وَانْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ

برا دستور ہے جا بات نا ہنجار شیوہ ہی
بڑی خوف و خطر کی جائے ہی جس گھر میں بیٹھی ہو

ایامیٰ

جس میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی ضرورۃ ایک دلچسپ قصے کے پیرایہ میں بیان کی ہی

اور جس کو

مولوی حافظ محمد نذیر احمد خاں صاحب بہادر سابق ڈپٹی کلکٹر و ممبر بورڈ آف ریونیو
سرکار عالی نظام و حال وظیفہ خوار سرکار ممدوح نے تصنیف فرمایا

سنہ ۱۸۹۱ء

باجازت جناب مصنف صاحب موصوف خاکسار بندہ محمد نذیر حسین تاجر کتب
دہلی بازار دریبہ کلاں نے منشی محمد علی صاحب مالک مطبع کے اہتمام سے

مطبع فیضی دہلی میں چھپوایا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلی فصل تمہید

۲۷۰۵

شہر اور محلے اور خاندان کا کیا مذکور ہی گھر بھی کوئی ایسا ہی اِکا دُکا ہوگا جس میں بوڑھی یا ادھیڑ یا (افسوس) جوان یا (ہائے ہائے) لڑکی بیوہ نہ ہو۔ اور جب بیاہ سے مرد اور عورت جیتے جی کا تعلق کرتے ہیں تو ہر ایک بیاہ کا ضروری اور لازمی نتیجہ ہی کہ آخر کار مرد رنڈوا ہو یا عورت رانڈ۔ بیاہ سے مرد اور عورت نے ساری عمر ساتھ رہنے کا قول و قرار کیا ہو نہ ساتھ مرنے کا۔ بے شک مردم شماری سے ثابت ہوا ہی کہ جنگلی اور وحشی قومیں چھوڑ کر ہر جگہ عورتوں کا مجموعہ مردوں سے کچھ یوں ہی سا بڑھا ہوا رہتا ہی۔ مگر نہ اتنا کہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھو رانڈیں ہی رانڈیں نظر پڑیں۔ ہو نہ ہو رانڈوں کی یہ کثرت کچھ تو اس وجہ سے ہی کہ ہر بی بی اَدّ بدا کر عمر میں تھوڑی یا بہت اپنے میاں سے چھوٹی ہوتی ہی ہی مرد کی مدت حیات پہلے ہو چکی عورت بیوہ ہو کر رہ گئی۔ لیکن ایک بڑا سبب اَور ہی کہ مرد تجرد کی مصیبتوں کے برداشت کرنے میں عورتوں سے زیادہ بودے ہیں۔ مرنے والی کا کفن تک میلا ہونے نہیں پاتا کہ ان کا ایمان ڈانواڈول ہونے لگتا ہی۔ اور نہ کیوں ہو۔ مرنے کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا ع شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن ؎ زندگی کے دن تو کسی نہ کسی طرح تیر کرنے ہی پڑیں گے جان پر عذاب ڈالیں کیوں اور زیست تلخ کریں کس لیے۔ وہ تو کچھ عورتوں کے ہی جگرے ہیں اور جگرے بھی کیا خاک ہیں یوں کہو پرلے درجے کی بدقسمتی ہی کہ بیوگی کی مصیبتہ زندگی جھیلتی ہیں۔ کہتے ہیں قیامت نفسی نفسی کا دن ہوگا کہ کسی کو دوسرے کے دُکھ درد

کی ذری پروانہ ہوگی - لیکن ہمارے دیکھنے میں تو بیوہ عورتوں کے لیے اب بھی قیامت
ہے - [illegible] کہنے کو تو [illegible] کہے گا کہ ہوگی بڑی آفت ہے - لیکن مونھ سے کہنے کی سند کیا ہے
ہم تو بڑی [illegible] قائل ہوں جب لوگوں کو آفت رسیدہ کے لیے کوئی تدبیر
[illegible] دیکھیں ؟ یہ کہنا کہ کچھ آفت نہیں اور یہ کہنا کہ آفت تو ہے مگر ہم اس کے لیے کوئی
نہیں کرنی چاہتے دونوں کا مآل واحد ہے - بیوگی اگر آفت ہے تو عجیب طرح کی آفت ہے کہ جس کو دیکھو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے - یہاں تک کہ جو خود مبتلائے آفت ہے روتا بھی ہے پیٹتا بھی
رنج کے مارے اندر ہی اندر پڑا گھلتا بھی ہے مگر چاہیے کہ بندِ غم سے نجات حاصل کرنے
کی فکر کرے بس اس کا کہیں پتہ نہیں - ہم نے بھی سیکڑوں ہی بیوؤں کو دیکھا
تعلق بعض کی بے کسی پر افسوس بھی کیوں نہیں آیا مگر خدا گواہ ہے وکفا [illegible]
[illegible]دی بیگم کا حال نہیں سُنا ہم نے نہیں جانا کہ بیوہ عورت کے دل پر یہ کچھ صدمہ گزرتا
شاید خدا کو بیوؤں کے حق میں کچھ بہتری کرنی تھی کہ آزادی بیگم نے مرتے دم [illegible]
[illegible] کا زہر اگلا - اگر کہیں خدا نخواستہ آزادی بیگم بھی دل میں سیکڑوں ہزاروں حسرتیں
اور مونھ میں گھنگنیاں بھرے ہوئے دنیا سے ناشاد نامراد اٹھ گئی ہوتی جیسے لاکھوں
کروڑوں خدا کی بندیاں اٹھ گئیں نہ اپنی کہی نہ دوسرے کی سُنی تو وہی بیوگی ہوتی
وہی جی ہی جی میں گھٹنا ہے ؎

گر ہوئی صبح دلِ زار پہ آفت آئی + رات آئی تو یہ جانا کہ قیامت آئی

وہی رسمی تعزیت وہی جھوٹی ہمدردی - آزادی بیگم کے اس احسان کو کون مٹ سکتا ہے
[illegible] بھی خدا اس کی مغفرت کرے اتنی کسر رہ گئی کہ کہنے کو تو اس نے [illegible] اُٹھا نہیں
[illegible] کرکے کچھ نہ دکھایا - اگر خدا اس کو ہمت دیتا [illegible] بیوگی میں جیسے جیسے [illegible]
دل میں آتے تھے سب نہیں تو دو چار پر بھی عمل کر گزرتی تو دنیا اچھی طرح آنکھیں کھول کر
[illegible] کہ بیوہ کے بیٹھنے بٹھانے کے کیسے زبون نتیجے ہیں خود بیوہ کے حق میں اُس کے
[illegible] کے حق میں خاندان کے حق میں [illegible] حق میں اور ملک کے حق میں +

آزادی بیگم کچھ ایسی بیوہ تو نہ تھی مگر اس [illegible] سے ایسے ایسے واقعات پیش آئے جن کی

یہ تو آج نیا مسئلہ سُننے میں آیا کہ مدرسے میں جانے سے آدمی کافر ہو جاتا ہی۔ تو تمھارے نزدیک میں بھی کافر ہوں اور جس جس کے مدرسے میں پڑھا سب کافر۔ اور سب سے بڑھ کافر تو تمھارے ماموزاد بھائی جنھوں نے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور جتنے مسلمان مدرسے [illegible]۔ ذری سمجھ کر تو بات کیا کرو۔ تم اپنے والد ہی سے پوچھنا کہ مسلمان کو جو کافر کہے اُس کا کیا حکم ہی۔ اور خبر بھی ہی میاں بی بی میں سے ایک بھی کفر کرے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہی۔ بی بی۔ کیا جانیں سارا شہر تھڑی تھڑی کر رہا ہی اور ابا جان ہی کو لوگ آ آ کر چھیڑتے ہیں کہ ایسے بڑے مولوی اور واعظ کے نواسے پادریوں کے مدرسے میں [illegible] ع چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ میں نے اس شرمندگی کے مارے لوگوں کے بیاہ برات میں بھی جانا چھوڑ دیا۔ میاں۔ بھلا تمھارے دا[illegible]

بی بی۔ ابا تو انھوں نے بھی کئی بار کہا کہ شہر میں بہتیرے مدرسے بڑی بے جا بات کی کہ پادری کے مدرسے میں لڑکوں کو داخل کیا یہ لوگ سکھا سکھا کر لڑکوں کو بے دین کر دیتے ہیں اور ابا جان اس بات سے بھی ہ[illegible]

ہیں کہ تم نے بچوں کو قرآن نہیں پڑھوایا۔ غضب ہی کہ مسلمان کے بچے اور قرآن کا ایک بول نہ جانیں۔ تمھاری اولاد ہی تم خدا کے یہاں چل کر اس کی جواب دہی کر لینا۔ بگڑو یا سُدھرو میں اس معاملے میں تمھاری شریک نہیں۔ میاں۔ جب معنے نہیں سمجھ سکتے تو طوطے کی طرح لفظوں کے پڑھانے سے کیا فائدہ تھا۔ بی بی۔ اب یہ ہزاروں لاکھوں مسلمان مرد اور عورت قرآن پڑھتے ہیں اور معنے مطلب نہیں سمجھتے تمھارے نزدیک تو یہ سب احمق ہیں۔ میاں۔ بے شک۔ اور تم ان کے قرآن پڑھنے سے کیا سند پکڑتی ہو میں تو اس عقیدے کا آدمی ہوں کہ میرے نزدیک بے سمجھے نماز بھی نہیں ہوتی بی بی۔ میں نے جو ذری کی ذری مدرسے کے لڑکوں کو بُرا کہا تو اُس پر اتنے اُچھلے کودے اب جو تم مُونھ بھر بھر [illegible] ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر کہہ رہے ہو تم جانو۔ میاں۔ سچ کہا ہی نیم مُلا خطرۂ ایمان نیم حکیم خطرۂ جان۔ کجا کافر کجا نماز کا نہ ہونا۔ خیر اس سے کیا بحث اپنی اپنی رائے [illegible] یہ بتاؤ کہ بچوں کو بے سمجھے قرآن کا پڑھنا مفید ہی یا نہیں۔ بی بی۔

تم کس طرح کا فائدہ ڈھونڈتے ہو فائدہ یہی کہ قرآن پڑھنے لگے - قرآن کے لفظوں میں
بھی ثواب اور برکت ہی - میاں - بچوں کو قرآن ثواب اور برکت کے لئے پڑھایا جاتا ہی یا
اس غرض سے قرآن کو لکھنا پڑھنا آئے - بی بی - دونوں ہی مطلب ہیں - میاں -
ثواب سے تو ہاتھ دھو رکھو وہ قرآن جس کو خدا فرماتے لا یمسہ الا المطہرون -
جزو جزو الگ ورق ورق کرکے نہایت بے توقیری کے ساتھ بے تمیز بچوں کے حوالے کر دیا جاتا
ہی جس کو وہ پھاڑتے اور بگاڑتے اور دست مال کرتے - ان کے پڑھے ہوئے سیپارے
میلے کچیلے گندے جن کو آنکھ بھر کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا - قرآن کے ساتھ یہ بے ادبیاں
ہوتی ہیں اور اس پر ثواب کی توقع - بی بی - بے شک احتیاط نہیں ہوتی اور ہو
نہیں سکتی - مگر معصوم بچوں سے کسی طرح کی پرسش نہیں - میاں - اگر بچوں سے پرسش نہیں
تو ان کو ثواب بھی نہیں - بی بی - لیکن بڑے ہو کر تلاوت کریں گے تو آگے چل کر ان کو
ثواب ہوگا - میاں - بے سمجھے - بی بی - ہاں ہاں بے سمجھے بھی - میاں - ایسے [illegible]
کے لئے تمہارے میکے والے اور جو ان سے ارادت رکھتے ہیں بڑ بڑایا کریں میں اپنے بچوں
کو اس زحمت میں نہیں ڈالتا میں سر دست اتنا ہی چاہتا ہوں کہ اردو کے پڑھنے لکھنے
پر بخوبی قادر ہو جائیں - سو میں امید کرتا ہوں جتنے دنوں میں قرآن ختم کرتے ویسے ہی دنوں
میں باین بدشوقی پر اچھی خاصی اردو پڑھنے لکھنے لگیں گے اور میں تم کو دکھا دوں گا
اور حساب وغیرہ سیکھیں گے سو الگ - بی بی - میں کہتی ہوں کہ تمہارا یہ مطلب
قرآن ہی سے بآسانی اور جلد حاصل ہوتا - میاں - یہ کیوں کر؟ بی بی - [illegible]
طرح انگریزی نہیں پڑھی اور خدا نہ کرے کہ کوئی پڑھے تو کیا اتنا بھی نہیں سمجھ سکتیں -
ہیں تم سب کچھ سمجھتی ہو مگر مجھکو بھی تو سمجھاؤ - بی بی - [illegible] قرآن جان لینے جاتے
ہیں - یہ تو خود اپنے پر گزری ہوئی ہی اور بیسیوں بچوں کو پڑھا کر دیکھا ہی - زیر زبر کے
سہارے سے رواں نکالنا جلد آ جاتا ہی پھر جو اردو شروع کرائی جاتی ہی تو خدا جانے کچھ
الکل ہو جاتی ہے اور میں تو قرآن ہی کی برکت کہوں گی جو تین مہینے میں اردو فرفر

سلہ پاک لوگوں کے سوا اس کو اور کوئی نہ چھوئے

کے ساتھ پڑھنے لگتے ہیں - تمہارے لڑکوں کو وہی قرآن نہ پڑھنے کی پھٹکار ہے کہ آج تک
اردو صاف نہیں چلتی وہی [illegible] تمہارا بالکل غلط خیال ہے مبتدی کو
جسطرح قرآن میں زیر و زبر [illegible] سہارا ملتا ہے اسی طرح اردو میں مطلب سمجھنے کا یہ فرق تم کو اُس
وقت محسوس ہوتا کہ ایک ہی طرح کے ذہن کے دو بچے ہوتے ایک کو قرآن شریف شروع
کرایا جاتا دوسرے کو اردو مگر وہ اردو جس میں زیر زبر لگے ہوں تب تم دیکھتیں کہ قرآن
پڑھنے والا بڑا رینگ رہا ہے اور اردو خوان سرپٹ چلا جاتا - بی بی - خدا کے لئے کہیں
بخشو گے بھی - میرا پیچھا کیوں لیا ہے میں نے تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں نہ دخل !
اور نہ آگے کو دوں - رہی لڑکی اس کو نہ نوکری کرنی ہے نہ لوگوں میں
جیسا برا بھلا مجکو آتا ہے سیج سیج سکھا پڑھا لوں گی - میاں - میں لڑکوں
کی قدر مطمئن بھی ہوں ابھی نا سمجھ ہیں شوق کرنے کی عمر نہیں گھر پر
ہوتا مگر میں ان کی تعلیم کا انتظام کروں گا - افسوس آزادی کی بربادی - اس
ہی جیسی اٹھاوگی - بی بی - کیوں مجھ میں کیا کیڑے پڑے ہیں - میں سینا نہیں جانتی -
پکانا نہیں جانتی - لکھ پڑھ نہیں سکتی - گھر کا انتظام نہیں کرسکتی - بچے پالنے مجکو نہیں آتے
پھوہڑ ہوں - بدسلیقہ ہوں - تم کیا قدر کروگے اپنے کنبے کے لوگوں سے پوچھو - محلے والوں
سے دریافت کرو - آتنی نہیں اس سے ڈیوڑھی دونی آمدنی کے گھر سے اپنے یہاں کے
سازوسامان کو ملاؤ دو چار دن گھر میں بیٹھ کر دیکھو کتنی عورتیں مجھ بے ہنر کو گھیرے
رہتی ہیں ؟ کوئی کپڑے قطع کرانے آتی ہے - کوئی صلاح لینے - کوئی دوا پوچھنے - کوئی خط
لکھوانے پڑھوانے - کوئی کتاب سننے - کوئی مسئلہ دریافت کرنے - شادی بیاہ وغیرہ بڑی
چھوٹی جتنی تقریبیں میرے بیاہ کے بعد تمہارے اور ہمارے کنبے اور اس محلے میں ہوئی
ہیں کسی ایک تقریب کا نام لو جس میں انتظام کے لئے میں نہ بلائی گئی ہوں - کیا تم نہیں
جانتے اب بات کی تہہ پر آکر گر جاؤ تو خبر نہیں - خاک چاٹ کر کہتی ہوں اگر آزادی خدا اس کو
جیتا رکھے ماجھی ہوئی تو جس گھر جائے گی سسرال والے اس کے پانو دھو دھو کر پئیں
تو سہی - میاں [illegible] کہہ رہا ہوں [illegible] اب پھر کہتا ہوں کہ [illegible]

بے شک پردے میں پہلے سے بہت سختی ہوگئی ہے مگر ویسے ہی اگلے لوگوں کی نیتیں بھی درست تھیں اب اس سختی پر بھی باز نہیں آتے مگر جس کا پردہ خدا رکھے۔ اور حلال خوری وغیرہ کی جو دلیل تم نے پکڑی تو ان سے ہماری ضرورتیں متعلق ہیں۔ میاں۔ اجی وہ سب سے بڑی ضرورۃ ہے جس کے لئے میں تم کو پادری صاحب کے یہاں لیے چلتا ہوں۔ اُن کی بی بی بچوں سے مل کر اور ان کا گھر دیکھ کر ضرور تمہارا خیال اور گھر کے انتظام کا رنگ بالکل بدل جاوے گا۔ بی بی۔ میرا دل ہی خدا نے ایسا ڈانواڈول نہیں بنایا [illegible] اپنی حالۃ اور وضع کو خوب سمجھتی ہوں مجکو اپنے ہی لوگوں میں جینا اور اپنے ہی لوگوں میں مرنا ہے میں فرنگنوں کے ڈھنگ دیکھ کر کیا کروں گی پہلے ہی سے بے پردہ ہوں تو اُن کی ریس بھی کروں۔ میاں۔ کیوں جی رات دن میں گُھٹے گُھٹے تمہارا جی نہیں اُکتاتا۔ بی بی۔ خدا نہ کرے کیوں اُکتانے سات پیسے ڈولی کہیں جانا ہوتا ہے تو سارے رستے ہول سا چڑھا رہتا ہے میاں۔ تو سودا کا یہ شعر تمہارے حسب حال ہے ؎

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے ✤ کہ جس نے دل سے مٹائی خلش رہائی کی

وہ طوطا بھی تمھیں یاد ہے جو یہاں درے میں لٹکا رہتا تھا اور جس کو کئی برس ہوئے نیولا لے گیا تم کو شاید خیال ہو اکثر پنجرے میں سے باہر نکل آتا مگر بیچارے سے اُڑا نہ جاتا [illegible] جب کبھی اُس کی یہ حالۃ دیکھتا اپنے ملک کی عورتوں پر افسوس کرتا کہ پردے کی [illegible] پڑے پڑے ان کے دل [illegible] تم نہیں چلتیں تو آزادی کو جانتا دو [illegible] ان [illegible] جاؤ اس کا [illegible] ہوائی ہے [illegible] کا لوٹھا سکتے سے یہ نہیں چھپتی [illegible] نہیں چھپتی مردانے کے [illegible] پردے والوں سے یہ پردہ نہیں کرتی بہتیرا روکتی رہتی ہوں بولے گی تو اس قدر چلا کر گلی میں [illegible] لیکن لے تو جاؤ گے پر اس کے جو والی وارث ہیں [illegible] تم کو اور اس [illegible] دونوں [illegible] بھی چکھا دیں گے۔ یہ سن کر آزادی کا باپ کچھ ڈر سا گیا۔ بات [illegible] رفع ہوگئی اسی طرح آزادی کے کانوں

چھدنے پر کئی دفعہ جھگڑا ہوئی۔ آزادی کی ماں سچ کہتی تھی [illegible]
بچپنے ہی میں اس کے کان چھدوا دیئے ہوتے تو شاید یہ ضد کرنے پاتی کہ کانوں کو ہاتھ
نہیں لگانے دیتی اور گوشت تھا نرم اس کو تکلیف بھی کم ہوتی۔ آزادی کا یہ حال
تھا کہ کسی بندے کی آواز کان میں پڑی اور پتا توڑ غائب ہوئی۔ گھر میں بعض عورتیں
ایسے سخت دل کی بھی تھیں کہ وہی کان چھید دیتیں مگر آزادی تو رہا نہ تھی ایک
دو دفعہ دبوچی گئی تو لگی پٹخنیاں کھانے دہائی دینے۔ چھوڑ چھوڑ دیا۔ کچھ تو اس کے
اپنے دل میں ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اور بہت کر کے باپ کا اشارہ اور سہارا تھا وہ دوسرا
بیٹی سے کہتے تھے آزادی کان ہی نہ چھدوانا بڑا ہی دکھ ہوتا ہے اور تمھاری ممی بھی کتنی برسوں
کی جھمیل میں پڑ جاؤ گی۔ بی بی کہتی مجھے کیا سناتے ہو میری بلا سے۔ یہی ناک کان سے
ننگی پڑی پھرے گی۔ ہم تو سستے چھوٹے اتنا زیور نہیں دینا پڑے گا تم نے اس کو
یہ تو اپنے مطلب کی اچھی صلاح دی۔ میاں۔ (بیٹی کی طرف رخ کر کے) نہیں بیٹا تم ان کے
بہکانے میں نہ آنا۔ خدا وہ دن کرے گا تو ناک کان کے بدلے ہاتھ گلے میں جتنا چاہنا
لا دلینا (بی بی کی طرف متوجہ ہو کر) اور مجکو تو یہ توقع ہے کہ آزادی بڑی ہو کر عام ہندوستانی
عورتوں کی طرح احمق نہیں رہے گی اور سمجھے گی کہ عورتوں کو کتنی زینت کی ضرورت ہے تعجب نہیں
ہے کہ یہ خود زیور کے بدلے نوٹ یا جائداد کا لینا پسند کرے گی۔ ایک بڑی مجبوری یہ ہے کہ تم
لوگ کسی بات میں عقل کو دخل نہیں دیتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے آدمیوں کا پیدا
کرنا کم کر دیا ہے آج کل کے آدمی آدمی نہیں ہیں بلکہ بھیڑیں ہیں جدھر کو اگلی بھیڑ
کا منہ اٹھا سارا ریوڑ اسی کے پیچھے ہو لیا۔ اگلے لوگوں نے جو دستور قرار دیئے ممکن
ہے کہ انھوں نے غلطی کی ہو کیوں کہ وہ بھی کچھ معصوم فرشتے نہ تھے بلکہ ہم ہی جیسے
آدمی تھے اور کون بندہ بشر ہے جس سے غلطی نہیں ہوتی۔ یا ایک فعل ایک وقت
خاص تک مناسب اور قرینِ مصلحت ہوتا ہے اب زمانے کا رنگ بالکل بدل گیا ہے۔
خدا نے سلطنت پر مسلط کر دیا ہے اُن لوگوں کو جو ہر طرح اُس کے شایاں ہیں۔ ان کی
عمل داری میں ملک نے بڑی نمایاں ترقی کی ہے اور کر رہا ہے۔ ہر چہار طرف علم جاری

اور ایک دن انشاء اللہ ہی کہ کڑی کے جالے کی طرح ہر جگہ پھیلی ہوئی ہوگی - یہ
اسی کا طفیل ہی کہ ہم مہینوں کے رستے ہفتوں میں اور ہفتوں کے گھنٹوں میں
طی کرتے ہیں بے زحمت بے تکان - ایک پیسے میں جہاں چاہو خط بھیج دو - انگریزی عمل داری
کی پیشمار برکتوں میں سے ایک تار برقی ہی کہ اگلے وقتوں میں ایجاد ہوا ہوتا تو کرامۃ اور
خرق عادۃ سمجھا گیا ہوتا - آٹھ آنے کی بھی کچھ حقیقت ہی کلکتہ - برما - مدراس - بمبئی
پشاور غرض تمام ہندوستان میں دور سے دور کوئی جگہ فرض کرلو چٹکی بجاتے میں
خبر موجود - گانو گانو مدرسے - جگہ جگہ شفا خانے - آرام اور آسایش کی سیکڑوں ہزاروں
چیزیں ولایۃ سے بن بن کر چلی آتی ہیں سستی اور عمدہ سے عمدہ - امن کا یہ حال ہی
کہ شیر اور بکری کا ایک گھاٹ پانی پینا کہانیوں میں سنا کرتے تھے یا اب اپنی آنکھوں سے
دیکھتے ہیں - یہ اگلے وقتوں کی بے اطمینانیاں تھیں کہ لوگ مقدور کو چھپاتے اور
دولۃ کو زمین میں گاڑتے یا زیور وغیرہ کے پیرائے میں رکھتے - چیز تھوڑی مالیۃ
بہت ذرا سا کھٹکا ہوا کہیں کونے کھدرے میں دبا یا نیفے میں اڑس چلتے پھرتے
نظر آئے - اب ہر ایک آدمی کی جان اور آبرو اور دولۃ پورے طور پر محفوظ ہی غریب
کی جیسے امیر کی - حاکم کی جیسے محکوم کی - مسافر کی جیسے مقیم کی - اکیلے کی جیسے جتھے کی -
غرض عمل داری بدلی انتظام بدلا زمین بدلی آسمان بدلا اور نہ بدلے تو ہمارے دستور
یہ مصرع تو تمہارے کان میں بھی پڑا ہوگا - ع کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج ÷
تو کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ زر و گنج میں مقناطیس کی طرح کشش کی قوۃ ہی - نہیں
نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ دولۃ سے دولۃ کمائی جاتی ہی - مسلمانوں میں مفلسی
کی شکایۃ عام ہی اور مسلمان مفلس ہیں بھی - مگر ان کے افلاس کا بڑا سبب یہ ہی کہ
ان کو دولۃ سے دولۃ کمانے کا سلیقہ نہیں - دولۃ اگر ان کو خدا دے بھی تو گاڑیں گے
دابیں گے - چھپائیں گے یا بے کار و بے مصرف کرنے کے لئے زیور بنوائیں گے - یعنی
اگلے وقتوں میں دوسرے لوگ چراتے تھے اب اپنی دولۃ کو آپ چرائیں گے - مگر یہ
نہیں ہوگا کہ اس کو بڑھائیں گے یا اس سے کچھ کمائیں گے - بی بی - تمہارے ایسے

خیالات میں تو تم بیٹی کی بات بھی کہیں نہیں لگنے دو گی اور تمہاری ان باتوں کا شہرہ بھی لوگوں میں کچھ کہا سنا ہوگا تبھی اس کی مانگ آج تک کہیں سے نہیں آئی اولاد کے حق میں اچھی خیر خواہی کر رہے ہو۔ میاں۔ کیا دیر ہوگئی ہی؟ بی بی۔ دیر ہوتا کیا دیر لگتی ہی۔ یوں تو خیر ہم لوگوں میں لڑکیوں کو چودھویں برس ضرور بیاہ دیتے ہیں لیکن اس کا ماشاءاللہ ایسا اُٹھان ہی کہ یہ تو کیا بتاؤں بارھویں ہی میں جوان ہو گئی۔ میاں۔ اجی اللہ اللہ کرو۔ اٹھارہ نہیں تو سولہ۔ بی بی۔ تو سیدھی بات یہی کیوں نہیں کہتے کہ بیٹی کو بٹھا رکھنے کی صلاح ہی۔ ہی بھی تو اکلوتی۔ لیکن بیٹی ذات کو بادشاہ وزیر نہیں بٹھا سکے ہماری تو کیا اصل ہی۔ میاں۔ یہ تو سولہ برس تک بیٹھے ہی گی۔ اور سولہ بھی میں اس نظر سے کہتا ہوں کہ تم اس کے اُٹھان کو ٹوکتی ہو۔ بھلا نا سمجھی کے بیاہ بھی کچھ بیاہ ہیں مرد اور عورة اتنے تو ہولیں کہ اپنی رائے ظاہر کر سکیں۔ میں خیال کرتا ہوں سولہ برس سے کم میں رائے کا مادہ بھی پیدا نہیں ہوتا ظاہر کریں کیا خاک۔ بی بی۔ ہوش میں آؤ تمہارا کدھر خیال ہی اب تو سولہ برس کی عورة تیں نہیں تو دو بچوں کی ما ہوتی ہی۔ میاں۔ تو ویسے ہی روتی صورة اونگھتے ہوئے بچے بھی ہوتے ہیں اور ویسے ہی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں موت کا پرتہ زیادہ اور عمر کا اوسط کم ہی۔ اور ویسے ہی اکثر میاں بی بی میں ساری عمر بے اُلفتی اور ناسازگاری بھی رہتی ہی۔ بی بی۔ تم خدا کے لئے ایسی باتیں تو کرو مت۔ سُن سُن کر کوارے پنچھی کے مونہہ کا نور صیو ر اُڑا چلا جاتا ہی۔

آزادی کے ماباپ میں اسی طرح کے تذکرے آئے دن رہا کرتے تھے اور سوائے اس کے اَور باتیں بھی کیا تھیں جن میں ان کا وقت کٹتا۔ آزادی کے دل پر ان باتوں کا اثر کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوتا ہوگا۔ کچھ یوں ہی سی کسر رہ گئی ہوگی تو [illegible] صاحب کی میم نے پورا کر دیا۔ آزادی کے باپ خواجہ آزاد نے پادری [illegible] کے گھر زنان خانے کی آمد و شد کے لئے بہتیرے ہی زور مارے جب موقع ملتا جب قابو پاتا سمجھاتا۔ مگر ایک نہ چلی۔ ان لوگوں کا پادری صاحب کی کوٹھی پر جانا

[illegible] آزادی کی ماں نے تو [illegible] کبھی ہامی نہ بھری کہ پادری صاحب کی میم یا ان کی بیٹیاں اس کے گھر آئیں ❖

تیسری فصل - آزادی انگریزی سوسائٹی کے طور طریقے سے واقف ہوتی ہے

آخر خدا کا کرنا ایک دن آزادی کسی ضرورۃ سے رات کے وقت کوٹھے پر سے اُترتی تھی اور یوں تو ساری ساری رات چراغ جلتا رہتا تھا اُس رات خدا جانے ہوا سے گُل ہو گیا یا تیل ہو چکا غرض اندھیر اگھُپ پڑا تھا آزادی نے جلدی کے مارے چراغ کا تو انتظار کیا نہیں جوانی کی عمر ہاتھ پاؤں میں پھُرتی دھما دھم دھما دھم اُترنا شروع کیا۔ اتفاق سے کسی سیڑھی پر بلی پڑی سوتی تھی اُس پر جو پڑا زور سے پانو وہ ایک بھیانک آواز سے چلائی۔ آزادی جھجکی اور جھونک سنبھال نہ سکی لڑکھڑا کر نیچے گری۔ گرنا تھا کہ بے اختیار ایک زور کی آواز اس کے مُونہ سے نکلی۔ بلی کا غل اس کے گرنے کا دھماکا اور دھماکے کے ساتھ چیخ۔ سارا گھر جاگ اُٹھا۔ آکر دیکھا تو آزادی اوندھے مونہ زمین پر پڑی کراہ رہی ہی۔ چاہا سیدھا کریں اُٹھائیں۔ چھونا تھا کہ پھڑک اُٹھی۔ پوچھا تو جواب دینے کے اوسان نہیں۔ باوجودے کہ کچھ ایسی گرمی نہ تھی مگر چوٹ کے صدمے سے پسینے پسینے ہو رہی تھی اور تھر تھر بوٹی بوٹی پڑی کانپ رہی تھی۔ بارے جب بڑی دیر تک پنکھے جھلے گئے ٹھنڈے پانی سے مُونہ دُھلایا تو اس نے بڑی مشکل سے کراہتے کراہتے اتنا کہا کہ میری داہنی ٹانگ میں بڑے زور کی چوٹ آئی ہی سانس نہیں لیا جاتا مجکو چپکی پڑی رہنے دو کچھ کہو سنو نہیں۔ لوگوں کی اُس وقت کی بدحواسی بیان نہیں ہو سکتی۔ چوٹ تو لگی تھی آزادی کے مگر ماما کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ کہتی کچھ تھی اور مُونہ سے نکلتا تھا کچھ۔ چوٹ کے تشخیص کرنے کا کسی کو سلیقہ نہیں کہے تو آزادی خود آزادی۔ سناٹے میں بیٹھا ہوا ایک کو ایک تک رہا تھا۔ رات کا وقت مٹی ذات [illegible] چوٹ چپیٹ کے لیے مشہور تھے کوئی بھڑ بونجا تھا کوئی تیلی کوئی قسائی کوئی نائی۔ [illegible] سب نے غور کیا کوئی عورۃ اس کام کی جاننے والی سمجھ میں نہ آئی۔

دیر بیہوش چلی جارہی تھی خیال ہوا کہ چوٹ ٹھنڈی نہ پڑ جائے ~~آخر~~ آزادی کو [illegible]
آپ ہی میاں سے بولی پادری کی میم کو اکثر لاؤں لاؤں کہا کرتے تھے اور مجھے خیال [illegible]
ہے تم نے ان کاموں میں بھی اُس کی بڑی تعریف کی ہی دیکھو اگر ہوسکے تو اُس کو لاؤ۔ ہادی [illegible]
کے مونھ سے اتنی بات کا نکلنا تھا کہ خواجہ آزاد آدھے گھنٹے کے اندر ہی اندر میم صاحب کو
جا کر لوا لایا۔ خواجہ آزاد پہونچا تو میم صاحب اپنے کمرے میں سو رہی تھیں اس نے [illegible]
کہہ کر جگوایا سُنتے کے ساتھ وہی شب خوابی کے کپڑے پہنے ہوئے اوزاروں کی [illegible]
دواؤں کا بکس بغل میں دبا ساتھ ہولیں۔ یہاں آتے ہی اُنھوں نے آزادی کو پہلے
کچھ دوا پلائی۔ حلق سے اُترتا تھا کہ بے چینی موقوف ہوئی۔ پھر پیروں کی انگلیوں
کو کھینچا پانوں کو ہلایا جُھلایا اپنے قاعدے کے موافق ہر طرف ٹٹولا۔ جب اچھی طرح
دیکھ بھال چکیں تو لگیں کہنے میں اس کی تکلیف کے ڈر سے زیادہ چھیڑ نہیں سکتی۔
مگر مجکو تو کولھا اُترا ہوا معلوم ہوتا ہی۔ اگر آپ لوگ اجازت دو تو کلوروفارم سنگھا کر
میں اس کو اطمینان کے ساتھ دیکھوں۔ ہادی بیگم۔ آپ کیا چیز سنگھائیں گی اور اس سے
ہوگا کیا؟ میم صاحب۔ کچھ نہیں اس بوتل میں ایک عرق ہی رومال پر چھڑک کر اس کی
ناک پر رکھ دوں گی تھوڑی دیر کے لئے لڑکی بے ہوش ہو جاے گی میں اس کو چت لٹا کر
کروٹ لوا کر معلوم کروں گی کہاں کہاں چوٹ ہی اور کیسی چوٹ ہی؟ ہادی بیگم۔ ایسی کتنی
دیر بے ہوش رہے گی۔ میم صاحب جتنی دیر مجھے لگے ہوئے ہوئی اتنی ہی اُف۔ ہادی بیگم
اس کو ایذا ہوگی۔ میم صاحب۔ چوٹ کی تو ذرا سی بھی ایذا نہیں ہوگی مگر ہاں ہوش
آئے پیچھے کسی قدر سر گھومے گا اور شاید جی بھی متلاے گا کیون کہ یہ دوا شراب کی
روح ہی اور اس مین بڑا تیز نشہ ہی۔ لیکن میں نشے کا اُتار دوں گی طبیعت جلد ٹھیر جاے گی
ہادی بیگم۔ ہی ہی شراب اس کو سنگھاؤ گی شراب تو ہمارے مذہب میں حرام ہی۔
میم صاحب۔ میں جانتی ہوں مسلمانوں میں شراب حرام ہی اور ہم لوگ بھی اس کو
بُرا جانتے ہیں مگر بیماری پر کچھ بس نہیں۔ اس کو بے ہوش کرنا ضرور ہی اگر کولھا اُتر گیا
ہی جیسا کہ میرا خیال ہی اور میں یقین کرتی ہوں کہ صحیح ہی تو بے ہوشی کے [illegible]

چڑھایا جا سکتا ہے اگر کلوروفارم سے [illegible] نہیں کی جائے گی تو غش سے بے ہوش
[illegible] منظور ہو۔ اگر آپ اس کا آرام چاہتی ہو تو جلدی کرو ایسا نہ ہو کہ
[illegible]۔ ہادی بیگم تو پس و پیش ہی کرتی رہی خواجہ آزاد نے انگریزی میں
کہا جناب یہ عورت بڑی وہمی اور متعصب ہے آپ میرے کہنے سے کلوروفارم سنگھا کر
اپنا عمل کیجئے۔ یہ کہہ کر آزاد لحاظ کے مارے سامنے سے ٹل گیا۔ اکیلی میم صاحب نے کلوروفارم
بھی سنگھایا کولھا بھی چڑھایا اور باندھ بھی دیا۔ پٹی کا آخری لپیٹ باندھا جا رہا تھا کہ
آزادی نے لال لال چڑھی ہوئی آنکھیں کھولیں۔ میم صاحب نے اوپر والوں کی تشفی
کی اور پھر آزادی کو کچھ دوا پلائی اور چلتے ہوئے چند پڑیاں دے گئیں کہ اگر طبیعت سنبھل گئی
تو گھنٹے گھنٹے ورنہ آدھے آدھے گھنٹے بعد پلاتی رہنا میں امید کرتی ہوں صبح تک سارا خمار
اتر جائے گا۔ اور جلدی میں بندش اچھی نہیں بن پڑی اس کو چاہیئے تھا زور اور
میرے ہاتھوں میں اتنا بوتا نہیں صبح ہوتے ہی میں اپنی بڑی لڑکی مس میری کو پٹیاں
اور پڑیاں دے کر بھیجوں گی وہ بندش کو ٹھیک ٹھاک کر جائے گی۔ ہادی بیگم۔ کیا
آپ کی بیٹی پھر اس کو وہی شراب سنگھائیں گی ہا میم صاحب۔ نہیں اب سنگھانے کی
کچھ حاجت نہیں۔ بندش کو کس دینا ہے اور بس۔ آپ کسی طرح گھبرایئے نہیں کولھا میرے
نزدیک بہت درستی کے ساتھ بیٹھ گیا ہے۔ ہادی بیگم۔ اب یہ چلیں پھریں گی کب ؟
میم صاحب۔ اس وقت تو اس کی بڑی احتیاط چاہیئے کہ کسی طرح ہلیں جلیں نہیں۔
بھلا زیادہ نہیں تو ایک ہفتے اسی طرح لیٹی رہیں۔ ایک ہفتے بعد میں آپ اگر بندش کو
کھولوں گی۔ اور اس وقت بتا سکوں گی کہ کب تک چلیں پھریں گی۔ اگلے دن ابھی
اچھی طرح دھوپ بھی نہیں نکلی تھی کہ مس میری سامان بندش لیے ہوئے آموجود
ہوگئیں اور بڑی پھرتی کے ساتھ جکڑ بند کر کے دونوں پہلوؤں میں اس طرح تکیے
لگا دئے کہ مریضہ ہلنا چاہے بھی تو نہ ہل سکے۔ آزادی کی عام تن درستی ماشاء اللہ شروع
سے ایسی عمدہ حالت میں تھی کہ گو اس کو بہت بڑا جھکولا پہنچا تھا مگر وہ مہینے کے اندر
ہی اندر اچھی خاصی تن درست ہو جاتی لیکن وہ کچھ تھی بھی چلبلی بہتیرے انتظام کئے

گر وہ نچلی نہ رہ سکی۔ مس میری بیمار اور بیمار گر[illegible] کو ڈرانی تھی کہ [illegible]
اور خدا نخواستہ کہیں پانو چھوٹا پڑ گیا تو ساری عمر کو لنگ رہ جائے گا اور [illegible]
ہوگی لیکن تم لوگ کچھ پروا نہیں کرتے جب میں آتی ہوں بندقن کو ڈھیلا پاتی ہوں [illegible]
نہیں ہیں تو بندقن آپ سے آپ کیوں کر کھل جاتی ہے؟ ہادی بیگم۔ اپنی جانب میں [illegible]
اس کو ہلنے نہیں دیتے یہ آپ بھی سمجھ دار ہیں جہاں تک ہو سکتا ہے احتیاط کرتی [illegible]
میں پانو بے کل ہو جاتا ہو تو مجبوری ہے۔ مس میری۔ کچھ مجبوری نہیں باری باری سے
ایک آدمی جاگتا رہے مگر تم لوگوں سے کچھ ہو نہیں سکتا۔ اسی اثنا میں آزادی کو کچھ تپ
بھی آنے لگی تپ نے مفارقت نہیں کی تھی کہ پیچش ہو گئی اور اب وہ پوری بیمار ہوئی۔ اور
اوپر والوں کی نیتیں لگیں ڈانوا ڈول ہونے۔ مگر میم صاحب نے صاف کہہ دیا کہ اب تک
ہم اس کا علاج آپ لوگوں کی خاطر سے کرتے تھے اور اب اپنی خاطر سے کریں گے علاج کا
کچھ قصور نہیں شروع سے ٹھیک قاعدے کے مطابق ہو رہا ہے سارا قصور اوپر والوں
کا ہے بیمار داری درستی کے ساتھ نہیں ہوتی اس کو چاہیے ہمہ وقت ہمارے پیش نظر
رہنا لیکن میں جانتی ہوں کہ تم اس کو میرے بنگلے پر جہاں اس کو تمھارے گھر سے
یقیناً زیادہ آرام ملے گا نہیں بھیجو گی۔ خیر اب ہم میں سے ایک آدمی یہاں رہے گا
رات کو میری سویا کرے گی بخار اور پیچش عارضی ہے میں اس کی تن درستی کا بیمہ لیتی ہوں
ایسا نہیں ہو سکتا کہ سوا ڈیڑھ مہینے تو اس کے پیچھے جان ماریں ہم اور اب کہ اس کے
اچھے ہونے کے دن قریب ہیں۔ دوسرا اپنا نام کرے کہ میں نے اچھا
کیا۔ مس میری نے مکان میں صفائی کرائی۔ ہوادار جگہ میں آزادی کی اور
اپنی چارپائی بچھوائی۔ آزادی کے تکیے بچھونے بدلوائے دوا اور غذا اور مالش
اور ہر چیز کا آپ اہتمام کیا ایک ہی ہفتے میں ساری شکایتیں رفع ہو گئیں۔ [illegible]
کے وقت کچھ یوں ہی خفیف سا درد کولھے میں ہوتا تھا سو مالش جاری تھی۔ آزادی
جھمیلے میں تو پڑ گئی تھی لیکن انگریزنوں کی حسن تدبیر سے تیسرے ہی مہینے بالکل تن درست
ہو گئی اور بیماری سے اٹھ کر اس کا رنگ ایسا نکھرا جیسے گلاب کا پھول۔ [illegible]

آسی رام نگری

کھلونے والا

وہ ہمارے گاؤں میں روزانہ آتا تھا۔ میں ہمیشہ سے اسے ایسا ہی دیکھ رہا ہوں۔ سینے پر لٹکتی ہوئی روئی کی طرح سفید لمبی داڑھی۔ ہونٹوں پر جھکی ہوئی نکیلی ناک۔ بڑی بڑی چھوٹی چھوٹی سی آنکھوں کی پلکیں پھولی پھولی سی چہرے پر متعدد جھریاں۔ ایک ڈلیہ میں کانچ اور مٹی کے بہت سے کھلونے — عورتوں کیلئے چوڑیاں، سنگار سامان۔ بچوں کے لئے کپڑے کی بنی ہوئی گڑیاں — یہی اس کی دکان، یہی اس کی کائنات تھی —

سردی ہو یا گرمی دوپہر کے وقت ہاتھ میں چھتری لئے سر پر ڈلیہ رکھے وہ آتا تھا۔ اور جب بھی وہ گاؤں میں آکر — "واہ واہ ری چڑیا جن کی ہوں سگے کھیا۔ وہی ہیں سگے چڑیا" کی آواز لگاتا تو بچے اپنا اپنا کھیل چھوڑ کر دوڑتے تھے۔ بچے اسے دیکھکر خوشی سے ناچ اٹھتے۔ وہ بچوں میں آکر جی جاتا تھا۔ لیکن شیلو اسے اور وہ شیلو کو جتنا پیار کرتا تھا۔ اتنی محبت اسے گاؤں میں کسی سے نہ تھی۔

شیلو ایک دوسرے گاؤں سے آئی ہوئی ایک بیوہ عورت کی اکلوتی بچی تھی۔ پہلے روز جب وہ گاؤں میں آئی تو بوڑھے کی آواز سنکر دوڑی۔ اس نے متحیر نگاہوں سے دیکھا کہ اس کے ساتھ کھیلنے والے بچے دوڑ کر بوڑھے کو لپٹ رہے ہیں۔ رامو دینا سے لڑ کر رو رہا تھا۔ بوڑھے کی آواز سنتے ہی روتے روتے کرتے کی آستین سے ناک پونچھتا ہوا خاموش ہو کر دوڑ پڑا۔ گوبند اپنی ماں کے آنچل میں چھپا ہوا دودھ پی رہا تھا۔ وہ دودھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ منی جو ماں سے گڑیا کیلئے ضد کر رہی تھی۔ بوڑھے کو دیکھا تو گڑیا بھول کر بچوں میں مل کر اس کے پیروں میں لپٹ گئی۔

شیلو منہ میں انگلی ڈال کر ایک طرف کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ دھول سے اٹے ہوئے گھونگھر والے بالوں کو آنکھوں کے آگے سے ہٹا کر اس نے بوڑھے کے چمکتے ہوئے کھلونوں کو دیکھا۔ پھر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بچوں پر برستی ہوئی محبت نے شیلو کو بیحد متاثر کیا۔

بوڑھے نے شیلو کو دیکھا تو اپنی ڈلیہ چھوڑ کر دونوں ہاتھ شیلو کی طرف پھیلا دیئے۔ اور بڑی محبت سے کہا — "آ میری بچی تو مجھ سے اتنی دور کیوں کھڑی ہے؟ کیا تجھے یہ کھلونے اچھے نہیں لگتے؟"

ایک لڑکے نے کہا — "دادا! یہ تمہیں جانتی ہی نہیں۔ ابھی کل رات ہی اس گاؤں میں آئی ہے۔"

بوڑھے نے پھر شیلو سے کہا — "آ بیٹی۔"

شیلو دوڑ کر بوڑھے کے گلے سے لپٹ گئی۔ بوڑھے نے اسے گود میں اٹھا کر کہا — "تمہارا نام کیا ہے رانی بیٹی؟"

شیلو کچھ نہ بولی تو بوڑھے نے ہنسکر بچوں کی طرف دیکھا۔ ایک بچے نے کہا — "دادا اس کا نام شیلو ہے۔ اور شیلو ہم سب انہیں دادا کہتے ہیں۔"

شیلو نے ہنسکر کہا — "اچھا تو میں بھی تمہیں دادا کہوں گی۔ لیکن یہ اتنے سارے کھلونے تم نے کہاں سے پائے؟"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا — "میں تو روز ہی اتنے کھلونے لاتا ہوں۔ اور یہ بچے دو چار خرید لیتے ہیں۔ کیا تم کوئی کھلونا لو گی؟"

شیلو نے ایک گڑیا ہاتھ میں لیکر کہا — "ہاں مجھے یہ گڑیا بہت اچھی لگ رہی ہے۔ اچھا تم ذرا ٹھہرو میں ماں سے پوچھتی آؤں۔"

شیلو اپنے گھر کی طرف دوڑی۔ بوڑھے نے محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کہا — "کیسی پھول سی بچی ہے۔ اس کا باپ کتنا خوش نصیب ہے۔ جب وہ اسے گود میں لیکر اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا ہوگا۔ تو دنیا کے سارے دکھ اسے پھیکے معلوم ہوتے ہوں گے۔"

اتنے میں شیلو دوڑتی ہوئی آئی۔ اور ایک پیسہ ہاتھ میں دیکر بولی — "تو دادا مجھے ایک گڑیا دیدو۔"

بوڑھے نے شیلو کے ہاتھ میں گڑیا دیکر کہا — "لے بیٹی یہ پسند ہے — ؟"

مگر میری کی اس قدر [illegible] آزادی [illegible] بلا ناغہ ہر روز آتی اور گھنٹوں [illegible] آزادی کی [illegible] تو اس پر ڈموں ڈیل [illegible] خود آزادی بیگم بھی اُس کے ساتھ [illegible] اُس کی [illegible] لگی کبھی کبھار میری دیر کر آتی تو انتظار کرتی یا سویرے جانا چاہتی تو بگڑتی۔ قومی اور مذہبی اجنبیت جو آزادی اور میری میں تھی وہی دونوں کے [illegible] اختلاط کا باعث بھی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو ایسا جاننا چاہتی تھیں گر گویا ایک گھر میں پیدا ہوئیں ایک جگہ رہیں سہیں اور ایک ساتھ کھیلیں۔ گھنٹے گزر جاتے اور ان کی باتوں کا سلسلہ ختم نہ ہوتا۔ مناسبتہ عمری تو کچھ ایسی نہ تھی کیوں کہ آزادی اصل خیر سے اب بارھویں میں لگی تھی اور میری کچھ دن کم اونیس کی۔ لیکن خدا جانے میری کی ملنساری کی کشش تھی یا آزادی کی بیماری میں جو اُس نے کسی طرح کی طمع نہیں لالچ نہیں سابقہ معرفتہ نہیں محض بے غرضانہ خدمتیں اور ہمدردیاں اور دل جوئیاں کی تھیں اُن کا اثر تھا کہ ہم نے دو سگی بہنوں میں بھی اس طرح کا ملاپ نہ دیکھا نہ سنا جیسا میری اور آزادی میں تھا۔ شروع شروع میں تو آزادی نے رُکاوٹ سی کی اور کواری لڑکی ایک اوپری عورۃ کے ساتھ جلد بے تکلف ہوتی بھی کیوں لیکن تین مہینے تک روز کے دو دو تین تین پھیرے اور آخر کو رات کا رہنا بیمار اور طبیب کا تعلق اور پھر جنسیۃ ملاقاۃ سے اُنس ہوا اُنس سے الفۃ اُلفۃ سے محبۃ۔ اُٹھان تو آزادی کا بھی اس ملک کی لڑکیوں میں کسی سے کچھ دبا ہوا نہ تھا لیکن میری تو اچھی خاصی پوری عورۃ تھی۔ اس کے ڈیل ڈول سے اپنے اوپر قیاس کر کے عورتیں اس کو جانچتی تھیں کہ کچھ نہ ہوگی تو دو تین بچوں کی ماں ہوگی اسی دھوکے میں ایک دن آزادی نے میری سے کہا آپ، اپنے بچوں کو ہمارے یہاں کبھی نہیں لاتیں؟ ہمارا جی اُن کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔ میری (مسکرا کر) میرا ابھی بیاہ بھی نہیں ہوا میں صرف نام کی میری (مریم) ہوں[ل] - کیا سمجھیں؟ آزادی - کیا آپ اُن عورتوں میں ہیں جو آپ لوگوں میں بیاہ نہیں کرتیں؟ اور جن کا تذکرہ ایک دن آپ نے کیا تھا۔ میری - نہیں - میں نن نہیں ہوں اور نن ہونا پسند

[ل] اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت مریم کے بلا شوہر حضرۃ عیسیٰ پیدا ہوئے تھے ۱۲

بچوں نے ایک ہی ساتھ کہا — "اُوں ہوں چار پیسے کی گڑیا شیلو کو ایک ہی پیسے میں کیوں دے رہے ہو دادا؟ ہمیں بھی دو"
بوڑھے نے شیلو کو گود میں اٹھا کر پوچھا — "تیرے باپ کہاں گئے بیٹی؟"
شیلو نے احتیاط سے گڑیا اپنے کُرتے میں چھپاتے ہوئے کہا — "ماں کہتی ہیں، اپنے مالک کے ہاں گئے"
بوڑھے نے بچی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا — "شیلو تو میری بیٹی ہے"
شیلو نے بوڑھے کی داڑھی سے کھیلتے ہوئے کہا — "ہاں تمہاری بیٹی تو ہوں ہی دادا۔ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو —؟"
بوڑھے نے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا "یوں ہی —"
اس روز کے بعد وہ روز آتا۔ شیلو کو گود میں بٹھا کر کھلاتا اور دو چار کھلونے دیکر چلا جاتا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی شیلو کی عمر بھی بڑھ رہی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح دوڑ کر اپنے دادا سے لپٹتی نہ تھی۔ بلکہ اپنے دروازے ہی پر کھڑی ہوئی مسکرا کر پکارتی — "دادا! ادھر آؤ" بوڑھا اپنی بیٹی کی محبت بھری پکاریں کھو کر وہیں بیٹھ جاتا۔ شیلو پڑوس کے بچوں کے لئے کھلونے خریدتی۔ اور دادا اپنی پسند کے مطابق اُسے نئی چوڑیاں پہنا جاتے۔
ایک دن بوڑھے نے گاؤں میں کچھ چہل پہل دیکھی۔ آہستہ آہستہ شیلو کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ خوب سجا ہوا تھا۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے خوشی سے اچھل رہے تھے۔ گھر میں عورتوں کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر بوڑھا اپنی آواز لگانا بھول گیا۔ شیلو کے دروازے کی سج دھج دیکھ دیکھ کر اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے آواز لگائی —— "واہ ری واہ چڑیا۔ جن کے ہو گئے کھلیا۔ وہی لیں گے چڑیا" اس نے کئی بار آواز دی مگر شیلو دروازے پر نہ آئی۔ بوڑھے نے دروازے کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھ کر ایک بار پھر آواز لگائی۔ شیلو کی ایک سہیلی نے دروازے سے جھانک کر کہا "دادا! آج شیلو کا بیاہ ہے۔ اسے بیاہ کی چوڑیاں پہنائی ہیں۔ آنگن میں بیٹھی ہوتی ہے"
بوڑھا شیلو کی شادی کی بات سنکر کانپ گیا۔ اس کے دل میں ایک دھکا سا لگا۔ وہ سوچنے لگا آج میری بیٹی مجھ سے چھن رہی ہے۔
بوڑھا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس لڑکی کے ساتھ اندر گیا اور آنگن میں بیٹھ کر چوڑیاں کھولیں۔ دو عورتوں کے ساتھ شیلو سامنے آئی۔ بوڑھے نے سرخ ساری میں چھپا ہوا اس کا حسین مگر اداس چہرہ دیکھا۔ شیلو نے بھی دادا کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ دھیرے دھیرے آ کر اُن کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کی گوری گوری کلائیوں میں دادا نے گہرے سبز رنگ کی چوڑیاں پہنائیں۔ پھر دو سنگار دان شیلو کے ہاتھ میں دیکر گلوگیر آواز سے —— "بیٹی اپنے دادا کی یہ حقیر پیشکش قبول کرو۔ خدا تمہیں خوش و خرم رکھیں ...."
بوڑھے کی آنکھوں سے گرم آنسوؤں کی دو بوندیں گر کر سنگار دان کے شیشے پر آ رہیں ——
شیلو نے اپنے دادا کی پیشکش کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگائی۔ بوڑھا لڑکھڑاتے پیروں سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔
رات کو بڑی دھوم سے بارات آئی۔ دوسرے روز اپنے بانکے سجیلے شوہر کے ساتھ شیلو سسرال چلی گئی۔

حسب معمول دوپہر کو بوڑھا گاؤں میں آیا۔ اس کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ ہر بچے کی صورت میں اپنی شیلو کو تلاش کر رہا تھا لیکن اس کی بس نگاہیں تھک کر رہ گئیں۔
وہ ہر روز گاؤں میں آتا۔ لیکن کھویا کھویا سا رہتا۔ اور شیلو کے دروازے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا چپ چاپ چلا جاتا۔
تین مہینے کے بعد شیلو سسرال سے واپس آئی اور اپنے دروازے پر کھڑی دادا کی راہ دیکھ رہی تھی۔ حسب معمول آج بھی بوڑھا آیا۔ شیلو نے دیکھا تو لپٹ گئی۔ دادا دیوار کے سہارے وہیں بیٹھ گئے۔ شیلو نے پکارا —— "دادا!"
اس نے پر محبت نگاہوں سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ پھر مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اس دلنواز منظر کو ہمیشہ کے لئے آنکھوں میں چھپا لینا چاہتا ہو!
شیلو نے بیقرار ہو کر پھر پکارا —— "دادا او دادا!" لیکن دادا نے آنکھ نہ کھولی۔ شیلو از خود رفتہ سی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اور بار بار بوڑھے کی داڑھی چومنے لگی۔

شیر محمد اختر

فطرت کی آواز

تہذیب اپنی معراج پر ہے۔ سائنس کی ترقی پر خود عقل انسانی حیران ہے۔ علم بڑھتا جا رہا ہے۔ فلسفہ اپنی موشگافیاں کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ سب لوگ فطرت کی آواز کی طرف کان نہیں دھرتے۔ اس سے بے خبر ہیں۔ بے خبر رہنا چاہتے ہیں۔

ایک کارخانے کو لیجئے۔ ہزاروں انسان پسینے سے شرابور آگ کے سامنے کھڑے لوہا کوٹ رہے ہیں۔ زندگی کی حقیقت اس سے زیادہ کہاں تلخ مل سکتی ہے۔ دوزخ کا نقشہ اور کہاں میسر آتا ہے۔ مگر اس ساری مخلوق میں ایک عورت کا گزر جانا معجزہ سے کم نہیں۔ جھلسے ہوئے چہرے مسکرا اٹھتے ہیں۔ تپتے ہوئے بدن سرد معلوم ہوتے ہیں۔ جھکی ہوئی کمریں یکایک سیدھی ہو جاتی ہیں۔ دوزخ میں جنت کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ فطرت اپنی آواز کی پکار سن رہی ہوتی ہے۔

اب اور آگے بڑھئے۔ فلسفہ دانوں کی مجلس گرم ہے۔ بال کی کھال اتاری جا رہی ہے۔ خیالات کی دنیا میں خشک بحثیں جاری ہیں۔ سننے والے حیران ہیں۔ کیا یہی زندگی ہے جس پر ساری دنیا مرتی ہے۔ مگر اس فضا میں ایک نقرئی اور شیریں آواز ساری محفل کا رنگ بدل دے گی۔ بوڑھے فلسفیوں کے چہرے تمتما اٹھیں گے۔ ان کی عینکیں درست ہو جائیں گی —— ایسا ہوتا ہے!

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ انقلاب کیوں؟ سوچئے یہی نا کہ زندگی کی تلخ حقیقت روح کو مردہ کر دیتی ہے۔ جنس کا خیال اس میں دوبارہ زندگی ڈال دیتا ہے۔ یہ عین فطرت ہے۔ بچوں کو دیکھئے۔ ایک بچہ دوسرے سے محبت کرتا ہے۔ اس سے جدا نہیں ہوتا۔ ان کی محبت کا تجزیہ کیجئے۔ ان ننھے اور معصوم بچوں کی تہ میں یہی فطری جذبہ جنس کار فرما ہے۔ اس سے چھٹکارا نہیں۔ رگوں کے دوڑتے ہوئے خون سے نفرت کرنا زندگی کو جھٹلانا ہے۔

مذہب اور سماج کا ظلم بڑھتے بڑھتے اس حالت تک پہنچ چکا ہے کہ اب اس فطرت کی آواز کا نکلنا بھی بند کیا گیا ہے۔ مذہب اور حکومت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ مذہب فتوے لگاتا ہے اور حکومت تعزیر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں برس کے قیود کا اثر ابھی تک ہمارے ذہنوں پر ہے۔ اس آزاد خیالی کے زمانے میں بھی ہم آزادی سے اس آواز کو نہیں نکال سکتے۔ اس کے متعلق مذہب اور حکومت کا فتویٰ موجود ہے۔ فحاشی کتنی ستم ظریفی ہے کہ معبدوں کے در و دیوار پر جنسی جذبات کا اظہار اشاریت میں موجود ہے۔ ان اعضا کی پرستش تک ہوتی ہے۔ جس کا نام لینا اور تحریر میں لانا قانونی گرفت میں آتا ہے۔ مگر اس کے جواز کے لئے قانون میں استثنےٰ موجود ہے۔ مذہب کے نام سے کتنا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

موجودہ تہذیب شعور پر ایک بوجھ ہے۔ جس سے انسان دبے جا رہے ہیں۔ مگر اس دباؤ سے نجات دینے کے لئے جنس کی فطری آواز ہے۔ سائنس نے انسانیت کو مشین کے پھندے میں جکڑ دیا ہے۔ اب وہ زمانہ قدیم کی سادگی کہاں۔ فطری آواز رنگین مگر سخت قیود میں بند ہے۔ اخلاق کا نام لیکر اس آواز کو بند کر دیا جاتا ہے لیکن یہ بھی دسے ذرا راستہ ملا، وہ بجلی سے زیادہ تیزی سے زندگی میں دوڑنے لگتی ہے۔ اس نئی زندگی کے اظہار کو اخلاق اور تہذیب فحاشی کا نام دیتے ہیں۔

جنس ایک ساز ہے جس کے تاروں پر صدیوں کا زنگ لگ رہا ہے۔ ان زنگ آلود تاروں کی آواز اتنی شیریں نہیں۔ اس میں آواز کیا تصور۔ زنگ دور کیجئے پھر دیکھئے کہ آواز کتنی شیریں سنائی دے گی۔

اس زنگ کو کون دور کرے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس کا جواب مذہب تو یہی دیگا کہ یہ جذبہ حیوانیت ہے۔ اسے اور دباؤ۔ قانون فحش کہکر رستہ روک دیگا۔ سائنس کی نظر میں یہ بے حقیقت سی چیز ہے۔ جارج برنارڈ شا کیسے لطف کی بات کہتا ہے "پادری ہمیشہ خود بخود گھس آتا ہے اور وہ زور دیتا ہے کہ جنس کے معاملے میں اسے حکم (AUTHORITY) مانا جائے —— پوپ سارے یورپ کا پادری ہے اور وہ زور دار الفاظ میں ... گفتگو کرتا ہے۔ میں تو کبھی ایسے معاملات میں اس سے کہوں گا کہ وہ دخل دے۔ ہاں اگر پوپ کی سب سے بڑی خاصہ عورت آئے تو میں اسے معاملات دونگا

کہ جنسی موضوع پر بات چیت کرے۔ میں کہوں گا یہ ہے وہ انسان جو پیشہ ورانہ طور پر جنس کو سمجھتا ہے۔ اس کے گزر اوقات کا سہارا اسی پر ہے۔ اس لئے وہ اس معاملہ میں غلط نہیں ہو سکتا ــــــ ہاں اس کے دوسرے درجہ پر میں خود ہوں تمثیل نگار۔"

انہوں نے تمثیل نگار کہہ کر خود نمائی نہیں کی۔ بلکہ حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ فطرت انسانی کو سمجھنے والا ادیب ہی جنس کے بارے میں جان سکتا ہے۔ وہ عدلیہ کے دیوانے کے دل و دماغ کے اندر جھانک لیتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس جھانک کے نظارے کو صفحۂ قرطاس پر اُلٹ دے۔ تصاویر اور وہ بت جو معبد خانوں میں ہیں اس لئے قابل گرفت نہیں کہ ان کے گرد مذہبی ماحول کا ہالہ بنایا جا چکا ہے اور ان کو دیکھ کر جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے۔ لیکن الفاظ میں کونسا جادو ہے جو پڑھنے والے کے سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ سیدھی تصویر تو معصوم مگر الفاظ کی اشاریت گردن زدنی۔ بات در اصل یہ ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن فحش پسند ضرور ہوتا ہے۔ وہ اشاروں کو اپنے ذوق کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اس کا مریض دماغ اس سے تحریک حاصل کرتا ہے۔ ورنہ مذہبی کتابوں میں جن باتوں کا ذکر ہے اس کا لاکھواں حصہ بھی ہمارے ادب میں نہیں ہے۔

صدیوں کا پیدا شدہ سماج اور مذہب کی بندشوں میں ہم پھنسے ہوئے ہیں۔ اس کا اٹھایا جانا موجودہ زندگی میں بالکل نہ ممکن ہوگا۔ تمام قیود کا یکسر اٹھایا جانا مضر ثابت ہوگا۔ تعمیر کے لئے تخریب لازمی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اس ظلم اور استبداد کے خلاف جو جنس کے معاملہ میں برتا جاتا ہے علم بلند کریں۔ پھر آہستہ آہستہ ایسا انتظام کیا جائے جس میں یہ فطری جذبہ نشو و نما پائے اور اپنی صحت مندانہ ڈگر پر گامزن ہو۔ مذہب اذیت پرستی سکھاتا ہے جو ایک مرض ہے۔ اس کا مریض سماج کے لئے تباہ کن نقصان پہنچائیگا۔

مہذب لوگ کلچر کے خواب دیکھتے ہیں۔ مگر ان کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ زمانۂ جہالت کی طرف لوٹ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم معصومیت اور گناہ، آسودگی اور یاس میں اس کشمکش کو دیکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں تجزیۂ نفسی کی تحقیقات سے پوری توقع ہے کہ وہ کلچر اور جنسی رجحانات کے مابین ایک صحیح راستہ معلوم کرنے کی سعی کریں گی۔

تہذیب کے ارتقا میں جبلت کا اہم حصہ ہے۔ اس سے شخصیت اور انفرادیت کی تخلیق ہوتی ہے۔ انسانی برتاؤ میں جبلت ایک بجلی کی رو کا کام دیتی جہاں یہ فائدہ مند ہے۔ وہاں اس کی ذرا سی بے احتیاطی تباہی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ مگر اس بجلی کو کس حد تک آزاد چھوڑ دیا جائے؟ اس کے لئے پہلی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ ہمیں جبلت اور اپنی شخصیت کا امتزاج اس طرح کرنا چاہئے تاکہ ہمارے اندر دباؤ کی جو کشمکش ہوتی ہے۔ وہ دور ہو جائے۔ سب سے اہم جبلت جنس ہے۔ اس سے ہم جس قدر اتحاد رکھیں گے۔ اسی قدر ہمارے برتاؤ پر اس کا اثر ہوگا۔ اس پر جبر کرنا اپنی ہلاکت مول لینا ہے۔

سائنس دان حقائق کو پسند کرتا ہے۔ مثلاً سقراط اور ارسطو، شعرا حسن کو محبت کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی فطرت کی آواز کی تکمیل کریں۔ سائنس دان کی ہی نہیں بلکہ فلاسفر اور شعرا کی طرح بنیں تاکہ ہماری زندگی خشک حقائق کے ساتھ ساتھ رنگین بھی ہو۔ یہ رنگینی ہی فطرت کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ جسے روک کر انسانی ارتقا پر ظلم کیا جاتا ہے سماج کے مظالم کا زیادہ شکار عورت ہی رہی ہے۔ اب اس کا رد عمل شروع ہے۔ اس رد عمل کو روک کر آپ نیک کام نہیں کرتے بلکہ ایک مرض کا علاج کرنے کی بجائے دوسرا ناسور پیدا کرتے ہیں۔ ہم مل کر جنت بنا سکتے ہیں۔ آپ نے حوا کو بند کر دیا۔ آدم پر قیود لگا دیں۔ جنت جہنم بنتی گئی اور صدیاں بیتتی جا رہی ہیں۔ ہم علم میں بڑھتے جا رہے ہیں۔ ترقی کر رہے ہیں۔

جنس ایک ایسی آگ ہے جو ہمیشہ روشن رہتی ہے اور جسکو کوئی بجھا نہیں سکتا۔ اس سے ڈرنا غلطی ہے۔ یہ جلاتی نہیں بلکہ جلا کرتی ہے۔ اس آگ میں پڑ کر انسان اور زیادہ چمکتا ہے۔ ذہنی اور روحانی بیماریوں کا شکار ساری دنیا ہو رہی ہے۔ ان سب کی تہہ میں کرید کر جب دیکھا گیا۔ تو فطرت کی آواز دبی ہوئی ملی۔ زندگی کے ساز کے زنگ آلود تار سارے نغمے کو برباد کر رہے تھے۔ یہی نکات تھے جنہوں نے جنت ارضی کو رنگین بنانا تھا۔

ادب نے جنس کے معاملے میں قدم اٹھایا ہے۔ تجزیۂ نفس نے نفسی گہرائیوں کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا ہے۔ عورت اس کھیل میں پیش پیش ہے۔ وہ جذبات سے کھیلتی رہی ہے۔ اسمیں اگر وہ کہیں بہک جائے تو اس میں اس کا قصور نہیں۔ یہ سماجی پابندیوں کا رد عمل ہوگا۔ اسی طرح وہ جو ان جسم کیلئے جنس شجر ممنوع تھا۔ اس کا پھل کھانا گناہ کر دیا گیا۔ آپ لاکھ اسے روکیں مگر ایسا ضرور ہوگا۔ یہ فطرت کی آواز ہے۔ جو دب سکتی ہے۔ مگر بند نہیں کیا جا سکتی۔

سیّد ضمیر جعفری

محسوسات

شب کی مغموم سی، ویران سی، تنہائی میں
دن کے آلام کا تڑپایا ہُوا، گھبرایا ہُوا
تلخیٔ گردشِ ایام کا سہمایا ہُوا
اپنے ویران سے بستر پہ نڈھال اور غمگیں
نیند کی سعی تو کرتا ہوں پہ نیند آتی نہیں
ہاں مگر دن کے حوادث کی بھیانک زنجیر
ذہن میں میرے اُبھر آتی ہے مثلِ تصویر
ہائے اے تلخیٔ اندوہِ گراں بارِ معاش
خود ہتھیلی پہ لئے پھرتا ہوں خودداری کی لاش
آہ! حاکم کی خوشامد! یہ ثنا آرائی!
دب گئی فطرتِ بیباک کی ہر سچائی
جس کو سچ کہتا ہے کوئی اُسے سچ کہتا ہُوں
مجھ کو چُپ رہنے کی تاکید ہے، چُپ رہتا ہُوں
زہر کو دیکھ کے بھی پینے پہ مجبور ہُوں میں
یہ بھی جینا ہے کہ یُوں جینے پہ مجبور ہُوں میں
اپنے ویران سے بستر پہ نڈھال اور غمگیں
نیند کی سعی تو کرتا ہوں پہ نیند آتی نہیں
ہاں مگر دن کے حوادث کی بھیانک زنجیر
ذہن میں میرے اُبھر آتی ہے مثلِ تصویر
اور اِک نرم سِسکتی ہوئی آوازِ ضمیر
توڑ دیتی ہے دل و رُوح میں احساسِ حقیر
شب کی مغموم سی، ویران سی تنہائی میں

ڈی پی در

جواب الجواب

میرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ترقی پسند شاعری بدترین ادبی اور اخلاقی جرم ہے۔ اس شاعری کو ادبی جرم کہنا تو شاید مرزا صاحب کے خیالات کے مطابق صحیح ہو مگر اسے اخلاقی جرم بھی کہنا ان کے نظریۂ شاعری کے مطابق کسی طرح مناسب نہیں ہوتا خود مرزا صاحب کا ادبی اخلاق مندرجہ ذیل منقولات سے ظاہر ہوتا ہے فرماتے ہیں

(۱) "یہ شاعری شاعری نہیں بکواس ہے۔"

(۲) "کثافت اور گندگی میں آلودہ کرنا۔"

(۳) "ان کو سمجھانے کی کوشش ہی پاگل پن ہے۔"

(۴) "عفونت میں بسا ہوا اور غلاظت میں تھڑا ہوا جھلسا۔"

(۵) "لیت پت۔"

(۶) "نجاست میں لوٹنے کی دعوت۔"

(۷) "پیشہ وری میں نکمے۔"

(۸) "جاہل اور بے حس۔"

(۹) "کاہلی اور سفاہت کی بنا پر شُد بُد۔"

(۱۰) "بغض و حسد و کینہ کے زیر اثر شاعر بن بیٹھے۔"

(۱۱) "بھنگ گھونٹنے سے زیادہ وقعت رکھتی ہے۔"

(۱۲) "مزدوری کسانوں کی دلالی وغیرہ وغیرہ۔" اور اس پر مرزا صاحب کو یہ شکایت ہے کہ ترقی پسند شاعروں میں جذبۂ انتقام و نفرت کارفرما ہے۔ نہ جانے مرزا صاحب اپنے ان الفاظ کو کس طرح محبت اور پریم پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ لیکن مرزا صاحب کی گالیاں اُن کے دلائل سے اچھی ہیں اور ہمیں عادت ہے کہ ہمیں جو گالی دے۔ اُسے حافظ کا یہ شعر سنا دیا کرتے ہیں ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی   جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعل شکر خا را

غالباً یہ ان گالیوں کی طفیل ہے کہ مرزا صاحب کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ کہتے ہیں۔ اور اپنے بیانات کے تناقض کو نظر انداز فرماتے ہیں۔

مرزا صاحب نے شاعری کا صحیح مقصد یوں متعین کیا ہے کہ انسان دن بھر کی مصروفیت اور تھکن کے بعد اپنی فرصت کے لمحے اس طرح صرف کر سکتا اور ایسے ماحول میں پہنچ سکتا ہے۔ جہاں دُنیا کے مکروہات سے تھوڑی دیر کے لئے نجات پا جائے۔ اور وہ سکون و راحت میسر ہو سکے۔ دل و دماغ کو جس کی ضرورت تھی۔ اور مرزا صاحب کو یہ شکایت ہے کہ "ادب برائے زندگی" یہ نعمت بخشنے سے قطعاً قاصر ہے۔ کیونکہ اپنی بہترین صورت میں بھی اُسی کشاکش کا آئینہ ہے جس کا عملاً سامنا ہوتا ہے۔ گویا مرزا صاحب شاعری کو زندگی اور عمل سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور ان کا تمام غصہ ترقی پسندوں سے بر صرف اس لئے ہے کہ ترقی پسند لوگ ادب کو زندگی کا ایک حصہ اور اس کا آئینہ دار سمجھتے ہیں لیکن اس کا کیا علاج۔ کیونکہ یہ محض ترقی پسندوں کا ہی عقیدہ نہیں ہے۔ اگر مرزا صاحب کو اعتراض نہ ہو تو میں ایک [illegible] قرآن شریف کی آیت نقل کر دوں۔

ترجمہ۔ شعراء کی باتوں پر عمل کرنے والے گمراہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ شعراء جو کہتے ہیں۔ وہ کرتے نہیں۔ اور مختلف وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں مگر وہ شاعر جو

جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔"

اب اس آیت پر مرزا صاحب کی تنقید سن لیجئے۔ مرزا صاحب ایک بزرگ کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں کہ "میرا خیال تھا کہ شاعر کی شہرت [illegible] اس کے کلام کی خوبی اور حسن قبول پر ہے مگر اب معلوم ہوا کہ شاعر جب تک [illegible] اس کا کلام ہمارے نزدیک عزت کا مستحق نہیں۔ کاش فاضل تقادا ایک ہی [illegible] محسن انسانیت شاعر کا نام لیتے جو ابراہیم بن ادہم کی طرح بنی آدم کا خادم بنکر خدا کا برگزیدہ بندہ بن گیا" مرزا صاحب نے گویا قرآن کریم کی آیت کا جواب دے دیا ہے۔ مگر اس مسئلہ پر قرآن پاک کی آیت شریفہ قابل قبول نہ ہو۔ تو ہم چند مشہور شعراء کے اقوال پیش کرتے ہیں۔ مولوی رومی کے کلام کے متعلق مشہور ہے کہ ۔

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآن در زبان پہلوی

اور ہمارے دور کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ شاعری کا جو نظریہ بار بار بیان کیا ہے وہ یہی ہے کہ ادب برائے زندگی ہے۔ ادب برائے ادب نہیں لیکن دوسروں کے اقوال شاید مرزا صاحب کیلئے مستند نہ ہوں۔ اس لئے خود انہی کے الفاظ اسی مضمون سے نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ "ٹھیک ہے کہ موجودات عالم میں کوئی شے اور کوئی واقعہ ایسا نہیں جو شاعری کے دائرہ عمل سے خارج ہو" اگر مرزا صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے تو مزدوروں اور کسانوں کے متعلق جو اشعار ہیں۔ انہیں مرزا صاحب "ولالی" کیوں کہتے ہیں۔ اگر ترقی پسند ادیب چند واقعات اور اشیا پر زیادہ زور دیتے ہیں تو اس میں بذات خود کون سے ایسے شاعرانہ نقائص ہیں کہ مرزا صاحب اس شاعری کو "پکرواس" کہتے ہیں۔ ان کو شکایت یہ ہے کہ بقول اُن کے ترقی پسند شاعر سوویٹ ذہنیت پھیلانا چاہتے ہیں۔ لیکن ستم یہ ہے کہ مرزا صاحب اسی مضمون میں ہندوستان کے ترقی پسندوں کو ذلیل کرنے کی خاطر سوویٹ ذہنیت کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "روس میں شاعروں اور ادیبوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ خیال کی دُنیا میں زندگی بسر نہ کرو۔ بلکہ میدان عمل میں کود کر حق اور انصاف کی حمایت اور جور و استبداد کی مخالفت پر کمر بستہ رہو" یہ لکھ کر مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ "ہندوستان کے شاعر محض قلم سے ہنگامہ کارزار گرم کرتے اور مرتے مارتے ہیں" تو مرزا صاحب کے مطابق اگر یہ ادیب جنگ آزادی میں کود پڑیں، قید و بند کی سختیاں جھیلیں، پھانسی کے تختوں پر لٹکیں، تو پھر ان کی شاعری قابل قدر ہوگی۔ ہمیں مرزا صاحب کے ساتھ بڑی حد تک اتفاق ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مرزا صاحب اس سے پہلے یہ فرما چکے ہیں کہ "شاعر کا نیک اور نیک عمل ہونا ضروری نہیں" اسی مضمون میں مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ "ترقی پسند شعراء کے اشعار اور ادب برائے ادب کے اشعار میں" مجھے چنداں فرق نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اگر ایک میں معشوق کی پلکیں صف آرا ہو کر بیچارے عاشق پر تیر باراں کرتی تھیں تو ادب برائے زندگی میں یہ خیالی جانباز مفروضی آلات حرب کا نشانہ ہیں" گویا جب تک شاعر کے اپنے جسم پر گولی نہ چلے اُسے حق نہیں کہ دوسرے زخمیوں کے جذبات کا اظہار کرے۔ یعنی اگر شیکسپئر شائلاک یہودی کے جذبات کا اظہار کرے تو وہ شاعر نہیں۔ جب تک وہ خود یہودی نہ ہو۔ خیر ادب برائے ادب کے اشعار اور ادب برائے زندگی کی نظموں میں چنداں فرق نہیں تو۔ تو پھر مرزا صاحب ایک گروہ کو کیوں کوستے ہیں اور دوسرے گروہ کی کیوں قصیدہ خوانی کرتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ اسی مضمون میں مرزا صاحب نے بڑی لمبی بحث کے بعد فرمایا ہے کہ "اگر ہمارا قول صحیح ہے تو ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں کوئی حد فاصل نہ رہی" ہم نے مان لیا کہ مرزا صاحب کا یہ قول صحیح ہے تو پھر اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ترقی پسند طعن و ملامت کے سزاوار نہیں۔

یہ لطافت بیانی غالباً اُس غصہ کا نتیجہ ہے۔ جس کا اس مضمون میں بار بار اظہار کیا گیا ہے۔ اسی غصہ کی وجہ سے مرزا صاحب نے ترقی پسندوں کی سیدھی سیدھی باتوں کو بھی غلط سمجھا۔ آپ فرماتے ہیں "ادب برائے زندگی کے مدعیوں کا بیان ہے کہ ان کے مخالفین زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں سے بھاگ کر ایک [illegible] میں پناہ لیتے ہیں۔" مرزا صاحب نے یہ سمجھا ہے کہ ترقی پسند لوگ اپنے مخالفین کو دُنیاوی حیثیت سے ناکام سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح ان پر طعنہ زن ہیں۔ [illegible] کا یہ مفہوم نہیں۔ ترقی پسند عام زندگی کی تلخی اور غلط سیاسی اور اقتصادی نظام کی بُرائی بیان کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ مرزا صاحب اور ان کے ہم خیال [illegible] میں ناکام ہیں۔ ترقی پسند تو وہی بات کہتے ہیں جسے مرزا صاحب نے اپنی زبان میں دُنیا کی "مکروہات" قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مکروہات [illegible] جا سکے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ "ان مکروہات کو بھول جاؤ، شاعر کا کام ہے کہ تھکے ماندوں کو دریا کے دوسرے کنارے [illegible] کر دیا جائے۔

تاکہ غلط بات کو شاید یں۔ مرزا صاحب کہتے ہیں۔ شاعر کا کام ہے کہ وہ لوگوں کو میٹھے سپنوں میں غرق کر دے۔ تھوڑی دیر کے لئے ! ——

مرزا صاحب کو اس پر بھی تو اعتراض نہیں۔ اسی مضمون میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اچھے شعرا نے ان خصوصیات کو جن کا اظہار جدِ حیات میں ہوتا ہے۔ کبھی نظر انداز نہیں کیا" —— یہاں "جدِ حیات" قابلِ غور ہے۔ اگر جدِ حیات کا اظہار اچھے شاعروں کا خاصہ ہے تو پھر مرزا صاحب ترقی پسندوں سے کیوں لڑائی کرتے ہیں۔ وہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ "بہتر ترقی پسند شاعری میں بھی یہ بُرائی ہے کہ وہ کشاکش کا آئینہ ہے"۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جدِ حیات کی آئینہ داری تو درست ہے۔ مگر کشاکش حیات کی آئینہ داری مکروہ ہے ! ——

مرزا صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کے پسندیدہ شاعر "راستی ذکر کاری" کی تعریف کر کے اُن کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ اور ظلم و طلم آزاری وغیرہ کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ مذمت اور رغبت مرزا صاحب کے الفاظ ہیں۔ مگر جب ترقی پسند شاعر ظلم کی مذمت کرتے ہیں اور لوگوں کو راستی کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ تو مرزا صاحب بگڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ایسا کام نہ کرو۔ اس پر ہماری اجارہ داری ہے۔ مرزا صاحب اس رغبت اور مذمت کے ساتھ "صناعت" کی شرط بھی لگاتے ہیں۔ مگر میری نظر سے آج تک کسی ترقی پسند نقاد کی کوئی ایسی تحریر نہیں گذری۔ جس میں یہ درج ہو کہ شاعری کے لئے "صناعت" غیر ضروری ہے۔

مرزا صاحب مضمون کے اخیر میں یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "سماج کا موجودہ نظام مکمل اور بے عیب نہیں ہے" اور یہ نظام اصلاح کا محتاج ہے۔ ترقی پسند ادیب اسی نامکمل اور باعیب نظام کی اصلاح چاہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے۔ مرزا صاحب کا خیال ہے کہ پھنسی مرہم پٹی سے درست ہو جائے۔ اور ترقی پسند کہتے ہیں کہ یہ پھنسی نہیں پھوڑا ہے۔ اور ایسا مہلک پھوڑا ہے کہ اگر اس کی جراحت نہ کی گئی تو یہ تمام انسانی نظام کو غارت اور برباد کر دیگا۔ پچھلے سالوں میں جنگِ عظیم کے بعد کئی چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوئیں اور اب ایک اور جنگ کا میدان گرم ہے۔ یہ ہیں اُس نظام کے نتائج جس کی مرزا صاحب حمایت کرنا چاہتے ہیں اور جسے ترقی پسند ختم کرنا چاہتے ہیں ۔

سمیع اللہ

دستِ تعاون

(ایک روسی افسانے کا عکس)

سینٹ پیٹرزبرگ، روس کا قدیم دارالحکومت ———

سڑک پر عوام کے ہجوم میں گولی چلنے کی آواز نے ایک کھلبلی سی مچادی۔ ایک جوان سال فوجی افسر کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والی اپنی جگہ پکڑی گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ یہ ایناؔ تھی ——— ایناؔ باغِ حسن کی ایک تیتری۔ اُس کا چہرہ چاند سا، گلاب سے رخسار، اور آنکھیں نیلی نیلی تھیں۔ وہ سراپا شباب تھی۔

وہ قاتل تھی ——— اُس کی اِس جراُت نے عوام کے ذہن کو ایک حیرانی میں ڈال دیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، رنگ برنگ کی افواہیں اڑنے لگیں لیکن حقیقت کہ وہ شخص جس نے اس کی عصمت کا موتی چرا کر اسے بربادی اور تباہی کے سمندر میں دھکیل دینے کی کوشش کی ہو، کسی طرح بھی قابلِ معافی نہ تھا۔

ملزم پر مقدمہ چلا۔ اس کا حسین چہرہ قانون کی گرفت کو ڈھیلا کرنے میں ناکام رہا۔ عدالت نے اُسے سو کوڑے لگانے کی سزا دی۔ اس عہد کا یہ دستور تھا کہ جس مجرم میں کوڑے کھانے کے باوجود زندگی باقی رہ جاتی۔ اُسے سائبیریا میں بھیج دیا جاتا تھا کہ مہذب دُنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ رہے۔ ایناؔ نے بڑے ضبط سے فیصلہ سُنا۔ ججوں نے حکم دیا کہ اگر کوڑے کھانے کے باوجود وہ زندہ رہی تو اسے "کوپال" کے زنداں میں بھیج دیا جائیگا۔ اسے اس بات کی آزادی دی گئی کہ وہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق شادی کرلے (کوپال) کا جیل خانہ ایک بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ وہاں کی دنیا صرف وحشت اپنے اندر لئے تھی۔ اس تک صرف پینے کیلئے پانی بھی بمشکل میسر آتا تھا۔ داروغہ جیل نے ایناؔ کے سب کپڑے اتار پھینکے ممکن تھا کہ صرف کوڑوں کے خوف ہی سے اس کی موت واقع ہو جاتی لیکن کسی سپاہی نے کوڑا اٹھانے پر اس نے حقارت اور نفرت کے جذبات حل میں لئے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ داروغہ چلایا "اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لو ہوشیار رہنا، آ نہ کھائے" دوسرے سپاہی نے اپنی آہنی مٹھیوں میں اس کے برف کی مانند سرد و سپید اور پھول کی مانند نرم و نازک ہاتھ دبا لئے۔

ایناؔ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی متوالی نگاہیں اس سپاہی کو مسحور کر چکی تھیں۔ وہ پچاس کوڑوں کی سزا برداشت کرنے پر تیار ہو گیا۔ داروغہ حیران تھا اس نے اس کی وجہ دریافت کی تو سپاہی نے جواب دیا کہ وہ اُسے اپنی شریکِ زندگی بنائے گا۔ ایک شوہر کی حیثیت سے وہ بیوی کی سزا میں حصہ لے سکتا ہے۔

سپاہی کا رنگ برہنہ ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف جکڑ دیئے گئے اور پاؤں سے بارہ بارہ سیر وزنی لوہے کے گولے باندھ دیئے گئے تاکہ وہ کوڑے کھاتے وقت حرکت نہ کر سکے۔ داروغہ نے اپنی پوری قوت سے کوڑا اٹھا کر اُس کی پیٹھ پر مارا اور کہا۔

"کیوں اب بھی آغوشِ حسن میں کھیلنے کی آرزو ہے۔ لو ابھی تمہارے اس جشن کا آغاز ہوا جاتا ہے"

سپاہی نے اپنے لب کاٹ لئے تاکہ منہ سے چیخ نہ نکل جائے۔ اس کے جسم پر کوڑوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ خون میں لت پت نظر آنے لگا۔ ایناؔ کا دل دہل گیا۔ گویا وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔ پچاس کوڑے لگ چکے۔ سپاہی بولا "دس اور ———"

ایناؔ کو اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دس کوڑے ختم ہونے پر اس نے دس اور کوڑوں کی تکلیف برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اب ایناؔ کیلئے صرف تیس کوڑے باقی تھے۔ بہادر سپاہی نے اس لرزہ براندام مریض پیکر کی طرف نگاہیں اُٹھائیں اور مدھم آواز میں کہا "دس اور ———"

داروغہ دیوانہ وار اُسے کوڑے لگاتا گیا۔ تیس کوڑے کھانے کے بعد اُس کی طاقتِ گویائی بھی رخصت ہو گئی یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ آیا اسکی سانس چل رہی ہے یا نہیں۔ داروغہ بولا۔

"کیوں بہادر سپاہی، محبوبہ کی خاطر دس کوڑے اور کھاؤ گے؟"

اس نے اشارے سے رضامندی ظاہر کر دی۔ یکایک ایناؔ فوراً دونوں ہاتھ پھیلا کر اس خون میں تھڑی ہوئی زندہ لاش سے چمٹ گئی اور کہنے لگی "وہ دس کوڑوں کی سزا اب مجھے ملنا چاہیئے، میرے دیوتا ——— میرے مصیبت کے ساتھی ———

[illegible]

عمدہ کتابیں

صبحِ بہار، اختر شیرانی ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ آپ کے کلام میں ترنم، شیرینی اور کیف پایا جاتا ہے۔ لفظوں کا انتخاب بھی خوب کرتے ہیں۔ اور اکثر بہ نظم لکھتے ہیں۔ دل سے لکھتے ہیں۔ تازہ مجموعہ نظم۔ قیمت مجلد سنہری ۱۲ر

شعرستان، رسالہ "رومان" لاہور کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب، جس میں حضرت اختر شیرانی کی چیدہ چیدہ نظموں کے علاوہ محترمہ کنیز فاطمہ حیا، محترمہ حجاب بیگم ادا، چوہدری خوشی محمد ناظر، اسرار الحق مجاز، عبدالمجید حیرت، اختر اورینوی، بشیر ضیائی اور دوسرے کئی ایک عمدہ لکھنے والوں کا کلام شامل ہے۔ جلد اور ڈسٹ کور عمدہ۔ قیمت صرف عہ

ادب اور زندگی۔ پروفیسر مجنوں کے تازہ ترین مقالات کا مجموعہ جس میں تنقید کے جدید تصور اور اس کے نئے اصول و اسباب سے بحث کی گئی ہے اور پھر انہیں کی روشنی میں اردو شعر و ادب کے بعض اہم مسائل اور چند ممتاز تاریخی شخصیتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے۔ قیمت عہ

انتخاب الہلال، مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین کا انتخاب مجلد مطلا ع

مخزنِ اخلاق، اگر آپ اپنے گھر اور خاندان کو صحیح اخلاقی تربیت دینا اور دنیا اور آخرت میں سرفرو ہونا چاہتے ہیں۔ تو اس مقصد کے لئے "مخزنِ اخلاق" دنیا بھر میں واحد کتاب ہے۔ چھٹا ایڈیشن مجلد مطلا ۱۲ر

سنہ ۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں، مرتبہ حلقہ اربابِ ذوق، قیمت ۸ر

زندہ چین، جدید چینی کہانیوں کا شاندار مجموعہ، چینی جذبات کی ترجمانی عہ

منٹو کے افسانے، بڑے ساتھ پر افسانوں کا مجموعہ، جس میں سعادت حسن منٹو کے بام عروج پر پہنچانے والے افسانے شامل ہیں۔ قیمت مجلد ۱۲ر

ہمارا پنجاب، معاشرتی، تاریخی، تمدنی، سیاسی اور اقتصادی حالات کا دلکش مجموعہ ۱۲ر

آفتاب، اسلام اور اسلامی مفکرین کے متعلق بہترین مقالے عہ

شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک۔ (مرتبہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی)، عہ

پیاری زمین، پرل ایس بک کی شہرہ آفاق تصنیف کا ترجمہ از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ۱۲ر

جزیرہ سخنوراں۔ ایک لطیف طنز کے پیرائے میں اردو شاعری کے محاسن و معائب اور سخنوروں کی زندگی کے بعض دلچسپ پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ایک ناولٹ مصنفہ غلام عباس قیمت عہ

مکتبہ اردو لاہور

مکتبہ اُردو لاہور کی نئی مطبوعات

آہنگ۔ ترقی پسند حلقوں میں اسرار الحق مجاز کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام اردو شاعری کے موجودہ رجحانات کا بہترین ترجمان ہے۔ خیالی رومان حقیقی جذباتی اور انقلابی نظم کی قوت کے لئے آہنگ کا مطالعہ کیجئے۔ آہنگ کا پہلا ایڈیشن اشاعت کے فوراً بعد ختم ہو گیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن کافی ترمیم و اضافہ کے بعد شائع ہوا ہے۔ دیباچہ پروفیسر فیض احمد فیض نے لکھا ہے۔ کتاب نہایت خوبصورت طریق سے شائع کی گئی ہے۔ مجلد قیمت عہر

منظر پسِ منظر۔ مختار، ہندی ملک کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جن کے دم سے اردو کی داغ بیل منڈھے چڑھی۔ انہیں زندگی کا گہرا مشاہدہ ہے اور یہ مجموعہ ان کے افسانوں میں زندگی کی خارجی اور داخلی حقیقتوں کا فنکارانہ تجزیہ بیان ہے۔ ان کا مطالعہ دراصل زندگی کی الجھنوں اور خوبیوں پر نظر ڈالنا ہے۔ آپ ان میں زندگی کے مختلف منظر دیکھیں گے — رنگین اور پھیکے بھی — یہی نہیں بلکہ پس منظر آپ وہ سب کچھ پائیں گے۔ جسے زندگی اپنے دامن میں چھپائے رکھتی ہے۔ آپ اس کتاب کے مصنف کو زندگی کے قریب تر پائیں گے۔ مقبول ترین افسانہ نگار کے مقبول ترین افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت مجلد ۵ر

رفیق تنہائی۔ علی عباس حسینی کے رومانی افسانوں کا مجموعہ۔ حسینی کے افسانے اچھوتے پلاٹ، نادر و دلکش تشبیہات، متوازن مکالمات و سنجیدہ مزاح کا ایک حسین مجموعہ ہوتے ہیں اس پر ان کے نفسیاتی تجزیئے سونے پر سہاگے کا کام کرتے ہیں۔ حسینی ماہر فن افسانہ نگار ہیں۔ ان کے ہر افسانے میں زندگی ایک نئے زاویئے سے پیش کی جاتی ہے۔ حسینی کے افسانے بلا دھڑک یورپ کے بہترین افسانوں کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ قیمت عہ

آیات و نغمات۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے افکار کا تازہ مجموعہ جو اردو شاعری کے دور ارتقا کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آیات و نغمات میں شاعر انقلاب نے اپنے آپ کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ ان کی روح کا عکس ہے۔ ان کے نغمات میں اپنے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ آپ کے دل کے تاروں پر ارتعاش پیدا ہوگا۔ بہترین ایڈیشن خوبصورت مجلد

شبستانِ الم۔ زبیدہ سلطانہ کے افسانوں نے دنیائے اردو میں جو شہرت حاصل کی ہے۔ وہ پبلک سے پوشیدہ نہیں۔ شبستانِ الم آپ کے جدید ترین اور کامیاب افسانوں کا مجموعہ ہے۔ زبیدہ سلطانہ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "لمحاتِ رنگین" بہت مقبول ہو چکا ہے۔ مگر ہمارا دعویٰ ہے۔ کہ جدید مجموعہ نہ صرف ان کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ دنیائے افسانہ میں بھی ایک مستقل اضافہ۔ قیمت عہ

بگولے۔ احمد ندیم قاسمی کا نام اور کام محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کے اشعار اور مختصر افسانے اردو ادب کے اس دورِ جدید میں ایک معزز مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جو اصحاب ان کے نام سے واقف نہیں۔ ان کی معلومات ناقص ہیں۔ جو ادیب ان کی عظمت کا منکر ہے۔ اس کا ادبی ذوق مکمل نہیں۔ ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر

احمد ندیم قاسمی کی زبان صاف ستھری ہے۔ اور فنی نقطۂ نظر سے ان کے افسانے قابلِ قدر ہیں۔ "ہمایوں" لاہور

احمد ندیم قاسمی کا شاعرانہ طرز تحریر ان کے افسانوں میں بدرجہ غایت نمایاں ہے۔ "ادبی دنیا" لاہور

بگولے میں قاسمی کے بیس منتخب افسانے شامل ہیں۔ خوبصورت جلد مع کور۔ قیمت عہ

ادبِ کثیف۔ حاجی لق لق، لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا۔ حضرت غالب نے مندرجہ بالا شعر میں لطافت اور کثافت کو لازم ملزوم قرار دیا ہے اور ملک کے مشہور مزاح نگار حاجی لق لق نے اس شعر کے مطابق اپنا ادبِ کثیف میں لطافت اور کثافت کو جمع کر کے ایک آئینہ بنا دیا ہے "ادبِ کثیف" کا ایک ایک جملہ غمگین سے غمگین شخص کے لب پر تبسم کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ اور پڑھنے والا بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے بلکہ یہ خیال کرنے لگتا ہے۔ کہ اگر یہ "ادبِ کثیف" ہے۔ تو "لطیف" کس بلا کا نام
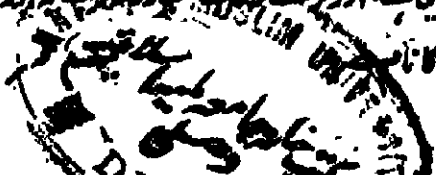
بھی نہیں کرتا کہ میری والدہ نے [illegible] مجکو نن بنانا چاہا تھا۔ مگر
[illegible] اس سے تا [illegible] سمجھے کیسے قدر ناراض بھی مری ہوں تو بھی
والدہ کے وقت کی ایک بہت پرانی لکھنؤ کی رہنے والی آیا ہی اُس نے مجکو دودھ پلایا اور
اُس نے مجکو پالا اور کھلایا اب بہت ضعیف ہوگئی ہی۔ اور [illegible] اُس کی پنشن کردی ہی۔
اس نے اپنی جوانی میں کہیں نن لوگوں کی نوکری کی تھی اور اُن کے حال سے خوب واقف
تھی۔ اس کو دودھ پلانے اور پالنے کی وجہ سے میرے ساتھ ایک خاص طرح کی محبت تھی
اور اب بھی ہی۔ میری عمر تو اُن دنوں چھوٹی تھی آیا نے مجکو سمجھا دیا تھا کہ مسی بابا ہیں نے
لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر کی اچھوتیوں کی اور نن لوگوں کی خوب خوب سیر دیکھی ہی تم نن بننے
کی حامی ہی نہ بھرنا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ماما[1] سے میں تم کو زیادہ چاہتی ہوں۔ مگر ماما کی عقل
کو مذہب نے چرلیا ہی وہ تم کو جیتے جی جہنم میں جھونکنا چاہتی ہیں۔ میں بہتیرا [illegible]
اور لڑوں گی بھی مگر میری اچھی مسی ایک اتنی سی بات میری بھی مان لو میں تمھارے ہی
فائدے اور آرام کے لئے کہتی ہوں۔ اس میں میرا اپنا مطلب کچھ بھی نہیں خدا نہ کرے
کہ تم نن بنو ورنہ میری آج کی بات یاد کرکے بہت پچھتاؤ گی۔ آیا نے جو اس اصرار سے کہا
اُس کی نصیحت میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں نے جی کو مضبوط کرکے اپنی والدہ سے دو ٹوک
بات کہہ دی۔ اُنھوں نے اپنے خیال کے مطابق بڑا ہی رنج کیا اور مریں تو وہ اپنی موت
سے مگر اس رنج نے ان کو جلد تحلیل کردیا۔ آزادی۔ تو کیا یہ میم صاحب آپ کی ما نہیں ہیں؟
میری۔ ما ہیں مگر سوتیلی۔ میری والدہ کے مرے بعد میرے باپ نے ان سے نکاح کرلیا۔
پہلے شوہر سے بھی ان کے بچے ہیں اور میرے والد سے بھی پانچ ہوچکے ہیں۔ خاندان
بہت بڑھ گیا ہی اور مذہب کی تسلی نہو تو میں کہہ سکتی ہوں کہ خوش حالی نہیں ہی۔ آزادی۔
سوتیلی ما آپ کو کیا چاہتی ہوں گی؟ میری۔ مجکو ان کے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ بحث نہیں
میرے لئے میری والدہ اس قدر چھوڑ مری ہیں کہ میں اس کی آمدنی سے بافراغت
زندگی بسر کرسکتی ہوں۔ آزادی۔ پادری صاحب کا آپ کے ساتھ کیا رنگ ہی؟ میری۔

[1] انگریزی میں ماں کو ماما کرکے پکارتے ہیں ۱۲

June 1942 Regd. L. No. 3521

رفیقِ تنہائی

علی عباس حسینی

رفیقِ تنہائی

علی عباس حسینی

قیمت

مکتبۂ اردو لاہور

ایڈیٹر
چودھری برکت علی
چودھری نذیر احمد
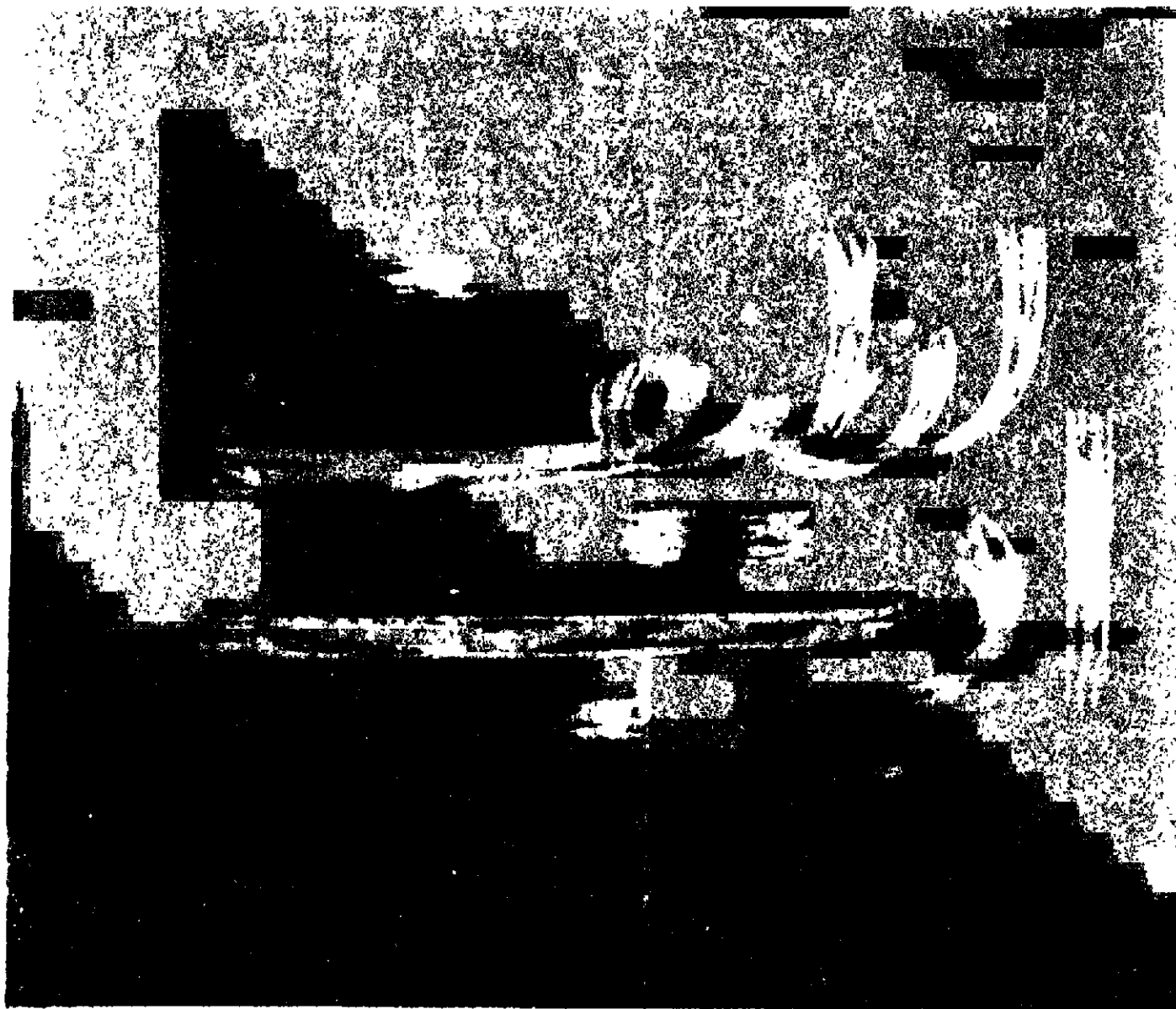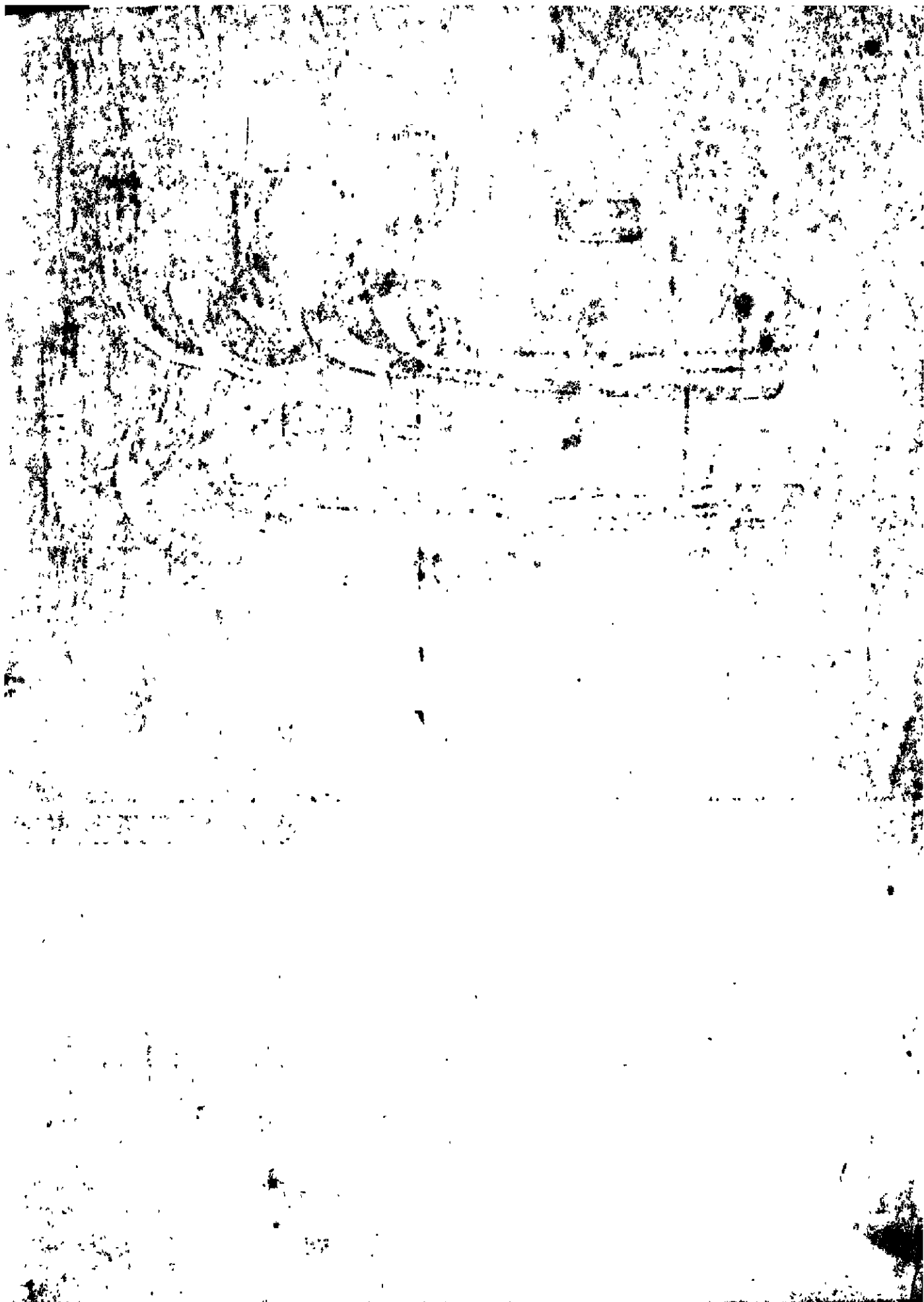
سالانہ چندہ
چار روپے چار آنہ

فی پرچہ
پانچ آنے

ادبِ لطیف لاہور

جلد ۱۶ ستمبر ۱۹۴۲ء شمارہ ۱

فہرس

ادارہ

اشارات

افسانہ نمبر آپ کی نظر سے گزرا۔ ملک کے طول و عرض سے جس قدر توصیفی مراسلات موصول ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے لئے حوصلہ افزا ہیں اور بلکہ یوں کہئے کہ جس قدر اُمیدیں ہم نے اس نمبر کو ترتیب دیتے وقت وابستہ کی تھیں۔ یہ نمبر اُن سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوا کاروباری اور ادبی اعتبار سے ہمیں مسرت ہے کہ افسانہ نمبر کے بیشتر افسانوں کو نقادانِ فن نے سال رواں کے بہترین افسانوں میں جگہ دی ہے لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسرت میں آپ ہمارے برابر کے حصہ دار ہیں۔

افسانہ نمبر کی کامیابی کا سہرا ہمارے قلمی معاونین کے سر پر ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم انہیں اس کے بعد مزید تکلیف نہیں دیں گے بلکہ بطور پیش بندی یہ گوش گزار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کہ وہ سالنامہ کے مضامین نظم و نثر کیلئے ابھی سے لکھنا شروع کردیں۔ تاکہ ہماری دوسری ادبی پیش کش اپنے تمام سابق ریکارڈوں کو مات کر دے۔ اور ہم کہہ سکیں۔ کہ ادبِ لطیف کی خدمات ادب اُردو کے لئے ناگزیر ہیں۔ ادبِ لطیف کا بار ہمارے قلمی معاونین کے کندھوں پر ہے۔ آج تک جس طرح اس فریضے کو ان حضرات نے سرانجام دیا ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ بھی وہ اس رفتار سے بلکہ اس سے کہیں زیادہ کاوش سے کام لیں گے اور ہمیں بار بار یاددہانی کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔

ہاں! او رمقدمے کے بارے میں اپیل ہائی کورٹ میں دائر ہو چکی ہے۔ نتیجہ ——— کون جانتا ہے۔

ہم اُن مصنفین سے نادم ہیں جن کو ہم ریویو کے لئے آئندہ شماروں کا انتظار کراتے آ رہے ہیں۔ اُن کی اطلاع کے لئے یہ کافی ہوگا کہ آئندہ شمارے سے ہم اس فرض سے سبکدوش ہونا شروع کر دیں گے۔

کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی اور دیگر صعوبتیں ہمارے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہو سکیں اور ہم مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا ادارہ نشر و اشاعت میں سرگرمی سے حصہ لے رہا ہے۔ چند نئی کتب جو عنقریب شائع ہو رہی ہیں:۔ **اَن کہی** ممتاز مفتی کی تیرہ کہانیوں کا مجموعہ **بلاسته**۔ اختر اورینوی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ۔ **طلوع و غروب**۔ احمد ندیم قاسمی کی بیس نئی کہانیوں کا مجموعہ۔

ابوالکلام آزاد۔ ابوالکلام کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن اس کے باوجود بہت کم لوگ ہندوستان کے اس مایۂ ناز فرزند کی زندگی کے حالات سے واقف ہیں۔ ابوالکلام کی شخصیت ہر اعتبار سے ہمہ گیر ہے۔ آپ بیک وقت ایک انقلابی مفکر، سیاستدان، بلند پایہ ادیب اور آتش بیان مقرر ہیں۔ اس کتاب میں آپ کی زندگی کے مکمل حالات افسانوی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ اُردو میں ابوالکلام پر اس انداز میں یہ پہلی کتاب ہے۔

———✕———

اطلاع { لاہور۔ مکتبہ اردو کی تمام مطبوعات اور ادبِ لطیف کا تازہ پرچہ مکتبہ جدید چوک انار کلی لاہور سے حاصل کر سکتے ہیں
کلکتہ۔ ادبِ لطیف کا تازہ پرچہ ایم عبدالحمید نیوز ایجنٹ ۱۹۵ اسی حرتلا سٹریٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

———✕———

اختر انصاری

غزلیات

کاش میں اس جہاں سے اُٹھ جاؤں! دکھ سے ہو جائے یہ جہان خالی
تم کہو تو یہاں سے اُٹھ جاؤں؟ میں بہت ہی بُرا ہوں اہلِ بزم

جوشِ مستی اگر سہارا دے
بزمِ بادہ کشاں سے اُٹھ جاؤں

دل کی اُمیدیں کیسے جیتی ہیں میں ہوں مایوس کوئی بتلاؤ
آہ! یہ تو مری چہیتی ہیں کیسے تج دوں میں آرزوں کو

چور ہیں نشے میں تصوّر کے
میری آنکھیں شراب پیتی ہیں!

قہر ہے اس جہان کا یہ دستور کوئی مختار ہے کوئی مجبور!
دل سی اک شے خدا نے کی تھی عطا وائے قسمت کہ بن گیا ناسُور!
غم سے خائف ہوں اور اسی باعث بھاگتا ہوں خوشی سے کوسوں دُور
کیوں نہ آنکھوں میں اشک بھر آئیں دل کی چوٹ اور اس قدر بھرپور!
آرزو اپنی چھب دکھائے تو! یاس کی سختیاں مجھے منظور
ہائے وہ دُکھ بھری نظر، یعنی ناتواں دل کی سعیِ نامشکور
لے چل اے لحنِ مطرب لے چل دُور، اس سرزمینِ غم سے دُور

دل میں پنہاں ہے یوں کوئی اختر
چاند جیسے گھٹا میں ہو مستور

حکیم ازرقی

سنہرے بال

کہانیاں سن سن کے لکھنے کا شوق ہوا اور لکھتے لکھتے مجھے فکشن کی کہانیاں نہیں جن کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر۔ بے جان واقعات لے بلکہ ہم تو عقلی واقعات کے قائل ہیں۔ اس طرح کہ پڑھنے والا ہر بار یہ سوچے کہ اب کیا ہوگا۔ الف لیلہ کی طرح کہ افسانے کی اس فسوں کاری نے شہرزاد کی جان بچالی ایک ہزار رات بادشاہ فرداً کا منتظر رہا۔ مگر مجھے عشق و محبت کے افسانوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ عشق تو کرنے کی چیز ہے۔ اپنے کرنے کی چیز۔ یہ نہیں کہ اوروں کی حرکتوں سے لذت اٹھاتے رہنا جیسے پیرس کے قہوہ خانوں میں بے مزہ زندگی بسر کرنے والے بڈھے جوان اور جوان بڈھے عشق کو ابتدا سے انجام تک دیکھتے ہیں۔ عشق ہی ہوا تا! — آپ اسے بدذوقی کہہ لیجئے۔ ملا رومی اسے عشق گندم کہتا ہے دلی کے داغ [illegible] کہتے ہیں

میں تو عقل اور خالص عقل کے عمل سے افسانہ سازی کرتا ہوں۔ اور خالص عقلی افسانوں میں سراغرسانی کا درجہ بہت بلند ہے۔ اردو میں یوں بھی اس قسم کے افسانوں کی کمی ہے۔ ہماری زندگی میں گرمی اور جذبہ زیادہ ہے۔ غور و فکر کم ہے۔ لیڈر حضرات تک کا یہ حال ہے۔ اہم سیاسی مسائل پر تقریر کرتے ہوئے داغ کے اشعار گنگنا دیتے ہیں۔ تو گویا ترقی پسندی بھی اسی میں ہے کہ عقلی افسانے لکھے جائیں اور پھر سراغرسانی عملی چیز بھی ہے جرائم کی تحقیق میں بہت مدد ملتی ہے

جب میں کالج میں تھا۔ تو میرے ساتھ کے کمرے میں ایک فلسفہ کا طالب علم رہتا تھا۔ اس کی اخلاقیات کی کتاب چوری ہو گئی۔ مجھے ان دنوں بھی سراغرسانی کے افسانوں کا بہت شوق تھا چنانچہ نیلی چھتری کے نام سے جو ناول چھپا ہے۔ اسکے متعلق میں نے ہی یہ دریافت کی تھی کہ یہ فرانسیسی کے ایک ناول کا سرقہ ہے۔ میری اس شہرت کی بنا پر اور محض اسلئے کہ کسی شک کی وجہ نہیں، وہ طالب علم میرے پاس آیا اور کہا کہ بھائی کھوج لگاؤ۔ میں نے فوراً کہا کہ یہ کسی عربی کے طالب علم کی حرکت ہے۔ اور وہ ضرور داڑھی رکھتا ہوگا۔ اس قسم کا ایک ہی شخص ہمارے ہوسٹل میں تھا۔ چنانچہ اسکے کمرے سے وہ کتاب برآمد ہوئی۔ ہم نے اس کی رپورٹ نہ کی اور علاج کے طور پر اسکی داڑھی منڈوا دی اور اب وہ شخص ایک معتبر افسر ہے۔ اور چوری کی لت سے شفا پا گیا ہے۔ میرا استدلال واضح تھا عربی کا تعلق مذہب سے ہے اور مذہب کا اخلاقیات سے اور داڑھی مذہب سے عملی انہماک کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا اخلاقیات کی کتاب کا چور یقیناً کوئی خشک صورت والا بزرگ ہے۔

افسانے لکھنے سے میری شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ اس شہرت کی وجہ سے ایک دن صبح سویرے جب میں اپنے بیٹھنے کے کمرے میں غور و فکر میں مشغول تھا مسز طارق تشریف لے آئیں۔ ان کے آنے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ایک نوجوان حسین اور قبول صورت عورت تنہا میرے کمرے میں کس وجہ سے آ سکتی ہے؟ میرا سراغرساں دماغ کام کرنے لگا۔

(۱) میری ذاتی جنسی کشش کی وجہ سے؟ یہ میرا وہم نہیں۔ اسکے عملی ثبوت بھی ہیں۔ مگر مسز طارق اول تو شوہر رسیدہ ہیں اور پھر خاوند سے محبت رکھتی ہیں۔ عشقیہ شادی ہوئی تھی اور عشق میں اب تک غلو ہے۔ (دوم) پچھلے چھ مہینوں سے ہم ہمسائے ہیں۔ اور پچھلے بیس دن سے مسز طارق سے ملاقات نہیں ہوئی حالانکہ طارق سے روزانہ آمنا سامنا رہتا ہے۔ (سوم) مسز طارق کے چہرے پر اس قسم کی کشش کے آثار نہیں نہ آنکھوں میں چمک نہ خالص میں بیزاری نہ آستینوں میں بال زلف وغیرہ وغیرہ۔ اور چہرہ کچھ زرد تھا۔

(ب) قرض لینے کے لئے ؟ - مگر وہ تو یہ خوشحال لوگ ہیں اور پھر طارق کو خود مانگنے یا رقم کھرا ادھار لینے میں باک نہیں۔ مجھے تو کم لینے کے لئے گو مگو ہوتی ہے
(ج) اپنے دستخطوں کی البم میں میرا نام لکھوانے کے لئے ؟ تو مسز طارق پہلے ہی یہ کر چکی ہیں۔
(د) گپ بازی کے لئے ؟ لیکن ابھی ان کی شادی میں اتنی جان ہے کہ میاں بیوی دوہرائے ہوئے قصے دوہرا لیتے ہیں۔
(ہ) دعوت پر بلانے کے لئے ؟ سو اسکے لئے خود آنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے تعلقات بھی نہیں اور میں دعوت انکار کرنے کا عادی نہیں۔

اسلئے ہو نہ ہو محض میری ادبی حیثیت کی وجہ سے وہ میرے ہاں آنا اپنی عزت افزائی سمجھ کر آئی ہیں۔ اور شاید میرے ناول کے بیلا پڑھ کر۔ یا شاید کسی سفارش کے لئے یا شاید ۔ ۔ ۔ ! — غرض یہ بے بے خیالات کا چرخہ چل رہا تھا۔ ایک طرح کی مسرت تھی کہ میں پہلے ان کے مداحوں سے آگاہ ہو جاتا ہوں کہ وہ پہلے اظہار کرتی ہیں۔ ادبی شہرت کا پلہ بھاری نظر آتا تھا۔ لیکن . . . .

آخر وہ ہی بولیں۔ آنکھیں نیچی کر کے بولیں: "میں سخت مصیبت میں ہوں!" —

اتنی خاموشی کے بعد بس اتنا سا فقرہ! — بجانے کیا مصیبت تھی ؟ —

صراحت کی کہ میرا خاوند مجھے دغا دے رہا ہے۔ بے وفائی کر رہا ہے! —

میرے منہ سے بے اختیار نکلا: "احمق کہیں کا!" — اس پر مسز طارق کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اور اس مغالطے سے میری ان کی شراکت ہو گئی۔ مغالطہ یہ ہوا کہ انہوں نے سمجھا کہ میں نے احمق کا خطاب ان کے خاوند کو دیا اور اس طرح ان کے حسد اور رقابت کو جائز سمجھا۔ حالانکہ میں نے اپنے آپ کو احمق کہا اسلئے کہ تیر قیاس سا غلط نکلا۔ دور کی باتیں سوچتا رہا اور سامنے کی بات نظر انداز کر دی۔ مسز طارق کا جذبۂ حسد ہمارے حلقے میں ضرب المثل تھا۔ شاید ہی کوئی دوست یا محض صورت آشنا ہو جو کبھی نہ کبھی ان کے شکوک کا راز داں نہ بنا ہو۔ طارق کی مزعومہ عشقبازیاں افسانہ بن چکی تھیں۔ مجھے چاہیئے تھا کہ مسز طارق کو اس طرح وارد ہوتے ہی سمجھ جاتا کہ کوئی نئی واردات ہوئی ہے۔

اب میں اپنے اس فقرے پر پچھتا رہا تھا اور مسز طارق بڑی تشکر مندی کے ساتھ مسکرا سی رہی تھیں۔ انہوں نے کہا خاوند نے بیوفائی کی۔ میں نے کہا احمق! گویا میرے خیال میں گویا میں نے ان کے خاوند کی نالائقی پر اپنی ناخوشنودی کا اظہار کیا اور خاوند کے خلاف بیوی کی حمایت کی — اس طرح مجھ سے ایک اور حماقت سرزد ہو گئی۔ اور اب میرے لئے پیچھے ہٹنا مشکل ہو گیا۔ مسز طارق کی تشکر مندی بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے آہ بھر کر کہا "میرے پاس اسکا ثبوت ہے"۔

میری سراغرسانی نے زور کیا اور میں نے بے اختیار ہو کر کہا "کیا ثبوت ہے؟" — یہ کہہ کر میں رکا۔ مگر اب رکنا بے سود تھا۔ جو پہلے مشکل تھا اب ناممکن ہو گیا۔ میں پوری طرح شریک سازش ہو گیا۔ اپنے دوست کے خلاف اسکی بیوی کے ساتھ! — حماقت در حماقت! —

مسز طارق سے میری بے تکلفی ترقی ہی کر رہی تھی۔ بالعموم مسز طارق ہی کہا کرتا تھا کبھی کبھی شمیم۔ اب وہ شمیم ہی رہ گئی۔

شمیم نے اپنے بیگ سے رومال نکالا اور رومال کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اسمیں ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو بیس لمبے بال تھے۔ سنہرے بال! —

میں دوڑ کر دوسرے کمرے میں گیا اور اپنی سراغرسانی والی خوردبین اٹھا لایا۔ سنہرے بال تھے۔ مگر ان کی جڑیں سیاہ تھیں۔ اور جڑ سے اوپر تھوڑے سے حصے تیل لگا ہوا تھا۔

میں نے کہا "نقلی سنہرے بال ہیں۔ پراکسائیڈ سے سنہرے کئے ہوئے ہیں اور زیادہ احتیاط نہیں کی ہوئی۔ بعد اپنی منڈوا رہی ہو رہا ہے"

شمیم بولی: "جی ہاں۔ نقلی عورت تو ہے۔ بدمعاش کہیں کی — اور اسکے بال جھڑ رہے ہیں"

میں نے کہا۔ عمر رسیدہ ہو گی۔

شمیم بولی کہ "نہیں طارق بوڑھی عورتوں سے معاملات نہیں کرتا۔ مگر عورت شناس نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس فاحشہ کو ٹنٹ کروا رہا ہے بال جھڑنے لگے ہیں

شاید بیماری سے نحیف ہو چکے تھے۔ بہانے طارق کے شانے پر سر رکھ دیا ہوا اور وہ احمق۔ آپ نے احمق کا لفظ خوب تجویز کیا۔ پہلے ہمدردی کے زور سے اور پھر اپنی عادت سے مجبور ہو کر ...... " یہ کہہ کر شمیم رُکی اور پھر بے اختیار ہو کر زار و قطار رونے لگی

میں سوچ رہا تھا کہ ذہانت کا نور کس طرح عقل کو روشن کر دیتا ہے۔ یہ تپِ محرقہ کا مریض خوب تھا۔ اس عورت کے نقلی سنہری بال، جوان عورت، نیا نیا تپِ محرقہ سے افاقہ۔ (نیا اس لئے کہ جوان عورت تپِ محرقہ سے جلد سنبھل جاتی ہے اور بال گرنے رک جاتے ہیں) اس عورت کی کھوج نکالنی ناممکن نہ ہوگی۔ اب میں شمیم کا پورا ہمدرد بن گیا۔ اسکے رونے سے میرا دل پسیج گیا۔ طارق نے سخت زیادتی کی۔ اسے اچھی طرح جھنجوڑنا چاہیئے۔ احمق کہیں کا! ــــ

شمیم میز پر سر رکھ کر میری سرخ آرام کرسی پہ دراز ہو گئی اور مطمئن سی ہو کر کہنے لگی "میں آپ کی مدد لینے کے لئے آئی تھی" میں نے کہا "میں حاضر ہوں" شمیم نے لمبی سانس لی اور کہا کہ میرے دل کو تسکین ہو رہی ہے آپ کی سراغرسانی ضرور کامیاب ہوگی۔ اور پھر ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو نہیں بلکہ بیسیوں ہچکیاں لی۔ میں بیٹھا بیٹھا ہچکیوں کے گچھے اس بدمعاش عورت کے سر سے الگ ہونگے۔ کوٹ بھی نیا تھا۔ کل ہی پہنا تھا۔ گندے بالوں سے خراب کر دیا؟

میں اس تندی سے گھبرا سا گیا اور اسرار کے وعدے سے پشیمان ہونے لگا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اور شمیم سب کچھ ایک ایک کر کے بتا کر چلی گئی۔

میں کمرے میں تنہا بیٹھا سوچنے لگا۔ کون کون سی عورتوں سے طارق کی واقفیت ہے؟ ۔ نو عورتوں کی فہرست بنی ــــ !

(۱) ـــ لیڈی ذ ...... عمر پچپن سال۔ لال لگاتی ہیں تو ہیں مگر اس قسم کی بڑھیا نہیں۔ مگر نام لکھ لینا چاہیئے۔ فہرست مکمل کرنے کے لئے۔

(۲) ـــ بیگم یوسف ـــ خاوند مصر میں فوجی ڈاکٹر بن کر گیا ہوا ہے۔ بالوں کی رنگت یاد نہیں مگر چونکہ ملی تھی اور تپِ محرقہ کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ یا شاید سرخی سے لپی ہوئی تھی۔ اس لئے معلوم نہ ہوا۔ غور طلب ہے! ــ

(۳) ـــ یاسمین ـــ نئی نئی گریجوایٹ ہیں۔ بال غالباً سیاہ ہیں۔ آنکھوں کی طرح ـــ تپِ محرقہ رہا ہے۔ طارق سے کیا ملتی۔ مگر تحقیقات ضروری ہے۔

(۴) ـــ کلاشیا ـــ نئی بیوہ ـــ غالباً سنہری بال۔ بھوری آنکھیں۔ فرانسیسی ماں۔ ہمارے حلقہ میں نووارد۔ رنگ زرد زرد ـــ بیوگی کی وجہ سے یا شاید اسے تپِ محرقہ رہا ہو ـــ بہت غور طلب! ــــ

(۵) مسز کوٹ مین ـــــ پٹھان عورت۔ فرنگی انجینئر سے شادی کی ہے۔ سنا ہے تپ رہا ہے۔ بال غالباً بھورے ہیں تحقیق طلب ہے! ــ

(۶) وزیرنی ـــ نیم پردہ۔ خاوند وزارت کے زور پر اوباشی کرتا ہے۔ ہر قسم کی اوباشی ـــ بالوں کی رنگت نامعلوم ـــ دیکھا جائیگا! ــــ

(۷) ـــ مہترانی ـــ فہرست مکمل کرنے کے لئے نام کا اندراج ضروری ہے۔

(۸) آپا خاتون ـــ تپِ محرقہ رہا ہے۔ بال غالباً سیاہ ہیں۔ سوشلسٹ بنتی ہیں۔ خاوند قید ہے۔ غور طلب! ــــ

(۹) مسز رحمت ـــ شاعر۔ مصنفہ۔ بالوں کی رنگت سیاہ بھی رہی ہے۔ بھوری بھی رہی ہے۔ ہفتے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ممکن ہے اب کیا رنگت ہو۔ یقیناً غور طلب! ــ [میرے حافظہ کی یہ خاص کمزوری ہے کہ مجھے بالوں کی رنگت یاد نہیں رہتی۔ بالوں کی طرف نظر ہی نہیں پڑتی۔ اسلئے ہر جگہ غالباً لکھ دیا]

اس فہرست میں سے کچھ نام تو فالتو ہی تھے۔ نمبر ایک اور نمبر سات میں نے کاٹ دیئے۔ نمبر تین بھی سوچ کر کاٹ دیا۔ نمبر چھ بھی ـــ باقی رہ گئے پانچ نام ـــ ان کے متعلق میں نے تفتیش شروع کرنے کا ارادہ کر لیا ـــ نمبر ۲۔ ۴۔ ۵۔ ۸۔ ۹ ــــ

پہلے نمبر ۲ کے ہاں پہنچا ـــ معلوم ہوا کہ پرسوں سے سسرال گئی ہوئی ہیں ـــ اور شاید کل واپس آئیں۔ الحمد ہوئیں۔ یہ قصہ تو کل کا ہے۔ پھر نمبر ۴ کے ہاں پہنچا۔ گفتگو بجائے غور طلب بن گیا۔ کلاشیا میرا اپنا ناول پڑھ رہی تھی۔ دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے طارق کا ذکر کیا۔ کہنے لگیں اچھا آدمی ہے۔ مگر بیوی حاسد قسم کی ہے۔ شاید اسی لئے ہفتے بھر سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کچھ معلوم ہوتا تھا۔ بڑی صاف گو اور زیرک عورت ہے

[illegible] ہی تھیں - آپکے پہلے [illegible] میں
[illegible] مہینے سے یہاں داخل یہاں آئی ہوئی ہوں - آزادی
[illegible] ہے آپکے بیاہ میں اتنی دیر ہوئی؟ میری - دیر تو کچھ بھی نہیں
[illegible] - ہم لوگ ایسی ہی عمر میں شادی کیا کرتے ہیں - اس سے پہلے شادی کر دینا
[illegible] اور گڑیا کی شادی کا سا کھیل ہی - آزادی - پھر اب میم صاحب کو تو ایسی کیا
دیر ہی تھی - پادری صاحب ہی کہیں بات ٹھہرا رہے ہوں گے - میری - شادی میری
اور بات ٹھہرائیں پادری صاحب؟ اس کے کیا معنی؟ اجی میں نے اپنی بات آپ
ٹھہرائی ہی - آپ کو ہم لوگوں کا دستور معلوم نہیں - ہم لوگوں کا قاعدہ یہ ہی کہ مرد اور
عورت ایک دوسرے کو پسند کرکے آپس میں رضامند ہو لیتے ہیں ماباپ اور دوسرے
بزرگوں کی اجازۃ ایک رسمی بات ہی - آزادی - تو کیا آپ لوگوں میں کواری لڑکیاں غیر مردوں
سے مل سکتی ہیں؟ میری - بے شک جیسے ہم اور آپ اور اگر ملیں نہیں تو ایک دوسرے
[illegible] ایک دوسرے کا اصل حال کیونکر معلوم ہو اور بے جانے بوجھے زندگی بھر کے لئے
کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا تو اندھیرے کا نشانہ ہے - لگا تو تیر نہیں تو تکا - آزادی
بھلا فرض کیجئے کہ آپ کسی شخص کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہو گئیں اور پادری صاحب
نے اجازۃ نہ دی تو آپ کیا کریں گی؟ میری - ایسا اتفاق شاذونادر واقع ہوتا ہی بلکہ نہیں
ہوتا آخر میں بھی تو عقل رکھتی ہوں ایسے شخص سے راہ و رسم ہی کیوں کرنے لگی جس کی
نسبت پادری صاحب کو یا کسی کو اعتراض کی گنجایش ہو - صورۃ - شکل - خاندان -
ذاتی لیاقت تندرستی - مزاج - عادۃ - آمدنی - پیشہ - یہی چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں -
تو کیا میں نہیں دیکھ سکتی؟ اور بیاہ تو مجکو کرنا پڑے گا میرا ہی دیکھنا مقدم ہی - مرد اور
عورۃ میں جب اس طرح کا تعلق ہونے کو ہوتا ہے تو گھر والوں سے چھپا نہیں رہتا اور
چھپانے کا دستور بھی نہیں - کثرۃ سے آنا جانا - خط و کتابۃ - تحفے تحائف بہت سی
باتیں ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہی کہ ایک دوسرے کی طرف مائل ہیں تو اگر گھر والوں
کو کچھ اعتراض ہوتا ہی وہ ملاقاۃ کو بڑھنے ہی نہیں دیتے - آزادی - آپ نے جہاں

میرے ناولوں سے بہت انہماک ہے مجھے اب تک نہ بتایا تھا کہ کتنی ہی دلچسپ عورت ہے۔ ملاقات کے قابل۔ دو گھنٹے بیٹھا رہا۔ اور وہاں انہیں کبھی بھی تپ محرقہ نہیں ہوا صحت مند عورت ہے۔ اور اب ذرا دبلی بھی جا رہی ہے۔ بال اوپر سے دیکھے واقعی سنہری ہیں مگر طارق کا اس سے کیا تعلق۔ یہ بھی الغلط ہوئیں!—

لنچ کا وقت ہو رہا تھا۔ اسلئے نمبر پانچ سے ملنا ملتوی کیا لنچ اور چائے کے درمیان سستانے کا وقت ہوتا ہے اور ذرا دیر سے جاؤ تو گویا چائے طلبی ہوئی! اسلئے مسز کوشیں کے ہاں شام کو پہنچا۔ میاں بیوی دونوں دورے پر گئے ہیں تین دن سے باہر ہیں۔ یہ بھی خارج از بحث ہوئیں۔

نمبر آٹھ کی کوٹھی پاس ہی تھی۔ وہاں پہنچا۔ جاتے ہی اُنہوں نے اپنی مخصوص حرکتیں شروع کر دیں۔ باہیں اٹھا کے گردن سکیڑ لی اور سینہ ابھار لیا تالیاں بجا پر دراز ہو کر کرسی لے کر باتیں شروع کر دیں۔ مگر بال کوئلے کی طرح سیاہ ہیں۔

اب رہ گئی مسز مہتہ — میاں صاحب تو رخصت تھے۔ مجھے دروازے پر لینے آئیں اور ہم ادیب یہ کہتے ہیں اور ہم ادیب جو ہوتے ہیں بار بار کہا جا رہا تھا۔ ایک نوبرفت رسیدہ کالج کا لڑکا بھی بیٹھا تھا اور بڑی قصیدہ خوان نگاہوں سے ٹکٹکی باندھے انہیں تک رہا تھا۔ نیا شکار تھا مگر دو تین دن کا معمول ضرور تھا۔ پہلی ملاقات بلکہ غرض طارق بری الذمہ تھا کیونکہ مسز مہتہ بیک وقت تعدد تعلقات کی مخالف ہیں۔ رومان میں توحید کی قائل ہیں۔ زبانی نہیں مہتہ کے پاس اسکے ثبوت ہیں۔ بال آجکل سیاہ ہیں!—

نو بجے میں گھر پہنچا۔ سارے دن کی بربادی پر اتنا افسوس نہ ہوتا اگر سراغرسانی میں ایسی ناکامی نہ ہوتی۔ سب دروازے بند پائے۔ اب کیا کیا جائے۔ سوچا کہ اپنے حلقے سے باہر تلاش کی جائے۔ مگر ہو تو کیونکر ہو— کہ نیچے لب طارق کے یار غار مسٹر گرجی کے ہاں پہنچا۔ اسلئے کہ طارق کی کل کی نقل و حرکت کے متعلق تفتیش کروں۔ کچھ گھٹیا سی حرکت معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب تو محض طارق کی بدکرداری کے خلاف اخلاقی احتجاج اور شمیم کی بےبسی سے ہمدردی کا سوال نہ تھا میری سراغرسانی کی قوتوں کا امتحان تھا۔ میرے لئے یہ چیلنج تھا۔ کتنے نقادوں نے کہا تھا کہ اگر پولیس میرے طرزِ استدلال اور طریق تفتیش کی رہنمائی میں کام کرے تو ملک جرائم سے پاک ہو جائے۔ یہ تو بالوں کی گتھی سلجھانا میرا فرض نہیں ادبی عزت و آبرو کا مسئلہ تھا!— ادب اور زندگی کا صحیح سنگم ہو رہا تھا!— مسٹر گرجی سے کوئی بات نکلوانا کچھ ایسا مشکل کام نہ تھا مگر وہ عشقیہ معاملات میں رازداری کا سختی سے قائل تھا لیکن نام چھپانے کی حد تک — میں نے چھوٹتے ہی کہا کیوں مسٹر گرجی تازہ خبر کیا ہے۔ مجھو اتنا کہنا ہی کافی ہوتا ہے مگر آج مسٹر گرجی کچھ بجھا بجھا سا تھا کہنے لگا بھائی گھر و بر کچھ نہیں — ہماری میم صاحب کلکتے گئی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا تو پھر تو مزے ہو گئے۔ میدان صاف ہے۔ گرجی نے کہا مگر تم کنوارا لوگ ٹھیک نہیں ہو۔ ہم جسکی نگاہ ہے تو بیوی کیسا تھا اور جب آنکھ اٹھاتا ہے تو بیوی کے سامنے۔ میں نے کہا مگر گرجی کیا تمہاری بیوی برا نہیں مناتی۔ گرجی بڑے تفخر سے ہنسا۔ تم کنوارا لوگ عورت کی جات کو نہیں سمجھتا۔ ہماری بیوی جب دیکھتی ہے کہ ہم اور عورت لوگ کو بھی خوش کر سکتا ہے تو وہ ہم سے اور زیادہ خوش ہوتی ہے۔ ہماری بیوی ہماری بیوی ہے۔ طارق کی بیوی نہیں ہے۔"

طارق کے نام سے میں چونکا اور چالاکی سے گفتگو کو اپنے ڈھب پر ڈھالنے کا ارادہ کیا۔ مگر گرجی جاری تھا۔ اسلئے میں یونہی سر ہلا کر چپ ہو رہا۔ کل طارق کی بیوی نے پھر کام خراب کیا۔ ہمارا کھانا وہیں تھا اور شروع ہو گئے انکے لاڈ پیار— تم نے کل اس عورت سے بات کی۔ کوشلیا سے مسکرائے۔ یا ہمیں سے ہنسی کی۔ اور ہم بیٹھے منہ تک رہے تھے اور بیوی کبھی طارق کے کاندھے پر سر رکھ کر رو رہی ہے اور کبھی منہ بنا رہی ہے۔ آخر ہم تنگ آ کر اٹھ آئے۔ اور رات کے نو بجے ہی گھر آ کر سو رہے۔"

بس میں یہی اطلاع چاہتا تھا۔ شمیم نے کل پھر فساد کیا اور طارق غصہ میں انتقام کی خاطر نو بجے کے بعد گھر سے باہر چلا گیا ہوگا اور پھر جو نقلی سنہری بالوں والی تپ محرقہ سے نکلی ہوئی عورت ملی ہوگی اس سے ہمدردی حاصل کی ہوگی۔ میں گرجی کو چلتی میں چھوڑ کر گھر آ گیا اور دو گھنٹوں طارق سے مکر و فریب و فتنہ کے ذریعے تفصیلات دریافت کرنے کی ٹھان لی اس اضطراب میں اچھی طرح نیند نہ آئی۔ صبح بھی سویرے کیساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ ابھی فراش نے بیٹھک کا کمرہ صاف نہ کیا تھا کہ میں نیچے اتر آیا۔ سورج کی کرنیں سبز آرام کرسی پر پڑ رہی تھیں۔ تو تکیہ پر کچھ بال الگ چمک رہے تھے عورت کے بال —— سنہری بال —— ایک دو نہیں پورے ایک درجن بال —— میں نے اپنی خورد بین اٹھائی۔ ان سنہرے بالوں کی جڑیں سیاہ تھیں۔ اور جڑ سے اوپر بھورے تھے۔ تیل لگا ہوا تھا!—

میں نے محض دل کی تسلی کیلئے طارق سے فون پر تصدیق کر لی کہ شمیم کو حال ہی میں نمونیہ کے بعد تپ محرقہ رہا تھا!—

اسرار الحق مجاز

افتاد

نہ ہم آہنگِ مسیحا نہ حریفِ جبریل
تیرا شاعر کہ ہے زندانیِ گیسوئے جمیل
کس کی آنکھوں میں یہ غلطاں ہے جوانی کی شراب
کھول دی آہ یہ کس نے مئے گلگوں کی سبیل
کس طرف جائے کہاں جائے بتا دو کوئی
زلفِ پُرخم کا گرفتار نگاہوں کا قتیل
عالمِ یاس میں کیا چیز ہے اک ساغرِ مے
دشتِ ظلمات میں جس طرح خضر کی قندیل
کتنی دشوار ہے پیرانِ حرم کی منزل
اِس طرف فتنۂ ابلیس، اُدھر ربِّ جلیل
اُف یہ طوفانِ نشاط اور مری طبعِ حزیں
آہ یہ شورشِ ناز اور میں مجروح و علیل
آہ وہ ہوش کا عالم وہ غموں کی یورش
اُف یہ مستی کہ ہے پھر ہوش میں آنے کی دلیل

شفیق الرحمٰن

زیرِ طبع کتاب شگوفے سے

دو تارے

میں نے دونوں بازو اوپر اٹھائے، پنجوں پر اچھلا اور سر
کے بل چھلانگ لگا دی۔ خنک ہوا کے جھونکوں میں سے گزرتا ہوا
دھم سے ٹھنڈے پانی میں گر پڑا، میری انگلیاں ندی کی تہ سے جا
لگیں۔ ترچھا ہو کر اچھلا اور پانی کی سطح پر آگیا، ادھر ادھر دیکھا، گلدستہ
اپنے ہی نہ چلتا تھا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ میں پورے زور سے
تیرنے لگا، ذرا سی دیر میں میں نے گلدستے کو دیکھ لیا۔ مجھ سے کافی
دور تھا۔ میں پتھروں سے بچتا ہوا بڑی تیزی سے تیرتا جا رہا تھا
میں نے لمبا سانس لے کر ایک غوطہ لگایا اور پھولوں کے بالکل
پاس جا پہنچا۔ یکایک مجھے پانی گرنے کا شور سنائی دیا۔ پھوار کے
بادل اٹھتے نظر آئے۔ آبشار نزدیک آگئی تھی۔ میں نے بے تحاشہ
تیرنا شروع کیا، اگر فوراً ہی گلدستہ نہ پکڑ لیا تو آبشار میں پھولوں
کی پتی پتی بکھر جائے گی۔ آخر ایک لمبے سے غوطے میں میں نے
گلدستے کو جا لیا۔ اور شپ سے پکڑ لیا۔ اور بڑی حفاظت سے
اسے کنارے تک لایا، پیچھے مڑ کر دیکھا تو جھرجھری آگئی، میں
کتنی دور چلا آیا تھا، ندی کے موڑ توڑ اور چیڑ کے درختوں نے
اس چٹان کو چھپا دیا تھا جہاں سے میں نے چھلانگ لگائی تھی۔
گول گول پتھروں کو پھلانگتا ہوا میں ندی کے کنارے کے ساتھ ساتھ جا
رہا تھا، مجھے وہ چٹان بھی نظر آگئی۔ میں حیران رہ گیا، اتنی بلندی
سے کس طرح کود گیا تھا، اب تو اگر کوشش بھی کروں تب بھی ہمت نہ پڑے
پھر اس چٹان پر ایک سفید سا دھبا بھی نظر آنے لگا، جو
بڑا ہوتا گیا۔ یہ پروین تھی۔ میں نے پھولوں کو پھر سے چُنا، بھلا
ایسے پھولوں کو کیونکر ضائع ہونے دیتا، مسکراتے ہوئے رنگ
برنگے معطر پھول، کتنے پیارے۔ بالکل پروین کی طرح!

چھوٹی پگڈنڈی کئی چکر کاٹ کر پہاڑ پر چڑھتی تھی، لیکن
اتنی دیر کون لگاتا۔ میں سیدھا چل دیا، لہلہاتے ہوئے سبزے کو
روندتا، خودرو پھول دار پودوں اور جھاڑیوں کو پھلانگتا اوپر چڑھ
رہا تھا۔ اب پروین اچھی طرح نظر آ رہی تھی۔ پہاڑوں کا چمکیلا سورج
ابھی ابھی جنگلوں سے طلوع ہوا تھا۔ سرو ہوائیں عجیب سی خوشبو
پھیلا رہی تھیں۔ نیلا نیلا آسمان، اُجلے اجلے بادل، لہراتی ہوئی
ٹہنیاں، اور چٹان پر کھڑی ہوئی پروین، سنہرے بالوں اور
گلابی چہرے والی۔ جس کی لٹیں ہوا کے جھونکوں سے کھیل رہی تھیں

اور جب میں اُس کے پاس پہنچ گیا۔ تو وہ کچھ مسکرائی
میں نے وہ گلدستہ اُسے واپس دے دیا، اور وہ پرفسوں آنکھیں
دیکھنے لگا۔ جن کی انتہاء گہرائی میں میری کائنات گم ہو جاتی تھی، کتنی
ملائمت تھی، اُن میں۔ چاند جیسی پیشانی پر کھیلتی ہوئی لٹیں، جو
بکھری ہوئی تھیں، میرا کتنا جی چاہ رہا تھا کہ انہیں سنوار دوں۔

وہ کتنی اچھی لگ رہی تھی، ایسے چمکیلے ماحول میں۔ میں نے
سوچا دنیا کتنا حسین مقام ہے مسرت ہی مسرت، رنگ برنگے حباب
مسکراتی ہوئی کلیاں، رقص کرتی ہوئی تتلیاں، لہلہاتا ہوا سبزہ اور
پھر دھڑکتا ہوا امنگوں بھرا دل۔

ہم واپس گھر چل دیے۔ ایسا عجیب اتفاق ہوا، صبح میں
تیرنے کے لئے آیا اور پھر پروین پھول چنتی ہوئی مل گئی۔

ہم دونوں چپ چاپ چل رہے تھے۔ آخر اُس نے کہا
کہ میں نے یونہی چند پھولوں کے لئے اتنی بلندی سے چھلانگ لگا دی

میں نے کہا کہ میں آیا بھی تو تیرنے کے لئے تھا۔

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

میں نے ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے سگریٹ نکالا۔ پوچھا

"سگریٹ سلگاؤں؟"

وہ بولی "ہاں"

"اور اگر جان کی اماں پاؤں تو پی بھی لوں"

"ہاں!" پھر خاموشی ——— میرا جی چاہتا تھا کہ یہ باتیں کرے

"دیکھیے یہ وادی کس قدر خوبصورت ہے، اور یہ اُودے پہاڑوں کی قطاریں یوں لگ رہی ہوں جیسے سمندر کی لہریں ہوں، اور وہ جھلمل جھلمل کرتے ہوئے چشمے —— جیسے چاندی کے تار اُن سفید سفید بادلوں نے آسمان میں کیسے عجیب گنبد بنا رکھے ہیں —— دیکھا —؟"

"جی!" وہ بولی۔

اب ہم ایک موڑ سے گزر رہے تھے۔

"اور وہ آبشار تو دیکھی ہی نہیں تم نے، کیسی دھندلی سی قوس قزح نے اُسے محیط کیا ہوا ہے، چاروں طرف پھوار پڑ رہی ہے یہ پانی اُن چمکیلی چوٹیوں سے آ رہا ہے، وہ اُجلی اُجلی چوٹیاں جن پہ برف جمی رہتی ہے۔ کبھی تم نے یہ پانی چکھا؟ — ایسا ٹھنڈا اور شیریں ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ اگر تم کہو تو کل وہاں چلیں؟"

"اچھا!"

اب ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے تھے، اُن کی کوٹھی پہلے آتی تھی میں چاہتا تھا کہ اس مختصر سے وقفے میں جس قدر باتیں کر سکوں کر جاؤں "خوب! تو ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے، وہ سامنے صنوبر کا اونچا درخت نظر آ رہا ہے۔ آج کیا پروگرام ہے؟ دوپہر کے بعد تمہارے ہاں سب سیر کو چلیں گے نا؟ — نہیں؟ — آپا دو سینڈوچ لائی ہیں، ایک میں لے چلوں گا، چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا شکار کریں گے۔ وہ جو اُس جھنڈ کے پیچھے جھیل ہے نا، وہاں چلیں گے وہاں ناشپاتیاں بھی ہیں اور سیب بھی، شاید سٹرابری بھی ہو، اور پھر گلدستہ تمہارے ہاتھ سے گر کر نیچے بہتے ہوئے میں جا پڑے اور میں تم سے چھلانگ لگا دوں"

"لیکن آج دوپہر کے بعد تو — آج تو ذرا دو — مجھے کچھ پڑھنا تھا"

میں کچھ چپ ہو گیا۔ اب اُن کا گھر آ گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا، "اچھا لائیے جناب ہمارا گلدستہ واپس کر دیجئے"۔ اور پھول واپس لے وہ چلی گئی، میں کھڑا دیکھتا رہا۔ یونہی بے وقوفوں کی طرح!

* * * * * * *

* * * * * * *

پھر ایک روز شام کو میں لمبی سیر سے واپس آ رہا تھا۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ سے بالکل تھکا ہوا۔ گلے میں کیمرہ، بندوق اور تھیلے اور نہ جانے کیا الا بلا۔ اب میں گھر کے نزدیک ہی تھا، صرف دو موڑ اور رہ گئے تھے، یکایک میری نگاہ چیڑ کے درخت کی چوٹی پر گئی۔ جہاں بڑی روشنی ہو رہی تھی، جیسے لوگ آرتی میں سے ایک بڑا چمکیلا تارا جھانک رہا تھا، میں وہیں ٹھٹک گیا، اور اُسے دیکھنے لگا، میرے افسردہ لبوں پر ایک مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر چکر کاٹ کر اوپر سے پہنچا، ہوا کے جھونکے تیز ہو گئے اور خنکی بڑھ گئی۔ موڑ سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک اور تارا چمک رہا تھا، اتنا ہی بڑا، اتنا ہی پیارا — پہلے تارے کے بالکل قریب۔

میں مسکراتا ہوا ایک پتھر پہ بیٹھ گیا، اور ان دو تاروں کو دیکھنے لگا، برفانی چوٹیوں سے خنک معطر ہوائیں آ رہی تھیں، چیڑ کے درختوں کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ پتے سرسرا رہے تھے۔

وسیع آسمان پر جہاں لاتعداد ننھے ننھے تارے چمک رہے تھے۔ وہاں وہ دو روشن تارے سب کو خیرہ کئے دیتے تھے، ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ، جیسے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہوں

اور فضا کی ظلمت میں دوش بدوش چل رہے ہوں

کتنی دیر تک میں اُنہیں دیکھتا رہا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ یہ تمام منظر پردیپ کو دکھلاؤں گا اور جب میں گھر پہنچا تو عجیب خیال مجھ پر سوار ہو گیا۔ میں ساری رات نہ سو سکا۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد اٹھتا اور باہر نکل کر دونوں تاروں کو دیکھتا کہ دونوں ساتھ ہی ہیں کہیں بچھڑ تو نہیں گئے۔ مگر وہ رات بھر ساتھ رہے۔ جب پچھلے پہر دھندلے ہوئے تب بھی اکٹھے، اور ساتھ ہی غائب ہو گئے۔ میرا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ صبح صبح میں مسرت سے مغلوب ہو کر دیر تک خود پھولوں پر لوٹتا رہا۔ اور چشموں میں نہاتا رہا۔

اگلی شام کو جب ہم سیر سے واپس آ رہے تھے تو میں نے پردیپ کو باتوں میں لگا دیا اور ہم دونوں پیچھے رہ گئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم اُسی موڑ پر پہنچے۔ جہاں تنگ سی سڑک کے ایک طرف تو اونچا پہاڑ تھا اور دوسری طرف وادی تھی۔ نیچے کہیں ہلکی ہلکی روشنی ٹمٹما جاتی اور پھر اندھیرا ہو جاتا۔ نیا نیا چاند آسمان میں تیر رہا تھا، کانپتا ہوا۔ چاروں طرف ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی، بالکل پھیکی سی۔

جہاں دوسرے تاروں کی چمک چاندنی میں ماند پڑ گئی تھی وہاں وہ دونوں تارے بالکل اُسی طرح چمک رہے تھے۔ بلکہ چاند سے بھی زیادہ روشن تھے

"وہ تارے دیکھ رہی ہو پردیپ؟" میں نے اشارہ کر کے کہا
وہ لمبی لمبی پلکیں اٹھائے اُنہیں دیکھنے لگی، میں اُس کے جگمگاتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیسے ساتھ ساتھ ہیں" میں نے کہا ———

"اور رات بھر میں اُنہیں دیکھتا رہا، یہ یونہی اکٹھے سفر کرتے رہے اور غروب بھی اکٹھے ہی ہوئے۔ مجھے یہی ڈر رہا کہ کہیں بچھڑ نہ جائیں ——— نظروں سے چھپ جائیں"

اور جب اُس نے بڑی بڑی کٹورے سی آنکھوں سے مجھے دیکھا تو میں بے چین ہو گیا۔ نہ جانے اُن نگاہوں میں کیا افسوں تھا، کیا پیغام تھا، وہ کیا کہنا چاہتی تھیں؟ مجھے وہ لمحے کس قدر خوشگوار معلوم ہوئے۔ اُس سیاہ دوپٹے کے حاشیے میں وہ گلابی چہرہ ایک خوابیدہ پھول سا لگ رہا تھا، جیسے ہوا کے جھونکوں نے ابھی جگایا ہو

میں نے سوچا زندگی کتنا حسین اور سہانا سپنا ہے۔ کس قدر ولولہ انگیز سپنا، جس میں تڑپ ہے، دھڑکنیں ہیں، نغمے ہیں۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تارے یونہی نہیں جھلملاتے۔ ان کے بھی اشارے ہیں، رمزیں ہیں۔ شبنم کلی سے چپکے چپکے کیا کہہ جاتی ہے؟ چاند سمندر کی لہروں سے رات بھر کیا باتیں کرتا رہتا ہے؟ کنول کے پھول ہوا سے کیا سرگوشیاں کرتے ہیں؟ یہ ایک راز ہے ——— بڑا پوشیدہ راز!

جب ہم واپس آ رہے تھے تو میں اُنہی تاروں کا ذکر کر رہا تھا
میں نے کہا "کہتے ہیں کہ ان تاروں کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق ہے"

"پتہ نہیں" وہ سرد مہری سے بولی۔ "ہوتا ہو گا"

وہ یک لخت گھبرا گئی، جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے ڈر جائے، اُس نے پھر میری جانب نہیں دیکھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا راستے میں بہت تھوڑی باتیں ہوئیں۔ اب تک میں سوچ رہا کہ اُس فوری تبدیلی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

* * * * * * *

* * * * * * *

ہمیں یہاں پہنچے عرصہ ہو گیا تھا۔ پندرہ بیس میل دور نیچے کہیں ایک سینما تھا، پہلے ایک مرتبہ وہاں جا چکے تھے۔ طے ہوا کہ وہاں چلا جائے اور جیسی بھی پکچر ہو دیکھی جائے۔ بزرگ حضرات میں سے چند ایک نے اختلاف کیا لیکن بعد میں وہ بھی مان گئے۔ میں نے اپنا سیاہ سوٹ نکالا، بو لگائی، اچھی طرح سے بال جمائے۔ اور ہلکی ہلکی خوشگوار خوشبو لگا کر تیار ہو گیا۔ لمبی سی فیملی کار میں ہم سب بیٹھ گئے، میں آگے بیٹھا تھا اور پردیپ پچھلی سیٹ پر۔ جب

ہم ایک اندھیرے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ تو میں نے سامنے لگا ہوا فلیش تیز کر دیا اب میں پروین کو دیکھ سکتا تھا اور وہ مجھے۔
مجھے پتہ نہیں کہ ہم کیسے کیسے نظاروں میں سے گزرے، کار میں کیا کیا لطیفے ہوئے، کیسی باتیں ہوتی رہیں، بس میں ٹکٹکی باندھے پروین کو دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے۔ لیکن ایک بات سے میں پریشان تھا، وہ مجھے دیکھتے نہ جانے کیوں چونک پڑتی اور جو نگاہیں نیچی کرتی تو میں تنگ ہی آ جاتا۔ پھر بالکل سمجھ میں نہ آیا۔ ہم تھیٹر پہنچے، وہاں پکچر تھی۔ "سنو وائٹ اینڈ سیون ڈوارفس" رنگ برنگا کارٹون۔ سب کے سب مسکرانے لگے۔ اس میں سنو وائٹ ایک ہی پیاری لڑکی تھی، اور سات چھوٹے مسخرے بونے تھے۔ پروین میرے ساتھ بیٹھی تھی، خوب مسکرا رہی تھی، یکایک مجھے کچھ سوجھی۔

میں نے آپا کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بولیں "چپ ۔ !"
پھر امی کے کان میں کہا۔ وہ بولیں "ہشت — !"
آخر میں نے پروین سے کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔ میں نے پوچھا "کہہ دوں؟"
بولی "کہہ دیجئے!"
میں نے زور سے کہا "ایک سنو وائٹ ہمارے ساتھ بھی ہے!" سب پوچھنے لگے "کون؟"
میں نے پروین کی طرف اشارہ کر دیا۔ ایک قہقہہ پڑا۔ اور وہ بیچاری شرما گئی۔
آپا بولیں "کس طرح بھلا؟"
میں نے آہستہ سے کہا "بالکل ویسی ہی گلابی اور خوبصورت سی لڑکی ہے، بھولی بھالی — اور — !" آپا نے مجھے بری طرح گھورا۔

میں نے پروین کے کان میں چپکے سے کہا "آج سے تم سنو وائٹ ہو، اور یہ حامد میاں، نصرت اور ننھی وغیرہ تمہارے سیون ڈوارفس ہیں۔" وہ کتنی مسرور تھی۔ کس قدر خوش تھی،

جب ہم واپس آنے لگے تو یکایک پروین کے ابا اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور مجھے پیچھے بیٹھنے کا موقع مل گیا۔
پروین کے ساتھ ایک ننھی منی بچی بیٹھی تھی، جس کا نام بہت پیارا سا تھا — نصرت جہاں، اس کے ریشم سے بالوں میں بڑی اچھی خوشبو لگی ہوئی تھی، اور ایک نیلا سا ربن لہرا رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان یہی گڑیا تھی۔
بڑی اچھی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی چادر پر ایک نور کا دریا موجیں مار رہا تھا۔ ہوا کے معطر اور خنک جھونکوں سے پروین کے بال پریشان ہو رہے تھے، اس کی لٹیں رہ رہ کر میرے چہرے کو چھو جاتیں اور میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے بال سنوار دوں۔ نصرت ٹکٹکی باندھے پروین کو دیکھ رہی تھی۔
"کیا دیکھ رہی ہو نصرت؟" میں نے اس کے کان میں پوچھا
"دیکھ رہی ہوں کہ آپا کتنی پیاری ہیں" وہ بولی۔ اور میں نے اس کے ننھے ننھے ہونٹ چوم لئے
جیسے میری نگاہوں کے سامنے بجلی کوند گئی۔ بھاگتی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں میں وہی دو چمکیلے تارے جھانک رہے تھے جن پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لیکن وہ دونوں اسی طرح دمک رہے تھے۔
"پروین! — وہ دیکھو دو تارے!"
وہ جیسے سرگوشی میں بولی "ہاں! دیکھ رہی ہوں"
"وہ بائیں طرف کا تارا تمہارا ہے اور دائیں طرف میرا" میں نے کہا۔ وہ میری بائیں طرف بیٹھی تھی
"ہاں!" وہ چپکے سے بولی۔
میں پروین کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں سوچنے لگا تم میری روح کی محبوب ہو۔ میری عزیز ترین شے، تم نے میرے تخیل، میری دنیا کو جگمگا دیا ہے، تم ہی سے تو میرا خیالی جنت آباد ہے، تم ہی تو میری تیرہ و تاریک زندگی میں ایک روشن ستارہ ہو۔

پتلے پتلے رسیلے ہونٹ، پنکھڑیاں جیسے، بڑی بڑی پرفسوں آنکھیں جن کی گہرائیوں میں میرے تصور کی دنیائیں آباد ہیں۔ جن کے اتھاہ سمندر میں جل پریاں ناچتی ہیں۔ گلاب کی کلیوں جیسی ملائم پلکیں، عجیب طرح سے سنواری ہوئی لٹیں — جیسے پریشان بھی ہوں اور بنائی بھی گئی ہوں۔

تب مجھے خیال آیا کہ خدایا میں کس قدر مسرور ہوں، میرا دل کہیں دھڑکتا دھڑکتا ٹھہر نہ جائے۔ اتنی مسرت میرے دل میں کیونکر سما سکے گی؟ میں یہ طوفان کس طرح برداشت کر سکوں گا؟

مجھے پتہ نہیں رہا کہ یہ دلفریب لمحات کیونکر ختم ہو گئے۔ ہم گھر پہنچ گئے۔ پیچھے ہماری کوٹھی تھی۔ سب کے سب وہیں ٹھہر گئے میں نے تہیہ کر لیا کہ ضرور آج پروین کو بتا دوں گا کہ مجھے اُس سے کس قدر محبت ہے۔

میں نے اُسے ساتھ لیا اور ہم دونوں اُن کی کوٹھی کی طرف چل دیئے۔ وہ ایک بڑی حسین چاندنی رات تھی۔ نہایت دلفریب سہانی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ اُس سادے لباس میں وہ اتنی پیاری لگ رہی تھی۔ کہ مجھ سے اچھی طرح دیکھا نہ جاتا تھا۔ ہم دونوں باغیچے میں سے گزرتے ہوئے گلاب کے تختوں میں سے گزرے، جہاں پھول، کلیاں، پتے سب سوئے پڑے تھے، پھر لمبے لمبے سایوں اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں میں سے گزرے ہمیں ننھی ننھی کلیوں نے چھپ چھپ کر دیکھا اُن کلیوں نے جنہیں ہوا کے جھونکوں نے جگا دیا تھا۔

تاروں کے جھرمٹ نے ہمیں اکٹھے چلتے دیکھا، چاند ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگا اور چاندنی کتنی گنا تیز ہو گئی

میں نے سوچا کہ اب پروین سے کہہ دوں۔ میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"ایک بات ہے پروین؟"

"کیا؟"

"وہ یہ ہے کہ میں ایک عرصے سے چاہتا تھا کہ کہہ دوں!"

"کہہ دیجئے۔"

"اور پھر کہہ دینا ہی تو اچھا ہے، بھلا چھپا نہ سکیا غلط۔ بات دراصل یہ ہے — کہ وہ — !"

"ہاں ہاں کہئے —" اور وہ مسکرانے لگی۔ میں گھبرا گیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں بڑی مدت سے کہنا چاہتا ہوں کہ — ؟"

"اب کہئے بھی!"

"یہی کہ — یہی کہ یہ تارے بہت چمکتے ہیں، اور پھر تارے بھی خدا نے خوب بنائے ہیں، اگر یہ نہ ہوں۔ تو رات کو بڑا اندھیرا رہا کرے۔"

اب اُن کی کوٹھی بالکل نزدیک آ گئی تھی۔ میں نے پھر ہمت کی — ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ جو کچھ کہنا ہے آپ بھی کہہ دو کیا بزدلی دکھا رہے ہو۔ میں نے گلا صاف کیا اور بولا۔

"نہیں تاروں کی بات نہیں ہے بات اور کچھ ہے، مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم بُرا نہ مان جاؤ۔ لیکن اب کوئی ڈر نہیں، اگر تمہیں بُرا لگتا ہے تو لگا کرے، میں ضرور کہوں گا — !"

"ہاں ہاں کہتے جائیے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"یہی کہ مجھے اتنے دنوں سے تم سے — یعنی مجھے سچ مچ تم سے — یعنی — !"

"ہاں ہاں!"

"مجھے تم سے — ایک شکایت ہے، یہی کہ تم اتنے سادے لباس کیوں پہنتی ہو جبکہ تمہارے پاس ایسے اچھے اچھے لباس ہیں"

وہ ہنس دی۔ اب ہم برآمدے میں پہنچ گئے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہرگز اُسے نہیں بتا سکتا۔ میں ایک بزدل اور بے وقوف لڑکا ہوں۔

ہم قدِ آدم آئینے کے سامنے سے گزرے۔ میں رُک گیا، اُسے بھی ٹھہرا لیا۔ ہم دونوں آئینے کے سامنے کھڑے تھے۔ پیچھے

کے ساتھ کھڑے ہو کر میں عجیب سی شان محسوس کر رہا تھا۔ یہ کتنی پیاری لڑکی ہے، میں بھی تنا برا نہیں، خاصا ہوں۔ بہت سوں سے اچھا ہی ہوں گا۔

کیا تو وہ کھڑی مسکرا رہی تھی اور کیا یک لخت بے چین سی ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا، اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ خدایا یہ کیا اسرار ہے؟ اس رویے میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ — جسے میں سمجھ نہیں سکتا۔ آخر یہ لڑکی کیا ظاہر کرتی ہے؟ یہ میرے ساتھ دفعتاً رنجیدہ کیوں ہو جاتی ہے؟ کس قدر پیچیدہ ہے یہ معمہ؟

یہ کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوا، ہر دفعہ یہی ہو رہا ہے، مسکراتے ہوئے چہرے پر یک لخت خوف کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ کہیں اسے مجھ سے نفرت تو نہیں؟ نہیں نہیں نفرت نہیں ہو سکتی، بھلا مجھ میں نفرت والی بات ہی کون سی ہے، اگر ہوتی تو یہ بتا دیتی، مگر بتاتی کس طرح؟ کیونکر کہہ دے کہ مجھے آپ اچھے نہیں لگتے یا مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنے دنوں سے ہم دونوں اکٹھے سیر کرتے ہیں، کھیلتے ہیں، گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ویسے یہ کبھی ایسی علامت ظاہر نہیں کرتی اور جب اس سے محبت کا اظہار کرنے لگوں۔ تو فوراً گھبرا جاتی ہے۔ اور گھبراتی بھی ہے کس قدر؟ یا یہ ہو گا کہ یہ مجھے صرف ایک رفیق سمجھتی ہے، ایک مخلص رفیق —— بس اس سے زیادہ کچھ نہیں، اپنی محبت کے قابل نہیں سمجھتی۔ میں ساری رات یہی سوچتا رہا۔ کئی بار اٹھا اٹھ کر میں نے تاروں کو دیکھا کہ کہیں بچھڑ تو نہیں گئے۔ مگر وہ بدستور اکٹھے مسکراتے ہوئے جا رہے تھے۔ میرے دل کو ڈھارس سی بندھ گئی۔

* * * * * *

دوسرے روز میں نے دیکھا کہ سامنے کی کوٹھی میں کچھ مزدور کام کر رہے ہیں۔ چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو ٹینس کا لان ٹھیک کیا جا رہا تھا، واشنیں لگائی جا رہی تھیں، میری سال [illegible] مہینوں سے ٹینس کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ جی میں آئی کہ ان لوگوں سے واقفیت پیدا کی جائے۔ ہماری اور ان کی کوٹھی کے درمیان ایک چھوٹا سا نالہ بہتا تھا، جس میں میں روز نہایا کرتا تھا۔ اُس کا پل آدھ میل پرے تھا۔ نوکروں نے بتایا کہ سامنے کوئی انگریز کرنل رہتے ہیں۔ اُن کی ایک لڑکی ہر روز تیرنے آیا کرتی ہے۔ مجھے یاد آ گیا۔ ایک انگریز لڑکی کو میں ہر روز نالے کے دوسرے کنارے پر تیرتے دیکھتا تھا۔ لیکن کبھی باتیں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

چند دنوں میں ہماری واقفیت ہو گئی، اُس نے میرے تیرنے کی تعریف کی، اور میں نے بھی یونہی الٹی سیدھی ہانک دی۔ ہم صبح اکٹھے تیرتے۔ لطیفے سناتے۔

وہ میری بڑی تعریفیں کیا کرتی۔ آپ بہت اچھا تیرتے ہیں آپ کا قد کتنا اچھا ہے، جسم کتنا خوبصورت ہے۔ بالکل ہیرو شمیمی جیسا، کبھی ہمارے ہاں بھی آئیے، امی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی، میں عموماً اُن سے آپ کا ذکر کیا کرتی ہوں۔ ہم لوگ تنہائی سے تنگ آ جاتے ہیں، ابا باہر گئے ہوئے ہیں، امی کسی سہیلی سے ملنے تین چار میل دور چلی جاتی ہیں، میں اکیلی گھبراتی ہوں۔ ہمارے ہاں پنگ پانگ بھی ہے اور ٹینس بھی۔ میں مووی کیمرے سے تصویریں اتارا کرتی ہوں۔ ہمارے ہاں رنگ برنگے خوبصورت پرندوں کے پنجرے بھرے ہوئے ہیں۔

ایک دن پروگرام بنا کہ دوپہر کو میرے تیرنے کی فلم اتاری جائے، وہ اپنا مووی کیمرہ ساتھ لے آئی۔ میں نے ایک اونچے پتھر سے چھلانگ لگائی۔ اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔

"مجھے آپ اُس پتھر پر لے چلیے —!" وہ ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے بولی جو نالے کے درمیان میں تھا۔

اُس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ میں جھجک کر پیچھے

جل گیا۔ لیکن پھر کتنا ہوا آگے بڑھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس لطیف بوجھ کو سنبھال لیا۔ اُس نے ایک بازو میری گردن میں ڈال دیا اور دوسرے سے پانی کے چھینٹے اُڑانے لگی۔

"ارے یہ تو بہت اچھا نہیں — وہ ٹھیک رہے گا" اُس نے ایک دور کے پتھر کی طرف اشارہ کیا

"وہاں روشنی بھی نہیں پڑ رہی اور وہاں سے تصویر بھی بہت اچھی آ سکے گی"

میں نے رُخ بدل دیا۔ ادھر چلنے لگا۔ آہستہ آہستہ اُس کا دوسرا بازو بھی میری گردن میں حمائل ہو گیا۔ اُس کا تپتا ہوا چہرہ میرے بالکل نزدیک آ گیا۔ اُس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں بولی

"آپ کے بازو کتنے مضبوط ہیں، سینہ کتنا چوڑا ہے۔ آپ ایک مکمل جسم کے مالک ہیں۔ بعض اوقات تو میں آپ کی حسین شخصیت سے اس قدر مرعوب ہو جاتی ہوں کہ بس!" میں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر دی۔

"مجھے ایسے لڑکے بہت اچھے لگتے ہیں آپ جیسے بے پروا اور خوش باش لیکن اتنا بے پرواہ بھی نہیں ہونا چاہیے"۔ وہ کھوئی سی گئی۔ اُس کی گردن ڈھلک گئی۔ آنکھیں مندنے لگیں، اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں تیزی سے پتھر تک پہنچا اور جلدی سے اُسے اتار دیا۔ وہ کچھ کھسیانی ہو گئی۔ لیکن جلد ہی سنبھل گئی اور مسکرانے لگی۔ اس کے بعد دیر تک وہ میری فلم اتارتی رہی۔

* * * * * * * * * *

* * * * * * * * * *

گھر میں پروین اور میرے متعلق دبی دبی زبان سے سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ دلیپ امی کو پروین بہت اچھی لگتی تھی۔ ابا کا پتہ نہیں، شاید وہ بھی ناپسند نہیں کرتے تھے۔ پروین کے والدین کا رجحان میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرا زیادہ وقت اُن کے ہاں ہی گزرتا۔ لیکن اس وسوسے نے جیسے میری امنگوں پر اوس ڈال دی۔ ہر وقت یہی وہم رہنے لگا کہ اگر پروین کو مجھ سے نفرت ہوئی تو۔

ایک صبح کو میں سیر کر کے واپس آ رہا تھا۔ باغ میں سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ پروین اور میری چھوٹی بہن نزہت بیٹھے تھے۔ پروین پھولوں کا گلدستہ بنا رہی تھی اور ننھی ساتھ بیٹھی تھی۔ جی میں آیا ان کی باتیں سنوں۔ کیا باتیں ہو رہی ہوں گی؟ میں دبے پاؤں بیلوں میں چھپ چھپا کر بالکل اُن کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔

ننھی بولی "تو اب آپ ہمارے ساتھ ہی رہا کریں گی نا؟"

"تمہارے ساتھ ہی تو رہتی ہوں"

"نہیں یوں نہیں — اب ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا کریں گی؟"

"ہمیشہ ہی تو رہتی ہوں تمہارے ساتھ — ننھی گڑیا۔"

"اوں! — میں پوچھتی ہوں آپ ہمارے ساتھ بیاہی جائیں گی — ہماری آپا بن کر؟"

پروین کا دمکتا ہوا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

"بتاؤ نا آپا" ننھی مچلنے لگی۔

"دیکھو نزہت کیسی رنگ برنگی کلیاں ہیں" پروین بولی۔

"نہیں ہمیں کلیاں نہیں چاہئیں، آپ بتائیے کہ چلیں گی ہمارے ساتھ یا نہیں؟"

"ارے نزہت! وہ دیکھو کیسی اچھی تتلی اڑی جا رہی ہے پکڑ لو تو جانیں" اور جب ننھی بیٹھی رہی تو پروین خود تتلی کے پیچھے بھاگ پڑی۔

سارے دن یہی سوچتا رہا کہ آخر پروین کو مجھ سے نفرت کیوں ہے۔

شام کو سیر سے واپس آتے ہوئے مجھے موقع مل گیا۔ اور میں نے پروین کو اپنے ساتھ ٹھہرا لیا۔ "آؤ جھیل تک چلیں!" میں نے کہا۔

"دیر تو نہیں ہو جائے گی؟"

"نہیں!"

ہم دونوں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر کتنا ترس آ رہا تھا۔ مجھے اس کا کتنا خیال ہے۔ اور یہ مجھے اتنا برا سمجھتی ہے۔

دور سے اودے پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا، پہاڑ کی چوٹی پر چیڑ کے درختوں کی قطاریں چمک رہی تھی۔ جیسے سنہری بنات لگی ہوئی ہو۔ آسمان شفق کی سرخی سے جگمگا رہا تھا۔ درختوں پر پرندوں کے غول کے غول اڑے جا رہے تھے۔

ہم دونوں چپ چاپ چل رہے تھے معطر ہواؤں کے جھونکے تیز ہونے لگے اور ہم اُس موڑ تک پہنچ گئے، میری نگاہیں آسمان کی جانب اُٹھ گئیں، دونوں تارے ابھی ابھی طلوع ہوئے تھے۔ میرا دل مسرت سے ناچنے لگا۔ میں نے پروین کو دیکھا، اور شاید نگاہوں میں اتنا کچھ کہہ گیا۔ کہ زبانی نہ کہہ سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ آج اس سے ساری بات پوچھونگا آج اس معمے کو حل کرکے جاؤنگا،

"تمہیں یہ تارے اچھے لگتے ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! بہت!!" وہ بولی۔

"ارے!" مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ "تارا ٹوٹا پروین!"

اُن میں سے ایک تارا ٹوٹا اور ایک نورانی لکیر بناتا ہوا غائب ہوگیا میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی سہم گئی تھی۔

"کون سا تارا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کون سا تھا"

میں نے بہتیرا یاد کرنے کی کوشش کی۔ مگر پتہ نہ چلا کہ کون سا تارا ٹوٹا تھا دہنا یا بایاں!

چیڑ کے درختوں کی نوکدار چوٹیوں پر صرف ایک روشن تارہ جگمگا رہا تھا، مجھے یوں لگا۔ جیسے اُس کی چمک بھی مدھم پڑتی جارہی ہو

جب ہم واپس آرہے تھے۔ تو جنگل میں سناٹا تھا۔

ایک دو روز تو میں کھویا کھویا رہا پھر سنبھل گیا لیکن جب سوچنے بیٹھتا تو گھنٹوں سوچتا رہتا، پروین کی بے رُخی دن بدن بڑھتی جارہی تھی، میری باتوں کا جواب سرد مہری سے دیتی، میرے ساتھ اداس ہو جاتی،

آخر وہی ہوا جو میرا دل مجھے کہا کرتا تھا، جس خیال سے میں پریشان ہو جاتا تھا، وہ حقیر سا اندیشہ جسے میں پیچھے چھوڑ جانا چاہتا تھا، آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور اتنا بھیانک ہو گیا کہ اُس نے مجھے ڈرا دیا۔

پروین کو مجھ سے نفرت تھی، شروع سے ہی نفرت تھی اور میں ہمیشہ اُسے غلط سمجھتا رہا۔

نفرت — اُکس قدر مکروہ لفظ ہے، اور محبت کے بعد تو اور بھی! پھر تو زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے ظلمت کی جھلکیاں دیکھیں، وہ بڑھتا ہوا اندھیرا مجھ پر چھا گیا۔ میں نے زندگی کی اُداس و تنہا پگڈنڈی کو دیکھا۔

اونچے اونچے ڈراؤنے درختوں سے گھری ہوئی جھیلوں کی سطح پر میں نے اداسی دیکھی، درختوں کے کانپتے ہوئے سائے دیکھے پتوں کی سرسراہٹ میں سرد آہیں سنیں۔ میں نے سوچا کہ پانی کی یہ سطح میری روح کی طرح ہے جس پر تاریکیاں منعکس ہیں۔ جس پر وحشتناک تاریکی قبضہ جماتی جا رہی ہے۔ میں نے تھرتھراتی ہوئی ٹہنیاں دیکھیں، بڑے بڑے اداس پھول دیکھے جو ٹہنیوں پہ جھکے ہوئے تھے تب مجھے پتہ چلا کہ دنیا کتنی غمگین جگہ ہے، یہاں مسرت کی اتنی سی رمق بھی تو نہیں ہے، آہیں ہیں، سسکیاں ہیں، رنج ہیں پھیکے پھیکے نظاروں میں دہشت ہے، بھیانک سی ویرانی ہے۔ میں چڑچڑا ہو گیا، سارا دن کمرے میں گزارنے لگا، ایک ایک کرکے تمام مشغلے ختم ہو گئے۔ رات کو جب کھڑکی میں بیٹھتا تو مجھے دو روشنیاں نظر آتیں ایک تو وہی تنہا تارا اور دوسری روشنی اُسی لڑکی لوسی کی کوٹھی میں نظر آتی۔ میں سوچنے لگتا کہ لوسی کی کوٹھی کی روشنی اُس تارے کے مقابلے میں کتنی پھیکی اور مدھم ہے۔

* * * * * * *

* * * * * * *

میں کھڑکی میں بیٹھا ایک پینٹنگ بنا رہا تھا، طرح طرح کے رنگ سامنے رکھے، منہمک بیٹھا تھا، دھڑام سے دروازہ کھلا اور

اپنی بات ٹھیرائی ہی پادری صاحب نے اس کو منظور کر لیا؟ [illegible]
امتحان بڑی نام وری کے ساتھ پاس کرتی رہی ہوں دو برس سے لوگ درخواست کر رہے
تھے میں نے کہا تھوڑے دن کی بات اَور رہ گئی ہی میں اپنی تعلیم کو ادھورا کیوں چھوڑوں
اب کوئی چھ مہینے ہوئے میری پڑھائی ختم ہوئی۔ میں اس خیال سے چلی آئی کہ باپ پاس
رہ کر شادی کروں گی تو مجکو ان سے صلاح لینے کا موقع ملے گا اور باپ کے دم کے سوا
دنیا مین میرا ہی بھی کون؟ جن لوگوں کو میرے ساتھ شادی کرنے کا خیال تھا ان میں
دو صاحب میرا آنا سن کر یہاں بھی آگئے ہین اور یہاں کے چند انگریزوں نے بھی
ایسی خواہش ظاہر کی۔ آخر میں نے چار مہینے خوب سوچ سمجھ کر ایک صاحب کو پسند
کیا ہی مگر ابھی تک ہامی نہیں بھری اور انکار بھی نہیں کیا بات کو اٹکا رکھا ہی۔ ان صاحب
مین اَور کچھ تو عیب نہیں۔ خاندان کے شریف ہین۔ لائق ہین۔ مزاج کے بھی ٹھنڈے
ہین۔ دل کے نیک ہیں۔ گو اس وقت صرف چار سو کے نوکر ہیں مگر ترقی کے سلسلے میں
ہیں۔ جوں جوں دن گزرین گے نمبر سے عہدہ بڑھتا جاے گا۔ مجکو ان کی ایک ہی بات کھٹکتی
ہی کہ بازی بدکر گھڑ دوڑ کی لت ہی جو ایک قسم کا جوا ہی۔ میں نے ان سے صاف صاف
کہہ دیا ہی کہ گھڑ دوڑ کا عہد کرو تو میں تم کو زبان دوں؟ ابھی تک نہ انھوں نے عہد کیا
نہ میں نے زبان دی اور نہ اپنے باپ کی منظوری حاصل کی۔ مگر ان کی طرف سے راہ ورسم
میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوئی۔ بے چارہ عجب کشمکش میں پڑا ہی۔ ادھر بچپن سے
گھڑ دوڑ کا عشق ادھر میری محبت۔ دیر سے معلوم ہوتا ہی کہ بات کا ہی پکا منھ سے
کہے گا تو اس کو ضرور پورا بھی کرے گا۔ ورنہ کیا مشکل تھا؟ کہنے کو کبھی کا کہہ چکا ہوتا لیکن
میں نے اس کے دل کو ٹٹول کر دیکھا تو میری جگہ بہت ہی میں ایسے تو گھڑ دوڑ سے
توبہ کیے پر کرے۔ اور فرض کیا کہ نہ بھی کرے تو میں زیادہ اصرار نہیں کروں گی
میں جانتی ہوں کہ شادی ہوئے پیچھے میں اس پر زیادہ دباؤ ڈال سکوں گی اور اس کو
میرا کہنا ماننا پڑے گا۔ آزادی۔ آپ نے مہر کا بھی فیصلہ کر لیا ہی؟ ہمارے یہاں تو مہر
کا بڑا جھگڑا رہتا ہی اور اکثر مہر کی وجہ سے لگی ہوئی باتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ مہری۔

سامنے سے دوڑتا چلا آیا۔ پیچھے پیچھے اور بچے تھے۔ ہاتھ میں کرکٹ کا بلا اور گیند تھی۔

"آ ہا! بھیا تصویر بنا رہے ہیں، کیسی رنگ برنگی تصویر ہے، یہ کہاں کی ہے بھیا؟"

"کہیں کی بھی ہو — تم جا کر کھیلو —!"

"ہم تو یہ تصویر لیں گے، ابھی نہیں — جب یہ بن جائیگی تب — دو گے نا بھیا؟"

"دیکھو بھئی تم لوگ دوڑ جاؤ — ورنہ پٹ جاؤ گے"

"اچھا! آپ یہ تصویر ہمیں دے دیجئے نا؟"

"نہیں! ہرگز نہیں!" میں نے غصے سے کہا۔

"اچھا تو ہمارے ساتھ کرکٹ ہی کھیل لیجئے، آپ نے وعدہ کیا تھا کہ بولنگ سکھائیں گے"

"اس وقت نہیں! پھر کبھی سہی!!"

"آج تو ہم آپ کو ضرور لے کر جائیں گے"

"میں آج ہرگز نہیں کھیلونگا —!"

"اچھا اگر نہیں کھیلتے تو یہ تصویر ہی —!"

"شیطانو" میں چلا کر بولا "تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے، میں تمہارا ڈرل ماسٹر ہوں، یا لنگوٹیا دوست — یہ لو یہ رہی تصویر —!"

میں نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

دیر تک بیٹھا پیچ و تاب کھایا کیا، پھر کوٹ اٹھایا اور باہر نکلا۔ نوکر کو آواز دی کہ موٹر سائیکل لے آئے۔ دو نوکر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک ہنسا اور دوسرے کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے بھی دانت نکال دئے۔

میں تلملا اٹھا "کیا ہے؟"

"کچھ نہیں حضور!"

"تم اس سے کیا کہہ رہے تھے؟" میں کڑک کر بولا،

"کچھ بھی نہیں حضور!"

"کم بختو! تمہیں بھی ہنسی سوجھتی ہے، صاف صاف بتاؤ کیا بات تھی — ورنہ —!"

"حضور! میں کہہ رہا تھا کہ موٹر سائیکل تو پچھلے ہفتے آپ نے ہی مرمت کے لئے بھیجا تھا"

میں لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں آ گیا، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟

میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا، نہ جانے کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا۔ مجھے نزہت کی میٹھی آواز نے چونکا دیا۔ اس کا ننھا منا ہاتھ میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔

"بھیا!"

میں پاگلوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ "ایں؟"

"بھیا کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں!"

"آئیے! آپا پروین کے ہاں چلیں!"

کسی نے دہکتی ہوئی سلاخیں میرے کانوں میں ٹھونس دیں!

"نہیں! وہاں نہیں جائیں گے"

"تو پھر مجھے اپنے ساتھ سیر کو لے چلئے"

"نہیں! کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ۔ مجھے کام ہے —!"

"کہیں بھی نہیں کام آپ کو، آپ یونہی رات تک یہاں ہی بیٹھے رہیں گے —!"

"بھئی جاؤ! کہا مانا کرتے ہیں بڑوں کا —!"

"نہیں بھیا! ہم تو سیر کو چلیں گے اور وہاں سے آپا پروین کے ہاں!" وہ مچل گئی۔

میں نے اسے جھڑک کر کہا "نزہت شور نہ کرو"

وہ چپ ہو گئی، اس نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا، بڑی بڑی معصوم آنکھیں دھندلی ہو گئیں اور دو موٹے موٹے آنسو اس کے رخسار پر بہنے لگے۔ وہ چپکے سے باہر جانے لگی میں نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا

کتنی مرتبہ امی نے بھی ٹوکا کہ یہ کیا سارا دن کمرے میں بند رہتے ہو، کیا تو صبح سے شام تک لوگوں کو ہنساتے پھرتے تھے اور کہاں ہر وقت کا بسورنا رہ گیا ہے۔

پروین کے ہاں سے ہر تیسرے روز شکایت آتی کہ میں وہاں نہیں جاتا۔ ایک روز ابا بولے شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، سامنے کے پہاڑ پر ایک ڈاکٹر رہتے ہیں۔ انہیں دکھا ئیں گے، اور میں سامنے پہاڑ کو دیکھتا رہا۔ لوسی اپنے باغیچے میں پھر رہی تھی، سبز رنگ کا گاؤن پہنے، کچھ دیر کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا دل میں آیا۔ جھٹ سے شوخ رنگ کی سبز جرسی پہنی، بال سنوارے اور سیدھا چل دیا پُل کی طرف۔ لوسی کی کوٹھی اور ہمارے درمیان جو نالہ تھا اس کا پل۔ پہلے پہلے میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ لیکن پھر سنبھل گئے،

میں نے جلدی سے پل عبور کیا، لوسی نے مجھے دیکھا دوڑی دوڑی آئی۔ اس کا دمکتا ہوا چہرہ اور بھی دمکنے لگا۔ میری شوخ جرسی کو دیکھا اور بڑی تعریف کی۔ پھر میرے بازوؤں کو دیکھتی رہی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دیر تک لئے رکھا۔ اس کی امی کہیں باہر تھیں۔ اس نے مجھے کوٹھی کا کونہ کونہ دکھایا، پرندے دکھائے۔ پھر صوفے پر بیٹھ کر اپنا البم دکھانے لگی۔ وہ میرا سہارا لئے صوفے کے بازو پر بیٹھی تھی، اس کی معطر زلفیں میرے چہرے کو چھو رہی تھیں ہم خوب قہقہے لگاتے رہے۔

جب میں لوٹا تو مسرور تھا، مطمئن تھا، سیٹی بجاتا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے وہ پل اچھلتے کودتے ہوئے عبور کیا۔

اس کے بعد ہم اکٹھے پھرتے، تصویریں اتارتے، میرا زیادہ وقت ان کے ہاں گزرنے لگا۔ پروین جیسے غائب ہی ہو گئی کیا ہوا جو کبھی تیسرے چوتھے روز آمنا سامنا ہو گیا، رسمی سا سلام ہوا اور بس!

اب میں پھر ہنس مکھ ہو گیا تھا، چڑ چڑا پن جاتا رہا تھا۔

ایک دن میں اور لوسی دونوں سیر سے واپس آ رہے تھے اچھا خاصا اندھیرا ہو چلا تھا، ہم اسی موڑ پر پہنچے، میری نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ چیڑ کے درختوں پر ایک تنہا تارہ چمک رہا تھا،

ہم دونوں اسی پتھر پر بیٹھ گئے۔ جہاں کبھی میں اور پروین بیٹھتے تھے۔ ان لمحات میں میں نے اپنے آپ کو کس قدر تنہا محسوس کیا، وہ کون سی سلگتی ہوئی آگ کی چنگاریاں تھیں۔ جو بھڑک اٹھیں۔ میرا جی بھر آیا، لوسی شاید کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن میں کچھ نہ سن سکا، کچھ عجیب سی اداسی میری روح میں اتر گئی۔ میں اس تنہا تارے کو دیکھتا رہا جو شاید اپنے رفیق کی یاد میں اداس تھا۔ تب میں نے لوسی سے کس قدر بے رُخی برتی۔ وہ حیران رہ گئی۔

* * * * *

* * * * *

بعض اوقات میں زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرنے لگتا ان قہقہوں میں بھی کوئی چیز دل میں چٹکیاں لیتی، اور میں ایک عمیق اور بھیانک غار میں گرتا چلا جاتا پتہ نہیں یہ کیا تھا، اپنی شکست کا احساس تھا، یا دل کی ویرانی کا اعتراف، لیکن میں تنہا رہتا تھا،

رات کو سوتے سوتے چونک پڑتا اور باہر نکل آتا، صبح تک کبھی پتھر پہ بیٹھا یونہی دیکھتا رہتا — چپ چاپ کھڑے ہوئے چیڑ کے درختوں کو، پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں کو، تاروں کے جھرمٹ کو۔ آخر میں ایک تنہا جھلملاتا سے پہ نظریں جم جاتیں،

دن گزرتے گئے، اور آخر وہ دن آ گیا۔ جب ہمیں واپس جانا تھا، ابا کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں، میرا کالج بھی کھلنے والا تھا۔ جب واپس جا رہے تھے میرا جی تو نہ چاہتا تھا کہ پروین کے ہاں [illegible] امی کی خشمناک نگاہوں نے مجبور کر دیا۔ پھر دیر کے [illegible] کی امی

چپ سے اداس اداس ملے، نہ انہوں نے خود خط لکھنے کو کہا اور نہ مجھے خط لکھنے کی تاکید کی۔ پروین کی آنٹی اپنے وطن جا رہی تھی، اسٹیشن تک اس کا اور ہمارا ساتھ تھا۔ پہلی کار میں سب جا چکے تھے، دوسری میں سامان تھا اور میں اور آنٹی۔

میں سب سے آخر میں پروین سے ملنے اس کے کمرے میں ڈرتے ڈرتے گیا، میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے مجھے وہاں جانے کا کوئی حق نہ تھا۔ پہلی مرتبہ میں نے ان کٹورے سی آنکھوں کو جھلملاتے دیکھا۔ ان میں لرزتے ہوئے آنسو دیکھے وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"خدا حافظ پروین!" میں چپکے سے بولا۔

"خدا حافظ!" اس نے بڑی سرد مہری سے کہا، اور کھڑکی سے سفید برفانی چوٹیوں کو دیکھنے لگی۔ میں جھجکے اور ٹھہرا، کہ شاید پروین کچھ کہہ دے، لیکن وہ چپ رہی۔ میں واپس چلا آیا۔ ذرا سی دیر میں ہم واپس جا رہے تھے، کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ میں ایک بستر پر ٹانگیں پھیلائے سگریٹ پی رہا تھا۔ سامنے چیڑ کے درخت، اودی اودی پہاڑیاں، رنگ برنگے کنج، جھلمل جھلمل کرتی ندیاں ——— سب اڑے جا رہے تھے۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ دن یونہی حماقتوں میں گزر گئے، اگر یہ یوں نہ ہوتا تو آج میں کتنا مسرور ہوتا۔ مجھے پروین سے کس قدر محبت ہے وہ مجھے بھی جیسی وہ تھی کتنی پیاری لگتی تھی۔ کیسے کیسے خواب میں دیکھتا رہا، سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی۔ لیکن وہ خواب کتنے غلط نکلے، اور اسے میرا ذرا سا بھی خیال نہ ہوا۔ اور جو وہ روسی تھی وہ ایسی بے وقوف سی لڑکی تھی۔ ذرا سی ٹینس اچھی کھیل لی، سینہ پھلا کر چھلانگ لگا دو بس وہیں خوش ہو جائے گی۔ صبح سے شام تک تعریفیں ہی تعریفیں کیا کرتی۔ لیکن تھی بس یونہی۔

نہ جانے یکایک مجھے کیا خیال آیا، میں نے آنٹی سے کہا "آنٹی ایک بات بتاؤ گی مجھے؟"

"کیا ہے؟"

"آنٹی تم بہت اچھی ہو، پروین کی آنٹی ہو نا؟ —— مجھے ایک بات تو بتاؤ —— آں ہاں انکار نہ کر دینا کہیں —— اب تم چلی جاؤ گی پھر نہ جانے کب تمہاری زیارت ہو۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو تم؟" وہ خشکی سے بولی۔

"یہی کہ میں کیسا ہوں؟ ——— میرا مطلب ہے دیکھنے میں ——!"

"اچھے بھلے ہو!"

"تو پھر پروین کو مجھ سے نفرت کیوں تھی؟ میں یعنی اسے برا کیوں لگتا تھا؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ——!"

"تمہیں سب پتہ ہے، خدا کے لئے مجھے فقط یہ بتا دو کہ اس نفرت کی وجہ کیا تھی، اتنی کوششوں کے باوجود بھی اس کے پتھر جیسے دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ اجنبی سی رہی۔ آخر کیوں؟"

میں منتیں کرنے لگا۔

"سننا ہی چاہتے ہو تو سن لو، تم اسے محبت کہتے ہو، یہ خود غرضی ہے یا محبت۔ تم جیسا خود غرض تو کہیں نہ ہوگا، تمہیں کبھی اس کا خیال نہ تھا۔"

"نہیں نہیں ——— یہ نہ کہو ——!"

"کیوں نہ کہوں؟ تم ذرا سی دلچسپی جتا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ تمہیں پوجنے لگے۔ تم نے اسے دیا کیا تھا جو بدلے میں اتنا کچھ مانگتے تھے۔ کبھی اپنے رویے پر بھی غور کیا، لاپرواہ اور خود سر لڑکے، تم نے اسے کس قدر ستایا ہے؟ تم نے اسے کتنے رنج پہنچائے ہیں۔ تم نے اس کا دل توڑ دیا۔ میری بچی کا لاکھوں کا سا دل —— !"

میں پاگلوں کی طرح اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"آج سے دو سال پہلے ایسے ہی دن تھے، ہم گرمیوں میں یہاں

حامد سعید خاں حامد

غزل

جہاں اک منظرِ ویرانیِ دل ہوتا جاتا ہے
یہ صحرا تیرے دیوانوں کے قابل ہوتا جاتا ہے

مذاقِ زندگی میں کون شامل ہوتا جاتا ہے
کہ دردِ دل ہی دردِ دل کا حاصل ہوتا جاتا ہے

ترا جلوہ نگاہوں کے مقابل ہوتا جاتا ہے
یہ دریا رفتہ رفتہ غرقِ ساحل ہوتا جاتا ہے

جہانِ آب و گل عکسِ حقیقت ہی سہی لیکن
وہ باطل کہتے جاتے ہیں یہ باطل ہوتا جاتا ہے

مجسم نشۂ صہبا مکمل شعلۂ مینا
یہ کیا تم ہوتے جاتے ہو یہ کیا دل ہوتا جاتا ہے

نمایاں ہوتی جاتی ہے دلِ خونبار کی سرخی
یہ آنسو اب ترے دامن کے قابل ہوتا جاتا ہے

اٹھاتے جا رہے ہیں وہ نقابِ روئے تابیدہ
جہاں کو امتیازِ حق و باطل ہوتا جاتا ہے

نگاہِ حسن جتنی بخشتی جاتی ہے آسانی
مذاقِ عاشقی اتنا ہی مشکل ہوتا جاتا ہے

الٰہی کیا کوئی گمراہیِ تقدیر باقی ہے
کہ دیوانے کا رخ پھر سمتِ منزل ہوتا جاتا ہے

محبت کی ہزاروں عقدہ دشوار ہیں لیکن
جو آساں ہوتا جاتا ہے وہ مشکل ہوتا جاتا ہے

یقیناً پھر کوئی طوفانِ غم اٹھنے کو ہے حامد
مجھے پھر اعتبارِ امنِ ساحل ہوتا جاتا ہے

چندرکانت

باپ بیٹا

جیون داس ابھی ابھی کھانے سے فارغ ہو کر حسبِ معمول باہر گلی میں ٹہلنے لگا تھا اور سوچ رہا تھا کہ زیندر کھانا کھا لے، تو تالا بند کر کے وہ بیٹھک چلا جائے۔ کیونکہ زیندر سے چھوٹا لڑکا تو کہیں رات کو دس بجے کام سے واپس آتا تھا۔ اور زیندر . . . . . .

اچانک پاس کی مل کا سات بجے کا گونجتا ہوا الارم فضا میں تحلیل ہو گیا۔ زیندر اندر بڑے کمرے میں کپڑے بدل رہا تھا۔ الارم کی آواز سنتے ہی اُس نے اپنے پرانے، میلے کچیلے کوٹ کی جیب سے تین پیسے نکالے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر چل دیا۔

"کھانا کھا لیا؟" جیون داس نے حسبِ عادت آہستہ سے پوچھا۔

زیندر لاپرواہی سے کہنے لگا۔ "نہیں آکر کھاؤں گا۔ وہاں بتیس ہزاری کے میدان میں آج دفتر کے کلرکوں کی میٹنگ ہے۔"

بڑھاپے نے جیون داس کی قوتِ سامعہ کو کافی کمزور کر دیا تھا۔ پہلے دو چار لفظوں کے سوا وہ اور کچھ نہ سن سکا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" جیون داس نے زیندر کے نئے، دھلے ہوئے کپڑوں کا جائزہ لے کر کہا۔

زیندر نے اُس کے کانوں کے عین قریب جا کر وہی الفاظ زور سے دوہرائے اور جانے لگا۔

جیون داس اُس کو روکتے ہوئے بولا۔ "نہیں نہیں۔ پہلے کھانا کھاؤ، پھر کہیں جانا۔" کبھی کبھی وہ غصے میں بھی آجاتا تھا۔ "میں تمہارا نوکر نہیں ہوں کہ تمہارے آنے تک دروازے پر کھڑا رہوں!"

زیندر ملائمت سے منانے لگا۔ "آپ سیر سے واپس آ کر اوپر سو رہیے گا۔ میں بھگت کے دروازے سے آ جاؤں گا۔"

"کوئی میٹنگ ویٹنگ نہیں" جیون داس نے تیز ہو کر کہا "جاؤ جا کر کھانا کھاؤ ـــ سنتے ہو؟"

"لیکن میٹنگ میں میرا جانا ضروری ہے . . . دیکھئے سات بج چکے ہیں اور ساڑھے سات تک مجھے وہاں پہنچنا ہے . . . میں جلد ہی واپس لوٹ آؤں گا۔"

جیون داس نے غصے میں تلملا کر زیندر کی بات کاٹ دی "جو میں کہہ رہا ہوں وہ تم نہیں سنتے۔"

"سن رہا ہوں . . ." زیندر بڑبڑانے لگا۔ "بوڑھے کی عقل کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔" اور جانے لگا۔

"میں کہتا ہوں کھانا کھا کر جاؤ۔" جیون داس نے جھنجھلا کر کہا۔

"کھا لوں گا ـــ ایسے کھانے سے تو بھوکے مر جانا اچھا ہے" اور زیندر اسی طرح بڑبڑاتا بازار کی طرف چل دیا۔

جیون داس اُس کی اس حرکت پر گلی کے سرے پر کھڑا پیچ و تاب کھانے لگا۔ "اس چھوکرے نے تو میرا جینا دشوار کر دیا ہے ـــ جو بھی کہو اُس کے برعکس کرے گا ـــ میری بات نہ ماننے کی تو اس نے گویا قسم ہی لے رکھی ہے ـــ بے شرم کو موت بھی نہیں آتی . . ."

....

زیندر بیس بائیس سال کا دُبلا پتلا، معمولی تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ حکومت کی جنگی ضروریات کی وجہ سے اگرچہ وہ کسی سرکاری محکمہ میں عارضی طور پر نوکر ہو گیا تھا، مگر ساٹھ روپے تنخواہ پانے کے باوجود اُس کا رہن سہن اپنے ساتھ والے کلرکوں کا سا نہیں تھا ـــ یوں ہی معمولی قمیص اور ہلکے لٹھے کا پاجامہ، گھر اور دفتر دونوں جگہ

اُس کی یہی پوشاک تھی۔ البتہ دس آنے گز والی گھٹیا قسم کی سفید زین کی ایک پتلون ضرور اُس کی صحیح ملکیت تھی۔ جو خدا جانے کتنی مرتبہ دھوبن کے پتھر پر پچھاڑیں کھا چکی تھی۔ اور کتنی دفعہ درزی نے اُسکے جائے نشست پر پیوند لگائے تھے۔ کبھی کبھی وہ پتلون بھی اُس کی لمبی، سوکھی ہوئی ٹانگوں میں جھولتی نظر آجاتی تھی۔ جیسے سانڈ گل کو کس کر غلاف پہنا دیا ہو۔ اُن دفتر جاتے وقت وہ چیک ڈیزائن کا ایک کوٹ بھی اپنے کندھے پر لٹکا لیتا تھا۔ جس کے بٹن شاید جنگ میں بڑھتے ہوئے نرخوں کی وجہ سے دوبارہ نہ ٹنک سکے تھے۔ اور صابن کی تیزی سے جسے دھوبی کے پیاز حاصل کئے تو ایک مدت ہی گزر گئی تھی — مگر اُسکی نظروں میں ابھی تک وہ کوٹ قیمتی تھا۔ اور وہ اسے سنبھال کر رکھے ہوئے تھا۔ اُس کو تمباکو نوشی کا بھی اچھا شوق تھا۔ جب کوئی اُسکے سامنے سگریٹ سلگاتا تھا۔ تو وہ بھی اپنی ایک پیسے کی دس والی بیڑی نکال کر نہایت شان کے ساتھ پینے لگتا تھا۔ بائیس نمبر کی بیڑی سے اس کو کچھ ایسا ہی عشق تھا کہ کئی مرتبہ یہ بیڑی پیتے پیتے وہ گانا ہی شروع کر دیتا تھا:

"دلہن بن کے آئی ہے نمبر بائیس کی بیڑی"

بیڑی کے علاوہ کئی دفعہ اس کو کریون۔ اے، کے سگریٹ کا دھواں اُڑاتے بھی دیکھا جاتا تھا — مگر بہت کم!

ہر مہینے کی پہلی، دوسری اور تیسری تاریخوں کو نریندر کبھی گھر نہ آیا تھا۔ اور نہ جیون داس نے اب کبھی اُس سے پوچھنے کی ضرورت ہی سمجھی تھی۔ جب تک تنخواہ کے ساٹھ روپے قریب قریب ختم نہ ہو جاتے، نریندر دفتر اور گھر دونوں جگہوں سے غائب رہتا۔ یہی تین دن تھے جب تو وہ دلی کے بہترین ہوٹلوں میں کھانے پر بیٹھ کر مہینہ بھر کی گھر میں کھائی ہوئی دال، مٹی کو اپنی رگ رگ سے نکال دینے کی کوشش کرتا تھا۔ انہی دنوں میں جان پہچان والے اُسکو فتح پوری اور چاندنی چوک، کی سڑکوں پر اکثر ٹہلتے دیکھتے۔ کئی واقفکاروں نے اسکو تانگے کی پہلی سیٹ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے، کئی دفعہ نیا بازار، میں سے گزرتے دیکھا تھا۔ جیون داس کے کرایہ دار جگت سنگھ نے ایکبار نریندر کو بھولا رام اینڈ سنز کی دوکان سے باہر آتے دیکھ کر پوچھا تھا۔ "کسنا و بھئی نریندر۔ ادھر کہاں" اور نریندر نے اُس کو ٹال دیا تھا "یہ جواہر نگر والے بھائی صاحب کا بچہ سخت بیمار ہے، برانڈی لینے آیا تھا"

نریندر کی شادی ہوئے تین سال ہونے کو آئے تھے اور خدا نے ایک لڑکی بھی دے دی تھی۔ لیکن اُس کی بیوی کو یہاں سسرال میں بمشکل ڈیڑھ دو مہینے ہی رہنا نصیب ہوا ہوگا۔ نریندر کو اپنے باپ کی طرح اپنی بیوی کا بھی کوئی خیال نہ تھا۔ یہاں تک کہ سردیوں میں جب بیوی اندر کمرے میں سوئی ہوتی تھی، تو وہ باہر گلی میں چارپائی بچھا کر ٹھٹھرتا رہتا تھا۔ ویسے رات کے گیارہ بارہ بجے سے پہلے تو وہ کبھی گھر آتا ہی نہ تھا۔ اور بیسیوں مرتبہ بیوی اسکا انتظار کرتے کرتے بھوکی ہی سو رہی تھی۔ بیوی کے تمام اخراجات بیوی کے والدین ہی برداشت کرتے آتے تھے۔ کیونکہ نریندر نے بیوی کو تو کیا، اپنی معصوم لڑکی کو بھی آج تک دو پیسے کا کھلونا لاکر نہ دیا تھا بلکہ ایک دفعہ نریندر کو جب کچھ روپوں کی ضرورت تھی، تو اُس نے چھ اِنچ کا لمبا چاقو نکال کر بیوی کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ اور اُسکے ازاربند سے بندھی ہوئی تالی کھول کر اُسکے سوٹ کیس میں سے طلائی آویزے نکال کر لے گیا تھا۔ جو نریندر کی نظروں سے بچا ہوا بیوی کا آخری زیور تھا۔ اسی رات نریندر اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر شراب کے نشہ میں چور گرا پڑا تھا۔ اور آدھی رات گئے بیوی نے اُسے اٹھا کر اندر چارپائی پر لٹایا تھا۔ اگلے دن نریندر نے جب بیوی کو میکے رخصت کیا تھا تو وہ اس وقت جان گئی کہ اب تقدیر ہی کبھی اُس کو سسرال میں واپس لائے گی۔

گلی محلے والے بھی نریندر سے کنی کتراتے تھے۔ مگر نریندر تھا کہ جہاں چار واقفکار نظر آتے، جھٹ اُن میں جا مخل ہوتا، بعد میں خواہ ذلیل ہو کر اُسے لوٹنا ہی پڑتا — اُس کی فطرت ہی کچھ

اس طرح کہ بنسی کی ہر بات میں باپ کا بھی ٹھمک اتار دیتا تھا۔ اور ہمیشہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ کب دوسرا بات ختم کرے اور وہ اپنی رام کہانی سنائے — بنسی کی گھوڑ دوڑ میں ہی پچھتّر ہزار روپیہ جیتا تھا اور صرف تین ہی مہینوں میں تاج محل ہوٹل کی نذر کر دیا تھا — "لیلا وٹیلانی نے جب لاہور میں رقص دکھایا تھا، میں نے پانچ سو روپے کے نوٹ سٹیج پر پھینک دئے تھے۔ کس میں ہمت ہے کہ نسیم بانو، جیسی مشہور ایکٹریس سے بات کر سکے۔ یہ ہمیں ہیں جو بیٹھے رہ دن اُس کے یہاں بیٹھے رہتے تھے" لوگ اُس کی گپیں سُن سُن کر تنگ آ گئے تھے اسکے علاوہ اُس کی سوسائٹی میں بازاری لوفر اور بے فکرے زیادہ تھے اسلئے کوئی بھی با عزت، بھلا مانس آدمی اُسکے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا خواہاں نہ تھا۔ نریندر کو جب کبھی کسی شریف آدمی کے ساتھ کہیں جانے کا موقع مل بھی جاتا تھا تو وہ سڑکوں پر غیر مہذب اور آوارہ لوگوں کی طرح زور زور سے گانا شروع کر دیتا تھا۔ شاید یہ بھی اُس کی عادت ہی تھی جس سے کئی بار اس کو آتی جاتی عورتوں سے ڈانٹ کھانا پڑی تھی۔ اور دو چار نوجوان لڑکیوں نے تو اُس کی طرف دیکھ کر تھوک بھی دیا تھا۔

جیون داس نریندر کو سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا۔ اور اب اُس نے کہنا... سننا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی اُسکے دل میں یہ امیدیں تھیں کہ وہ اور نریندر مل کر چھوٹے لڑکے کو اعلیٰ تعلیم دلائیں گے مگر نریندر کے طور و اطوار دیکھ کر اُس نے ان امیدوں کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ کئی دفعہ تنگ آ کر جیون داس نے نریندر کو گھر سے نکال بھی دیا تھا لیکن چند ہی دنوں کے بعد، نریندر جب پھر وہیں چکّر کاٹنے لگتا تھا، تو جیون داس اُس کے حال پر ترس کھا کر اسکو واپس بلا لیتا تھا۔ کئی مرتبہ نریندر بھی گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا تھا لیکن دو چار مہینے باہر کی ٹھوکریں کھانے پر اُس کو پھر جیون داس ہی کے پاس آنا پڑا تھا۔ پچھلے دنوں میں جیون داس نے دو مکان اپنے قصبے میں اور ایک دہلی میں بنوا لیا تھا۔ جن کا تھوڑا بہت کرایہ کسی فرمانبردار بیٹے کی طرح اُس کے بڑھاپے کی مشکلوں میں کام آ رہا تھا۔

نریندر نے آج تک کئی کام شروع کئے تھے۔ جیون داس نے دوڑ دھوپ کر کے اُس کو دو بار سرکاری نوکری دلائی تھی، لیکن اُس نے دونوں مرتبہ اپنی روزی پر خود ہی لات مار لی تھی۔ بالآخر مستقل آمدنی پر اُس نے خود بھی چند ایک پرائیویٹ فرموں میں ملازمت کی تھی۔ پر اُس کی نازک طبیعت اُن سے بھی جلد ہی اکتا گئی تھی۔ ایک دفعہ جیون داس نے پورا ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کر اُس کو صابن کا کارخانہ بھی کھول دیا تھا، مگر وہ تھا کہ چند دنوں میں کارخانہ ہی بیچ کر کھا گیا تھا۔ اس کے سسر نے بھی دو دفعہ اُس کو پانچ پانچ سو کی رقم دے کر کہا تھا کہ اپنی پسند کا کوئی بھی کام شروع کرے، اور اُس نے ایسے کام کر کے دکھا دئے تھے کہ سسر کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ یہی پہلا موقع تھا جب سے آٹھ مہینوں سے برابر نوکری کر رہا تھا۔

اس رات نریندر پورے بارہ بجے واپس آیا۔ جیون داس اور اُسکا دوسرا لڑکا انتظار کرتے کرتے، اوپر چھت پر جا کر سو گئے تھے۔ نریندر نے چپکے سے بیٹھک کا دروازہ کھلوا لیا۔ لیکن ساتھ ہی جیون داس کی آنکھ بھی کھل گئی۔ نریندر اپنی دُھن میں مست رسوئی خانے میں جا کر، لیمپ جلائے بغیر، اندھیرے ہی میں کچھ ٹٹولنے لگا اور پھر فوراً ہی باہر گلی کے ایک سرے کی طرف چل دیا۔

جیون داس اوپر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اپنے بڑھاپے کے سہارے کو گلیوں میں گرتے دیکھ کر وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا — نریندر اپنے مکان سے دور، گلی کی واحد نالی میں اپنے پیٹ کا رکھا ہوا کھانا پھینک رہا تھا۔

جیون داس چپ چاپ جا کر پھر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور نریندر جب اوپر آیا تو اُس نے پہلا سوال یہی کیا "کیا بجا ہے اس وقت"

"یہی دس، ساڑھے دس ہوں گے!" وہ آہستہ سے یہ کہہ کر بغیر بستر کے کسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

جیون داس نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "سوا دس بج گئے ہیں، گھنٹہ ہو گیا ہے اور تمہارے سوا دس ہی بجے ہیں! — بارہ بجے تک کہیں سو جاؤ گے یا نکڑ پر؟ جب بھی چلے گئے، جب ہی چلے آئے۔ تمہاری یہ حرکتیں کب تک چلتی رہیں گی؟"

زبیدہ خاموش تھا اور جیون داس اسی طرح کہے جاتا تھا۔ "یوں دیکھو تو کس مزے سے بیٹھے ہیں ہاتھ بڑھتے ہیں۔ اور اب کھانا نالی میں پھینک دیا — وہ کیا تمہارا باپ پھینکے گا؟"

کوئی جواب نہ پاکر جیون داس اور بھی تیز ہو گیا۔ "میں پوچھتا ہوں کہ مجھ کو جواب کیوں نہیں دیتے؟"

ٹھیک دیر سے ختم ہوئی تھی۔ زبیدہ شاید کسی اور ہی خیال میں محو تھا۔

"سو برس سے ختم ہوئی تھی!" — جیون داس نے طنز سے پوچھا "اور کھانا پسند نہیں تھا؟"

"زبیدہ بڑبڑانے لگا۔ "کس نا بڑا رائل ہوٹل سے کھایا ہوا تھا۔"

جیون داس غصے میں تلملا اٹھا۔ "رائل ہوٹل؟ اُلّو کے بچے، تمہیں رائل ہوٹل کا کھانا چاہیے؟ اگر میرا کھانا پسند نہیں تھا تو رائل ہوٹل ہی میں کیوں نہ بیٹھے گئے؟"

زبیدہ بھی غصے میں آگیا۔ "تو میں نے کونسی رعونت کی پلیٹیں پھینک دی ہیں — بغیر دانے کے وہ چھنکی دال ہی تھی نا؟ — اور جلی بھنی چار سوکھیاں!"

"بڑبڑ مت کرو۔ زیادہ بکواس کی تو ابھی گھر سے نکال دوں گا — سمجھے" جیون داس نے چلا کر کہا۔

زبیدہ زیر خندہ بولا۔ "آپ کیوں نکالتے ہیں، میں خود ہی چلا جاتا ہوں" اور اسی وقت چارپائی سے اٹھ کر نیچے چلا گیا۔

جیون داس اوپر کھڑا ابھی تک کہہ رہا تھا۔ "جاؤ جہنم میں، میرا پیچھا چھوٹے تو — خواہ مخواہ میری جان سولی پہ لٹکا رکھی ہے — کہیں ڈوب کر مر بھی نہیں جاتا حرامزادہ۔ اور دھوبی کے بیٹے ہی کو موت آتی ہے۔ اس روز روز کے جھگڑے کا فیصلہ تو ہو جائے — ایک بار، دو بار، کب تک یہ حرکتیں دیکھتا رہوں آگے تو ترس کھا کر تجھے واپس بلا لیتا تھا، مگر اب اس گھر میں کبھی پاؤں نہ رکھنے دوں گا" یہ کہتے کہتے وہ بھی نیچے اتر گیا۔

اچانک قریبی گھنٹہ گھر نے ساڑھے دس بجایا — زبیدہ نے اندر جا کر اپنی وہی پتلون پہنی اور کندھے پر وہی پرانا کوٹ لٹکا کر بازار کی طرف چل دیا۔ جیون داس نے کھڑکی سے ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لیا۔

— ⁂ —

اصل

بعد کی اُڑان

چوم ہی لے گا، بڑا آیا کہیں کا، — کوّا
اُڑتے اُڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا
کلموا، کالا کلوٹا، کاجل —
میں اگر مرد نہ ہوتا تو یہ کہتا تجھ سے،

دوش پر بکھرے ہوئے ہیں گیسو
بندی وہ مدار ستارہ ہے، مگر ساکن ہے،
چلتے چلتے کوئی رُک جائے اچانک جیسے،
غسل خانے میں نظر آیا تھا اُنگلی پہ مجھے سُرخ نشاں،
وہی وہ مدار ستارے کی نمائش کا پتہ دیتا تھا،
آپ ناپید ہوا ہے مگر اپنے پیچھے
کسی نقشِ کفِ پا کی صورت
رات کے راستے میں چھوڑ گیا ہے وہ کہانی جس کو
سُننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اِک تان کی حاجت ہی نہ تھی

ایسی ہی ایک لرزتی ہوئی تان آئی تھی
جب پھسلتے ہوئے ملبوس لرزتے ہوئے جا پہنچے تھے۔
فرش پر ایک مسہری کے کٹہرے پہ ہوا آویزاں
"چھوڑ دو، رہنے دو، اس کو تو یہیں رہنے دو"
نیم وا آنکھوں کو پھر بند کیا تھا اُس نے
ہاتھ بھی آنکھوں کے پردوں پہ رکھے تھے یک دم
اور اب ایک ہی پل میں یہ اگر کھل جائیں
یہی آنکھیں جو مجھے دیکھ نہیں سکتی تھیں

دیکھتے دیکھیں مجھے — ہاتھ کہاں رکھیں گی؟
وہیں رکھیں گی — وہی ایک نشانِ منزل
جس جگہ آ کے ازل اور ابد ایک ہوئے تھے دونوں
ایک ہی لمحہ بنے تھے مل کر
اسی لمحے میں یہ بندی مجھے دُمدار ستارہ سا نظر آئی تھی
رات کے راستے میں چھوڑ گئی تھی وہ کہانی جس کو
سُننے والا یہ کہے گا مجھ سے
گیت میں ایسی لرزتی ہوئی اِک تان کی حاجت ہی نہ تھی

اب لرزتے ہوئے ملبوس نظر آتے نہیں ہیں لیکن
اُن کی آنکھوں کو ضرورت بھی نہیں،
وہ تو اِک رات کے طوفان کا اعجاز تھا، طوفان تھا،
کیسا طوفان تھا! — اندھا طوفان
جس کے تھمنے پہ مجھے نوح کی یاد آئی ہے،
اور پھر نوح نے بیٹوں سے کہا
کھول دو پنجرا اسے چھوڑ دو، — اس فاختہ کو
جا کے خشکی کا پتہ لے آئے
چند ہی لمحوں میں وہ فاختہ لوٹ آئی، مگر ناکامی
اس کی قسمت میں لکھی تھی،
اور پھر کوّے کو چھوڑا یہی خشکی کا پتہ لائے گا
اُڑتے اُڑتے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا،
چُوم ہی لیگا، بڑا آیا کہیں کا کوّا،
کلموا، کالا کلوٹا، کاجل،

میراجی

○ ادبی دنیا، جولائی ۱۹۴۲ء

ہم لوگوں [illegible] نہیں ہوتا۔ کیونکہ [illegible] کو چھوڑ سکتا اور نہ اُس کے جیتے جی دوسرا نکاح کر سکتا۔ غرض اس طرح کے بہت سے [illegible] میری اور آزادی [illegible] اور [illegible] کا اختلاط بڑھتا چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میری نے بہت [illegible] آزادی کو سنائے۔ کئی بار بڑے بڑے البم[1] لا لا کر لوگوں کی۔ عمارتوں کی۔ پہاڑوں کی۔ اور کاہے کاہے کی تصویریں دکھائیں جن میں بعض بعض میری کی اپنی بھی کھینچی ہوئی تھیں۔ ایک دن وہ بڑا گٹھر ا مزدورنی کے سر پر لدوا کر لائی۔ اُس میں گلوبند۔ موزے۔ دستانے۔ میز پوش۔ غلاف۔ کنارے۔ زیر انداز۔ [illegible] کی چیزیں تھیں اُس کے اپنے ہاتھ کی سی ہوئی۔ بنائی ہوئی۔ کاڑھی ہوئی۔ کبھی [illegible] تو انگریزی باجا بجاتی۔ گاتی۔ زیادہ مزے میں آتی تو ناچتی بھی۔ ایسا تو کئی بار ہوا کہ [illegible] کپڑے پہنے۔ گھڑیوں آئینہ دیکھا کی اور ایک ایک سے پوچھتی رہی کہ مجھے یہ کپڑے کچھ اُوپری اُوپری تو نہیں معلوم ہوتے۔ میری کے ساتھ اس طرح [illegible] اختلاط ایسا کچھ بہت دنوں تک تو نہیں رہا۔ آزادی کے غسل صحت کے چوتھے ہی مہینے میری کا بیاہ ہو گیا تیسرے پہر بیاہ ہوا شاموں شام ہنی مون[2] کے لئے صاحب کے ساتھ پہاڑ کو روانہ ہوئی۔ مگر اتنے دنوں کے میل جول نے بھی آزادی کی ماہیت بدل دی۔ میری کے [illegible] ہوتے تو اس نے کچھ ایسا خیال کیا نہیں۔ میری کی باتوں میں اس کو کسی چیز کی سُدھ [illegible] نہیں رہتی تھی میری گئی تو مدتوں اس کی مفارقت کا ملال رہا ہمہ وقت میری کی صورت آنکھوں میں پھرتی اور اُس کی باتیں یاد آتیں ✤

[illegible] فصل آزادی کے بیاہ کی چھیڑ چھاڑ اور اپنے بیاہ کے بارے میں اُس کے خیالات

ابھی اثنا میں آزادی کی نسبت ناطے کے پیغام بھی آنے شروع ہو گئے۔ جب کہیں سے

[illegible] قصے کی کتاب کو انگریزی میں ناول کہتے ہیں ۱۲ [1] کتاب جس میں تصویریں لگی ہوں ۱۲
[2] انگریزوں کا دستور ہے کہ شادی کے پہلے مہینے دولھا دولھن کسی تفریح کی جگہ اکیلے جا کر رہتے ہیں اس کو انگریزی میں ہنی مون کہتے ہیں ۱۲

پیروڈی

شعر کا بیان

کاش ہی لیگا جڑا آیا کہیں کا، ——— چوہا،
چکے چکے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا،
دُم کٹا، بھورا لنگوٹا، پاگل،
میں جو نامرد نہ ہوتا تو بتاتا تجھ سے،

کمرہ میں دبکا پڑا ہے اُلّو
وہ جو مُردار پرندہ ہے، مگر احمق ہے،
اُڑتے اُڑتے کوئی تھک جائے اچانک جیسے
چڑیا گھر میں جو نظر آیا تھا ٹہنی پہ مجھے مرغ نہاں
اُسی مُردار پرندے کی نمائش کا پتہ دیتا تھا
آپ ناپید ہوا ہے مگر اپنے پیچھے
کسی ناخواندہ بلا کی صورت
راگ کے راستے میں چھوڑ گیا ایسی ہی بانی جس کو
سُننے والا یہ کہے گا سب سے
گیت میں ایسی اُکھڑتی ہوئی اک تان کی حاجت ہی نہ تھی،

ایسی ہی ایک اُکھڑتی ہوئی تان آئی تھی
جب پھسلتے ہوئے مزدور لڑھکتے ہوئے جا پہنچے تھے
فرش پر ایک عمارت کے کٹہرے پہ بیٹھا آیا لال
"مجھ کو مجبور کرتے دو، مجھ کو بھی یہیں مرنے دو"
نیم وا آنکھوں کو تب بند کیا تھا اُس نے
ہاتھ پھر دونوں کٹہرے سے اُٹھاتے یک دم
اور بس ایک ہی پل میں تھا زمیں پر دھا تیں!
میری آنکھیں تو اُسے دیکھ نہیں سکتی تھیں

یا پھر مجھ سے کہے ——— لاش کہاں تو ہیں گے؟
وہیں تو ہیں گے ——— وہی ایک جہاں کی منزل
جس جگہ آکے اجل اور ابد ایک ہوئے تھے دونوں
ایک ہو کر بنے تھے مل کر
ایسی لمحے میں وہ مردہ مجھے مُردار پرندہ سا نظر آیا تھا
ختم کے واسطے ہے چیز مجھے ایسی پکانی جس کو
کھانے والا یہ کہے گا مجھ سے
محبت پر ایسے گلتے ہوئے پکوان کی حاجت ہی نہ تھی

اب گلتے ہوئے ماکول نظر آتے نہیں ہیں، لیکن
اُن کی پیٹوں کو ضرورت بھی نہیں
اونچی دکان کے پکوان کا یہ حال ہے، پکوان پکا
کیسا پکوان تھا؟ ——— پھیکا پکوان
جس کو چکھنے پہ مجھے لون کی یاد آتی ہے
اور پھر لون[1] نے مرچوں سے کہا
"کھول دو ہنڈیا، اسے چھوڑ دو" ——— اس شور بے کو
جا کے ہلدی کی گرہ لے آئے
چند ہی لمحوں میں وہ شوربہ لوٹ آیا، مگر ناکامی
اس کی قسمت میں لکھی تھی،
اور پھر چوہے کو چھوڑا یہی ہلدی کی گرہ لائیگا
چپکے چپکے بھلا دیکھو تو کہاں آ پہنچا،
کاش ہی لے گا بڑا آیا کہیں کا چوہا
دُم کٹا، بھورا لنگوٹا، پاگل

عاشق محمد ایم اے

[1] چوہے اور ہلدی کی گرہ کو آپس میں خاص نسبت ہے پنجابی کی یہ مثل ذہن میں رہے: "چوہے نے ہلدی کی گرہ پائی تو پنساری بن بیٹھا!" (عاشق محمد)

معین احسن جذبی

طوائف

اپنی عظمت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب — ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھکو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ — تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں — میری پائندگیٔ غم کو تو دیکھا ہوتا
کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلون سے مگر — تُو نے اِس دیدۂ پُرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں — کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھکو
اپنی پستی کا بھی احساس پھر اتنا احساس — کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھکو

اور یہ زرد سے رُخسار، یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار، مری عرضِ وفا سے بیزار

آسی رام نگری

بدگمانی

گاؤں کے کنارے نٹوں کی کئی جھونپڑیاں تھیں۔ گاؤں میں رہنے والی دوسری اونچی قوموں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ گاؤں کے تین طرف ہرے بھرے کھیت اور پرفضا میدان تھے، سو گز کے فاصلے پر برگد کے درخت کے نیچے ایک جھونپڑی تھی۔ اسی میں مہادیو کا تاڑی خانہ تھا۔

کل سے خانہ بدوشوں نے ڈیرا ڈالا ہے۔ یہ گزشتہ سال بھی آئے تھے۔ دو چار گدھے۔ کچھ کتے اور چند بندر ان کا اثاثہ تھے۔ پھر بھی ان کے آنے سے اس میدان میں کافی چہل پہل ہو گئی تھی۔

مہادیو کے تاڑی خانہ میں بھی رونق رہنے لگی۔ نٹوں میں تقریباً سب تاڑی پیتے تھے۔ تاڑی پینے کے علاوہ انہوں نے مہادیو سے لین دین بھی شروع کر دیا تھا۔

شام ہوتے ہی دھوئیں سے بھری ہوئی لالٹین ٹمٹمانے لگتی۔ جیسے جلنے کے لئے اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ لالٹین کی دھندلی روشنی میں تین آدمی اطمینان سے بیٹھے ہوئے تاڑی پی رہے تھے۔ ان میں ایک کسی کی جستجو میں بار بار اندر جھانک رہا تھا۔ آبخورے کی تاڑی ختم ہو جانے کے بعد بھی تاک جھانک جاری رہی۔

آبخورے پھر بھرے گئے۔ وہ بھی خالی ہو گئے۔ لیکن کسی کی دید کی پیاسی آنکھیں تشنہ ہی رہیں۔ آخر ان میں سے ایک سے ضبط نہ ہو سکا۔ پوچھ ہی بیٹھا — "آج کسم نہیں نظر آ رہی ہے ...."

"اپنے نانا کے ہاں گئی ہے" مہادیو نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

تینوں کے چہرے زرد ہو گئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے آخری آبخورے کے دام پانی ہی میں گئے۔

مہادیو منہ پھیر کر ہنسا۔ لیکن اس کی ہنسی کوئی دیکھ نہ سکا۔ کسم اس کی بیوہ لڑکی تھی۔ کسم جوان اور خوشرو تھی۔ اسی کی بدولت حسن اور جوانی کے پیاسے اس کی دوکان پر آتے ہیں۔ اسے مہادیو خوب سمجھتا تھا۔ اس لئے آزادانہ سب کے سامنے کسم کو آنے دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاہکوں کی کافی بھیڑ تھی

کسم کو نہ پا کر تینوں اپنی محرومی پر متاسف ہوئے اور دل ہی دل میں کسم اور مہادیو کو گالیاں دیتے چلے گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد مہادیو دوکان کے ایک تاریک گوشے کی طرف دیکھ کر بولا — "تجھے بھی تھوڑی دوں؟"

جنسی جھجکتا ہوا بولا —— "دو ایک گھونٹ۔ چچا تمہارے پیسے کل بازار سے لوٹ کر دے دوں گا" یہ کہہ کر جنسی خاموش ہو گیا۔ اس کے گرد و پیش جیسی تاریکی چھا رہی تھی۔ شاید اندر بھی ایسا ہی اندھیرا تھا

مہادیو نے جنسی کو ایک آبخورہ بھر کر دیا۔ یہ چپ چاپ پی کر اٹھ گیا۔ اسی وقت ایک عورت نے آکر پوچھا —" وہ کیسی ہے؟" اندھیرا ہونے کے باعث وہ بولنے والے کو نہ دیکھ سکا۔ نہ آواز ہی سے پہچان سکا۔ اور آہستہ سے کہہ دیا — "اچھی ہے"

"ارے تم نے پہچانا نہیں؟ میں سکھیا ہوں" ——؟"

"تم لوگ کب آئے ـــ ؟"
"کل ہی تو آئے ہیں۔"
"میری سکھی تو اچھی ہیں؟ کل دیکھنے آؤں گی۔ کوئی بال بچہ ہوا ہے؟"
"نا۔ کلو کہاں ہے ـــ ؟"
گھر پہ ہے۔ اسی کیلئے تو تاڑی لینے آئی ہوں۔ دیر ہونے سے گالی دیگا۔ شکھیا ٹین کے ڈبے میں تاڑی لے کر چلی گئی۔ اور جنسی خیالات کی رو میں بہتا ہوا گھر لوٹا۔

* * *

دلریا کھانا پکا رہی تھی۔ جنسی بھٹی میں آگ سلگا کر بانسریاں سینکنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے تاڑی پینے سے واقعی بدن میں چستی و توانائی آجاتی ہے اور اب یہ آدھی رات تک بانسریاں سینک سکتا ہے۔ تمام دن لہو پسینہ ایک کر دینے والی جانفشانیوں کے بعد بغیر تاڑی پیئے رات میں کام ہونا ناممکن ہے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ جنسی اب بھی کام میں مصروف منہمک تھا۔ اس نے ابھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اسی لئے دلریا نے بھی نہیں کھایا تھا۔ نیند سے اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ بھی باہر آئی۔ دیکھا بھٹی میں انگارے دہک رہے تھے۔ جنسی کی آنکھوں میں نیند تھی نہ وہ کسی طرف دیکھ رہا تھا۔ بس لوہے کی ایک بے جان مشین کی طرح کام میں لگا ہوا تھا۔ اسکے پسینے سے شرابور چہرے کو آگ کی لپک نے اور بھی خوفناک بنا دیا تھا۔ دلریا نیم وا آنکھوں سے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ آہ دو لقموں کے لئے کتنی جانفشانی کرنی پڑتی ہے! بانسریاں ہی اس کی زندگی کا سہارا ہیں۔ سو بھی آجکل نہیں بکتیں۔

اندر ہی اندر کھوکھلا بنا دینے والی شوہر کی فکرمندیوں سے دلریا بے حد متاثر تھی۔ وہ وہیں کچھ دیر تک کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ پھر ایک طویل سانس کھینچتی ہوئی چولھے کے پاس آ بیٹھی اور چاول کی ہانڈی کی طرف دیکھتی ہوئی اونگھنے لگی۔

اسی طرح تین چار دن گزرے۔ ایک روز دلریا نے کہا ـــ "خالی چاول کیسے کھاؤ گے۔ جاؤ کہیں مچھلی ملے تو . . . ."

جنسی مچھلیاں پھنسانے کے کانٹے اور ڈوریاں لیکر چلا۔ دوپہر تک کئی جگہ مارا مارا پھرا مگر کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر تھکا ماندہ آکر اپنے گھر کے پیچھے والے تالاب میں کانٹے ڈال کر بیٹھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خشک پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنکر پیچھے مڑ کر دیکھا تو کسم آرہی تھی۔

"بابو تمہیں ابھی بلا رہے ہیں!"
"کیوں ـــ ؟"

بہت ضروری کام ہے۔ چلتے ہو؟"
کسم کی بدنامی سے جنسی ناواقف نہ تھا۔ اس سنسان تالاب کے کنارے جھاڑی کی اوٹ میں کسم کو اپنے پاس کھڑی دیکھ کر یکایک نامعلوم خوف سے کانپ اٹھا۔ اور سوچنے لگا یہ چلی جائے تو جان بچے لیکن کسم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی اور ذرا قریب آکر بولی۔ "کچھ کوئی مچھلی پھنسی؟"
"نہ۔ ایک بھی نہیں . . . ." کہتا ہوا جنسی ایک ایک قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ اسے ہٹتا ہوا دیکھ کر کسم نے بھی جانے کا حیلہ کر کے گردن اونچا اٹھا کر کہا ـــ "دیکھو ضرور آنا۔ نہیں تو بہت برا ہوگا؟ تمہیں میری قسم ہے۔"

کسم چلی گئی۔ بنسی کو جس بات کا خوف تھا وہی سامنے آئی۔ دلریا نہانے کے لئے پگھٹ پر آ رہی تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ایک عورت کو اس بیباکی سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے دیکھ کر ایک درخت کے نیچے چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ کسم کی آخری بات اس نے سُن لی تھی۔ رشک و حسد اور غم و غصے سے اس کا بدن کانپنے لگا۔ وہ لوٹ کر گھر چلی گئی۔ اس کے دل میں بدگمانی کی بھٹی سلگنے لگی

بنسی خالی ہاتھ گھر واپس آیا اور بولا —— "کچھ ملا نہیں۔ جو جی میں آئے پکاؤ"

دلریا کچھ نہ بولی ——

"ابھی آ رہا ہوں"، کہہ کر بنسی باہر چلا گیا۔

دلریا پھر بھی نہ بولی۔ اور غم و غصے کانپتے ہوئے دل کو باندھے وہیں بیٹھی رہی۔

بھادو بنسی کو دیکھ کر بولا —— "کسم نہیں مانتی۔ بیٹے کے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔ اسکے لئے ایک ساڑی ضروری ہے۔ کل تو تم نے کئی بانس بیچے ہیں۔ ڈیڑھ روپیہ دے دو۔ اسے ایک ساڑی لا دوں"

"اچھا دونگا ۔ ۔ ۔ ۔"

"لینا دینا کیا۔ اگر تمہیں کل بازار جانا ہو۔ تو تم ہی لیتے آؤ۔ بوڑھے آدمی کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ؟"

"اچھی بات ہے لا دونگا"

"خوب اچھے کنارے کی لانا" کسم نے باہر نکل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

بنسی کچھ نہ بولا۔ اور سائے کی طرح وہاں سے ہٹ گیا۔

اسکے پاس صرف چار روپے تھے اور گھر میں کھانے کے لئے ایک دانہ نہ تھا۔ اوپر سے بھادو کا تقاضہ۔ بنسی کا دل بیٹھ گیا۔ اس روز دلریا بنسی سے بولی تک نہیں ——

شام ہوئی اور بنسی بازار جانے لگا تو دلریا سے بولا —— "ایک روپیہ دے"۔ یہ اسی کے پاس اپنی کمائی رکھا کرتا تھا

"کیا کرو گے ۔ ۔ ۔ ۔؟" دلریا نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ادھار تاڑی پی ہے۔ پیسہ دینا ہے"۔ دلریا کے سامنے یہ کہنے کی جرأت تو تھی نہیں۔ اسلئے بنسی نے آہستہ سے کہا —— "کام ہے"

اکثر نہ پوچھنے پر بھی بنسی دلریا سے ساری باتیں کہہ دیا کرتا تھا۔ لیکن آج پوچھنے پر بھی اس نے صاف نہ بتلایا۔ اسکے اس برتاؤ سے دلریا کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ اور پیشانی پر بل ڈال کر اس نے چپکے سے ایک روپیہ بنسی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور بھاگ گئی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ سچ مچ اپنے شوہر کے نزدیک پرائی ہو گئی ہو —— !

* * * * * * * * * *

کئی دنوں سے سکھیا روزانہ دلریا کے ہاں آتی تھی۔ ایک روز سویرے وہ لال کنار۔ کی دھوتی پہنے ہوئے آئی۔ اور دلریا کے پاس کھڑی ہوتی ہوئی بولی —— "دیکھیں تیری دھوتی کہاں ہے؟ پہنی کیوں نہیں؟"

دلریا نے تعجب سے پوچھا —— "دھوتی —— ؟"

"بات نہ بنا۔ کلو نے مجھ سے بتا دیا ہے"

"کیا لایا ہے —؟" دلریا نے سکھیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"جنسی تمہارے لئے دھوتی لایا ہے۔ دونوں نے ایک ہی ساتھ تو خریدی تھی۔ سیاہ چھیل دار کناری کی"

دلریا کچھ نہ سمجھ سکی۔ اور بولی — "بہت اچھی"

لیکن دوسرے ہی لمحہ اسکے دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھنے لگے۔ اس کی صورت افسردہ اور سنجیدہ ہو گئی۔ وہ بے دلی سے اٹھتی ہوئی بولی — "نہانے جا رہی ہوں"

"اتنی جلدی کیا ہے؟"

"نہ ہو" دلریا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اور رسوئی گھر میں چلی گئی۔ سکھیا بھی تنہا کیا بیٹھتی وہ بھی چلی گئی۔

دلریا دھڑکتے دل سے سوچنے لگی۔ اس کا شوہر ضرور کسم کے لئے دھوتی لایا ہے یہی وجہ تھی کہ کل اس نے روپیہ مانگتے وقت اسکی بات کا صاف جواب نہیں دیا۔ اُف یہ چوری . . . .؟

دلریا کچھ دیر تک بے حس و حرکت مجسمے کی طرح کھڑی کچھ سوچتی رہی۔ کسم اکثر اسی وقت تالاب میں نہانے آتی ہے۔ آج بھی ضرور آئیگی اگر اسکے شوہر نے اسے دھوتی لاکر دی ہوگی۔ تو وہ ضرور پہن کر آئیگی۔

دلریا گھر میں تالا لگا کر گھاٹ کی طرف گئی۔ کسم نہا چکی تھی۔ اسکے کندھے پر ایک دھوتی تھی جس کی کناری واقعی سیاہ تھی۔ اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ایک ہی بازی میں جیسے وہ اپنا سب کچھ ہار گئی۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس میں کچھ سوچنے سمجھنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ اپنے گھر کی طرف دوڑی اور اندر آکر کھڑی رہی۔ اس کا دم پھول رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ کہ جی بھر کر رو دے اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو کہاں تھے۔

اس واقعہ کا ذکر اس نے کسی سے نہ کیا۔ کیونکہ یہ تو اسی کی تحقیر و توہین اور شکست کی بات تھی۔ یہاں تک کہ اس نے جنسی سے بھی کچھ نہ کہا اور حسب معمول گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ ہاں حتی الامکان اس سے الگ اور دور رہنے لگی۔ نہ دل کھول کر باتیں کرتی نہ سیدھے منہ اسکی بات کا جواب دیتی دلریا کی اس کشیدگی سے جنسی کی خشک زندگی اور بھی بے کیف ہو گئی۔ محنت و مشقت اور فاقہ مستی و جفاکشی کے باوجود اسے اس کی باتوں سے سکون حاصل ہوتا اور اسکے دم قدم سے اس کی جھونپڑی بھی قصر ارم بنی رہتی۔

جنسی بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی دلریا کی خفگی و کشیدگی کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ آخر مجبوراً اس نے بھی گھر کی بے کیفی سے اُب کر ادھر ادھر یہاں وہاں۔ جہادیو کی دکان۔ اور تالاب پر وقت گزارنا اور دل بہلانا شروع کیا۔ تمام دن باہر رہتا۔ آدھی رات سے پہلے کبھی گھر نہ آتا۔ اس طرح اس کی زندگی پر غم واندوہ اور افسردگی و بے کیفی کی گھٹائیں محیط رہنے لگیں۔

* * * * * * * *

کئی روز کے بعد سکھیا آکر بولی — "آج رات میں ہم لوگ چلے جائینگے"

"کہاں —؟"

"یہ کیسے کہوں . . . . خانہ بدوشوں کی کوئی منزل ہوتی ہے؟"

دلریا کچھ نہ بولی۔ ٹکٹکی لگائے افق کی طرف دیکھتی رہی ——

سکھیا ہنس کر کہنے لگی — "تو بڑی پگلی ہے"
دلربا نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
سکھیا پھر ہنسی، اور روتی دیکھنا چاہی۔ بولی — "دکھا دیتی تو کیا ہوتا؟ گھس جاتی کیا"
کوشش کرنے پر بھی دلربا اپنی ٹھنڈی سانس نہ روک سکی، اور آنکھیں پھاڑے سکھیا کی طرف دیکھتی رہی۔
سکھیا نے پوچھا — "کیا سوچ رہی ہے؟"
"میں اس کی کون ہوں جو میرے لئے دھڑنی لاتا۔ ۔ ۔ ؟"
اس کی آواز غم انگیز اور شکست آمیز تھی —
سکھیا نے تعجب سے پوچھا — "تو پھر کس کے لئے لایا ہے —؟"
دلربا کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی — "اب میں اس کی کوئی نہیں رہی۔ پرائی ہو گئی۔ سارے سارے دن باہر رہتا ہے اور آدھی رات گئے گھر آتا ہے۔"
سکھیا معاملے کی تہہ تک پہونچ گئی اور بولی — "تو روتی کیوں ہے؟ ہم لوگ کتنی دوائیں جانتے ہیں۔ ایک ہی جڑی دینے سے ٹھیک ہو جائیگا"
اندوہ و آلام کے بے پایاں سمندر میں دلربا نے مسرت و انبساط کی ہراہٹ محسوس کی۔ اسکے ہونٹوں پر امید کی برق چمکتی ہوئی بولی — "سچ مچ ایسی کوئی جڑی ہے —؟ کسم نے بھی شاید اسے دوا ہی کھلا کر۔ ۔ ۔ ہاں تو جڑی کب دو گی —؟ تم تو چلی جا رہی ہو۔"
سکھیا بولی — "کل سے پوچھ کر بتاؤنگی"
"کب —؟"
"وہ آ جائے۔ کہیں گیا ہے۔"
دلربا بڑی بیتابی سے سکھیا کا ہاتھ پکڑ کر بولی — "سچ بتاؤ دو گی؟ نہیں تو زہر کھا کر مر جاؤنگی۔ سکھیا تیری قسم کھا کر کہتی ہوں۔ زہر کھا کر جان دے دونگی"
"ہاری ر دمت۔ اس جڑی میں بڑے گن ہیں۔ بنسی تو تیری پوجا کریگا"

شام ہی سے دلربا سکھیا کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس کا جی کسی کام میں نہ لگا۔ کبھی گھر میں جاتی کبھی باہر آتی۔ بنسی ابھی نہیں آیا تھا۔ سکھیا نہ آنے سے دلربا کی امیدیں یاس میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ اسکے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ رہا تھا۔ یہ گھر میں سے نکل کر صحن میں کھڑی تھی۔ چاند نہیں نکلا تھا۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ مایوس ہو کر چولھے کے پاس جا بیٹھی۔ دو گھنٹے کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز سنکر باہر گئی تو دیکھا کوئی اس کی طرف آ رہا تھا۔ پوچھنے سے پہلے ہی آنے والے نے کہا — "بہو ادھر آ"
یہ سکھیا تھی —
دلربا دوڑی ہوئی گئی اور بولی — "جڑی کہاں ہے —؟"
"دیتی ہوں۔ پہلے دروازے کی کنڈی تو لگا آ"

دلریا نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ سکھیا نے چار پانچ انچ کی ایک جڑی اپنے آنچل سے نکالتے ہوئے آہستہ سے بولی — "بے حد احتیاط کرنا"

دلریا جڑی ہاتھ میں لیتی ہوئی بولی — "اسے کیا کروں گی —؟"

"مار کے رکھ دیتی ہے؟ کھانے میں . . . لیکن اتنا یاد رہے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ نہیں تو کوئی فائدہ نہ ہوگا بھی؟"

دلریا نے احتیاط سے جڑی آنچل میں باندھ لی۔ سکھیا نے کچھ اور تدبیریں بھی بتائیں۔ ٹھیک اسی وقت باہر کی کنڈی کھڑکھڑائی اور باہر سے آواز آئی — "کواڑ کھولو۔"

منسی کی آواز خلافِ معمول کرخت تھی۔ دلریا ڈرتی ہوئی کواڑ کھولنے چلی۔ سکھیا نے دلریا کو روک کر آہستہ سے کہا — "ذرا ٹھہر جا مجھے بھاگ جانے دے۔ نہیں تو سارا کام بگڑ جائیگا"

سکھیا کھڑکی کی راہ سے باہر ہوگئی۔ دلریا نے دروازہ کھول دیا۔ منسی ہوا کے جھونکے کی طرح گھر میں گھس آیا۔ دلریا اسکے خوفناک چہرے کی طرف دیکھتے ہی کانپ گئی۔ منسی پر جیسے بھوت سوار تھا۔ اس نے لال لال آنکھیں نکال کر دلریا کو دیکھتے ہوئے کرخت آواز میں پوچھا — "گھر میں کون تھا —؟"

دلریا خوف و ہراس سے کانپ گئی۔ وہ کیسے کہے کہ اسے بس میں کرنے کے لئے سکھیا سے ساز باز کر رہی تھی — وہ منسی کے خوفناک چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی دبی زبان سے بولی — "کوئی نہیں"

کھڑکی کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ وہ کواڑ کھلنے کی آواز بھی سن چکا تھا

"کوئی نہیں، شیطان کی بچی" کہتا ہوا منسی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے دلریا کا داہنا ہاتھ کس کر پکڑا۔ اور اسے مروڑتا ہوا کہنے لگا۔ "تو پھر کس سے میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی تھیں —؟؟"

دلریا خوف سے کانپ رہی تھی۔ اسکے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ منسی کے مضبوط ہاتھ میں اسکا نرم و نازک ہاتھ بے حس ہوگیا۔ اس نے بال پکڑ کر ایک دھکا دیا۔ وہ زمین پر گر پڑی اور منسی اسکے اوپر خونخوار درندے کی طرح جھپٹ کر اسے مارنے لگا۔ دلریا نہ ہل سکی نہ چیخ سکی۔ مارتے مارتے تھک کر منسی نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا — "حرام زادی جلد ہی اندر یہ کھیل کھیلتی ہے —؟"

منسی وہاں ایک لمحہ نہ ٹھہرا اور فوراً گھر سے باہر نکل آیا۔ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہوگیا؟ کس طرح بات کا بتنگڑ بن گیا؟ دلریا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کا سارا بدن درد سے چور تھا۔ وہ کھلی ہوئی دھوتی کس کس طرح لپیٹ کر اٹھی اور باہر نکلی تو دیکھا اس کا شوہر چوپال والوں کو اس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسکے ساتھ آس پڑوس کے بچے بوڑھے جوان سبھی تھے۔ لاٹھیں۔ ہجوم۔ ہنگامہ۔ طرح طرح کی باتیں —! دلریا ڈر کے مارے ہیں دیوار کے پیچھے چھپ گئی۔

منسی کہہ رہا تھا — "شیطان کی بچی کو جان سے مار ڈالتا تو دل ٹھنڈا ہوتا۔"

ایک شخص بولا — "کہاں ہے حرام زادی؟ دو چار ہاتھ لگائیں۔"

دوسرا بولا — "منسی تم نے دیکھا کون آدمی تھا —؟"

"کیا معلوم کون تھا۔ دیکھتا تو کیا زندہ چھوڑ دیتا۔ گردن نہ کاٹ لیتا"۔ سب مکان میں گھس گئے۔

ولریا کا سر چکرا رہا تھا۔ اسے دیکھتے دیکھتے وہ کیا ہو گیا — ؟ وہ اپنے پیچھے ہوتے سر کو دیوار سے لگائے کان لگا کر سن رہی تھی —

"کہاں گئی — ؟"

"جا نکلی کہاں ؟ تلاش کر کے نکالو حرام زادی کو۔ آدمی کا پتہ چل جائے مجھے پھر کالو کوئی نہ ہوگا" بنسی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا — "میں شیطان کی بچی کی جان لیکر رہونگا۔"

سب کے سب مل کر ولریا کی تلاش کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اتنے آدمیوں کے سامنے وہ کیا کہے گی ؟ اپنے شوہر کی بدگمانی کس طرح دور کرے گی — ؟ اگر وہ سچائی کی بات کہے گی تو بھلا کون یقین کریگا ؟ اتنے آدمیوں کے سامنے اسکی باتیں خشک پتیوں کی طرح اُڑ جائینگی یا تنکے سیلاب میں بہہ جائینگی

"بھاگ گئی ہے — ؟"

"جا نکلی کہاں ؟"

بنسی بولا — "چلو اچھا ہی ہوا چلی گئی۔ میں اب اسے اب دروازے پر کھڑی نہ ہونے دونگا۔ اب ایسی عورت کا منہ دیکھوں تو اپنے باپ کا بیٹا نہیں"

ولریا کو ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آئی۔ کہیں ٹمٹماتا ہوا دیا بھی نظر نہ آیا۔ اب وہ کہاں جائے — ؟ کیا کرے — ؟ ایک بیکس و بے زبان عورت اتنے مردوں کے مقابلے میں کیا کر سکتی ہے ؟ اپنے مالک کے پاس واپس جانے کی کوئی صورت نہیں۔ اور اسکے علاوہ سویرے پڑوس والوں کو کس طرح منہ دکھائیگی ؟

وہ مایوس ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔ سوچنے لگی — اُف یہ کلنک — ؟ یہ الزام ؟ مرد بھی کتنے بدگمان ہوتے ہیں . . . . . !!

کچھ دیر تک بیٹھی ہوئی ولریا یہی سوچتی رہی۔ دفعتہً اس کا خوف و ہراس کم ہوا۔ سب چلے گئے تھے۔ بنسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ سارا گھر شمشان کی طرح سنسان تھا۔ چاند نکل رہا تھا۔ ہر طرف ہلکی روشنی پھیل رہی تھی۔

وہ سوچنے لگی۔ اب بنسی کو کیا منہ دکھائے۔ قسمت ہی بگڑ گئی تو اپنا بس ہی کیا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اس نے تہیہ کیا کہ اپنی خانہ بدوش سہیلی کے ساتھ در بدر بھیک مانگ کر زندگی کے دن گزار دے گی۔ لیکن گھر کی محبت۔ سارا اثاثہ اور وہاں گزرے ہوئے دنوں کی یاد اس کا دامن پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بہت دیر تک ولریا وہیں پڑی روتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھ کر خانہ بدوشوں کے خیموں کی طرف چلی۔

ولریا نے میدان میں آکر دیکھا۔ وہاں خانہ بدوشوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ سب چلے گئے تھے۔ اسی سنسان کھلے میدان میں وہ کچھ دیر تک کھڑی رہی۔ پھر آگے بڑھی۔ وہ کہاں جا رہی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ کہاں جائیگی — ؟ اسے خبر نہ تھی۔ اوپر آسمان نیچے زمین۔ یہی اس کا سہارا، یہی امن تھا۔ اس کا کوئی مطمحِ نظر تھا۔ نہ منزلِ مقصود۔ پھر بھی اسکے ناتواں قدم لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے !!

یوسف ظفر

تین سال

تین دیواروں نے محصور کیا ہے مجھ کو
تین دیواریں مجھے قید کیے بیٹھی ہیں
میری ہی عمر کی گھڑیوں سے جو تعمیر ہوئیں
میرے ہی اشکوں سے ہوتی ہے چراغاں جن میں
جن کی مٹی میں ہیں گوندھی ہوئی میری چیخیں
میرے ہر سانس پہ جو گونج اُٹھا کرتی ہیں،
جن کی اینٹوں میں مرے خون کی آمیزش ہے ——
تین دیواریں —— دھڑکتا ہے مرا دل جن میں
کوئی دروازہ نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں
کوئی روزن بھی نہیں ایسا کہ میں جھانک سکوں،
زندہ درگور ہوں شاید، کہ مری دیواریں
میرے ماضی کی عمارت سے ہم آہنگ نہیں ——
ان پہ آویزاں ہیں تصویریں ملاقاتوں کی
چاندنی راتوں کی، مہکی ہوئی برساتوں کی
اُس کی باتوں کی بجائی ہوئی شہنائی سے
گونجتے نغمے بھی دیواروں پہ آسودہ ہیں
اُس کی تصویریں بھی ہیں زینتِ دیوار یہاں
مسکراتی ہوئی نظریں بھی ہیں —— یہ دیواریں
غمِ محرومی کے آنسو بھی دکھاتی ہیں مجھے

——۲

بڑھتی جائیں گی یہ دیواریں مری عمر کے ساتھ
وہ بھی آنے کو ہے —— آئے گی —— عمارت اُس کی
میری دیوارِ دل سے پیوستہ نظر آئے گی،
کوئی دن ہی میں یہ تصویریں، یہ دیواریں تمام
دھڑکنیں عمر کی، ماضی کی سہانی یادیں
وقت کی درد بھری چیخیں، مری فریادیں
ایک فرسودہ سے منظر میں بدل جائیں گی
اور اب تین ہی دیواریں ہیں —— لیکن افسوس
عمر بھر میں یہیں محصور نہیں رہ سکتا ——

September 1942 Regd. L. No. 3521

یہ کہانیاں مکمل آپ بیتیاں ہیں جنہیں پڑھنے والے اُنکے کرداروں
کے ساتھ سانس لیتے ہیں اور بعض اوقات اپنے آپ کو اِن کہانیوں کے
چلتے پھرتے کردار محسوس کرنے لگتے ہیں۔

Rs. 2/-

اس رات وہ ایسا غافل سویا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ صبح الحمد تو گھٹنے کا ورم بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ دوپہر تک اکیلا یہاں بیٹھا شعر موزوں کرتا رہا۔ سہ پہر کے وقت ان دو چھوٹے لڑکوں کو جن کا نام نک اور رک تھے ساتھ لے کر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ جمعے کا دن تھا اس لیے وہ اسکول سے جلدی لوٹ آئے تھے۔ ایک سات سال کا تھا ایک چھ سال کا شریر لڑکے ہیں۔ رنگ بہت گورا تھا اور بالوں کی رنگت بھی سنہری۔ مسٹر الیشرسٹ سے بچے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں دونوں چڑ چڑ باتیں کرنے لگے۔ سوائے مچھلیوں کے باقی جانوروں کے مارنے کے جتنے طریقے انھیں یاد تھے دونوں نے ایک ایک کرکے الیشرسٹ کو سکھا دیئے۔ پھر پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر پیٹ کے بل ندی کے کنارے مچھلیوں کی تاک میں لیٹ گئے۔ گویا اس فن میں بھی کچھ نہ کچھ مہارت انھیں ضرور حاصل ہے۔ لیکن ہنستے اس قدر تھے اور غل اس قدر مچاتے تھے کہ ایک مچھلی بھی قریب نہ پھٹکی۔ الیشرسٹ نیچے کے درختوں کے جھنڈ کے پاس ایک چٹان پر بیٹھا پرندوں کے گیت پر کان لگائے انھیں دیکھتا رہا۔ آخر کار نک جو ان دونوں میں سے بڑا تھا۔ مچھلیوں کے کھیل سے اکتا کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا اور بولا۔

"جپسی بھوت اس پتھر پر بیٹھتا ہے۔"

"وہ کیا بلا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ کبھی اسے دیکھا نہیں مگر میگن کہتی ہے کہ وہ یہیں بیٹھتا ہے۔ بڑے جم کو ایک دفعہ نظر آیا تھا جس دن بابا کے سر میں ٹٹو نے لات ماری۔ اس سے پہلے رات کے وقت بھوت یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر سارنگی بجاتا ہے۔"

"کون سا راگ بجاتا ہے وہ؟"

"معلوم نہیں۔"

"اس کی شکل کیسی ہے؟"

"کالے رنگ کی بڈھا جم کہتا ہے اس کے جسم پر بال ہی بال ہیں۔ بڑا سخت ہولا ہے۔ کبھی کبھی دن کو بھی آ جاتا ہے۔" پھر اپنی ترچھی سیاہ آنکھوں کے ڈھیلے پھرا کر کہا۔ "مجھے تو اٹھا کر نہیں لے جائے گا۔ میگن اس سے بہت ڈرتی ہے۔"

"میگن کو کبھی نظر آیا ہے؟"

"کبھی نہیں۔ لیکن میگن آپ سے نہیں ڈرتی۔"

"واہ مجھ سے بھلا کیوں ڈرتی؟"

"وہ آپ کے لئے دعا مانگتی ہے۔"

"چل بدمعاش۔ بھلا تجھے کیسے معلوم ہے؟"

"جب میں سویا ہوا تھا۔ تو وہ کہہ رہی تھی خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر الیشرسٹ پر بھی۔ بڑی دھیمی آواز میں دعا مانگ رہی تھی۔ میں نے خود اسے سنا ہے۔"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ جو باتیں تمھیں خود بھی نہ سننی چاہئیں تھیں وہ تم اوروں کو سنا رہے ہو۔"

لڑکا چپکا ہو گیا اور پھر بڑے فخر سے بولا۔

"میں خرگوش کی کھال اتار لیتا ہوں۔ میگن تو کھال اترتی ہوئی دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے"

"اچھا جناب مگر میں پوچھتا ہے! جن کہیں کا!"

"جن کیا ہوتا ہے!"

"جن اسے کہتے ہیں جو دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوش ہو"

چھوٹے جرے نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا۔ "جو خرگوش ہم کھاتے ہیں وہ تو مرے ہوئے ہوتے ہیں"

"ٹھیک ہے بک۔ میں معافی مانگتا ہوں"

"میں مینڈک کی کھال بھی اتار لیتا ہوں"

لیکن ایشرسٹ کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ "خدایا ہم سب پر فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی" بک نے دیکھا کہ ابھی تو ابھی خاصی باتیں کر رہا تھا۔ اور اب جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔ بہت حیران ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوڑتا ہوا پھر ندی پر جا پہنچا۔ جہاں پھر دونوں نے مل کر ہنسنا اور غل مچانا شروع کر دیا۔

جب میگن چائے لے کر آئی تو ایشرسٹ نے پوچھا۔

"میگن۔ چیپی ہوا کیا چیز ہے؟"

میگن نے چونک کر سر اٹھایا۔

"اس کا قدم بہت منحوس ہے"۔

"تم بھوت پریت کو مانتی ہو۔؟"

"اللہ کبھی اس کی شکل نہ دکھائے"

"نظر کیونکر آنے لگا۔ کچھ ہو تو نظر آئے۔ بڈھے جم نے یونہی کسی ٹٹو کو دیکھ لیا ہوگا"

"نہیں ان چٹانوں میں بھوتوں کا ڈیرا ہے۔ یہاں ان لوگوں کے بھوت رہتے ہیں جو بہت عرصہ پہلے یہاں آباد تھے"

"تمہارا چیپی تو نہ ہوئے نا! یہاں کے قدیم باشندے تو جپسیوں کے آنے سے بہت عرصہ پہلے مر کھپ گئے تھے"

میگن نے صرف اتنا کہا۔ "وہ سب منحوس ہیں"

"پھر کیوں! اور اگر یہاں بھوت ہیں بھی تو خرگوشوں کی طرح اپنا جنگل میں رہتے ہیں۔ اب جنگل پر جو پھول اگتے ہیں وہ منحوس ہوتے ہیں۔ یہ شہتوت کے درخت بھی تو سب خود رو ہیں۔ یہ تو منحوس نہیں اور بھوت منحوس ہو گئے! میں رات کو جنگل میں جا کر اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ آؤں گا۔ بلکہ ان سے دو چار باتیں بھی کر آؤں گا"

"ارے نہیں! نہیں!"

"میں ضرور جاؤں گا اور جا کر اس چٹان پر بیٹھوں گا جہاں ہوا بیٹھتا ہے"

لڑکی نے اپنا ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لئے!"

"پھر کیوں؟ اگر مجھے کچھ ہو بھی گیا تو کیا مضائقہ ہے؟"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ایشرسٹ پیار کے انداز میں بولا۔

"مگر میں جاؤں، جانا ہی بہتر ہے۔ آخر اب یہاں سے بھی تو جلد کوچ کرنا پڑے گا۔"

"جلد؟"

"تمہاری خالہ آخر کب تک مجھے رہنے دیں گی؟"

"ہم تو گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ کمرے کرایہ پر دے دیتے ہیں۔"

ایشرسٹ نے لڑکی کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔

"تم چاہتی ہو میں ٹھہر جاؤں؟"

"ہاں"

"تو آج رات میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

ایشرسٹ نے تمہارے کے لفظ پر خاص زور دیا۔ میگن کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چیں بجبیں کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایشرسٹ نے چائے کو ابھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ پتیاں ابھی اچھی طرح بھیگی نہ تھیں۔ اپنے آپ کو بہت برا بھلا کہا۔ یہ کیا منہ سے نکل گیا؟ یہ تونے کیا کیا؟ خوشنما پھولوں کو اپنے جوتے کی ٹھوکر سے کچل ڈالا۔ میں بھی رابرٹ گارنن کی طرح گدھا ہوں۔ شہر کا رہنے والا۔ کالج کا طالب علم۔ اس لڑکی کو سمجھنے سے بالکل قاصر!

(۴)

اگلے ہفتے ایشرسٹ کو یقین ہو گیا کہ اب گھٹنے کی تکلیف جاتی رہی۔ کیونکہ اس نے اردگرد کے علاقہ کی خوب سیر کی۔ ایشرسٹ پر اب کے سال موسم بہار کی وہ کیفیتیں آشکار ہوئیں کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کبھی کسی پیچ کے سرخ و سفید شگوفوں کو جو گہرے نیلے آسمان کے بالمقابل دھوپ میں کھلے ہوتے یا کبھی سکاچ فر کے تنوں اور ٹہنیوں کو جو تیز روشنی میں نیلے معلوم ہوتے تھے۔ ایک نشے کے عالم میں بیٹھا دیکھتا رہتا۔ یا پھر جنگل میں لارچ کے درختوں کا نظارہ کرتا۔ جو ہوا کے زور سے سیاہ ہو گئے تھے۔ نچلے پتے کالے کالے تھے۔ اوپر کی ٹہنیوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں جو ہوا کے جھونکوں سے پھڑک اٹھتیں تو درخت میں ایک زندگی سی آجاتی۔ کبھی سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹ جاتا اور بنفشے کے پھولوں، گچھوں کو دیکھتا رہتا یا سوکھے ہوئے سبز کھیتوں میں کھڑا ڈیزی کی گلابی گلابی کلیوں کو جن کے آر پار دکھائی دیتا تھا انگلیوں سے چھیڑتا رہتا۔ کبھی ککو چہچہانے لگتے۔ کبھی سبز ہدہد بول اٹھتے۔ کبھی آسمان کی بلندی سے کوئی لارک اپنے گیت کے موتیوں کو قطروں کی طرح ایک ایک کر کے زمین پر ٹپکاتا۔ بہاریں کئی دیکھی تھیں لیکن ان میں یہ بات نہ تھی۔ وہ بہاریں ننھے پودوں کی بہاریں تھیں۔ یہ بہار دل کی بہار تھی۔ دن کے وقت گھر کے لوگوں سے ملنا کم ہوتا۔ جب میگن کھانا لے کر آتی تو یا گھر کے کسی کام کاج میں ہوتی یا اسے احاطے میں ننھے ننھے جانوروں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی اس لئے ایک دو باتوں سے زیادہ نہ ٹھہرتی۔ لیکن شام کے وقت ایشرسٹ باورچی خانہ کی کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتا۔ پائپ سلگا لیتا۔ نک اور جم یا مسز نریڈ کو سب سے باتیں کرتا رہتا۔ لڑکی سینا پرونے بیٹھی یا کھانے کے برتن سنبھالتی پھرتی۔ بعض دفعہ اسے یہ احساس ہوتا کہ میگن اپنی چمکیلی چمکیلی بھونرا سی بھوری آنکھیں

جھکائے نیچی نیچی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس سے عجیب نخوت آمیز مسرت ہوئی۔ دل کی وہ کیفیت ہوتی جو ایک بلی کی ہوتی ہوگی جب وہ میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اتوار کے دن شام کے وقت ایشرسٹ باغیچے میں بیٹھا بلیک برڈ کی آواز پر کان لگائے ایک مشفقانہ نظم موزوں کر رہا تھا کہ راستے میں پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ دو درختوں کے بیچ میں آگے آگے لڑکی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ لال لال گالوں والا دہقان بھاگتے نظر آئے۔ ایشرسٹ سے بیس گز کے فاصلہ پر آ کر لڑکی ٹھہر گئی۔ جو نہی وہ پہنچا، دونوں آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑی۔ دہقان آگے بڑھا گیا۔ لڑکی اسے پیچھے ہٹاتی رہی۔ لڑکی کے چہرہ پر طیش اور پریشانی تھی۔ دہقان کے لڑکے کا چہرہ؟ کسی کو یہ معلوم تھا کہ اس دہقان کے لال چہرے پر بھی اتنا اضطراب ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایشرسٹ کو یہ منظر دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے اسے دیکھا۔ میگن نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیئے اور جھجکتی ہوئی ایک درخت کے تنے کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ دہقان گھبرا کر کنارے کی طرف بھاگ نکلا اور چھلانگ لگا کر غائب ہو گیا۔ ایشرسٹ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لڑکی کے پاس آیا۔ وہ حسن کی مورت ہونٹ کو دانتوں میں دبائے بالکل ثبت بنی کھڑی تھی۔ نظریں زمین میں دوز تھیں۔ ملائم سیاہ بال چہرے پر پریشان تھے۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "میں معافی مانگتا ہوں۔"

لڑکی نے سر نیچا ڈالے پلکیں اٹھا کر نیچی نیچی آنکھوں سے ایشرسٹ کو ایک نظر دیکھا۔ ایک سسکی بھری اور مڑ کر چل دی۔

ایشرسٹ اس کے پیچھے گیا۔

"میگن"

لیکن وہ نہ رکی۔ آخر ایشرسٹ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے اسے اپنی طرف موڑ کر کہا۔

"ٹھہر جاؤ۔ مجھ سے بات تو کرو۔"

"آپ مجھ سے کیوں معافی مانگتے ہیں؟ مجھ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا تو میں جو سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

"اسے میرے پیچھے آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"تم پر عاشق ہوگا اور کیا؟"

لڑکی نے زور سے پاؤں زمین پر ملا۔

ایشرسٹ ہنس دیا۔ "کہو تو میں اسے ڈانٹ دوں؟"

لڑکی یکلخت جذبہ سے بے قابو ہو کر رونے لگی۔

"آپ مجھ سے دل لگی کر رہے ہیں۔ آپ ہم لوگوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔"

ایشرسٹ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ یہی کہ اس کا تمتمایا ہوا چھوٹا سا چہرہ اس کے پریشان بال ایک سیب کے درخت کے گلابی شگوفوں میں جا لگے۔ ایشرسٹ نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ دل میں سوچا کہ

یہ حرکت کیسی تھی تو ور کیا ہوں۔ وہ لڑکی جو میرے مقابلہ میں کتنی حقیر ہے اور یہ احساس محض اتنی بات سے پیدا ہوا کہ اس لڑکی نے اس کا ہاتھ کو ہونٹوں سے چھو لیا تھا۔ میگن اس وقت تک اپنا جسم چرائے کھڑی تھی لیکن صبا یکلخت تھر تھر کانپتی ہوئی ایشرسٹ کی طرف بڑھی۔ میٹھی میٹھی سی حرارت ایشرسٹ کے بدن میں سر سے پاؤں تک پھیل گئی۔ سمجھ گیا کہ اس نازک بدن بھولی بھالی دوشیزہ کو میرے چھونے سے کس سے خوشی ہوئی ہے۔ بلکہ بے تاب ہو کر باہیں اس کے گرد ڈال دیں۔ اور سینے سے لپٹا کر اس کا منہ چوم لیا پھر کچھ سہم گیا۔ میگن کا رنگ سفید تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے بے رنگ رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی بے جان بازو پہلوؤں کے ساتھ لگے تھے۔ اس کے سینے کے مس سے ایشرسٹ کے بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ ایک آہ بھر کر کہا۔ میگن اور اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس گہری خاموشی میں ایک بلیک برڈ چہچہایا۔ پھر لڑکی نے ایشرسٹ کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ پہلے رخسار پھر ہونٹوں سے لگایا۔ اور اسے دیوانہ وار چوما اور پھر بھاگ کر سیب کے درختوں کے کائی دار تنوں میں غائب ہو گئی۔

ایشرسٹ ایک پرانے مڑے تڑے درخت پر جس کی شاخیں زمین کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں بیٹھ گیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور حواس پریشان تھے۔ ان گلابی کلیوں کو جن میں کی ایک کلی کھل کر سفید ستارہ بن گئی تھی۔ ان شگوفوں کو مکھیوں نے میگن کے بالوں کے ارد گرد پھولوں کا ایک تاج گوندھ دیا تھا۔ کبھی گھورتی نظروں سے تکتا جن کے ہاتھوں شکست کھائی تھی یا خدا جانے بہار کا جادو چل گیا تھا۔ بہر حال دل مسرت اور احساس فتح مندی سے لبریز تھا۔ ٹانگیں اور بازو پھڑک رہے تھے۔ کچھ سہما ہوا بھی تھا۔ یہ آغاز ہے مگر کاہے کا آغاز؟ بھنگے اسے کاٹ رہے تھے۔ مچھر اڑ اڑ کر اس کے منہ میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ککو اور بلیک برڈ چہچہا رہے تھے۔ بیشل ہنس رہے تھے سورج کی شعاعیں زمین کے متوازی پڑ رہی تھیں۔ سیب کے شگوفے کھلے ہوئے تھے اس کے چاروں طرف بہار کی کیفیات میں پہلے سے زیادہ حسن اور پہلے سے زیادہ زندگی آگئی تھی۔ درخت کے تنے سے اٹھا اور باغیچے سے باہر نکل گیا۔ اسے کسی کھلی جگہ اور کھلے آسمان کی ضرورت تھی۔ جہاں چل کر اپنے جذبات سے مفاہمت کرے۔ اس نے جنگل کا رخ کیا۔ جھاڑیوں میں سے ایک میگ پائی نے ایش کے درخت پر سے اڑ کر جنگل والوں کو اس کے آنے کی خبر کر دی۔

جس شخص کی عمر پانچ سال سے زیادہ ہو۔ اس کے متعلق کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسے کبھی عشق نہیں ہوا؟ جب رقص کی تعلیم لے رہا تھا تو جن کے ساتھ ناچتا تھا ان پر عاشق تھا۔ اسکول کی چھٹیوں میں کئی لڑکیوں پر عاشق ہوا۔ عشق کا نشہ جب ایک دفعہ چڑھنا شروع ہوا تو پھر شاید ہی کبھی اترا۔ ہمیشہ (کم و بیش دور سے) کسی نہ کسی کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ عشق سب سے زیادہ نرالا تھا یہاں دوری کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ یہاں تو روح مسرت سے لبریز تھی۔ اور دل میں مردانگی کے تکمیل پانے کا احساس تھا۔ ایسے جنگلی پھول کو ہاتھوں میں تھامے رہنا جب دل چاہے ہونٹوں سے لگا لینا اور اسے خوشی کے مارے کانپتے ہوئے محسوس کرنا۔ اس میں کتنا سرور ہے۔ ہاں مگر اس سرور کے ساتھ ساتھ ایک الجھن بھی ہے۔ اس پھول کو آخر کرے کیا؟ دوبارہ اس لڑکی سے کس طرح ملے؟ پہلا پیار تو کچھ ٹھنڈے دل سے کچھ ترس کھا کر کیا تھا! لیکن اب تو ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اب تو جانتا ہے کہ اسے بھی مجھ سے عشق ہے کس جذبہ کے ساتھ اس نے میرا ہاتھ کو چوما تھا۔ کس زور کے ساتھ اسے سینے سے لگایا تھا بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب انھیں خراج عشق ادا کیا جائے تو ان کی فطرت میں ایک گرمجوشی آ جاتی ہے۔ لیکن ایشرسٹ ان لوگوں میں سے تھا جو محبوب بن کر جھک جاتے ہیں۔ کسی کو گرویدہ دیکھ کر خود مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے جذبات میں گرمی اور طبیعت میں گداز پیدا

سمجھا جاتا ہے۔ وہ عشق کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔ جس سے ان کی فطرت میں ایک طلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔

ایلزرسٹ جنگل کے ٹیلوں کے پاس بیٹھا عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ دل کے اندر جو بہار کھل گئی تھی۔ اس کے مزے لوٹنے کیلئے تیار تھا۔ لیکن فطرتاً بھی تصلب سا معلوم تھا کہ کس چیز سے لیکن شاعرانہ تھا دل سے کتنا ایسی خوبصورت لڑکی بھولا بھالا چہرہ چمکتی چمکتی آنکھیں۔ اس کے دل پر فتح حاصل کر لینا یہ کیا کچھ کم فخر کی بات ہے اب خدشہ کا ہے کا ہے لیکن پھر ایک معنوی سنجیدگی کے ساتھ سوچتا یہ سب کچھ سہی۔ لیکن تم انجام سے پوری طرح واقف ہو۔ مجھ سے کام لو۔

اپنے خیالات میں محو تھا کہ شام ہو گئی۔ چاولوں کے تڑتے ہوئے شاہی دھنس کے ڈھیروں پر تاریکی چھا گئی۔ اور قدرت کی کارفرمائی کہا یہ تمہارے لئے نئی دنیا ہے۔ جس طرح انسان گرمیوں کے موسم میں صبح چلنے کے اٹھ کر باہر نکل جائے تو چرند پرندے گھور کر دیکھتے ہیں۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے گویا ہر چیز نئی ہے۔

وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہا۔ لیکن جب سردی محسوس ہونے لگی تو اٹھا۔ پتھروں اور بید کی جھاڑیوں کے بیچ سے راستہ ٹٹولتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ سڑک کی پگڈنڈی پر نکلا اور پھر مرغزار کے برابر ہوتا ہوا باغیچے میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیا سلائی جلائی اور گھڑی کو دیکھا ساڑھے بجنے والے تھے! چھ گھنٹے پیشتر دن کی روشنی کچھ کچھ باقی تھی اور پرندے چہچہا رہے تھے۔ لیکن اب تو چاروں طرف تاریکی مسلط تھی اور کہیں کہیں زندگی کے آثار نظر آتے تھے۔ اور پھر اس نے یکلخت اپنے عشق و دستانی کو بیرونی نقطۂ نظر سے دیکھا تصور میں اس بھگاگ عورت یعنی مسز نیرد کو صبح کی ترش روئی اس کی سانپ کی سی مڑی ہوئی گردن اس کی تیز سیاہ آنکھ سب باتوں کا جائزہ لیتی ہوئی دکھائی دی۔ جیتی وضع والوں کے شبہات اور ان کے ناشائستہ طعنے سنائی دیئے۔ اکڑ جو کا چہرہ غصہ سے لال نظر آیا۔ صرف دکھ بھری آنکھوں والا لنگڑا جم ہی ایسا تھا جس کا تصور تکلیف دہ نہ تھا گاؤں کے شراب خانہ میں کیا کیا چہ میگوئیاں نہ ہوں گی۔ بوڑھی عورتیں جنہیں اکثر سیر کے وقت سڑک پر چلتے دیکھا تھا کیا کیا باتیں نہ بنائیں گی۔ اور پھر اس کے اپنے دوست کیا کہیں گے۔ رابرٹ گارتھ تو رخصت ہوتے وقت واقفکارانہ انداز سے اور طنز کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ اس کا دل گھن سے بھر گیا۔ مجھے پھر کو اسے اس رسمی محنت زدہ دنیا سے نفرت ہو گئی جس میں انسان زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ جس پھاٹک کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی سیاہی مدھم پڑ گئی۔ اور ایک نور کی جھلک اس کے پاس سے گذر کر نیلی نیلی تاریکی میں پھیل گئی۔ چاند نکل آیا۔ ایلزرسٹ نے مڑ کر دیکھا عجیب نظارہ تھا۔ چاند مٹی کے پشتہ پر دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن سرخ اور تقریباً گول ایلزرسٹ نے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ پگڈنڈی پھولدار اور گوبر اور نوخاستہ سبزے کی خوشبو آ رہی تھی۔ احاطے میں مویشی بڑے بڑے کالے کالے دھبے سے معلوم ہوتے تھے۔ اس سیاہی میں کہیں کہیں ان کے پیلے پیلے سینگوں کے قوس دکھائی دیتے تھے جیسے آسمان سے ہلال نوکوں کے بل آ گرے ہوں گھر میں کہیں روشنی نظر آئی۔ دبے پاؤں ڈیوڑھی تک پہنچا اور ایک یو کے درخت کی تاریکی میں گم ہو کر میگن کی کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ نہ معلوم میگن سو رہی ہے یا اس کی جدائی میں پریشان اور بے قرار کروٹیں بدل رہی ہے۔ کھڑکی کو تکتا رہا تھا کہ ایک الو بولا۔ بجز ندی کے ہلکے ہلکے مسلسل و متواتر شور کے چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ الو کی آواز جیسے تاریکی میں گونج اٹھی۔ دن کو گکوؤں کا چہچہانا۔ رات کو الوؤں کا بولنا۔ ایلزرسٹ کے دل کے ہنگاموں کا ان سے بہتر ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ دفعتاً میگن نے کھڑکی کے باہر جھانکا۔ ایلزرسٹ درختوں سے ذرا ہٹ آیا اور نہایت ہلکی آواز میں بولا۔ "میگن میگن مجھے پہنچی۔

غائب ہو گئی۔ پھر آنی نظر آگئی۔ ایلبرٹ اس گھاس کے قطعہ پر پنجوں کے بل آگے بڑھا، سبز گھاس سے ٹکرا گئی۔ وہ ایک لمبا سینگ ہے کے چہرے اور پھیلے ہوئے بازو دیں جو غیر واضح نظر آ رہے تھے کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ایلبرٹ نے فکر کا سر جھکا کر دیوار کے ساتھ لگا دی۔ وہ چپ چاپ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھایا تو میگن تک جا پہنچا۔ میگن کے ہاتھ میں دروازے کی ایک بڑی سی چابی تھی ایلبرٹ نے گرم ہاتھ ٹھنڈی چابی سمیت زور سے پکڑ لیا۔ میگن کا چہرہ دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ ہونٹوں کے بیچ میں دانت چمک رہے تھے۔ اور بال پریشان تھے کپڑے اس نے بھی نہ اتارے تھے۔ بے چاری ایلبرٹ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ "خوبصورت میگن!" اس کی گرم گرم کھردری انگلیاں ایلبرٹ کی انگلیوں سے لپٹ گئیں۔ بشرے سے کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھی چہرے پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی اس کے چہرے تک ہاتھ پہنچ جانا بھی کیسی خوش نصیبی ہے! "تو پھر بولا۔ سونٹ برانڈ کی خوشبو ایلبرٹ کے نتھنوں میں سما گئی۔ قدم کا ایک کتا بھونکا۔ میگن کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"گڈ نائٹ میگن!"

"گڈ نائٹ جناب!" وہ چلی گئی۔ ایلبرٹ آہ بھر کر نیچے اترا۔ کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ اس کے سوا اب کیا ہو سکتا ہے کہ چپ چاپ جا کر سو رہے۔ لیکن پھر بھی وہ بہت دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے بازو ادس میں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ نیم متبسم چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہ گرم انگلیاں۔ اسے یاد آ رہی تھیں جو چابی اس کی ہتھیلی میں دبا کر اس کے ہاتھ کو لپٹ گئی تھیں۔ اور ایلبرٹ پر ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔

(۵)

رات کو بھوکا ہی سو گیا تھا۔ لیکن صبح اٹھا تو طبیعت میں گرانی تھی۔ جیسے رات کو کھانا پیٹ بھر کر کھایا ہو۔ کل کی سرگزشت عشق برسوں پہلے کی ایک کہانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس دن پھر صبح میں ایک عجیب سی دلفریبی تھی۔ بہار کا موسم آج پورے جوبن پر تھا۔ ساتوں رات سنہری پھول تمام مرغزار پر چھا گئے تھے۔ اور کھڑکی میں سے باغیچہ سیب کے شگوفوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جیسے کسی نے گلابی اور سفید رنگ کا لباس بچھا دیا ہو۔ جب ایلبرٹ نیچے اترا تو دل ڈر رہا تھا کہ میگن سے سامنا نہ ہو جائے لیکن جب اس کا ناشتہ میگن کے بجائے مسز نیرد کو میز پر لانا پڑا تو ایلبرٹ کو ناگوار گزرا اور مایوسی ہوئی۔ آج مسز فیرد کو سب کی تیز آنکھ اور سانپ کی سی گردن پہلے سے بھی زیادہ چوکنا تھی۔ اسے کہیں معلوم تو نہیں ہو گیا؟

"اچھا مسٹر ایلبرٹ۔ رات آپ گویا چاند کے ساتھ ساتھ سیر کرتے رہے۔ کھانا بھی کہیں کھایا یا نہیں؟"

ایلبرٹ نے سر ہلا دیا۔

"ہم نے تو آپ کے لئے کھانا رکھ چھوڑا تھا لیکن میں جانوں آپ کا دماغ اتنا مصروف تھا کہ کھانے کا خیال بھی نہ آیا ہو گا؟"

کیا وہ اپنے ویلز کے لہجے میں (جس پر کہیں کی بولی بہت غالب آتی جا رہی تھی) اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ اگر اسے اس بات کا علم ہو جائے تو ـــــ! ایلبرٹ نے اس وقت دل سے کہا: "نہیں نہیں میں یہاں سے چلا جاؤں گا"

میاں بی بی میں آئے دن بات [illegible] میں تنا کرتی ہوں - دونوں کے
بول، تو نہیں سکتی مگر جہاں [illegible] خیال کیا ہو ابا جان کی رائے اکثر درست اور
[illegible] بات کی پچ کرتی رہتی ہیں - اگرچہ ان میں [illegible]
کرنے کا [illegible] نہیں لیکن اتنا تو سمجھ میں آتا ہی کہ دونوں کے خیال ایک دوسرے
سے [illegible] ہیں کہ ایک کہتا ہو رات تو دوسرا کہتا ہو دن - اور یہی سبب ہو کہ ابا جان جیسے
[illegible] میری دل سے کچھ یوں ہی سا دخل دیتے ہیں وہ بھی جب کہ اماجان زبردستی ان کو
[illegible] ہیں اُن کے بشرے سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ وہ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے
اور [illegible] ہاں میں ہاں ملا دیا کرتے ہیں - اچھا تو فرض کرو کہ اماجان نے اپنے خیال اور
اپنی مرضی کا داماد ڈھونڈا اور فرض کرنے کا کیا محل ہی یوں ہی ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہی
اور یوں [illegible] ہوگا ابا جان بچارے کی تو نہ چلی ہی اور نہ چلے گی تو یہی کھٹ پٹ وہاں مجھسے
رہا کرے [illegible] یہ دونوں تو صبح کو لڑے شام کو مل گئے اور میرا مزاج ہی اَور طرح کا - مجکو تو کسی
کی بات کی مطلق برداشت نہیں - کوئی میری ذری سی بات بھی کاٹتا ہی تو بے اختیار میرا جی چاہتا
[illegible] کاٹ کھاؤں - ایسے آدمی کے ساتھ میرا تو ایک دن بھی گزر ہونا مشکل ہی - بعزہ
[illegible] کنوارا بیٹھنا ہزار درجے بہتر - اچھا تو نرے سوچنے سے تو کچھ فائدہ نہیں -
ایسا [illegible] ہو کہ میں اپنی جگہ سوچتی کی سوچتی ہی رہوں اور یہ لوگ اپنی کرنی کر گزریں -
کیا کروں کس سے کہوں میری سہیلیوں میں تو کوئی اس قابل نہیں - پیٹ کی ہلکیاں چھچھوری
[illegible] کہنا تو سارے شہر میں اپنے تئیں رسوا کرنا ہی - ودا استری بہتری - اس کو تو ڈھب
[illegible] کا بھی سلیقہ نہیں - اور پھر کسی سے کہوں بھی تو وہ اپنے جی میں کیا خیال
[illegible] ہمیشہ [illegible] میں اُس کی نظروں سے گر جاؤنگی - اتنے لوگوں میں ایک ہی
[illegible] آتا ہی کہ میں اُس سے اس بارے میں کچھ کہوں اور وہ مجکو حقارۃ سے
[illegible] کسی طرح کی بدگمانی اُس کے ذہن میں نہ آئے اور ساتھ ہی میری تائید
بھی [illegible] - لیکن ارادہ کرنا آسان ہی اور ڈو بڈو کہنے کو چاہیئے ہمت -
وہ مجکو چاہتے بھی بہت ہیں اور میں اُن کی خدمت میں کسی قدر گستاخ بھی ہوں اور محبۃ کی

لیکن ناشتہ کر چکنے کے بعد میگن سے ملنے کی خواہش ہر لحظہ بڑھتی گئی۔ دل میں ڈر تھا کہ کہیں کسی نے اس سے ایسی ویسی بات نہ کہی ہو جس سے سب بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ تاہم دل میں کچھ کالا کالا ضرور ہے جو صبح سے اس نے خیال تک نہیں کیا کہ وہ حقیقتہً نظم جو کل سہ پہر کو سیب کے درختوں کے نیچے اس پر اس قدر چھائی ہوئی تھی اب اسے اتنی پھیکی معلوم ہوئی کہ گزشتہ سہ پہر اس کی چھپیاں جا بجا کر اس نے پاپ سنا دیا۔ اس ہاتھ کو پکڑ کر چوم لینے سے پہلے وہ عشق کی رمزوں سے بے خبر تھا۔ اب اس لڑکی کی کیفیت ایسی نہیں جس سے وہ بے خبر ہو۔ لیکن ان کیفیات کو نظم کرنا گویا پانی کی لہریں گننا ہے۔ ٹیک کتاب لانے کو سونے کے کمرے میں گیا۔ وہاں پہنچا تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میگن اس کا بستر لگا رہی تھی۔ ایشرسٹ دروازہ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ میگن نے جھک کر تکیے کو عین اس کی جگہ پر جہاں ایشرسٹ کے سر رکھنے سے جھک گیا تھا چوم لیا۔ ایشرسٹ کے دل میں بلحاظ مسرت کا ایک طوفان بپا ہوا۔ اب اس پر کس طرح ظاہر کرے کہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ اگر دبے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے آہٹ سن پائی تو اور بھی برا ہوگا۔ میگن نے تکیے کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رخسار کے نقش کو مٹانا نہیں چاہتی۔ پھر اسے نیچے رکھ دیا۔ اور دروازہ کی طرف مڑی۔

"میگن"

لڑکی نے چونک کر اپنے ہاتھ رخساروں پر رکھ لیے۔ لیکن اس کی آنکھیں ایشرسٹ کے آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ ایشرسٹ کو ان چھلکتی ہوئی آنکھوں کی گہرائی پاکیزگی اور ان میں رقت انگیز وفا کی جھلک۔ ان کا اس قدر احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ رک رک کر بولا۔

"رات تم میرے انتظار میں بیٹھی رہیں۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں"

لڑکی کچھ نہ بولی۔

"میں رات جنگل میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ بڑا سہانا وقت تھا۔ اب میں یہ کتاب لینے اوپر آیا تھا"

میگن کا وہ تکیہ کو بوسہ دینا یاد آیا۔ ہمت بڑھی۔ دل میں ایک جوش سا اٹھا۔ قریب آیا اور اس کی آنکھیں چوم لیں۔ رگوں میں خون تیز تیز دوڑنے لگا۔ دل نے کہا۔ "اب بتاؤ کل جو کچھ ہوا تھا۔ وہ تو وقتی۔ اضطراری حالت میں سرزد ہوا تھا۔ لیکن اب؟ اب کس منہ سے کہو گے کہ ....." لڑکی نے اپنا ماتھا ہونٹوں سے الگ نہ کیا۔ ایشرسٹ کے ہونٹ نیچے کو سرکتے گئے اور آخرکار میگن کے ہونٹوں سے جا ملے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو مکمل احساسِ عشق کے ساتھ چوما ہو۔ بوسہ عجیب سا کیف آور تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک معصومیت سی بھی تھی۔ اس سے دونوں میں سے کس کا دل زیادہ تڑپا ہوگا؟

"رات کو جب سب لوگ سو جائیں تو اس بڑے سیب کے درخت کے پاس ملنا۔ میگن وعدہ کرو"

میگن نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ "میں وعدہ کرتی ہوں"

میگن کا رنگ فق تھا۔ ایشرسٹ نے کچھ اسے دیکھ کچھ اس سارے واقعہ پر غور کیا۔ سہم گیا۔ لڑکی کو چھوڑ کر نچلی منزل میں آیا۔ جانتا تھا کہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس کے عشق کو قبول کر لیا۔ اپنا عشق ظاہر کر دیا۔ اب باقی کیا رہ گیا ہے۔ کتاب لانا تو بھول ہی گیا تھا۔ خالی ہاتھ اس تنبز کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے سامنے اور پیچھے قدم سے لوگ کام کاج میں مشغول تھے۔ لیکن

ایشرسٹ کی نظریں مبہوت تھیں۔ پاٹرا بھی بہہ رہا تھا۔ پچھتا بھی رہا تھا۔ نہ معلوم کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر جو دیکھا تو دائیں ہاتھ کو ذرا پیچھے ہٹ کر جو کھڑا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کھیت پر سے ابھی ابھی لوٹا ہے۔ جسم کا بوجھ کبھی اس ٹانگ پر ڈالتا کبھی اس ٹانگ پر۔ چہرے کا رنگ ڈوبتے سورج کی مانند تھا۔ نیلی قمیص کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بازوؤں کی رنگت اور چمک پکے ہوئے آڑوؤں کی مانند تھی۔ لال لال ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح سنسناتی دیتا تھا۔ نیلی نیلی آنکھیں سن کی سی پلکیں۔ نظریں ایشرسٹ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ ایشرسٹ نے طنز سے پوچھا۔

"کیوں جو۔ کوئی خدمت میرے لائق؟"

"ہاں"

"کیا؟"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں تمہاری ضرورت نہیں!"

ایشرسٹ پہلے ہی کون سا مسکین صورت تھا۔ اور اب تو وہ اور بھی تن کر بولا۔

"تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ لیکن تمہیں خدائی وعدہ دار بننے کو کس نے کہا؟"

جو ایک دو قدم آگے بڑھا۔ محنتی نوجوانوں کے پسینے کی بو ایشرسٹ کے نتھنوں کو ناگوار گزری۔

"تم یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟"

"میری مرضی"

"چندیا کی استری ہو گی تو مرضی ورضی سب بھول جائے گی"

"تو تمہارا ہاتھ کس نے روکا ہے؟"

جو نے کچھ نہ کہا۔ صرف سانس اور بھی تیز ہو گیا۔ جوان اور بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح آنکھوں سے آگ برسنے لگی غصہ کے مارے چہرے کے پٹھے اینٹھ گئے۔

"میگن تمہیں نہیں چاہتی"

اکھڑ۔ بدتمیز دہقان کی یہ بات سن کر ایشرسٹ کے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ حقارت اور غصہ اور حسد سے ہکا بکا ہو گیا۔ اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ یکلخت اٹھا کرسی پیچھے کو دھکیل دی اور بولا۔

"ایسی کی تیسی تمہاری"

یہ الفاظ منہ سے نکلے تو سامنے میگن نظر پڑی۔ بادامی رنگ کا کتے کا پلا گود میں اٹھائے دروازہ میں کھڑی تھی۔ جلدی سے پاس آئی اور بولی۔

"دیکھو اس کی آنکھیں نیلی ہیں"

جو چل دیا۔ گردن کا رنگ بیچ بیچ زردی سہما تھا!

ایشرسٹ نے کتے کے ہونٹوں کو پیار سے چھیڑا۔ کتا بڑے مزے سے مینڈک کی مانند موٹا تازہ پیٹ

میگی کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔

"یہ ابھی سے تمہیں پیار کرنے لگا ہے۔ سبھی تم سے پیار کرتے ہیں۔"

"جو آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہتا تھا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میگی کو تمہاری ضرورت نہیں۔"

لڑکی نے پاؤں زور سے زمین پر مارا۔ پھر آنکھ اٹھا کر ایک بیمار کی نظروں سے ایشرسٹ کو دیکھا۔ ایشرسٹ کانپ اٹھا جیسے کسی پروانے کے پر جلتے دیکھ لیے ہوں۔

"نہیں!" سر جھکا کر کتے کو پیار کیا اور اس کے موٹے تازے جسم سے چہرہ ڈھانپے اندر چلی گئی۔

ایشرسٹ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ مگر اسے پھاٹک پر وہ لنگڑا آدمی ملا۔ گائیں چرا رہا تھا۔ ایشرسٹ بولا "ہم بڑا اچھا موسم ہے۔"

"گھاس کے لئے بہت اچھا ہے۔ اس لئے اوک کے درخت ایش کے درختوں سے پہلے ہرے ہوں گے۔ مثل ہے کہ جب اوک کے درخت ایش سے پہلے ———"

ایشرسٹ نے یونہی پوچھا۔ "ہم جب تمہیں جپسی جو نظر آیا تھا تو تم کہاں کھڑے تھے۔؟"

"بس اس بڑے سیب کے درخت کے نیچے کچھ سمجھئے۔"

"کیا واقعی بھی کچھ تھا یا یونہی؟"

"اب یہ تو خدا جانے۔ کم از کم مجھے یہی معلوم ہوا کہ کھڑا ہے۔"

"یہ ہوتا آتا کیوں ہے؟"

لنگڑے آدمی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کسی کی برائی نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ مسٹر نیرد کو سب نسل کا جپسی تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جپسی لوگ اپنی نسل کے آدمی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح خبر ہو گئی ہوگی کہ مسٹر نیرد کو مرنے والا ہے۔ چنانچہ انہوں نے بھوت کو بھیجا کہ جاؤ تم پاس رہو ——— میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"دیکھنے میں کیسا تھا؟"

"چہرے پر بال ہی بال۔ یوں چلتا تھا جیسے ہاتھ میں فڈل اٹھا رکھا ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں بھوت پریت سب جھوٹ ہے۔ لیکن صاحب اندھیری رات میں اس کتے کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہوئے تو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ خود چاہے مجھے بھوت نظر نہ آیا ہو۔"

"چاند نکلا ہوا تھا؟"

"کوئی بارھویں تیرھویں رات تھی۔ چاند ابھی ابھی نکلا تھا۔ اور اوک کے درختوں کے پیچھے سنہری دکھائی دے رہا تھا۔"

"تمہارا خیال ہے بھوت خوش ہوتے ہیں۔"

منگشے اودی نے اپنی ٹوپی پیچھے سرکادی اور اپنی چھوٹی چھوٹی نظروں سے ایشرسٹ کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا۔

"صاحب یہ تو خدا جانتا ہے لیکن یہ بھوت ہیں بڑے مزے کے۔ کیل پھرتے رہتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ خدا نے ان بیچاروں کو کیا دیا ہے۔ بعض لوگوں کو کچھ نظر آتا ہے بعض کو نہیں آتا۔ اب ہماری تو کیا، ہمارے لڑکوں کو لیجئے۔ سامنے کی چیز دکھائی نہیں دیتی لیکن میگن کی نظر کی مجال جو کبھی چوک جائے۔ جو چیز ہوگی دکھائی دے گی۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگا۔"

"وجہ یہ ہے کہ وہ حساس ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے وہ ہر چیز کو محسوس کرتی ہے۔"

"یہ سچ ہے۔ میگن کا دل بڑا نرم ہے۔"

ایشرسٹ کو اپنے چہرے پر خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ تمباکو کی تھیلی آگے بڑھا دی۔ "لو پائپ بھر لو۔"

"شکریہ حضور۔ بس لاکھوں میں ایک ہے یہ لڑکی۔"

ایشرسٹ نے جواب میں مختصر سا فقرہ کہا۔ تھیلی لپیٹ لی اور چل دیا۔

"اس کا دل نرم ہے۔ بجا لیکن میں بھلا کس فکر میں ہوں۔ میری نیت کیا ہے۔" ادھر ادھر کھیتوں میں گھومتا پھرا۔ لیکن اس خیال نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کھیتوں میں بزرگپ کے پھول اگ رہے تھے اور لال رنگ کے گھوڑے گھاس چر رہے تھے۔ آسمان پر ابابیلیں اڑ رہی تھیں۔ واقعی ایش کے درخت ابھی ہرے نہ ہوئے تھے۔ لیکن اوک کے درختوں پر بھورے بھورے سنہری پھول کھل رہے تھے۔ ہر درخت کا رنگ جدا تھا۔ کسی کی اٹھتی جوانی تھی۔ کوئی اپنے بھورے جوبن پر تھا۔ کوکو اور ہزاروں پرندے چہچہا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی ندیوں کا پانی دمک رہا تھا۔ قدیم زمانے کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ عیش و عشرت کا زمانہ آنے والا ہے..... باغ جنت میں...... ایک بھڑ اس کی آستین پر آ بیٹھی۔ ایک بھڑ سے دو ہزار بھڑیں پیدا ہوتی ہیں اور ایک بھڑ کو مار ڈالو تو گویا جو سیب ان شگوفوں سے اگیں گے۔ وہ دو ہزار بھڑوں کی دستبرد سے محفوظ ہو جائیں گے۔ پر کون ایسا سنگدل ہوگا جو ایسے خوشگوار موسم میں کسی کی بھی جان لے سکے۔ ایک کھیت میں سرخ رنگ کا ایک جوان سانڈ چر رہا تھا۔ ایشرسٹ نے اسے دیکھا تو جو کی فصل یاد آئی۔ لیکن سانڈ نے ایشرسٹ سے کچھ تعرض نہ کیا۔ شاید یہ پست قد جانور خود بھی اس سنہری چراگاہ کی خوبصورتی اور موسیقی سے مست تھا۔ ایشرسٹ بے کھٹکے ندی کے پاس ڈھلوان پر جا پہنچا۔ سامنے ایک پہاڑی چٹانوں کا تاج پہنے کھڑی تھی۔ بلیوبل اس کثرت سے اگ رہے تھے کہ ذہن پر ایک نیلی سی دھند چھا گئی تھی۔ اور سیب کے کوئی بیس درخت شگوفوں سے لدے کھڑے تھے۔ ایشرسٹ گھاس پر لیٹ گیا۔ کھیتوں کے منظر پر اوک کے درختوں اور بزرگپ کے پھولوں کا سنہری رنگ چڑھا ہوا تھا۔ لیکن یہاں نیلے رنگ کی پہاڑی کے دامن میں گویا آسمان کا حسن زمین پر اتر آیا تھا۔ ایشرسٹ اس رنگ کو دیکھ کر محو حیرت تھا۔ کلکوں کا چہچہانا اور ندی کا شور البتہ دلیسے ہی سنائی دے رہا تھا۔ بہت دیر تک لیٹا رہا۔ شہد کی مکھی کے سوا اور کوئی ساتھی نہ تھا۔ سورج نے رفتہ رفتہ اپنا رخ بدل لیا اور سیب کے درختوں کے سائے بلیوبل کے پھولوں پر پہنچ

جگہ جہاں سادھو بیٹھا جاتا تھا گھنی ٹہنیوں کے نیچے پہنچ کر وہ رک گیا۔ اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہی ہوائیں اب بھی سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ اور نیم خوابیدہ سفید دیمی آوازیں ڈکار رہے تھے۔ پاس کے کسی سے تنے کی کھوکھلی کالی اور سطح میں سے انگلی کی طرح کی خوشبو نکلی کیا وہ آئے گی؟ کیا سچ مچ؟ تھرتھراتے ہوئے مہتاب درختوں کے درمیان اس کے دل پر جوار کی طرح سے احاطہ کر لیا۔ یہاں کوئی شے بھی اس دنیا کی معلوم ہوتی تھی۔ یقیناً یہ مقام فانی عاشقوں کے لئے نہیں۔ ایشرسٹ اور اس دیہاتی لڑکی کے لئے نہیں۔ صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے لئے بنا ہے۔ اگر وہ ذاتی تو کیا طبیعت کا ایک اطمینان ایک ہلکی سی احساس نہ ہوگا! لیکن پھر بھی اس کے کان اس کی آہٹ سننے کے منتظر تھے۔ وہ معلوم پرند بدستور جپ جپ کر رہا تھا ندی کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا۔ اور درخت کی ٹہنیوں میں محبوس چاندنی کو جھلک رہا تھا۔ بلکہ کبھی ہر جوڑ شگوفے تھے وہ معلوم ہوتا تھا ہر لحظہ زندہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا پراسرار نقرئی حسن بھی ایشرسٹ کی بےتابی کا ایک جزو بنا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ٹہنی جس پر تین شگوفے کھل رہے تھے، توڑ لی۔ پھل دار درختوں کے شگوفوں کو توڑنا۔ پاکیزہ۔ مقدس۔ دلفریب شگوفوں کو توڑنا اور پھر پھینکنا کیا یہ گناہ عظیم نہیں؟ یکلخت پھاٹک کے بند ہونے کی آواز آئی۔ سور پھر جاگ اٹھے اور ڈکرانے لگے۔ ایشرسٹ درخت کے ساتھ سہارا لگائے کھڑا تھا اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کائی دار تنے کو دبا رہے تھے۔ میگن کو دیکھا تو حیرت سے دھک رہ گیا۔ اس کی خاموش رفتار ایک پری کی سی تھی جو درختوں کے بیچ میں پھر رہی ہو۔ جب قریب پہنچی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تاریک جسم ایک چھوٹے سے درخت کا حصہ ہے۔ اس کا سفید چہرہ شگوفوں میں ایک شگوفہ ہے۔ وہ چپ چاپ ایشرسٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایشرسٹ نے دھیمی آواز میں کہا "میگن!" اس کا ہاتھ بڑھاتے ہی وہ سیدھی دوڑ کر اس کے سینے سے آ لگی۔ جب اس کا دل اپنے دل کے ساتھ دھڑکتا ہوا محسوس کیا تو ایشرسٹ نے اپنے دل کو توقیر نسواں اور وفور عشق سے لبریز پایا۔ چونکہ وہ اس دنیا کی نہ تھی۔ نوجوان تھی۔ معصوم تھی۔ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھی۔ عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور کسی طرح اپنی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اس تاریکی میں اس کا محافظ نہ بنے تو اور کیا کرے؟ مگر چونکہ وہ سراپا حسن اور سادگی تھی۔ اور زندہ شگوفوں کی طرح بہار کی اس رات کا ایک جزو تھی۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ دے وہ سب کا سب قبول کر لے۔ اور اس کے دل کی پیاس اور اپنے دل کی بےتابیوں کی تکمیل نہ کرے! یہ دو جذبے اپنی اپنی طرف اسے کھینچ رہے تھے۔ لڑکی کو زور سے سینے کے ساتھ لگایا اور اس کے بالوں کو بوسہ دیا۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہ کتنی دیر دونوں یونہی خاموش وہاں کھڑے رہے۔ ندی بڑبڑاتی رہی۔ الو بولتے رہے چاند چپکے چپکے بلند اور سفید ہوتا گیا۔ ان کے اردگرد شگوفے زندہ حسن کے دل کی دھڑکن سے اور بھی چمک اٹھے۔ ہونٹوں کے وصل نے گفتگو کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گفتار کا یہاں کوئی کام نہیں۔ بہار صرف سرسراتی ہے۔ اور سرگوشیاں کرتی ہے۔ بہار بولتی نہیں۔ لیکن بہار کے کھلے ہوئے پھول پھوٹتی ہوئی کونپلیں۔ ندیوں کی سبک پائی۔ ان کی خوش آہنگ والہانہ جستجو یہ تقریر و گفتار سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ اسی طرح بہار بعض اوقات زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اور ایک پراسرار ساحر کی طرح دو عاشقوں کے پاس کھڑی ہو کر ان دونوں کے گرد اپنی باہیں ڈال دیتی ہے۔ اپنی انگلیوں کے مس سے ان پر اپنا جادو پھیر دیتی ہے۔ اور پھر وہ ہونٹوں سے ہونٹ ملائے بجز اس بوسے کے سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ جب میگن کا دل اس کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور میگن کے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر پھڑک رہے تھے ایشرسٹ کے دل کو بجز شیریں مسرت کے سوا اور کوئی احساس نہ تھا۔ قسمت ہی میں لکھا تھا کہ وہ اس کی آغوش کو زینت بخشے۔ عشق کا [illegible]

سکتا ہے۔ بلکہ جب سانس لینے کو ان کے ہونٹ جدا ہوئے تو دونوں کو احساس ہوا۔ البتہ عشق کا جذبہ اب پہلے سے زیادہ مونہہ زور تھا۔ الیشورسٹ نے آہ بھر کر کہا۔

"او میگی۔ تم کیوں آئیں؟"

میگی نے نظر اٹھائی۔ کچھ حیران تھی کچھ مجروح۔

"جناب آپ ہی نے بلایا تھا۔"

"میری جان مجھے جناب نہ کہو۔"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"فرینک۔"

"میں نہیں کہہ سکتی۔ ہرگز نہیں۔"

"تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟"

"دل پر میرا زور نہیں۔ میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں اور بس۔"

"بس؟"

دھیمی آواز میں جو بمشکل سنائی دیتی تھی۔ میگی نے کہا

"آپ کے پاس نہ رہ سکی تو میں مر جاؤں گی۔"

الیشرسٹ نے ایک لمبا سانس لیا۔

"تو آؤ پھر میرے پاس آؤ۔"

"اوہ۔"

اس "اوہ" میں جو شدت اور مسرت تھی۔ اس سے الیشرسٹ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ دھیمی آواز میں بولا۔

"میں تمہیں لندن لے چلوں گا۔ میں تمہیں سب دنیا کی سیر کراؤں گا۔ اور میگی میں تم سے کہتا ہوں کہ میں ہر طرح تمہارا خیال رکھوں گا۔ کبھی تم سے درشتی کے ساتھ پیش نہ آؤں گا۔"

"اگر میں آپ کے پاس رہ سکوں تو یہی کافی ہے۔"

الیشرسٹ نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا

"کل میں ٹارکی جاؤں گا اور وہاں سے روپیہ لے کر تمہارے لئے کپڑے خریدوں گا۔ ان کپڑوں میں لوگ خواہ مخواہ شبہ کریں گے۔ پھر ہم چپکے سے لندن چلے جائیں گے۔ اور وہاں پہنچ کر اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوئی تو شادی کریں گے۔"

میگی کے بالوں کی تھرتھراہٹ سے اس کے سر کی جنبش کا پتہ چلتا تھا۔

"نہیں نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

اپنی دیوانگی سے خود ہی مسحور ہو کر الیشرسٹ نے کہا

"نہیں بلکہ میں تمہارے قابل نہیں۔ میگن نہیں، مجھ سے محبت کب پیدا ہوئی؟"

"جب میں نے آپ کو سڑک پر دیکھا اور آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی۔ پہلی ہی رات مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی لیکن مجھے میرے وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ آپ مجھے چاہیں گے۔"

یکلخت گھٹنوں کے بل جھک کر ایشرسٹ کے پاؤں چومنے لگی۔

ایشرسٹ کانپ اٹھا۔ فوراً اسکو اٹھا لیا۔ اور بھینچ کر گلے سے لگا لیا۔ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔ میگن نے کہا۔ "آپ مجھے چومنے کیوں نہیں دیتے؟"

"مجھے تمہارے پاؤں چومنے چاہئیں۔"

میگن کی مسکراہٹ سے ایشرسٹ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چاندنی میں ایشرسٹ کے قریب میگن کے چہرے کی سفیدی اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ۔ ان میں سیب کے شگوفوں کا سا زندہ غیر ارضی حسن تھا۔

اور پھر یکلخت میگن نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا کھسک کر اس کی آغوش سے اپنا آپ چھڑا لیا اور بولی۔

"وہ دیکھو!"

ایشرسٹ کو روشن ندی۔ ہلکے سنہری رنگ کے چمکتے ہوئے بیچ کے درختوں اور ان کے پیچھے چاندنی میں اس پہاڑی کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ پیچھے سے اس کو میگن کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔

"جپسی بھوت!"

"کہاں؟"

"وہ درختوں کے نیچے۔ پتھر کے پاس۔"

ایشرسٹ نے بارفتہ ہو کر ندی کو پھاندا اور بیچ کے درختوں کی طرف چلا۔ چاندنی کا فریب ہے! کچھ بھی نہیں! اجالے اور تاریکی کے درختوں کے بیچ میں بڑبڑاتا، اور لعنتیں بھیجتا ادھر ادھر بھاگتا اور ٹھوکریں کھاتا پھرا۔ واہیات! فضول! پھر سیب کے درخت کے پاس گیا لیکن وہ جا چکی تھی۔ اسے ایک سرسراہٹ سوروں کے ڈکرانے اور پھاٹک کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ چلی گئی۔ صرف وہ پرانا سیب کا درخت وہاں رہ گیا۔ اس نے اپنی بانہیں تنے کے گرد ڈال دیں۔ کہاں اس کا نرم جسم کہاں یہ کرخت تنا! کھردری کائی اس کے چہرے کو چبھ رہی تھی۔ کہاں اس کا کھردرا پن۔ کہاں اس کا نرم رخسار! صرف خوشبو۔ جنگل کی خوشبو کچھ ویسی ہی تھی۔ اور اس کے اوپر اور اس کے اردگرد شگوفے پہلے سے زیادہ زندہ۔ چاندنی میں پہلے سے زیادہ روشن۔ دمکتے اور سانس لیتے معلوم ہوتے تھے۔

(ے)

ٹورکی اسٹیشن پر ریل سے اتر کر ایشرسٹ نے سمندر کا رخ کیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ رک رک کر ٹہلتا رہا۔ کیونکہ

بالکل سکما جل منصوبہ کی اس علامتی ڈرکی سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اپنے لباس کا چنداں خیال نہ تھا۔ اس لئے اسے اس بات کا احساس نہ ہوا کہ یہاں کے باشندے اسے تعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک موٹی سی نارفوک جیکٹ، گرد آلود بوٹ اور پھولدار ٹوپی پہنے لمبے لمبے قدم اٹھاتے چلا جا رہا تھا۔ اس بات سے مطلق بے خبر کہ لوگ اس بات کو حیرت سے تک رہے ہیں۔ اس کا بینک منتظر ہی تھا لیکن وہ اس تلاش میں تھا کہ یہاں اس کی کوئی شاخ موجود ہو تو یہیں سے روپیہ نکلوا لے۔ جب بینک میں پہنچا تو اس کے خوشگوار خیالات کو سخت دھچکا لگا۔ انہوں نے پوچھا آپ لڑکی میں کسی کو جانتے ہیں؟ جواب ملا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ لندن تار بھیج دیجئے وہاں سے جواب آنے پر ہم بڑی خوشی سے روپیہ ادا کر دیں گے۔ تجوری کاروباری دنیا کے مشتبہ سائنس نے اس کے درخشاں تصورات کو دھندلا کر دیا۔ لیکن تار اس نے بھیج دیا

ٹاکخانہ کے سامنے عورتوں کے ملبوسات کی ایک دوکان نظر پڑی۔ اس نے کھڑکی میں لٹکے ہوئے کپڑوں کو اپنائیت کے احساس کے ساتھ دیکھا۔ اپنی محبوبہ دہقان کے لئے کپڑے خریدنا خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔ دوکان کے اندر گیا ایک جوان عورت سامنے آئی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ماتھے پر خاصے تعجب کے آثار تھے۔ ایلفرسٹ بغیر کچھ بولے اسے تکتا رہا۔

"کہیے جناب؟"

"مجھے ایک نوجوان خاتون کے لئے لباس خریدنا ہے۔"

نوجوان عورت مسکرا دی۔ ایلفرسٹ نے ماتھے پر تیوری ڈالی۔ یکلخت اور بڑے عذر سے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ فرمائش انوکھی فرمائش ہے۔

نوجوان عورت نے جلدی سے کہا

"کس قسم کا لباس چاہیئے آپ کو؟ بہت وضعدار؟"

"نہیں سیدھا سادا"

"یہ نوجوان خاتون کس قد کی ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ بس تم سے دو انچ چھوٹی ہوں گی؟"

"کمر کا ناپ آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟"

میگن کی کمر!

"بس یہی جو عام طور پر ہوتا ہے!"

"بہت خوب!"

جب وہ چلی گئی تو ایلفرسٹ کھڑکی میں رکھے ہوئے لباسوں کو پریشان نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور یکلخت اسے خیال پیدا ہوا کہ میگن ـــــ اس کی میگن۔ سوائے کھردری پٹی کے سائے، کھردرے جامہ اور دہقانی ٹوپی کے لیے سوائے ان کپڑوں کے جن میں اسے بارہا دیکھا تھا کسی اور لباس میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی۔ نوجوان عورت بازو پر بہت سے کپڑے ڈالے واپس آ گئی۔ اور ایک ایک لباس کو اپنے عورت جسم سے لگا کر دکھانے لگی۔ ان میں سے ایک، کا تقاضی رنگ ایلفرسٹ کو بہت پسند آیا

لیکن میگن کو یہ لباس پہنے ہوئے تصور نہ کر سکتا تھا۔ نوجوان عورت چلی گئی اور چند اور کپڑے اٹھا لائی۔ لیکن [illegible] تھا کیا چنے اور کیا نہ چنے؟ ٹوپی اور جوتا اور دستانوں کی بھی ضرورت تھی اور فرض کرو سب کچھ خرید کر اسے پہنا دیا اور اس طرح نے اسے بالکل ہی بے رنگ بنا دیا جیسے اکثر کپڑے اکثر دیہاتیوں کو بنا دیتے ہیں تو پھر کیا ہوگا؟ سفر میں بھی اپنے ہی کپڑے کیوں نہ پہنے؟ ہاں۔ لیکن ان کپڑوں میں وہ بہت نمایاں معلوم ہوگی۔ یہ ہنسی کھیل نہیں۔ خود فکر کا معاملہ ہے۔ نوجوان عورت کو بے معنی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کیا معلوم یہ سب کچھ تازگی ہو اور مجھے ایک بدمعاش شخص سمجھی ہو۔ آخر کار بولا "یہ فاختئی رنگ کا لباس علیحدہ رکھ دو۔ میں اس وقت فیصلہ نہیں کر سکتا۔ دوپہر کے بعد آؤں گا۔"

نوجوان عورت نے ایک آہ بھری۔

"بہت اچھا۔ بہت خوبصورت لباس ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس سے عمدہ لباس نہیں مل سکتا۔"

الیشرسٹ نے کہا "غالباً نہیں۔" اور چل دیا۔

مشتبہ دنیا کے کاروباری پن سے ایک بار پھر آزاد ہو کر اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور پھر اپنے تصورات میں مشغول ہو گیا۔ تصور میں اس بھولی بھالی پیاری لڑکی کو دیکھا جو اپنی زندگی اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ کرنے کو تیار تھی۔ دیکھا کہ دونوں رات کے وقت چپکے سے باہر نکلے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ وہ جنگل میں جا رہے ہیں۔ اس کا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ہے۔ لڑکی اپنے نئے کپڑے اٹھائے جا رہی ہے۔ علی الصباح وہ کسی دور دراز جنگل میں پہنچ گئے ہیں۔ لڑکی نے اپنے پرانے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اسٹیشن پر صبح کی گاڑی تیار کھڑی ہے جس میں سوار ہو کر وہ اپنے ہنی مون کے سفر پر روانہ ہو گئے ہیں اور پھر لندن نے انہیں نگل لیا ہے اور عشق کے خواب سچے ثابت ہو رہے ہیں۔

"فرینک الیشرسٹ! واللہ رگبی کے بعد تمہیں آج دیکھا ہے!"

الیشرسٹ کے ماتھے کے شکن صاف ہو گئے۔ جو چہرہ اس کے قریب تھا اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بشرے پر آفتاب کی جھلک تھی۔ ایسے شخص کا چہرہ تھا جس کا آفتابِ دل آفتابِ فلک کے ساتھ مل کر اس کی زندگی کو درخشانی بخش رہا ہو۔

"ارے فل ہیلی ڈے!"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ یونہی گھوم رہا تھا۔ روپیہ لینے آیا تھا۔ میں جنگل میں رہتا ہوں۔"

"لنچ کے لئے کہیں جانا تو نہیں؟ آؤ ہمارے ساتھ لنچ کھاؤ۔ میرے ساتھ میری بہنیں بھی ہیں، انہیں خسرہ نکلا تھا۔"

ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دونوں وہاں سے روانہ ہوئے اور ایک پہاڑی رستے ہوتے ہوئے شہر سے باہر نکل گئے۔ ہیلی ڈے کا چہرہ آفتابی تھا تو آوازیں بھی بہجت اور تازگی اور خوش دلی پائی جاتی تھی کہہ رہا تھا کہ یہاں اجاڑ مقام میں تو سوائے نہانے اور کشتی چلانے کے اور کوئی شغل نہیں۔ ہوتے ہوتے مکانات کی ایک بالائی قطار کے سامنے آ کر ٹھہر گئے جو سمندر سے ذرا ہٹ کر واقع تھے۔ عین وسط میں ایک ہوٹل تھا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

رقعہ یا زبانی پیام آتا اور لوگ بے تکلف اس میں گفتگو اور رد و کد کرتے مگر آزادی ایسا
چپ چاپ اصلا الگ تھلگ بیٹھی رہتی کہ گویا اس کو کچھ سروکار ہی نہیں۔ پوچھنا اور صلاح
لینا تو در کنار۔ آزادی اگر لوگوں کی گفتگو کو دھیان دے کر اپنی تعلق کا اتنا سننا بھی داخل
بے شرمی سمجھا جاتا تھا۔ بیبیاں لگیں کن انکھیوں سے اشارے کرنے تو ماں نے بیٹی کو اس کی
[illegible] ار جب تمھارے بیاہ برات کا مذکور ہوا کرے تو تم ٹل جایا کرو یا ٹلنے کا
موقع نہ ہو تو آنکھیں نیچی کرکے سر جھکا لیا کرو [illegible] زمیں اس کی پرچول کرتی ہیں ایسا
نہ ہو کوئی کسمد صیانے میں جا لگا [illegible] اور دیکھو خبردار اپنی سہیلیوں میں بھی اس کی
احتیاط کرنا ورنہ بعض تیز لڑکیاں آپ ہی تو کھود کھود کر پوچھتیں اور آپ ہی محلے
ڈھنڈورا پیٹتی پھرتی ہیں [illegible] آزادی نے ماں کے کہنے اور دادا کے سمجھانے پر عمل تو خوب
[illegible] ہی دل میں کہتی تھی کہ عورت تو میری [illegible] ڈھونڈا اپنا بیاہ
[illegible] اسی طرح کی ایک میں ہوں کہ بولنا تو بولنا سننے تک کی ممانعت ہے۔ کیا حقیقت
میں یہ لوگ مجھکو ایک اجنبی آدمی کے حوالے کردیں گے جس کی صورت تک سے میں واقف
[illegible] مزاج کی کون کہے۔ ایسا غضب؟ اتنا اندھیر؟ اگر میں نے اس کو
ناپسند کیا یا میری اس کی مرضی نہ ملی تو میں تو جیتے جی مرلی [illegible] کہ یہ لوگ مجھ سے زیادہ
عقل رکھتے ہیں۔ انھوں نے دنیا کے نشیب و فراز بہت دیکھے ہیں اور سچے دل سے میرے
خیر خواہ ہیں (اولاد سے بڑھ کر بھی کسی کی چاہتا ہوگی؟) اور [illegible] میرے لئے بہتر سے بہتر
گھر تلاش کرنے میں ہرگز ہرگز کسی طرح کی کوتاہی نہیں کریں گے۔ مگر لاکھ ہو بھرنا تو مجکو پڑے گا
ماں باپ تو بیاہ کر فرض سے سبکدوش [illegible] مہمان کھائی کا بجا کر چلتے پھرتے نظر آئے کوئی
کسی کی آنچ میں نہیں جلتا میرا اکیلا دم ہوگا اور یہ پہاڑ زندگی۔ اگر تقدیر بھلی ہے اور
کسی اچھے سے پالا پڑا تو بیڑا پار ہے ورنہ ایک ایک گھڑی دشوار ہے۔ میں تو ایک موٹی سی بات
جانتی ہوں کہ اماں جان کو مٹھائی بہت بھاتی ہے اور میں سیروں مٹھائی گھر میں دھری رہتی
ہے کبھی بھول کر چکھتی تک نہیں۔ تو جس طرح کھانے پینے کی چیزوں میں میرا مذاق الگ
اُن کا الگ کون جانے اس بات میں بھی اُن کی رائے کچھ ہو اور میری کچھ۔ ان دونوں

"میرے کمرے میں آکر منہ ہاتھ دھو لو۔ لنچ ابھی تیار ہوا چاہتا ہے۔"

ایلیئرسٹ نے اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ فارم ہاؤس میں پندرہ دن تک صرف ایک کنگھی اور دو قمیصوں پر گزارہ کیا تھا اور یہاں تو کئی کپڑے اور کئی برش رکھے تھے۔ سوچا عجیب بات ہے۔ انسان کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ —— کاہے کا احساس؟ یہ اسے ٹھیک معلوم نہ تھا۔

بیلی ڈے کے ساتھ بیٹھنے کے کمرے میں جب گھسنے گیا تو تین حسین چہرے نظر آئے۔ رنگ بہت گورے، آنکھیں نیلی بیلی ڈے نے کہا۔ "یہ فرینک ایلیئرسٹ ہیں۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ہیں۔" تینوں کے چہرے یکلخت دمک اٹھے۔

دو تو بہت ہی چھوٹی تھیں۔ ایک دس سال کی، ایک گیارہ سال کی لیکن تیسری کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ قد لمبا۔ بال ہلکے رنگ کے۔ سرخ سفید رخسار جن کو سورج نے ذرا سنولا دیا تھا۔ بھنویں سنہری تھیں۔ دائیں بائیں ذرا اٹھی ہوئی تھیں۔ دہان کی رنگت سر کے بالوں سے قدرے گہری تھی۔ آنکھیں تینوں کی بیلی ڈے کی طرح نیلی اور بشاش تھیں۔ تینوں سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ جلدی جلدی ہاتھ ملایا۔ ایلیئرسٹ پر ایک مجسس نظر ڈال کر فوراً آنکھیں جھکا لیں۔ اور سہ پہر کے مشاغل کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ ایک ڈانٹا اور باقی دو اس کی داسیاں معلوم ہوتی تھیں۔ فارم کی زندگی کے بعد ان کی شوخ۔ پرجوش بے تکلف گفتگو۔ ان کا پرسکون مہذب جواب بے تکلف انداز شائستگی پہلے تو چونکا اور پھر اس قدر خوش معلوم ہوا کہ فارم ہاؤس کا ماحول یکلخت کسی دور دراز دنیا کا خواب معلوم ہونے لگا۔ چھوٹی بہنوں کا نام سبینا اور فریڈا اور بڑی کا نام اسٹیلا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سبینا اس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

"آپ ہمارے ساتھ مچھلیاں پکڑنے چلیں گے؟ بڑا لطف رہے گا۔"

اس غیر متوقع بے تکلفی پر متعجب ہو کر ایلیئرسٹ نے کہا۔

"مجھے تو آج سہ پہر واپس جانا ہے۔"

"اچھا؟"

"جانا ملتوی نہیں کر سکتے؟"

یہ سٹیلا کا فقرہ تھا۔ ایلیئرسٹ اس کی طرف مڑا اور سر ہلا کر مسکرا دیا۔ کیا حسن تھا۔ سبینا نے افسوس کے لہجے میں کہا "ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہو۔" اس کے بعد پھر تالابوں اور تیرنے کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

"آپ بہت دور تیر سکتے ہیں؟"

"قریباً دو میل۔"

"سچ مچ؟"

"خوب"

"واقعی؟"

تینوں نے نیلی نیلی آنکھیں اس کے چہرہ پر گاڑ دی تھیں۔ ایشرسٹ کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ خوشگوار احساس۔ ربیکا ڈے نے کہا۔

"ایشرسٹ تمہیں ٹھیرنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ نہانے نہ چلو گے؟"

"میں تو کہتا ہوں رات یہیں ٹھیر جاؤ۔"

"ہاں ضرور۔"

لیکن ایشرسٹ نے پھر مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اور پھر یکلخت ہی لڑکیاں اس کے کھیلوں اور جسمانی کرتبوں کے متعلق دھڑا دھڑ اس سے سوالات پوچھنے لگیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ کالج میں کشتی بھی چلاتا رہا ہے۔ فٹ بال کی ٹیم میں شامل تھا اور ایک میل کی دوڑ میں اوّل بھی آیا تھا۔ لنچ ختم ہونے تک اس نے اپنی ان صفات کی بدولت لڑکیوں کے دل میں گھر کر لیا۔ چھوٹی لڑکیاں مصر ہوئیں کہ ہمارے ساتھ چل کر وہ غار دیکھئے۔ جہاں ہم کھیلنے جاتی ہیں۔ چنانچہ طوطوں کی طرح باتیں کرتی وہ ایشرسٹ کو ساتھ لئے غار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ پیچھے پیچھے سٹیلا اور اس کا بھائی تھا۔ غار دوسرے غاروں کی طرح سیلا ہوا اور تاریک تھا۔ خوبی اس میں صرف یہ تھی کہ اندر ایک پانی کا تالاب تھا جس میں سے کئی جانور پکڑ کر بوتلوں میں بند کئے جا سکتے تھے۔ سبینا اور فریڈا نے جن کی سڈول سانولی پنڈلیاں موزوں سے بے نیاز تھیں۔ تالاب کے بیچ میں کھڑے ہو کر ایشرسٹ کو شمولیت کی دعوت دی۔ تاکہ تینوں اکٹھے مچھلیاں پکڑیں۔ ایشرسٹ نے ٹوپی اور موزے اتار دیئے۔ جس کے دل میں احساس حسن ہو اسے وقت گزرتا معلوم نہیں ہوتا۔ دو خوبصورت بچے پانی میں کھیل رہے تھے۔ نوجوان ڈائنا کنارے پر کھڑی تھی۔ اور جو کچھ وہ تالاب میں سے نکالتے تھے اسے حیرت اور تعجب سے پکڑتی جاتی تھی۔ ایشرسٹ یوں بھی وقت کا اندازہ ٹھیک نہ لگا سکتا تھا جب گھڑی جیب سے نکالی تو حیران رہ گیا۔ تین کب کے بج چکے تھے۔ گویا بنک بند ہو گیا ہو گا۔ اور روپیہ آج نہ مل سکے گا۔ اس کے بشرے کو دیکھ کر چھوٹی لڑکیاں چلانے لگیں۔

"آہا ہا — اب تو آپ کو ٹھیرنا ہی ہو گا۔"

ایشرسٹ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے میگن کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ناشتہ کے وقت میگن سے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ میری جان میں سامان خریدنے ٹورکی جا رہا ہوں۔ آج شام واپس آ جاؤں گا۔ اگر موسم اچھا ہوا تو آج رات ہی چل دیں گے۔ تم تیار رہنا۔ اسے یاد آیا کہ میگن تھر تھرا اٹھی تھی اور اس کے الفاظ کو سن کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ دل میں کیا کہے گی؟ پھر یکلخت احساس ہوا کہ تیسری لڑکی۔ لمبا قد۔ گورا رنگ۔ ڈائنا کا سا حسن۔ تالاب پر کھڑی تیز نیلی آنکھوں سے بغور اسے دیکھ رہی ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ اس کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ انھیں کیا معلوم کہ آج رات کے لئے اس کے دل نے کیا ٹھان رکھا تھا؟ اگر انھیں معلوم ہو جائے تو وہ نفرت کا اظہار کر کے اسے تنہا غار میں چھوڑ کر خود چلے جائیں۔ اس خیال سے کچھ ایسی ہوئی۔ کچھ شرم سی آئی۔ گھڑی کو جیب میں ڈال کر یکلخت بولا۔

"آہا ہا — اب تو آپ ہمارے ساتھ ہی نہائیں گے۔؟"

"یہ خوبصورت بچے کس قدر بے فکر تھے۔ سٹیلا مسکرا رہی تھی۔ ہیلی ڈے کہہ رہا تھا۔" لطف آ گیا۔ بس رات کے کپڑے

یہ باتیں دہرا دوں گا۔" اس تمام خوش دلی سے متاثر نہ ہونا ناممکن تھا۔ لیکن پھر بھی پشیمانی اور تمنا کے جذبات سے دل دھڑکنے لگا۔
اداسی کے لہجے میں بولا۔
"مجھے ایک تار بھیجنا ہے۔"
تالاب کے کھیل سے تنگ آ گئے تو ہوٹل کو لوٹ آئے۔ ایلبرٹ نے مسز نیزدکوم کے پتہ پر اس مضمون کا تار بھیجا۔
"افسوس ہے مجھے رات یہیں ٹھہرنا ہوگا۔ کل آ جاؤں گا۔" اس سے دل کچھ ہلکا ہو گیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی سی گرمی جسم کو بہت
اچھی معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پرسکون اور نیلا تھا اور ایلبرٹ تیراکی کا شوقین۔ خوبصورت بچوں کی تعریف و توصیف سے اس
کی نخوت کی تسکین ہوتی تھی۔ سٹیلا اور بلی ڈے کے بشاش چہرے کو دیکھ کر خوشی حاصل ہوتی تھی۔ گویا میگن کے ساتھ
ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنی اصلی زندگی کو آخری نظر دیکھ رہا ہے۔ بلی ڈے سے غسل کا لباس مستعار لیا اور
دیکھنے روانہ ہوئے۔ بلی ڈے اور ایلبرٹ نے ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کپڑے اتارے۔ سب سے پہلے ایلبرٹ پانی میں
داخل ہوا۔ اور یہیں پانی اپنی جو تعریف ان کو سنا چکا تھا اس کو سچ ثابت کرنے کے لئے جان بوجھ کر دلیرانہ تیر کر بہت دور
نکل گیا۔ مڑ کر دیکھا تو بلی ڈے ساحل کے ساتھ ساتھ تیر رہا تھا۔ لڑکیاں پانی میں اچھل رہی تھیں، اور ڈبکیاں لگا رہی تھیں اور
چھوٹی لہروں کے سامنے بھی اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتی تھیں۔ ایلبرٹ عام طور پر ایسے نظارے کو حقارت کی نظر سے دیکھتا
تھا لیکن اس وقت لڑکیوں کی یہ کمزوری معقول اور دلکش معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس کے مقابلہ میں اس کا اپنا کمال بہت نمایاں
معلوم ہوتا تھا جب ان کے قریب پہنچا تو سوچنے لگا میں ایک اجنبی ہوں۔ میری شمولیت کہیں ان کو ناگوار نہ گزرے۔ اس نازک
بدن دوشیزہ کے قریب جاتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ لیکن سبینا نے اسے خود بلایا اور کہنے لگی مجھے تیرنا سکھا دیجئے۔ چھوٹی لڑکیوں
نے اسے اس قدر مصروف رکھا کہ اسے یہ معلوم کرنے کا کہ اسٹیلا اس کے قرب سے مانوس ہو چکی ہے۔ یا نہیں۔ موقع ہی نہ ملا۔
یکلخت سٹیلا چونک کر پکاری۔ ایلبرٹ نے دیکھا تو سٹیلا مری پلی اور نازک بازو پھیلائے جسم ذرا آگے کو جھکائے کمر کمر تک پانی
میں کھڑی ہے۔ اس کے چہرے پر دھوپ کی وجہ سے چھینٹیں سی پڑ رہی ہیں اور وہ سہمی ہوئی ایک طرف کو اشارہ کر رہی ہے۔
"فل کو دیکھو! یہ کیا کر رہا ہے؟ ارے دیکھو!"
ایلبرٹ تاڑ گیا کہ فل خطرے میں ہے۔ وہ ایلبرٹ سے سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ اس کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ اور وہ
ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ یکلخت اس نے چیخ ماری۔ بازو اوپر کئے اور پانی میں ڈوب گیا۔ لڑکی اپنے بھائی کی طرف بڑھی۔ لیکن
ایلبرٹ نے "واپس جاؤ سٹیلا" کہہ کر اسے روک دیا اور خود لپکا۔ عمر بھر اس قدر تیز کبھی نہ تیرا تھا۔ بلی ڈے سے دوسرے زیادہ غوطہ
نہ کھانے پایا تھا کہ ایلبرٹ نے اسے پکڑ لیا۔ حادثے کی وجہ سے تشنج اعضا تھی۔ لیکن اسے سنبھالنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کیونکہ
اس نے مزاحمت نہ کی۔ آخر وہاں پہنچے جہاں ایلبرٹ لڑکی کو روک گیا تھا جب زمین پر پاؤں لگے تو لڑکی بھی آ گئی۔
فل کو اٹھایا اور ساحل پر لے گئے۔ ایلبرٹ اور سٹیلا اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی مالش کرتے رہے چھوٹی لڑکیاں سہمی ہوئی
پاس کھڑی رہیں۔ تھوڑی دیر میں بلی ڈے مسکرانے لگا۔ اور اس قدر تکلیف کا موجب ہونے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ ایلبر
سے بولا۔ "ذرا سہارا دو تو میں کپڑے بدل لوں" ایلبرٹ سہارا دینے لگا تو سٹیلا نے تر۔ اشک آلود سرخ چہرے چمکتی

برہم ہوچکا تھا۔ نظر پڑی تو سوچنے لگا میں نے اسے سیلا کہہ کر پکارا تھا۔ اس سے برا تو نہیں مانا۔

کپڑے پہن رہے تھے تو بیلی ڈے نے نیچی آواز میں کہا

"ایلبرسٹ تم نے مجھے موت سے بچایا ہے"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

کپڑے پہن چکے تو ہوٹل میں آئے۔ لیکن ابھی کچھ پریشان تھے۔ باقی لوگ تو چائے پی کر بیٹھ گئے۔ بیلی ڈے کو نا شپاتی کا مربہ اور روٹی کے ایک دو ٹکڑے کھا چکی تو سبینا بولی۔

"آپ نے تو بہت بہادری دکھائی"

اور فریڈا بولی۔

"آپ کمال کے آدمی ہیں"

ایلبرسٹ نے دیکھا کہ اسٹیلا کی نظریں نیچی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور وہاں سے اس نے سیلا کو دیکھا، آواز میں کہتے سنا آؤ خونی قسم کھائیں کہ ہم ہمیشہ دوست رہیں گے۔ فریڈا تمہارا چاقو کہاں ہے؟ انکھیوں سے دیکھا کہ تینوں نے چاقو کی نوک اپنے جسم میں چبھا کر خون کا ایک ایک قطرہ نکالا ہے اور کاغذ کے ایک صفحہ پر کچھ لکھ رہی ہیں۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف چلا۔

"اب یوں نہ بنئے یہاں آئیے" چھوٹی لڑکیوں نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر میز تک لے آئیں میز پر وہ کاغذ پڑا تھا جس پر خون سے ایک انسان کی تصویر بنی تھی۔ اور خون ہی سے تین نام لکھے تھے سٹیلا بیلی ڈے۔ سبینا بیلی ڈے فریڈا بیلی ڈے۔ کاغذ پر بہتے ہوئے لہو سے ایسی شکل بن گئی تھی۔ جیسے ایک ستارے کی شعاعیں ادھر ادھر پھیل رہی ہوں سبینا بولی

"یہ بیچ میں تم ہو۔ تمہیں معلوم ہے۔ اب تو ہم تمہیں چومیں گی"

اور فریڈا بولی۔ "ارے ہاں واقعی!"

ایلبرسٹ کے لئے کوئی مفر نہ تھا۔ اس کے گیلے بال اس کی آنکھوں کے سامنے لٹک آئے تھے۔ کسی نے اس کی ناک کو جیسے کاٹ لیا۔ اس کے بائیں بازو پر کسی اور نے چٹکی بھری اور دانت اس کے رخسار پر آ لگے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کو چھوڑ دیا۔ اور فریڈا بولی۔

"سٹیلا اب تمہاری باری ہے"

ایلبرسٹ کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا جسم اکڑا ہوا تھا میز کے اس طرف اسٹیلا کا بھی یہی حال تھا سبینا نے ایک طفلانہ قہقہہ لگایا اور فریڈا پکاری۔

"اب چلو بھی نہیں تو سب مزا کرکرا ہو جائے گا"

ایلبرسٹ کے جسم میں ایک عجیب و غریب مجوب سے اشتیاق کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔

"کم بخت۔ بہت شریر لڑکیاں ہو تم"

سبینا پھر ہنس دی۔

"اچھا تو سٹیلا اپنے ہاتھ چومے اور تم اس کے ہاتھ کو لے کر اپنی ناک سے لگا لو۔ آپ کی ناک ہے بھی اس طرف کو مڑی ہوئی۔"

سٹیلا نے سچ مچ اپنا ہاتھ چوم کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اشرسٹ نے بڑی متانت کے ساتھ اس خنک نازک ہاتھ کو اپنے رخسار سے لگا لیا۔ چھوٹی لڑکیاں تالی بجانے لگیں۔ فریڈا بولی۔

"بس اب جب موقع آیا ہے، آپ کی جان بچانی ہوگی۔ میں چائے کا ایک اور پیالہ پی لوں سٹیلا! لیکن ایسی پھیکی پانی کی چائے نہیں جیسی تم نے پہلے مجھے دی تھی؟"

چائے کا دور پھر چلنے لگا۔ اشرسٹ نے وہ دستاویز تہ کر کے جیب میں رکھ لی۔ پھر خرگوشوں پر، نارنگیوں پر، چمچے سے شہد کھانے پر اور اسکول نہ جانے کے فوائد پر گفتگو ہوتی رہی۔ اشرسٹ چپ چاپ سنتا رہا۔ صرف کبھی کبھی سٹیلا سے جس کے چہرے کی سرخ سفید رنگت پھر عود کر آئی تھی آنکھیں چار ہو جاتیں۔ اور نظروں ہی نظروں میں عہد رفاقت کا اعادہ ہوتا رہتا۔ ایک اجنبی کے ساتھ ان بشاش لوگوں کے مشفقانہ سلوک سے اشرسٹ کے دل کو راحت ہوئی۔ ان کے ہنستے ہوئے چہروں سے آنکھیں نہ ہٹا سکتا۔ چائے کے بعد چھوٹی لڑکیاں تو سمندری کائی کو خشک کرنے کے شغل میں مصروف ہو گئیں۔ اور اشرسٹ کھڑکی کے قریب جو نشست تھی اس پر بیٹھ کر سبینا سے باتیں کرتا رہا اور سٹیلا کی کھینچی ہوئی آبی رنگوں کی تصاویر کو دیکھتا رہا۔ اس پر ایک خوشگوار خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ وقت اور واقعے اور اہمیت اور حقیقت کا احساس معطل و معلق ہو گیا تھا۔ کل وہ پھر میگن کے پاس چلا جائے گا۔ اور اس لطف و مسرت کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوگی۔ بجز اس کاغذ کے جو ان بچوں کے خون سے رنگین تھا۔ بچے! سٹیلا تو عمر میں میگن کے برابر ہے۔ وہ بچہ کیونکر ہوتی؟ اس کی باتیں تیز تیز۔ قدرے خشک اور محجوب تاہم دوستی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی۔ اشرسٹ کی خاموشیوں میں کسی ساز کی آواز کی مانند گونجا کرتی تھیں۔ سٹیلا کے انداز میں ایک خنکی، ایک دوشیزگی پائی جاتی تھی۔ جیسے کسی افسانے کی محبوبہ پھولوں کی جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔ بیلی ڈسے کے پیٹ میں بہت سا کھاری پانی جا چکا تھا اس لئے وہ کھانے پر نہ آیا۔ کھانے کے دوران میں سبینا بولی۔

"میں تو آپ کو فرینک بلایا کروں گی۔"

اور فریڈا پکار اٹھی۔ "فرینک۔ فرینک۔ فرینکی۔"

اشرسٹ نے مسکرا کر تعظیماً سر جھکا دیا۔

"جب کبھی سٹیلا آپ کو مسٹر اشرسٹ کہہ کر بلائے اسے جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ مسٹر اشرسٹ کہنا کیا فضول معلوم ہوتا ہے۔"

اشرسٹ نے سٹیلا کی طرف دیکھا جس کا رنگ حجاب سے سرخ ہو رہا تھا۔ سبینا ہنس دی۔ فریڈا بولی۔

"وہ دیکھو۔ وہ دیکھو شرما رہی ہے۔ اللہ رے شرم!"

اشرسٹ نے دائیں بائیں دونوں لڑکیوں کے سنہری بال پکڑ لئے۔ اور بولا۔

"دیکھو زنگ، سٹیلا کو مت چھیڑو ورنہ میں تم دونوں کو باندھ دوں گا۔"

زنگا بولی۔ "تم بہت وحشی ہو!"

"ورست" سٹیلا نے محتاط بن کر کہا۔ "تم جو اسے سٹیلا جانتے ہو۔"

"تو کیوں نہ بلاؤں؟ سٹیلا بہت اچھا نام ہے۔"

الیشرسٹ نے ان کے بال چھوڑ دیئے۔ سٹیلا! اس گفتگو کے بعد وہ سمجھا کہ کس نام سے پکارے گی! لیکن اس نے نام استعمال ہی نہ کیا۔ سونے کا وقت آیا تو الیشرسٹ نے کہا۔

"گڈ نائٹ سٹیلا!"

"گڈ نائٹ مسٹر گڈ نائٹ زنیک! آج تم نے بہت ہی بہادری دکھائی۔"

"اس کا ذکر مت کرو۔"

سٹیلا کا مصافحہ سیدھا سادا مصافحہ تھا۔ لیکن لمحہ بھر کو اس نے الیشرسٹ کا ہاتھ زور سے دبایا۔ اور پھر یکلخت اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

الیشرسٹ خالی کمرے میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ صرف کل رات کا ذکر ہے کہ سیب کے پیڑوں اور زندہ شگوفوں کے نیچے کھڑا میگن کو سینے سے چمٹائے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کو چوم رہا تھا۔ یہ بات کیا یاد آئی جیسے کسی طوفان کے تھپیڑے سے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ ہانپنے لگا۔ آج رات ایک نئی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جس کی تمنا صرف یہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ اور یہ سب کچھ ملتوی ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے آگے جا پڑا۔ محض اس لئے کہ ـــــ اس نے اپنی گھڑی کو دیکھا تھا۔ ان معصوم بچوں سے تعلقات کیوں پیدا کر لئے۔ جبکہ خود معصومیت ہی کو خیرباد کہنے والا تھا! لیکن پھر سوچا میرا ارادہ تو اس سے شادی کرنے کا ہے۔ میں نے اسے کہہ بھی دیا تھا۔

روشن شمع ہاتھ میں لئے سونے کے کمرے کی طرف چلا۔ ہیلی ڈے کا کمرہ راستے میں پڑتا تھا۔ اس کے پاس سے گذرا تو ہیلی ڈے اندر سے پکارا۔

"تم ہو! الیشرسٹ! اندر آجاؤ۔"

ہیلی ڈے بستر پر بیٹھا پائپ منہ میں لئے پڑھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

الیشرسٹ کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔

ہیلی ڈے یکلخت بول اٹھا۔ "تمہیں معلوم ہے آج دن بھر مجھے بار بار تمہارا ہی خیال آتا رہا۔ لوگ کہتے ہیں۔ جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو گذشتہ زندگی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ لیکن میرے حافظے میں ابھی کا بیشتر حصہ جل کا توں مدفون رہا۔ فلیڈ میں اس سے ابھی بہت دور تھا۔"

"تو پھر تمہیں خیال کس بات کا آیا؟"

نقش سفید اسے یوں سے اس کا نزاکت کا وہ حسن اور دل کی وہ دھڑکن سب کچھ یاد آ گیا۔ لائف کے سلسلے میں گھر آ ہوگی۔ یہاں رات کے
وقت ندی کی آواز نہ تھی۔ یہاں سمندر کا شہر تھا اور سمندر سر پٹک رہا تھا اور اس میں بھونچال تھا کوئی نغمہ نہ تھا۔ کوئی گیت۔ کوئی تانا بانا بھی نہیں
بولتا نامیاتی تھا۔ ان کی بجائے پیانو کی آواز آ رہی تھی۔ اور سفید مکانات نے آسمان کو جیسے قینچی سے کتر دیا تھا۔ اور تنگ کی خوشبو صرف
سمندر تھی۔ کسی اونچی منزل میں ہوٹل کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی پردے کے سامنے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے
دل میں عجیب و غریب حساسات کے شورش بپا کر دی۔ جیسے کوئی ایک ہی جذبہ پیچ و تاب کھا رہا ہو۔ الجھا جا رہا ہو۔ پٹا جا رہا ہو۔
جیسے پیار اور عشق پریشانی کے عالم میں ٹکریں مار رہے ہوں۔ راستہ ڈھونڈ رہے ہوں انھیں راستہ مل گیا ہو۔ یہ لڑکی جس نے اسے
زنگ لگ کر پکارا تھا۔ جس کے ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو دفعتاً بھینچ لیا تھا۔ یہ شائستہ اور پاکیزہ لڑکی اس کے برعکس۔ خلاف
فطرت عشق کا حال سن لے تو کیا کہے۔ وہ مکان کی طرف پیٹھ موڑے آنکھیں بند کر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت آلتی پالتی مار کر گھاس
پر بیٹھ گیا۔ کیا واقعی اس کا یہ ارادہ تھا کہ جنگلی پھول کی خوشبو سونگھ لے۔ اور ـــ شاید ـــ میرا ہے چھوکرے! سمجھو میرا ایک
دل کی جس سے میں ایک دفعہ تم خود ہی سمجھ لو۔ دونوں ہتھیلیاں داہنے بائیں گھاس پر رکھ کر دبا دیں۔ ابھی گھاس میں گرمی کچھ
کچھ باقی تھی۔ ابھی اس میں نمی آئی تھی۔ ابھی اس کا سہارا لے سکتا تھا۔ اپنے آپ سے پوچھا ”میں کیا کروں؟“ شاید میگن کھڑکی کے
پاس کھڑی شگوفوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور اس کے خیال میں محو ہے بیچاری میگن! پھر خیال آیا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟ میں تو اسے
چاہتا ہوں! لیکن ـــ لیکن۔ کیا مجھے اس سے واقعی محبت ہے؟ یا صرف اس کو اس لیے چاہتا ہوں کہ وہ خوبصورت ہے اور مجھ سے
محبت کرتی ہے؟ میں کیا کروں؟“ پانی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایشرسٹ مبہوت ہو کر کالے سمندر کو
تکتا رہا۔ آخر اٹھا۔ اعضا جیسے جڑ گئے تھے۔ اور جسم کو خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں اب روشنی نظر نہ آتی تھی۔ جا کر سو رہا۔

(۸)

ایشرسٹ گہری نیند سو رہا تھا کسی نے دروازے پر دستک دی اور آنکھ کھل گئی۔ پھر کوئی کرخت آواز میں پکارا
” اٹھو بھائی ناشتہ تیار ہے!“
ایشرسٹ یکلخت اٹھ بیٹھا۔ میں کہاں ہوں ـــ ہاں ہاں یاد آ گیا!
باقی لوگ سر پر کھڑے تھے۔ سٹیلا اور سبینا کے درمیان ایک نشست خالی تھی۔ ایشرسٹ اس پر جا بیٹھا سبینا کچھ دیر
اسے بغور دیکھتی رہی۔ اور پھر بولی۔
” ذرا جلدی کیجیے ساڑھے دس بجے یہاں سے چلنا ہے!“
” ایشرسٹ ہم ہیری کی ہیڈ کوارٹر جا رہے ہیں۔ تمہیں بھی چلنا ہو گا!“
ایشرسٹ نے سوچا۔ ”میں ان کے ساتھ جاؤں ناممکن! مجھے تو چیزیں لے کر واپس جانا ہے۔“ اس نے سٹیلا کی طرف
دیکھا۔ سٹیلا نے شرما کے کہا
” ضرور چلیے!“

سبینا بولی۔
آپ کے بغیر کیا خاک لطف آئے گا؟"
فریڈا اٹھ کر کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔
آپ چلے نہیں تو میں آپ کے بال کھینچوں گی۔"
ایشرسٹ نے سوچا۔ "ایک دن اور سہی۔ اس میں کچھ غور بھی کر لوں گا۔ ایک دن اور!" اور پھر بولا۔
"اچھا اچھا میں چلتا ہوں۔ میرے بال کھینچنے کی ضرورت نہیں۔"
"ہُرّا!"

سٹیشن پر پہنچ کر اس نے ایک تار اور بھیجنے کا ارادہ کیا لیکن لکھ کر پھاڑ ڈالا۔ انھیں کیا بتائے کہ کیوں نہیں آ سکتا۔ پھر سے ایک چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ایشرسٹ سبینا اور فریڈا کے بیچ میں چپکا ہوا بیٹھا تھا۔ گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے جا لگتے تصورات میں۔ آپ جینکنز کا کھیل کھیلتے رہے۔ دل بہل گیا۔ سوچا یہ تھا کہ ایک دن مزید غور کرنے میں صرف کر دوں گا۔ لیکن اب غور کرنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔ دن بھر دوڑتے رہے۔ کشتی لڑتے رہے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں بھاگے پھرے (نہانے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا) گیت گاتے رہے۔ کھیل کھیلتے رہے۔ اور جس قدر سامان خورد و نوش ساتھ لائے تھے۔ سب چٹ کر گئے۔ واپسی میں چھوٹی لڑکیاں ایشرسٹ کے کندھے سے سر رکھ کر سو گئیں۔ ایشرسٹ کے گھٹنے سٹیلا کے گھٹنوں سے چھو رہے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ تیس گھنٹے پہلے وہ ان تین لڑکیوں میں سے (ان کے بال کس قدر ملائم تھے) کسی کو جانتا تک نہ تھا۔ ریل میں وہ سٹیلا سے شاعری کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ سٹیلا نے ایشرسٹ کو اور ایشرسٹ نے سٹیلا کو (مگر ایک خوشگوار احساس برتری کے ساتھ) اپنی اپنی پسند کے شعرا کے نام بتائے۔ یکلخت لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔
"شلی کہتا ہے۔ آپ حیات بعد الموت کے قائل نہیں۔ یہ تو بہت بری بات ہے زینگ!"

ایشرسٹ نے پریشان ہو کر کہا
"نہ قائل ہوں نہ منکر۔ میرا عقیدہ تو صرف یہ ہے کہ ہم حیات بعد الموت کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔"
لڑکی نے جلدی سے کہا
میرا ایسا عقیدہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا مطلب پھر فائدہ ہی کیا؟"
ان خوبصورت ابروؤں کے شکنوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے ایشرسٹ نے جواب دیا۔
"یہ کیا کہ جس چیز کے وجود کی تمنا ہو اس کے وجود پر انسان ایمان ہی لے آئے۔"
"لیکن اگر اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں تو انسان کو دوبارہ زندہ ہونے کی تمنا ہی کیوں ہوتی ہے؟"
یہ کہا اور نظر بھر کر ایشرسٹ کی طرف دیکھنے لگی۔
ایشرسٹ اس کے جذبات کو مجروح کرنا نہ چاہتا تھا لیکن برتری کی خواہش غالب آ گئی بولا۔
"جب تک انسان زندہ ہے اس وقت تک اس زندگی کو دائمی بنانے کا آرزومند رہتا ہے۔ یہ آرزو خود زندگی کا

بجز مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں:

"تو کیا تم انجیل کو نہیں مانتے؟"

ایشرسٹ نے سوچا اب ضرور اسے صدمہ ہوگا۔ بولا۔

"یسوع مسیح نے پہاڑی پر جو وعظ سنایا تھا۔ میں اس کو مانتا ہوں کیونکہ وہ بہت دلکش ہے اور اس کے الفاظ ہمیشہ سچے رہیں گے:"

"لیکن کیا تم یسوع مسیح کو خدا کا جز نہیں سمجھتے؟"

ایشرسٹ نے سر ہلا دیا۔

لڑکی نے اپنا چہرہ جلدی سے کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ ایشرسٹ کو یکلخت میگن کی دعا یاد آئی۔ "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایشرسٹ پر بھی۔" اور کون ایسا تھا جو اس لڑکی کی طرح یوں اس کے لئے دعا مانگے۔ اس لڑکی کی طرح جو اس وقت خود منتظر ہوگی اور سڑک پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہوگی۔ دل نے کہا۔ "تم کس قدر ذلیل ہو۔"

یہ خیال بار بار دل میں اٹھتا رہا لیکن اس کی چبھن رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی (اکثر یہی ہوتا ہے) حتیٰ کہ ذلیل بننا نہایت معمولی بات معلوم ہونے لگی اور نہ تعجب کی بات ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ واپس میگن کے پاس چلے جانا ذلیل بات ہے یا اس سے ملنے کا خیال ترک کر دینا۔

شام کے وقت سب مل کر تاش کھیلتے رہے اور جب بچوں کے سونے کا وقت آ پہنچا اور وہ چلے گئے تو سٹیلا پیانو پر جا بیٹھی۔ ایشرسٹ کھڑکی کے باہر اندھیرے میں بیٹھا شمعوں کے بیچ میں سے سٹیلا کو دیکھتا رہا (ریشم کے بال ہلکے رنگ کے لباس کے نیچے وہ لمبی گوری گردن جو ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ساتھ خم کھاتی تھی)۔

سٹیلا کے پیانو بجانے میں کوئی خاص رنگینی نہیں تھی۔ لیکن بلا تکلف بجاتی تھی۔ ایشرسٹ کو وہ ایک دلکش صورت معلوم ہو رہی تھی۔ جس کے اردگرد ہلکے نیلے رنگ کا نور جھلملاتا تھا گویا انسان نہیں فرشتہ ہے۔ اس لڑکی کی موجودگی میں جس کا لباس سفید جس کا سر فرشتوں جیسا اور جس کا جسم موسیقی کے ساتھ لچک رہا تھا کس کی جرأت تھی کہ بے عنان خواہشات یا گمراہ خیالات کا دل میں گذر بھی ہونے دے۔ وہ شومان کا ایک گیت بجا رہی تھی جس کا نام "وارم" تھا؟ اس کے بعد ہیلی ڈے نے اپنی بانسری نکالی اور طلسم ٹوٹ گیا۔ پھر انھوں نے ایشرسٹ کا گانا سنا اور سٹیلا شومان کی گیتوں کی ایک کتاب کو سامنے رکھ کر اس کے ساتھ پیانو بجاتی رہی۔ "باغ گردل تخت" کا گیت ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ چھوٹی لڑکیوں نے جو نیلے رنگ کے ڈریسنگ گاؤن پہنے تھیں دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر پیانو کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کے بعد کھلبلی مچ گئی اور بقول سبینا کے بڑا مزہ آیا۔

اس رات ایشرسٹ کو نیند نہ آئی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے اور وہ بے چینی کے عالم میں کروٹیں بدلتا رہا۔ دو دن کے اندر اندر ان لوگوں سے اس قدر مل جل گیا تھا ان کی بے تکلفی اور اپنائیت نے اس کے دل پر اس قدر اثر کر لیا تھا کہ فارم اور میگن ـــــ غیر دلکش! عجب خیال ہو گیا کیا سچ مچ ابھی سے [illegible] کیا تم بھاگ گئے ہو

میاں بی بی میں آئے دن بات بات پر رد و کد ہوتی ہی اور میں سنا کرتی ہوں - دونوں کے
بیچ میں بول تو نہیں سکتی مگر جہاں تک میں نے خیال کیا ہی ابا جان کی رائے اکثر درست اور
معقول ہوتی ہی اماں جان ناحق ضد کر کے اپنی بات کی پچ کرتی رہتی ہیں - اگرچہ ان میں بیچ بچاؤ
کرنے کا مجکو منصب نہیں لیکن اتنا تو سمجھ میں آتا ہی کہ دونوں [illegible] خیال ایک دوسرے سے
اس قدر مختلف ہیں کہ ایک کہتا ہی رات تو دوسرا کہتا ہی دن [illegible] ابا جان میرے
معاملے میں اوپری دل سے کچھ یوں ہی سا دخل دیتے ہیں وہ بھی جب کہ اماں جان زبردستی اُنکے
سر ہونے لگتی ہیں اُن کے بشرے سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ وہ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے
اور بمجبوری ہاں میں ہاں ملا دیا کرتے ہیں - اچھا تو فرض کرو کہ ابا جان نے اپنے خیال اور
اپنی مرضی کا داماد ڈھونڈا اور فرض کرنے کا کیا محل ہی یوں ہی ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہی
اور یوں ہی ہوگا ابا جان ہمارے گھر [illegible] چلتی ہی اور نہ چلے گی تو یہی کھٹ پٹ وہاں جیسے
رہا کیے گی - یہ دونوں تو صبح کو [illegible] تو شن سے اور میرا مزاج ہی اور طرح کا - مجکو تو کسی
کی بات کی مطلق برداشت نہیں [illegible] کوئی میری ذرا سی بات بھی کاٹتا ہی تو بے اختیار میرا جی چاہتا
ہی کہ اس کو کاٹ کھاؤں - ایسے آدمی کے ساتھ میرا تو ایک دن بھی گزر ہونا مشکل ہی - بیرہ
بیاہ سے تو کوارا بیٹھنا ہزار درجے بہتر - اچھا تو نرے سوچنے سے تو کچھ فایدہ نہیں
ایسا نہ ہو کہ میں اپنی جگہ سوچتی کی سوچتی ہی رہوں اور یہ لوگ اپنی کر گزریں
کیا کروں کس سے کہوں میری سہیلیوں میں تو کوئی اس قابل [illegible] پیٹ کی ہلکیاں چھچھوری
ان سے کہنا تو سارے شہر میں اپنے تئیں [illegible] کرنا ہی [illegible] بہتیری [illegible]
سے بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں [illegible] کہوں بھی تو وہ اپنے جی میں کیا خیال
کیے گا - ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میں اُس کی نظروں سے گر جاؤں گی [illegible] میں [illegible] ہی
شخص سمجھ میں آتا ہی کہ میں اُس سے [illegible] میں کچھ کہوں اور [illegible]
نہ دیکھے میری نسبت کسی طرح کی بدگمانی [illegible] ہی میری تائید
بھی کرے یعنی میرا باپ - لیکن ارادہ کرنا آسان ہی اور ڈھونڈھنے تو چاہیے ہمیشہ -
وہ مجکو چاہتے بھی بہت ہیں اور میں اُن کی خدمت میں کسی قدر گستاخ بھی ہوں اور محبت کی

[illegible] تھا اس کے ساتھ رہنے کا وعدہ کیا تھا؟ جیسے جیسے وہ مسرور ہو گیا تھا۔ اس پر جادو چل گیا۔ بیچارا۔ بات کا سبب [illegible] اس کو۔ اس کمسن بچی کو جس کی عمر ابھی اٹھارہ سال بھی نہ ہونے پائی تھی۔ یکایک شدت جذبات سے اس خیال کے آتے ہی ایلبرٹ کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی لیکن پھر بھی جسم میں گرمی اور خون میں تیزی پیدا ہو گئی۔ دل سے کہا۔ "میں نے بہت برا کیا۔ میں نے بہت برا کیا" خزاں کی موسیقی اس کے پریشان خیالات کے ساتھ مل کر اس کے دل کے اندر جیسے دھڑکنے لگی۔ اسے تصور میں سیلا کا چہرہ نظر آیا۔ پرسکون۔ موری جیسے رنگ کے بال۔ چہرہ اردگرد ان اردگرد فرشتوں کا سا تقدس۔ اس نے سوچا "میں کیوں قائم نہ تھے۔ میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ بدنصیب سیلا! "خدایا ہم سب پر اپنا فضل کر اور مسٹر ایلبرٹ پر بھی!" "میں صرف آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔" اور اس نے چہرہ تکیے میں ڈھانپ لیا۔ پلکیں بند ہو چلی تھیں۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا

واپس چلا جائے تو مصیبت۔ نہ جائے تو اور بھی آفت!

جوان آدمی اگر اپنے دل کی بھڑاس نکال لے تو اس کی بے چینی مٹ جاتی ہے۔ ایلبرٹ کی آنکھ لگ گئی جب نیند اسے لگی تھی تو سوچ رہا تھا۔ "آخر کیا ہوا۔ چند لمحے ـــ میں بھر میں بھول جائیں گے۔"

اگلے دن صبح کے وقت اس نے چیک کے روپے وصول کئے لیکن کپڑوں کی دکان کے پاس بھی نہ پھٹکا۔ اس نے ٹائی رنگ کے لباس کی بجائے اپنی ضرورت کی چند چیزیں خریدیں۔ دن بھر اس کے دل کی عجیب حالت رہی۔ جیسے اپنے آپ سے لڑتا رہا ہے۔ دونوں سے دل میں امنگیں اٹھ رہی تھیں لیکن اب جذبات سے یکسر خالی تھا جیسے آنسوؤں کے طوفان سے دل کے شعلے سب بجھ گئے ہوں۔ چائے کے بعد سیلا نے ایک کتاب اس کے پاس رکھ دی اور کچھ شرما کر بولی۔

"ڈزینگ تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟"

نیوکی۔ "سوانح یسوع" ایلبرٹ مسکرا دیا۔ سیلا اس کے عقائد کے متعلق کس قدر فکرمند ہے۔ اسے کچھ ہنسی آئی۔ کچھ پیار آیا۔ اپنی طبیعت کو بھی گدگدی ہوئی کہ اسے اپنا ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرے یا کم از کم ان کے عقائد کی حمایت میں کچھ پہلے شام کے وقت چھوٹی لڑکیاں اور بیل ڈے اپنے اپنے جال کی مرمت کر رہے تھے۔ ایلبرٹ سیلا سے مخاطب ہوا۔

"مذہب انعام اور صلے کا لالچ دلاتا ہے کہ نیک زندگی بسر کی تو یہ کچھ ملے گا۔ گویا انعام کے لئے ہیں جیسے بھیک مانگا جا سکتا ہے۔ یہ رجا در حقیقت بیم سے پیدا ہوتا ہے۔"

وہ صوفہ پر بیٹھی رسی کے ایک ٹکڑے پر گانٹھیں دے رہی تھی۔ اس نے یکلخت نگاہ دوڑائی۔

"نہیں اس کی وجہ اور ہے اور اس سے کہیں گہری ہے۔"

ایلبرٹ کے دل میں پھر وہی تحکم کی خواہش پیدا ہوئی اور بولا۔

"کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی بات کی وجہ دریافت کرنے کی خواہش ہی سب سے زیادہ عمیق ہے اور اس کی تہ کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔"

سیلا نے ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکا لی۔

"میں نہیں سمجھی۔"

ایشرسٹ اپنی ہٹ پر قائم رہا اور بولا۔

"ذرا غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آخرت کے معتقد بیشتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشات اس دنیا میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ برعکس اس کے میں نیکی کا قائل اس لئے ہوں کہ نیکی ایک اچھی چیز ہے۔"

"تو آپ نیکی کے قائل تو ہیں"؟

وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھی اور اس کی صحبت میں نیکی کس قدر سہل۔ ایشرسٹ نے شائستگی سے سر ہلایا اور بولا۔

"اس طرح کی گرہیں لگانا مجھے بھی سکھا دو۔"

جب گرہیں لگا رہے تھے تو اسے راحت ملی تھی۔ سونے کو چلا تو بالارادہ اسی کے متعلق سوچنا چاہا۔ اس کے درخشاں پرسکون۔ خوابیدہ تصور کے انوار سے اپنا آپ یوں ڈھانپ لیا جیسے اس ملبوس میں اب اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

اگلے دن معلوم ہوا کہ اگلے دن وہ لوگ ریل میں سوار ہو کر "ٹوٹنس" جانا چاہتے ہیں۔ اور بیری پومرائے کاسل کے مقام پر پکنک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ ماضی کو دل سے محو کر دینے کا جو مصمم ارادہ کر چکا تھا اس نے اسے مجبور کیا کہ اسٹیشن کی طرف بیٹھ کر کے ہیلی ڈے کے ساتھ لینڈو میں بیٹھ گیا۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور اسٹیشن کی طرف مڑنے ہی کو تھے کہ ایشرسٹ کا دل دھک سے رہ گیا میگن ——— خود میگن! ——— پیدل پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ وہی پھٹا پرانا سایہ اس نے پہن رکھا تھا وہی جیکٹ۔ وہی ٹوپی اور راہگیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر ایشرسٹ نے یکلخت ہاتھ اٹھا کر چہرہ ڈھانپ لیا۔ اور ظاہر یہ کیا گویا آنکھ میں سے مٹی کا کوئی ذرہ نکال رہا ہے۔ لیکن انگلیوں کے بیچ میں سے میگن پھر بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چال میں دہقانوں کی سی بے تکلفی نہ تھی۔ برعکس اس کے وہ کھوئی کھوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے قدم متامل تھے۔ اور اس کی حالت رحم کی طالب۔ جیسے کوئی کتا اپنے آقا سے جدا ہو گیا ہو۔ اور یہ نہ جانتا ہو کہ سیدھا دوڑتا چلا جائے۔ یا واپس پلٹ جائے اور جائے تو کہاں؟ یہ یہاں کیسے آ گئی؟ بہانہ کیا بنایا ہوگا؟ یہ کس امید میں پھر رہی تھی گاڑی کے پہیے گھومتے چلے گئے اور وہ میگن سے دور تر ہوتا گیا۔ لیکن اس کا دل اس پر لعنت بھیج رہا تھا اور چیخ چیخ کر اس سے کہہ رہا تھا کہ ٹھہر جاؤ۔ گاڑی سے اتر جاؤ۔ اس کے پاس جاؤ۔ جب گاڑی اسٹیشن کی طرف مڑی تو ایشرسٹ سے رہا نہ گیا۔ دروازہ کھول کر بولا۔ "میں کچھ بھول آیا ہوں۔ تم چلو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ میں اگلی گاڑی سے آؤں گا۔ اور تمہیں کاسل میں آ ملوں گا۔" یہ کہہ کر گاڑی سے کود پڑا۔ ٹھوکر کھائی۔ گھوم گیا۔ پھر سنبھلا اور چل پڑا۔ ہیلی ڈے اور اس کی بہنیں حیران تھیں کہ یہ کیا ہو گیا لیکن ان کی گاڑی آگے نکل گئی۔

موڑ سے اسے میگن بہت دور دکھائی دے رہی تھی۔ ایشرسٹ چند قدم دوڑا۔ پھر رک گیا۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ جوں جوں میگن کے قریب تر اور ہیلی ڈے اور اس کی بہنوں سے دور تر ہوتا گیا۔ قدم ڈھیلے پڑتے گئے۔ اسے دیکھ لیا تو پھر کیا ہوا؟ کیا فرق پڑ گیا؟ اس سے جو ملاقات ہوگی اور اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوگا۔ اس کی کراہت کو کیونکر کم کرے۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہیلی ڈے کی بہنوں سے ملنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ میگن سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ چند دن اس سے عشق کرے گا۔ تکلیف پہنچے گا۔ پچھتائے گا اور پھر الگ ہو جائے گا۔ محض اس لئے کہ وہ اپنا سب کچھ دے ڈالے گی۔ اس لئے کہ وہ

سامنے اونچا ہے۔ سبز رنگ ہے شبنم آلود ہے۔ لیکن شبنم جلد خشک ہو جاتی ہے۔ اس کی ٹوپی جو دور سے ہلکے رنگ کا ایک دھبّہ سا معلوم ہوتا تھا ہجوم میں نظر آ رہی تھی جس سے میگن کی متلاشی حرکات کا پتہ چلتا تھا۔ وہ ہر چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ہر گھڑی پر بجھتا ہوا چہرہ چھپا لیا گیا ہو گا اس سے بھی زیادہ دکھ کا کوئی نصیب ہوا ہو گا! جا دو کرتا تھا دل اسی پر ملامت کرتا تھا۔ اور اپنا آپ ذلیل معلوم ہوتا تھا۔ ایک ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکلی جیسے سسکی ایک۔ راہ گیر ٹھہر ٹھہر کر اس کا منہ تکنے لگے۔ سامنے دیکھا تو میگن ساحل سمندر کے پاس جو دیوار کھڑی تھی اس کے ساتھ سہارا لیے کھڑی تھی۔ اور سمندر کی طرف دیکھتی رہی۔ ایشرسٹ بھی رک گیا شاید میگن نے سمندر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اضطراب کی حالت میں بھی وہ اس نظارے سے باز نہیں رہ سکی۔ ایشرسٹ نے سوچا اس بیچاری لڑکی نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس کا مستقبل ابھی نہ جانے کن کن نعمتوں کا سرمایہ دار ہے۔ چند ہفتوں کے عیش کی خاطر اس کی زندگی کے چمن پر خزاں برسا دوں؟ یک لخت تصور میں سٹیلا کی پرسکون آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ اس کے لئے آنکھ بال ہی سے اس کے ساتھ پلٹ آنے سے دیوانگی ہے۔ اس کا مطلب ہو گا کہ جن چیزوں کو قابلِ احترام سمجھتا ہے۔ ان سب سے اور احترامِ نفس سے ہاتھ دھو بیٹھنا پڑے گا۔ مڑ گیا اور جلد جلد اسٹیشن کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ لیکن اس بے بس سراسیمہ لڑکی کی یاد سے جس کی منتظر آنکھیں راہ چلتوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل کو دھچکا لگا۔ اور وہ پھر سمندر کی طرف چلا۔ وہ ٹوپی سب نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی وہ دھبّہ سیر بینوں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو گیا تھا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ سینے میں خلا سا محسوس ہوا جیسا کہ دل کی وجہ سے کوئی چیز ہاتھ سے چھن جائے تو یہی حال ہوتا ہے) وہ تیز تیز چلنے لگا۔ لیکن میگن کہیں دکھائی نہیں دی۔ آدھ گھنٹہ تک اس کی تلاش میں پھرتا رہا اور پھر ساحل سمندر کی ریت پر پڑ کر اوندھا لیٹ گیا۔ جانتا تھا کہ اس سے ملنے کی سہل ترکیب یہ ہے کہ اسٹیشن پر جا کر اس کا انتظار کرے۔ حتیٰ کہ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئے۔ یا ریل پر سوار ہو کر فارم کو چلا جائے۔ تاکہ وہ واپس پہنچے تو یہ وہاں پہلے ہی موجود ہو۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اور اس کے پاس بے پروا ننھے ننھے بچے بالٹیاں لئے کھیلتے رہے۔ اس متلاشی سرگرداں لڑکی پر رحم ضرور آتا تھا لیکن یہ رحم بھی کم و بیش خون کی اس سرگرمی اور تیزی کا ایک جزو بن گیا جو اس کے جسم میں پیدا کر دی تھی۔ اب دل میں صرف ایک بے جان جذبہ باقی رہ گیا تھا تو تیز نسوانی کے جذبات مفقود ہو چکے تھے۔ دل میں پھر میگن کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے بوسوں، اس کے نازک اور گداز جسم۔ اس کی وارفتگی۔ اس کے کافرانہ عشق کی گرم جوشی کے لئے دل پھر بے قرار ہو گیا۔ مہتاب سے روشن سیب کے درختوں کی شاخوں تلے۔ اس رات کا پھر لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ اور اس کا دل ان خواہشات کی تکمیل کے لئے یوں مضطرب تھا جیسے کوئی جنگل کا دیوتا کبھی یہ دیوی کے لئے مضطرب ہوتا ہے۔ اس ندی کا پُر کیف شور سبز ٹیلے کے پھولوں کی دمک۔ وہ پرانی تاریخی چٹانیں۔ گلہ اور سیٹیل کی کوک الّو کا بولنا۔ سرخ چاند کا گھنی تاریکی میں سے شگوفوں کی زندہ سفیدی کو جھانکنا۔ وہ کھڑکی میں اس کے چہرے کا نظر آنا اور ہاتھ ہلا ہلا کر رہ جانا تھا۔ اس کی عشق میں ڈوبی ہوئی نگاہیں۔ سیب کے درخت تلے دھڑکتے ہوئے سینوں کا ملنا۔ اپنے ہونٹوں سے اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کا محسوس کرنا۔ ان تصورات نے اس کے دل کو مسحور کر لیا۔ لیکن پھر بھی بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ یہ کیا ہے جو رحم کے جذبات اور ان بے قرار خواہشات کے ساتھ دست و گریباں ہے۔ اور جس نے اسے مفلوج بنا کر گرم ریت پر لٹا رکھا ہے؟ تین ہائی کالر والی لڑکیاں۔ ایک دلفریب چہرہ جس کی نیلی آنکھوں میں دوستی کا جذبہ جھلک رہا ہے لیکن

جنگلی بانٹو جو اس کے ہاتھ کو کھینچ رہا ہے۔ ایک آواز جو جلدی سے۔ مس کیتھرین پکار کر کہتی ہے۔ "تم آپ نیکی کے قائل نہیں ہو؟" یہ کچھ
عرصہ اس کے علاوہ ایک عجیب فضا جیسے چار دیواری کے اندر ایک باغیچہ ہو۔ قدیم انگریزی وضع کا جس میں جو بہا گلابی رنگ
کے پھول ہیں۔ کانٹ خالاہ گلاب کے پھول اور لونڈر اور لائک کی خوشبو ہو) خنک اور دلفریب۔ انسانی مس سے غیر ملوث
مقدس۔ غرضیکہ ان تمام چیزوں کا مجموعہ جنہیں وہ بچپن سے پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا تھا یکلخت اسے خیال آیا۔ "ممکن ہے
وہ ادھر ہی کو آ نکلے اور مجھے دیکھ پائے؟" اٹھ کھڑا ہوا ساحل سمندر کے دوسرے سرے پر ایک چٹان تھی اس پر جا بیٹھا سمندر
کی چھینٹیں اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھیں۔ اس سے ہوش و حواس پھر بجا ہو گئے۔ فارم کو واپس چلے جانا اور ان جنگلوں میں ہر
چٹانوں کے درمیان رہ کر میگن سے عشق کرنا یعنی روستائی ماحول میں اس دیہاتی لڑکی کو چاہنا، قطعاً نا ممکن ہے۔ اسے کسی بڑے
شہر میں لے آنا اور کسی فلیٹ میں رکھنا۔ اس سے اس کی شاعرانہ طبیعت کو صدمہ ہوتا تھا۔ کیونکہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی یقیناً منتظر
کھڑی جذبہ ہے۔ اسے شہر میں لا کر رکھا تو محبت کا جذبہ ایک نفسانی خواہش بن کر رہ جائے گا اور دنوں ہی میں غائب بھی ہو جائیگا
شہر میں اس کی سادگی اور اس کا گنوارپن اس قدر نمایاں ہوگا کہ اسے محض کھلونا سمجھ کر رکھنا پڑے گا۔ جس سے چند گھڑی کے لیے دل
بہلا لیا جائے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ایک سبزی مائل تالاب کے اوپر ٹانگیں لٹکائے جس کا پانی اتر رہا تھا ان خیالات میں محو تھا اور
یہ سب باتیں اس پر روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے میگن کا بازو اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ آہستہ
آہستہ نیچے سرکا جا رہا ہے اور پھر اس تالاب میں جا گرا ہے اور بہہ کر سمندر میں جا پہنچا ہے میگن کا چہرہ اوپر تک رہا ہے۔ اس کی گول
ہوتی تنکوں میں ایک التجا ہے۔ اور اس کے سیاہ بال بھیگے ہوئے ہیں۔ اس تصور نے دل میں بچھو کا ڈنک دیئے بہتیرا چاہا اسے دل سے
ہٹانے کی کوشش کی لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا یہ خیال اسے دق کرتا رہا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چٹان سے نیچے اترا اور پانی کے
قریب ایک غار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید سمندر میں نہانے سے اس کا دل بہل جائے اور یہ بخار اتر جائے۔ کپڑے اتار دیئے اور
تیر کر دور نکل گیا۔ چاہتا تھا تھک کر چور ہو جائے تاکہ حواس سن ہو جائیں۔ اس لئے تیز تیز اور دور دور چکر کاٹے۔ پھر دفعتاً بغیر کسی وجہ
کے اسے خوف سا معلوم ہوا فرض کرو وہ واپس ساحل تک نہ جا سکا اور سمندر کی ندا اسے بہا کر لے گئی۔ یا بیلی ڈے کی طرح اس کے
پٹھے اینٹھ گئے تو کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر وہ واپس پلٹا۔ سرخ رنگ کی چٹانیں بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ اگر وہ ڈوب گیا تو کسی کی نظر
اس کے کپڑوں پر پڑے گی۔ بیلی ڈے اور اس کی بہنوں کو تو خبر مل جائے گی۔ لیکن میگن کو شاید کبھی علم نہ ہونے پائے گا۔ فارم
کے لوگ کوئی اخبار نہیں خریدتے۔ قبل بیلی ڈے کے الفاظ اسے پھر یاد آگئے۔ "کیمبرج میں ایک لڑکی تھی جس سے میں شاید
ـــــ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اس کی طرف سے میرا ضمیر صاف ہے۔" مجنونانہ خوف کے اس لمحے میں اس نے قسم کھائی کہ میں میگن
کی طرف سے اپنا ضمیر صاف رکھوں گا۔ لیکن خوف جاتا رہا۔ اطمینان سے تیرتا ہوا ساحل پر آن پہنچا۔ دھوپ میں جسم سکھایا اور کپڑے
پہن لئے۔ اس کا دل زخمی تھا لیکن درد محسوس نہ ہوتا تھا جسم خنک اور تر و تازہ ہو گیا تھا۔

ایشرسٹ کی عمر میں رحم کا جذبہ شدت کے ساتھ محسوس نہیں ہوا کرتا۔ جب واپس بیلی ڈے کے کمرے میں پہنچا اور
چائے پر خوب پیٹ بھر کر کھایا تو ایسے معلوم ہوا جیسے ایک سخت بخار آیا تھا جو اب اتر چکا ہے۔ ہر شے نئی نئی اور صاف ستھری معلوم
ہوتی تھی۔ چائے۔ ٹوسٹ اور ... مربہ۔ غرضیکہ ہر چیز میں اسے بہت مزا آیا۔ تمباکو کی خوشبو ... آج پہلے معلوم ہوتی

وہ کمرے میں ٹہلتا ٹہلتا رک جاتا۔ کبھی اس چیز کو دیکھتا کبھی اس کو چھوتا۔ پھر سیلا کے سینے پر دھلکی ہوئی ہمتانی تاگے کی گلابی اور ملائم نمک۔ ریشم کی ایک گچھی کو مس کرتا ہے۔ ڈری میں ایک بیلی تھی۔ جو کسی خوشبو دار پوڈر سے بھری ہوئی تھی۔ اسے اٹھا کر سونگھتا پھر پیانو کے پاس جا بیٹھا اور ایک انگلی سے مختلف سُر بجاتا ہے۔ پھر سوچنے لگا۔ کل پھر وہ بجائے گی۔ اور میں پاس بیٹھا اسے دیکھتا ہوں گا۔ اسے دیکھتے رہنے سے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ جو کتاب اسیلا نے اس کے پاس لاکر رکھ دی تھی وہ بھی پڑی تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن میگی کی اداس شکل پھر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اٹھ کر ٹہلا اور کھڑکی میں سے جھانک کر باغیچے میں جو تمتماتے پھول رہے تھے۔ ان کو بستا ہوا اور سمندر کا نظارہ کرتا رہا جو درختوں کے پیچھے نیلا نیلا اور خواب آلود نظر آتا تھا۔ ایک ملازمہ اندر آئی اور چائے کے برتن اٹھا کر لے گئی۔ لیکن وہ دیر تک وہیں کھڑا شام کی ہواؤں کا لطف اٹھاتا رہا۔ اس کشمکش میں کہ اس کا دماغ کسی بات کو سوچنے نہ پائے۔ تھوڑی دیر کے بعد بیلی ڈے اور اس کی بہنیں پھاٹک میں سے اندر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ سیلا آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے فل اور فل کے پیچھے چھوٹی لڑکیاں اپنی اپنی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ایلبرسٹ اضطراراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا مجروح اور مایوس دل ان لوگوں کی ملاقات سے گھبراتا بھی تھا اور ان کی دوستانہ شفقت سے تسکین بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان کے سحر کو محسوس کرکے چڑتا تھا۔ لیکن ان کی پُرسکون معصومیت اور سیلا کی دید سے مستفید ہونا چاہتا تھا۔ پیانو کے پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا کہ سیلا اندر داخل ہوئی۔ لیکن کچھ گھبرائی سی جیسے کوئی ڈھونڈ رہی ہو۔ پھر ایلبرسٹ پر نظر پڑی۔ مسکرا دی۔ اس کا تبسم بجلی کی طرح سریع اور درخشاں تھا جس سے ایلبرسٹ کو مسرت بھی ہوئی اور تھکا بھی گیا۔

"زریک تم نہ گئے نا؟"

"ہاں آنا ہی نہ ہو سکا۔"

"دیکھو ہم کیسے جنگلے کے پھول چن کر لائے ہیں۔ اب ان کا موسم ختم ہونے کو ہے۔" سیلا نے پھول آگے بڑھا دیئے۔

ایلبرسٹ نے انہیں سونگھا۔ دل میں مبہم سی خواہشات پیدا ہوئیں۔ لیکن پھر یکلخت مر بھی گئیں۔ میگی کا متفکر چہرہ نظر آیا۔ وہ ادبر تک رہی تھی۔ وہ گیروں کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "بہت خوبصورت ہیں اور منہ موڑ لیا۔ چھوٹی بچی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ان سے بچتا ہوا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اور بستر پر جا گرا اور دونوں بازوؤں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ تڑپ کر پھینک چکنے کے بعد۔ میگی کو چھوڑ چکنے کے بعد اسے نہ صرف اپنے آپ سے بلکہ وہیش بیلی ڈے اور اس کی بہنوں اور ان کی انگریز گھرانوں کی سی خوش دلی سے بھی نفرت ہونے لگی۔ حسرت نے یہ کیا ظلم کیا کہ انہیں یہاں لے آئی اور اس کے اولین عشق کا گلا گھونٹ دیا اور اسے یہ سمجھایا کہ یہ عشق اوباشی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ سیلا کا کیا حق تھا کہ اس کا دل فریب مجرب حسن اسے یقین دلا دے کہ وہ میگی سے کبھی شادی نہیں کرے گا اور اس کے عشق کو مضموم ثابت کرکے اس کا دل تاسف اور حسرت اور رحم سے بھر دے۔ میگی بے چاری تلاش کے بعد مایوس ہو کر واپس چلی گئی ہوگی۔ اور شاید یہ امید دل میں لئے گھر کو جا رہی ہو گی کہ ایلبرسٹ پہلے سے پہنچ گیا ہوگا۔ تاسف اور حسرت سے بے تاب ہو کر ایلبرسٹ نے اپنی آستین کو کاٹ لیا۔ کھانے پر بیٹھا تو اداس اور چپ چپ تھا۔ کسی

ہالی کو دیکھ کر بچے بھی پژمردہ ہو گئے۔ سب کے سب تھکے ہوئے تھے اس لئے ان کا مزاج برہم تھا۔ چنانچہ شام کے وقت جب وہ گھر
پہنچے تو کئی بار ایلشرسٹ کی سٹیلا سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ پریشان اور مجروح نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ایلشرسٹ کو ایسا
لگا اس لئے بھی یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ رات بھر بے چین رہا۔ صبح بہت سویرے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ساحل سمندر کے پاس بیٹھ
کر تنہائی کے عالم میں پرسکون۔ نیلے روشن سمندر کو دیکھ کر اس کا دل قدرے پسیجا۔ مزید سمجھ گیا کہ بہت ہی صدمہ
ہفتہ دو ہفتے میں بھول بھی جائے گی۔ باقی رہا وہ خود تو اسے اپنی پکباری کا بدلہ لے گا یا نیک رہا! سٹیلا کو اس کا علم ہو جائے
تو وہ اس ضبط نفس کو کس قدر سراہے۔ وہ شیطان کی قائل ہے۔ مجھے شیطان کو نیچا دکھایا یہ خیال آیا تو ایک گرمجوشی طبیعت پر چھا گیا۔
لیکن رفتہ رفتہ سمندر اور آسمان کے سکون اور حسن اور سمندری پرندوں کی پرواز کے نظارے سے متاثر ہو کر اس کو شرم سی آنے
لگی۔ نہایا اور گھر کو چلا

سٹیلا مکان کے باہر باغیچے میں ایک سفری اسٹول پر بیٹھی تصویر بنا رہی تھی پیچھے سے اس کے پیچھے جا کر سوچا وہ کس
قدر حسین ہے۔ جسم آگے جھکائے۔ موقلم ہاتھوں میں تھامے۔ ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالے وہ کس قدر پیاری معلوم ہوتی ہے۔

بڑے ملائم لہجے میں بولا

"سٹیلا مجھے افسوس ہے کہ رات میں نے بہت ہی بدتمیزی کی۔"

سٹیلا چونک کر مڑی۔ چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ حسب عادت جلد جلد بولی

"اس کا ذکر مت کرو۔ میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ بات ہو گی۔ لیکن دوستوں میں ایسی باتوں کا تذکرہ ہی فضول ہے
ہے نا؟"

ایلشرسٹ نے جواب دیا۔

"ہاں دوستوں میں —— تو ہم آپس میں دوست ہیں نا؟"

سٹیلا نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ بڑے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ برق صفت سرخ لب اور درخشاں تبسم سے اس
کے چمکتے دانت پھر دکھائی دینے۔

تین دن کے بعد ایلشرسٹ ان لوگوں کے ساتھ لندن چلا گیا۔ فارم کے لوگوں کو خط نہ لکھا۔ لکھتا تو کیا لکھتا؟
اگلے سال اپریل کے آخری دن سٹیلا سے اس کی شادی ہو گئی ....

یہی وہ واقعات تھے جن کی یاد اب ایلشرسٹ کے دل میں جبکہ وہ اپنی شادی کی پچیسویں سالگرہ کے دن گھاس کے
بیچ میں دیوار کا سہارا لگائے بیٹھا تھا۔ تازہ ہو رہی تھی۔ جہاں اب لنچ چن رکھا تھا۔ یہی وہ مقام ہو گا جہاں میگی اسے پہلی دفعہ
آسمان کے بالمقابل کھڑی دکھائی دی۔ انسان کو زندگی میں کیسے کیسے اتفاقات پیش آتے ہیں۔ دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ اس مقام اور

باغیچے اور جھیل پر ہوتے ہوئے اس مرغزار کو پھر جا کر دیکھے۔ اس میں بہت وقت نہ لگے گا۔ سیٹیا ابھی شاید گھنٹے بھر تک نہ لوٹے۔

پہاڑی پر دو چیڑھ کے درختوں کا جھنڈ اور عقب میں وہ گھاس سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان — اسے اچھی طرح یاد تھی۔ اقدام کے سامنے ایک بے حس ہو کر رک گیا۔ وہ پتھر کی بنی عمارت۔ بید کے درختوں کا وہ محراب۔ وہ انگور کے شگوفے بالکل ویسے کے ویسے تھے وہ ہلکا سبز رنگ کی پھلکی بھی وہیں کھڑکی کے نیچے گھاس پر رکھی تھی۔ جہاں کھڑے ہو کر اس نے میگن کے ہاتھ سے چابی لی تھی۔ پگڈنڈی پر چل کر باغیچے کے پھاٹک تک پہنچا جو پہلے کی طرح اب بھی سیاہی مائل اور شکستہ تھا۔ درختوں میں ایک سیاہ رنگ کا سور ادھر ادھر پھر رہا تھا گویا پچیس سال گزر چکے ہیں یا شخص کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اور اس بڑے سیب کے درخت کے پاس میگی اس کا انتظار کر رہی ہے! خود فراموشی کے عالم میں اپنی بھوری ڈاڑھی کو ہاتھ لگایا اور واقعات کی دنیا میں واپس آگیا۔ پھاٹک کھول کر باغیچے میں داخل ہوا اور خاردار جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا آگے تک جا پہنچا جہاں وہ پرانا سیب کا درخت کھڑا تھا۔ بالکل ویسے کا ویسا! ہلکے رنگ کی کائی پہلے سے قدرے زیادہ تھی۔ دو ایک شاخیں بھی خشک ہو رہی تھیں۔ لیکن اس کے سوا اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کل رات ہی کا واقعہ ہے۔ جب میگی کے بھاگ جانے کے بعد وہ ایک ہی خوشبو کے کائی دار تنے سے لپٹ گیا تھا اور اس کی خوشبو نے جو جیسے مشام کو لطف اندوز کیا تھا اور سر کے اوپر چاندنی میں شگوفے سانس لیتے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ اوائل بہار کا زمانہ تھا۔ کہیں کہیں کلیاں پھوٹ چکی تھیں۔ بلیک برڈ اپنے راگ الاپ رہے تھے لیکن ککو کی کوک سنائی دے رہی تھی۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی میٹھی میٹھی گرمی خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مقام حیرت ہے کہ کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ وہی شور مچاتی ہوئی ندی تھی اور وہی تنگ سا تالاب جس میں وہ ہر روز صبح کے وقت لیٹ جایا کرتا تھا اور پانی اچھال اچھال کر اپنے پہلوؤں اور سینے پر ڈالا کرتا تھا۔ ویران مرغزار میں بیچ کے درختوں کا وہی جھنڈ تھا۔ اس کے پاس وہی پتھر جہاں بیٹھتے تھے جیسی ہوا ان کر بیٹھا ہے۔ گم کردہ شباب کا خیال آیا۔ عشق کی بربادی کا خیال آیا کہ کس بے دردی سے اس کی شیریں گھڑیوں کو ضائع کر دیا تھا۔ دل میں ایک ٹیس ایک ہوک اٹھی جس نے ایشرسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس غیر موقت حسن سے بھری ہوئی دنیا میں انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جو مسرت اسے حاصل ہو اسے دل سے جانے نہ دے۔ جس طرح یہ زمین یہ آسمان جدا نہیں ہونے دیتے! لیکن انسان بے بس ہے!

ندی کے کنارے پہنچا تو اس چھوٹے سے تالاب پر نظر پڑی۔ سوچا شباب اور بہار کیا معلوم دونوں کہاں چلے گئے پھر یکلخت ڈر گیا کہ کسی سے سامنا ہو گیا تو یہ خوشگوار تصورات برہم ہو جائیں گے۔ پگڈنڈی کی طرف پلٹا اور کسی سوچ میں کھویا ہوا پھر اس چوراہے پر جا پہنچا۔

موٹر کے پاس ایک کوہ بڑی ڈاڑھی والا بوڑھا شخص ایک چھڑی کا سہارا لئے کھڑا شوفر سے باتیں کر رہا تھا۔ ایشرسٹ کو دیکھ کر وہ یکلخت رک گیا۔ گویا کوئی بے ادبی کر بیٹھا ہے اور تعظیماً ٹوپی کو چھو کر لنگڑاتا لنگڑاتا پگڈنڈی پر ہو لیا۔

ایشرسٹ نے مٹی کی اس سبز ڈھیری کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟"

بوڑھا شخص ٹھہر گیا۔ چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دل میں کہہ رہا ہے۔ "مجھ سے بہتر یہ باتیں بتانے والا اور کون مل سکتا ہے؟" بولا۔ "یہ ایک قبر ہے۔"

"لیکن یہاں کیوں؟"

بڈھا مسکرا دیا" یہ لمبی داستان ہے میں سے کئی دفعہ سنا چکا ہوں۔ کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ ڈھیری کیسی ہے۔ ہم لوگ اسے دوشیزہ کی قبر کہتے ہیں"

ایلفرسٹ نے تمباکو کی تھیلی آگے بڑھادی۔ "پائپ بھرلو" بڈھے نے اپنی ٹوپی کو چھوا۔ اور آہستہ آہستہ اپنی مٹی کا پائپ بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو جھریاں اور بالوں میں سے اور پرکٹک رہی تھیں ابھی چمک باقی تھی۔

"جناب اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔ آج ذرا ٹانگ دکھ رہی ہے" یہ کہ کر وہ اسی ڈھیری پر بیٹھ گیا۔

"اس قبر پر ہمیشہ ایک آدھ پھول پڑا رہتا ہے۔ کچھ ایسی تنہائی بھی نہیں یہاں۔ اب تو جب سے یہ موٹروں کا چلنا شروع ہوا ہے۔ اکثر لوگ ادھر سے گزرتے ہیں۔ پچھلے زمانے کی اور بات تھی۔ اب تو یہاں چہل پہل رہتی ہے۔ اس بے چاری نے خودکشی کرلی تھی"

ایلفرسٹ نے کہا" سمجھ گیا۔ جبھی تو چوراہے میں دفن ہے۔ میرا خیال تھا اب یہ دستور نہیں رہا"

"مگر یہ تو بڑے عرصہ کی بات ہے۔ ان دنوں ہمارے ہاں کا پادری بڑا خدا ترس شخص تھا۔ اگلے سکیمس میں میری پنشن کو چھ سال ہو جائیں گے۔ اور جب یہ واقعہ ہوا۔ اس وقت میں پچاسویں برس میں تھا۔ اب تو کوئی ایسا شخص زندہ نہیں جسے اس کا حال مجھ سے بڑھ کر معلوم ہو۔ وہ یہاں قریب ہی رہتی تھی۔ اسی فارم میں جہاں مسٹر نیروکومب کے ہاں کام کیا کرتا تھا اب وہ فارم جک نیروکومب کے پاس ہے۔ میں کبھی کبھی اس کے ہاں بھی متفرق کام کرلیتا ہوں"

ایلفرسٹ پھاٹک کے سہارے کھڑا پائپ سلگا رہا تھا۔ دیا سلائی بجھ گئی۔ لیکن ایلفرسٹ نے دیر تک خمیدہ ہاتھوں کو چہرے کے سامنے سے نہ ہٹایا۔

اس نے کہا" اچھا!" لیکن اپنی آواز خود اپنے کانوں کو عجیب معلوم ہوئی۔ جیسے بیٹھی ہوئی ہو۔

"وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی! جب میں گزرتا ہوں یہاں ایک آدھ پھول ڈال جاتا ہوں۔ خوبصورت اور نیک تھی مگر انھوں نے اسے گرجے میں دفن نہ کیا۔ نہ وہیں دفنایا۔ جہاں وہ خود چاہتی تھی"

بڈھا ذرا دور ٹھہر گیا اور اپنا بالوں والا لاغر ہاتھ کھول کر اس ڈھیری پر بلیوبل کے پھولوں کے پاس رکھ دیا۔

ایلفرسٹ نے کہا" اچھا"

بڈھے نے کہا" بس یوں سمجھئے کہ کسی سے عشق ہوگیا تھا اس لڑکی کو۔ گو یقین سے کوئی نہ کہہ سکتا تھا۔ کسی لڑکی کے دل کا حال اللہ ہی جانے لیکن میرا خیال ہے کہ اسے کسی سے عشق تھا"

قبر پر ہاتھ پھیرا" مجھے اس لڑکی سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ خود بھی بہت زیادہ محبت کرنے والی تھی۔ یہی اس میں خرابی تھی" اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور ایلفرسٹ نے جس کے ہونٹ اس کی ڈاڑھی کے بالوں میں چھپے ہوئے تھے لیکن پھر کپکپاتے تھے کہا۔

"اچھا؟"

"پچھلے موسم بہار کا واقعہ ہے۔ لیکن یہی موسم تھا۔ عجب ہے یا ذرا چند دن بعد ہوگا۔ شگوفوں کے دن تھے۔ فارم میں ایک لڑکا کام کرتا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ اپنا ذرا خیال کرتا تھا۔ مجھے بہت پسند تھا۔ میں نے تو صاحب کوئی ایسی بات نہیں دیکھی لیکن میرا خیال ہے کہ اسی نے اس لڑکی کا سر پھرا دیا تھا۔"

بڈھے نے پائپ منہ سے ہٹایا۔ زمین پر تھوکا۔ پھر بولا۔

"بات یہ ہوئی کہ یہ لڑکا ایکا ایکی یہاں سے چل دیا اور واپس کبھی نہ آیا۔ اس کا تھیلا اور چھوٹی موٹی چیزیں ابھی تک فارم میں پڑی ہیں۔ میں ہمیشہ یہی سوچتا ہوں کہ اس نے اپنی چیزیں منگوا کیوں نہیں۔ ایشر یا ایسا ہی کچھ نام تھا اس لڑکے کا۔"

ایشرسٹ نے پھر کہا۔ "اچھا!"

بڈھے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اس دن سے اس لڑکی کے ہونٹوں پر تو جیسے مہر لگ گئی۔ دن بھر یوں پھرتی رہتی تھی جیسے حواس بجا نہ ہوں۔ وہ تو کچھ دیوانی سی ہو گئی۔ میں نے کبھی کسی کی حالت یوں بدلتے نہیں دیکھی۔ فارم میں ایک اور لڑکا تھا۔ جو تھی۔ وہ اسے چاہتا تھا۔ میں بے چاری لڑکی اس سے بہت ہی پریشان رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی گئی۔ بعض اوقات میں شام کے وقت بچھڑوں کے لئے گھاس لاتا تو وہ لڑکی باغیچے میں ہمیشہ سیب کے درخت کے پاس کھڑی ہوتی۔ اور بالکل سامنے تک رہی ہوتی۔ میں دل میں کہتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ لیکن تمہاری حالت زار ہے۔"

بڈھے نے اپنا پائپ پھر سلگایا اور سوچ کے انداز میں کش لگانے لگا۔

ایشرسٹ نے کہا۔ "اچھا؟"

"ایک دن مجھے یاد ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میگن تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے۔ (اس کا نام میگن ڈیوڈ تھا اور وہ اور اس کی خالہ بڈھی مسز نریدر کو سب دو توں اور یز سے آئی تھیں) میں نے کہا تمہیں ضرور کوئی دکھ ہے۔ کہنے لگی نہیں جم مجھے کسی چیز کا دکھ نہیں۔ میں نے کہا دکھ کیسے نہیں۔ ہے اور ضرور ہے۔ کہنے لگی نہیں تو۔ یہ کہا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو چھلک پڑے۔ میں نے کہا پھر تم ملتی کیوں ہو؟ اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں دکھ ہوتا ہے۔ لیکن تھوڑے دنوں میں آپ ہی ہٹ جائے گا۔ پھر کہنے لگی۔ جم اگر مجھے کچھ ہو گیا تو مجھے اس سیب کے درخت تلے دفن کیجیو۔ میں ہنس دیا۔ میں نے کہا تمہیں کیوں کچھ ہونے لگا۔ بچوں کی سی باتیں منہ سے نہ نکال۔ وہ بولی نہیں میں بچوں کی سی باتیں نہ کروں گی۔ میں نے دل میں سوچا لڑکیوں کی باتوں کا کیا ہے۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی چنانچہ اس بات کا خیال میں نے دل سے نکال دیا لیکن دو دن کے بعد کوئی شام کے چھ بجے میں بچھڑوں کو لئے آ رہا تھا کہ میں نے ندی میں سیب کے درخت کے پاس کالی سی چیز پڑی دیکھی۔ میں کہتا سنو ہے۔ پھر خیال آیا شاید کوئی سؤر کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ قریب پہنچا تب معلوم ہوا کہ کیا ہے!"

بڈھا رک گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو تک رہی تھیں۔ نظروں میں چمک تھی اور دکھ بھرا تھا۔

"ندی میں ایک چٹان ہے۔ اس میں رک کر پانی کا ایک تالاب سا بن گیا ہے۔ وہاں وہ لڑکی پڑی تھی۔ اسی مقام پر میں نے اس لڑکے کو ایک دو مرتبہ نہاتے بھی دیکھا تھا۔ لڑکی پانی میں اوندھی پڑی تھی۔ اور اس کے سر کے پاس ایک پتھر کے شگاف

جیسے سنہری پھولوں کا ایک پودا اُگ رہا تھا۔ چہرے کو دیکھا تو اس پر ایسا حسن آگیا تھا کہ آپ سے کیا کہوں۔ ننھے بچے کی طرح پرسکون اور خوبصورت تھا۔ جب ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ایسے پانی میں ڈوبنا تو ناممکن ہے۔ اور سچ پوچھئے تو اس کے چہرے سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ میں تو زار و قطار رو دیا۔ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ جون کا مہینہ تھا لیکن اسے سیب کے شگوفے کی ایک آدھ ٹہنی کہیں سے مل گئی تھی۔ اسے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ اسے شادی مرگ ہوئی تھی۔ ورنہ اس نالے سے کیوں مرتی۔ اور پھر پانی بھی تو فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن میں آپ سے کیسے کہوں کہ یہ چرچ کا بھید ہے۔ پادری کو بھی معلوم ہے۔ اسے بھی معلوم تھا۔ اور کوئی کہے کہ ہماری نہیں۔ تو میں کبھی نہ مانوں۔ میں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ وہ سیب کے درخت تلے دفن ہونا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سن کر لوگ اور بھی خلاف ہو گئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ اگر یہ بات ہے تو ضرور خودکشی کی ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے یہاں دفنا دیا۔ ہمارے پادری کو ایسی باتوں کا بہت خیال تھا۔"

بڈھے نے پھر ڈھیری پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر رک رک کر بولا۔

"لڑکیاں عشق کی خاطر کیا کچھ نہیں کر گزرتیں۔ وہ بڑی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ میرے خیال میں اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن یقین سے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

داد دینے کے لئے اس نے نظر اوپر اٹھائی۔ لیکن ایشرسٹ وہاں سے چل دیا تھا۔ اس طرح کہ گویا اور کوئی وہاں موجود ہی نہ تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر جہاں لنچ چن رکھا تھا اس سے پرے نظروں سے اوجھل وہ زمین پر اوندھا لیٹ گیا۔ تو اس کی پاکبازی کا صلہ یہ تھا! یہ عشق کی دیوی سائپرین کا انتقام! اس کی پُرنم آنکھوں کو میگن کا چہرہ دکھائی دیا۔ جس کے سیاہ بھیگے ہوئے بالوں میں سیب کے شگوفے لگے تھے۔ اور اس نے دل سے پوچھا۔

"میں نے کیا گناہ کیا تھا؟ میں نے کیا کیا تھا؟ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے دل میں جذبات خیز گل ریز مترنم بہار نے طوفان بپا کر دیا تھا۔ اس کے اور میگن دونوں کے دل میں۔ لیکن کیا دراصل عشق کو محض کسی کی جان لینا مطلوب تھا! تو پھر وہ یونانی ہی راستی پر ہے۔ اور "ہپالٹس" کے الفاظ آج بھی سچے ہیں۔

عشق کا دل دیوانہ ہے
اور اس کے پروں کی چمک سنہری ہے
اور جب وہ جست بھر کر اڑتا ہے
تو کوئی اس کے جادو کی تاب نہیں لا سکتا۔
وہ تمام زندگی جو بہار اور موج اور آب جو میں
شباب اور خودسری سے مست ہے
ہر وہ شے جو سینۂ زمین سے پھوٹتی ہے
یا سورج کی شہابی شعاعوں میں سانس لیتی ہے۔

وجہ سے اُن کو میری کوئی بات بُری بھی نہیں لگتی لیکن آخر ہیں تو مرد اپنے ہی معاملے میں [illegible]
چھوڑ کر مجھ سے کیوں کر بات کی جائے گی؟ نہیں نہیں۔ کتنا ہی دل کو مضبوط کروں اُن کے
آگے ایک حرف بھی مجھ سے نہیں بولا جائے گا۔ اُن کو لکھ کر کیوں نہ دوں۔ تحریر میں اپنا
مطلب بھی اچھی طرح آجائے گا اور کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوگی۔ کہ میں نے کیا لکھا اُنھوں
نے کیا پڑھا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اُن کے بس کی بات ہوتی تو وہ [illegible] میرے کہے آپ کرتے۔
[illegible] کچھ کر نہیں سکتے [illegible] کہنا [illegible] اُن کو بے فائدہ رنج دینا ہے۔
[illegible] میرا سہارا ڈھونڈتی پھروں میں آپ ہی اپنی اماجان سے کیوں نہ کہوں؟
[illegible] والی تو وہ ہیں دوسرے (گو وہ آباجان ہی کیوں نہ ہوں) بہت کریں گے تو صلاح کے
[illegible] بات اُن کے کان میں ڈال دیں گے [illegible] اور یہ کتنی بڑی خوبی ہے کہ آباجان کی طرح
مجھ پر اُن کی ہیبت نہیں۔ اگر میں آباجان کی خدمت میں گستاخ ہوں تو اماجان کے ساتھ بے تکلف
ہوں تو وہ بھی عورت میں بھی۔ اُن سے ایسی شرم کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ سب منصوبے
[illegible] ٹھیک ہے کہ میں آپ اپنی ایلچی بنوں اور اماجان سے چل کر خود گفتگو
کر[illegible] کے بعد چھوٹی دیر کے لئے آزادی کو جالی اور دھندوں سے فرصت ملی اور وہ
[illegible] تھی کہ اگر [illegible] فارغ ہوں تو اپنی رام کہانی سناؤں
اتنے میں پھر اس کو خیال آیا کہ میں نے اعتراض تو [illegible] سوچ رکھے ہیں لیکن اگر وہ
پوچھ بیٹھیں کہ آخر [illegible] کیا چاہتی ہے تو میں کیا جواب دوں گی۔ وہ میری کی بات تو میری سگے
[illegible] رہی اُن لوگوں میں پردے [illegible] اور نہیں غیر مردوں سے ملنے بات چیت کرنے کا
عیب نہیں۔ ہم لوگ ٹھیرے پردہ دار ہم سے اُن کی ریس کیسے ہو سکتی ہے۔ پردے کی
پابندی سے [illegible] تو اتنا ہی ممکن ہے کہ اوپر والے چھان بین کریں سو کر رہے ہیں۔ میں
بہت کروں تو کسی طرح چھپ چھپا کر دور سے جھلک دیکھ لوں وہ بھی شاید؟ سو آباجان
بھائیوں کو ٹھیک سمجھایا کرتے ہیں کہ صورت شکل ڈھلتی چھاؤں ہے یا چار دن کی چاندنی
آدمی کا بڑا ہنر لیاقت ہے اور اُسی سے کام پڑتا ہے اور اُسی کی پُرسش ہے۔ تو میں جو اتنے کے
واسطے انگشت نما بنوں مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی احمق ہوگا۔ رہیں دوسری باتیں عادت۔

اما یہ سب کچھ ہر مرد اور ہر عورت
سب کے اوپر ایسے سانچے ہیں۔ ایسے سانچے ہی تو حکومت کرتی ہے
صرف تو۔
یا تو کیا سچ کہتا ہے۔ میگن حسرت زدہ ہو گئی! پہاڑی سے نیچے اترتی ہوئی! میگن پرانے سیب کے درخت کے نیچے
رکی ہوئی! پہچان۔ مردہ میگن جس پر حسن کی مہر ثبت ہے:
ایک آواز کانوں میں پڑی۔
"وہاں ہم تم۔ آؤ دیکھو"
ایشرسٹ اٹھا۔ بیوی نے جو تصویر کھینچی تھی۔ اسے ہاتھ میں لیا اور چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔
"فرینک۔ اس کا پیش منظر ٹھیک ہے؟"
"ہاں"
"لیکن پھر بھی کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ہے نا!"
ایشرسٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "کمی؟ سیب کا درخت۔ موسیقی اور سنہری پھول!"

ترجمہ: پطرس

(کاروان)

نوعِ انسان کی کہانی

دنیا کی ابتدا

ہماری ہستی ایک بہت بڑا گورکھ دھندا ہے۔

ہم کون ہیں؟

ہم کہاں سے آئے ہیں؟

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

ان سوالات کا جواب افق سے بھی پرے کہیں دور ہمارا انتظار کر رہا ہے، اور ہم بہت ہی آہستہ آہستہ لیکن بڑے استقلال اور ہمت کے ساتھ اس کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

لیکن ابھی ہم نے کچھ بھی مسافت طے نہیں کی!

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔

ابھی ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ تاہم اتنا کچھ جان گئے ہیں کہ اپنے علم کی بدولت کئی اور باتیں بہت حد تک بوجھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

اس باب میں میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ ظہور انسان سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا کا کیا حال تھا!

اگر ہم یہ اندازہ لگائیں کہ کرۂ زمین پر جاندار اشیاء کا وجود کتنے عرصہ سے ممکن ہے، اور مدت کو اس لکیر سے ظاہر کریں کہ جو ننھی سی لکیر اس کے نیچے کھینچی گئی ہے وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ انسان یا انسان کے طرح کی مخلوق یہاں کتنے عرصہ سے رہتی ہے۔

انسان سب سے آخر میں آیا لیکن عقل کے ذریعہ قدرت کی طاقتوں کو تسخیر سب سے پہلے کیا۔ اسی لئے ہم بلیوں یا کتوں یا گھوڑوں یا دوسرے جانوروں کی بجائے انسان ہی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے گو اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ کرۂ زمین جس پر ہم آباد ہیں شروع شروع میں شعلہ بار مادے کا ایک بہت بڑا گولا تھا جو فضا کے ناپیدا کنار سمندر میں دھوئیں کے ایک ننھے سے بادل کی مانند اڑ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی سال بعد جب زمین کی سطح ٹھنڈی ہو چکی تو اس پر چٹانوں کی ایک پتلی سی تہ نمودار ہو گئی۔ ان گرم چٹانوں پر بے تحاشا مینہ برسا۔ سخت پتھر بارش کے پانی میں تحلیل ہو گئے۔ اور گدلا پانی ان وادیوں میں بہہ نکلا جو گرم گرم زمین کی چوٹیوں اور

وہ سچ جو کبھی جھوٹ نہ ہوگا

میں انسانی زندگی کی الجھنوں پر جس قدر غور کرتا ہوں اتنا ہی مجھ پر روشن تر ہوتا جاتا ہے کہ جس طرح ہر عہد کے لوگ روح بخش اور نجات کے لئے ایمان اور یقین کا دامن پکڑتے تھے اسی طرح ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے طنز اور رحم کا دامن پکڑنا پڑتا ہے

طنز اور رحم سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری راہنما نہیں ہو سکتی۔ طنز سے زندگی کے ہر موڑ پر مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے اور رحم اپنے آنسوؤں سے زندگی کو مقدس بنا دیتا ہے

جس طنز کو میں اپنا دیوتا بنانا چاہتا ہوں وہ کوئی سنگدل دیوتا نہیں۔ وہ محبت اور حسن کا مضحکہ نہیں اڑاتا۔ وہ حلیم اور مہربان دیوتا ہے اس کا تبسم دشمن کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور وہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ احمقوں اور ظالموں پر ہنسو ان سے نفرت مت کرو۔ کیونکہ یہ کمزوری کی نشانی ہے۔

ایک بہت بڑے فرانسیسی کے ان دانش مندانہ الفاظ پر میں اس کتاب کو ختم کرتا ہوں اور رخصت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ

ماخوذ از کتاب: نوع انسان کی کہانی۔ مصنف ہنڈرک وان لون

مترجم پطرس

بچے کا پہلا سال

ایک زمانہ تھا کہ لوگ بچے کی عمر کے پہلے سال کو تعلیم کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے۔ جب تک بچہ کچھ بولنا شروع نہ کرتا۔ اسے صرف ماں یا دایہ کی زیر نگرانی رکھا جاتا تھا۔ اور یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ خود ہی بچے کے نیک و بد کو ایسی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ انہیں سکھانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن فی الحقیقت لوگوں کا یہ خیال غلط تھا۔ اکثر بچے سال بھر کے بھی نہ ہونے پاتے کہ مر جاتے اور جو زندہ رہتے۔ ان میں سے کئی ایک کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی۔ غلط تربیت کی وجہ سے خطرناک ذہنی عادات کی بنیاد پہلے ہی پڑ جاتی۔ یہ حقیقت ابھی حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگ شیر خوار بچوں کی پرورش کے معاملے میں سائنس کا دخل پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے ماں کی ممتا اور بچے کے لاڈلے پن کا جو رومانوی تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اسے صدمہ پہنچتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ محض محبت اور لاڈ پیار اور چیزیں ہیں۔ اصل محبت اور چیز ہے جن والدین کو اپنے بچوں سے سچی اور اصلی محبت ہے وہ ان کی تربیت کے لئے سائنس کے اصولوں پر عمل کرنے سے نہیں گھبراتے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مضر رومانی قسم کی محبت انہی لوگوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ یا جو دوسروں کی مانند اپنے بچوں کو کسی قیمتی کھلونے کی طرح رکھنا چاہتے ہیں۔ اکثر تعلیم یافتہ والدین سائنس کی معلومات سے متنفر ہونے کی بجائے استفادہ کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان پڑھ لوگوں میں بھی سائنس کا چرچا روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی اموات روز بروز کم ہوتی جاتی ہیں۔ اگر لوگ پوری احتیاط سے کام لیں تو نہ صرف اموات کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی بلکہ جو بچے زندہ رہیں گے ان کی دماغی اور جسمانی حالت بہت بہتر ہوگی۔

جسمانی صحت کے ماہر ڈاکٹر لوگ ہیں۔ وہی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسائل اس کتاب کے دائرے سے خارج ہیں۔ لیکن ہم یہاں جسمانی صحت کے مسائل پر اسی حد تک بحث کریں گے۔ جس حد تک ان کا تعلق ذہنی یا نفسیاتی زندگی سے ہے۔ اور ان پر اس وقت بحث کرنا یوں ضروری ہے کہ اول تو عمر کے پہلے سال میں جسمانی زندگی اور ذہنی زندگی میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے دوسرے اگر شروع میں بچے کے جسم کا کما حقہ خیال نہ رکھا جائے تو چند ایسے نقائص کے پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جو بڑے ہو کر تعلیم کے رستے میں حارج ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہر چند کہ جسمانی صحت پہ بحث کرنا ڈاکٹروں ہی کا حصہ ہے تاہم اس موضوع پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ عرض کریں۔

نوزائیدہ بچہ کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔ اس کی تمام حرکات کسی عادت کی وجہ سے نہیں بلکہ اضطراراً سرزد ہوتی ہیں۔ اگر ماں کے پیٹ میں اس نے بعض عادتیں اختیار کر لی ہیں تو وہ کم از کم ایسی نہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے کام آ سکیں۔ یہاں تک کہ سانس لینا بھی اسے پیدائش کے بعد سیکھنا پڑتا ہے۔ اور بعض بچے تو محض اس لئے مر جاتے ہیں کہ سانس کا عمل دیر میں سیکھتے ہیں۔ ایک زبردست خواہش بچہ فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور

وہ بچہ مشکل ہی سے خوش ہے جب تک کہ وہ اس عمل میں مصروف ہے بہت خوش رہتا ہے۔ اس تمام وقت وہ ایک تجربہ کے عالم میں گزرتا ہے جس سے یوں تو ہم حاصل ہوتی ہے کہ دن اوقات کا بیشتر حصہ نیند میں گزر جاتا ہے۔ چند دنوں کے بعد یہ حالت بدل جاتی ہے۔ وہ بعض باتیں (مثلاً دودھ پینا وغیرہ) تو جلد کے ساتھ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے بعد پھر ان باتوں کا متوقع رہتا ہے یعنی یوں کہئے کہ اب وہ بعض چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور جن باتوں کا عادی ہو جاتا ہے انہیں کرنا پسند کرتا ہے گویا عادات پسند بن جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ شروع میں ایسا ہی تھا پھر عمر بھر ایسا نہیں ہوتا۔ ہر نئی چیز سے ناپسند ہوتی ہے اگرچہ اس عمر میں سیکھنے کا اہل ہوتا ہے۔ بڑے بڑوں کی طرح اپنی پسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں نہ کرے لیکن جانے دو اس عمر میں سب ہم بچے نئی نئی باتیں سیکھ کر سیکھ سکتے ہیں۔ تاہم شیر خوار بچے نئی عادتیں بہت جلد اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی بری عادت سیکھ لیں تو وہ بعد میں اچھی تربیت کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے شیر خواری کے زمانے کی عادات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے۔ اگر شروع شروع کی عادات اچھی ہوں تو بہت سہولت ہوتی ہے۔ وہ بچہ جو شیر خوارگی کے زمانے کی عادت اتنی راسخ ہو جاتی ہے کہ جیسے وہ کردار کا بالکل جبلت معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے اطفال پر اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے جو عادات بعد میں سیکھی جائیں ان میں یہ پختگی کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے زندگی کی عادات خاص طور پر اہم ہو سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اول اور سب سے مقدم صحت، دوم سیرت۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ایک ایسا انسان ثابت ہو جس کے اوصاف پسندیدہ ہوں اور جو اپنے گرد و پیش سے بہ احسن طریقہ نبھا سکے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صحت اور سیرت دونوں کے مطالبات ایک ہیں۔ جو چیز ایک کیلئے مفید ہے وہی دوسرے کے لئے مفید ہے۔ یہاں بحث سیرت سے ہے لیکن جو اصول ہم سیرت کی بہتری کے لئے وضع کریں گے۔ وہی صحت کے لئے بھی مفید ہوں گے یا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ تو تندرست ہو لیکن اس کے اخلاق برے ہوں۔ یا نیک سیرت ہو لیکن اس کا جسم امراض کا شکار ہو۔

آج کل ہر تعلیم یافتہ ماں جانتی ہے کہ بچے کو صرف مقررہ اوقات پر دودھ پلانا چاہئے اس سے بچے کا ہاضمہ درست رہتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک نہایت معقول وجہ ہے لیکن اس کے علاوہ اخلاقی نقطہ نظر سے بھی یہ بہت مفید ہے۔ شیر خوار بچہ اتنا بے عقل نہیں ہوتا جتنا ہم اسے سمجھتے ہیں اسے ایک دفعہ یقین ہو جائے کہ رونے سے مطلب نکل آتا ہے تو وہ ضرور روئے گا لیکن جب بڑا ہو کر اسی عادت کے زیر اثر وہ ہر وقت رو دھو صورت بنا کر لوگوں سے گلے شکوے کرتا رہتا ہے تو لوگ اسے چمکارنے کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ لوگوں کا یہ سلوک اسے ناگوار گزرتا ہے اور وہ دنیا کو خود غرض اور بے ہمدردی کے جذبے سے عاری سمجھ لیتا ہے۔ اگر لڑکی ہو اور بڑی ہو کر اسے حسین بنا دے تو بے جا توجہات اس بے جا فرمائشات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہ نقص اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی حال دولت مند لڑکوں کا ہوتا ہے کہ بچپن میں بگڑ جاتے ہیں اور پھر تمام عمر بگڑتے چلے جاتے ہیں جس شخص کی پرورش شیر خوارگی کے زمانے میں غلط طریقے پر ہو وہ بڑا ہو کر اگر ذی اقتدار ہے تو تندی اور حریص ہو سکتا ہے اور اگر بے بضاعت ہے تو لوگوں کی معزولی سے ترحم سے کام لیتا رہتا ہے اس لئے اخلاقی تعلیم روز اول ہی سے شروع کر دینی چاہئے۔ تاکہ نہ غلط توقعات پیدا ہوں۔ نہ بعد میں انہیں مجروح ہونا پڑے۔ اگر شروع میں اس کا تدارک نہ کیا جائے تو بعد میں بچے کی خواہشات کو ٹھکرانے سے اس کے دل میں غصے اور رنج کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

گویا بچے کی تربیت اس طرح کرنی چاہئے کہ نہ تو اسے لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں سے بگاڑا جائے نہ اس کی طرف سے بالکل بے توجہی برتی جائے مثلاً جو باتیں صحت کے لئے ضروری ہیں ان میں کوتاہی نہ کرنی چاہئے۔ بچے کو ہوا اور دھوپ سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو اسے اٹھا لینا چاہئے۔ تاکہ کسی بیماری نہ لگے اور وہ بہک نہ جائے لیکن اگر بچہ بغیر کسی جسمانی تکلیف کے رونا شروع کر دے تو اسے رونے دینا چاہئے ورنہ وہ بے جا خدمت کرانے کا عادی ہو جائے گا۔ جب اس کی دیکھ بھال کی جائے تو بہت زیادہ چاؤ اور اہتمام کی ضرورت نہیں بلکہ صرف وہ جو بات مناسب ہو وہ کر دینی چاہئے اور

چاہتی ہیں۔ جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا ہے وہ سونے پر کم وقت صرف کرتا ہے لیکن باقی تمام وقت اس کی طبیعت اکتائی رہتی ہے جب وہ ہوش میں ہو تو جاگ رہا ہو تو کوئی دلچسپی سے مصروف رہتا ہے انسان کی کوشش اعضا اور اس کی ذہنی قابلیت پر ہے لیکن تین مہینے کی عمر کے بچے کا ذہن صحیح کام کرنے کے قابل ہوتا ہے نہ وہ اپنے اعصاب پر قادر ہوتا ہے اس لئے مسرتوں سے محروم رہتا ہے۔ جانوروں کے بچے پیدا ہوتے ہی بہت جلد زندگی سے لطف اٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی مسرتیں غذائی ہوتی ہیں اور تجربے پر منحصر نہیں ہوتیں۔ انسان کا بچہ اگر صحت اچھی پر نظر رکھے تو اس کی خوشیوں اور دلچسپیوں کا حلقہ تنگ رہتا ہے۔ بچہ اپنی عمر کے پہلے تین مہینے عام طور پر اکتایا رہتا ہے اس لئے سونے میں بھی حکمت ہے۔ اس سے ذہنی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ اگر بچے کو بہت زیادہ بہلایا جائے تو وہ سوتا کم ہے۔

جب بچہ دو تین مہینے کا ہو جاتا ہے تو مسکرانا سیکھتا ہے اور اشخاص کے متعلق اس کے جذبات اشیا سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پہنچ کر ماں اور بچے میں سوشل تعلقات کا امکان شروع ہو جاتا ہے بچہ ماں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ اور نہ صرف جانوروں کی مانند بلکہ دو طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تحسین و تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے اپنے بچے میں اس خواہش کے واضح آثار پانچ مہینے کی عمر میں ظاہر ہوئے۔ میز پر ایک وزنی گھنٹی پڑی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس نے اسے اٹھایا اور بجایا پھر فخریہ مسکرا کر سب لوگوں کی جانب دیکھنے لگا۔ جب یہ خواہش پیدا ہو جائے تو گویا ایک زبردست حربہ معلم کے ہاتھ آ جاتا ہے یہ حربہ تعریف اور ملامت کا حربہ ہے۔ بچپن کے تمام زمانے میں اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس حربے کو از حد احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔ عمر کے پہلے سال میں بچے کی مذمت بالکل نہ کرنی چاہیے بعد میں بھی اس سے بہت حد تک احتراز واجب ہے۔ تعریف نسبتاً کم مضر ہوتی ہے لیکن تعریف نہ تو اس فراخدلی سے کرنی چاہیے کہ اس کی قدر ہی جاتی رہے اور نہ اس بخل کے ساتھ کہ بچے کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑے۔ جب بچہ پہلی دفعہ قدم اٹھائے یا پہلی دفعہ الفاظ منہ سے نکالے تو کسی معقول شخص کو اس کی کارگزاری کو سراہنے میں تامل نہ کرنا چاہیے۔ جب کبھی بچہ بہت سی کوششوں کے بعد کسی مشکل کو حل کرے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیے۔ بچے کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ ہمیں اس کی خواہش اکتساب کے ساتھ ہمدردی ہے۔

عام طور پر بچے میں خواہش اکتساب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اس کے لئے صحیح مواقع مہیا کر دینا ہی کافی ہوتا ہے باقی سب کچھ وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچے کو گھٹنوں چلنے یا پاؤں پاؤں چلنے یا اسی طرح کی دیگر حرکات سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باتیں کرنا البتہ ہم ہی لوگ سکھلاتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ باقاعدہ الفاظ سکھانے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔ بچے اپنی ترقی کی رفتار خود ہی متعین کرتے ہیں۔ اسے تیز تر بنانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔ مرتے دم تک انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشکلیں پیش آتی ہیں۔ ان پر قابو پاتا ہے اور اس سے مزید کوشش کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس سے بہتر طریقہ شوق کے بڑھانے کا اور کوئی نہیں۔ مشکلات نہ اتنی زیادہ ہونی چاہئیں کہ کام کرنے کا شوق ہی مر جائے اور نہ اتنی کم کہ طبیعت کو اکتا دیں۔ ہم کچھ سیکھتے اسی بات سے ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔ بڑوں کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ ایک دفعہ بچے کو کر کے دکھا دیں۔ مثلاً اس کے سامنے ایک دفعہ جھنجھنا بجا دیں اور پھر بچے کو چھوڑ دیں کہ وہ خود اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرے۔ جو کام دوسرے لوگ سرانجام دیں۔ وہ محض شوق پر تازیانے کا کام کر سکتے ہیں۔ لیکن جب تک بچہ وہ کام خود نہ کرے۔ اسے تعلیم نہیں کہا جا سکتا۔

باقاعدگی اور وقت کی پابندی شروع بچپن اور خصوصاً پہلے سال میں بہت ضروری ہیں۔ نیند، خوراک اور رفع حاجت کے لئے شروع ہی سے باقاعدگی کی عادت ڈالنی چاہیے۔ گرد و پیش کے حالات و واقعات کا مانوس ہونا ذہنی نقطۂ نظر سے بہت ضروری ہے اگر ایک ہی بات بار بار پیش آتی رہے تو بچے کو اس کے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ ذہن پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ اور یہ محسوس کرتا ہے کہ میں محفوظ ہوں

مزاج [illegible] برسوں ایک ساتھ رہنے کا اتفاق ہو تب کہیں جا کر معلوم ہوں تو ہوں۔
شیخ سعدی نے بہت درست کہا ہی ؎

تو ان شناخت بیک روز از خصائل مرد — کہ تا کجاش رسید ہست پایگاہ علوم
ولے ز باطنش ایمن مباش و غرہ مشو — کہ خبث نفس نہ گردد بہ سال ہا معلوم

پھر آدمی کے مزاج کا بھی کیا ٹھکانا ہی۔ لوگوں کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی۔ اس سے تو یہی بہتر ہی کہ کسی سے نہ کچھ کہوں نہ سنوں۔ تقدیر پر شاکر ہو کر خاموش بیٹھی رہوں جو کرے سو خدا۔ آخر انگریزوں کے علاوہ [illegible] لاکھوں کروڑوں عورتیں ہیں اور اسی طرح پر بیاہی گئی ہیں شاذ و نادر کہیں [illegible] بالاتفاقی بھی ہی سو انگریزوں میں بھی ہوتی ہی۔ خود میری نے ایسی کئی مثالیں بیان کی تھیں۔ اگر ہر جگہ ان بن رہا کرے تو دنیا کا کام کیوں کر چلے۔ اور پھر جب ایک کے ساتھ نباہ کرنا ٹھیرا تو اپنا مزاج اُس کی مرضی کے مطابق بنا لینا کیا بڑی بات ہی [illegible] اپنے مزاج کے بدلنے پر قادر ہو وہ دوسرے کو کیوں اُلاہنا [illegible] طرح کی باتیں آپ ہی آپ سوچ سمجھ کر آزادی ملکہ پاس جاتی جاتی رُک گئی۔ اور [illegible] ورنہ اُس کو ایسی باتوں کی نہی چڑ۔ اِس کو ایسا جھاڑتی کہ یاد ہی تو کرتی۔ جو عورت اپنی رائے پر ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم ہو کہ ساری عمر میاں کو سمجھاتے گزری [illegible] مرغے کی وہی ایک ٹانگ۔ وہ اس چار دن کی لڑکی کی بات کی کیا وقعت کرتی۔ لوئی ایسا ہی دل جانا ہوگا کہ خیال سے اس کی تکرار نہ ہوتی ہو اور تکرار بس ایک بات کی تھی کہ خواجہ آزاد ہر پہلو سے انگریزوں کی دانشمندی کی۔ ان کے حسن انتظام کی۔ ان کے [illegible] رواج کی۔ ان کے اخلاق کی۔ غرض ان کی سب باتوں کی یہاں تک کہ کھلم کھلا تو نہیں در پردہ اشارۃً کنایۃً ان کے مذہب کی بھی مدح کیا کرتا تھا۔ اور ہادی بیگم تھی مولویوں کے ایک بڑے نامی خاندان کی بیٹی۔ بھولے پن اور نرم دلی کی وجہ سے عورتوں کے عقائد مذہبی یوں بھی بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ ہادی بیگم اس بارے میں عام عورتوں سے بھی کسی قدر بڑھی ہوئی تھی۔ آزاد کی چھیڑ چھاڑ نے اس کو اور متعصب بنا دیا۔ وہ جو اعتراض یہاں سُنتی

دیہات میں بوائے سکاوٹ کا کام

مکھیوں کا بادشاہ

ایک دن سقراط گاؤں کے اسکول میں آیا۔ سب لوگ اسے جانتے تھے کہ جونہی بچے بچیوں نے اس کی صورت دیکھی، ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ پڑھنا لکھنا بھول گیا۔ اور سب کی نظریں دروازے پر گڑ گئیں جہاں بڈھے میاں مسکراتے بڑے غور سے بچوں کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔

سقراط نے کچھ کہے سنے بغیر کمرے کا ایک چکر لگایا۔ پھر اپنے آپ سے منہ ہی منہ میں باتیں کرنے لگا۔ "نہ کسی کے کانوں میں مُرکیاں دیکھیں۔ نہ ناک میں نتھ، نہ کسی کے چہرے پر میل، نہ کسی کی ناک بہہ رہی ہے، نہ ناخن بڑھے ہوئے ہیں (ایں، یہ کیا؟ اس بچی کے ناخن تو بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کی بات ہے! لیکن نہیں یہ کوئی نئی لڑکی ہوگی) اور یہاں نہ کسی کا پیٹ بڑھا ہوا ہے، نہ چہرے پر زردی ہے، نہ آنکھیں خراب ہیں، نہ کپڑے میلے ہیں۔ سب کے چہروں پر خوشی اور مسکراہٹ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اصلاح اور ترقی کے لیے جو ہم نے کوشش کی تھی وہ بے نتیجہ ثابت نہیں ہوئی۔"

چوتھی جماعت کے ایک شوخ لڑکے نے کہا: "بڑے میاں یہ ہم پر منتر پڑھ پڑھ کر کیا پھونک رہے ہو؟"

سقراط یوں چونک اٹھا گویا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ بولا "سلام ہے لڑکو! ہاں میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔"

"تو بڑے میاں! اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ ابا جان کہتے ہیں کہ تم خواب دیکھنے کے عادی ہو لیکن ہم تو خواب نہیں دیکھ رہے ہم تو سب جاگ رہے ہیں۔"

"تو پھر عزیزو میرے خوابوں میں سے ایک خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ایک ننھے سے لڑکے نے کہا۔ "واہ وا۔ تو اب سقراط میاں ہمیں ایک کہانی سنائیں گے۔"

سقراط کے آنے سے ماسٹر صاحب کا چہرہ بھی، اپنے شاگردوں کی طرح خوشی سے دمکنے لگا تھا۔ انہوں نے پوچھا: "کہئے آپ کا کون سا خواب سچا ثابت ہوا؟"

"میں چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ایسا اسکول دیکھ رہا ہوں جس میں گندگی نام کو بھی نہیں۔ جہاں نہ کوئی بچہ بیمار ہے، نہ کسی نے سونے چاندی کے زیور پہن رکھے ہیں۔ یہی خواب سچا ثابت ہوا ہے۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "یہ تو کچھ بھی بات نہیں۔ مہینوں سے ہمارے اسکول کی یہی حالت ہے۔ کبھی کبھی کوئی نیا بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو ہمیں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے لیکن ہم جلد ہی اسے بھی راہ پر لے آتے ہیں۔"

عین اس موقع پر ایک عورت داخل ہوئی۔ وہ چپ چاپ اور شرمائی ہوئی تھی لیکن تھی چست چالاک اور اکثر یہاں آیا کرتی تھی اس

بچوں کے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھ کر حیران تھا۔ سقراط نے دیکھا کہ سب لڑکے اور لڑکیاں ہاتھ کھولے بیٹھے ہیں اور جنہیں بیٹھے تھوڑی دیر میں سب لڑکے ایک طرف بیٹھ گئے اور سب لڑکیاں دوسری طرف۔ تب اس عورت نے لڑکیوں کو سوالوں کا ایک سبق پڑھانا شروع کر دیا۔ سقراط نے کمرے سے نکل جانا چاہا۔ مگر لڑکے دیکھ چکے تھے وہ سقراط سے لپٹ گئے سب چلا اٹھے: "بس بس بڑے میاں کہاں جا رہے ہو۔ ابھی تم نہیں جا سکتے۔ تم یہاں بیٹھے بڑی دیر کے لڑکوں سے باتیں کرتے رہے ہو کیا ہم نے کچھ قصور کیا ہے؟"

سقراط نے کہا: "یہاں میری ضرورت ہی کیا ہے۔ جو کچھ میں تمہیں بتا سکتا ہوں تمہاری استانی اس سے بہت زیادہ جانتی ہیں۔ میں کسی ایسی جگہ جاؤں گا جہاں میری ضرورت ہو۔"

استانی نے کہا: "نہیں آپ نہیں جا سکتے۔ ہم نے سب کچھ آپ ہی سے سنا ہے۔ کچھ دیر یہاں ٹھہریئے اور کوئی بات بتایئے۔"

سقراط نے کہا: "میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں استاد تھوڑا ہی ہوں۔"

اسی شوخ لڑکے نے پھر کہا: "اچھا تو کوئی کہانی ہی سنا دو۔" کہانی کا نام سنا تھا کہ سب لڑکے چلا اٹھے: "ٹھیک ہے کہانی، کوئی کہانی۔"

سقراط نے کہا: "میں کہانیاں وہانیاں نہیں سنایا کرتا۔"

اس پر کئی لڑکے بول اٹھے: "ہم نہیں مانتے۔ تم بچوں والے ہو۔ اپنے بچوں کو تو ضرور کہانیاں سناتے ہو گے۔"

سقراط نے کہا: "یہ کام میرا نہیں۔ ان کی ماں انہیں کہانیاں سنایا کرتی ہے لیکن تمہاری ماؤں کو چرخے کاتنے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔"

اس پر کئی لڑکیوں نے ایک زبان ہو کر کہا: "ہرگز نہیں۔ تمہیں ہماری ماؤں پر یہ الزام لگاتے شرم نہیں آتی۔ انہوں نے تو یہ کام برسوں سے چھوڑ رکھا ہے۔"

سقراط نے کہا: "خوب خوب۔ مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری ماؤں پر یہ جھوٹا الزام لگایا ہے۔ مجھے امید ہے تم معاف کر دو گے۔"

"معاف تب کریں گے جب تم ہمیں کوئی کہانی سناؤ گے۔"

"اچھا تو سنو، ایک تھا گھوڑا بہت ہی بڑا ——"

"رہنے دو، ہم ایسی بے ہودہ کہانی نہیں سننا چاہتے۔ سنانی ہے تو کسی کام کی کہانی سناؤ۔"

"دیکھو میاں سقراط! عقل کے ناخن لو اور ہمیں اچھی کہانی سناؤ جس میں بادشاہ ہوں، شہزادے اور شہزادیوں کا ذکر ہو۔ اگر تم چاہو تو ایسی کہانی سنا سکتے ہو۔"

"اچھا تو سنو، ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ وہ ایک چھوٹی سی ریاست پر حکومت کرتا تھا۔ رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ جہاں بادشاہ کا پسینہ گرتا وہاں رعایا اپنا خون بہانے کو تیار ہو جاتی۔"

لڑکوں نے کہا: "اب آئے نا راہ پر، ہاں تو پھر کیا ہوا؟"

"اس چھوٹی سی ریاست سے ملی ہوئی ایک بہت بڑی ریاست تھی۔ جس پر ایک بہت ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ اس بادشاہ کی بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اس چھوٹی ریاست پر قبضہ جما لوں۔ اس چھوٹی ریاست کے بادشاہ کے ہاں کوئی بیٹا نہ تھا ہاں ایک بہت خوب صورت بیٹی تھی۔ بڑے بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر میرے بیٹے کی شادی اس چھوٹے بادشاہ کی بیٹی سے ہو جائے تو بادشاہ کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت پر میرا قبضہ ہو جائے گا۔

لیکن چھوٹا بادشاہ اور اس کی رعایا اس کی نیت سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے اس کے بیٹے کے ساتھ اپنی شہزادی کی شادی کرنے

سے انکار کیا۔ اس پر بڑا بادشاہ بہت ہی جھنجھلایا اور اپنے امیروں وزیروں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا۔ وزیروں نے کہا: اس چھوٹے بادشاہ نے ہمارے بادشاہ کی ہتک کی ہے۔ ہمیں اس پر چڑھائی کر کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لینا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب چھوٹے بادشاہ کو اس کی خبر ملی تو وہ اپنے دل میں بہت فکرمند ہوا۔ اس کی فوج بڑے بادشاہ کی فوج کے مقابلے میں ایک چوتھائی بھی نہ تھی۔

اس چھوٹے بادشاہ نے اپنے امیروں وزیروں کو بلایا اور کہا: "اگر ہم لڑے تو یہ بادشاہ ساری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ اور اگر ہم یونہی بیٹھے رہے تب بھی وہ ہماری سلطنت پر قبضہ کر لے گا۔ ہم ایسے میں کیا کریں؟"

اس کی رعایا نے جواب دیا: "ہم لڑیں گے اور اپنی جانیں حضور پر فدا کر دیں گے۔"

بادشاہ نے کہا: "لیکن اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ غنیم کے مقابلے میں ہماری فوج بہت ہی تھوڑی ہے۔"

اس پر سب چپ ہو گئے لیکن اس ریاست کے تمام باشندے اپنے بادشاہ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ کیا دیہات میں اور کیا شہروں میں سب جگہ لوگوں کو یہی فکر تھی کہ ہم اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کو غنیم کے ہاتھ سے کس طرح بچائیں۔ یہاں تک کہ حیوانوں اور پرندوں کو بھی اپنے بادشاہ کی امداد کی فکر ہوئی۔

جب بادشاہ نے دوسری مرتبہ اپنے امیروں وزیروں کو طلب کیا تو اس موقع پر شیر بھی آئے اور کہنے لگے: "ہم دشمن کے گھوڑوں اور مویشیوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔"

بھیڑیے اور گیدڑ آئے اور کہنے لگے: "ہم دشمن کے خیموں کے ارد گرد گھومتے رہیں گے اور جو کوئی اکیلا دکیلا باہر نکلے گا اسے کھا جائیں گے۔"

کتوں نے کہا: "ہم ان کی ٹانگیں تک نہ چھوڑیں گے۔"

لیکن بادشاہ نے کہا: "یوں کام نہ چلے گا۔"

عین اس موقع پر ایک مکھی بادشاہ کی ناک پر آ کر بیٹھی۔ بادشاہ نے ہاتھ سے اڑا دی مگر مکھی وہاں سے جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس دفعہ وہ آ کر بادشاہ کے کان پر بیٹھ گئی۔ بادشاہ جھنجھلا اٹھا اور کہنے لگا: "اس مکھی نے تو ناک میں دم کر دیا۔ یہ مجھے کیوں تنگ کرتی ہے! میں پہلے ہی پریشان ہو رہا ہوں۔"

بادشاہ کے کان میں بھنبھناہٹ کی آواز آئی جیسے کوئی کہہ رہا ہو: "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ چونک اٹھا اور کہا: "یہ کون بولا؟"

وزیر نے عرض کیا: "حضور! کوئی بھی تو نہیں بولا۔"

بادشاہ کے کان میں پھر وہی باریک آواز آئی: "میں بولا تھا۔"

اب تو بادشاہ اچھل پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے ارد گرد دیکھنے لگا مگر اس کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ ناچار پھر آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا مگر دل ہی دل میں سخت حیران ہوتا اور کہتا تھا کہ میری پریشانیوں اور اندیشوں نے کہیں مجھے دیوانہ تو نہیں بنا دیا۔

اتنے میں پھر وہی آواز سنائی دی کہ: "میں حضور کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

امیر وزیر سب دم بخود کھڑے ہو گئے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ مگر اب بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور کسی ایسی ہستی کی آواز ہے جو نظر نہیں آتی۔

بادشاہ نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

"میں مکھیوں کا بادشاہ ہوں اور آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوا ہوں۔"

بادشاہ نے کسی قدر ناراضی سے کہا: "جاؤ، اپنا فضول وقت ضائع نہ کرو۔ بھلا تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ تم مجھے پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر مجھ سے مذاق کرنے آئے ہو؟"

"نہیں، میں اس خیال سے ہرگز نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ اور اگر آپ وعدہ کریں کہ میں جو کچھ مانگوں آپ دیں گے تو میں آپ کی مدد سے دریغ نہ کروں گا۔"

"میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے دسترخوان پر بیٹھنے کی اجازت مل جائے اور جہاں چاہوں اڑ سکوں۔"

بادشاہ نے ہنس کر کہا: "جاؤ، تمہیں اجازت ہے۔ میرے دشمن حملہ کرنے والے ہیں۔ اپنا سامان درست کر رہا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نہ تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو، نہ میرے دشمن کو نقصان پہنچا سکتے ہو۔"

آس پاس جو لوگ بیٹھے تھے جب انہوں نے بادشاہ کو آپ ہی آپ باتیں کرتے اور ہنستے دیکھا تو انہیں بہت فکر ہوئی۔ وہ سمجھے کہ پریشانیوں کی وجہ سے بادشاہ کا سر پھر گیا ہے اور وہ دیوانوں کی طرح آپ ہی آپ ہنس رہا ہے۔ لیکن بادشاہ نے سارا واقعہ ان سے بیان کر دیا۔ اس بات کا تو کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ مکھیاں ہماری کچھ امداد کر سکتی ہیں۔ البتہ اس خیال پر انہیں بہت ہنسی آئی کہ مکھیاں ہماری سلطنت کی حفاظت کرنا چاہتی ہیں۔ اس موقع پر ایک بڈھا جو سب سے پیچھے بیٹھا تھا اٹھ کھڑا ہوا اور مکھی کی شرطیں مان لینے کے خلاف رائے دینے لگا۔ اس نے چلا کر کہا: "بادشاہ سلامت! آپ نے اپنے معزز و مستقل ہمسائے سے بھی زیادہ خطرناک دشمن کے ہاتھ اپنی سلطنت بیچ ڈالی ہے۔"

اس پر چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں: "چپ رہو بڈھے، کیا بکتے ہو؟" اور بے چارے بڈھے کو زبردستی کھینچ کر اپنی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مجلس ختم ہو گئی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ مگر اس عرصے میں بڈھا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا۔

ایک لڑکے نے کہا: "خدا جھوٹ نہ بلوائے تو وہ بڈھا ضرور سقراط ہی ہوگا۔"

سقراط نے کہا: "اگر تم یوں میری بات ٹوکو گے تو میں باقی کہانی تمہیں نہ سناؤں گا۔"

ایک ننھی سی لڑکی نے کہا: "یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس خوب صورت شہزادی کا کیا حال ہوا؟"

سقراط نے چپکے سے اسکول سے باہر نکلتے ہوئے کہا: "یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔ آج صبح میں نے پہلے ہی تمہارا بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔"

کچھ دنوں کے بعد سقراط اپنی کہانی کا باقی حصہ سنانے پھر اسکول میں آیا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ اسکول کے احاطے میں ادھر ادھر اوپر نیچے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ اسکول کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

لڑکوں نے پوچھا: "احاطے میں تمہاری جو چیز کھو گئی تھی وہ ملی یا نہیں؟"

سقراط نے جواب دیا: "نہیں۔"

ایک لڑکے نے کہا: "یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ لیکن یہ تو بتاؤ تمہاری کیا چیز گم ہوئی ہے؟"

"میری کوئی چیز گم نہیں ہوئی۔ اور جو چیز میں تلاش کر رہا تھا وہ مجھے نہیں ملی اور مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ نہیں ملی۔"

کئی لڑکوں نے زور دے کر پوچھا: "تمہاری کوئی چیز گم بھی نہیں ہوئی اور تم ڈھونڈ رہے ہو، اِدھر اُدھر تلاش بھی کرتے ہو اور جب وہ تمہیں نہیں ملی تو تمہیں خوشی بھی ہوئی۔ یہ تو پہیلی سی پہیلی ہے۔"

"اچھا۔ اگر تم اسے پہیلی سمجھتے ہو تو پہیلی ہی سہی۔"

ماسٹر صاحب نے کہا: "مجھے معلوم ہے آپ کو کس چیز کی تلاش تھی۔ آپ کوڑا کرکٹ کی تلاش کر رہے تھے لیکن وہ اب آپ کو یہاں نہیں مل سکتا۔"

سقراط نے کہا: "بجا فرمایا آپ نے اور اس کے لئے میں آپ کو دلی مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے ایک تنکا بھی تو اسکول کے آس پاس کہیں نظر نہیں آیا۔ تمام گندگی اور کوڑا کرکٹ اسکول کے گڑھے میں پھینکا جاتا ہے۔ یقین جانئے مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی حاصل ہوئی۔"

اس کے بعد سقراط چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کو مخاطب کر کے بولا: "مجھے امید ہے کہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے اور اسکول چھوڑ دو گے تو تم بھی ان تمام اچھی عادتوں کو کبھی نہ بھولو گے۔"

استاد نے کہا: "اس کی طرف سے آپ بے فکر رہئے۔ اب صفائی ان کی فطرت کا جزو بن گئی ہے اور غلاظت سے انہیں دلی نفرت ہے۔ اور یہ نفرت ان کے دل سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ سبق پڑھنے سے پہلے یہ ہر روز اپنے اسکول کی صفائی کرتے ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر یہ جگہ کوڑے کرکٹ سے اٹی رہے تو اس کے خیال سے بھی انہیں یہاں بیٹھنا دوبھر ہو جائے۔"

یہ سن کر سقراط کے منہ سے بے اختیار "مرحبا" نکل گیا۔

اب کئی لڑکوں نے پوچھا: "ہاں بڑے میاں! اب وہ کہانی بھی تو سناؤ۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بات ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو!"

سقراط نے کہا: "لو ابھی سنائے دیتا ہوں۔ اچھا تو کہاں چھوڑی تھی کہانی؟ ہاں ہاں یاد آگیا۔ خوب صورت شہزادی باغ میں بیٹھی جراب بُن رہی تھی۔"

"نہیں میاں تو نہیں چھوڑی تھی۔"

"تو پھر یہاں چھوڑی ہو گی کہ "بہادر نوجوان شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور نیام سے تلوار نکال لی۔""

"نہیں، یہاں بھی نہیں چھوڑی۔ سقراط تم جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ خیر ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ تم نے کہانی وہاں چھوڑی تھی جہاں مکھیوں کے بادشاہ نے چیونٹی سلطنت کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ یہیں چھوڑی تھی۔ لو صاحب! یہاں سے رخصت ہو کر مکھیوں کا بادشاہ بھن بھن کرتا ہوا سیدھا بڑے بادشاہ کی سلطنت کی طرف روانہ ہو گیا۔ جس وقت وہ وہاں پہنچا تو وہ بڑا بادشاہ چڑھائی کے لئے اپنی فوجوں کو تیار کر رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اپنی راجدھانی میں ایک بہت شاندار جشن منانا چاہئے جس میں ہمارے تمام نوجوان شامل ہوں اور دنگل میں سب اپنے اپنے جوہر دکھائیں اور اس طرح ان میں سے تمام بہادروں اور سورماؤں کو چن کر اپنی ایک زبردست فوج تیار کر لوں جو میرے گستاخ ہمسایہ کو تباہ و برباد کر ڈالے۔

چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک شاندار جشن منایا گیا اور ملک کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ آ کر اس میں شامل ہوئے۔ جس جگہ نظر پڑتی تھی لوگوں کے خیمے ہی خیمے دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کا جب جی چاہتا، بادشاہ کے خرچ سے خوب کھاتے پیتے اور رنگ رلیاں مناتے۔ انہوں نے بادشاہ کی راجدھانی کی تمام زمین اور پانی کو گندہ اور نجس بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیماری کی ایک وبا پھیل گئی اور ہزاروں آدمی مرنے لگے۔ بہتیرے جتن

سپاہی گئے مگر مرنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ ناچار بادشاہ نے سب لشکریوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ میرے لشکر، تم سب کے پاس خود آئیں گے اور تم میں سے جو بہادروں کو چن چن کر فوج میں بھرتی کریں گے۔ یہ سن کر سب لوگ اپنے اپنے دیہات اور شہروں کو لوٹ گئے اور اپنے ساتھ بیماری کو بھی لیتے گئے اور اس طرح بڑھتے بڑھتے بادشاہ کی تمام سلطنت میں وبا پھیل گئی اور چند ہی روز میں ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے تب بادشاہ نے اپنی سلطنت کے بڑے بڑے امیروں، وزیروں کو بلایا۔ انہوں نے کہا: "بادشاہ سلامت! ہمارے تمام نوجوان مر چکے ہیں۔ ہمارے گھر ویران ہو گئے ہیں ہم اب جنگ نہیں کر سکتے۔ آپ نے بہادر سورماؤں کی فوج تیار کرنے کے لئے جو مہم شروع کی تھی اس نے نہ صرف اس فوج ہی کو برباد کر ڈالا بلکہ ہمارے ملک میں بھی تباہی پھیلا دی"

بادشاہ نے کہا: "افسوس! اب کئی سال تک ہم جنگ نہیں کر سکتے۔" اور سب بڑے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس خوفناک وبا کا حال جب بادشاہ کے کانوں تک بھی پہنچا اور اس کے امیر وزیر ایسے طاقت ور دشمن کے حملے سے بچ جانے پر بڑے حیران ہوئے حیران کہ جس وقت وہ بادشاہ کے آس پاس بیٹھے تھے تو مکھیوں کا بادشاہ بھی بھن بھن کرتا ہوا ان کے پاس آیا اور اپنی ننھی سی ترئی بجا کر اتنی اونچی آواز میں جو سب کے کانوں تک پہنچ جائے چلا کر کہنے لگا: "بادشاہ سلامت دیجئے میرا انعام! میں نے اپنا کام انجام دے دیا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے: "اے مکھیوں کے ننھے بادشاہ! ذرا ہمیں بھی معلوم ہو تم نے کیا کام سر انجام دیا ہے؟ ہمارے دشمن اگر مرے ہیں تو وبا سے مرے ہیں۔ اس میں تیری کوشش کو کیا دخل ہے؟ تو جھوٹا اور دغاباز ہے۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا: "میں ہرگز دغاباز نہیں۔"

بادشاہ نے کہا: "ثابت کر۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے کہا: "میں ثابت کرتا ہوں، سنئے۔ جب اس ملک کے دیہات اور شہروں سے نوجوان بادشاہ کی راجدھانی کی طرف روانہ ہوئے تو ہم بھی ان کی پیٹھوں، ان کے اسباب اور ان کے گھوڑوں اور بیلوں پر بیٹھ کر ان کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں ہر جگہ اپنے خیمے گاڑ دیئے اور بڑی بے احتیاطی سے، اپنے سمجھتے تھے۔ وہ اور ان کے بیل اور گھوڑے جہاں جی چاہتا پاخانہ اور لید کر دیتے۔ اور کوئی شخص زمین صاف نہ کرتا۔ اتفاق سے ان میں ایک شخص ایک ایسی جگہ سے آیا تھا، جہاں ہیضہ پھیلا ہوا تھا وہ اپنے ساتھ اس بیماری کے جراثیم بھی لیتا آیا تھا ہم سب یعنی میں اور میرا لشکر پہلے گندگی اور کوڑے کرکٹ پر بیٹھتے اس کے بعد ان لوگوں کے کھانوں، اور مٹھائیوں اور ان کے ہونٹوں اور آنکھوں پر جا بیٹھتے۔ ہم گندی جگہوں پر بیٹھنے کے بعد نہ تو اپنے پاؤں صاف کرتے اور نہ ہی ہاتھ۔ پہلے تو ہم نے دستوں کی بیماری پھیلائی پھر جب ہم نے سنا کہ کوئی شخص اپنے ساتھ ہیضے کے جراثیم بھی لایا ہے تو ہم نے ہیضہ بھی پھیلا دیا۔" یہ کہہ کر مکھیوں کے بادشاہ نے پھر اپنی ترئی بجائی۔ اور چلا کر کہا: "اے عادل اور انصاف پسند بادشاہ اب میں اپنا انعام مانگتا ہوں۔"

یہ سن کر سب لوگ خوف سے تھرا اٹھے اور بادشاہ نے کہا: "بے شک تم انعام کے حقدار ہو۔ میں اپنے قول کے مطابق تمہیں انعام دوں گا۔ اور تمہیں میری مٹھائیوں پر بیٹھنے اور جہاں جی چاہے اڑنے کی اجازت ہو گی۔"

اب وہی بڑھا حبشی جس نے بادشاہ کے مکھی کی شرطیں مان لینے کی مخالفت کی تھی اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا: "بادشاہ سلامت! میری التجا ہے کہ آپ نے مکھیوں کے بادشاہ سے جو اقرار کیا ہے اس سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھئے۔"

بادشاہ نے پوچھا: "ہمارے میاں یہ کیوں؟"

اس کے جواب میں وہ بڑھا جو بڑا سمجھدار تھا اور اس وقت تم لوگوں نے ٹھیک یہ جو دیتا تھا کہنے لگا: "جب آپ نے مکھیوں کے بادشا

کے ساتھ اتحاد کیا تھا۔ تو آپ نے انسان کے سب سے خطرناک دشمن کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ بادشاہ سلامت آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہی کہ سلطنت میں طرح طرح کی بیماریاں پھیلی رہتی ہیں ان میں سے زیادہ یہی مکھیاں پھیلاتی ہیں۔"

بادشاہ نے پوچھا: تب میں کیا کروں؟"

سفیر ابابیل: حضور! آپ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مکھیوں کو آپ کی مٹھائیوں پر بیٹھنے کی اجازت ہوگی اور وہ جہاں چاہیں گی اڑ سکیں گی۔"

بادشاہ نے کہا: ہاں! اور اس قول کو نبھانا میرا فرض ہے۔"

سفیر ابابیل: تو اپنے قول کو نبھائیے، لیکن خبردار رہیے کہ مکھیوں کا بادشاہ بھی آپ کے دشمن کی سلطنت کی طرح آپ کی سلطنت کو بھی تباہ کر ڈالے۔ مکھیاں گندگی میں پرورش پاتی اور بچے دیتی ہیں اور آپ نے یہ تو وعدہ نہیں کیا کہ آپ ان کے لیے گندگی بھی پھیلاتے رہیں گے۔"

بادشاہ نے کہا: "نہیں میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا اور نہ یہ اجازت دی ہے کہ وہ بادشاہ کے سوا کسی اور کے دسترخوان پر بھی بیٹھ سکیں۔"

یہ سن کر ایک چھوٹے قد کا شخص جو بڑا چالاک تھا۔ بول اٹھا: "بادشاہ سلامت! ابھی سے اس طاقت ور دشمن کو ختم کر دیجیے۔" لیکن بادشاہ نے اس کی بات کی کچھ پروا نہ کی اور کہا: "ہمیں اپنی جانوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ وہ مکھیاں جس طرح اس سے پہلے بادشاہ کی فوج میں وبا پھیلا کر اسے تباہ کر ڈالا ہے اسی طرح ہمیں بھی تباہ کر ڈالیں گی۔"

مکھیوں کے بادشاہ نے اپنا ننھا سا پاؤں زمین پر مارا اور بڑی بے صبری سے پوچھا: "اے بادشاہ! اس کا انجام کب ہوگا؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "اسی وقت لیکن میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس سے آگے بھی تم قدم نہ بڑھا سکو گے۔"

یہ سن کر مکھیوں کا بادشاہ اڑ گیا۔ اور تھوڑی دیر میں اپنا لاؤ لشکر لے آیا۔ تمام مکھیاں بادشاہ کی مٹھائیوں کے دسترخوان پر جا جا کر بیٹھتیں اور جہاں چاہتیں اڑتی پھرتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ تھوڑے ہی دنوں میں بیمار پڑ گیا لیکن چونکہ اور کسی نے مکھیوں کو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کے قریب نہ پھٹکنے دیا تھا اس لیے اور کسی کو کچھ ضرر نہ پہنچا۔ وہ اپنی کھانے پینے کی چیزیں یا تو باریک کپڑوں سے ڈھک کر یا الماریوں، برتنوں اور صندوقوں میں بند کر کے رکھتے۔ اس طرح مکھیوں کا کچھ بس نہ چلتا۔ اور وہ وبا نہ پھیلا سکتیں۔ اور چونکہ مکھیاں گندگی میں انڈے دیا کرتی ہیں۔ انہوں نے غلاظت اور کوڑے کرکٹ کے لیے الگ گڑھے کھدوا لیے۔ وہ ان میں تمام کوڑا کرکٹ پھینک دیتے۔ اور کسی جگہ گندگی وغیرہ کا نام تک نہ رہنے دیتے۔ وہ اپنے گھروں اور دیہات کو ایسا صاف ستھرا رکھتے کہ مکھیوں کو انڈے دینے کے لیے کوئی جگہ ہی نہ ملتی۔ پہلے تو وہ لوگ جہاں جی چاہتا پاخانہ کر دیتے تھے لیکن اب انہوں نے اس رسم کو بالکل بند کر دیا اور یہ قانون بنا دیا کہ کوئی شخص بھی سوائے گڑھوں اور گھروں کے پاخانوں کے جو انہوں نے خاص طور پر اس کام کے لیے بنوائے تھے۔ اور کسی جگہ رفع حاجت نہ کر پائے۔ اور وہ اپنے اصطبلوں اور مویشی خانوں کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے اور لید اور گوبر وغیرہ گڑھوں میں پھنکوا دیتے وہ ان گڑھوں کو پانی سے تر کرتے رہتے تاکہ وہ گرم رہیں۔ اور ان میں خمیر اٹھتا رہے۔ اور مکھیاں [illegible] ان میں انڈے نہ دینے پائیں۔ جب گڑھے بھر جاتے اور تمام کوڑا کرکٹ اور گندگی مٹی میں گھل مل کر نہایت عمدہ کھاد بن جاتی۔ تو وہ اسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے۔ اب انہیں مکھیوں کا کچھ اندیشہ نہ تھا۔ انہیں نہ صرف بیماریوں اور مکھیوں ہی سے چھٹکارا مل گیا بلکہ ان کی کھیتیاں بھی پہلے سے زیادہ ہری بھری ہو گئیں۔ اور ان کی جسمانی صحت بھی پہلے کی نسبت اچھی ہو گئی۔

اس طرح انہوں نے اپنی سلطنت کو نہ صرف اپنے ظالم ہمسایہ بادشاہ ہی سے بچا لیا بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک دشمن یعنی مکھی کے شر سے بھی محفوظ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی سلطنت کی رعایا نے بڑی سلطنت کی رعایا سے دوستی بھی پیدا کر لی۔ اور دونوں نے آپس میں عہد کر لیا کہ ہم پہلے ایک دوسرے سے لڑا کرتے تھے اب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گندگی، مکھی اور بیماری کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے۔ اور چھوٹی سلطنت کی شہزادی

اخبار میں ضرورت ہے

یہ ایک اشتہار ہے لیکن چونکہ عام اشتہار سے بہت زیادہ طویل ہے اس لئے شروع ہی میں یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوا کہ شاید آپ پہچان نہ پاتے۔

یہ اشتہار دینے والا ایک روزانہ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ چند دن سے ہمارا ایک چھوٹا سا اشتہار اس مضمون کا اخبارات میں نکل رہا ہے کہ ہمیں مترجم اور سب ایڈیٹر کی ضرورت ہے۔ یہ غالباً آپ کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ اس کے جواب میں کئی امیدوار ہمارے پاس پہنچے اور بعض کو تنخواہ وغیرہ چکانے کے بعد ملازم بھی رکھ لیا گیا لیکن ان میں سے کوئی بھی ہفتے دو ہفتے سے زیادہ نہ ٹھہر پایا۔ تب ہم نے سمجھا کہ یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اشتہار کا مطلب وہ کچھ اور سمجھے تھے۔ ہمارا مطلب کچھ اور تھا۔ مختصر سے اشتہار میں سب باتیں وضاحت کے ساتھ بیان کرنا مشکل تھا۔ جب رفتہ رفتہ ہمارا اصل مفہوم ان پر واضح ہوا یا ان کی غلط توقعات پر ضرب پڑی تو ہمارے تعلقات کشیدہ ہوئے۔ تلخ کلامی اور بعض اوقات دست درازی تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد یا تو وہ خود ہی نا شائستہ باتیں ہمارے منہ پر کہہ کر چلے جانے والے کا بل ادا کئے بغیر چل دیئے یا ہم نے ان کو دھکے مار کر باہر نکال دیا۔ اور وہ باہر کھڑے نعرے لگایا کئے جس پر ہماری اہلیہ نے ہم کو اگلے دوسرے دن دفتر جانے سے روک دیا اور اخبار بغیر ایڈیٹر ہی کے شائع کرنا پڑا۔ چونکہ اس قسم کی غلط فہمیوں کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ہم اپنے مختصر اور مجمل اشتہار کے مفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں کہ ہمیں کس قسم کے آدمی کی تلاش ہے۔ اس کے بعد جس کا دل چاہے ہماری طرف رجوع کرے جس کا دل نہ چاہے وہ بے شک کوئی پیسہ اللاٹ کرا کے ہمارے مقابلے میں اپنا اخبار نکال لے۔

امیدوار کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کام چور نہ ہو۔ ایک نوجوان کو ہم نے شروع میں ترجمے کا کام دیا۔ چار دن کے بعد اس سے ایک نوٹ لکھنے کو کہا تو بگڑ کر بولے کہ میں مترجم ہوں سب ایڈیٹر نہیں ہوں۔ ایک دوسرے صاحب کو ترجمے کے لئے کہا تو بولے میں سب ایڈیٹر ہوں، مترجم نہیں ہوں۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ نا تجربہ کار لوگ مترجم اور سب ایڈیٹر کو الگ الگ دو آدمی سمجھتے ہیں، حالانکہ ہمارے اخبار میں یہ قاعدہ نہیں۔ ہم سمجھ گئے کہ آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ دوسرے صاحب کہنے لگے آپ کے اشتہار میں عطف کا استعمال غلط ہے۔ ایک تیسرے صاحب نے ہمارے اداریے اور ہمارے نوٹ دیکھ کر ان پر تنقید کی۔ اس لئے ہم واضح کئے دیتے ہیں کہ ان لوگوں کی ہم کو ہرگز ضرورت نہیں جو ایک سے دوسرا کام کرنے کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور اس کے لئے دھونس کی آڑ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو ملازم ہوں گے انہیں تو وقتاً فوقتاً ساتھ کی دکان سے پان بھی لانے پڑیں گے اور اگر انہیں بحث ہی کرنے کی عادت ہے تو ہم ابھی سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب ایڈیٹر کے معنے یہ ہیں۔ ایڈیٹر کا اسم مخفف۔ اخبار میں ایک عہدہ دار کا نام جو ایڈیٹر کو پان وغیرہ لا کر دیتا ہے

میکے میں جاکر ایک ایک کے چار چار جواب دنداں شکن سیکھ آتی - اس نے میاں کی ضد پر
انگریزی سوسائٹی کی ایسی رُوئی دُھنکی کہ گویا مسٹریز آف لنڈن اس کو ازبر تھی - وہ
میری کے گھر میں آنے ہی کو کب پسند کرتی تھی مگر بیٹی نے ایسی بُری طرح ٹانگ اڑائی تھی کہ اس کی
کچھ بن نہیں پڑتا تھا - اور میری کی وہ باتیں جن سے آزادی کا دل بگڑا بادی بیگم کے
فرشتوں کو بھی اُن کی خبر نہ تھی - لڑکیاں لڑکیاں آپس میں سر جوڑے ہوئے صلاحیں
کیا کرتی تھیں - بادی بیگم بوڑھی عورت کو کیا مناسب تھا کہ ان کی شورتوں میں مداخلت
کرے - تو اگر آزادی یا اس جاکر میری کی سند پکڑتی یا انگریزوں کی ایسی قلعی کھولتی کہ
آزادی [illegible] میری [illegible] دیکھنے کی بھی روادار نہ ہوتی - مگر خدا کو میری کا پردہ
رکھنا منظور تھا [illegible] پاس [illegible] ہی نہیں کیا - اگرچہ آزادی نے اس وقت فیصلہ
کر لیا کہ اپنے [illegible] کے بارے میں کسی سے کچھ کہنا سُننا فضول اور لاحاصل
ہی اور یہ معاملہ ہی اس قسم کا ہی کہ چار و ناچار حوالہ بتقدیر کرنا چاہئے مگر کوئی سرسری بات
ہو تو آدمی اس کے خیال کو دل [illegible] بھی کرے - وہ طبیعت کو دوسری طرف مشغول کرنا
چاہتی تھی مگر رہ رہ کر آپ ہی آپ اس [illegible] ہوتا تھا کہ دیکھئے میری قسمت میں کیسے
آدمی کے پلے بندھنا لکھا ہی - ای ہی [illegible] سے تو بہتر ہی کہ میرا بیاہ ہی نہ کریں - یہ
کیوں میرے بیاہ کے پیچھے پڑ [illegible] تقاضا ہی یا میں نے درخواست کی ہی؟ اس بات
کے دل میں آتے ہی [illegible] والوں میں نظر ڈالی تو کوئی عورت ایسی نہ دکھائی دی
جو کنواری بیٹھی ہو - پھر لگی اس کا سبب سوچنے کہ شاید بڑے ہوکر بیاہ کا تقاضا پیدا ہوتا ہوگا
لیکن خدا جانتا ہی میرے دل میں تو اس وقت تک اس کا خیال بھی نہیں آیا اور میں تو بیاہ
کے نام سے گھبراتی ہوں اور جن کے بیاہ ہوگئے ہیں اُن کو بھی ایسا کہاں کا سُکھ ہی - کم عقل
لڑکیوں کو دُلھن بننے اچھے اچھے کپڑے زیور - پھول اور چوڑیاں پہننے مہندی لگانے خوش بو
ملنے کی شاید چند روز خوشی رہتی ہوگی اس کے بعد سے تو میں نے جس کو دیکھا دُکھڑا ہی روتے
ہوئے دیکھا - میاں کی بدمزاجی - ساس نندوں کے طعنے - بچوں کا جننا پالنا - گھر کی ٹہل -

ف انگریزی کی ایک کتاب ہی جس میں انگریزی سوسائٹی کے عیوب چُن چُن کر بھر دیئے ہیں ١٢

ہے اور باہر چاند پڑنے برس رہا ہے اور آندھیاں چل رہی ہیں۔

پچھلے سال قائد اعظم یہاں تشریف لائے تھے۔ وہ باغ جس کو لارنس گارڈن کہا کرتے تھے، اس میں جو "قصر" "گلستان" کہلاتا تھا وہاں ایک عظیم الشان پارٹی ہوئی۔ اس دن جو پاکستان کا جھنڈا پہلا جشن کا دن تھا "گلستان" کا نام "گلستان فاطمہ" رکھ گیا۔ اور تمام ایک بڑا پتھر کر باغ میں جو چھوٹی سی رہٹ اجنوں کی خوب صورت محراب استادہ ہے اس کی پیشانی پر نصب کیا گیا لیکن اس کی کتابت بیکار سیاہ و مسلسل تھی۔ کہ دوسرے رنگوں کو بھی کسی انسپکٹر کی تشریف آوری پر پایا جو ادہ نقشہ جو سے شرمندگی "محترمہ فاطمہ" کی بدمذاق ترکیب سے قطع نظر کیجئے اور اس کے مصنوعی پن کو جانے دیجئے جس کی بدولت نہ وہ قریب کی اس چیز سے مانوس رہ سکے جو دوپہر کے وقت درختوں کے سائے میں اپنا گرد آلود جوتا سرہانے کے رکھ کر اس باغ میں سو جاتے ہیں۔ نہ وہ جن کو ان پڑھ کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی پیشانی کے خط شکستہ کے وقت موزوں میں سعادت کو یہاں نہیں کھینچ سکتے ہیں۔ لیکن جب ان جوسے کی پیاسی گنہگار آنکھوں نے اسے یوں ایک نمایاں جگہ پر منقوش دیکھا تو دل اور دماغ پر دوت ہو گئے ہیں کہ ایسے شاندار موقع نے ہمارے اس سے بدصورت کتابت کی نمائش ذہن میں نہ آسکتی تھی۔ مسلمانوں کی قوم، وہ قوم جو کئی پشتوں سے فن خوشنویسی کی علمبردار ہے جس نے قرآن پاک کے ہزاروں نسخے اس صفائی اور ہنرمندی سے لکھے کہ کاتب حقیقت کے بھی ان کو آنکھوں سے لگاتا ہو گا۔ پنجاب کا خطہ، وہ خطہ جسے نستعلیق کی ایک جدید اور جمیل طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل ہے۔ لاہور کا شہر، وہ شہر جہاں ہر گلی میں ایک خوشنویس رہتا ہے اور جہاں حکیم فقیر محمد مرحوم جیسے استاد فن پیدا ہوئے جن کے سامنے ہندوستان بھر کے جادو رقم زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے اور اس پر یہ عالم کہ اس تقریب میں جو اس شہر میں مسلم قوم کی طرف سے عقیدت اور محبت کے مرتب دو لفظ لکھے پڑے ہیں اور ان کے بھی دائرے غلط ہیں اور نشست بے ڈھنگی ہو۔ آپ دیکھئے تو یقیناً آپ کو اس کی ترتیب میں جنون کا عروج نظر آتا۔ اور آپ پژمردہ ہو جاتے اور دانت پیستے کہ کس کے پاس جا کر شکایت کروں۔ اور اگر آپ کچھ بولتے اور بعض ایسے بھی ہوتے کہ ایسی خردہ گیری پر آپ کو بدتمیز سمجھتے یا آپ سے توقع رکھتے کہ آپ ہر قباحت کو حسن سمجھیں یا حسن کہیں۔ ورنہ آپ پر پاکستان میں کچھ لطیفے کا الزام عائد ہو آپ کی دلآزاری پر بہت آتا۔

اب آپ اس انجمن کے جلسے میں اپنے آپ کو کسی منبر پر پائیں اور آپ کے سامنے آپ کے ہم قوم بیٹھے ہوں اور وہ آپ کو زبان کھولنے کی اجازت دیں تو آپ جو سینے میں درد مند دل رکھتے ہیں یہ کہنے سے کیوں کر باز آئیں گے کہ اے مسلمانو! تمہارے آباؤ اجداد تو قطار در قطار اور خم اندر خم اس ذوق رکھتے تھے کہ دنیا میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ کوفی اور طغریٰ، نستعلیق اور نسخ، کس کس خم سے انہوں نے بیعت عشق کیا ہے۔ ان کے ایوانوں میں آویزاں وصلیوں کو دیکھو۔ ان کے مقطعات اور ذی نسخوں کو دیکھو، ان کے روضوں اور محلوں، ان کی مسجدوں اور خانقاہوں کے فرامین اور سکوں اور مہروں، ان کی قبروں اور ان کے کتبوں کو دیکھو۔ مرگ یا زیست کا کوئی مقام، سلطنت یا افلاس، مسرت یا ماتم، جشن یا یکسوئی، خلوت یا جلوت کا کوئی مقام ایسا ہے جہاں انہوں نے قلم اٹھایا ہو اور ان کے قلم نے حسین و جمیل حروف کے لافانی نقوش چوب و کاغذ، سنگ پر ثبت نہ کر دیئے ہوں۔ اب جب کہ خدا نے تمہیں اپنے گھر کے جیا اور تحفظ کے منصب پر قرآنی تہذیب سے نوازا ہے تو کیا دہی ہی قسمیں کھاؤ کہ اس میں کوئی کتابت جانے نہ دو گے اور عہد کرو کہ آج سے تمہاری دکانوں، تمہارے مکانوں، تمہارے دفتروں، تمہاری کتابوں اور اخباروں اور رسالوں، تمہاری مسجدوں اور تمہارے مزاروں، تمہارے سڑکوں اور تمہارے قریوں، پہاڑوں پر جہاں جہاں تمہارا ہاتھ پہنچے گا خط کھینچیں گے، اسلامیت کا نام روشن کریں گے۔ اور جو نزاکتیں اور لطافتیں اور رعنائیاں انہوں نے میدانوں میں بھائی ہیں انہیں مسخ نہ ہونے دیں گے تاکہ جہاں کسی کو تمہاری تحریر نظر آئے وہاں سے پکار اٹھے کہ یہ اس قوم کا لکھا ہوا ہے جس نے دنیا میں خوش خطی کا رتبہ بلند کیا اور جو اب بھی اپنا حسن آفرینی پر ناز کرتی ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بچوں کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً بلی کے بچے، فاختہ کے بچے وغیرہ۔ مگر میری مراد صرف انسان کے بچوں سے ہے، جن کی ظاہرا تو کئی قسمیں ہیں، کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے۔ کوئی پھول سا بچہ ہے اور کوئی چاند سا بچہ ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگھوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے بچے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہو کر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کر لی۔

یہ جو میں نے اوپر لکھا ہے کہ بیدار ہونے پر بچے کے پانچوں حواس کام کرنے لگ جاتے ہیں، یہ میں نے اور حکماء کے تجربات کی بنا پر لکھا ہے ورنہ حاشا وکلا میں اس بات کا قائل نہیں۔

کہتے ہیں بچہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن مجھے آج تک سوائے اس کی قوت ناطقہ کے اور کسی قوت کا ثبوت نہیں ملا۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ روتا ہوا بچہ میرے حوالے کر دیا گیا ہے کہ ذرا اسے چپ کرانا۔ میں نے جناب اس بچے کے سامنے گانے گائے ہیں، شعر پڑھے ہیں، ناچ ناچے ہیں، تالیاں بجائی ہیں، گھٹنوں کے بل چل کر گھوڑے کی نقلیں اتاری ہیں، بھیڑ بکری کی سی آوازیں نکالی ہیں، سر کے بل کھڑے ہو کر ہوا میں بائیسکل چلانے کے نمونے پیش کئے ہیں، لیکن کیا مجال جو اس بچے کی یکسوئی میں ذرا بھی فرق آیا ہو یا جس سُر پر اس نے شروع کیا تھا اس سے ذرا بھی نیچے اترا ہو۔ خدا جانے ایسا بچہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے تو کس وقت؟

بچے کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہو جب اس کے لئے کسی نہ کسی قسم کا شور ضروری نہ ہو۔ اکثر اوقات تو وہ خود ہی سامعہ نوازی کرتے رہتے ہیں ورنہ یہ فرض ان کے لواحقین پر عائد ہوتا ہے۔ ان کو سلانا ہو تو لوری دیجئے۔ ہنسانا ہو تو مہمل سے فقرے بے معنی سے بے معنی منہ بنا کر بلند سے بلند آواز میں ان کے سامنے دہرائیے اور کچھ نہ ہو تو شغل بے کاری کے طور پر ان کے ہاتھ میں ایک جھنجھنا دے دیجئے۔ یہ جھنجھنا بھی کم بخت کسی بے کار کی ایسی ایجاد ہے کہ کیا عرض کروں یعنی ذرا سا آپ ہلا دیجئے لڑھکتا چلا جاتا ہے اور جب تک دم میں دم ہے اس میں سے ایک ایسی بے سُری، کرخت آواز متواتر نکلتی رہتی ہے کہ دنیا میں شاید اس کی مثال محال ہے اور جو آپ نے ماموں یا چچا کے جوش میں آ کر برخوردار کو ایک عدد وہ ربڑ کی گڑیا منگا دی جس میں ایک بہت ہی تیز آواز کی سیٹی لگی ہوتی ہے تو بس پھر خدا حافظ۔ اس سے بڑھ کر میری صحت کے لئے مضر چیز دنیا میں اور کوئی نہیں سوائے شاید اس ربڑ کے تھیلے کے جس کے منہ پر ایک سیٹی دار نالی لگی ہوتی ہے اور جس میں منہ سے ہوا بھری جاتی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو والدین کہلاتے ہیں۔ بدقسمت ہیں تو وہ بیچارے جو قدرت کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مقرر ہوئے ہیں کہ جب کسی عزیز یا دوست کے بچے کو دیکھیں تو ایسے موقع پر ان کے ذاتی جذبات کچھ ہی کیوں نہ ہوں وہ یہ ضرور کہیں کہ کیا پیارا بچہ ہے۔

میرے ساتھ کے گھر ایک مرزا صاحب رہتے ہیں۔ خدا کے فضل سے چھ بچوں کے والد ہیں۔ بڑے بچے کی عمر نو سال ہے۔ بہت شریف آدمی ہیں۔ ان کے بچے بھی بیچارے بہت ہی بے زبان ہیں۔ جب ان میں سے ایک روتا ہے تو باقی کے سب چپکے بیٹھے سنتے رہتے ہیں۔ جب وہ رو کے تھک

خانہ داری کے بکھیڑے ایک مصیبت ہی - میں نہیں جانتی عورتیں کیوں یہ آفت مول لیتی ہیں؟ پر نہ ہو یہ کمبخت پیٹ سارے جتن کراتا ہی - عورتیں نکمی بے ہنر کچھ کمائی تو کر نہیں سکتیں مردوں کا سہارا نہ پکڑیں تو کھائیں پہنیں کہاں سے ؟ ماباپ زیادہ دن تک بار اُٹھا نہیں سکتے - بیٹیاں بیاہنے جوگی ہوئیں اور ماباپ نے ان کو کسی نہ کسی کے سر مڑھا - لیکن میں خیر ایسی بے ہنر بھی نہیں - محنت کروں گی تو گو دیدہ ریزی ہی کیا چار پانچ آنے روز کی بھی سلائی نہیں کر سکتی ؟ بخوبی اور بافراغت - لیکن پھر مزدوری کا نام مزدوری - تنگی ترشی سے گزر تو ہو جاے گی مگر بدنامی کتنی بڑی ہی - خواجہ ازاد کی بیٹی مولوی متقدی کی نواسی اور سلائی پر گزران ؟ ہی ہی خدا نہ کرے کہ بڑوں کے نام کو بٹہ لگاؤں - یہ کیا بیہودہ خیال ہی ؟ خدا کے فضل و کرم سے ددھیال [illegible] مقدور [illegible] سے اکیلے دم کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکیں گے [illegible] ان کے نام کے مطالبے عزت [illegible] ہیں؟ کریں گے اور ضرور کریں گے - لیکن کیسے [illegible] نہیں [illegible] بھاوجوں کو میری ایسی کیا پیٹ پڑی - بھائی ایسے [illegible] ہیں - [illegible] سے بولتی نہیں چالتی نہیں اس پر ابھی سے بھاوجوں کا مزاج نہیں ملتا - تو مجھکو ایک دم بھی نہیں ٹکنے دیں گی - بھلا اماجان سے اس کا مذکور کروں اور ان کو سوکول کو سہی ؟ اس میں تو ایسی کوئی بدلحاظی کی بات نہیں کہ میں بیاہ کرنا نہیں چاہتی - ابھی تک میں اپنے ہی دل سے باتیں جوڑ رہی ہوں کہ یوں کہیں گی اور وؤں کہیں گی - کیا معلوم کیا کہیں گی؟ شاید گفتگو میں کوئی بات نکلے جس سے میرا تردد رفع ہو اور اماجان کو ناگوار بھی نہ گزرے -

سچ ہی کہ کواری لڑکیاں اپنے بلکہ پرائے بیاہ برات کی باتوں میں بھی بڑی یا چھوٹی کسی طرح کی بات مونھ سے نہیں نکالا کرتیں - لیکن میں تو ایسی شرم کو شرم نہیں سمجھتی - ایک آدمی چوری کرنے سے شرماتا ہی تو اس کے یہ معنے ہیں کہ چوری بری ہی اور وہ بھی چوری کو بُرا سمجھتا اور چھپاتا ہی اور اگر اس کی شرم سچی ہی تو ایک نہ ایک دن چوری کو چھوڑے گا بھی ضرور - یہ کیسی شرم ہی کہ دنیا جہان میں بیاہ کا ڈھنڈورا پٹے میکے اور سسرال میں مبارک باد کا غل مچے - لڑکی دولھن بننے سے خوش - لڑکا دولھا پکارے جانے سے راضی - آدمی

مضحک اشیاء کے متعلق چند عام اصول

(پروفیسر ہنری برگساں کا فلسفۂ خندہ)

ہنسی کے کیا معنی ہیں؟ کسی مضحک چیز میں ہنسانے والا عنصر کون سا ہے؟ ہم کیوں کسی کے منہ چڑانے پر یا کسی مسخرے یا کاٹھ پتلی کے چہرے اور کبھی کسی شخص کی ہیئت کذائی پر ہنس دیتے ہیں۔ ان سب میں مشترک کیفیت کون سی ہے؟ ہم کس طرح معلوم کریں کہ اس کا تعلق اس روح سے ہے جو ایک روح کی طرح مختلف اجسام میں آ کر مختلف شکلیں اختیار کرتی ہے اور سامان تضحیک میں اس قدر تنوع پیدا کرتی ہے؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ارسطو سے لے کر آج تک اکثر حکماء اپنا دماغ صرف کرتے رہے لیکن جو ہمیشہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل کر پھر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا اور ان کی ہنسی اڑاتا رہا۔

جانِ خندہ یا روحِ ظرافت یا عنصرِ مضحک جو نام بھی آپ اس پری کے لئے تجویز کریں۔ اس کو منطق کے اصولوں پر کسی تعریف کے بند میں جکڑ دینا فضول ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ روحِ خندہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس لئے ہمیں اس کا ادب و احترام کرنا چاہئے۔ اور ایک آدھ فقرے میں اس کی تمام ہستی کو سمو دینا اس کی توہین کرنا ہے۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اس کا نظارہ کریں کہ وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اور کس طرح نشو و نما پاتی ہے۔ دیکھیں کہ کس کس ڈھنگ سے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے۔ ممکن ہے ہم اس دیرپا آشنائی کی وجہ سے اس کو اچھی طرح جاننے لگیں۔ اور ہمیں اس بات کی ضرورت ہی نہ رہے کہ کوئی ایک فقرے کی حدود کے اندر اس کو بند کر کے ہمارے سامنے کا نقشہ پیدا کر دے۔ اور ممکن ہے یہ آشنائی ہمارے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو۔ کیونکہ روحِ خندہ کی بھی ایک منطق ہے۔ وہ بھی اپنا ایک مقررہ طریق عمل رکھتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی آوارہ و وارفتہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کئی مضحک باتیں ایسی ہیں جن کو ایک زمانہ جانتا ہے۔ احسان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جن پر ایک قوم کی قوم ہنس پڑتی ہے۔ جن پر ایک ملک کا ملک دہرا ہوا جاتا ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اگر ہم روحِ خندہ سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ تو ساتھ ہی ہمیں عوام الناس کے تخیل کا بھی کچھ نہ کچھ علم حاصل نہ ہو جائے۔ ہنسی خود زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور فن کی بہت ہی قریبی رشتہ دار ہے۔ تو ممکن ہے یہ زندگی اور فن پر بھی بہت سی روشنی ڈالے۔

شروع شروع میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہنسی کے متعلق تین بنیادی اصول بیان کر دئے جائیں۔ ان اصولوں کا خود مضحک اشیاء سے بہت تعلق نہیں لیکن ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے میدانِ تضحیک کی حدود قائم کی جا سکتی ہیں۔

فصل۔ دورانِ بحث میں سب سے پہلی بات جس کی طرف ہمیں اپنی توجہ مبذول کرنی چاہئے یہ ہے کہ کوئی سامانِ تضحیک انسانی دائرہ سے باہر نہیں پایا جاتا۔ کسی دریا یا پہاڑی کا منظر ممکن ہے کہ خوبصورت ہو۔ ممکن ہے کہ دلفریب و دلکش ہو یا ممکن ہے کہ بالکل ہی حقیر و بدنما ہو لیکن مضحک ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات ہمیں ایک جانور کو دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ جائے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ ہماری نگاہ کو اس میں انداز

اس تعریف میں یہ شامل ہے کہ انسانوں کی یہی وقت محسوس ہوجاتی ہے جو ہمارے تضحیک بن جاتی ہے ممکن ہے کہ بعض اوقات ٹوپی ایک بھونڈی نمدہ [illegible] چیز ہنسی پیدا کرے۔ لیکن جو چیز مضحک ہے وہ اس ٹوپی کا نمدہ نہیں۔ وہ ہے دراصل اس ٹوپی کی شکل ہے۔ وہ شکل جس کو انسان کی ہوس [illegible] نے بنایا جو کسی انسان کی [illegible] غیر ذی [illegible] جہاں [illegible] مضحک نہیں ہے کہ وہ کسی انسانی دماغ کے ایک عجیب و غریب خیال کی ترجمان ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ ایسا اہم اور ایسا سیدھا سادہ مسئلہ فلسفیوں کی تفتیش سے اس قدر الگ رہا ہے۔ اکثر لوگ انسان کو "حیوان ناطق" کے نام سے پکارتے ہیں۔ انہیں غور سے دیکھنا ہے تو نہ صرف "حیوان ضاحک" بلکہ "حیوان مضحک" بھی ہے۔ اگر کوئی اور حیوان یا کوئی بے جان چیز بھی ہنسی کا باعث ہوتی ہے۔ تو ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ غیر مضحک یا کوئی انسانی مشابہت ہو کہ جیسا صنعت انسانی کا کوئی نقش اس پر [illegible] کا الزام [illegible] ہے۔ جو کوئی انسان اس چیز سے [illegible] ہو۔

دوسری بات جس کا بیان کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اکثر ہنسی کے وقت جذبات مفقود ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی مضحک چیز اپنا اثر پیدا ہی نہیں کر سکتی جب تک روح انسانی مکمل سکون و قرار کی حالت میں نہ ہو۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم ایک ایسے شخص کی ہنسی نہیں اڑا سکتے جس پر ہم ترس کھاتے ہوں۔ یا جس سے ہمارے الفت و محبت کے تعلقات وابستہ ہوں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ایسے شخص کی ہنسی اڑانے کے موقع پر تھوڑی دیر کے لئے رحم اور محبت کی زبان بندی کر دیتے ہیں۔ چند ایسے اشخاص کی جماعت میں جو صرف دماغ ہی دماغ رکھتے ہیں اور جن کا دل [illegible] میں گرد جذبات کا [illegible] معدوم ہو۔ شاید کوئی شخص بھی کبھی روتا ہوا نہ پایا جائے۔ لیکن ہنسنے والے پھر بھی اس میں موجود ہوں گے اس کے مقابلے میں ایک جماعت حساس طبیعت رکھنے والے اشخاص کی ہے جن کا دل زندگی کی اہمیت کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہے یعنی وہ اشخاص جن کو اہل دل کہا جاتا ہے اور جن کی فطرت میں ہر ایک واقعہ ایک جذباتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے (جو ہمیشہ کمال کو پہنچی رہتی ہے۔) ایسے اشخاص نہ ہنسی سے آشنا ہیں نہ اسے سمجھ سکتے ہیں۔ جو آوازیں آپ کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا جو حرکات و افعال آپ کے سامنے ظہور پذیر ہوتے ہیں اگر آپ ان کے ساتھ دلچسپی پیدا کر لیں۔ اگر آپ تصور و تخیل میں اداکاروں کے افعال میں ان ہی کی طرح شریک کار ہو جائیں اور انہیں کی طرح سب کچھ محسوس کرنے لگیں۔ مختصر یہ کہ اگر آپ اپنے جذبہ ہمدردی کو پوری طرح وسعت دے دیں تو حقیر سے حقیر چیز آپ کی نظروں میں اس قدر قیمتی بن جائے گی۔ گویا کسی طلسم نے دنیا کی حقیقت کو یکلخت بدل دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام محسوسات پر ایک تاریکی چھا جائے گی۔ جو آپ کو ہنسی سے محروم کر دے گی۔ اب اگر آپ کشمکش حیات سے الگ ہٹ کر اور اپنے آپ کو بالکل لاتعلق بنا کر اس کا نظارہ کریں تو کئی باتیں آپ کے لئے مضحک بن جائیں گی۔ اگر کہیں موسیقی کے ساتھ باقاعدہ تال پر ناچ ہو رہا ہو تو آپ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اگر آپ اپنے کانوں کو اس طرح بند کر لیں کہ موسیقی کی آواز آپ بالکل نہ سن سکیں تو نظارہ رقص مضحک ہو جاتا ہے۔ اور شاید ہی کوئی فعل انسانی ایسا ہو۔ جو اس طرح کی آزمائش میں پورا اترے اگر ہم افعال و حرکات کو جذبات کی ہم آہنگ موسیقی سے علیحدہ کر کے ان پر نظر ڈالیں تو ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو فوراً سنجیدگی سے گرے ہوئے نظر آنے لگیں گے۔ ثابت ہوا کہ کسی مضحک چیز کے پورے طور پر اثر پذیر ہونے کے لئے ایک عارضی انعدام جذبات ضروری ہے۔ تضحیک کا تعلق عقل و فہم اور صرف عقل و فہم سے ہے۔

لیکن ہنسی کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا دماغ اور انسانوں کے دماغوں سے واقف [illegible] ہو [illegible] ہے اگر آپ اپنے آپ کو بالکل تنہا اور علیحدہ محسوس کریں تو آپ مضحک اشیاء سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ ہنسی کے لئے ہمیشہ ایک گونج ایک صدائے بازگشت یعنی شرکت و رفاقت کا ہونا ضروری ہے۔ آپ خود ہنسی کی آواز کو غور سے سنئے۔ یہ صاف [illegible] اور [illegible] شدہ آواز نہیں۔ خود [illegible] آواز

تھا اس پتھر سے ٹھوکر لگی ہے۔ اس سے بچ کر چلتا یا اپنی رفتار بدل دیتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور تو خیر اس کے ذہن میں لچک نہ تھی اچھلنے کی قابلیت نہ تھی یا شاید وہ کسی اور خیال میں ڈوبا ہوا تھا یعنی اس کا خیال کہیں اور تھا، اور اس کے جسم میں اتنی لچک اور تیزی کی قابلیت نہ تھی کہ وہ خیال کے یکا یک حاضر ہو جانے پر اپنے بگڑتے ہوئے توازن کو فوراً سنبھال لیتا۔ اس سے اس کے اعصاب اپنے پہلے فعل یعنی تنے رہنے کی حرکت ہی میں مصروف رہے حالانکہ نئے حالات کچھ اور چاہتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ گر پڑا اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں کو ہنسی بھی آئی۔

اب ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا معمول نہایت ہی باقاعدہ اور مرتب ہے۔ اور جو چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اپنے معمول سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ اس کی تمام اشیا ایک مقررہ طریقے اور ترتیب سے لگی رہتی ہیں اور وہ بہت ہی باقاعدگی سے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اب فرض کیجئے کوئی شریر لڑکا آ کر ان تمام چیزوں کی ترتیب کو بدل دیتا ہے۔ اب وہ شخص میز پر سے قلم اٹھانے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ میں چاقو آ جاتا ہے جب وہ الماری میں سے طب کی کتاب نکالتا ہے تو اس کی جگہ موزوں کا ناول نکل آتا ہے جب وہ کرسی پر بیٹھنے لگتا ہے تو دھم سے زمین پر جا گرتا ہے چنانچہ اس سے کوئی کام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ عادت اس کو مجبور کرتی ہے کہ جب اسے کرسی پر بیٹھنے کی ضرورت ہو تو وہ ایک خاص جگہ پر پہنچ کر بیٹھ جائے۔ اب اگر خلافِ معمول کرسی وہاں موجود نہیں تو چاہئے تھا کہ وہ اپنی اس حرکت کو روک لیتا۔ یا منحرف کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ ایک مشین کی طرح بے خطا سیدھا چلتا رہا۔ گویا جو شخص اس قسم کی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کی حالت بھی ایک طرح سے اسی شخص کی سی ہے۔ جو دوڑنے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ سامانِ تضحیک دونوں حالتوں میں ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں اشخاص میں ان خاص موقعوں پر بل کھانے یا لچک جانے کی قابلیت کافی مقدار میں نہیں ہوتی۔ اور چونکہ ہم ایک انسان سے اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ نہایت ہی بیداری سے حرکت کرے اور اس میں مڑ جانے کی قابلیت پائی جائے۔ اس لئے ہمیں ان پر ہنسی آتی ہے۔ ان دو اشخاص کی مضحکہ کیفیتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں تو ہنسنے کا سامان سوء اتفاق نے مہیا کیا تھا۔ اور دوسری حالت میں ایک لڑکے کی شرارت نے۔ ان دو وجوہات سے ان دو کیفیتوں میں لچک جانے کی قابلیت کی کوتاہی ظہور میں آئی۔

لیکن ان دونوں میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ جو مضحک نتیجہ رونما ہوا اس کی علت خارجی تھی۔ یعنی ان اشخاص کی اپنی ذات میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اب اگر اس لچک کی کوتاہی کے ظہور کے لئے سڑک میں کسی پتھر کے پڑے ہونے یا کسی شریر لڑکے کی شرارت کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ یہ کوتاہی قدرتی اور طبعی طریقے پر خود اپنے خزانے میں سے اپنے ظہور کے لئے کوئی موقع نکال لے تو سامانِ تضحیک کی علت خارجی نہ رہے گی بلکہ داخلی بن جائے گی۔ ایک ایسے شخص کی مثال لیجئے جس کا دماغ اپنے گزشتہ افعال کے متعلق مصروف رہتا ہے۔ اور اس بات کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتا کہ وہ ابھی ابھی کیا کر رہا ہے۔ یعنی اس کے خیالات زمانۂ حال سے ہمیشہ ایک قدم پیچھے رہتے ہیں۔ اگر آپ اس سے کوئی سوال پوچھتے ہیں تو وہ اس کا وہی جواب دیتا ہے جو کہ اس نے کسی اور شخص کو کسی اور بات کے متعلق دیا تھا۔ اگر اس کے سامنے ایک گاڑی آ کر رک جاتی ہے تو وہ اس پر اسی طرح چڑھنا شروع کر دیتا ہے جس طرح وہ صبح اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھا تھا۔ یعنی چڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حواس اور عقل دونوں میں ایک لچک اور تیزی کی ایسی کمی اور کوتاہی ہے۔ کہ وہ زمانہ حال میں وہ آوازیں سنتا ہے جو کچھ عرصہ ہوا بند ہو گئیں اور وہ کچھ دیکھتا ہے جو آنکھوں سے کب کا اوجھل ہو چکا۔ اس کے حواس اور اس کی عقل میں اتنی لچک نہیں کہ وہ ان پر زور ڈال کر ان کو گرد و پیش کے حالات کے ساتھ مطابقت دیتا رہتا۔ جب کہ اس پر واجب یہ ہے کہ اس کے افعال حقیقتِ حاضرہ کے موافق ہوں۔ ایسی حالت میں سامانِ تضحیک (اور اس کی علتِ ظہور) خود اس شخص کی ذات کے اندر موجود ہے۔ ایسا شخص بعض اوقات بہت ہی مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔ اور اگر آپ ذرا غور کریں تو آپ کو شیخ چلی کی کئی ایسی باتیں یاد آ جائیں گی جو اس خیال کی ترجمانی کریں گی۔

خیال کی غیر حاضری کا جو تیسرا نمونہ میں نے بتایا ہے، اس کا منظر عام طور پر اوقات دیگر وجوہ سے اور بھی زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ فرض کیجئے آپ ایک شخص سے کسی وقت بے پرواہ ملتے ہیں، جو غیر حاضر رہتے تک ساری تاریخ سے واقفیت ہو اس کی داستان گویا آپ کی آنکھوں کے سامنے پیدا ہو۔ وہ آپ اس بات سے بھی واقف ہوں کہ وہ جیسے بڑھتی رہتی ہے ویسی وجوہ سے ترقی کر رہی ہے تو آپ کو اور بھی زیادہ ہنسی آئے گی۔ فرض کیجئے ایک شخص رات دن مجنوں اور فرہاد کے قصے پڑھتا رہتا ہے۔ اس کو چوبیس گھنٹے اس کا دل و دماغ عشق کی وحشت، صحرا نوردی، خود فراموشی، بےخودی اور دیگر کیفیات میں مشغول رہتا ہے۔ مجنوں کی قسمیں، فرہاد کا کوہ کن ہونا اسے اتنا جاذب اور دلکش معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی تقلید کرنے لگ جاتا ہے۔ اب وہ اپنے آپ کو عاشق تصور کرتا ہے۔ اور اس کے خیالات اور رویے اسی کی طرف مائل ہوتے ہوتے بالکل اسی کی طرح ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اسے اس کی یہی حالت رہی لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ وہ آیا اور لوگوں کی صحبت میں شریک ہوا تو اس طرح گویا ایک مسلسل خواب اس پر طاری ہے۔ وہ اسی خواب میں رہبر رہبر چل پھر رہا ہے۔ اس کی باتیں اس طرح کی ہوں گی جیسے کوئی نیند میں بڑبڑا رہا ہو۔ اب اس کی تمام حرکتیں کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسے شخص میں سامان تضحیک کس قدر موجود ہوتا ہے۔ جب آپ اس سے وقت پوچھتے ہیں تو وہ ایک شعر پڑھ دیتا ہے اور کبھی وہ آپ کو اپنا محبوب فرض کر کے ایک قصیدہ پڑھنے لگ جاتا ہے۔ ایسے شخص کے خیال کی غیر حاضری میں یہ بات نمایاں ہے کہ اس کا خیال غیر حاضر تو ضرور ہے لیکن اس کے علاوہ کسی اور جگہ حاضر بھی ہے جہاں وہ موجودات سے بے خبر ہے۔ وہاں تخیلات سے باخبر بھی ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ گرد و پیش میں بےکار ہے، بلکہ وہ ایک اور دنیا میں مصروف بھی ہے۔ ایسی ہستی اس شخص سے زیادہ مضحک ہے، جس کے خیال کے متعلق آپ صرف یہی جانتے ہیں کہ کہیں چلا گیا ہے، لیکن یہ نہیں معلوم کہ آخر وہ ہے کہاں؟ مگر جب آپ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ اوقات موجودہ سے بے خبر اس کا دماغ کس بات میں مصروف ہے تو وہ زیادہ مضحک ہو جاتا ہے۔ ایسے اشخاص کو عوام عام میں جنونی اور پاگل کہتے ہیں۔ ان دیوانوں کو دیکھ کر جب ہمیں ہنسی آتی ہے تو ہمارے ساز ہستی میں وہی تار لرزاں ہوتے ہیں جو کسی ایسے شخص کو دیکھ کر لرزاں ہوتے تھے، جو ایک شریر لڑکے کی شرارت کا تختۂ مشق بنتا ہے یا جو بازار میں دوڑتا ہوا پھسل کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیوانے بھی ایک نصب العین کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اور اس تنگ و دو میں کسی سخت درخت حقیقت سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے اس بات میں بڑھے ہوئے ہیں کہ ان کی بے خبری باقاعدہ منظوم و منضبط ہوتی ہے اور ایک خاص مرکز کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے ان کے سوانح اور ان کے حالات و معلوں کے ایک خاص سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جو باہوش انسانوں کی منطق سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کی عقل میں لچک کی ایک ایسی کمی ہے جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنے حواس کو اپنی دنیا سے موڑ کر اس دنیا کے حواس کے ساتھ مطابقت نہیں رکھ سکتے۔

مذکورہ بالا شخص کے ایک خاص خیال میں اس قدر ہٹ اور ضد ہے کہ وہ دماغ میں سے باہر ہی نہیں نکلتا۔ اس لئے خیالات اس کے دماغ میں جگہ نہیں پا سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص مضحک حرکتوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اب ذرا اس سے آگے چلئے اور غور کیجئے کہ جو تعلق ایک خاص خیال کی بابت کو انسانی دماغ سے ہے۔ وہی تعلق بعض برائیوں کو انسان کی سیرت سے ہے یہاں پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بداخلاقیاں دو قسم کی ہیں۔ بعض برائیاں ایسی ہیں کہ روح انسانی اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کو ساتھ لئے ان میں کود پڑتی ہے اور اپنی حیات سے ان برائیوں کو گویا زندگی بخش کر ان کو اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹتی چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح سے مختلف شکلوں میں انہیں ظاہر کرتی رہتی ہے۔ ایسی برائیاں درد انگیز اور عمل ناخیز ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے مضحک برائی گویا ایک چوکھٹا سا ہوتا ہے۔ جس میں انسان کو کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ہم میں حلول کر جائے وہ ہم پر سوار ہو جاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے اپنے رنگ تنوع میں رنگ دیں۔ وہ ہمیں اپنی یکسانیت کا جامہ پہنا دیتی ہے۔ ڈراما اور کامیڈی میں فرق صرف اسی سے ہے۔ ممکن ہے کہ ڈرامے میں چند ایسی برائیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہو جو خاص اسماء سے موسوم ہو سکتی ہیں، لیکن وہ بھی اس طرح سے کیریکٹر کا جزو و بدن بن

جاتی ہیں کہ ہم ان برائیوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ ان کے خواص کو اس قدر وسیع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں ان برائیوں کا خیال تک نہیں آتا۔ بجائے اس کے جانے پہچانے نظر صرف وہ کیریکٹر ہوتا ہے جس کی ذات میں ان برائیوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک ڈرامہ کا نام کوئی اسم ہوتا ہے۔ مثلاً اتھیلو، ہملٹ وغیرہ۔ لیکن ایک مضحک برائی خواہ وہ ایک شخص سے نہایت ہی چسپیدگی کے ساتھ وابستہ ہو پھر بھی اپنی علیحدہ نوعیت اور ہستی کو قائم رکھتی ہے۔ وہ بذات خود ایک کیریکٹر ہو جاتی ہے جس کے ارد گرد زندہ کیریکٹر گھومتے رہتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مضحک برائیاں کیریکٹروں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچاتی ہیں۔ اسی لئے ایک شخص جتنا زیادہ وہ اپنی ذات سے بے خبر ہو اتنا ہی وہ مضحک بھی ہوتا ہے۔ ایک مضحک کیریکٹر اگر اس بات کا علم ہو جانے کہ وہ کیسا ہے اس میں کون سی برائیاں ہیں۔ انسان برائیوں کو ہر کسی نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ میں کوئی مناسب یا تغیر پیدا کرنا چاہے لیکن جہاں صاحب تماشہ مضحک کو اپنے مضحک ہونے کا احساس ہو وہیں وہ اپنی ذات میں ترمیم شروع کر دیتا ہے یا کم از کم یہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اب اس میں وہ بات نہیں رہی۔ یہی تغیر ہونے سے لوگوں کی ہنسی مصلح اخلاق ہے۔

سو ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص میں جو روشنے موئے کر رہا ہے۔ اور اس شخص میں جو کسی شرارت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس شخص میں جو ایک خیالی دنیا میں رہتا ہے اور اس شخص میں جس کی سیرت کے نقائص مضحکہ انگیز ہوتے ہیں ان سب میں لچک یا فوری تبدیلی کر سکنے کی کمی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اور یہی سامان تضحیک کی رونمائی کا باعث ہوتی ہے کشمکش حیات اور سوسائٹی کے تقاضے ہم سے ہمیشہ اس بات کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ہماری توجہ ہر وقت بیداری اور آگاہی کے ساتھ واقعات حاضرہ کو پیش نظر رکھے۔ وہ ساتھ ہی ہمارے جسم اور دماغ میں وہ لچک پائی جائے جس کی بدولت ہم اپنے آپ کو موجودات کے ساتھ مطابقت دیتے رہیں۔ اگر ہمارے جسم میں اس کی کوتاہی ہو تو ہم مختلف عوارض و حادثات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر یہ کوتاہی ہمارے دماغ میں پائی جائے تو ہر ایک قسم کی بے وقوفی اور ہر قسم کا جنون ہماری زندگی میں مخل انداز ہوتا ہے اگر یہ کوتاہی ہماری سیرت میں پائی جائے تو ہماری ہستی اپنے گرد وپیش کی سوسائٹی پر ایک بوجھ سی رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کے مصائب ہم پر نازل ہوتے ہیں۔ اور طرح طرح کے جرائم ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ ہنسی گویا سوسائٹی کی ایک اخلاقی سزا ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے۔ اس کا تعلق محض لطافت طبع سے نہیں۔ اگرچہ یہ کون نہیں جانتا کہ ہم ہنستے صرف اس وقت ہیں جب ہم تھوڑا سا نفس کے تفکرات سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کو صرف مخلوق فن اور دلچسپ صنعت کاریاں تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔

"پطرس"

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

یہ مضمون آج سے چھتیس سال قبل لکھا ہے۔ اس وقت فرانس کے مشہور فلسفی ہنری برگسان کا فلسفہ بہت مقبول تھا۔ "عالم خواب"، "دماغ و قوت" اور "خندہ" کے متعلق اس کے نظریات دنیائے مغرب سے خراج تحسین وصول کر رہے تھے۔ پطرس نے اس کے فلسفہ خندہ سے اردو کو پہلی مرتبہ روشناس کرایا۔ یہ مضمون ترجمہ نہیں بلکہ قابل مضمون نگار نے اس کے فلسفہ میں ادب کی نظری مثالوں کو اپنی معاشرت کے حسب حال بنانے میں مجتہدانہ قدرت سے کام لیا ہے۔

(ادارہ)

پاکستان میں تعلیم کا مستقبل

یہ امر کس قدر قابل مسرت ہے کہ سب سے پہلے جو کل پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی وہ تعلیمی کانفرنس تھی جو سال گذشتہ ماہ نومبر میں کراچی میں ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہر طرف سے مہاجرین کی آمد کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اور کشمیر کا مسئلہ روز بروز اس قدر نازک صورت پکڑ رہا تھا۔ اتفاق کہ بمشکل توجہ کسی دوسری طرف مبذول کی جا سکتی تھی۔ اور پھر دیگر اہم ترین سیاسی مسائل کے مقابلے میں تعلیم کا نمبر ویسے بھی بعد میں آتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تقریباً ایک سال گذر چکا۔ اس عرصہ میں نہ تو تعلیم کی مد میں کوئی کثیر رقم مخصوص کی گئی اور نہ ہمارے سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ ہوا۔ نہ ہمارے نظام تعلیم اور طریق امتحان میں کوئی انقلاب برپا ہوا۔ اور نہ رضاکاروں اور کارکنوں کی کوئی جماعت ناخواندگی کے خلاف جہاد کرنے کے لئے میدان عمل میں اتری لیکن یہ سب کچھ نہ ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم نے آزادی کے پہلے سال کو رائیگاں کھو دیا تو وہ بڑی حد تک غلط ہے اس لئے کہ اس عرصہ میں تعلیمی مسائل پر جوش و خروش سے گرما گرم بحثیں بھی ہوئی ہیں اور سنجیدگی و متانت سے غور و خوض بھی ہوا اور اسی سال میں پاکستان کے طول و عرض سے ماہرین تعلیم کا اجتماع منعقد ہوا تاکہ پاکستان کے تعلیمی مسائل کو سامنے لا کر ان کا حل تلاش کیا جائے۔

اگر مجھے ایک فرسودہ سا استعارہ استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ ہماری تعلیمی آزادی ہماری پونجی ہے محض اس کی ملکیت احساس فخر و اعتماد پیدا کرتی ہے لیکن جلدی یا دیر میں ہمیں اس پونجی کو ضرور استعمال کرنا پڑے گا ورنہ اس کی حیثیت مردہ دھات سے زیادہ نہ رہے گی استعمال کی کئی صورتیں ہیں۔ یہ پونجی فضول خرچ کر کے ہم دوبارہ مفلس بن سکتے ہیں پونجی کو ایسی مد میں لگایا جا سکتا ہے جہاں سے کوئی فائدہ نہ ہو یا سوچ سمجھ کر اس پونجی کو کسی سود مند کاروبار میں لگایا جا سکتا ہے تعلیمی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ہم جس طرح چاہیں جس کو چاہیں جو چاہیں پڑھائیں۔ تعلیمی آزادی کا مطلب یہ ہے نصاب تعلیم اور طریق تعلیم بلکہ یوں کہیے مکمل نصاب تعلیم میں حسب ضرورت مناسب رد و بدل کرنے کی آزادی۔ سات کروڑ بندگان خدا کو جہالت کی تاریکی سے نکالنے کے لئے نہایت تفصیلی ڈھانچہ تیار کرنے کی ضرورت ہے اس سلسلے میں مفصل تعلیمی رپورٹوں کی ترتیب و تدوین بھی ایک امر ناگزیر ہے پاکستان کے ماہرین تعلیم خواہ دفتروں میں ہوں خواہ یونیورسٹیوں میں خواہ خالص علمی حلقوں میں کئی ماہ سے غیر معمولی خلوص اور محنت سے اس قسم کی رپورٹیں مرتب کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں ان کوششوں کے نتائج تا حال بار آور نہ ہو سکنے کا سبب یہ ہے کہ نہ صرف تعلیمی مسائل پیچیدہ ہیں بلکہ ہمارے سامنے تعلیم کا نصب العین بھی مکمل طور پر واضح نہیں بہت سی حقیقی اور واضح چیزیں غیر حقیقی اور مبہم چیزوں سے کچھ اس طرح خلط ملط ہو چکی ہیں کہ امتیاز مشکل ہو گیا ہے۔

موجودہ طریق تعلیم کو گذشتہ کئی برسوں سے بالاتفاق آراء مذموم قرار دیا جاتا رہا ہے موجودہ نظام تعلیم سے بے اطمینانی و تبدیلی کے احساسات ہر جگہ موجود تھے اگرچہ ان جذبات کے اسباب و علل مختلف جگہوں میں مختلف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بنتے ہی لوگوں نے ذرا اس طرف توجہ کی اور موجودہ نظام تعلیم کے

نقائص سے آگاہ ہونے کی سعی شروع کر دیں۔ موجودہ نظام کے نقائص و عیوب کی مفصل و مکمل فہرست تیار کرنا تو تضیعِ اوقات ہے، تین باتوں پر تو غالباً سب متفق ہوں گے۔

اوّل تو انگریزی زبان کی حیثیت ——— ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں انگریزی کو لازمی مضمون ہونے کی حیثیت سے جو اہمیت حاصل ہے وہ نہ تو قومی نقطۂ نظر سے نہ علمی نقطۂ نگاہ سے کسی طرح قابلِ برداشت ہے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم قرار دے دینا نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ طالب علم کی ذہنی نشوونما کو محدود بھی کر دیتا ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کو جو مرکزی قرار دے دیا گیا ہے وہ اس امر کا محتاج ہے کہ ہمارے نظام کے بلند مقاصد حاصل ہوں اور ... کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

دوسرا نقص ہے ہماری تعلیم کی ثنویت ——— اس ثنویت کے مختلف مظاہر ہیں مثلاً ایک طرف تو یہ کہ دیسی ملکی زبانیں کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہیں اور دوسری طرف یہ کہ ہماری موجودہ تعلیم نہ صرف مادی اعتبار سے فضول و بے سود ہے بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ناکارہ اور لادینی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے ہماری تعلیم کی محدودیت ——— پڑھے لکھے لڑکوں اور مردوں کی تعداد پندرہ فی صد سے بھی کم ہے، اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو محض دستخط کرنا جانتے ہیں اور عورتوں کا تناسب تو اس سے بھی کہیں گرا ہوا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نقائص کو دور کرنے کا ہمارے پاس کیا طریقہ ہے۔ گو ابھی تک ہم کسی آخری فیصلے یا تعلیمی نتیجے پر تو نہیں پہنچ سکے لیکن بحث و تمحیص کے دوران میں بعض جدید رجحانات اور نئے میلانات منظرِ عام پر آئے ہیں ان کا جائزہ بے سود نہ ہوگا۔ مثلاً زبانوں کے مسئلے پر کراچی کی تعلیمی کانفرنس میں بہت کچھ کہا گیا لیکن پھر کچھ بہت کچھ نہیں کیا گیا۔ صدر نے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ ——

"پاکستان میں صوبائی زبانوں کو نشوونما کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچانے ہوں گے چنانچہ ہمیں ان صوبائی زبانوں کو مختلف صوبوں میں نہ صرف ذریعۂ تعلیم قرار دینا ہوگا بلکہ دیگر ایسے طریقے بھی اختیار کرنے ہوں گے جن سے وہ تہذیب و تمدن جو کسی خاص صوبائی زبان سے مختص ہے اس زبان کے توسط سے ترویج و ترقی پائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی مدِنظر رکھنا ہوگا کہ ہماری (پاکستانی) کلچر کی وحدانیت و یگانگت کو صدمہ نہ پہنچنے پائے۔ ثقافتی وحدت کو برقرار رکھنے اور مختلف صوبوں کے درمیان ذریعۂ مراسلت و مکاتیب و اظہار و متعلقہ کام لینے کے لیے ایک خاص زبان کی ضرورت ہے اور اس سلسلے میں اردو زبان کے حقوق خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ اردو نہایت آسانی اور عمدگی سے بیرونی زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمونے اور جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو کا تعلق فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی سے تاریخی ہے۔ اردو میں گراں بہا ادبی سرمایہ موجود ہے ان سب وجوہ کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ اردو پاکستان کی قومی زبان بننے کی مستحق ہے۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے غیر ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا یقیناً مضرت رساں ہے لیکن پھر بھی آئندہ کئی سال تک ہمیں انگریزی زبان کو یونیورسٹی کی تعلیم میں اور بین الاقوامی مراسلت و مکاتبت کے ذریعے کی حیثیت سے صفِ اوّل میں جگہ دینا پڑے گی۔ گزشتہ تیس چالیس برس سے فرانسیسی کی جگہ انگریزی دنیا کی ممتاز ترین زبان ہوتی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں محض ذاتی منفعت کے نقطۂ نگاہ سے قطع نظر

ہمیں کس قدر طلبا ایک ایسی زبان ہاتھ سے نہیں کھونی چاہیے جو نہایت آسانی سے ہمیں مغربی سائنس اور کلچر سے روشناس کرا رہی ہے۔

فارسی اور عربی زبانوں میں ہمارا ثقافتی اثاثہ محفوظ ہے لہٰذا ان زبانوں کے مطالعہ کو بھی ہمارے نظام تعلیم میں ممتاز حیثیت حاصل ہوگی۔

(خطبہ صدارت پہلی کل پاکستان تعلیمی کانفرنس)

اس اقتباس کو دو مرتبہ پڑھنے کی ضرورت ہے پہلی مرتبہ تو یہ معلوم ہوگا کہ اس میں ہماری قیادت کا کلی سامان ہے لیکن دوسری دفعہ پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں ایک پیچیدہ مسئلہ کو صرف بیان کیا گیا ہے حل معلوم کرنا سوال باقی ہے۔ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک کچھ نہیں تو نصف درجن زبانوں کو مساوی حیثیت حاصل ہے اردو کو خاص اہمیت دی جانے گی یکجہتی یا یگانگت و روحانیت کی خاطر صوبائی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ نشوونما کا موقعہ دیا جائے گا علوم کی خاطر انگریزی کو صف اول میں جگہ دی جائے گی صنعت کی خاطر فارسی اور عربی کو ممتاز جگہ دی جانے گی ثقافتی اثاثہ کی حفاظت کے سبب۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا تکمیل حیات ملی کے خاطر ہمارے لئے ان تمام زبانوں کا سیکھنا ضروری ہے یا ان میں حق انتخاب یا کم از کم حق ترجیح بھی ہو سکتا ہے مختلف صوبوں میں مختلف حلقوں میں اس مسئلہ پر غور و فکر ہو رہا ہے لیکن ابھی تک کہیں سے نصاب تعلیمی کے حدود کی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔

زبان اردو کے متعلق مختلف نظریوں کا اظہار کیا گیا ہے صدارتی خطبہ میں اسے پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) بننے کا مستحق قرار دیا گیا ہے لیکن یہ بہت غیر واضح اور مبہم سی بات ہے اور بعد کے مباحث سے ظاہر ہوا کہ اس سے مختلف معانی تعبیر کرنا ممکن تھا۔ شاید اسی مسئلہ پر جب کمیٹی میں بحث ہوئی تو کمیٹی نے سفارش کی کہ اردو کی تعلیم و تدریس کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دے دیا جائے اور اسے بتدریج زیادہ سے زیادہ حد تک ذریعہ تعلیم بنانے کی کوشش کی جائے دوسرے لفظوں میں مشرقی پاکستان والے اسکولوں میں بنگالی کو ذریعہ تعلیم قرار دے سکتے ہیں لیکن زیادہ عرصے تک نہیں، یہ تو ہوئی کمیٹی کی سفارشیں جن میں پنجابی ماہرین تعلیم کی اکثریت تھی لیکن جب معاملہ پوری کانفرنس میں پیش ہوا تو مشرقی بنگال نے اس کی زبردست مخالفت کی اور آخری جو سمجھوتہ ہوا اس کی حیثیت کچھ لیے دیے دونوں نیچے بروں کی سی تھی کانفرنس نے مجلس دستور ساز سے سفارش کی کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان (لنگوا فرانکا) تسلیم کر لیا جائے۔ یہ حیثیت اس سے بھی کمتر تھی جو صدارتی خطبے میں دی گئی تھی۔ کانفرنس نے یہ بھی سفارش کی کہ اردو کی تعلیم کو تمام اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے لیکن اسے کس منزل سے شروع کیا جائے اس کی تعیین کا اختیار صوبائی حکومتوں کو دے دیا گیا صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ چاہیں تو اسے ذریعہ تعلیم بنائیں اور نہ چاہیں تو نہ بنائیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اگرچہ اردو کو آخر قومی زبان کے خطاب سے نوازا جا سکتا ہے لیکن وقت آنے پر صورت مختلف ہو جاتی ہے ممکن ہے سیاسی رہنماؤں کی زیر قیادت مشرقی بنگال اردو زبان سے قطعی بے تعلقی کا اعلان کر دے لیکن مشرقی بنگال میں اردو زبان کے لئے بیش از بیش جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت ہے جب تک انگریزی موجود ہے اس وقت تک ایسے صوبہ کے لئے اردو کا قومی زبان (لنگوا فرانکا) ہونا بھی زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ سندھ اور صوبہ سرحد نے پنجاب کا ساتھ دے کر اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ آگے چل کر اگر سندھی نہیں تو پشتو یہ دعوے نہ کر دے کہ قومی یگانگت کے اندر ثقافتی انفرادیت کے تحفظ و بقا کی خاطر پاکستان کی تعلیمی ترقی میں مجھے اور زیادہ اہمیت ملنی چاہیے۔

مغربی پنجاب تو بلا شبہ اردو کا سب سے بڑا پرستار ہے مغربی پنجاب میں پنجابی کی حمایت کرنا غداری کے مترادف سمجھا جاتا ہے اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ پنجابی کو سکھوں نے اپنی مذہبی زبان قرار دیا ہے ممکن ہے جب سکھوں کی یاد محو ہو جائے تو پنجابی کا گناہ بھی معاف ہو جائے لیکن اس سے پہلے نہیں لہٰذا فی الحال مغربی پنجاب میں اردو نہایت آسانی اور سہولت سے اپنا راستہ طے کر رہی ہے جیسا ماضی میں تقسیم سے پہلے اردو کی نشوونما و ترقی میں جن لوگوں

کی دو آنکھیں ایک شہزادے دوسری فرماے؟ اماجان اگر اباجان کے ساتھ ہٹ دھرمی
کرتی بھی ہیں تو اُن کو بات کی پچ آپڑتی ہو ورنہ یوں اماجان بڑی معقول پسند آدمی ہیں
بے خطا بے قصور کیوں ناراض ہونے لگیں۔ بہت کریں گی مجکو آہستگی سے سمجھا دیں گی۔
غرض آزادی اپنے [illegible] جانے پر آمادہ ہوئی۔ اُن کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر
بیٹھ گئی اور لگی دل میں غور کرنے کہ بات کا سلسلہ کس طرح پر شروع کروں۔ یہی نہ کہ تم
میری منگنی کی بات چیت کر رہی ہو مجکو اپنا بیاہ کرنا منظور نہیں۔ یہ تو بات کا ہے کو ہی
ایک پتھر سا مار دینا ٹھہرا؟ اور اگر سن کر اُنھوں نے جھڑک دیا اور کہا چل پرے ہٹ؟
موئے لگائی دو منہی کاٹے [illegible] نکل [illegible] کے دخل دیا ہی جا اپنے ٹھکانے سے جا کر بیٹھ۔
تو کچھ بھی [illegible] کی بڑی بنی اور مطلب کا مطلب فوت ہوا۔ وہ تو کہیں ایسا
اتفاق ہوتا کہ کوئی اس کا ذکر چلاتا۔ میں بیٹھی سنتی اور موقع پاکر بول اٹھتی۔ مگر ایسا اتفاق
[illegible] اماجان نے دو [illegible] تم منع کر دو اچھا ہو کہ اس قسم کی بات چیت
ہو تو تم ٹل جایا کرو۔ بس اس کا تو فیصلہ ہو کہ یا تو کہنے سننے کا نام نہ لوں اور کہوں
تو آپ کہوں اور تنہائی میں کہوں۔ اچھا تو ذرا اور سوچ لوں۔ کہوں بھی تو ایسے طور
سے کہوں کہ بات خالی نہ جائے۔ جس وقت سے ایسے تصورات آزادی کے دل میں پیدا
ہوئے ان کا سلسلہ ہی ختم ہونے پر نہیں آتا تھا۔ آزادی اکتا کر گھبرا کر ہتیرا طبیعت کو
دوسری طرف مصروف کرنا چاہتی مگر ان خیالات نے اُس کے تمام حواس کو معطل کر دیا
تھا اور جس طرح کسی کو جنون [illegible] ایک بات کی رٹ لگ جائے۔ چلتے پھرتے۔ اُٹھتے
بیٹھتے اس کو اسی کی [illegible] ایک منصوبہ بناتی آپ ہی بگاڑتی۔ آپ ہی
ایک [illegible] قائم کرتی [illegible] کا آخری خیال یہ تھا کہ بیاہ سے انکار کرنا تو
ٹھیک [illegible] کپڑے کے لئے بیٹیوں کو بیاہتے ہیں صریح غلطی ہو۔
[illegible] بیٹیوں کو بٹھا رکھا کریں یہ میرے نزدیک معاش کا معقول
بندوبست بھی باسانی ہو سکتا ہی لیکن بڑی مشکل ناموس کی ہو جس کے آگے شریف
لوگ جان اور مال کسی کی بھی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔ اور بیاہ کے سوا ناموس کی

دوسری کشمکش دینی اور دنیاوی مضامین کے بارے میں ہے۔ افادیت کے حامی ادبی مطالعہ کو محض تعیش ذہنی سے تعبیر کرتے ہیں، اور جہاں تک ان سے بن پڑتا ہے وہ اقبال کے قومی شاعر ہونے کی تردید نہ کر سکے، یہ پیش کرتے ہیں۔ ان الجھنوں کے علاوہ اور بڑی بڑی الجھنیں ہیں۔ وہ موضوع بر مطالعہ بالاستقلال ـــ فارسی صرف گلستان کے ذریعے پڑھائی جاتی ہے۔ فارسی "کیمیائے سعادت" پڑھنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ وہ مذہبی طرز فکر بر مقابلہ عقلی طرز فکر ـــ تاریخ فلسفہ کو، انسانی فکر و ذہن کے ارتقا کے مطالعے کی حیثیت سے پڑھایا جائے یا محض کلمات کفر کے مجموعے کی حیثیت سے۔

یہ الجھنیں ہمیں ایک ایسے مقام پر لے جاتی ہیں جہاں ہمیں ایک طرف ناداں جتنک کا پیش کیا ہوا اسلام اور دوسری طرف قرآن اور تحریکوں کا حقیقی یا فرضی چیلنج نظر آتا ہے۔ یہ زبردست اختلاف ہے کہ کس حد تک اسلام جغرافی مخصوص اساس کے لئے افکار جدید کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ کیا ہم جدید ہونے کے ساتھ ساتھ "اسلامی" بھی ہو سکتے ہیں؟ کسی نے کبھی یہ سوال نہیں کیا کہ کیا "ہمارے لئے واقعی اسلامی ہونا بالکل ضروری ہے؟" سوال ہمیشہ یہ کیا گیا ہے کہ آیا ہمیں "ماڈرن" ہونے کی ضرورت ہے؟

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ ان سوالوں کے جوابات مختلف اور متضاد ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح ان سب کو ایک نظم میں پرونا ہوگا ورنہ ہمارا نظام تعلیم ہماری احتیاجات کا بار اٹھانے کی استعداد سے محروم ہو جائے گا۔ سرسید کے زمانے میں بھی اس قسم کے سوالات کئے گئے تھے اور اس قسم کی الجھنیں اور پیچیدگیاں اس وقت بھی سطح پر ابھر آئی تھیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو سرسید پر ہندوستان میں اسلام کی بیخ کنی کا الزام دھرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی ہمیں روحانی اور ذہنی سکون حاصل نہیں۔

اس مسئلے کا حل یا تو وقت کے ہاتھوں ہو سکتا ہے، جس میں دیر لگے گی، یا زبردست جنگ کے ذریعہ، اس میں خدشہ ہے کہ تعمیر سے زیادہ تخریب ہوگی یا قابل قیادت کے توسط سے جو اس وقت موجود معلوم نہیں ہوتی۔ جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی مباحث کا نتیجہ کچھ تصادم یا اشتراک نہیں ہے بلکہ اشتعال کی صورت میں ظاہر ہوتا رہے گا۔ اشتعال کی علامتیں ابھی سے ظاہر ہیں اگر ہم ہر مختلف زاویہ نگاہ کو تسلیم کر کے اپنے نصابوں میں اضافہ کرتے گئے تو طلبا پر تو ایک طرف رہے ہماری تعلیم کیلئے خود اس بار گراں کی شاید متحمل نہ ہو سکے۔ ہر تجویز کو اس شد و مد سے پیش کیا جاتا ہے اور اسے لازمی قرار دیئے جانے پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نظام کے تحت جو طالب علم بھی کامیاب ہو کر نکلے وہ ایک ہی وسیع حلقے کے مطابق چلا ہوا۔ اب تک انگریزی، اردو، فارسی، عربی، دینیات، اسلامی تاریخ، عسکری تربیت اور سائنس، ان سب کو لازمی مضامین قرار دیئے جانے کی تجویزیں پیش کی جا چکی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ انہیں نہ صرف کالجوں اور سکولوں میں بلکہ مقابلے کے امتحانوں میں بھی لازمی قرار دے دیا جائے۔ ہمارے سامنے جو خطرہ اس وقت درپیش ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تعلیم کا معیار بہت کم ہو گا بلکہ یہ کہ بہت بھاری ہو گا، اس قدر بھاری کہ یا تو تعلیم بالکل ناممکن ہو گی یا بالکل فضول ہو گی۔

تعلیمی حلقوں میں انگریزی کے متعلق بہت کم کچھ کہا سنا جاتا ہے بس خاموشی سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ انگریزی ابھی جاری رہے گی۔ لیکن انگریزی کی پرجوش حمایت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس کے بین الاقوامی رتبہ اور اہمیت کا تو احساس ہے لیکن اس کی معاشرتی اہمیت پہلے ہی بہت کم ہو چکی ہے اور اس کی کچہری وقعت سے اگرچہ اعلانیہ انکار تو نہیں کیا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ ان حالات میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب اس کا مستقبل کیا ہو گا یا یہ کہ آیا اس کا مستقبل بھی ہے یا نہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی کے خلاف جو معاندانہ جذبہ پایا جاتا ہے خواہ وہ فطری اور حقیقی ہو اور خواہ انتقامی ہو اس کا لازمی اثر یہ ہو گا کہ اس مضمون کی تعلیم کا معیار گر جائے گا۔ ایسے ماہرین تعلیم بھی موجود ہیں جو اس قسم کی صورت حال کو خالی از خطرہ تصور نہیں کرتے ان کا کہنا ہے ہمیں منصوبہ و ارادہ اور دماغوں کے بہاؤ کے مقابلے کا لغداد علمی از سر نو تیار کرنا پڑے گا لہذا ہمیں زمانہ حال کو زمانہ قدیم بنانے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزی کی مراجعت

ایڈیٹنگ کا فن

اور بدقسمتی سے یہ ان حضرات بھی ایسے مل جائیں جو اس مضمون کو پڑھ کر اصرار کریں کہ ان میں سے کم از کم ایک بزرگوار تو ایسے ضرور ہوں گے جنہیں سینما سے نفرت ہے اور الحمد للہ اس نفرت میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتے۔ باقی حضرات میں بھی بعض ایسے ہوں گے جو کبھی کبھی اس گناہ کا ارتکاب تو کر لیتے ہیں لیکن اقبال جرم نہیں کرنا چاہتے اور اکثر اوقات اپنے سینما تشریف لے جانے کی تاویل یوں فرمایا کرتے ہیں: —

"آج شام کو کوئی شغل نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں میری بیوی رونلڈ کالمین کے کھیل کو بہت پسند کرتی ہے میں نے سوچا کہ لاؤ ہم بھی چلے چلیں چنانچہ ہم ...."

لیکن اس جگہ نہ تو میں ان اصحاب کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں جنہیں سینما سے نفرت ہے نہ دوسرے گروہ کو جسے بیوی کے ساتھ ایسے تماشے میں لطف آتا ہے اس لطف و مسرت سے محروم کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر سینما واقعی آرٹ کہلانے کے قابل ہے اور اس کے کمالات کا کوئی جداگانہ منظر اور اس کے آرٹ کا کوئی مخصوص وسیلۂ اظہار ہے تو وہ کیا ہے؟ مصور کے کمالات کا مظہر خطوط اور رنگ ہیں۔ شاعر الفاظ کے ذریعے اپنا مطلب ظاہر کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فلم کار کن چیزوں سے کام لیتا ہے، اس کے پاس کس قسم کا مواد موجود ہے اور اس مواد کے امکانات کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

اس قسم کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ فلم کیوں کر بنایا جاتا ہے کیونکہ اس طرح ہمیں یہ بتانے میں آسانی ہوگی کہ سینما میں کس قدر وسعت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فلم متحرک کیمرے کی تصاویر کے ایک سلسلہ کا نام ہے۔ جو یکے بعد دیگرے دکھائی جاتی ہیں۔ یا یوں کہئے کہ سینما کے شاٹ جب ترتیب و تسلسل کے ساتھ دکھلائے جاتے ہیں۔ تو انہیں فلم کہا جاتا ہے۔ شاٹ فلم کے ایک ایسے ٹکڑے کا نام ہے جس کی تصویر متحرک کیمرہ میں یک وقت لی جاتی ہے جہاں تسلسل ٹوٹا، شاٹ ختم ہو جاتا ہے جب کیمرہ دوبارہ چلنے لگتا ہے تو دوسرا شاٹ شروع ہو جاتا ہے۔

قصہ (یا جو کچھ بھی فلم کا موضوع ہو) کے انتخاب کے بعد دوسرا مرحلہ فلم نامے کا مرتب کرنا ہے میں یہاں تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا کہ فلم نامہ کتنے مرحلوں سے گزرنے کے بعد تکمیل کی منزل تک پہنچتا ہے بلکہ میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ فلم نامے میں قصے یا موضوع فلم کی تمام روئداد کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اسے "شاٹوں" میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر شاٹ کا حال پوری تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے اس کی تمام جزئیات کو واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے گویا وہ تمام اجزا جن کی ترکیب سے فلم کی تکمیل ہوتی ہے، اسی ترتیب اور تقدم و تاخر کے ساتھ فلم بند کئے جاتے ہیں جس ترتیب کے ساتھ انہیں پردے پر دکھانا منظور ہے۔ ہر شاٹ کے متعلق پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہدایات دی جاتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ شاٹ کا موضوع

جا ہوگا۔

تیار ہو کر بھی کچی ہو گا۔ یہ کبھی خارج ہو جائے گا یا سینما کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ "کٹ" سے ابتدا میں رفتار پر لایا جائے گا یا پھر ابتدا میں بتدریج تیز ہو گا، رفتار بتدریج کم ہو جائے گی۔ اور یا تصویر کے نمودار ہونے اور غائب ہونے کا یہ عمل آہستہ آہستہ ہو گا یا بسرعت۔ اور اگر دونوں صورتیں نہیں تو پھر پہلے شاٹ میں سے دوسرا رفتہ رفتہ نمودار ہو رہا ہو گا تا شاٹ میں تحلیل ہو جائے۔ اصطلاح میں حل تحلیل کہتے ہیں اور یہ عمل تحلیل آہستہ آہستہ ہو گا یا تیزی سے۔ پھر یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شاٹ لیتے وقت کیمرہ کہاں تک ڈسٹ کیا گیا۔ یعنی "کلوز اپ" یا "لانگ شاٹ" کے قریب ہو جائے گا یا پیچھے ہٹ جائے گا یا اس کے متوازی حرکت کرے گا۔ اور گھوم کر پورے منظر کی تصویر لے گا۔

"فلم نامہ" میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ کس چیز کا شاٹ لیا جائے۔ کیمرہ اس کے سامنے کتنی بلندی پر ہو گا یعنی بلندی پر انسان کی آنکھ کے برابر سے یا کسی اور "زاویے" سے۔ ایسے شاٹ لیا جائے گا کیمرہ اس سے کس قدر فاصلے پر ہو گا۔ شاٹ دیر ہو گا یا مختصر یا جیسا بھی۔ غرض فلم نامے میں ان تمام سوالوں کے جواب اور ہر شاٹ کے متعلق تفصیلی ہدایتیں موجود ہوتی ہیں۔

میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ فلم نامے میں شاٹ اسی ترتیب سے ملتے جلتے ہیں جس ترتیب سے انھیں پردے پر دکھایا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاٹ لیتے وقت بھی یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائے۔ شاٹ تو اسی ترتیب سے لیے جاتے ہیں جس میں زیادہ سہولت ہو۔

فرض کیجیے کہ ایک کہانی کا آغاز ایک ... سے ہوتا ہے اور خاتمہ بھی یہیں۔ اگر مناسب سمجھے تو آپ سب کے تمام سین پہلے لے لیں گے اور ... ہے جو ہیں۔ اور پھر انھیں فلم نامے کے مطابق مرتب کر لیں گے۔ اور اگر کیفیت یہ ہو کہ کہانی کا ایک سین تو ایک مقام قدرتی یا سٹوڈیو میں مصنوعی طور پر تیار کردہ سے متعلق ہے، تمام اور دوسرے سین کا تعلق کسی دوسرے مقام سے ہو، اور مختلف مقامات سے شاٹ اسی طرح تبدیل ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ فلموں میں ہوا کرتا تو آپ وہ تمام مناظر جو ایک جگہ سے تعلق رکھتے ہیں ایک مرتبہ لے لیں گے۔ اور پھر دوسری جگہ پہنچ کر تمام متعلقہ مناظر کا عکس لے لیا جائے گا۔ اس بات کا خیال نہیں رکھا جائے گا کہ ترتیب کے لحاظ سے جو سین پہلے ہے وہ سب سے پہلے لیا جائے۔ اور جو بعد میں ہے وہ سب سے بعد میں "فلم بند" کیا جائے۔ اس کے بعد آپ کو اگر تمام عنوانات کے فوٹو لینے ہوں گے۔ جب تمام واقعات اور عنوانات کا عکس لے لیا جائے گا تو "مسودہ" کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ایک ایک شاٹ الگ کر لیا جائے گا۔ پھر ہر شاٹ میں کسی قدر کانٹ چھانٹ ہو گی (ہر شاٹ کے دونوں سروں پر کسی قدر زائد فلم لے لیا جاتا ہے تاکہ بعد میں اسے کاٹ کر تناسب پیدا کر دیا جائے) اور آخر میں یہ شاٹ مناسب ترتیب کے ساتھ جوڑ دیے جائیں گے۔ اور فلم کی تکمیل ہو جائے گی۔ فلم کی قطع و برید اور از سر نو شیرازہ بندی جسے تدوین یا "ایڈیٹنگ" کہتے ہیں فلم سازی کا ایک اہم مرحلہ ہے کہ بعض ڈائریکٹر خصوصاً روسی ماہرین تو حقیقت میں فن اسی کو سمجھتے ہیں۔

سینما ایک "صوری" فن ہے۔ تمام صوری فنون سے کم عمر لیکن اس کم عمری کے باوجود اسے ایک حیثیت سے ان پر فوقیت حاصل ہے تمام صوری فنون "حرکت" کے اظہار سے قاصر ہیں۔ بہت ہوا کہ مثلاً حرکت کا مفہوم ادا کر دیا۔ لیکن فلم کو یہ دشواری نہیں۔ وہ "حرکت" کو بین اور صحیح طور پر ظاہر کر سکتا ہے۔ عمل ڈرامے کی جان ہے اور فلم میں بھی اسے یہی حیثیت حاصل ہے کیونکہ فلم میں تو کوئی چیز دکھائی ہی نہیں جاتی۔ جس کی ظاہری حالت اس کی تمام کیفیات کی ترجمان ہو اور جس میں واضح طور پر حرکت نظر آئے اور وہ فلم ہی کیا ہے جس میں حرکت، اور کسی کا اتار چڑھاؤ، مکا ترقی یا رک دیا جانا اور یا حرکات کا باہمی تصادم نہ دکھایا جائے۔ تمام صوری فنون میں یہ امتیاز فلم کو ہی حاصل ہے کہ مسلسل حرکات اور روانی کو اس کا اصول موضوعہ قرار دیا جا سکتا ہے گویا فلم کا آغاز حرکت سے ہوتا ہے اور ایک شاٹ سے دوسرے شاٹ کے درمیانی فاصلے میں بھی تسلسل یا روانی موجود ہوتی ہے اور

یہی خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے فنون سے ممتاز کرتی ہیں۔ آپ نے بہتر سے بہتر تصویردار پوسٹ کارڈوں کے البم دیکھے ہوں گے جن پر تفریح گاہوں اور صحت افزا مقامات کے مناظر ہوتے ہیں۔ یہ تصاویر ایک خاص نسق کی بنا پر ایک دوسرے سے منسلک تو ضرور ہوتی ہیں لیکن ان میں یہ صلاحیت کہاں ہے کہ ایک تصویر دوسری تصویر میں داخل ہو جائے اور ان متواتر تحلیل سے ایک تسلسل پیدا کرے جس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ لیکن یہ کون بتائے کہ کیوں کر ہوا؟ اس کے اظہار پر صرف فلم ہی قادر ہے۔ جب تک واقعہ کی پوری ترتیب اور پوری صحت اور کیفیت اس کی بلاواسطہ تحریر میں نہ آ جائے لطف نہیں آتا۔

ٹالسٹائی الفاظ میں منظر کی تصویر کھینچتا ہے۔ ڈرامہ نویس مکالمے سے یہ کام لیتا ہے۔ فلم نگار کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ فلم نامہ لکھنے کے لئے قلم اٹھائے تو اس کے ذہن میں ایسی مرئی اشکال ہوں جو بہ آسانی ایک دوسرے پر ڈھلتی چلی جائیں۔

ایک کہانی جو فلم کے لئے لکھی گئی ہے ایک فقرہ یہ ہے:—

"زید اس کے مکان میں اکثر آیا کرتا تھا۔" یہ جملہ بحیثیت فقرے کے بامعنی اور باعتبار مطلب پورے طور پر واضح ہے۔ لیکن اسے بعینہٖ فلم کی صورت میں منتقل کر دینا ناممکن ہے۔ ٹالسٹائی کے قلم سے جب یہ جملہ نکلا تھا تو اس کے ذہن میں اشکال و صور نہیں بلکہ الفاظ تھے۔ یہ تو اسی صورت میں فلم کے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ لکھنے والے کے ذہن میں الفاظ کے بجائے تصاویر ہوتیں۔ "اکثر" ایک غیر معین عدد ہے جس کے معنی کئی مرتبہ کے ہیں۔ اگر فلم میں زید کو اس مکان پر پانچ چھ مرتبہ آتا دکھایا جائے تو کہیں جا کر "اکثر" کا مفہوم پورا ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ "اکثر" کا مفہوم ادا کرنے کا یہ طریقہ بے حد سر دردی ہے۔ ایک فلم میں یہ مشکل اس طرح حل کی گئی تھی۔ کہ زید مکان میں قدم رکھتا ہے تو بچے خوشی سے اس کی طرف دوڑتے ہیں اور کتا اچھلتا اور دم ہلاتا اس کی جانب لپکتا ہے۔ اس طرح تماشائیوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ زید اس مکان میں نو وارد نہیں بلکہ اکثر آتا ہے۔

"اے وومن آف پیرس" نام فلم میں جس کا ڈائریکٹر چارلی چیپلن تھا۔ یہی مفہوم زیادہ لطیف طریقے پر ادا کیا گیا ہے۔ مکان میں نہ تو بچے دکھائے گئے ہیں اور نہ کوئی پالتو حیوان تھا۔ نوکروں کے سوا مکان میں کوئی نہ تھا۔ زید ایک مکان میں داخل ہوتا ہے صوفے پر جا بیٹھتا ہے۔ کچھ دیر سیگرٹ پیتا رہتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ میرے پاس رومال نہیں۔ وہ بغیر کسی پس و پیش کے اٹھتا ہے اور دوسرے کمرے میں جا کر اور نہایت بے تکلفی سے ایک دراز کھول کر ایک رومال نکال لیتا ہے۔

لیکن یہ تو ایسی مثالیں ہیں کہ کہانی پہلے موجود تھی۔ بعد میں اسے فلم کی صورت میں ڈھال لیا گیا اور بہتر یہ ہے کہ تصاویر سے کہانی مرتب کی جائے۔ گویا تصویر بمنزلہ بیج کے ہے جو کہانی کے پودے کو جنم دیتی ہے۔ اس کے برعکس کہانی کو بیج اور تصویر کو پودا فرض کر لینا سخت غلطی ہے۔ میں یہاں بعض اچھے فلموں کی ایک فہرست پیش کرتا ہوں۔ جس کی ترتیب میں کسی خاص غور و فکر سے کام نہیں لیا گیا۔ ایک نقاد نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے یہی فہرست بطور دلیل پیش کی ہے۔

دی کروزر پوٹمکن۔ دی کیبنٹ آف ڈاکٹر کیلی گاری۔ اے وومن آف پیرس۔ وارننگ شیڈوز۔ دی سالویشن ہنٹرز۔ وا ریٹی۔ دی پلگرم۔ برلن اور دی میزیکل سرکل۔

یہ سب کے سب کامیاب فلم ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی کسی ناول یا ڈرامے سے ماخوذ یا مستعار نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب کسی ناول کو فلم کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو کیوں ناکامی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر "ٹیس" کو لیجئے۔ فلم میں خیر ایک قدر جابرانہ تصرف کیا گیا ہے کہ کہانی کو مسرت انجام بنا دیا گیا ہے لیکن اس سے ذرا قطع نظر کر کے دیکھئے تو بھی فلم اکثر حیثیتوں سے ناکام نظر آئے گی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ٹامس ہارڈی نے جو مطالب الفاظ میں ادا کئے ہیں۔ انہیں تصاویر میں ظاہر کرنے کے لئے ہارڈی جیسے نکتہ رس دماغ کی ضرورت تھی جسے اتنا [illegible]

* میں زیادہ موجود رہوں گا۔

فلم تماشے کے تصرف کی ننھی سی جنبش نے اس منظر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جب ناول کے مقاصد کو جو لفظوں اور تصاویر سے کم نہ تھے یوں واضح ترکیا جائے تو ایسی فلم کی کامیابی پر کیسے تعجب ہو سکتا ہے۔

فلم جن مرئی اشکال سے بنتا ہے وہ بہ آسانی دوسرے قالب میں ڈھل جاتی ہیں۔ ایک تصویر پردے پر جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری تصویر لے لیتی ہے۔ اور یہ رنگ بدلنے اور نئے نئے پیکر اختیار کرنے والی شکلیں اپنے حالات کی ترجمان آپ ہوتی ہیں۔ ہر تصویر واضح اور غیر مبہم معنی رکھتی ہے جن کی شرح بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ ذہن خود بخود انہیں سمجھ لیتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہر خیال کو سیکڑوں طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ہزاروں تصویریں بن سکتی ہیں۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ پہلے غور و فکر کے بعد تصاویر کا انتخاب کیا جائے اور وہی تصاویر منتخب کی جائیں جو سب سے زیادہ واضح ہوں۔ اور ہمارے مقصود ذہنی کو پوری طرح ادا کر سکیں۔ کیمرہ دیکھتا ہے، سنتا ہے، چھوتا ہے، سونگھ سکتا ہے، چکھتا ہے۔ گویا وہ انسان کی طرح حواس خمسہ رکھتا ہے لیکن اس کی آنکھ بے پروا تماشائی کی آنکھ نہیں، بلکہ وہ ہر چیز کا مطالعہ بالاستیعاب نگاہ سے کرتا ہے اور فلم کار کو بڑی آسانی یہ ہے کہ کیمرہ کی وسیع طاقت اور قوت اسے سہارا دینے کے لئے موجود ہے۔

فرض کیجئے کہ ہمارے سامنے دربار شاہی کا منظر ہے۔ تماشائی اگر اس منظر کا پوری طرح مشاہدہ کرنا چاہے گا تو وہ بالا خانے پر چلا جائے گا تاکہ بلندی سے تمام منظر اچھی طرح دیکھ سکے۔ پھر بھی اس کی خواہش یہ ہوگی کہ بادشاہ کو قریب سے دیکھے درباریوں کے ہجوم میں مل کر ایک ایک چیز پر نظر ڈالے لہٰذا تماشائی کی توجہ پر پوری طرح تصرف کرلیتا ہے۔ تماشائی انہیں چیزوں کو دیکھتا ہے یا دیکھتا ہے جنہیں فلم ڈائرکٹر انہیں دکھانا چاہتا ہے اور پھر ان مناظر کا انتخاب اس ڈھنگ سے کیا جاتا ہے کہ تماشائی انہیں صرف دیکھتا ہی نہیں بلکہ وہ اس کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی مقام پر فلم کار کے جوہر کھلتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ فلم میں جو قدرت ہے وہ تھیٹر میں نہیں۔

فلم کی قدرت کا دائرہ اس اعتبار سے بھی وسیع ہے کہ وہ جزئیات اور تفصیلات کو نہایت واضح طور پر پیش کرنے کی خاص اہلیت رکھتا ہے۔ فلم کا کیمرے کی مدد سے ہر چیز کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے اور تصویر کی روح کو بے نقاب کر دیتا ہے چنانچہ ایک نقاد لکھتا ہے کہ

کیمرہ ہمیشہ زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی ایسی پوشیدہ چیزوں تک پہنچتا اور انہیں بے نقاب کر دینا چاہتا ہے جنہیں عام تماشائی کی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ کیمرے کی قدرت کا دائرہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ جو چیز بھی اس کے سامنے آتی ہے وہ اسے سلولائڈ پر محفوظ کر لیتا ہے۔ جب ہم کسی تصویر کو دیکھتے ہیں تو بہت دیر کے بعد اچھی خاصی کوشش کرکے ہماری نگاہ کسی خاص نقطے پر مرکوز ہوتی ہے اور ہم تصویر کے محاسن کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن فلم میں نہ اتنا وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے نہ تصویر کی خوبیاں سمجھنے کے لئے کوئی کوشش کرنا ضروری ہے۔

فلم کو ایک اور بھی سہولت حاصل ہے جو اس سے بھی بڑھ کر کہیں اہم ہے۔ فلم اپنے لئے الگ زمان و مکان پیدا کر لیتا ہے جو حقیقی زمان و مکان سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ سٹیج میں کسی حد تک یہ بات ہے کہ ایکٹ اور زمانہ کو واضح کرنے کے لئے پردہ گرایا جاتا ہے یا اٹھایا جاتا ہے۔ لیکن فلم اس بارے میں تھیٹر پر سبقت لے گیا ہے۔ سٹیج پر ہر کیرکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک حرکت کرتا ہے اور یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی اہم واقعہ اسی وقت رونما ہوتا اور کسی ایکٹر یا پروڈیوسر کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس بعد مکانی کو جو ان دونوں نقاط کے درمیان حائل ہے دور کرے یا اس وقت کو جو فاصلہ طے کرنے میں صرف ہوتا ہے مٹا ڈالے اور تماشائی کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ جب کیرکٹر ایک نقطے سے دوسرے نقطے کی جانب حرکت کر رہا ہو تو وہ اپنے ذہن کو معطل کر سکے۔

اب دوسری طرف غور فرمائیے کہ بعض بعد مکانی کو بڑی آسانی سے ختم کر دیتا ہے۔ ایک شاٹ اس وقت لیتا ہے جب کہ کیمرا نقطہ سے چھوٹا ہے۔ اور دوسرا اس وقت جب وہ نقطہ تک پہنچ جاتا ہے پھر دونوں شاٹ ملا دیئے جاتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر میں آپ کی ساری توجہ ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وقت کو ایک دھارا سمجھئے۔ جس کے بعض لمحے اہم ہوتے ہیں اور بعض غیر اہم۔ فلم کار غیر اہم حصوں کو نظر انداز کر کے بلکہ حذف کر کے ایک نیا زمان پیدا کر دیتی ہے جس میں صرف اہم لمحے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہے تو ایک جگہ وقت کو ذرا ساکت ہو جانے اور دوسری جگہ تیز دکھائی دے اور دو مختلف مقامات میں ایک وقت دو مختلف کیفیتیں نظر آئیں اور وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ وقت کا سیل دو شاخوں میں تقسیم ہو جائے۔ دو دھارے پہلو بہ پہلو بہتے نظر آئیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فلم میں جب کوئی ایسا منظر دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف ایک مصیبت زدہ کی زندگی کے آخری لمحے ہیں اور دوسری طرف کوئی اسے نجات دلانے چلا ہے تو فلم کار اپنے فن کے ایسے ہی عجائب دکھایا کرتا ہے۔

جس طرح آپ فلم میں نیا زمان پیدا کر سکتے ہیں اسی طرح نیا مکان بھی خلق کیا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک ڈائریکٹر چند ایسے مناظر فلم بند کر لیتا ہے جو مختلف مقامات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بعد مکانی حائل ہے لیکن وہ ان تمام اجزا کو ملا کر ایک نیا "فلمی مکان" بھی پیدا کر سکتا ہے۔ ایک روسی نقاش کلیشاف نامی نے جو فلم سازی کے فن میں بصیرت رکھتا ہے ۱۹۲۰ء میں تجربے کے طور پر حسب ذیل مختلف شاٹ جمع کئے تھے۔

۱۔ ایک نوجوان بائیں جانب سے دہنی جانب جاتا دکھائی دیتا ہے۔
۲۔ دوسری جانب سے ایک عورت آتی ہے۔
۳۔ وہ دونوں ملتے اور ہاتھ ملاتے ہیں۔ نوجوان انگلی سے اشارہ کرتا ہے۔
۴۔ ایک وسیع سفید رنگ کی عمارت دکھائی جاتی ہے جس کی سیڑھیاں بہت فراخ ہیں۔ وہ دونوں سیڑھیوں سے چڑھ کر مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام مناظر الگ الگ مقامات پر لئے گئے تھے۔ اور پھر انہیں مندرجہ صدر ترتیب سے فلم کے پردے پر دکھایا گیا تو دیکھنے والوں کو ایک مرتب واقعہ نظر آیا کہ ایک نوجوان مرد اور ایک عورت آپس میں ملتے ہیں۔ مرد پاس کے مکان کی طرف اشارہ کر کے اندر چلنے کی دعوت دیتا ہے اور دونوں مکان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سارے اجزا الگ الگ مقامات سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً وہ نوجوان ماسکو کی ایک پبلک عمارت کے قریب تھا اور عورت شہر کے دوسرے حصے میں تھی۔ مصافحہ انہوں نے ایک لکچر کے پاس کیا جو ان دونوں مقامات سے بہت دور واقع ہے۔ سپید رنگ کی عمارت کا شاٹ کسی امریکن فلم سے لیا گیا تھا۔ در حقیقت یہ سپید رنگ کی عمارت امریکہ کا مشہور قصر سپید تھا۔ اور سیڑھیاں جن سے وہ چڑھ کر مکان میں داخل ہوئے ایک گرجا کی سیڑھیاں تھیں۔ اب دیکھئے کہ اسو لانڈ کے مختلف ٹکڑے ملانے سے ایک نیا "فلمی مکان" پیدا ہو گیا جو محض نمائش سراب ہے اور در حقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یہی چیز ہے جسے "تخلیقی جغرافیہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پڈوکن سب سے پہلا فلم کار ہے جس نے فلمی مکان و زمان کا تخیل وضاحت سے پیش کیا۔ مگر اب دنیا کے ہر ملک میں اکثر ڈائریکٹر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ اس سے کیمرہ کی قدرت کے امکانات بھی بہت وسیع ہو جاتے ہیں۔ پچھلے سال جو برف پڑی تھی اس سے اگلے سال کام لیا جا سکتا ہے۔ ایکٹر دیکھئے قطب مینار سے کودتا ہے اور دریائے راوی میں آ گرتا ہے۔ آپ کسی کمرے سے باہر قدم رکھئے۔ اپنے آپ کو شالامار باغ میں پائیے گا۔ خواہ آپ نے کمرے سے باہر نکلنے سے کئی سال پہلے یا کئی سال بعد شالامار باغ میں قدم رکھا ہوگا۔

اب آپ پر واضح ہو گیا کہ فلم کے حدود کس قدر وسیع ہیں۔ انسان کا دائرہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ فلم کا عدسہ تو ایک بنی گئی ہی
وہ جس زاویہ سے چاہے دنیا پر نظر ڈالے جس نقطہ سے چاہے مشاہدہ کرے۔ اور ساری جزئیات کو ایک ایک کر کے دیکھا جائے اس میں یہی قسمت
ہے کہ زمان و مکان پیدا کرے۔ حواس پر مستزاد یہ کہ وہ ڈائریکٹر کی خواہش کے سوا کسی کا پابند نہیں۔ فلم کے سامنے ساری کائنات اور زمانہ کا تمام
سلسلہ پڑا ہوا ہے اسے اختیار ہے کہ زمان و مکان کے دامن میں بکھرے ہوئے رنگا رنگ جلوے ہیں ان میں سے جسے چاہے منتخب کرے اور جسے چاہے چھوڑ دے
البتہ انتخاب بہت اہم کام ہے۔ اور ایک فلم پر کیا موقوف ہے ہر فن میں انتخاب کو اہمیت حاصل ہے۔ میں پہلے مثال کے طور پر "سعد ومن آمنہ یس" سے
ایک شاٹ کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم کا ڈائریکٹر چارلی چیپلن تھا۔ اور یہ پہلا فلم تھا جو چاپلن کی نگرانی میں تیار ہوا۔ لیکن اس میں خود اس نے پارٹ نہیں لیا بجز
ایک نہایت ہی معمولی مختصر پارٹ کے۔ جہاں تک ڈائریکٹر کے فرائض کا تعلق ہے۔ یہ فلم بہت کامیاب ثابت ہوا ہے۔ میں نے جو مثال پیش کی تھی
وہ آپ کو یاد ہو گی۔ اور اب آپ کے ذہن سے اس شخص کا خیال محو نہیں ہوا ہوگا۔ جس نے دراز سے رومال نکالا۔ تو ایک مردانہ کالر بھی گر پڑا۔ اس نے کالر
اٹھایا اور پھر دراز میں رکھ دیا۔ عورت کے مکان میں مردانہ کالر کا پایا جانا اور مہمان کا اس پر اظہار تعجب نہ کرنا۔ غور کیجئے ایک کتنا بلیغ انداز بیان ہے حسن انتخاب
کی بدولت جزئی باتوں میں کیا کیا نزاکتیں پوری جا سکتی ہیں اور کیا کیا معنی پنہاں کئے جا سکتے ہیں۔ "ان ٹالرنس" میں جس کا ڈائریکٹر ڈی ڈبلیو گرفتھ تھا
ایک عورت دکھائی گئی جس کا خاوند کسی عدالت میں ماخوذ تھا۔ وہ بیچاری اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ دیکھیں جج مقدمہ کا کیا فیصلہ کرتا ہے۔ یہیں عورت کا
کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔ یا ہاتھ جنہیں وہ بار بار مروڑتی ہے لیکن اس کا بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ تشویش و فکر کے جتنے مظاہرے ہو سکتے تھے ان میں سے ڈائریکٹر
نے صرف وہی منتخب کئے ہیں جو سب سے زیادہ موثر ثابت ہوں

ایک اور مثال سنیئے۔ پچھلی گرمیوں میں "واسٹ پر فارمینس" نام ایک فلم لاہور میں دکھایا گیا تھا۔ پال جنوس ڈائریکٹر تھا اور کونراڈ ویٹ ہیرو کا پارٹ
ادا کر رہا تھا۔ کہانی کا موضوع اگرچہ ایسا شاندار نہ تھا لیکن صنعتی اور فنی حیثیت سے یہ فلم درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور ڈائریکٹر نے اپنی قابلیت کے جو کرشمے دکھائے تھے
ان کے لحاظ سے بہت قابل تعریف تھا۔ اس میں سے ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔

ایک مداری ایک شعبدہ دکھاتا ہے وہ یہ کہ اس کا ایک اسسٹنٹ ایک صندوق میں داخل ہوتا ہے۔ صندوق کے پہلوؤں میں سوراخ ہیں جو ایک دوسرے
کے قریب واقع ہیں۔ ان سوراخوں میں سے صندوق میں اس طرح تلواریں داخل کی جاتی ہیں کہ اس کا بچ جانا ناممکن معلوم ہوتا ہے تلواریں نکال لی جاتی ہیں۔ لیکن
اس کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ تلواریں نکال لی جاتی ہیں اور صندوق کا ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے تو وہ صحیح و سالم نکل آتا ہے۔ ایک دن مداری کی نیت بدل جاتی ہے
اور وہ ارادہ کر لیتا ہے کہ اسے کھیل ہی کھیل میں سچ مچ قتل کر ڈالے۔ اب غور کیجئے۔ کھیل دیکھنے والے کو ارادہ قتل سے آگاہ کر دیا جاتا ہے تماشائی اس کے نتیجے
کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اور بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ کہ کب صندوق کا ڈھکنا اٹھتا ہے مقصود اس بے چینی کو بڑھانا اور کانپتے ہوئے دلوں کی ترجمانی کرنا ہے۔
صندوق سے تلواریں نکال کر اس طرح سٹیج پر کھڑی کر دی جاتی ہیں کہ ان کے قبضے اوپر کی جانب ہیں۔ اور نوکیں فرش پر دھنسی ہوئی ہیں ڈائریکٹر کو اس مقام پر یہ فکر تھی کہ
کسی طرح دیکھنے والوں پر اضطراب و بے تابی اور تذبذب کی کیفیت طاری ہو جائے چنانچہ اس نے ایک ایسا شاٹ لیا جس نے تماشائیوں کو عجیب ہیجان اور
کشمکش میں مبتلا کر دیا۔

مداری سٹیج پر کھڑا ہے اور اس کے سامنے تلواروں کا ایک ستھرا سا بن گیا ہے کیمرہ نشیب میں رکھ دیا گیا تا کہ مداری کا سر تلواروں کے دستوں کے بیچ اور
فراز سے تلواروں کے دستے بوجھل ہیں اس لئے ان میں ایک لرزش سی پیدا ہو گئی ہے اور پھل چمک رہے ہیں ان کے اوپر مداری کا ہولناک چہرہ دکھائی دیتا
ہے اس شاٹ نے دیکھنے والوں پر وہی کیفیت طاری کر دی۔ جو آرکسٹرا کے گمبھیر نغموں کے اثر سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

کی علم نفسیات نے سلسلے میں اس کے نتائج کی دلچسپ داستان ان الفاظ میں بیان کی تھی۔

جب یہ تینوں تصویریں دیکھے لوگوں کو دکھائی گئیں جو اس راز سے واقف نہ تھے تو ان پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ لوگ ایکٹر کے کمال فن کی تعریفیں کرنے لگے تھے۔ انہیں پہلی تصویر میں ایکٹر کے چہرے پر فکر اور سوچ کے آثار نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ شوربے کی پلیٹ کو بھول گیا ہے اور اس کی طرف اب گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ دوسری تصویر پر انہیں ایکٹر کے چہرے پر حزن و ملال کی کیفیات نظر آئیں گویا مرد کو عورت کا تابوت دیکھ کر اسے بہت قلق ہوا ہے۔ تیسری تصویر میں انہیں ایکٹر کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم دکھائی دیا۔ گویا وہ بچی کو کھیلتے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ تینوں تصویروں میں ایک ہی چہرہ ہے جس سے اصلاً کوئی جذبہ ظاہر نہیں ہوتا۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ فلم سازی میں جتنے لوگ حصہ لیتے ہیں ان میں سے کسی کو کوئی اہمیت حاصل ہے۔ بجز ایکٹنگ کے یہ بیان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو ایکٹر کو اتنا بے حقیقت نہیں سمجھتے۔ تاہم اتنا تو ماننا پڑے گا کہ تاثر کا انحصار اس کے سیاق و سباق پر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فلم کے اجزا کی ترتیب میں ایکٹر کو مطلق کوئی دخل نہیں۔

لیکن فلم کے مختلف اجزا کو مرتب کر دینا ہی کافی نہیں۔ ایڈیٹر میں یہ سمجھ بوجھ بھی ہونی چاہیے کہ اجزا کی لمبائی کتنی ہو کیونکہ جس طرح موسیقی میں نہ صرف سروں کا اتار چڑھاؤ بلکہ ان کی کمی بیشی بھی نیا اثر پیدا کرتی ہے اسی طرح فلم میں بھی شاٹوں کی کمی بیشی سے خاص خاص تناسب اور آہنگ پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان سے دیکھنے والوں پر مختلف قسم کے اثرات طاری ہوتے ہیں۔ یہ آہنگ و تناسب کا سوال ذرا پیچیدہ سا ہے اور اس قابل ہے کہ سینما سے شغف رکھنے والے لوگ جن کا مطالعہ مجھ سے زیادہ وسیع ہے اس جانب توجہ کریں۔ میں صرف چند ضروری باتیں بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

میں اس جگہ صرف دو مثالیں پیش کروں گا۔ یہ مثالیں پڈوفکن نے یہ ظاہر کرنے کے لیے پیش کی ہیں کہ مختلف مقاصد کے لیے آہنگ میں کیا تبدیلی ہوتی ہے یعنی شاٹ پے در پے جس رفتار سے آتے ہیں وہ رفتار کس طرح بدلتی رہنی چاہیے۔ اس سے نتیجہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مناظر کو فلم بند کرنے میں موقع و محل کے اعتبار سے کیا کیا خاص طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔

عنوان

● مزدوروں کی بغاوت فرو کر دی گئی:

۱۔ تصویر آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ دور زمین پر خالی کارتوس اور بندوقیں پڑی نظر آتی ہیں۔

۲۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور لینز کے سامنے سے ایک لمبا پشتہ گزرتا ہے۔ جس پر مزدوروں کی لاشیں پڑی ہیں۔

۳۔ ان میں ایک عورت بھی ہے جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے ایک ٹوٹے ہوئے کھمبے کے ساتھ ایک پھٹا ہوا جھنڈا لٹکا ہوا ہے یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۴۔ قریب سے شاٹ لیا جاتا ہے۔ عورت جس کا سر پیچھے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ لینز کی طرف گھور گھور کر دیکھتی ہے۔ یہ شاٹ اگلے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

۵۔ پھٹا ہوا جھنڈا ہوا میں لہراتا ہوتا ہے۔

یہ تو ایک ابتدائی واقعہ کی مثال ہے جس میں سکون بلکہ سکوت اور غم پایا جاتا ہے ایک شاٹ دوسرے شاٹ میں اس لیے تحلیل ہو جاتا ہے کہ ناظرین کے سامنے آہستہ آہستہ آئے۔ اور اس سکوت و سکون کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے۔ کیمرہ گھما کر پورے منظر کا شاٹ لیا جاتا ہے اور تصویر کے آہستہ

اہمیت ترتیب دینے سے واضح ہو جانے سے یہی واضح کرنا مقصود ہے کہ فلم کا یہ مختصر سا حصہ بجائے خود ایک واقعہ کی سی اہمیت رکھتا ہے اس لیے ایک تیز شاٹ اور
ہنگامہ خیز واقعہ کی مثال پیش کی جاتی ہے۔

۱۔ ایک گوشے سے مزدوروں کا ہجوم غیر معمولی نظر آتا ہے وہ تیزی کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں سب کے سب بیٹھے ہجوم کیمرے کے
سامنے سے گذر جاتے ہیں۔

۲۔ ایک مزدور ایک آہنی سلاخ پرے کرتا ہے اور بھاگتا ہوا چلا جاتا ہے پھر یک بیک ٹھہر جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

عنوان :-

"سب سے پہلی دکان کو بچاؤ"

۳۔ ایک مزدور کرین پر چڑھ جاتا ہے۔

۴۔ دھواں ہوا میں بلند ہوتا ہے بھاپ کی سیٹی بجتی ہے۔

۵۔ مزدور جو کرین پر چڑھا ہے اسے جھک کر نیچے دیکھتا ہے۔

۶۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں (یہ شاٹ اوپر سے لیا گیا ہے)

۷۔ مزدور جو کرین پر ہے پوری قوت سے چلاتا ہے

"پہلی دکان کو بچاؤ"

۸۔ اوپر سے شاٹ لیا گیا ہے۔ بھاگتے ہوئے مزدور ٹھہر جاتے ہیں تھوڑی دیر توقف کرتے ہیں اور پھر بھاگ نکلتے ہیں۔

۹۔ ایک عورت ان سے ٹکرا کر گر پڑتی ہے۔

۱۰۔ کلوز اپ دکھایا جاتا ہے عورت گر کر پھر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیتی ہے۔

۱۱۔ مزدور بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ان میں سے کوئی شاٹ پردے پر اپنے اصلی وقت سے آدھ سیکنڈ زیادہ دکھایا جائے تو سارا تناسب خاک میں مل جائے گا اور جو اثر پیدا
کرنا مقصود ہے پیدا نہیں ہوگا۔

اب اس سے بھی زیادہ آسان مثال لیجئے۔ یہ مثال بھی پڈوکن نے ہی پیش کی ہے اور کسی بازار کے حادثے کے متعلق ہے حادثہ اس طرح
دکھایا گیا ہے۔

۱۔ ایک بازار دکھائی دیتا ہے جس میں گاڑیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ ایک راہگیر بازار کو عبور کرتا ہے اس کی پشت کیمرے کی جانب ہے
پاس سے ایک موٹر کار گذرتی ہے جو اس کے اور کیمرے کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔

۲۔ موٹر ڈرائیور کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے وہ بریک پر قدم رکھتا ہے اور گھبرایا ہوا نظر آتا ہے۔

۳۔ جو بدنصیب حادثے کا شکار ہوتا ہے اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آتی ہے اس نے چیخ مارنے کے لئے منہ کھول دیا ہے۔

۴۔ یہ شاٹ موٹر ڈرائیور کی نشست سے لیا گیا ہے۔
گھومتے ہوئے پہیئے کے قریب ٹانگیں نظر آتی ہیں۔

۵۔ مرنے کے پیچھے گھومتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

۶۔ کالا سفید گولی سے اور اس کے پاس لاش پڑی ہے۔

اس واقعہ میں گر رہے ہونے والے ہاتھ وغیرہ دیکھنے کے بجائے ایک منٹ تک ملا دکھایا جاتا تو سارا اثر خاک میں مل جاتا۔

یہ آخری تدوین کی مثالیں ہیں۔ یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تدوین کے اس اہم شعبہ پر بھی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جائے۔

جسے اصطلاح میں "تخلیقی تدوین" کہتے ہیں۔ جس میں ایڈیٹر کے ذہن کے واسطے عجیب عجیب راستے نظر آتے ہیں۔

میں گزشتہ اوراق میں "دی واسٹ پرفارمنس" نامی ایک فلم کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس فلم میں ایک واقعہ بھی ہے کہ چند اشخاص تھیٹر میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے ہیں اور ایک پیشہ ور ماہر مسمریزم ان پر عمل کر رہا ہے۔ اب اس عمل کا اثر فلم کے ذریعے دکھانا مقصود ہے اور فلم کے لیے حقیقتاً یہ موضوع بہت مشکل ہے۔ صحیح سمن پیدا کرنے کے لیے پہلے عامل کے چہرے کا قریبی شاٹ لیا۔ اس کی آنکھیں چند اشخاص کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ اور وہ انہیں گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور تصویر اس طرح دکھائی گئی کہ دونوں تصویریں ایک دوسرے کے بیچ میں جھلملاتی نظر آتی تھیں۔ اس دوسری تصویر میں بلب بڑے ان پتلے ملاقات جیسے نقشے میں جھلتے دکھائے گئے ہیں۔ یہ شاٹ دوسرے شاٹ میں تحلیل ہو جاتا ہے اور جس میں وہ تماشائی نظر آتے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ جب عامل کا چہرہ آہستہ آہستہ غائب ہو جاتا ہے کیمرہ پیچھے ہٹتا ہے اور دھندلکے سے تماشائیوں کے چہرے ابھرتے نظر آتے ہیں اور پھر کیمرہ قریب آ جاتا ہے۔ یہ تمام شاٹ خاص آہنگ و تناسب سے یکے بعد دیگرے دکھائے جاتے ہیں اور ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پردے پر رنگا رنگ شکلیں نظر آتی ہیں۔ کوئی دیدے پھیلا پھیلا کر دیکھ رہی ہے کوئی پیچھے ہٹتی ہے کوئی آگے بڑھتی ہے اور کوئی جھوم رہی ہے چنانچہ اس کا تاثر بے حد حیرت انگیز ہوا —— ایڈیٹر تماشائیوں پر اس قسم کے جو اثرات طاری کر دیتا ہے اس کا تجزیہ آسان نہیں چنانچہ اس کے کمال فن کی مثالیں مہیا کرنا مشکل ہے۔ پڈوکن نے اپنی فلم "دی اینڈ آف سینٹ پیٹرز برگ" سے ایک مثال پیش کی ہے جسے اسی کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ جنگ کے مناظر کا [illegible] میں ایک ہولناک دھماکہ دکھانا چاہتا تھا اور کہ یہ دھماکہ اپنی پوری قوت کے ساتھ فلم کے پردے پر نمودار ہو جائے۔ میں نے بہت سا ڈائنامیٹ زمین میں دفن کیا پھر اسے اڑایا اور اس کا شاٹ لیا۔ اس سے بڑا دھماکہ تو پیدا ہو گیا لیکن یہ فلم کے کسی کام کا نہ تھا پردے پر محض ایک بے جان سی حرکت دکھائی دی بہتیرے تجربات کے بعد آخر کار میں فلم کے پردے پر دھماکہ اور اس کے تمام اثرات دکھانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ بھی یوں کہ ڈائنامیٹ کے دھماکے کا جو شاٹ لیا اس کو [illegible] استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے ایک شعلہ سے دھوئیں کے بادل پیدا کئے اور شور و تصادم کا اثر پیدا کرنے کے لیے "مجسٹرم ہیٹ" سے کام لیا اس شاٹ کے درمیان میں نے ایک دریا کا شاٹ بھی داخل کر دیا جو میں نے اس سے پہلے کسی زمانے میں لیا تھا اس طرح پردے پر وہ مرئی شکل میں پیدا کرنا چاہتا تھا وہ اثر پیدا ہو گیا لیکن اس غرض کے لئے کوئی ایسی چیز استعمال نہ کی گئی تھی جو حقیقت دھماکہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہو۔

میں اس مثال کی روشنی میں آپ پر ایک بار پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کامل تدوین کا فلم کو بڑی [illegible] ہے وقت محض خام مواد مہیا کرتی ہے جس سے ایڈیٹر اپنی دنیا آپ پیدا کر لیتا ہے جس کا حقیقت اور فلم میں بھی تعلق ہے —— فلم کے مضمون کو انہی الفاظ پر ختم کر دینا چاہتا ہوں میرا یہ مضمون سینما کے مبادیات سے متعلق ہے۔ ملک ہندوستان میں جو لوگ سینما کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں کئی دشواریاں پیش آتی ہیں خوش قسمتی سے لاہور میں دنیا کے بعض بہترین فلم دکھائے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے لاہور کی خوش قسمتی انگلستان کے بڑے بڑے شہروں کے لیے بھی قابل رشک ہو سکتی ہے لیکن افسوس کہ سینما کے [illegible] پرست دانشوں اور قدامت پسند منصب کے نزدیک ابھی تک اکثر یہ فلم مردود ہیں جنہیں انسانی ذہن و عقل کی عظیم ترین کامیابی کہا جانا چاہیے اور طالبان کو ان کے دیکھنے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

امید ہے جب آپ اس نوع کی تصویریں کو میری دوسری فاصلوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں گے تو آپ کو یہ مضمون غنیمت معلوم ہوگا۔ (نیرنگ خیال)

انگلستان کا جدید تھیٹر

پطرس

چونکہ مجھے تھیٹر اور اس کے فن سے خاص دلچسپی ہے اس لیے سفر یورپ کے دوران میں، میں نے اپنی فرصت کا بیشتر حصہ اسی کے مطالعہ میں صرف کیا۔ اس سے میرا مقصود صرف اپنی پیاس بجھانا تھا۔ یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ ہندوستان واپس آ کر اس کے متعلق کوئی تبلیغ کروں گا۔ یا کسی رسالے یا اخبار میں کوئی سلسلۂ مضامین شروع کروں گا۔ میرے احباب میں سے سید امتیاز علی تاج کا تجربہ ہندوستانی ناٹک کے متعلق بہت وسیع ہے اور یورپ کے تھیٹروں کے متعلق بھی ان کی معلومات کا ذخیرہ حیرت انگیز ہے وہ اور میں اپنے پرانے کالج یعنی گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر گردت سوندھی کے زیر قیادت ایک کلب بنا کر برسوں سے ناٹک کے شوق کو پورا کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر گاہے گاہے امتیاز صاحب کو خط لکھتا رہا۔ اور واپسی پر بھی انہیں سے اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ باقی رہے پروفیسر سوندھی، سو میرا انہیں کچھ بتانا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ان دنوں حالات میں ہرگز اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ یورپ کے تھیٹروں کے متعلق کوئی مضمون لکھتا اور حق تو یہ ہے کہ اگر امتیاز صاحب کی یہ خواہش نہ ہوتی کہ میرے بعض مشاہدات قارئین نیرنگ خیال کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں تو یہ مضمون کبھی ظہور میں نہ آتا۔

ایک تو ہندوستان کا تھیٹر یورپ کے مقابلے میں اس قدر حقیر ہے کہ یورپ کے تھیٹر کا ہندوستانی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا بے معنی بات ہے اور ایک ہندوستانی رسالے میں اس کا کماحقہٗ بیان کرنا بے حد مشکل ہے دوسرے موضوع اس قدر وسیع ہے کہ میں کسی طرح بھی اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اگر آپ اس تحریر سے کسی طرح بھی تنقید یا لطف اندوز نہ ہوں تو کم از کم میرے اس تامل کے شاہد تو ضرور ہیں جس کا اظہار میں شروع ہی میں کر رہا ہوں۔

اس وقت میں صرف ایک تھیٹر کا ذکر کروں گا۔ جس کا نام فیسٹی ول تھیٹر (FESTIVAL THEATRE) ہے اور جو کیمبرج (انگلستان) ہی میں ہے۔ حسن اتفاق سے اس تھیٹر کا افتتاح عین اس وقت ہوا جب میں کیمبرج پہنچا۔ لیکن اس کے لیے ایک مدت سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اور اس کے شروع ہونے سے پہلے جو جو بیانات وقتاً فوقتاً اس کے متعلق اخباروں میں شائع ہوتے رہے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ کم از کم انگلستان میں اس تھیٹر کی نظیر نہ ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ میں نے لندن سے کیمبرج کا سفر کیا تو سفر کے دوران میں اخبار کے کالموں میں اس تھیٹر کے آئندہ پروگرام کا حال بہت انہماک سے پڑھ رہا تھا۔ یونیورسٹی کے کھلتے ہی پہلا کھیل رکھا گیا۔ اور اس دن سے لے کر آج تک میں نے سب کھیل دیکھے ہیں اور آج کل جہاں یورپ کی اور باتیں یاد آ رہی ہیں وہاں فیسٹی ول تھیٹر کا فراق کچھ کم افسوسناک نہیں۔

شروع ہی میں اس تھیٹر کے اغراض و مقاصد ان الفاظ میں بیان کیے گئے تھے: —

"میڈیسن وِل تھیٹر کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ ہر فن اور ہر زمانے کے عظیم الشان ڈرامے سٹیج پر پیش کرے۔ اور اس بات کا مطلق خیال نہ رکھے کہ لوگوں کو کس چیز کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ یہ وہ لوگ جو محض کتابوں کے لئے لکھتے ہیں اور جو ڈراموں کا بحیثیت تصانیف کے مطالعہ کرتے ہیں، وہ ناٹک کے فن کے نقطۂ نظر سے ان پر غور نہیں کرتے۔ ان کے دماغ میں ڈرامہ کا تصور کیا ہے۔ دنیا کے سب سے دلچسپ ڈرامے یہاں دکھلائے جائیں گے موجودہ زمانے میں جو تھیٹر محض تجارتی اغراض سے کھلے ہوئے ہیں ان میں ایسے ڈراموں کی تلاش کرنا بے سود ہے کیونکہ ان تھیٹروں کا انتظام ایسی ... کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کے نزدیک ڈرامے کا فن کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اور وہ لوگ جو جواہر فن کے دلدادہ ہیں اور فی الواقع ان فن لطیف کے نمونے پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایسا کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ عام تھیٹروں میں عمارت کی ساخت اور سٹیج کا سامان کچھ اس ... سے بنایا جاتا ہے اور جدید ترین طرز اداکاری کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو یہ کہ عام تجارتی تھیٹر اصل فن سے محض بے خبر ہے اور صرف عامۃ الناس کی اسفل خواہشات کو پورا کرنا ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے کیونکہ روپیہ کمانے کا یہی ایک ڈھنگ ہے دوسری بات یہ کہ تھیٹروں کا طرز تعمیر اور سٹیج کی مشینری وغیرہ خود انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی فرسودہ اور بے کار ہے۔ یہ دونوں باتیں بہت حد تک تفصیل طلب ہیں لیکن مضمون کو اس قدر طول دینا کہ ہر تفصیل معلوم ہو جائے میری طاقت اور نیرنگ خیال کی ضخامت سے افزوں ہے۔

انگلستان کے عام تھیٹروں میں سے ہر ایک میں ایک ہی کھیل ہر رات مہینوں بلکہ بعض اوقات برسوں ہوتا رہتا ہے دیکھنے والوں کی تعداد بے شمار ہوتی ہے اس لئے ایسا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ کھیل بہت ہی مقبول ہو تو سال ڈیڑھ سال دو سال تک آمدنی کا ذریعہ بنا رہتا ہے اور کوئی برا کھیل فیل ہونے پائے تو دو ہفتے ہی میں فیل ہو جائے۔ جب ایک کھیل ختم ہو جائے تو پھر دوسرا کھیل تیار کیا جاتا ہے اور وہ بھی اسی طرح اپنی مقبولیت کی حد تک دکھایا جاتا ہے برخلاف اس کے میڈیسن وِل تھیٹر میں ہر ایک کھیل صرف ہفتہ بھر تک ہوتا رہتا ہے جب یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوں تو تھیٹر بھی بند ہو جاتا ہے حق تو یہ ہے کہ یہ تھیٹر یونیورسٹی ہی کے سر پر قائم ہے۔ کیونکہ یہاں کھیلوں کا جو معیار ہے اس کے مطابق دیکھنے والے بھی ایسے ہی تربیت یافتہ آدمی ہونے چاہئیں۔ جو یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں اسی لئے اس تھیٹر کا قیام لندن یا کسی بڑے شہر کی بجائے کیمبرج ہی میں مناسب سمجھا گیا۔

کھیلوں کے انتخاب میں بہت ہی وسعت نظر سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو جدید سے جدید کھیل جو عام تھیٹروں کے مالک اس ڈر سے کہ عامۃ الناس اسے قبول نہیں کرتے کہیں ان کی جدت عامۃ الناس کے ناپسند نہ ہو اور کاروبار میں نقصان نہ اٹھانا پڑے پیش کئے جاتے ہیں (بشرطیکہ ان میں فنی اعتبار سے کوئی خاص خوبی ہو) اور دوسری طرف قدیم سے قدیم یونانی کھیلوں کے دکھلانے میں ماہرین تھیٹر کمال فن کا ثبوت دیتے ہیں اور ان دونوں کے مابین ڈرامے کے ہر مشہور دور کا ایک نہ ایک نمونہ ضرور پیش کیا جاتا ہے اور اس میں ملک و قوم کی کوئی قید نہیں۔ چنانچہ یہاں میں نے جرمن اور فرانسیسی اور امریکن اور ہسپانوی آسٹرین اور نارویجن سبھی مصنفوں کے کھیل دیکھے ہیں البتہ ہوتے سب انگریزی زبان میں ہیں۔ اور پھر اس کے علاوہ تو انگریزی کامیڈی فارس وغیرہ سب اصناف ڈرامہ شامل کئے جاتے ہیں۔

یہاں کی سٹیج کا حال خاص طور پر بیان کرنا ضروری ہے کیونکہ یہی چیز ان کا طرۂ امتیاز ہے افسوس کہ میرے پاس کوئی ایسی تصویر نہیں جس سے خالی سٹیج کا منظر پیش کر سکوں۔ یہ کام تصویر ۲ سے نکالنا پڑے گا (اس تصویر میں سٹیج پر جو سین دکھایا جا رہا ہے وہ ایک قدیم یونانی کھیل کا ایک سین ہے۔ سٹیج ۲ بہت سا حصہ سین کی وجہ سے رُک گیا ہے۔ جو حصہ نظر آتا ہے وہ بعض خاص باتیں بیان کرنے کو کافی ہے)

پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ سٹیج اور حاضرین کے درمیان بڑی بڑی سیڑھیاں ہیں جو تصویر میں سب سے واضح نظر آ رہی ہیں (سٹیج کے اوپر جو سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں وہ سین کا حصہ ہیں۔ لیکن جن سیڑھیوں کا میں اس وقت ذکر کر رہا ہوں وہ تھیٹر سٹیج کا مستقل حصہ ہیں) گویا اگر آپ تماشائیوں کی پہلی قطار میں بیٹھے ہوں۔ تو سٹیج آپ کے پاس سے بتدریج اٹھنی شروع ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ سٹیج کی سب سے بڑی سطح پر پہنچ جائیں اس سطح کا کچھ حصہ سٹیج کی سیڑھیوں اور سین کی سیڑھیوں کے درمیان دکھائی دے رہا ہے اس حصے پر آپ غور سے دیکھیں تو حلقے کی شکل میں ایک خط سا کھنچا ہوا ہے یہ ایک دائرہ ہے جس کا کچھ حصہ کچھ سیڑھیوں کے نیچے آ کر چھپ گیا ہے اس دائرے کے اندر جس قدر حصہ سٹیج کا ہے وہ باقی سٹیج سے علیحدہ ہے اور بوقت ضرورت اس حصے کو گھمایا جا سکتا ہے۔

سٹیج ساری کی ساری ایک ہی ہموار سطح نہیں بلکہ اس کا بعض حصہ اور کبھی ایک وجہ اوپر کو اٹھا ہوا ہے۔

اس تصویر میں سب سے پیچھے جو ایک سفید سا پردہ نظر آتا ہے وہ دراصل ایک سفید دیوار ہے جو سیدھی نہیں بلکہ گول ہے جیسے جلتی ہوئی شمع کو ہوا کے جھونکے سے بچانے کے لئے ہاتھ کو خم کر کے شمع کے پیچھے رکھ لیا جاتا ہے۔ یہ دیوار کنکریٹ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے تاکہ ایکٹروں کی آواز اس سے بخوبی منعکس ہو سکے اور اس پر بہت ہی پختہ سفید رنگ کا پلستر ہے جس پر کسی چیز کی رگڑ سے خراش وغیرہ آنا بہت محال ہے اس دیوار کو اصطلاح میں سائیکلوراما (Cyclorama) کہتے ہیں اور یورپ کے جدید تھیٹروں میں اس کا ہونا ضروری ہے۔

تھیٹر کا وہ حصہ جہاں تماشائی بیٹھتے ہیں۔ تصویر ۳ میں دکھایا گیا ہے (یہ گویا وہ منظر ہے جو ایکٹر کو سٹیج پر سے دکھائی دیتا ہے) اس سے آپ اس بات کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں کہ تھیٹر کی لمبائی بہت کم ہے۔ ایکٹروں کو خواہ مخواہ چلانا نہیں پڑتا۔ ورنہ تقریر کی وہ تمام خوبیاں جو آواز کے چڑھاؤ اتار پر منحصر ہیں ضائع ہو جائیں۔ تھیٹر کے اس حصے کی شکل گھوڑے کے نعل کی مانند ہے۔ دو اوپر کی منزلیں ہیں اور فرش کی نشستیں بتدریج اوپر کو اٹھتی جاتی ہیں۔ گویا فرش نہیں فرش کی بجائے بہت سی سیڑھیاں ہیں اور ہر سیڑھی پر کرسیوں کی ایک قطار رکھی ہے صرف دو راستے آمد و رفت کے لئے خالی چھوڑ دئے ہیں۔

یہ تو عمارت کا حال ہوا لیکن اس تھیٹر کا سب سے ضروری چیز جس کی وجہ سے اس کو انگلستان کے باقی تمام تھیٹروں پر تفوق حاصل ہے اور جو اس کے لئے خاص طور پر باعث ناز ہے وہ یہاں کی روشنی کا انتظام ہے۔ فٹ لائٹس یعنی وہ لیمپ جو سٹیج کے کنارے پر ایکٹروں کے قدموں میں لگے ہوتے ہیں اور جن کا رخ ایکٹروں کی طرف ہوتا ہے۔ وہ قطعاً مفقود ہیں۔ سامنے سے روشنی ڈالنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے سب سے اوپر کی گیلری میں چار بڑے بڑے لیمپ لگے ہیں (تصویر ۳) جن کا رخ سٹیج کی طرف ہے اور جو بڑی احتیاط کے ساتھ ایسے زاویے پر لگائے گئے ہیں کہ ان کی روشنی سٹیج یا ایکٹروں پر تو پڑتی ہے لیکن سائیکلوراما پر نہیں پڑتی۔ ورنہ ایکٹروں کے سائے سائیکلوراما پر پڑا کریں۔

سٹیج کے اوپر ایک پل سا بنا ہے (اس کے طول و عرض کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اس پر سے کوئی چیز گرائی جائے تو سٹیج کے عین وسط میں آ گرتی ہے) اس پر لیمپوں کی قطاریں لگی ہیں بعض کا رخ تو بالکل نیچے کی طرف ہے لیکن چند لیمپ ایسے ہیں جن کی روشنی سائیکلوراما پر پڑتی ہے اور لیمپ۔ سات سات لیمپوں کی ایک ایک قطار ہے۔ ان سات لیمپوں کے سامنے قوس قزح کے سات مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہیں۔

١

٢

٣

۴

٥

٦

٧

٨
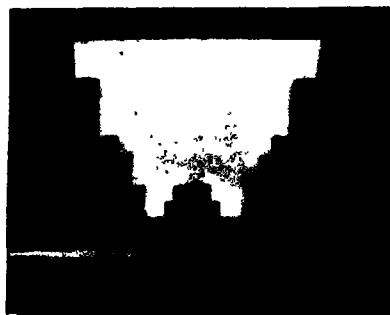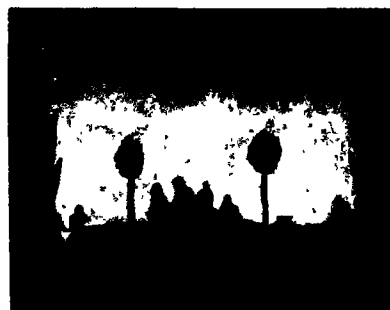
زندگی ہی بری طرح بھی کٹ جائے گی اور بھلی طرح بھی کٹ جائے گی - میں زندگی کی بڑی
کامیابی اسی کو سمجھتی ہوں کہ انجام بخیر ہوا اور وہاں چل کر خدا سے اچھی بنے - میں نے جس
مشکل سے اپنے ایمان کو سنبھالا ہی بس خدا ہی کو خوب روشن ہی - اور وہ بھی میکے کی امداد
سے سکہ جمیے جمعے کا وعظ [illegible] ہونے دیا - ذرا سا بھی خدشہ ہوا اُس کو جھٹ سے جا کر
صاف کر لیا - اور یہ کوچی لڑکی ہی الحمد للہ [illegible] کی بیٹی ہی - یہ اگر کسی بدعقیدے کے پالے
پڑ گئی جاتے ہی بے دین ہو جاتے گی اور اُسی کا کلمہ بھرنے لگے گی - میں اس کا وبال اپنے
سر کیوں لینے لگی - اور جو گھر میں نے تلاش کیا ہی خدا کے فضل سے کھاتا پیتا خوش حال
ہی - کہنے کو توکل کی گزران ہی مگر حیثیت نوکری والوں سے کم نہیں - بیبیوں پاس سونے کا
[illegible] - کپڑا لتا بھی خاصہ تن زیب جو ہم پہنتے ہیں - ایک چھوڑ چھوڑ دو دو ماما ئیں ہیں
گھر کا چلن اچھا ہی - ماشاء اللہ کسی سمدھیانے میں کوئی شاکی نہیں - لڑکا خدا اس کی عمر میں
[illegible] سارے میکے [illegible] کہتے ہیں - جوان صالح ہی - ضروری کتابیں پڑھ چکا ہی
[illegible] باپ نے وعظ پر لگا یا ہی - سننے والے بیان کی تعریف کرتے تھے - تو صاحبو
[illegible] تو اچھا ہی اچھا دیکھ کیا آگے میری ہی آگے اس کی تقدیر - آزادی مولویوں میں
ایسی ہلکی سن کر کچھ اداس سی ہو گئی - [illegible] بھی مولویوں کے گھرانے کی اور ددھیال
میں تو نہیں مگر ننھیال میں ابھی تک مولویت ہی کا پیشہ تھا بھی - کہ کسی کے نوکر نہیں
جا کر ہیں طالب علموں کو پڑھا دیا وعظ کہہ لیا - فتوے لکھ دیا - امامت کر دی - الحمد للہ
خیر [illegible] دنیا دار لوگ گھر بیٹھے خدمت کرتے اور سعادت سمجھتے - خرچ سے معلوم ہوتا تھا کہ
دو چار جگہ سے تنخواہ کے طور [illegible] بھی ضرور کچھ مقرر ہی - مگر مولوی اس کا پتہ چلنے نہیں
دیتے تھے - ہر کیف گزر کا یہ رنگ تھا کہ ظاہر خراب باطن آباد - وہ وہ کھانے جو ہم غریبوں
[illegible] بستی میں ہیں اچھے اچھے امیروں کو بھی کبھی کبھار نصیب
ہوتے ہیں خدا [illegible] کو بے زحمت بے مشقت نہ ہلدی لگے نہ پھٹکری دونوں وقت مفت
کھلاتا ہی - مولوی لوگ دنوں کی نحوست کو نہیں مانتے اور حقیقت میں بات ہی بھی بے اصل
سب دن خدا کے - مگر ہم دیکھتے ہیں مہینے میں زیادہ نہیں دو چار دن مولویوں پر بھی نحوست

اور پھر انہی سات رنگوں میں سے مختلف رنگ انتخاب کر کے ان کو مختلف تناسب میں ملا کر نیا اور علیحدہ رنگ بنایا جا سکتا ہے اس سے سائیکلوراما پر جس قسم کے رنگ کی روشنی ڈالنی مطلوب ہو ڈالی جا سکتی ہے۔

ان لیمپوں کے علاوہ اور بھی لیمپ ہیں جو مختلف موقعوں پر لگتے ہیں لیکن ان کا بیان ضروری نہیں۔

سائیکلوراما کے لیمپ کی روشنی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اگر ان کے سامنے عام قسم کے شیشے لگائے جائیں تو یا تو حرارت کی وجہ سے ٹوٹ جاتے ہیں یا ان کا رنگ مدھم پڑ جاتا ہے اس لئے ان میں ایک خاص قسم کا شیشہ استعمال کیا جاتا ہے جو جرمنی میں بنتا ہے اور جو بہت مہنگا ہوتا ہے صرف ایک اور بات کا ذکر باقی ہے اس کے بعد اس سٹیج کے گرد و پیش سے ذہن کو جدا کر کے رکھ دوں گا۔ ہر ایک لیمپ کے جلانے کا بٹن علیحدہ ہے نہ صرف یہ بلکہ اس بٹن کے ساتھ ایسا انتظام بھی ہے کہ لیمپ کی روشنی نہایت آہستہ آہستہ بالکل ہی بے معلوم طور پر مدھم یا تیز کی جا سکتی ہے تمام لیمپوں کے تار ایک خاص کمرے میں جاتے ہیں۔ جہاں بٹنوں کی قطاروں کی قطاریں لگی ہیں۔ اور جہاں سے بجلی کا ماہر روشنی پر قابو رکھتا ہے۔ بس ماہر کو اپنی نشست پر سے سٹیج بالکل نظر نہیں آتی۔ لیکن مسٹر رچ جو آج کل وہاں یہ کام کر رہے ہیں ان کے تجربے کا یہ عالم ہے کہ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے مختلف بٹنوں کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتے ہیں کہ سائیکلوراما پر کس رنگ اور کس شدت کی روشنی پڑ رہی ہوگی۔ یا ان کو کسی رنگ کا کپڑا دکھا دیجئے تو وہ بجلی کے بٹنوں کو اوپر نیچے سرکا کر آپ سے کہہ دیں گے کہ اس وقت سائیکلوراما پر جو رنگ ہے اس میں اور اس کپڑے کے رنگ میں سر مو تفاوت نہیں اور وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتے۔ ریہرسل کے دوران میں جب ڈائریکٹر مختلف رنگ آزما رہا ہے تو ہال اور بجلی کے کمرے کے درمیان عارضی ٹیلیفون لگا دیتے ہیں ڈائریکٹر تماشائیوں کی نشست پر بیٹھا ہوتا ہے۔ ماہر روشنی اپنے کمرے میں ہوتا ہے۔ ڈائریکٹر ہدایات دیتا رہتا ہے کہ مثلاً سرخی مائل کہربائی رنگ مطلوب ہے۔ ماہر روشنی اپنی نشست سے محض بٹنوں کو اوپر نیچے سرکا کر اس کی تعمیل کر دیتا ہے حالانکہ سائیکلوراما خود اسے نظر نہیں آتا۔

تصویر نمبر ۱ میں سائیکلوراما کو دیکھئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کی گہرائیاں دور تک پھیلی جا رہی ہیں۔ جب تک مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ دیوار ہے مجھے اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

یہ تمام وہ سامان ہے جس کی مدد سے وہاں کے خداوندان تھیٹر دنیا کے لئے اپنے ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ سینری کے متعلق ان کے بعض خیالات انوکھے ہیں پردے پر پینٹ کی ہوئی سینری تو خیر ذلیل سے ذلیل تھیٹر بھی وہاں استعمال نہیں کرتا۔ اس کا تو ذکر ہی جانے دیجئے۔ فیسٹیول تھیٹر کا رجحان زیادہ تر ایسی سینری کی طرف ہے جس میں انتہا درجے کی سادگی سے بڑے سے بڑا کام نکل سکے۔ تصویر نمبر ۱ کا سین محض لکڑی کے کندوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے لیکن سیڑھیوں اور ستونوں کے تناسب سے پاکیزگی اور رفعت ٹپکتی ہے سائیکلوراما کا رنگ اس سین میں آسمانی ہے۔

تصویر نمبر ۳ ایک محل کا منظر ہے کالے پردوں میں سے سائیکلوراما دکھائی دے رہا ہے۔ یہ ایک ڈرامے کا آخری سین ہے کھیل اس واقعے پر ختم ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ اپنی سلطنت چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہ ادا یوں کیا گیا کہ بادشاہ سٹیج پر آگے کو بڑھتا بڑھتا سیڑھیوں پر سے اتر کر تماشائیوں میں سے ہوتا ہوا تھیٹر سے باہر نکل گیا۔ فیسٹیول کی یہ خاص جدت ہے کہ اکثر اوقات ایکٹر تماشائیوں میں سے ہو کر سٹیج پر آتے ہیں اور اسی طرح باہر نکل جاتے ہیں البتہ یہ صرف وہیں کیا جاتا ہے جہاں موزوں معلوم ہو۔

تصویر نمبر ۴ ان کی سینری کی سادگی کا ایک اور نمونہ ہے یہ منظر ایک خوشنما باغ ہے آسمان (یعنی سائیکلوراما) کا رنگ شہابی ہے جو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ درخت بہت ہی نفاست اور سادگی سے پیش کئے گئے ہیں۔

تصویر نمبر ۵ دوسرے منظر میں بہت ہی گھنا جنگل دکھانا مقصود تھا۔ اس سین پر صرف تین طرف سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک تو سائیکلوراما روشن ہے۔ اس کے علاوہ دائیں بائیں دو چھپے ہوئے لیمپوں سے روشنی کی شعاعیں ستونوں پر پڑ رہی ہیں۔ بے شمار ستونوں میں دو تین درختوں کو کھڑا کر دیا۔ یہ ستون اور بھی کئی ڈراموں میں استعمال ہوں گے۔ اس لئے درخت گو صرف تین ہیں لیکن جو اثر پیدا کرنا مطلوب تھا وہ ہو گیا۔

ایک دفعہ ایک فیکٹری دکھانے کے لئے بڑے انتظامات کرنے پڑے۔ ان کو سوچتے ہوئے دماغ گھبراتا ہے لیکن اس تھیٹر نے اس مشکل کو یوں حل کیا کہ اسٹیج کے اوپر کے پل پر جو لیمپوں کی قطاریں لگی تھیں ان کا سایہ سائیکلوراما پر ڈال دیا یعنی ان تمام لیمپوں کو ان کے پیچھے ایک اور لیمپ روشن کر دیا۔ نتیجہ تصویر نمبر ۶ سے ظاہر ہے۔

تصویر نمبر ۷ میں ایک ڈرامے کا آخری منظر ہے۔ ڈرامے کی کہانی مصر کی قدیم تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔ دو لاشوں کی ممیاں [illegible] کئے جا رہے ہیں۔ صرف سائیکلوراما روشن ہے باقی سب تاریکی ہے لیکن چونکہ آخری سین ہے لوگ کیرکٹروں سے کب کے آشنا ہو چکے ہیں، اس لئے اس سے کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ البتہ روشنی کی اس ترتیب سے سین میں ایک خاص خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

سائیکلوراما پر روشنی کی بجائے سائے ڈالنے کی مثال اوپر پیش کی جا چکی ہے۔ اس کی ایک اور مثال بھی ملاحظہ کیجئے جو میرے خیال میں یہ تجربہ فن کامیاب تر ہے۔ (تصویر نمبر ۸) شیکسپیئر کے رچرڈ سوم کا وہ سین ہے جہاں رچرڈ سویا ہوا ہے۔ اور طرح طرح کے پریشان خواب دیکھ رہا ہے۔ ہیبت ناک صورتیں دکھائی دے رہی ہیں۔ سٹیج پر ایک لیمپ کسی چیز کے پیچھے چھپا کر رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ سے جو سائے سائیکلوراما پر پڑ رہے ہیں ان سے ہیبت اور وحشت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اور بہت سے مناظر پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن امید نہیں کہ نیرنگ خیال میں ان سب کے متعلق تصاویر چھاپنے کی گنجائش ہو اور تصاویر کے بغیر ان کا کچھ بیان کرنا بے معنی ہوگا۔ اس لئے اس قصہ کو یہیں ختم کئے دیتا ہوں، اس امید پر کہ ان چند مثالوں سے قارئین کو اس تھیٹر کے طرز و نہج کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا۔

صرف ایک کھیل کے دو سین تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں ایک تو تصنیف ہی بالکل نرالے طرز کی ہے اور اس کے علاوہ جس طریقے سے یہ ڈرامہ پیش کیا گیا وہ بھی سٹیج کے فن کی بعض عجیب طرازیوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کھیل کا نام (THE ADDING MACHINE) یعنی جمع کرنے والی مشین ہے۔ اس کھیل میں جو پیغام مضمر ہے وہ یہ ہے کہ امریکہ اور اس سے کم درجے پر انگلستان اور یورپ کے بعض اور ممالک میں حیرت انگیز مادی ترقی ہوئی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہزارہا افراد (مثلاً کلرک اور مزدور) ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی زندگی بالکل ایک مشین کی طرح چلتی ہے گویا روح اور احساس کی تمام صلاحیتیں مر چکی ہیں۔ زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کام میں کوئی لطف نہیں۔ برسوں تک ایک ہی دفتر میں ایک بے رونق سی مصروفیت میں مبتلا ہیں۔ ہر صبح اسی وقت پر اٹھنا۔ اسی وقت پر کام کو جانا۔ اسی کرسی پر بیٹھنا۔ وہیں ہندسے جمع کرتے رہنا۔ ہر شام اسی گھر کو واپس آ جانا۔ کوئی تفریح نہیں۔ کوئی اونچے خیالات نہیں۔ کوئی ترقی کی امید نہیں۔ اس کاروباری دنیا میں نیرنگی بالکل مفقود ہے۔ بے رنگ یکسانیت چھائی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک کلرک اور دوسرے کلرک یا ایک مزدور اور دوسرے مزدور میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سب کے سب جانوروں کی طرح ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے ہیں۔ سب ایک ہی جیسی باتیں کرتے ہیں ایک ہی جیسے خیالات رکھتے ہیں غرضیکہ کولہو کے بیل کی طرح پیدائش سے مرگ تک ایک ہی نقطے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔

ڈرامے میں جس کلرک کی زندگی پیش کی گئی ہے اس کا نام مسٹر زیرو یعنی صفر ہے۔ ڈرامے کے بیشتر افراد کے ناموں کی بجائے اسی طرح نمبر ہے

سے جیسے ہیں۔ یعنی کسی میں کوئی انفرادیت جیسے کسی کی کوئی خاص شخصیت نہیں۔ گویا یہ ذی روح اشخاص نہیں۔ جانور بلکہ مشین ہے۔ ایک بالکل دوسرے جیسا۔ ان میں تمیز کا ہو تو یہ ہو۔ اس سلسلہ ہر ایک پر ایک ایک لیبل لگا دیا جائے اور کوئی طریقہ نہیں۔ اسی لئے افراد کو ہندسوں سے تعبیر کیا گیا ہے صرف چونکہ کھیل کے ہیرو یعنی مجبور انسان ان مشینوں سے ایک خاص مشین کو باقی مشینوں سے تمیز کرتا تھا اس لئے اس کا نام زیرو رکھ دیا۔

کھیل کا پلاٹ۔ وہ اس کو سٹیج پر ادا کرنے کا ڈھنگ دونوں ساتھ ساتھ بیان کرتا جاؤں گا۔ (میں صرف اپنے حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔ تفصیلات میں کمی بیشی ممکن ہے مگر اتنی نہیں کہ اس سے کوئی خاص فرق پڑے) پہلا سین مسٹر صفر کی خواب گاہ کا ہے۔ میاں بیوی دونوں بستروں پر ساتھ ساتھ لیٹے ہیں۔ بیوی بدمزاج ہے اور ہر وقت میاں کو ذاتی ذہنی رہتی ہے۔ گلہ صرف یہ کہ اس کلرک بے چارے کی زندگی دفتر کی بے تعلق ہے بچہ گھر پر بھی اس کو کوئی آرام کوئی خوشی نصیب نہیں۔ ایک سین میں بیوی نہایت غصے میں بلند آواز کے ساتھ بول رہی ہے اور میاں کو طرح طرح کی باتوں پر ملامت کر رہی ہے میاں سامنے سے کچھ نہیں بولتا۔ چنانچہ اس تمام سین میں میاں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ صرف کبھی کبھی جب لے بھر کے لئے بیوی آرام لینے کے لئے ٹھہر جاتی ہے تو اس وقفے میں مسٹر صفر کے دماغ میں اپنے محدود سے خیالات گونجتے رہتے ہیں۔ اس کو یوں ادا کیا گیا کہ جہاں بیوی چپ ہوتی ہے پردے کے پیچھے سے پانچ ایکٹر بھاری اور ناذوق اور نہایت ہی مدھم آواز میں ہندسوں کا ایک بے معنی سا سلسلہ دہرانے لگ جاتے ہیں حتیٰ کہ پھر خاموشی چھا جاتی اور بیوی پھر بولنے لگ جاتی۔ اس دوران میں مسٹر صفر بت کی طرح بیٹھا رہتا۔ صرف بے قراری سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا اور پھر جیسے نیند میں ڈوب جاتا تھا۔ جو ایکٹر پردے کے پیچھے سے بولتے تھے ان کی آوازیں ایک کلی کے آلے کے ذریعے سے تمام ہال میں گونجتی تھیں۔ گویا پانچ چھ آوازوں والا عجیب دیو سرگوشیاں کر رہا ہے۔ ہندسوں کے دہرانے سے مطلب یہ تھا کہ مسٹر صفر کی روح روزمرہ کی بے رنگ کاروباری مصروفیت کی وجہ سے اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ اس نے خیالات کے پیدا ہونے کی طاقت اس حد سلب ہو چکی ہے کہ دفتر کے دن بھر کے کام کے علاوہ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ دل و دماغ پر اس مشین کی طرح طرز زندگی نے اس قدر قابو پا لیا ہے۔

دوسرا سین دفتر کا ہے۔ پیچھے سیاہ رنگ کے پردے لٹکے ہوئے ہیں سٹیج کے عین وسط میں ایک بہت اونچا سا ڈبل ڈیسک ہے دونوں طرف دو اونچے سٹول ہیں۔ جن پر بیٹھنے سے آدمی کے پاؤں زمین سے تین فٹ کے قریب اونچے رہتے ہیں ایک طرف مسٹر صفر بیٹھا ہے دوسری طرف ایک کام کرنے والی عورت بیٹھی ہے ڈیسک کے عین اوپر ایک لیمپ لٹک رہا ہے۔ لیمپ تو دکھائی نہیں دیتا لیکن اس میں سے جو پیلی پیلی تیز روشنی کا ایک مخروطی مینار سا نیچے ڈیسک پر پڑ رہا ہے وہ اردگرد کی تاریک فضا میں نمایاں نظر آتا ہے یہ سب سامان سٹیج کے اس حصہ پر ہے جو گھمایا جا سکتا ہے مسٹر صفر اور لڑکی دونوں نے آنکھوں پر سبز رنگ کے چھجے لگا رکھے ہیں۔ لڑکی کے سامنے بل فارموں کا ایک ڈھیر ہے ایک بل کو اٹھاتی ہے۔ رقم بلند آواز سے بول کر اس کو فائل میں لگا دیتی ہے پھر دوسرے بل کو اٹھاتی ہے اس کو بھی یونہی پڑھتی ہے غرضیکہ متواتر یہی کئے جاتی ہے۔ مسٹر صفر ہر رقم کو دہراتا ہے اور سامنے جو رقموں کی فہرست رکھی ہے اس پر نشان لگاتا جاتا ہے یہ رقمیں جس لہجے میں بولی اور دہرائی جاتی ہیں اس سے تھکن اور بے رونقی ٹپکتی ہے بیچ میں کہیں کہیں ٹھہر جاتے ہیں ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوتے مگر بغیر نظر اٹھائے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں جس سے ان کی زندگی کی مردہ ہوسوں اور شکست خوردہ امنگوں کا پتہ چلتا ہے۔ مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ مسٹر صفر کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو یہاں شاید برسوں سے اسی لڑکی کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے لیکن کبھی جی بھر کے اس کا چہرہ دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ دل میں یہ امید ہے کہ آج نہیں کل میری ترقی ہو گی آخر اتنے سالوں سے کام کر رہا ہوں مالک کمپنی سے آج تک صرف ایک مرتبہ گفتگو کا موقع ملا وہ یوں کہ ایک دفعہ میں نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور اس نے کہا کہ "نوازش" لیکن کیا ہوا آخر کبھی تو اس کو خیال آئے گا کہ یہ شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

منظر میں منظر کی سیٹی بجتی ہے۔ دن کا کام ختم ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ شطرنج پر سے اٹھتے ہیں۔ دونوں کی حالت میں اس قدر مماثلت پیدا کرنے سے صرف یہی بتانا مقصود تھا کہ ان کی زندگیاں بالکل مشین کی مانند ہو گئی ہیں۔ (لڑکی باہر چلی جاتی ہے) مسٹر صفر جانے کو اٹھتا ہے کہ مالک کمپنی اندر داخل ہوتا ہے۔ بڑے تحکم کے انداز میں پوچھتا ہے تم کو یہاں ملازم ہوئے کتنے سال ہو گئے؟ تم کیا کام کرتے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں مسٹر صفر سے کہتا ہے کہ جو کام تم یہاں کرتے ہو یعنی رقمیں جمع کرنے کا اس کے لئے ایک ایسی مشین ایجاد ہو چکی ہے جو تم سے کہیں تیز کام کرتی ہے وہ مشین میں نے منگا لی ہے اس لئے تم کل سے برخاست کئے جاتے ہو۔ یہ سب کچھ بہت تیز تیز بولتا ہے مسٹر صفر کچھ احتجاج کرتا ہے وہ نہیں سنتا۔ اس بحث کے دوران میں دونوں کی آوازیں بلند تر ہو جاتی ہیں پیچھے ٹھوس سی تختی ہے لیکن مسٹر صفر اور مالک کمپنی دونوں اس طرح چلتے ہیں کہ گویا تختی گھومتی رہتی ہے لیکن وہ دونوں اپنی جگہ پر قائم ہیں آوازیں اور بھی بلند ہوتی جاتی ہیں گفتگو اور بھی تیز ہو رہی ہے پیچھے پر سرخ اور سفید رنگ کی روشنی کبھی جلتی کبھی بجھتی ہے پردے کے پیچھے ایکٹر ڈرامائی سرگوشیاں شروع کر دیتے ہیں۔ جو لمحہ بہ لمحہ عجیب تر ہوتی جاتی ہیں۔ الفاظ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ کہیں ایک گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی ہے قسم قسم کے شور سنائی دیتے ہیں مسٹر صفر میز پر سے قلم اٹھا کر اس کے نوک دار حصے سے مالک پر حملہ کرنے کو اٹھتا ہے آوازیں اور شور اور روشنی کی چمک اور سٹیج کا گھومنا سب کچھ بہت تیز ہو گیا ہے تماشائیوں کے دل دہلنے لگتے ہیں مسٹر صفر دفعتاً اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھاتا ہے یک لخت ایک دھماکا سنائی دیتا ہے (یہ آواز پستول کے ایک خالی کارتوس سے زمین پر پیدا کی گئی تھی) اور تمام چراغ گل ہو جاتے ہیں مکمل طور پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور پھر جو دوبارہ لیمپ روشن ہوتے ہیں تو پردہ گر چکا ہوتا ہے تماشائیوں کے دل کی دھڑکن درست ہوتی ہے تو زور سے داد دیتے ہیں۔

یہ اس حیرت خانے کی ایک جھلک ہے مکمل ڈرامے کو اس تفصیل سے بیان کرنے کی ہمت اور فرصت کہاں!

(نیرنگ خیال)

پنجاب کی رہبری بجز اس کی یہی قوت نامیہ کے کوئی چیز نہیں کر سکتی۔ یوپی میں اب اردو کا ایک مسلّم معیار سا بن گیا ہے جو کبھی کبھی ایک بحث سی چھیڑ دیتا ہے اور بس۔ اب یوپی صرف اعتراض کر سکتا ہے۔ رہنمائی نہیں کر سکتا۔ اور نہیں جانتا کہ اس کا چرچا اپنا "اس کا رہبرانہ انداز" اس کی ظفاظتی تنقید بے سبب منحصر کی قابلیاں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یوں ایک خود بین بستی تو اس کے انحطاط کی خبر سنا رہی ہے لیکن یہ بھی کہ ایک نشتر زنی کی بے رحمی ہے۔ یوپی معمول کی داد کی کا خیال کرنا فضول ہے۔

اس انحطاط کے ثبوت میں کوئی سی ایسی تنقید اٹھا کے دیکھ لیجیے جو کسی یوپی کے مرتب کیے ہوئے رسالے میں چھپی ہو۔ اگر وہ تنقید دوسرے پرچے تو اتنا کے حصوں سے کچھ بحث نہیں۔ معانی کی ترتیب سے کچھ واسطہ نہیں۔ سیخ کی موزونیت سے کچھ تعلق نہیں۔ اگر نظم پر ہے تو شاعر کی نفسیت و فصاحت زیر بحث نہیں۔ اس کی جذبات زیر غور نہیں۔ اس کی ذہنی کشمکش پر نظر نہیں۔ اگر افسانہ ہے تو توازن کا ذکر نہیں۔ فضا کا احساس نہیں۔ مطلب کا شعور نہیں۔ اگر ترجمہ ہے تو فقروں کی ترتیب پر توجہ نہیں اصل سے مقابلہ کا حوصلہ نہیں۔ اجتہاد کر کے لکھنے کی استعداد نہیں۔ صرف زبان کے اعتراضات پر زور ہے۔ اس محاورے پر، اس لفظ پر، اس حرف پر، اس نقطے پر نظریں گڑی ہوئی ہیں۔ نگاہ میں یہ وسعت نہیں اور طبیعت میں یہ بلندی نہیں کہ کسی اور چیز کو بھانپ سکیں۔ یا اصل معانی کے متعلق پہلے سے وہ لفظ بھی کچھ کی توفیق پیدا کر سکیں۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کاروانِ اردو نئی منزلیں طے کر گیا۔ لیکن حضرات یوپی ہنوز "تم" اور "تک" کے پھیر میں ہیں۔ وہ زبان اردو کو شوک کا ایک مکتبہ سمجھتے ہیں۔ جو دہلی یا لکھنؤ میں منصب ہے اور جس کا تتبع ان پر بھی ضروری ہے جو جمادات کی منزل سے آگے نکل چکے ہوں۔

گزشتہ سال کے کاروان پر کئی رسائل نے زبان کے اعتراض کیے تھے لیکن ہم لوگ اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم یوپی کے حضرات کو اس شغل سے محروم نہیں کرنا چاہتے۔ اس انحطاط کے زمانے میں اب یوپی کے پاس یہی ایک کھلونا رہ گیا ہے جو چھوٹے پن کا یہ عالم ہے کہ خود اس سے کھیل نہیں سکتے اور کسی کو کھیلنے نہیں دیتے۔ بے ہنر نقادوں کا مزاج یہی رہ گیا ہے کہ جہاں پنجاب کا کوئی مضمون چھپا اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے نقطے کو ہر بڑی سے بڑی ذہنیت کے ساتھ پرکھیں۔ اہلِ قلم کی ہر قوت کو محض تذکیر و تانیث کے معیار سے ناپیں اور اس کے بعد ایک "فہرست اغلاط" مرتب کر کے فن تنقید کی گویا برات مار دیں۔ مطالب یا فن یا حسنِ بیان کی طرف ڈر کے مارے صرف کنکھیوں سے دیکھ لیں۔ اور اگر باوجود اپنی نااہلی کے مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنی بے چارگی کو "اچھا ہے" یا "خوب ہے" جیسے بے معنی فقروں سے ڈھانپ کر اپنی کم مائگی کو فہرست اغلاط کی طوالت سے پورا کرنے کی کوشش کریں یا اگر کسی ریلوے بک سٹال سے کسی انگریز لال بجھکڑ کی کوئی ارزاں کتاب مبادیات انشا کے متعلق دستیاب ہو جائے تو اس کے فرسودہ خیالات کے پیوند سے اپنی تھوڑی بہت سترپوشی کر کے یہ سمجھ بیٹھیں کہ اب ہم علم و فن کی تمام آرائشوں سے مزین ہیں۔ اور کیا مشرق اور کیا مغرب دنیا بھر کا ادب ہمارے ہی گوشۂ چشم سے کیمیا بننے کو ہماری دہلیز پر پڑا ہوا ہے۔

اگر یوپی کے سب رسالے اسی جبلت سے مرتب ہوتے تو اس مضمون کا لکھنا محض بے سود تھا۔ لیکن ان میں سے چند رسالے ایسے بھی ہیں جن کی ہر اشاعت کے ساتھ نہایت خوشگوار توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ اور جنہیں پنجاب کا ہر وہ ادب آشنا جسے اہلِ نظر کی تلاش رہتی ہے بہت شوق سے پڑھتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ایسے رسالوں کے مرتب کرنے والے بھی باوجود اپنے علم اپنے ذوق اور اپنی متانتِ طبع کے یوپی کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارا روئے سخن اس وقت ان کی طرف ہے اور ان میں سے دو رسالے خاص طور پر ایسے ہیں جن سے مخاطب ہونا خود ہمارے لیے فخر کا باعث ہے۔ ہماری مراد "علی گڑھ میگزین" اور "جامعہ" سے ہے۔

علی گڑھ کا خطہ مردم خیز خطہ ہے۔ اور اس کی زمین کا ہر ذرہ قابلِ احترام ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی ایسا شخص ہے جو تہذیبِ جدید کے ساتھ شرمانے میں پریشان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اردو زبان کو اپنے لیے روح پرور تصور کرتا ہے وہ علی گڑھ کے نام کو اسمِ اعظم اور علی گڑھ کی مطبوعات

تو اب یہ کہنا بھی بہت سعادت ہے ان کا جو سب کمال اداس کا تجزیہ بھی ہم ہیچ میرزوں کی تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔ پھر کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ یہ بات کا تجزن ان کی صلاحیت جیسے کہ بھی مٹ کر رہ جائے۔ اردو کی تقطیع کے نقطے سے بے لوث و بے غرض تفکر و تعمق سے بے نیاز ہو جائے میں۔ اس زبان دانی کا حوصلہ ہمیں صرف اس لئے ملا کہ "جامعہ" نے فہرست اغلاط میں "منزل گاہ" جیسے لفظ کو بھی شامل کر لیا اور کہہ دیا کہ "یہ ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی"۔ یہی وہ ادعا اور تیقن ہے جس کی ایک مثال سی تنقید کے اکثر ماخوں پر بھی ہوتی ہے۔ ۔۔۔ کاش کہ فاضل تنقید نگار صاحب اچھے بھلے کی طرح سلسلہ بند ہٹ کر مخلصہ تامل پر رہتے۔ اے کاش اب بھی کبھی کبھار اپنا انداز طالب علمانہ بنا لیا کریں اور خشوع و خضوع کے ساتھ یہ شعر گایا کریں ؎

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجاست　　ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

لیکن سے پڑھا بھی وہ شاید یہی کہیں گے کہ "ترکیب صحیح نہیں۔ غالباً قافیہ کی مجبوری تھی"۔

جامعہ کے جس پرچے میں کاروان پر تنقید چھپی ہے اسی نمبر میں زبان کی کئی دلچسپ غلطیاں موجود ہیں جنہیں ہم یہاں نقل کرنا سوءِ ادب سمجھتے ہیں لیکن ارباب جامعہ کا اشارہ پاتے ہی ہم ان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہیں۔

جامعہ کی تنقید کا انداز ضرورت سے زیادہ پیغمبرانہ ہے اور "عمل پیہم" اور "قومی سیرت" اور "اصلاح" مدنظر ہے اور "ہمیں خوشی ہے" اور "ہمیں امید ہے" اور اسی قسم کی آیات سے فالاً پسورۃ من تنبیہ پر عمل کرنے کی کوشش بہت نمایاں ہے لیکن چونکہ یہ انداز جامعہ کا مستقل انداز ہے، اور اس کے اغراض و مقاصد میں شامل ہے اس لئے ہمیں اس پر اعتراض کرنے کا حق غالباً حاصل نہیں تاہم اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نقد و نظر کے اعتبار سے اس تنقید کا "وزن مخصوص" بہت کم ہے اور پڑھنے والے کو اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا بجز اس احساس کے کہ تنقید نگار اپنے سینے میں دل درد مند رکھتے ہیں۔ اور یہ احساس لاریب دونوں جہان میں امت مرحومہ کے لئے "بھلائی" کا موجب ہوگا۔

"پنجابی محاورے" خاص طور پر قابل بحث ہیں۔ عالمگیر، نیرنگ خیال اور جامعہ دونوں نے ان کا ذکر کیا ہے اور کنایۃً بالکل بجا فرمایا ہے کہ یہ محاورے خطۂ پنجاب کی پیداوار ہیں۔ یہاں تک تو ہمیں ان سے پورا اتفاق ہے مثلاً پنجاب کے لوگ "مجھے جانا ہے" کی بجائے "میں نے جانا ہے" اور "میری سمجھ میں نہ آتا تھا" کی بجائے "مجھے سمجھ میں نہ آتا تھا" بولتے ہیں لیکن یہ دونوں رسالے اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جب پنجاب نے اردو کو اپنا لیا ہے تو اس قسم کے تصرفات لابدی ہیں اور جوں جوں پنجاب میں اردو ترقی کرے گی ایسے تصرفات کی تعداد بجائے کم ہونے کے اور بڑھے گی۔ اس کے ثبوت اور جواز کے لئے کسی زبان کی تاریخ ارتقاء کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے بعد اگر آپ ذرا بلند نظری سے کام لیں تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ اگر اردو کو پنجاب میں نشوونما نصیب ہوئی ہے تو ان تصرفات کے بغیر چارہ نہیں بلکہ انہی کی بدولت پنجاب میں اردو کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ اور وہ ایک اکتسابی زبان کے درجے سے ایک فطری زبان کے رتبے تک جا پہنچے گی۔ وہ وقت آن پہنچا ہے جب کہ آپ اردو لغت کی کتابوں میں لکھنؤ اور دہلی کے محاوروں کے پہلو بہ پہلو پنجاب کے محاورے بھی شامل کر لیں۔ چہ جائیکہ آپ ان کو اغلاط قرار دیں۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تو اب یہ حالت ہو چکی ہے کہ جہاں کوئی محاورہ باز "تجھے جانا ہے" کہتا ہے، پڑھے لکھے لوگ اسے ملامت کرتے ہیں کہ یہ کیا چرقناتیوں کی زبان بول رہے ہو۔ اپنا "پنجابی ڈھگوں" کی طرح باتیں کرو، ریختی مت بولو۔ کاروان کی اس اشاعت میں جناب تاثیر کی نظم کا پہلا مصرعہ ہے ؎

تو نے الفت مجھ سے کی ہے تو کرم میرے لئے

ان سے کہا گیا کہ "تو نے . . . . کی ہے" کی بجائے "تجھ کو الفت مجھ سے کی ہے" رکھ دیجئے۔ انہوں نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ "تو نے الفت مجھ سے کی ہے" میں ترنم زیادہ ہے۔ میں مصدر کے ساتھ "نے" استعمال کرتا بھی ہوں اور نہیں بھی کرتا۔ مصرعے یا جملے کے ترنم کے مطابق جہاں

پنجابی محاورے کا بھی منہ مطلب نظر آتا ہے۔ وہاں میں بحیثیت پنجابی اردو خوان کے اسے مستحسن نہ ماننا حق سمجھتا ہوں۔ یوپی کے حضرات اس حق سے محروم تھے۔
وہ مجبور ہوں تو ہوں میں مجبور نہیں۔

علی گڑھ میگزین اور جامعہ دونوں بہترین ہندوستانی تہذیب کے علمبردار اور آئینہ دار ہیں جس فضا میں یہ رسالے ترتیب پاتے ہیں۔
وہ ہندوستان کی بہترین علمی فضا ہے اور ان کے مدیر و معاون حضرات اہل پنجاب کے نزدیک واجب عجب و عقیدت ہیں۔ ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو ان حضرات سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے۔ اور جانتے ہیں کہ ان کا حسن اخلاق اور ان کی بلند نظری ہمارے نزدیک مسلم، ان کی صحبت کی یاد اگرچہ کہ وہ صحبت بہت مختصر تھی، بالیدگی روح کا موجب ہے۔ لیکن جہاں ہماری عقیدت کا یہ عالم ہے وہاں توقعات بھی کچھ کم نہیں۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ یہ دو رسالے ہندوستان بھر میں تنقید کی رہنمائی کریں گے ادب و انشا کے معاملے میں بے جا سعی قائم کریں گے جو کم از کم نصف صدی تک اس قسم کے بے محل حمایت کا کام دیں۔ صوبجاتی اور علاقائی حدود سے باہر قدم رکھ کر کل ہندوستان میں اردو کے مستقبل پر غور کریں گے اور اپنے رویے سے ایسے ایسے اصولوں کی نگہبانی کریں گے جن کی تائید ہمیشہ فرہنگ آصفیہ سے نہ ہو سکتی ہو۔ بلکہ جن کی بدولت خود فرہنگ آصفیہ رفتہ رفتہ بیکار ہو کر رہ جائے گی۔ تاکہ دنیا پر یہ ثابت ہو جائے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جو بڑھ رہی اور پھول رہی ہے
جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں پنجاب اس زبان کو اپنے خون سے سینچ رہا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اس سے اردو پر یہ کہ جیسے کہ ہمارا خون نہیں ہے۔ اور اس کے مقابلے میں بار بار ان مردہ ہڈیوں کو سراہا جائے جو مدت ہوئی بے مغز ہو چکیں۔ ہم آپ سے رہنمائی کی توقع رکھتے ہیں رہزنی کو آپ کی شان کے شایاں نہیں سمجھتے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہم نیاز مندوں کو حرف ناروا نہ کہیں گے ہم ادنیٰ عقیدت اور اپنے دلوں سے بزم اردو کی زینت کو بڑھائیں گے نہ یہ کہ قلعہ معلیٰ کے کھنڈروں پر بت بنے تکتے چلے جائیں گے۔

بقلم پطرس

ہمارے زمانے کا اُردو ادب

ترجمہ
مظفر علی سید

پطرس مرحوم نے یہ مقالہ ۱۹۴۵ء میں پی ای این کے سالانہ جلسے منعقدہ جے پور میں پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے اردو ادب کے جدید دور، یعنی اقبال کے فوراً بعد کے زمانے کو موضوع بنایا تھا۔ اور اپنے مخصوص چبھتے ہوئے انداز میں اس پر روشنی ڈالی تھی۔ اس مضمون کی اصل خوبی تو اُن کی انگریزی انشا پردازی ہے جس کا اُردو ترجمہ وہ خود ہی کرتے تو کرتے۔ زیر نظر ترجمہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگ بھی جو انگریزی سے زیادہ واقف نہیں، اُن کے اندازِ نظر، جدید اردو ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ خیال سے واقف ہو جائیں۔

چونکہ پطرس مرحوم کا اپنا تعلق اس دور کے ادب سے دوگونہ تھا۔ نئے ادیب کی حیثیت سے اور اس سے بھی زیادہ نئے ادیبوں کے استاد کی حیثیت سے، اس لئے اس مقالے کی "معروضیت" اور بھی لائق مطالعہ ہے۔ شاید عجیب معلوم ہو۔ پطرس نے اپنے نوجوان ساتھیوں کو ایک پہاڑی پہ چڑھتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کی ہے (یہ الگ بات کہ دو ایک عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں) اور اُن پر ہلکی ہلکی کنکریاں بھی پھینکی ہیں۔

ممکن ہے آپ اس مضمون کو محض تبرک سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ چند ایک ٹکڑے اس میں ہر لحاظ سے اچھے ہیں۔

گیارہ سال پہلے، جب اقبال اپنے اسلاف سے عالمِ بالا میں جا کر ملے تو دور دراز دیس کے زمانوں سے کئی ایک دوست ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ غالب اور میر، حالی، شبلی اور گرامی، حتیٰ کہ نظیری، رومی اور حافظ بھی۔ چنانچہ گفتگو روانی سے ہونے لگی۔ کچھ لمحے گومگو کی حالت میں بھی گزرے۔ مثلاً جب خودی کے مسئلے پر ایک عالمانہ بحث رومی اور اقبال کے درمیان شروع ہوئی تو باقی لوگ اونگھنے لگے اور وقفہ 'پیام' پر اقبال کی تنہا کلامی کے دوران میں تو غالب کے خراٹے بھی سنائی دیئے۔ مگر مجموعی طور پر یہ صحبت بے حد سازگار رہی۔ جانے پہچانے اقتباسات، کتابوں سے یا حافظے سے باآوازِ بلند پڑھے گئے اور شب و روز کی بے پایاں لہروں پر حکمت اور ظرافت کا ملاپ ہوتا رہا۔ بہت سے قضیے سامنے آئے اور اُن میں سے کئی ایک حل نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود

معاشرہ باقی نہیں رہا۔ وہ اپنے آپ کو ایک نئے اور ہر لحظہ بدلتے ہوئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے جس سے مربوط ہونا اس کے لئے لازم ہے۔ اگر وہ بالکل ہی کٹ کے رہ جانا نہیں چاہتا۔ وہ پوری طرح اس کا شعور نہیں رکھتا مگر یہ بات اس کو معلوم ہو چکی ہے کہ پچھلی نسل نے اس کو کچھ نہیں دیا۔ نئی دنیا میں کوئی مناسب مقام اس کو حاصل کرنا ہے۔ ماضی کی کئی چیزیں اس کو ایسا کرنے سے روکتی ہیں اور وہ ماضی مردہ باد کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس لئے نئی پود کا سب سے بڑا تقاضا بغاوت ہے، رسم و رواج کے خلاف، قوت اور اختیار کے خلاف، والدین اور پولیس کے خلاف۔ وہ قدیم انبیا اور شعرا دونوں سے دور بھاگتا ہے بلکہ ہر اُس چیز سے جو اُسے ماضی کی یاد دلائے۔ یہ جنگ کبھی کبھار دھندلی اور غیر واضح سی ہو جاتی ہے اور پرکار کے نقطے آپس میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مگر خیر ادبا تو ہر جگہ یہیں ہوتا ہے۔

اردو ادیب کو اپنے ماضی سے قطع تعلق کر کے کم سے کم ایک بڑی قربانی تو دینی پڑی ہے۔ وہ یک جنبش قلم الفاظ، تلمیحات اور علامات کے ذخیرے سے، جو فن کار مصنف کو نازک اور کارآمد ترین آلات اظہار بخشتا ہے، محروم ہو گیا ہے۔ لفظ محض چند آوازوں اور لکیروں کا نام نہیں جو مٹ جانے کے بعد پھر پیدا کی جا سکیں۔ ان میں ہمارے پیشروؤں کی جذباتی واردات اور نفسیاتی مشاہدات مضمر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک، انسانی تجربے کے طیف میں ایک خط کا حکم رکھتا ہے۔ اگر طیف کا ایک خط گم ہو جائے تو ہم اس کی جگہ دوسرا خط نہیں کھینچ سکتے۔ اسی پہلے خط کو پھر سے دریافت کرنا پڑے گا۔ آج کے لکھنے والے کو اس وجہ سے نئی چیزوں کو نئے نام دینے پڑے ہیں۔ اسے ان چیزوں کو جو پہلے معلوم و محسوس تھیں پھر سے جاننا اور پہچاننا ہے۔ ماضی سے دست بردار ہو کر اس نے اپنی تخلیقی شخصیت پر ایک بوجھ ڈال دیا ہے جس سے اس کی فنی مشکلات دوچند ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کو بیک وقت نازک اور اکھڑ، واضح اور دھندلا، گو مگو میں گرفتار اور ہزار معنوں میں مضطرب دیکھتے ہیں۔ بعض جن سے اُس نے پہلو تہی برتی تھی اب اس سے پہلو چراتے ہیں۔ دوسرے، ڈپٹی نذیر احمد نے، جو اس بات سے واقف تھے کہ زندہ زبانوں میں تلمیحات اور حوالوں کا ایک ذخیرہ مخفی ہوتا ہے جسے تعلیم یافتہ افراد اپنا کر اپنی تحریر و تقریر میں رنگ اور زور پیدا کرتے ہیں، چند سال پہلے ایک کتاب کی صورت میں انگریزی زبان کے پس منظر کا نقشہ کھینچا تھا۔ ادبی حوالوں کے زیر عنوان انھوں نے بائبل کے مستند ترجمے کا، شیکسپیئر کا اور بچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا تھا اور "انگریزی روایت" کے تحت تواریخ، معروف شخصیتوں کے القاب و خطابات اور مشہور اشتہارات گنائے تھے۔ حتیٰ کہ ایک جزو "قصے پٹے جملوں" پر بھی لکھا تھا۔ آج سے پچاس برس پہلے اسی انداز سے، اُردو کا ناک نقشہ کتنی آسانی سے بیان ہو سکتا تھا اور آج یہ کام کتنا مشکل ہے!

اردو ادیب کو یہی ایک مشکل درپیش نہیں۔ وہ دو زبانیں پڑھتا اور بولتا ہے اور جب یہ دو زبانیں اردو اور انگریزی کا سا وسیع اختلاف رکھتی ہوں تو یہ خوبی کتنی بڑی خرابی بن جاتی ہے۔ علما اور ماہرین تعلیم تاریخ اور تجربے کی مدد سے کئی ایک ناقابل تردید دلائل پیش کر کے ارشاد کریں گے کہ دو زبانوں کی مہارت بہت بڑی نعمت ہے۔ بین الاقوامیت کے قائل یہ کہیں گے کہ ہر بیرونی زبان دوگونہ رحمت ہے، اس ملک کے لئے جس کی وہ زبان ہے، اور اس کے لئے بھی جس نے اُسے اختیار کیا۔ ان کا ارشاد بجا ہے کیونکہ ہر نئی زبان ذہن میں ایک نیا دریچہ کھول دیتی ہے اور کون ہے جو روشنی کو پسند نہیں کرتا۔ انسانوں کی اکثریت کے لئے اس کے اثرات خوشگوار ہوں گے مگر افسوس کہ لکھنے والے کو اپنا دماغ ہی روشن نہیں کرنا، کچھ کام بھی کرنا ہے اظہار خیال

اس کا فرض ہے اور اس خطرہ میں کہ ایک وقت میں ایک ہی زبان کے قریب ہے۔ جیسے یقینی زبانوں سے۔ اس نے ذہنی خلا سمل کی ہو وہ جس توس کے پاس ایک ہی ہے۔ ایک دیکھیے ہے تو دوسرا سرخ کا ذہن ہے یہ دونوں [illegible] سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اور ایک دوسرے سے جدا نہیں رہ سکتے۔ [illegible] ایک تیسرے [illegible] حقیقی [illegible] رکھتے ہیں جو ایسے کے پاس ذرا زیادہ سبز ہے اور دوسرے کے پاس ذرا زیادہ سرخ مگر نہ تو کہیں پوری طرح سبز ہے اور نہ پوری طرح سرخ۔ یہ لطیف [illegible] سرا روشنی اس کے لیے باعث نشاط بھی ہو سکتی ہے اور باعث فخر بھی۔ مگر اس میں یہ [illegible] سبز یا سرخ علاقوں سے اپنے اصلی رنگ میں کرانا کتنا مشکل ہوگا۔ بات کو طول دینے سے کیا فائدہ درست ہے کہ دو زبانی ادیب اپنے دل کی بات سیدھے نہیں کہہ سکتا ہے۔ دونوں زبانیں استعمال کرے۔ [illegible] صورت میں بھی [illegible] ہے۔ اس کا ذہن کسی واضح شکل میں ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ [illegible] کی دو لہریں یکے بعد دیگرے ابھرتی ڈوبتی دکھائی دیتی ہیں۔ اگر اس کو ایک زبان کا پابند کر دیا جائے اور پوری بات کہنے کی مجبوری بھی ہو تو مبہم اور بے ربط مہمل قسم کی گفتگو سننے میں آنے لگی۔ اس کی تحریری گرفت میں آپ کو عجیب قسم کے تم دیکھ نظر آئیں گے اور ابہام و اشکال کی کئی صورتیں ملیں گی اور سب سے بڑھ کر انگریزی ساخت کے جملے جو اصل اردو میں ملبوس دکھائی دیں گے جن کو دونوں زبانوں کے ماہر ہی سمجھ سکیں گے۔ زبان ایک نازک اور لطیف آلۂ اظہار ہے جسے فن کار بڑی مہارت سے برتتا ہے۔ مگر یہ دخیل زبان معنی کے گرد طواف کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی اور کہنے سے اشاروں سے زیادہ تامل فہم نہیں ہوتی۔ لفظ اپنے معنوں کو ساتھ لے کے نہیں چلتے بلکہ محض دور سے ان کی طرف اشارہ کر کے رہ جاتے ہیں۔ جب احساس شکست قوی ہو جاتا ہے تو دو رخا ادیب اردو کو چھوڑ کے انگریزی میں لکھنے لگ جاتا ہے مگر علاقہ سبز ہو یا سرخ، مسئلہ جوں کا توں رہتا ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہمارا ادیب اپنے آپ کو ایک نئے معاشرے میں گھرا ہوا دیکھتا ہے۔ یہ معاشرہ اس کے فہم و تعقیب کی حدوں سے بڑھ کر وسیع اور پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ جس نے اسلاف کے تجربے [illegible] سے [illegible] ہے۔ اور اسی وسیع و عریض حقیقت سے اس کو موافقت پیدا کرنا ہے تاکہ تکمیل اور استحکام حاصل ہو۔ جب تک یہ موافقت پوری نہیں ہوتی وہ بڑے پر جوش اضطراب کے ساتھ کسی نہ کسی طرز کی محفل بنا کے بیٹھ جائے۔ اسی اضطراب کی وجہ سے اس زمانے کے اکثر ادیب کسی نہ کسی انجمن یا حلقے سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی تصانیف پر دیباچے اور پیش لفظ لکھتے رہتے ہیں۔ آج سے پہلے شاید ہی کبھی ہمارے ادیبوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑنے، محفلیں، انجمنیں اور حلقے بنانے کی ضرورت محسوس کی ہو۔ یہ ادارے کتنی ہی سنجیدگی اور خلوص سے کیوں نہ وجود میں آئے ہوں، معاشرہ سازی کی جعلی اور مصنوعی کوششوں کا نتیجہ ہیں اور ادیب کو ان آسائشوں اور راحتوں کی قیمت اپنے تخلیقی جوہر سے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ان غیر واضح قسم کی حرکتوں سے اس کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کے "کل" کو پالے اور چونکہ بیرون خانہ سے اس کا رابطہ قائم نہیں ہوا۔ اس کو درون خانہ میں تلاش و تجسس سے کام لینا پڑتا ہے۔ مگر اس تلاش کے دوران میں زندگی کا کاروبار ملتوی ہوتا رہتا ہے اور جب تک کوئی زرخیز زمین نہ ملے۔ زندگی کا رس خشک ہو جاتا ہے۔

پی۔ ای۔ این کی سترھویں سالانہ مجلس میں تقریر کرتے ہوئے آرتھر کیسلر نے بتایا تھا کہ تورگنیف کیسے لکھتا تھا۔ اپنے پیروں کو گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے ہوئے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا تھا۔ یہ گرم پانی کی بالٹی، کیسلر کے نزدیک الہام یا تخلیقی سرچشمے سے عبارت تھی اور کھلی کھڑکی سے مراد باہر کی دنیا تھی جو فن کار کے لیے خام مواد کا کام دیتی ہے۔ کیسلر نے

کچھ عصمت چغتائی کے بارے میں

عصمت چغتائی نے افسانے میں ایک لڑکی دوسری کے متعلق کہتی ہے کہ: "حمیدہ موٹی تھی تو کیا، مگر وہ تو صرف زیادہ کھاتی تھی بے چاری۔ لوگ جسم دیکھتے ہیں۔ نہیں دیکھتے جی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے۔" جب میں نے عصمت کی کلیاں اور چوٹیں دونوں مجموعے ختم کر لئے اور جو چند دیباچے اور مضامین ان کے مداحین اور معترضین نے ان پر ازرہ تنقید و تعارف لکھے ہیں ان سے بھی سب ہو چکا تو استعجاب کے رنگ میں یہ فقرہ پھر یاد آیا: "لوگ جسم دیکھتے ہیں۔ نہیں دیکھتے دل بھی کیسا ہر وقت خراب رہتا ہے:"

اس فقرے کے معانی کو کھینچ تان کر پھیلا لیجئے اور اس پر تھوڑا سا فلسفیانہ رنگ چڑھا دیجئے، تو عصمت کے بعض کمالات اور نقادوں کی بعض کوتاہیوں کا بیان ہو جائے گا۔ عصمت صاحبہ کا مذاق آپ ہے وہ حال ذہنی کا ہے وہی حال کی اور معروف اور متداول لیبلوں کا ہے جو مستعمل الفاظ اور عادات مستمرہ کی شکل میں قسم قسم کی شیار پر چپکے نظر آتے ہیں۔ ذہنی کسالت اور خوف اور بزدلی کے مارے ہم اکثر انہیں لیبلوں پر تو دیکھ کر صاد کر دیتے ہیں۔ ان سے آگے نکل کر اصل چیز کو جانچنے اور تولنے کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پاتے۔ مثلاً اور عشق پر دل گدازی کا لیبل مدت سے لگا ہوا ہے اس لئے جہاں ان کا ذکر کیجئے، پڑھنے والے دونوں ایسے ملفوظ سامع پاکیزہ رقت کے لئے پہلے ہی سے تیار ہو بیٹھتے ہیں۔ جنسی مشاغل تحقیق کرسی کی طرف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان بیزار کن یا اخلاقی تخیلات کے بعض لوگ برہم ہو جاتے ہیں۔ بہن بھائیوں کا سا پیار رکھنا چاہئے۔ کہ پاک محبت کا سب سے اونچا درجہ ہے لہٰذا بہن بھائی کے درمیان جو اس جذبۂ عالیہ کے سوا اور تعلق کی گنجائش ناممکن یا کم از کم نامناسب ضرور سمجھی جاتی ہے۔ عصمت چغتائی کے رہنما بھی اگر عاد حسنہ ایسے ہی کچھ ہوتے تو ادب ان کی بہترین انشا سے محروم رہ جاتا لیکن ان کی طبیعت اس سے کہیں زیادہ دور رس ہے۔ وہ لیبلوں کے فریب میں نہیں آتیں اور جسم اور دل اور دماغ کی کچی کیفیتیں سیتی ہیں جن سے وہ اکیلے میں دو چار ہوتے نہیں گھبراتیں۔ ایسے انشا پرداز کا بغیر حوصلہ مشاہدہ، دقت نظر اور جرات بیان کے گذارا نہیں۔ اور یہ ادب کی خوش قسمتی ہے کہ عصمت کو یہ تینوں نعمتیں میسر ہیں۔

برخلاف اس کے احساس محرومی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس جرات اور دقت نظر میں سے عصمت کے نقادوں کو حصہ وافر نہیں ملا۔ ابھی ذرا ان کا ذکر جانے دیجئے جن کو عصمت کی تحریروں میں اپنے اخلاق اور ادب دونوں کی تباہی نظر آتی ہے وہ تو ان لوگوں میں سے ہیں جن کے لیبل گوند سے چپکے ہوئے نہیں کیلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے ذہنوں میں ایک موٹی موٹی لکیروں والی جدول بنا رکھی ہے کہ ان چیزوں کا ذکر حلال ہے ان کا حرام ہے۔ نامحرم کا ذکر ہم مقرر کر چکے ہیں کہ فحش ہے۔ محرم کا ذکر معاملہ بندی ہے یعنی جائز ہے۔ حرام کا کچھ ذکر تو منظور ہے تو ہو جائے، ہمارے ادب کو منظور نہیں۔ اور یہ نفرت کا مطالعہ؟ محض ایک ڈھونگ! آوارہ مزاجی کا عذر آوارگی! ہمیں بچپن میں مطالعہ پر کوئی مجبور نہ کر سکا تو اب کسی کی

کیا حال ہے؟ ہم جب بھی کھلونوں سے دل بہلاتے تھے اب بھی کھلونوں سے دل بہلائیں گے ... ایسے لوگوں سے اس وقت بحث نہیں کیونکہ ؎

وہ وہاں ہیں جہاں سے ان کو بھی
کچھ ان کی خبر نہیں آتی

شکایت ان سے ہے ——— اور اپنوں کی شکایت ہے، بیگانوں کی سی نہیں ——— جو عصمت چغتائی کے تعریف اور مدح میں ان کے مضامین کو پڑھ کر روح میں ایک بالیدگی محسوس کرتے ہیں جس سے دل میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ قدم بہ قدم گرد ہو کر بیلوں زینے کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ افسوس کہ عصمت مرد نہیں اور افسوس کہ لیبلوں میں سے سب سے بڑا اور قرار کن لیبل عورت ہے۔ مرد ذات کے قرابت کے خرابیوں اور محرومیوں سے چپکا ہوا۔ عورت دلفریب ہے، مکار ہے، صنف نازک ہے، ایک معمہ ہے، کمزور ہے، کم عقل* ہے، مجموعۂ اضداد ہے ... جہاں آپ نے عورت کا نام لیا، ان میں سے دو چار گھڑے گھڑائے معنی ذہن الم کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ اسی فریب میں آکر ایک مہنا اور میں دیباچہ نویس فرماتے ہیں:-

"عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پُرپیچ اور شوخ نگار نظر آتے ہیں میں شاعری نہیں کر رہا اور اگر اس بات میں شاعری ہے تو اسی حد تک جہاں تک شاعری کو کسی بات میں دخل ہوتا ہے مجھے یہ افسانے اس جوہر سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے۔ اس کے باطن میں ہے"

اب نہ معلوم اس نوجوان نقاد کے تصور نے عورت کا لیبل کس قسم کی چیزوں پر لگا رکھا ہے۔ یہ معلوم ہوتا تو وہ جوہر بھی کھلتا جو بہ قول ان کے عصمت کے افسانوں میں ہے لیکن ان کے رنگین تصورات و مفروضات کے خلوت کدہ میں ہمیں کیونکر باریابی ہو سکتی ہے اور کوئی ایسی ڈکشنری بھی نہیں جس میں عورت کے وہ معنی مل جائیں جو اس تنقید کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔ دیباچے کا مقطع ہے:-

"عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ دیباچہ بھی اسی خفت کو مٹانے کا ایک نتیجہ ہے۔"

لیجئے۔ عورت کے ایک دوسرے تصور سے پھر ہمارے عزیز کی ناقدانہ نظر بہک گئی۔ دکھانے تو چلے تھے عصمت کے افسانوں کا جوہر لیکن آخر میں کہہ گئے کہ یہ عورت ناقص العقل جانور ہے ڈاکٹر جانسن کے کتے کی طرح کہ دو ٹانگوں کے بل کھڑا ہو جائے تو تعجب و تحسین ہی کا نہیں بلکہ ہم انسانوں (یعنی مردوں) کے لئے شرم و ندامت کا موجب ہے۔

ایک اور مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس نے بھی معلوم ہوتا ہے انشا پردازوں کے ریوڑ میں نر اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اپنی جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش انہیں وہی مرتبہ حاصل ہے جو ایک زمانہ میں اردو ادب میں جارج ایلیٹ کو نصیب ہوا" گویا ادب بھی کوئی ٹینس کا ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے میچ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ جارج ایلیٹ کا رتبہ مسلم۔ لیکن لیلیٰ اس کا نام لے دینے سے تنگ ہی ملا اور بہ جیوں تو کوئی کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا محتاج ہے کہ کیا کوئی مابہ الامتیاز ایسا ہے ——— خارجی اور ہنگامی اور اتفاقی نہیں، بلکہ داخلی اور جبلی اور بنیادی۔ جو انشا پرداز عورتوں کے ادب کو انشا پرداز مردوں کے ادب سے ممیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ بھی ہو، بہر حال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنا پر مصنفین کو "جنس کے اعتبار سے" الگ الگ مرتبوں میں کھڑا کیا جائے۔

کچھ ایسی ہی بے تکلفی و روانی سے علاوہ ان افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں عصمت نے ان جدید نما چمکیلے رنگوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ایسے افسانوں میں نہ پلاٹ کی چولیں ٹھیک بیٹھتی ہیں نہ ذہنی کرداروں کا نقشہ ہی درست ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی میگزینوں میں سے کہانیوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر جوڑے ہیں۔ اور پیشہ ور افسانہ نویسوں کی طرح رسمی رومان کا رنگ دے کر جھوٹ موٹ ایک بات بنائی ہے۔ "پکنک" اور "شادی" پڑھ کر دل پر یہی اثر ہوتا ہے۔ اور "ہیرا بچہ" میں تو برنارڈ شا کے "آرمز اینڈ دی مین" کے پچھلے سین پر کچھ اس طرح سے ہاتھ صاف کیا ہے کہ شبہ کی گنجائش نہیں۔

بسیلیا اور یلی اور مخنون، اور پارٹیوں کی دنیا عصمت کی دنیا نہیں۔ اس میں وہ محض بہتی ہیں اس کی تہ کو وہ جب پہنچیں گی تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ان کی دنیا وہی ہے جو ان کے بہترین افسانوں یعنی جوانی، ڈائن، نیرا، چھل بھلیاں، ساس، بیمار اور تل میں پائی جاتی ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں عورتیں پردے کے پیچھے سے فقرے چست کرتی ہیں جس میں زینوں پر اور دیواروں کی آڑ میں آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے۔ جس میں نوابوں نے پلنگوں پر چھپکلیاں رکھی ہیں۔ مہترانیوں کی جوانی بہو بیگموں کو پریشان کرتی ہیں۔ لڑکیاں گھر بیٹھی پھرتی ہیں۔ وہ دنیا میں ڈبکیاں لگاتی ہیں جس میں کلبلاتے بچے ماں کے پیٹ سے چھپکلی کی طرح چپکے ہوئے چوپٹ پر منہ مارتے ہیں۔ اس کے گرد و پیش میں وہ اس بے تکلفی اور احساس ہم آہنگی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں کہ اسی کا ایک جزو معلوم ہوتی ہیں چنانچہ وہ کس سہولت کے ساتھ دو ہی چار خط کھینچ کر اس دنیا کو کاغذ پر لے آتی ہیں۔ عصمت کے بہترین افسانوں میں آپ کو فضا اور ماحول کے لمبے لمبے پر تکلف ڈسکرپشن (DESCRIPTION) کہیں نہ ملیں گے۔ لیکن جو بات ہے وہ ایسے پتے کی ہے کہ اختصار سے تشنگی اور خلا کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ "ساس" کے شروع کے فقرے لیجئے۔۔۔

> "سورج کچھ ایسے زاویے پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے ٹھرے ہی پر روشنی پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔ تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رخ سے گھسیٹی اور اب پھر پٹی پر دھوپ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم قدموں کی آواز چھت پر سے آئی۔ "خدا غارت کرے پیاری بیٹیوں کو" ساس نے بے حیا بہو کو کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی تھی۔ "دنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کاہے کو جئے۔ اے لو دوپہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر۔ ذرا ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آ پہنچا۔ پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔"

اتنے تھوڑے سے الفاظ میں اس سے زیادہ کوئی کیا رنگ بھرے گا اور رنگ بھی ایسے کہ نہ ضرورت سے زیادہ شوخ نہ ضرورت سے زیادہ مدہم۔ یہی حال "نیرا" میں کے ایک ٹکڑے کا ہے۔

> جھولے تال سے گذر کر پیاپے ہوتے ہوئے دونوں ننھے منے بیوپاری شہر کی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کم بخت جاڑا قواب کے ایسا دانت پیس کر پیچھے پڑا تھا کہ نرم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ گرمی تو جیسے تیسے کٹ جاتی ہے۔ چاہو جتنا نہاؤ، پیاؤ پر سے ٹھنڈا پانی جتنا چاہو پی لو۔ نہ کپڑوں کی ضرورت نہ کچھ۔ رہ کو تو دھوتی کا بھی مرہون منت نہ ہونا پڑتا تھا۔ یاد سوت کا ڈورا جو اس کے کچوری جیسے پیٹ پر سے پھسل کر کولہے کی ہڈیوں پر رہتے

گانو میں خبر ہوئی۔ ان بچاروں کو جوار باجرے کی روٹی اور دال ساگ کے سوائے کچھ بہتر نہیں مگر مولوی صاحب کے لئے جورو کی نتھنی بکے تو بکے اور پانی پینے کی لٹیا گروی ہو تو ہو [illegible] ایک چونہ شام۔ گیہوں کی چپاتیاں۔ دودھ جتنا پیا جاے۔ گھی جس قدر [illegible] چیزوں کی جیسے بوٹنٹ ہوئے ہ ساول ہوئی کچھ کمی نہیں۔ پئے دودھ اور کھائے [illegible] گانو کی تازی شفاف ہوا ستھرا ہاضم پانی۔ بے فکری اور گانو والوں کی آؤ بھگت [illegible] ورونق نکلا کہ لوٹ کر آئے تو گھر کی بی بی نے پہچان تو لیا مگر ذری دیر کے بعد۔ اور ایک دورہ لعنۃ بزیہج ہمارا ہو کہ گھر برس رہا ہو [illegible] نہ باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا مگر ڈبل کوچ سرحد سولہ ہو پندرہ میل سے سفر کم کرو تو بھتے [illegible] میں سوانے کے تین مقدمے فیصل کرنے ہیں۔ دوران زیادہ دن کا ہو گیا [illegible] ماہی میں وجہ تعویق گھڑانی پڑتی ہو۔ [illegible] روبکار پیر روبکار چلے آتے ہیں۔ مجبور دو بسکٹ کھا اوپر سے چاے کی پیالی پی لہذیے کا منتے سوار ہوئے۔ سمجھتے تھے کہ کھانے کو ناوقت تو ضرور ہوگا مگر خیر دو بجتے بجتے خیمے میں جا داخل ہوں گے۔ یہاں پہلے ہی مقدمے میں دو پہر ہو گئی [illegible] دھمکایا بھی مگر زمین دار کم بخت پچے چپے زمین پر جان دیئے دیتے ہیں۔ مختاروں نے کہا تم الگ [illegible] کو سمجھاؤ مختار۔ بہت خوب جیسا ارشاد۔ حضور کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ہمارا فریق تو راضی ہو فریق ثانی ناحق کی ضد کر رہے ہیں۔ حضور ذرا تامل کریں میں اپنے لوگوں [illegible] ابھی راضی نامہ لکھوا کر لاتا ہوں۔ یہاں تو یہ کہہ کر گیا اور الگ جا کر خدا جانے ظالم نے کیا پٹی پڑھائی کہ اسی کا فریق بتے سے اُکھڑا ہوا تھا۔ روح پر [illegible] قدر صدمہ ہوتا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ موذی واقعات کا انکار کر رہے ہیں [illegible] ماہی اور ضبط کرنا پڑتا ہی۔ جبھی سے غلطی ہوئی۔ حاکمانہ فیصلہ کر دیتا تو ہرگز اتنی دیر [illegible] میں نے چاہا رضامندی سے فیصلہ کرنا کہ اپیل نہ کر سکیں۔ غرض ایک ہی مقدمے [illegible] سارا دن گھُل گیا۔ ٹھیک دو پہر کو لوگ ذرا کی ذرا دم لینے چمپنا کرتے اور

سلہ پچھ [illegible] دار چنوں کے درخت ۱۲ سلہ گانو کی سرحد کو سوانہ کہتے ہیں ۱۲

سے شک ہوتا تھا مروت سے زیادہ تھا۔ دسترے تلے میں ڈبکی لگائی، کناروں پر کرائیں بیٹھ گئے اور لمبے چھپاکوں سے سوکھ گئے۔

اور مسرت سے بھی مختصر یہ کہ:۔

زندگی بتمامہ باتیں بھیجتے کٹتے گئیں۔ پھر لائی دونیاں اندوختہ بہ مشکل حاصل کرنے کے لئے سارے گھر کا دن بھر تپسیہ میرے کھیت میں بیتتے گذر جاتی۔ پھر گھاس چھیل لاتی، بھینسوں کو بھی دن سے اور دودھ چرانا شروع کر دیا کرتی۔ سمجھا جاتا کہ بچی باؤس میں ہی ایک تھنبا ہو گئی۔ دوسری بیاہنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ بھینس جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو پتہ بھی نہیں چلتا۔ نہ اس کی کمر جھکے نہ بال چوڑی ہوں۔

ان اقتباسات میں پانچ پانچ چھ چھ فقرے ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کو یہاں نقل بھی کر دیا ورنہ اسی قسم کے ایک دو فقروں کے نمونے تو کئی جگہ ہیں۔

یہ دنیا بیشتر مفلسوں اور اکھڑوں کی دنیا ہے۔ بہ حال امیروں، نفاست پسندوں اور تراشیدہ لوگوں کی دنیا نہیں۔ اس میں فاقے ہیں غلیظیں ہیں (اور غلاظتوں کا حال عصمت کتنی برہم ہو کر اور بچی کے مزے لے لے کر بیان کرتی ہیں) جہالتیں ہیں، جذباتیاں ہیں، بدکاریاں ہیں، بیماریاں ہیں ڈھیروں بچے ہیں، لیکن پھر بھی ان میں زندگی کا ایک حلقہ ہے جو دبائے نہیں دبتا، امنگیں ابھرتی ہیں، جوانی اپنے نشے دکھاتی ہے، ذہن میں شرارتیں چٹکیاں لیتی ہیں۔ اور نفسِ انسانی کا پہلوان زور آزمائی کرتا ہے جن افسانوں کو میں نے بحث کے لئے منتخب کیا ہے ان میں آپ کو بہت بڑی جدت یا بہت پرمعنی گہرائی نظر آئے گی۔ عمیق امن، خاموش آسودگی یا مسرت عالیہ کہیں نہ ملے گی۔ نہ وہ حزن ملال ہی ملے گا جو کہر کی طرح دل پر جم جاتا ہے۔ اس میں ٹریجیڈی کی کوشش ہے نہ کامیڈی کی۔ لیکن انسانی خون آپ کو رگوں میں دوڑتا نظر آئے گا۔ اس طرح دوڑتا ہے جیسے پہاڑی ندی کا پانی دوڑتا ہے، لبالب اور ابلتا ہوا اور ٹکراتا ہوا اور رستہ چیرتا ہوا۔

ان افسانوں کا موضوع کیا ہے۔ اگلے وقتوں کے لوگ ان افسانوں کو (اگر ایسے افسانے انہیں ہاتھ آتے تو) عشقیہ افسانے یا عشقیہ افسانے ہی سمجھ لیتے۔ لیکن عشق کے معنی اس قدر پھیل چکے ہیں کہ عشقیہ سے یہاں کام نہ چلے گا۔ لیلےٰ مجنوں کا عشق، صوفیوں کا عشق، غزالوں کا عشق، فلموں کا عشق، امرد پرستوں کا عشق۔ سبھی طرح کے عشق ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں اور ہر ایک کا مزاج جدا ہے۔ اس لئے عشق کے لفظ سے نہ جانے کہنے والے کا مفہوم کیا ہو، اور سننے والے کیا سمجھ بیٹھیں۔ جنسی بھوک پر مجھے کوئی خاص اعتراض نہیں، لیکن محض اس سے بھی بات نہیں بنتی۔ کیونکہ جنسی بھوک تو دانتے کی بیاٹرس سے لے کر کتے کتیا تک سبھی کو لگتی ہے۔ عصمت کے افسانوں میں جو جذبہ مرد عورت کو ایک دوسرے کی طرف کھینچتا ہے اس کی کسی قدر اور تخصیص کرنی چاہئے۔ ایک بات تو ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اس جذبے میں شاعرانہ لطافتوں کی رنگینی نہیں پائی جاتی۔ اس کا رومان سے کوئی تعلق نہیں۔ عصمت کے کسی افسانے میں مرد یا عورت کے حسن کا کبھی ذکر نہیں آتا۔ کیونکہ جو جذبہ ان کے پیش نظر ہے اس کی تحریک کے لئے حسن کی ضرورت نہیں۔ یہ محض خون کی تاریک حرارت اور جسم کی جھلسا دینے والی گرمی سے پیدا ہوتا ہے اور جب انسان کے جسم میں یہ آگ لگتی ہے تو وہ کبھی اس کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ اس آگ سے کوئی پیچیدہ نفسیاتی مسئلے پیدا نہیں ہوتے۔ صرف تند و تیز شراب کا سا نشہ [illegible] روئیں میں

مضمون ختم کرنے سے پہلے دو ایک باتیں عصمت کی زبان کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں کیونکہ ان کے طنزی مذاق میں بھی ہمارے لئے ایک ہدایت ہے۔ عصمت کی انشا پر فارسی اور عربی کا اثر بہ نسبت اور ادیبوں کے بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور یہ بے نیازی الفاظ تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ترکیبوں، بندشوں کی ساخت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کی تحریر بڑی ایک حد تک اس مصنوعی نقالی کے انگریزی تراکیب اور انگریزی اسالیب خیال سے بھی پاک ہے۔ اس زمانے کے اکثر انشا پردازوں کو بوجہ اپنی تعلیم یا ماحول کے اس سے مفر نہیں کہ ان کے کلام میں وقتاً فوقتاً انگریزی کے شُر بھی سنائی دے جائیں۔ اردو میں مغربی تلمیحات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ چنانچہ عام مصنفوں میں بھی اور کچھ نہیں تو ترجمہ شدہ ترکیبوں کی گتھیاں تو کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ عصمت انگریزی کے خیروشر دونوں سے مبرّا ہیں۔ یہ تو بتانا مشکل ہے کہ وہ کیا لطف ہے جو ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا اور سو باکہ اسی کی وجہ سے پیدا نہ ہوا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس کی بدولت نہ لکھنؤ اور دلی کے بہت سے ایسے الفاظ کام میں لے آئی ہیں جو آج تک پردے سے باہر نہ نکلے تھے۔ اور جن کو اب انہوں نے نئے نئے مطالب کے اظہار کے قابل بنا دیا ہے۔ گویا ہمارے اردو انشا کو ایک نئی جوانی نصیب ہوئی۔ اور پردہ نشین الفاظ کو تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ عصمت کے فقروں میں بول چال کی سی لطافت اور روانی ہے۔ اور جملوں کا زیروبم روزمرہ کا سا گھریلو تیا ہوا زیر و بم ہے۔ اس لئے ان کے فقروں کا سانس کبھی نہیں پھولتا۔ اور ان میں ثقالت اور تکلف نہیں آنے پاتے۔ مختصر یہ کہ الفاظ کے انتخاب اور فقروں کی ساخت ان دونوں رستوں سے وہ انشا کی زبان کو زندگی کے قریب تر لے آئی ہیں۔ جس کے لئے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیئے۔ اس نیک کام میں عصمت کے علاوہ چند اور قابل قدر اہلِ زبان انشا پرداز بھی شریک ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ کام اہلِ زبان کے سوا کسی دوسرے کے لئے کچھ ایسا آسان بھی نہیں لیکن عصمت کے احسان کا بوجھ کچھ اس وجہ سے ہلکا نہیں ہو جاتا۔

عصمت کوئی قدآور ادیب نہیں۔ اردو ادب میں جو امتیاز ان کو حاصل ہے۔ اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔ اور یہ مضمون بنیادی خود اس امتیاز کا اعتراف ہے۔ لیکن بھول نہ جانا چاہیئے کہ ہمارا افسانہ ابھی سنِ رشد یا سنِ بلوغ کو نہیں پہنچا۔ آج کل جبکہ نظروں کو وسعت نصیب ہو رہی ہے۔ اور دنیا بھر کا ادب کتاب کی طرح ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ اردو ادب کے قدردانوں میں یہ حوصلہ پیدا ہونا چاہیئے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے ادب کا دنیا کے بہترین ادب سے مقابلہ کرتے رہیں۔ تاکہ تناسب کا احساس کند نہ ہونے پائے۔ مقامی تعصبات کی حقیقت واضح ہوتی رہے اور دل میں امنگ پیدا ہو۔ ہمارے ادب جدید کے پات نئے نئے چکنے چکنے ہیں۔ لیکن اس میں ابھی بڑے بڑے پھول نہیں لگے۔ یا تنی حد بندی کر لینے کے بعد ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہونا چاہیئے کہ عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعثِ فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اس کارنامے کے لئے اردو خوانوں ہی کو نہیں بلکہ اردو کے ادیبوں کو بھی ان کا ممنون ہونا چاہیئے۔

(ساقی دہلی فروری ۴۵ء)

ہیبت ناک افسانے

"ہیبت ناک افسانے" کا پیکٹ جب یہاں پہنچا میں گھر پر موجود نہ تھا۔ میری عدم موجودگی میں چند انگریز احباب نے جو کتابوں اور اشیائے خوردنی کے معاملے میں ہر قسم کی بے تکلفی کو جائز سمجھتے ہیں۔ پیکٹ کھول لیا۔ یہ دوست اردو بالکل نہیں جانتے۔ بجز چند ایسے کلموں کے جو غصے یا رنج کی حالت میں وقتاً فوقتاً میری زبان سے نکل جاتے ہیں اور جو بار بار سننے کی وجہ سے انھیں یاد ہو گئے ہیں۔ اردو تحریر میں ان کی قابلیت یہیں تک محدود ہے۔ تحریر میں اخبار "انقلاب" کا نام پہچان لیتے ہیں۔ وہ بھی اگر خط طغری میں لکھا گیا ہو۔ چنانچہ جب واپس پہنچا تو ہر ایک نے محض کتاب کی وضع قطع دیکھ کر اپنی اپنی رائے قائم کر رکھی تھی۔ سرورق پر جو کھوپری کی تصویر بنی ہوئی ہے اس سے ایک صاحب نے یہ اندازہ لگایا کہ کتاب

یہ بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

سے متعلق ہے۔ ایشیا کے ادیب (عمر خیام۔ گوتم بدھ وغیرہ) اکثر اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب سمجھے کہ فن جراحی کے متعلق کوئی تصنیف ہے۔ ایک بوڑھے جادو کی کتاب معلوم ہوتی ہے (ہندوستان کے مداریوں کا بیان بڑا مشہور ہے) ایک خاتون نے کتاب کی سرخ رنگت دیکھ کر بالشویکی شبہات قائم کر لئے۔

میں نے کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ گو یہ سب کی سب کہانیاں میں پہلے انگریزی میں پڑھ چکا ہوں۔ اور ان میں سے اکثر زاہم کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے خود امتیاز سے سن چکا ہوں۔ وہ مختلف قسم کی دلفریبیاں جو مجھے کبھی کسی تصنیف کو مسلسل پڑھنے پر مجبور کر سکتی ہیں سب کی سب یہاں یکجا تھیں۔ کتابت ایسی شگفتہ کہ نظر کو ذرا الجھن نہ ہو۔ تحریر میں وہ سلاست اور روانی کہ طبیعت پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ اور پھر امتیاز کے نام میں وہ جادو جس سے ہندوستان یا انگلستان میں کہیں بھی مفر نہ ہو۔

یہ کتاب تیرہ ہیبتناک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے مصنف کا دعا یہ تھا کہ پڑھنے والوں کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور ہر افسانے میں درد و کرب خوف و دہشت یا پھر مرگ و ابتلا کی ایسی خونیں تصویر کھینچی جائے کہ بدن پر ایک سنسنی سی طاری ہو جائے۔ ایڈگر ایلن پو کے پڑھنے والے ایسے افسانوں سے بخوبی آشنا ہوں گے۔ حق تو یہ ہے کہ پو ہی اس فن کا استاد تھا اور یہ جو آجکل اس صنف ادب کی کثرت فرانس میں نظر آتی ہے عجب نہیں کہ اس کا بیشتر حصہ پو ہی کی بدولت ہو۔ کیونکہ فرانس کی ادبیات پر پو کا اثر

مسلّم ہے اور ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو۔ جو کسی نہ کسی صورت میں اس نے اپنا رنگ نہ پھیر رکھا ہو۔ پیرس میں ایک خاص تھیٹر اسی بات کے لئے وقف ہے کہ اس میں دہشت انگیز کھیل دکھائے جائیں۔ اس کمپنی نے اس قسم کے ڈراموں کا اچھا خاصا مجموعہ جمع کر رکھا ہے۔ تھیٹر کی ڈیوڑھی میں چیدہ چیدہ ڈراموں کے مشہور مناظر کی تصاویر آویزاں ہیں۔ کہیں کوئی بدنصیب موت کی آخری انگڑائیاں لے رہا ہے۔ چہرہ تنا ہوا ہے اور آنکھیں باہر کو ابلی پڑتی ہیں۔ کہیں کوئی سنگدل کسی حسینہ کی آنکھیں نکال رہا ہے۔ بائیں ہاتھ سے گردن دبوچے ہوئے ہے۔ دائیں ہاتھ میں خون آلود چھری ہے اور لڑکی کی آنکھوں سے لہو کی دھاریں بہہ رہی ہیں۔ کھیل کو ہیبت ناک بنانے کے لئے جو تدابیر بھی ذہن میں آسکتی ہیں ان سب پر عمل کیا جاتا ہے۔ ایکٹر اپنی شکل و شباہت اپنی آواز اور اپنی حرکات کے ذریعے ایک خون سے کانپتی ہوئی فضا پیدا کر لیتے ہیں۔ پردہ اٹھنے سے پہلے ہی گھنٹی نہیں بجائی جاتی بلکہ چراغ گل کر کے لکڑی کے تختے پر دستک دی جاتی ہے۔ اس سے ہیبت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اس بات میں بحث کی گنجائش نہیں کہ درد و کرب یا خوف و دہشت کے مناظر یا افسانوں سے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہ فقرہ بظاہر خود اپنی تردید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو درد کہا جائے اس سے خوشی کیسے حاصل ہوگی۔ لیکن یہ ہمارے متداول الفاظ کی کم مائیگی کا نتیجہ ہے۔ اصل خیال کو جو اس فقرہ سے ظاہر کیا گیا ہے الفاظ کے اس گورکھ دھندے سے باہر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی وجہ سے بعض ماہرین نفسیات دکھ، درد، کرب وغیرہ اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے مجتنب رہتے ہیں کیونکہ وہ کب کے اس نتیجے پر پہونچ چکے ہیں کہ بہت سی ایسی کیفیات جن کو ہم عام زبان میں دکھ، درد وغیرہ سے موسوم کرتے ہیں۔ بسا اوقات اس قدر تسکین بخش ہوتی ہیں کہ لوگ ان کے حصول کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ اور ان میں اپنی مسرت ڈھونڈتے ہیں۔ یقیناً آپ کے پڑوس میں کئی ایسی عورتیں ہوں گی جو اس تلاش میں رہتی ہیں کہ کسی نہ کسی کی موت کی خبر سن پائیں اور بین اور واویلا میں شامل ہو کر آنسو بہا بہا کر اپنی تمنا پوری کر لیں۔ جرائم اور اموات کی گھناؤنی سے گھناؤنی تفصیلات کی اشاعت یورپ اور امریکہ کے کئی اخبارات کی مقبولیت کا باعث ہے۔ لوگوں کو ان کے پڑھنے میں ایک خاص لطف آتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ بھی بعض دہشت ناک افسانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو ہمیں اس کا اعتراف کرتے ہوئے محض اس وجہ سے متامل نہ ہونا چاہیئے کہ کہیں لوگ اس کو ہماری طینت کے کسی نقص پر محمول نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ قدیم زمانے میں روم کے لوگ جو اپنے اکھاڑوں میں پہلوانوں کی لڑائیاں اسی جذبے کے تحت دیکھنے آتے تھے۔ ہر کشتی ایک نہ ایک حریف کی موت پر جا کر ختم ہوتی تھی۔ اور کشت و خون کا یہ نظارہ ہزارہا لوگوں کو خوشی کے مارے دیوانہ بنا دیا کرتا تھا۔ ہماری تہذیب اس تماشے کی متحمل نہیں لیکن افسانوں اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونا اب بھی ہمارے بس میں ہے۔ اور اگر ہم اس جذبے کو فن کی کیمیا سے کشید کر کے لمحے بھر کو اپنے اعصاب میں ایک کیف انگیز تھرتھراہٹ پیدا کر لیتے ہیں تو کم از کم میں تو کسی طرح بھی نادم نہیں۔ آپ اپنے دل کو ٹٹول لیجئے۔

اعصاب میں ایک تھرتھراہٹ! بس یہی ان افسانوں کا مقصد ہے۔ اور جس کامیابی، جس خوبی اور جس فن کے ساتھ اس کتاب کے مصنف نے اس مقصد کی تکمیل چاہی ہے۔ اس کی تعریف اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ امتیاز جیسے ذی مطالعہ اہل قلم کو اس کے ترجمے کی خواہش ہوئی۔ ان لوگوں کے سامنے جو اردو ادب کے مشاہیر سے واقف ہیں اس سے زیادہ قابل وثوق ضمانت نہیں پیش کی جا سکتی۔ مصنف کی سب سے بڑی خوبی خود مترجم نے کتاب کے دیباچے میں واضح کر دی ہے۔

"موسیو لیول بے انتہا سلیس عبارت استعمال کرتے ہیں۔ جس کی پختگی اور سلاست پڑھنے میں نظم کا سا لطف دیتی ہے۔ ایک فقرہ یا لفظ بھی ضرورت سے زیادہ یا کم نہیں ہوتا۔ مختلف چیزوں کے بیان میں تناسب کی سمجھ بہت تیز ہے۔ چنانچہ ان کی یہ مکمل کہانی ایک نفیس اور صاف ستھرے تراشے ہوئے ہیرے کی طرح دل کش معلوم ہوتی ہے۔

یہ اختصار دہشت انگیز افسانوں کی ایک ضروری صفت معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان میں وہ تندی وہ تیزی نہیں رہتی جس سے سنسنی پیدا کی جا سکے اور پھر یہ اختصار ہر رنگ میں شامل حال رہتا ہے۔ دونوں افسانے یا ڈرامے کی کامیابی میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ میں کبھی ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اس کی حقیقت کے متعلق میرے دل میں کوئی شبہ نہیں۔ پیرس کے جس تھیٹر کا میں نے ذکر کیا ہے وہاں اکثر کھیل صرف ایک ایکٹ کے ہوتے ہیں اور خود تھیٹر بھی بہت چھوٹا سا ہے۔ چند دن ہوئے میں نے لندن میں ایک ایسی قسم کا کھیل دیکھا جو ہیو والپول کے ایک ناول سے مرتب کیا گیا ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اس کھیل کے لئے بھی لندن کا ایک بہت چھوٹا سا تھیٹر منتخب کیا گیا۔ اس تھیٹر کا نام "لٹل تھیٹر" یا "چھوٹا تھیٹر" ہے۔

باقی رہا امتیاز کا ترجمہ۔ میں حیران ہوں کہ اس مختصر سے تبصرے میں اس موضوع کے متعلق کیا کہوں اور کیا کسی اور وقت پر اٹھا رکھوں۔ آج کل اردو میں تراجم کثرت سے شائع ہو رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ کوئی صاحب فہم ان کے متعلق ایک بسیط تنقیدی مضمون سپرد قلم کر دیں تاکہ "چترا" اور "تائیس" اور "مذہب اور سائنس" اور "عذرا" اور "لیلےٰ" ایسی تصانیف کی ادبی حیثیت کو جانچنے کے لئے ایک معیار مقرر ہو جائے۔ میں ایسی بحث سے گریز کرتا ہوں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ میرے زیر نظر صرف "ہیبت ناک افسانے" ہے اور میرا قلم صرف اس کی خدمت میں مصروف ہے۔

یہ کہنا کہ امتیاز صاحب انگریزی جانتے ہیں۔ اس وقت تک بے معنی فقرہ ہے جب تک کہ میں اس کی مزید تشریح نہ کر دوں۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ "گدھا" کس کو کہتے ہیں۔ کسی انگریز کے لئے اس لفظ کے معنی سیکھ لینا کچھ مشکل نہیں۔ جانور کی تصویر دکھا دیجئے اور نام بتا دیجئے۔ قصہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس لفظ کے ساتھ "ابے گدھے" سے لے کر "خر عیسیٰ" تک جو شعر و ادب، فلسفہ و مذہب رسم و عادات، محاورہ اور روزمرہ کی ایک تاریخ وابستہ ہے۔ اسکو منتقل کرنے کے لئے ایک عمر چاہیئے اور پھر اس کے لئے بصیرت، ذہانت، مذاق اور مطالعے کی ضرورت ہے۔ امتیاز کو خدا نے یہ سب خوبیاں عطا کی ہیں اور یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے اپنی ان قوتوں کو مطالعہ السنہ اور علم و ادب کی تحصیل کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ ہاں وہ انگریزی جانتے ہیں۔ اسی لئے جب کبھی ان کا کوئی دلدادہ اپنی عقیدت کی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ بی اے لکھ دیتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے۔

ان کی اردو پرکھنے کے لئے ہندوستان میں مجھ سے بدرجہا بہتر نقاد موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میں امتیاز کے نیاز مندوں میں سے ہوں مجھے سنبھل کر قلم اٹھانا چاہیئے۔ مبادا قارئین میرے جذبات کی تو تعریف کریں لیکن میری تنقید کو محض اظہار نیاز مندی سمجھ کر پس پشت ڈال دیں۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ اس کتاب کے ایک دو صفحے آپ اور میں مل کر پڑھیں۔

"شام ہو رہی تھی۔ فقیر سڑک کے کنارے خندق کے پاس کھڑا ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کوئی کونا کھدرا نظر آئے تو وہاں پڑ کر رات بسر کرے۔ اور کوٹ سمجھ لیا ہو کچھ بھی لو ایک بورا سا اس کے پاس تھا اسی میں گھس گیا۔ لاٹھی کے سرے پر ایک گٹھڑی سی

اُدھر گرنے سے پڑا تھا رکھی تھی۔ تکیے کی جگہ اسے سر کے نیچے رکھ لیا۔ تھکن سے جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ لیٹا لیٹا نیلے آسمان پہ تاروں کو ایک ایک کر کے ابھرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف جنگل بیابان پڑا تھا۔ پیڑوں پر چڑیاں نیند میں چپ چاپ تھیں۔ دور بہت فاصلہ پر گاؤں ایک بہت بڑا سیاہ دھبہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں سکون اور سناٹے میں لیٹے لیٹے غریب بڈھے کا دل بھر آیا۔

اسے کچھ معلوم نہ تھا میرے ماں باپ کون تھے۔ لاوارث کو ثواب کمانے کے لئے کسی زمیندار نے لے لیا تھا۔ اسی کے ہاں پروان چڑھا تھا۔ بچہ ہی سا تھا تو وہاں سے نکل بھاگا۔ اِدھر اُدھر اس فکر میں پھرنے لگا کہ کہیں کچھ کام مل جائے جس سے دو ٹکڑوں کا سہارا ہو سکے۔ بڑی کٹھن زندگی گذر رہی تھی۔ دکھوں کے سوا جینے کا کوئی مزا نہ دیکھا تھا۔ جاڑوں کی لمبی لمبی راتیں چکیوں کی دیواروں تلے پڑ کر کاٹ دی تھیں۔ سوال کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ذلت اٹھائی تھی۔ چاہتا تھا کہ مر جائے۔ ایسی نیند سوئے کہ پھر کبھی آنکھ نہ کھل سکے۔ جتنے لوگوں سے اب تک واسطہ پڑا تھا بے درد تھے۔ شقی تھے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا ہر ایک اس سے متنفر ہے۔ بچے دیکھ پاتے تو بھاگ جاتے۔ کتے اس کو چیتھڑوں میں دیکھ کر بھونکنے لگتے۔

"پھر بھی کبھی کسی کا بُرا نہ چاہا تھا۔ سیدھی سادی اور نیک طبیعت پائی تھی۔ جسے مصیبتوں نے مردہ بنا دیا تھا۔"

یہ وہ زبان ہے جو قلعے میں پیدا ہوئی اور جو برسوں تک "اہل زبان" کے لئے باعث فخر و ناز رہی۔ شمالی ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کو یہ زبان رتن ناتھ سرشار، داغ اور امیر، نذیر احمد اور محمد حسین آزاد سے ورثہ میں ملی۔ اور اسی خزانے کے سکوں سے جنھیں خود اہل زبان محض سکوں کی طرح اپنے ہاتھوں ہی میں مل مل کر خوش ہو لیتے ہیں۔ اب لاہور کا ادیب فرانس اور انگلستان کا سستا ادب خرید خرید کر ہندوستان میں منتقل کر رہا ہے۔ اس قدیم دولت سے ادب جدید کے بازار میں اپنی ساکھ قائم رکھنا صرف امتیاز ہی کا کام تھا
اب ایک اور صحیفے کو پڑھیے۔ جو دلی اور لکھنؤ دونوں سے بے نیاز ہے بلکہ جو اکثر پرانی وضع کے بزرگوں کو اپنی جدت سے برہم کر دے گا۔

"اس روز میں بہت دیر تک کام کرتا رہا تھا۔ اتنی دیر تک کہ آخر کار جب میں نے میز پر سے نظریں اٹھائیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شفق شام سے میرا مطالعہ کا کمرہ لالہ زار بن رہا ہے۔ ذرا دیر تک میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ دماغ پر کسل کی وہ کیفیت طاری تھی جو کبھی بڑی ذہنی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بے تعلق نظروں سے اِدھر اُدھر تکتا رہا۔ دھیمی دھیمی روشنی میں ہر چیز دھندلی دھندلی اور بے وضع نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ روشنی تھی تو ان جگہوں پر جہاں غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں میز، آئینے اور تصویر پر سے منعکس ہو کر روشنی کے دھبے ڈال رہی تھیں۔ کتابوں کی الماری پر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔ اس پر شعاعیں ضرور خاص قوت سے منعکس ہو کر پڑ رہی ہوں گی۔ کیونکہ میں نے نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے ایسے روشن طور پر نظر آئی کہ گال کی ہڈی سے لے کر جبڑے کے زبردست دانتوں تک ہر حصہ بخوبی واضح تھا۔ شام کا دھندلکا بڑی سرعت سے گہرا ہوتا جا رہا تھا اور ہر چیز کو جیسے نگلے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ مگر قطعی طور پر اس سر میں زندگی کی چنگاری چمک اٹھی ہے۔ وہ گوشت پوست سے ڈھک گیا ہے۔ دانتوں پر ہونٹ سرک آئے ہیں۔ حلقوں میں آنکھیں جڑ گئی ہیں۔ بہت جلد کسی افسوں کے سحر سے مجھے ایسا نظر آنے لگا کہ میرے سامنے تاریکی میں گویا ایک سر معلق ہے اور میری طرف تک رہا ہے۔
وہ سر بھی ہوئی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا اور اس کے چہرے پر استہزا کا ایک تبسم تھا یہ کوئی اس قسم کا گریبا تصور تھا جو

انسان کا تخیل پیدا کر لیا کرتے ہیں۔ یہ چہرہ ایسی حقیقی چیز معلوم ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ تو میں بے قرار ہو گیا کہ ہاتھ بڑھا کر سے چھو لوں لیکن یکلخت خیال جیسے تحلیل ہو کر رہ گئے۔ حلقے خالی ہو گئے۔ ایک بجلی سی کہر نے اسے منور کر لیا..... اور پھر مجھے عام کھوپریوں کی طرح ایک کھوپری نظر آنے لگی۔

یہ دونوں بازار میں پیدا ہوئے۔ گھر میں۔ اس زمانہ لشکر میں پرورش پائی نہ تنہے میں۔ بلکہ یہ صرف ملک کے بہترین دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ نئی تہذیب کی ضروریات نے اسے ایجاد کیا اور لطافت اور خوش مذاقی نے اسے دلفریب صورت بخشی۔ اس بارے میں ہمارا ادب سجاد حیدر۔ ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر اقبال اور ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کا ممنون ہے۔ جنہوں نے بعض ایسے دروازے کھول دئیے کہ ترقی کے کئی راستے آنکھوں کے سامنے پھیلتے ہوئے نظر آنے لگے۔

یہ دو مختلف نمونے میں نے امتیاز کی قادر الکلامی کو ثابت کرنے کے لئے پیش کئے ہیں۔ ان پر یہ اعتراض بجا نہ ہوگا کہ ایک ہی تصنیف میں اتنے متباین ڈھنگ یک رنگی کے منافی ہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ جب آپ کسی ایک ایسی کتاب کو جو ایک غیر ملکی تہذیب میں ڈوبی ہوئی ہو۔ محض اردو جاننے والے ہندوستانیوں کی ضیافت طبع کے لئے کسی دیسی زبان میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ تو یقین مانئے انشا پردازی کا کوئی اسلوب نہ ہوگا جس سے آپ بے نیازی برت سکیں۔ اس کے لئے قلم نہیں بلکہ دسوں انگلیاں دس چراغ ہونی چاہئیں۔

پطرس از کیمبرج

(مخزن مئی ۱۹۲۸ء)

وارفتگیِ جذبات

بھائی...... تم سے کیا کہوں طبیعت روز بروز حساس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے جس کو تنہائی اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ مختلف اسباب مل کر ایک عجیب سے دل پیدا کر دیتے ہیں۔ میں فطرتاً ہوس ناک ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے۔ اِس نے بعض اوقات ایک پیالی کا اثر جام زہر کی طرح مجھ پر ہوا کرتا ہے۔ میں شاعری نہیں کرتا۔ یہ حقیقت ہے۔ گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیمپ بجھا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر جلا دیتا ہوں کہ نیند نہیں آتی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی کلفت اور تھکان کے بعد خواب راحت میں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ میں اس وقت حیات کی ایک بیداری، اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دور چند غریب پٹھان مزدور رباب بجا رہے ہیں اور پشتو کے کسی درد ناک گیت کی فراق زدہ لَے، رباب کی سادہ موسیقی، رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں۔ مضطرب روح سوز کوہستانوں کے وحشت عشق و حسن کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصور آتا ہے کہ ایک خنجر، غیور اور تنومند افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر رکھ دیا ہے اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تضرع سے بھرے فقروں میں اپنے عشق کی کہانی کہہ رہا ہے۔ خیبر کی آغوش کوہ کی پروردہ حسینہ کے خوب صورت سڈول بازوؤں کو نسوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم نگاہوں میں ایک محبت آ گئی ہے یکایک اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے ابھار دیا ہے۔ اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدلی کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے۔ رقیب حسن میں تنی ہوئی اسے اجتناب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ پھر غصہ میں آ کر اس نے اپنی گھاس کی گٹھڑی اور درانتی کو سر پر رکھ لیا ہے۔ اور ندی کے بیچ میں سے گذر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب، ایک کشمکش سنائی دیتی ہے۔ غیرت مند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پر کھڑا اردگرد کی چوٹیوں کو، پتھریلے ٹیلوں کو، بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نظروں سے دیکھ رہا ہے اس کی آنکھوں میں خون ہے، اور آگ ہے۔ اس نے بندوق میں ایک کارتوس بھر لیا ہے اور اس بنجر اور تپتے کوہستان میں اس کے گیت کی پرسوز صدا ویران وادیوں میں گونج گونج کر موت کو تلاش کر رہی ہے ایک جنگ جو کی موت کو، ایک فاتح کی موت کو۔ عشق اس میدان وغا میں آوارہ، سرگرداں پھر رہا ہے۔ اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان، مردانگی اور بہادری کے حوالے کر سکے۔ خیبر کے بنجر اور ویرانے پہاڑ محبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں۔ اور موت کی طرح خاموش اور دہشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو آتی معلوم ہوتی ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی موسیقی بے دردی سے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

پانی پینے کو ٹھیرے - میں بھی ایک درخت کی آڑ میں بیٹھ گیا - لوگوں نے مجھ سے کہا بھی کہ حضور کے لائق تو اس وقت کوئی چیز میسر نہیں آسکتی اگر حکم ہو دودھ حاضر کریں - میں نے سوچا کہ قیمت یہ لیں گے نہیں اور [illegible] کا کو چھٹی تک [illegible] لگنا پڑے گا - انکار کر دیا - اب میں ان سے کیوں کہتا کہ [illegible] سے کھڑا ہوا نہیں جاتا اور میری آنکھوں کے آگے ترمرے [illegible] چلے آتے ہیں دوری جھنڈی ہنیں سوجھتی - [illegible] دن کی محنت سے تھک کر چور ہو گیا تھا مگر جی میں خوش تھا کہ بڑا پیچیدہ اور جھگڑے کا مقدمہ طے ہوا اب مقام پر مزے میں تان کر سوؤں گا - گانو کے قریب پہنچ کر جھٹپٹا سا ہو چلا تھا دیکھتا ہوں تو لب سڑک جو میں نے جگہ بتا دی تھی خیمے کا پتا نہیں - الٰہی علے خلاصی - میرے نوکر یہ سب کہاں غارت ہو گئے کہیں گانو تو نہیں بھولے ؟ نظر اٹھا کر دیکھا تو دھندلے میں کوئی آدمی نہ دکھائی دیا جس سے پوچھوں بستی کی طرف مڑا - گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سن کر کتے [illegible] گھیرا - گھوڑا [illegible] دن کا کسا تھا - دانے کا وقت - کتوں کا زغہ لگا الف ہونے - آخر اترپڑا - گانو میں جا کر دیکھا تو سناٹا - بارے بڑی دیر میں ایک چوکیدار نکلا اس نے بتایا کہ سولنے والا بغیچا [1] میں کوئی ایک کوس کے فاصلے پر لشکر ٹھیرا ہی - یہ کوس بھر کی مسافت [illegible] ایک منزل تھی - جگہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہنوز ڈیرہ نہیں کھڑا ہوا - سنتے کے ساتھ [illegible] ہی تو بیٹھ گیا - زمیندار - بنیے - بقال - سب لشکر کی آمد سن کر بھاگ کھڑے ہوئے گانو میں چڑیا تک باقی نہیں - لکڑی - گھاس - آٹا - دال - کسی کو کوئی چیز نہیں ملی - جانور کھڑے ٹاپ رہے ہیں - اور آدمی سکڑے ہوئے بیٹھے تاپ رہے ہیں - لوگوں نے اپنا کچھ بندوبست کر کرا لیا ہو گا [illegible] آدمیوں نے ساری عمر میں یہ ایک نمک حلالی تو ضرور کی کہ تھوڑے سے چاول لگا رکھے تھے جلدی سے خشکہ ابال لیا تڑاقے کی بھوک میں وہ پھیکا خشکہ جیسا [illegible] کا لگا آج تک مجھ کو ایسا لذیذ کھانا کھانے کا اتفاق نہیں ہوا - غرض میں تو دوزخ شکم بھر کر ایک [illegible] ہو گیا جیسے کسی کو سانپ سونگھ جاتا [illegible] ابھی مصیبت کا خاتمہ نہیں ہوا - گندہ بہار

[1] چھوٹا سا باغ ۱۲

مجھے اس وقت ایک عجیب درد، افسردگی، ایک وحشت، ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں۔ نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ لکیر کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا اور انسان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے گویا میں صحرا کی وحشت اور آسمان کی پہنائی میں ایک ذرہ ہوں۔ اور ستاروں کی دور دراز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے جھلک رہا ہے اور کائنات میں یا چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے یا تاریک سائے ہیں جن میں رات نے اپنے پر اسرار اقتضا کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت نے ایک لے، ایک بے قراری پیدا کر دی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈر نہیں ہوتا۔ خوف نہیں لا متناہی ایک اضطراب ہوتا ہے ایک ناقابل بیان بے قراری ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بستر پر سکون کی حالت میں مردہ کی طرح دیکھ کر دل تعجب میں پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں بے بس کیوں ہوں۔ لیکن یہ بے بسی کا احساس جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے۔ اور تنہائی ایک محشرستان، بیداری ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی دھیمی ہو جاتی ہے۔ اور گیت بہتے بہتے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سردی پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے دل میں رحم آ جائے تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ نیند آ ہی جاتی ہے۔ مگر آہ! اس بیماری کے بعد!

(مخزن۔ جولائی ۱۹۲۱ء)

تنزل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا، جس تیز رفتاری سے میں تنزل کی طرف جا رہا ہوں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے۔ میں ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں۔ لیکن میں سامنے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش، ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے

آہ! بہت تھوڑے عرصہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پاتا تھا۔ میرا مطمح نظر اور میرا دائرہ افق اس قدر وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکرا جاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے اور میں کوتاہ بینوں سے ناواقف تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا۔ میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔

مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گذرنے نہیں پائے گا جب میرے حسیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے لگ جاتا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں۔ آرام و سکون میرے لئے ناممکنات سے ہیں۔ نہ مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہے اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں۔ چارہ گر کو مجھ پر رحم آ سکتا ہے اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک — صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب! بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

(مخزن۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

محبت کی دردناکی سے جب تاروں میں ایک بے قراری ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب سر اپنی جان سے بیزار ہو کر سب کچھ جانتا ہے اور بے تابانہ ایک دوسرے سے سر ٹکراتے ہیں۔ جب بربط کی جان نازک اپنی بساط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں۔ بمشکل نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ پھر وہ بربط بربط نہیں رہتا بلکہ فنا کا ایک خاموش نوحہ ماتم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے عشق کی نامرادی "

(مخزن۔ نومبر دسمبر ۱۹۲۱ء)

آسمان

مجھے یاد ہے کہ بچپن کے زمانے میں میں آئینہ کو ہاتھ میں لے کر اس میں آسمان کا عکس دیکھا کرتا تھا وسعتِ فلک کا اندازہ میں صرف آسمان کو یوں اپنا کر ہی لگا سکتا تھا۔ آسمان کی بلندی سے مانوس فطرتِ انسانی کو اس کی عظمت کا احساس صرف اسی طرح ہو سکتا تھا کہ میں اس بلندی کو گہرائی بنا کر دیکھتا پھر جب میں آئینے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی نظر کو اعماقِ فلک میں پھیلتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کرتا تو ہر ایک قدم ایک عجیب التباس کے کنارے پر ہوتا اور ہر ایک لغزش گویا مجھے غرقابی کی گود تک لے جاتی اور پھر سلامتی تک یوں واپس پہنچاتی کہ میرا دل دھڑکنے لگتا اور میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ عقل نے آخر ہاتھوں سے اس فریب و طلسم کو توڑ دیا۔ اب میں آسمان کی طرف نگاہیں جھکا کر دیکھ بھی سکتا ہوں۔ اب اس کی حقیقت کے متعلق ہر طرح سرگوشی بھی کر سکتا ہوں۔ اب میں اس کو کئی دفعہ اپنے آپ سے لاتعلق بھی سمجھتا ہوں گویا اس کی ہستی ہی نہیں۔

مگر ایک رات ایسی بھی آتی ہے جب ایک بے نام بے چینی مجھے نیند سے ناآشنا کر دیتی ہے دل ایک خاموش اور بے نوا اضطراب بیداری بن کر آنکھوں میں بھر آتا ہے۔ کسی تنہا، آہستہ خرام، رہگیر کی سریلی تان رات کی گہری تاریکی میں سے چھن چھن کر مجھ تک ایک رقیق سی بے قراری اور ایک خفیف سی لرزش ہو کر پہنچتی ہے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ قدرت کے عالی شکوہ گنبد میں کسی سانپ کی پھنکار کی پُر اسرار گونج معلوم ہوتی ہے گویا فطرت کی آتما سرد آہیں یا الہام کی سرگوشی جو ایک عظیم الشان کائنات کے خاموش اندھیرے اور تاریک سمندر کے راستے مجھے غرقِ تحیر کر رہی ہے۔ ستاروں میں ایک ابدی روشنی چمکتی نظر آتی ہے کالے آسمان کی مہیب سیاہی ایک لازوال اور ہمہ گیر غم کی طرح دنیا و ما فیہا پر چھائی ہوئی ہے اور ستارے اس غیر محدود بلندی پر آگ کے قطروں کی طرح معلق و لرزاں معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت میں اس دور دراز بلند اور پُر ہیبت عظمت کے نیچے ایک ذرۂ حقیر اور ایک روحِ بے مایہ کی طرح گم ہو جاتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر ایک ستارہ رات کا ایک خاموش اور بے بہا آنسو ہے۔ جو صبح کے وقت زمین کے کسی پھول کی پتیوں پر سورج کی کرنوں میں مسکرا رہا ہوگا۔ آسمان ایک بھیانک غم کی طرح ہر ایک طرف طاری دکھائی دیتا ہے اور میں اپنے آپ کو اس میں گھرا ہوا پاتا ہوں جب کوئی ٹوٹتا ہوا تارا ایک وارفتہ سرعت کے ساتھ آسمان کی وسعت و پنہائی پر ایک افق سے لے کر دوسرے افق تک ایک طویل خطِ آتشیں کھینچتا ہوا تاریکی میں کہیں فنا ہو جاتا ہے تو میں آسمانی زلزلے سے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

اس وقت میں قدرت سے رحم کا طلب گار ہوتا ہوں۔ اس وقت میں اپنی تمام زندگی میں سے آنسوؤں کے سوا اور کوئی چیز آسمان کے حضور میں پیش نہیں کر سکتا۔ میرے ہونٹوں پر ایک مہرِ سکوت ہوتی ہے اور میری روح ایک حیرت بن کر رہ جاتی ہے اس وقت میں آسمان کی سیاہ وسعت اور رفعت کو دیکھ کر بھول جاتا ہوں کہ ازل اور ابد میں کیا فرق ہے؟

(مخزن۔ جنوری ۱۹۲۲ء)

ایک رات

رات کے بارہ بجنے والے ہیں۔ آدھ گھنٹہ ہوا میں مطالعہ سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اور اب تمام کوٹھی میں مکمل خاموشی اور سکون ہے۔ کھڑکی کے دروازے میں سے باہر کا ایک منظر دکھائی دے رہا ہے جس پر اس قدر سکوت طاری ہے کہ کبھی کبھی ہوا کا ایک جھونکا میرے چہرے پر دفعتاً ایک عجیب سی خنکی پیدا کر دیتا ہے۔ تو میں کانپ اٹھتا ہوں۔ کہیں دور ایک کتا بھونک رہا ہے جس کی آواز محیط خاموشی میں ایک دھیمی سی ہیبت ہو کر رہ گئی ہے جب یہ آواز ایک لمحے کے لئے میرے کان تک نہ پہنچے تو اس چپ چاپ میں وحشت کی سی سرسراہٹ سنائی دینے لگتی ہے اور میرا دل ایک لمحے کے لئے زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ سکوت کی بے زبان اور ڈراؤنی آوازوں سے اپنے دل کو ہٹاتا ہوں تو لیمپ کی خاموش روشنی اور گھڑی کی ٹک ٹک اور بھی گھبرا دیتی ہے۔ میز پر رکھی ہوئی تصویروں کا سکون اور ان کی بے حس و حرکت روحوں کو دیکھ کر کسی قبرستان کا بھیانک منظر تصور میں آ کر ڈراتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کمرے کی تمام چیزیں اس وقت سو رہی ہیں اور میں اس وقت سگریٹ پینا چاہتا ہوں لیکن میں اس آواز سے خوف کھاتا ہوں جو دیاسلائی جلاتے وقت اس سنسان کے نحیف نغمہ کو اپنی درشتی سے پریشان کر دے گی۔ سچ ہے بل کھاتی ہوئی دھوئیں کی باریک دھار سے نکلتی ہے جو سلگتے ہوئے سگریٹ سے ایک نازک اور پُراسرار ناگن کی طرح نکل کر میرے سامنے کہیں تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے۔ میں دروازے میں سے چمن کی کالی کالی جھاڑیوں کو کچھ دیر دیکھتا رہتا ہوں۔ تو مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ باہر کی تاریکی ایک مہیب خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے اور میرے لیمپ کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آہستہ سے اٹھ کر دبے پاؤں دروازے تک جا کر اسے بھیڑ کے بند کر دوں۔ لیکن میں ڈراؤنی کالی رات سے ڈرتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہیں میرے حواس اس کی ہوشربائی کے بے پناہ طلسم سے مسحور ہو کر رات کی تاریکی کے ساتھ نہ مل جائیں اور میں اس سکوت کے سمندر میں آہستہ سے ڈوب کر غائب نہ ہو جاؤں۔ مجھے صرف لمبے لمبے بکھرے ہوئے گھنے سیاہ لہروں والے بال دکھائی دے رہے ہیں اس حسینہ کے جس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ہو۔ ان کی ڈراؤنی سیاہی میری آنکھوں میں نچا رہی ہے حسن میری آنکھوں سے اوجھل ہے اور خیال میں ایک کانپتی ہوئی امید کی طرح ڈر ڈر کر جھلک رہا ہے۔ ہوا کے کمزور سے جھونکے میرے بدن میں خون کی سی ٹھنڈک پیدا کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میرے لٹکتے لمبے بال گر کر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں تو مجھ پر ایک تھرتھرانے والا ڈر طاری ہو جاتا ہے۔ آنکھیں ان کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتی ہیں۔ اور ہاتھ ان کو ہٹاتے ہوئے کانپتا ہے۔ فرش پر میرا سیاہ کمبل اس سکون سے پڑا ہے گویا رات نے اس پر اپنی لمبی لمبی انگلیاں پھیر کر ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ بیٹھے سے اپنی خاموشی کا دھیما سا طلسم پھونک دیا ہے۔ میں اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے سہم جاتا ہوں گویا پُراسرار چپ چاپ دنیا کا کوئی بھیانک سا منظر یکلخت مجھے اپنی وحشت دکھلائے گا۔ اور میں ہیبت ناک چیخ مارنے کی کوشش کروں گا۔ جو میرے منہ سے نہ نکلے گی۔ میرا گلا ان تصورات سے خشک ہو رہا ہے۔

میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوں۔ لیکن وہ خشک ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کسی چیز کو دیکھوں اور رات کی خاموشی اور سکون میں کوئی اضطراب پیدا ہو جائے لیکن میں اپنے آپ کو کسی جادو میں جکڑے ہوئے پاتا ہوں۔ جو میری آنکھوں کو زور سے گھورے ہوئے ہے، جو میرے سینے کو دبا رہا ہے اور جو مجھے سانس نہیں لینے دیتا۔ گھڑی کی سوئیاں جن میں میں نے کوئی حرکت نہیں دیکھی اب کسی اور جگہ میں رات کے ساتھ ساتھ وہ بھی چپ چاپ آہستہ آہستہ سانپ کی طرح آگے چلتی رہی ہیں۔ کیا کمرے کی دیواریں بھی اسی طرح قریب ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا کائنات چاروں طرف سے آہستہ آہستہ تنگ ہو کر مجھے بھینچنے کیلئے میری طرف آ رہی ہے۔ اور کیا خاموشی اور تاریکی نے جادو سے مجھے اس تنہا بچھیا تک موت کے لئے یہاں باندھ رکھا ہے۔

باہر سڑک پر ایک تانگا گزر رہا ہے۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ہے، یہ پہیوں کی۔ دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شاید تھیٹر سے واپس آئے ہوں گے۔ آج تھیٹر میں خدا جانے کونسا کھیل تھا۔ سگریٹ میں نے کہاں رکھے ہیں؟ دیاسلائی کی ڈبیا تو اس جیب میں ہے۔

میں اب سگرٹ پی رہا ہوں۔ اور رات اب میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سوائے اس کے کہ میں اب سو جاؤں اور صبح پھر اٹھوں۔

(نیرنگ خیال)

ایک غیر مطبوعہ کتاب کا دیباچہ

یہ کتاب ساٹھ مضامین کا مجموعہ ہے جو ۳۹ پاکستانی اور ۲۱ غیر پاکستانی (بیشتر امریکی) مشاہیر کے خیالات و مشاہدات کے آئینہ دار ہیں۔ ہر حصے کے پہلے مضمون کو چھوڑ کر باقی مضامین کی ترتیب بلحاظ ابجد ہے ورنہ حفظ مراتب میں نہ معلوم کیا لغزشیں سرزد ہوتیں۔ پاکستانی مضامین چند ایک اور دیگر مضامین تمام تر انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مترجمین کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ یہ کام انہوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

مجموعے کا خیال ایڈورڈ آر مرو (EDWARD. R. MURROW) کی ایک تالیف دس آئی بلیو THIS I BELIEVE سے پیدا ہوا۔ مرو صاحب امریکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاہیر میں سے ہیں کولمبیا براڈکاسٹنگ سسٹم کے وائس پریذیڈنٹ ہیں۔ حالات حاضرہ خصوصاً سیاست ملکی اور بین الاقوامی معاملات کے ماہرین میں ان کا رتبہ بلند سمجھا جاتا ہے۔ وہ تعلیمی مسائل سے بھی ان کو بہت دلچسپی ہے۔ لاکھوں لوگ ان کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کو غور سے سنتے اور دیکھتے ہیں اور ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

مرو صاحب اس سے بے حد متاثر ہوئے کہ پچھلی جنگ عظیم میں اہل انگلستان نے بہت ثابت قدمی دکھائی اور باوجود بے سروسامانی کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور یہی نہیں کہ تیغ و تفنگ کے جوہر دکھائے بلکہ اپنے قدیم اصولوں اور روایتوں کی پابندی میں بھی کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ چنانچہ حب الوطن عدل و انصاف جمہوریت، حریت کا خیال جب بھی ان کے امتحان کی نوبت آئی ہر انگریز نے بلا جھجک اپنے قدیم اصولوں کی پیروی کی۔ اور شدید خطرے کے زمانے میں بھی جب کہ دل یہی چاہتا ہے کہ کسی بات میں بہت مین میخ نہ نکالی جائے اپنی روایات کو پس پشت نہ ڈالا۔ اس سے مرو صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی قوم کا عمل دراصل اس کے عمیق عقائد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور وہی کسی بحران کے زمانے میں بروئے کار آتے ہیں۔ یہاں سے انہیں تلاش ہوئی کہ امریکیوں کے عقائد کیا ہیں؟ اور اس غرض کے لئے انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے کہا کہ آپ اپنے عقائد اور خیالات کا مختصر سا خاکہ کھینچ دیجئے۔ اس کے جواب میں جو مضامین وصول ہوئے انہیں پہلے ایک، اور پھر ایک دوسری کتاب میں شائع کیا ——— دونوں کتابیں غور سے پڑھی گئیں۔ چند مضامین ان میں کے اس کتاب میں بھی شامل ہیں۔ اور امید ہے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

مکتبہ فرینکلن نے ایسا ہی سوال میری وساطت سے پاکستان کے مشاہیر کے سامنے پیش کیا۔ جن مہربانوں نے اس کے جواب میں مضمون عطا فرمایا میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔

پاکستانی اور امریکی مضامین یکجا شائع ہوں تو دل ان کا مقابلہ کرنے کو چاہتا ہے۔ دونوں ملکوں کا آپس میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے ایک امیر ملک، ایک غریب ملک ——— ایک آزادی کا عادی، دوسرے کا تعارف آزادی سے بالکل ہی نیا ——— ایک بیشتر مسیحیوں کا ملک، دوسرا مسلم

کا ۔۔ ایک کی تاریخ یورپ سے وابستہ دوسرے کا ماضی یورپ کی مخالفت سے لبریز ۔۔ ایک یورپین ڈھانچے کا مالک، دوسرا ایشیائی ڈھانچے کا۔ اس لئے حیرت ہوتی ہے کہ دونوں ممالک کے مشاہیر کے خیالات میں جس قدر ہم آہنگی ہے وہ کس قدر زیادہ ہے۔ دونوں قنوطیت سے دست بردار، دونوں رجائیت کے قائل، عہد جدید کے قائل، عزم و خدمت کے قائل، دونوں کے نزدیک معاشرتی خدمت اہم ترین عبادات میں سے ہے۔ البتہ امریکہ میں ان خیالات کو بہت کچھ سہولتیں اور گنجائشیں عمل کی نصیب ہو چکی ہیں۔ اور ہمارے ہاں ابھی بہت کچھ مستقبل میں ہے۔ لیکن فخر و مسرت کا مقام ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ برسرکار ہیں یا جن کا معاشرے میں حصہ لینا لازم ہے یا جو ایسے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو بہت عرصے تک سربرآوردہ و نمایاں قوم مہیا کرتا رہے گا۔ ان کے خیالات اور افکار میں وہ بلندی ہے کہ خواہ ان میں قوت کا احساس رکھتے ہیں۔ معاشرتی خدمت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ ایمان کو پاکیزہ زندگی کا جوہر عظیم سمجھتے ہیں۔ ابھی منزل سے دور سہی لیکن ترقی کی سمت انہیں باوجود اپنی پسماندگی کے ایسی ہی صاف دکھائی دے رہی ہے جیسے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کو ۔۔۔

جب میں اس مجموعے کو اس نظر سے دیکھتا ہوں تو اس کی قدر بڑھ جاتی ہے اگر میری قوم فی الواقع مجموعی طور پر ان خیالات کی علم بردار ہے جو فرداً فرداً مشاہیر نے اپنے مضامین میں واضح کئے ہیں۔ تو ہمارا مستقبل ایسا نہیں کہ ہم مایوس ہو جائیں آپ بھی اس کتاب کو اسی نظر سے پڑھئے۔ تو دلچسپی کا باعث ہوگی۔

(بشکریہ مکتبہ فرینکلن)

چمپا اور دوسرے افسانے

دیباچہ

(مولانا عبدالمجید خاں) سالک (رشیداوی) کے افسانے بہت کم ہی ہیں اور صفحۂ قرطاس اس کی سحر نگاری سے محروم۔ لیکن چہرۂ فطرت کے جو خار اس کی قلم طرازی کے ممنونِ احسان ہیں وہ ہمیشہ چشمِ تماشائی کی پتلی بنے رہیں گے۔

یہ انتخاب بہت عجلت سے مرتب کیا گیا ہے۔ کہ جب تک زمانہ کی چار دیواری سالک کو اہلِ نظر سے پوشیدہ رکھے۔ سالک کے شیدائی اس کے نقشِ دل کی مینا پاشی سے محروم نہ رہیں۔ اگر وہ "گمنام" گمنامی کا شیدا۔ وہ عزلت نشینِ محشر۔ وہ انجمنِ خلوت، اس وقت حماقت و رنجیدہ سے گداز ادھر ہوتا۔ تو یقین نہیں کہ وہ اپنی "گمنامی" کے نقاب کو یوں چاک چاک دیکھنا گوارا کر سکتا۔ کیونکہ اس کی نقادانہ نظر اور نگاہِ انتخاب بھی ہیں اور نکتہ چیں ثابت ہوتی ـــ ایک وقت اور صرف ایک وقت ـــ جب وہ اپنی بیش بہا تصنیفات کو کھول کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔

وہ شخص جو ادبِ لطیف کے خیاباں سے منہ موڑ کر صحافت کی سنگلاخ زمین اور سیاسیات کے خارزار میں گامزن ہوا۔ جذبۂ وفا کو ہمیشہ اپنے سینے میں لئے پھرا۔ گلزار و گل گشت میں بھی زنگ دار تھا۔ بادیۂ دشت میں آج بھی اس کی آبلہ پائی ہے اس سے اہلِ مذاق برسوں لطف اندوز ہوتے رہے اور اس سے اہلِ درد آج اشک ریز و غمزدہ ہیں۔

افسانہ نگاری میں وفا کو وہ ہمیشہ "عشق کی دلہن" سمجھتا رہا۔ اور عورت کے دل کو خواہ وہ "فلورا" یا "رکمنی" ہی کیوں نہ ہو، اس کا محلِ عروسی۔ اس کی "چمپا" نے اپنے سوامی کے قدموں میں جان دی۔ اس کی "فلورا" کی وفا حسد اور رشک کو پامال کر گئی۔ "بیہولا" کی آہ و زاری نے دیوتاؤں کے دل ہلا دئے، اور "موسیٰ" کے عشق کا شعلہ اب تک رات کی ہیبت اور تاریکی میں بہار کی برفانی چوٹیوں پر روشن نظر آتا ہے۔

ہمارے شعر و سخن کے آئینے میں عشق کو اپنا چہرہ اکثر دلیلا ہی کا سا نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ عشق جنوں کو اپنا ایک دوسرا نام سمجھتا ہے۔ "سدا بہار ٹاپو کا ہندی" میں عکس اور معکوس۔ اسم اور مسمّی دونوں سامنے کھڑے ہیں۔ اور جو نظر فریب نظارہ ہمارے پیشِ نگاہ ہے وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم ماتھے پر تیوری چڑھائے ایک نقادانہ اور مربیانہ انداز میں کھڑے ہو کر اس پر تبصرہ کریں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اپنے حواس کو محویت میں گم کر دیں اور کتاب کو اپنے بے جان ہاتھ سے گر پڑنے دیں۔

سالک کی تحریر سازِ دل میں مزید کوئی نہ کوئی تار ایسا چھیڑ جاتی ہے۔ جو سننے کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی تھرتھراتا رہتا ہے۔ اور بارہا میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ایسے تار بھی ہیں جن کو مضراب نے نہیں چھوا۔ پھر بھی ہم آہنگ ہیں اور کانپ رہے ہیں۔ "بیہولا" ایک چھوٹا سا افسانہ ہے لیکن "بیہولا" کو جیسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ سالک نے مجھ سے کبھی نہیں کہا۔ لیکن مجھے اس وفا شعار رنجیدہ دوشیزہ اس عصمت و عفت کی دیوی کے ساتھ

کے تھے دن کو ایک رات کو ابر آیا اولے گرے [illegible] اس زور کا مینہ برسا کہ باغ میں گھٹنوں
گھٹنوں پانی کھڑا ہو گیا۔ صبح ہوتے بیزار و خستہ گانو میں جا کر پناہ لی۔ جہاں جس کے سینگ سمائے
گھس پڑا۔ لوگوں نے [illegible] مسجد بتلادی۔ اور فی الواقع سارے گانو میں اس سے بہتر
کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ [illegible] مولوی صاحب جن کا میں نے اوپر ذکر کیا اُن کو میں نے اسی مسجد
میں دیکھا۔ میرے تو دانت سے دانت بج رہے تھے [illegible] مولوی صاحب ہیں کہ حجرے میں
الاؤ روشن ہی مزے سے اکھڑا کرتہ ڈانٹے ہوئے [illegible] صاحب کہاں تک جوڑوں
کی گرمی نہ ہوگی۔ مولویوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے بے اختیار شیخ ابراہیم ذوق کی رباعی یاد آیا کرتی ہے:

قطعہ

نذر دیں نفس کش کو دنیا دار — کیا مرے حق کی بجے [illegible]
سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوق — مالِ موذی نصیب غازی ہے

جب نہیں خواجہ آزاد کو مولویوں کی حالت پر رشک تھا یا اُس نے جو تعلیم پائی تھی اُس کا
اثر تھا مگر اس میں شک نہیں کہ وہ مولویوں کی طرف سے بہت ہی بدگمان رہا کرتا تھا۔ اور
اسی کی دونوں میاں بی بی میں لڑائی تھی۔ اسی کی ناموافقت۔ اسی کا جھگڑا۔ اسی کا بگاڑ
خواجہ آزاد چوں کہ سچے کی کہتا تھا۔ ہادی بیگم آگ ہو ہو جاتی تھی اور یہ خواجہ آزاد کی بڑی بے تدبیری
بھی تھی۔ مولویوں کی بیٹی۔ پوتی۔ نواسی۔ مولویوں کو بُرا کہنے کی اُس کو [illegible] پھیرا لی جائے تو
کہاں تک اس کو بُرا نہ لگے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جس قدر خواجہ آزاد چھیڑتے [illegible] قدر ہادی بیگم کی
ضد بڑھتی جاتی۔ ہادی بیگم کو تو اپنے میکے والوں [illegible] پر بڑا ناز تھا۔ خواجہ آزاد
ان کے چڑانے اور چھیڑنے کو کہتا بھیک کہو بھیک [illegible] تم توکل سے تعبیر کرتی ہو
میرے نزدیک وہ بھیک سے بھی بدتر ہے۔ فقیر اگر بھیک مانگتا ہے تو شاید وہ اپاہج ہے۔
معذور ہے اُس نے اپنے پتے کو مار لیا ہے۔ دروازے دروازے پھرتا۔ کہیں دھکے کھاتا۔
کہیں گھر کی سُنتا اور کہیں سے ٹکڑا بھی ملتا۔ یہ اچھے چنگے۔ ہٹے کٹے۔ موٹے تازے۔
اندھے نہیں۔ لولے نہیں۔ لنگڑے نہیں۔ ان کو دوسروں کی کمائی کھانے کا کیا حق ہے؟
[illegible] اس ہیکڑی اور سینہ زوری سے کہ مسند لگائے مخادیم بنے ہوئے بیٹھے رہیں؟ ہادی بیگم
تم کیا اپاہج نہیں ہو تم کاہے کی تنخواہ پاتے ہو؟ آزاد۔ میں کام کرتا ہوں تنخواہ کے

پھٹک اٹھتا نظر آتا ہے: ارشاد کی کشتی" دیکھئے یہ دیکھتے دیکھتے افق میں غائب ہو گئی ہے لیکن اس کے چہرے پر عشق کی دل سوز وحشت اب تک نہیں دکھی ہے۔

سالک کو تصادم جذبات کا بہت شوق ہے۔ تہذیب و تمدن کے دائرے کے اندر، لاہور اور بمبئی کے خوشنما محلوں میں اس نے جذبات کو پامال ہوتے دیکھا تو انہیں سنسان پہاڑوں میں دلدلوں اور سرکش جنگلوں کے بیچ میں لے جا کر ان کی عریانی، مستی اور پاکیزگی کو آزاد چھوڑ دیا۔ جہاں مرد صرف مرد اور عورت صرف عورت ہوتی ہے جہاں کے طوفان سخت بلاخیز ہیں اور درندے سخت خونخوار

لیکن سالک کا دل حیات کی نزاکتوں اور جذبات کی لطافتوں سے ناآشنا نہیں۔ اس کے سینے میں بے شمار چھوٹے چھوٹے درد اور ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ مگر غضب یہ ہے کہ وہ آفات و مصائب کو دلیرانہ برداشت کرنے والا مجاہد مرد اس شریت کو اپنی فطرت کی کمزوری سمجھتا ہے۔ "جوان حیدہ" جو اس کے قلم کی بے ساختگی اور بے تکلفی اور اس کی طبیعت کی نازکی کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک سرگوشی ہے جو کبھی بلند آہنگ نہیں ہوتی۔

میں یہ کہہ دیتا کہ سالک بار ایک لفظ سے وہ کام لیتا ہے جس کے سرانجام دینے میں ہندوستان کے اکثر انشاپردازوں کے لیے لمبے لمبے فقرے ناکام رہے ہیں۔ الفاظ میں وہ موسیقی اور شیرینی بھر دیتا ہے جو محبت کو معنی سے زیادہ دلآویز بنا دیتی ہے لیکن مجھے اس کے کہنے سے سالک کی "چترا" کو دوبارہ پڑھنے کا اور اس ادیب سحر طراز انشا شاعر شیریں مقال "اس آئینہ دار تخیل" کے ذوقِ سخن کا ایک دوسرا پہلو ہے۔

میری یہ ہذیان تحریریں سالک کی کافر ادا جسارت کے ہمرکاب ہے۔ اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ حیات ابدی کا دامن میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی کبھی جرات نہ ہوتی اگر مجھے یہ فخر حاصل نہ ہوتا کہ میرے نیاز مندانہ خلوص نے تبسم حوصلہ افزا کو اکثر سالک کے لبوں پر کھیلتے ہوئے دیکھا ہے۔

آج وہ حراست میں ہے اور شاید اب بھی مسکرا رہا ہے۔ نیاز مند آنکھیں پھر اس مسکراہٹ کو دیکھیں۔

۱۹۴۲ء

"پطرس"

نغمہ زار

ابو الاثر حفیظ جالندھری کی کتاب کا دیباچہ

جالندھر کے نغز پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ عرصے سے لاہور کے شاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مسحور کر رہا ہے جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں، تصویریں بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں، اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہیں۔

ساون رُت، گھنگھور گھٹاؤں میں کھیلتی ہوئی بجلی، موروں کی جھنکار، پپیہوں کی پکار، برسات کی ٹھنڈی ہوا، ہوا میں اڑتے ہوئے آنچل، آنکھوں میں تمنائے دید، اور فراق کے آنسو، دل کو انتظار کی دھڑکن، یہ ایک مست کیف شاعری کی وہ دنیا ہے جس میں حفیظ گاتا پھرتا ہے، جب اس کا دل بھر آتا ہے تو وہ آنسو بہا دیتا ہے، جب اس کے دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے تو وہ اسے اپنے سروں میں لاتا ہے اور سننے والوں کا کلیجہ مسل دیتا ہے۔

یہ اس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جا بجا اس میں فن کے لحاظ سے سب خامیاں نظر آئیں گی، اہلِ ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک وارفتہ عاشق مزاج عشق کے اتھاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کے دل بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک ایسا شاعر ہے جس کے قدم پامال رستے سے ادھر ادھر جا پڑتے ہیں۔ لیکن یہ ایک راہ گم کردہ کی آوارگی نہیں، ایک مست کی لغزشیں ہیں۔ نشے میں چور، کیف میں سرشار، جو پیتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔ پیالے میں بھی بھر کر دیتا ہے اور یوں بھی لنڈھاتا ہے۔ ایک آزاد جو گاتا ہے اور الفاظ اس کی زبان پر ناچتے ہیں۔

ہمارے شاعر برسوں سے ترک شیرازی پرست ہیں۔ ایک ایسی شراب ہی سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں۔ شاعری ایک فریب ہے لیکن اس تصنع کا کیا نام ہے جو کسی کو دھوکہ نہ دے سکے؟

حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے لیکن ابھی وہ ترک شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے۔ یہ بے وفائی آخر کب تک؟ عاشق کہ نظر باز؟

۱۹۲۵ء

"پطرس"

جھولنے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی کتاب کا دیباچہ

ایسی ہی چھوٹی کتاب پر جو چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے دیباچہ کا بوجھ ڈالنا چاہئے تھا لیکن بچوں کے ساتھ قدرت نے والدین کی اور انسان نے استاد کی پخ بھی لگا رکھی ہے۔ صوفی تبسم کو جو مصنف کتاب ہونے کے علاوہ والد بھی ہیں اور استاد بھی، یہ گوارا نہ ہوا کہ بچوں کو تو بہلایا جائے اور والدین اور استادوں کی پروا نہ کی جائے۔ اس لئے قرار پایا کہ وہ بچوں کو نظمیں سنائیں اور میں والدین وغیرہ کو باتوں میں لگائے رکھوں۔

بچوں کا بہلانا سہل ہے۔ بڑوں کا بہلانا سہل نہیں۔ بچوں نے تو یہ پڑھا کہ "چیچوں چیچوں چاچا، گھڑی پہ چوہا ناچا" اور خوش ہوئے۔ بڑے کہیں گے۔ چیچوں ہونے کو کسی لغت میں دیکھا نہیں۔ اور اگر چاچا سے مراد چچا ہے تو یہ شائستہ لوگوں کی زبان نہیں۔ اور یہ جو گھڑی پہ چوہا ناچا تو آخر کیوں؟ ہوا بہرحال اس تک بندی کا نتیجہ کیا؟ اس سے بچوں کو کون سا سبق حاصل ہوا؟

یہ سب سوال نہایت ہی ذمہ دارانہ سوال ہیں۔ بالفاظ دیگر ان لوگوں کے سوال ہیں جو اپنا بچپن بھلا بیٹھے ہیں۔ یا جو یہ تہیہ کئے بیٹھے ہیں کہ جن باتوں سے ان کا بچپن رنگین ہوا تھا وہ اس دنیا میں اب نہ دہرائی جائیں گی۔ تک بندی کی طرف سے بے فائدہ بات ہے [illegible] چاہئے۔

خدا کا شکر ہے، صوفی تبسم کو ایک ایسی دانائی عطا ہوئی ہے کہ نادانی کی لذت سے ابھی محروم نہیں ہوئے۔ وہ جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن ایک عجیب و غریب دنیا ہے جس میں پیڑوں پر ناگ ناچتے ہیں، اور بلیاں بیر کھاتی ہیں اور ٹرر موٹر، چھم چھم، ٹم ٹم میں آہنگ اور لے کی وہ تمام لذتیں سما جاتی ہیں جو بڑے ہو کر تان سین کی کرامات سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں گڑیاں اور جانور اور پرندے اور انسان سب ایک دوسرے کے دوست ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ گویا سب مخلوق ایک ہی خدا کی مخلوق ہوتی ہے۔ بڑے ہو کر ذہن انسانی ہزار فلسفیانہ کشمکش اور خیال آفرینی کے بعد بھی مشکل سے اس سطح پر پہنچتا ہے۔

اس لئے قابل رشک ہیں صوفی تبسم کہ بلا تکلف اس رنگین دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صوفی تبسم ایک خوش فکر سخن سنج اور سخن گو ہیں۔ اردو فارسی غزل استادانہ کہتے ہیں اور جذبہ اور ادا کی باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں یہ مجموعہ ان کی شاعری میں اتوار کا دن ہے اور یوں تو اردو رسالوں میں انہوں نے بڑے بڑے اساتذہ کا تتبع کیا ہے لیکن یہ نہ سمجھے کہ اس دن وہ بالکل ہی خالی الذہن ہو کر بیٹھتے ہیں اور جو منہ میں آئے کہہ ڈالتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام قافیے اور وزن اور آہنگ اور الفاظ کی نزاکتوں پر قادر ہوئے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس لئے صوفی تبسم کی پختہ کاری اور طباعی کے شواہد اس میں جا بجا آپ کو نظر آئیں گے۔ ایسے کلام کا درجہ سہل ممتنع کا درجہ ہے۔ جیسے سہل ممتنع سہل نہیں ہوتا اسی طرح سہل ممتنع بھی سہل نہیں ہوتا۔ دعا ہے کہ صوفی تبسم کا یہ بچپن ہمیشہ قائم رہے اور ان کے قدر دان ہمیشہ انہیں یہ کہنے کے قابل ہوں کہ چہل سال عمر عزیزت گذشت، مزاج تو از حال طفلی نگشت۔ پطرس

دہلی ۵ مارچ ۱۹۴۹ء

ایران میں اجنبی

ن۔م۔ راشد کی نظموں کے دوسرے مجموعہ کی تمہید

راشد صاحب! یہ مجموعہ جب چھپ جائے گا تو آپ ایک نسخہ مجھے مفت بھیجیں گے۔ بلکہ اس پر میرا نام بھی اپنے قلم سے لکھ دیں گے۔ اور میں فخر سے لوگوں کو دکھاتا پھروں گا۔ اور اسے بلاوجہ اپنا ہی کمال سمجھوں گا۔ کہ میرا ایک شاگرد اردو کے دورِ حاضر کا بہت بڑا شاعر ہوا اور میری اس سخن دری پر کہ خواہ مخواہ آپ کی شاعری پر اپنا حق جتا رہا ہوں ہنسیں گے بھی اور اسے ضعف المسنین سمجھ کر معاف بھی کر دیں گے لیکن یہ تو آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا کہ قبل از وقت اس کتاب کے پروف مجھے پڑھنے کو دے دیے آپ کو معلوم ہے کہ میں انہیں کس شوق سے ساتھ لیے۔ ان کی غلام گردشوں میں اٹھائے اٹھائے پھرا ہوں کہ ع

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ارمان کو بیچ میں لا کر دزدیدہ۔ اوقات میں آپ سے کیسی مزے مزے کی بحثیں رہی ہیں ان کے میلے ڈیریا میں ہوئی ہیں۔ اور ہم اپنے آپ کی شاعری کو سمجھانے سمجھنے کے بہانے سے اردو سے کتنی عشق بازی کی ہے۔ اجازت ہو تو آپ کے نام ایک مکتوب بھی اس عاشقی میں لکھ ڈالوں اور آپ سے یہ جو حجت ہے اس کا عیب پوش رنگین پردہ اپنی بے سود نگاری پر ڈال لوں۔ تاکہ کوئی بات میرے پاس کہنے کے قابل نہ ہو اسے لوگ سننے کے قابل مزید کہیں ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

راشد صاحب! وہ دن آپ کو یاد ہے جب آپ کی نظم "اتفاقات" شائع ہوئی تھی اور میں آپ کے گھر پر قلعہ گوجر سنگھ میں والہانہ آپ کو مبارک باد دینے آیا تھا۔ ان دنوں ابھی جدید شعرا پر سخت طعن برابر ہو رہی تھی۔ اور ان کی ثانیہ آزادی اور عروض کی بے راہ روی پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ لوگ پرانی وضع کی شاعری سے اکتاتے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ غزل بھی جب تک نئے شباب، نئی نظر اور نئے اسلوب کی حامل نہ ہو بزم میں توقیر نہیں پاتی۔

اس انقلاب میں کن کن قوتوں کا ہاتھ ہے جسے مورخ اپنے مقام پر بیان کرے گا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے وہ جانتے ہیں کہ دورِ جدید کے اکثر شعرا نے آپ اور فیض اور آپ ہی جیسے معدودے چند باغیوں سے ہدایت پائی ہے ورنہ نہ معلوم ہماری شاعری کی کشتی اور کتنا عرصہ دلدل میں پھنسی رہتی۔ جیسا کہ آپ نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے آپ لوگوں کی تربیت میں مغربی علوم کو دخل تھا جس سے متقدمین بے بہرہ تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دورِ جدید کے ذہنی اور معاشرتی طوفانوں اور زلزلوں کی بدولت آپ کو ایک نئی بینش نصیب ہوئی۔ اور آپ لوگوں نے وہ افق دیکھے۔

جو اس سے قبل نظروں سے اوجھل تھے۔ ممکن تھا کہ آپ کی شاعری ایک نیا اندازِ فکر اور نئی زبان بلکہ نیا لہجہ (بقول آپ کے نئی ہیئت) اپنے ساتھ نہ لاتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی تخیل کتنے نوخیز شاعروں کی بہت بڑی بلکہ ناشدہ کے اسلوبِ بیان میں آ نکلی ایسا نشہ ہے۔ ان کے بعض معتقدین کچھ زیادہ ہی پی گئے۔ یہ جاذبیت بلکہ جادو فیض میں بھی ہے۔ لیکن فیض کی کسی ادا میں شعر نے نظم میں ڈھل کر جاتی ہیں برچھے اور ہر پھیل میں لغزش نہیں آتی۔ اس کے مقابلے میں آپ کا چسکا نوجوان شاعر کو بہت جلد پڑ جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بزم میں شمع پہلے کس کے سامنے رکھی جائے۔ اس قسم کا سابقہ ہی مقصود تھا اس سے تو محض یہ واضح کرنا تھا کہ آپ سے پہلے شعرا جو اثر پذیر ہوئے تو ان کے اور آپ کے تصرفِ نظر کے امین کیا علاقہ تھا۔

ایران میں اجنبی کا عنوان ایک دلچسپ فریب ہے۔ میں نے آپ خود بھی شکار ہوئے۔ اس عنوان کے تحت میں جو تیرہ قطعے آپ نے یک جا کر دیئے ہیں۔ ان میں احساس جذبے کا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ جسے عزیز لکھنوی نے ایک مطلع میں یوں بیان کیا ہے ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

(داخلِ ایران ہونا؟) ہر چند کہ ایران آپ کا جغرافیائی وطن نہیں اور تہران اور لاہور کا فرق واضح ہے تاہم جس ذہنی اور عقلیاتی دنیا میں آپ کی شاعری بار پاتی ہے وہ ایران سے دور نہیں بلکہ وہ تو ہندوستان سے دور تر ہوگی۔ سعدی اور حافظ اور خیام اور عرفی اور نظیری کی دنیا میں آپ اجنبی کیوں کر ہوتے؟ ایران تو ہمارے شعراء کا روحانی وطن ہے۔ ہندوستان میں جو پردیسیوں کی سی اداسی ذہن پر چھائی رہتی ہے وہ نسبتاً ایران اور عربستان کی ذہنی یا جسمانی سیاحت سے دور کرتے تھے۔ آپ کے قطعات اس بات کے گواہ ہیں کہ آپ کو ایران میں بیگانگی کا نہیں بلکہ ایک نئی یگانگت کا احساس ہوا۔ "من و سلوٰی" میں تو آپ ایران سے در پردہ یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اجنبی نظر آتا ہوں، اجنبی ہوں نہیں ؎

بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں

اور پھر زبان بھی آپ کے رفاقی بھائی کی زبان ہے اجنبی کی نہیں ——

خدائے برتر
یہ داریوشِ بزرگ کی سرزمیں
یہ نوشیروانِ عادل کی داد گاہیں
تصوف و حکمت و ادب کے نگار خانے

آپ کے قلم نے تو آپ کے لئے ایران میں اجنبی کا لقب انتخاب کیا لیکن آپ کا دل پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ میں اپنے بھائی اور زبانِ عجم سے ملنے آیا ہوں۔

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ جب آپ انگریزی کی وردی پہن کر ایران پہنچے تو ماحول نے پھر اس طرح آپ کا دامن کھینچا اور ماضی کی یادوں نے آپ کے دل پر کچھ ایسی دستک دی کہ آپ ہندوستان اور انگریز دونوں کو بھول گئے اور آپ کے سیاہ فام "مجسم میں ایشیائی" روح بیدار ہوئی۔ وہ احساسِ مظلومیت جس سے کم ہی کوئی ہندی ناآشنا تھا۔ اس میں ایک نئی کسک پیدا ہوئی اور غیر کے بے پناہ بچھڑے ہوئے ستم نے ایک نئے انداز سے آپ کو پچھاڑ دیا۔
ایشیائیوں کو آپ نے دیکھا کہ ——

قدیم و ہوس سراؤں کی اک نژاد کاہل ہیں
اور یہی جن کی راہوں پر تیز گامی سے جا رہے ہیں

تو آپ بہتر، یہ جو فرمائے ———

ان دیئے درخشندہ شہروں کی
دریئہ فصیلوں کو مضبوط کر لو!
ہر اک برج و بارہ پر اپنے نگہبان چڑھا دو۔
گھروں میں ہوا کے سوا
سب صداؤں کی شمعیں بجھا دو!
کہ باہر فصیلوں کے نیچے
کئی دن سے رہزن ہیں خیمہ فگن

یہ چونکا دینے والے اشعار آپ کے مجموعہ میں کتنی جگہ ملتے ہیں۔ ہاں ایسے وطنی شاعری بھی ملتے ہیں اور قومی شاعری بھی، اخلاقی بھی، اور اشتراکی بھی لیکن جہاں تک میری نگاہ پہنچتی ہے ایشیائی شاعر آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

کیا یہ احساس ایک قسم کا سیاسی احساس ہے؟ کیا یہ کہنا کافی ہے کہ اس دور میں راشد نے سیاسیات کا رخ کیا؟ کیا آپ کی اس نوع کی نظمیں سیاسی کہلائیں گی؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا تسمیہ تو اہلِ کتب کے سوا کسی کو پسند نہ آئے گا۔ آپ کا شمار "سیاسی شاعروں" میں کرنا کور ذوقی معلوم ہوتی ہے کسی نازک مزاج کی اس سے تشفی ہرگز نہ ہوگی۔ کیوں کہ اکثر مقام ایسے ہیں جہاں ہر چند کہ آپ سیاسیات کی زبان ہی کا کرشمہ دکھا رہے ہیں، لیکن آپ کی نظر اور جبلتوں پر پڑ رہی ہے اور روح کی بعض گہرائیاں آپ کو ایسی ملتی ہیں، جو محض سیاسیات کی تہ سے عمیق تر ہیں۔ مثال کے طور پر "کیمیاگر" کو لیجئے جو بظاہر ایرانی سیاست کے ایک دور کا مرقع ہے۔ شروع شروع میں تو اس نظم کا منشا واضح اور سطحی معلوم ہوتا ہے لیکن پارہ پارہ نظم کی عمارت ابھرتی جاتی ہے بات آمریت اور آمر سے شروع ہوئی تھی لیکن ذیل کے اشعار ایسی خودبینی کا المیہ ہیں جو اپنی سزا اپنے ساتھ لاتی ہے، اور جس کی گرفت جنوں کی سی گرفت ہے ———

مگر وہ تیری حد سے گزری ہوئی رازداری
کہ جس نے تجھے
اپنے افکار کے قید خانے میں
محصور سا کر دیا تھا
وہ زنداں جہاں گھوم پھر کر نگاہیں
فقط اپنا چہرہ دکھاتی تھیں تجھ کو
جہاں ہر تقیّہ کو تو
سفیدِ ابہام کے شیشہ گروں میں دیکھتا ہے

شہر اور قصبے کے ملفوف زندان
جو ہندوستاں میں انسانی گلوں کے

اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ انہی چند اجنبیوں کی بدولت آپ یہ بھی عطا فرما سکتے ہیں ——

سنو کہ اچھی کا ظلم سہتے ہوئے برہمن
کہ جن کا سایہ بھی برہمن کے لئے
ہے وزرِ شبِ زمستاں
وہ سوچتے ہیں
کہیں یہ ممکن ہے
بچا اس کا
ہم گریہ و فروشِ بازنگ
اب اسی برہمن کے ہاتھوں
کہ جس کے صدیوں پرانے پیسے
آج بھی گرد کرتے ہیں ہم سب
جواب بھی چاہیے
تو روک سکے ہم سے لہو عرفاں

ایسے شعروں سے محروم رہ جانے کے منظور ہوگا۔

باقی رہی شدت تو اس کی رمق آپ میں آغاز ہی سے پائی جاتی ہے اس کے لئے ہماری تنقیدی زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں مثلاً سیاق وسباق کے اعتبار سے کبھی اسے جوش کہہ لیتے ہیں کبھی جذبہ۔ لیکن مجھے تلاش ایسے لفظ کی ہے جس میں جوش اور جذبہ کے علاوہ کچھ درشتی بھی پائی جائے جیسے کوئی کسی سے انتقام لے رہا ہو جب شدت اس حد تک پہنچے تو مزا کچھ تلخ ہو جاتا ہے شاعر اپنی ہی کیاریاں کو روندتا ہے جیسے بچہ ضد میں آکر چیزیں توڑ ڈالے۔ شروع شروع میں یہ منہ زوری غالباً آپ کے شباب کا تقاضا تھی اور چونکہ ہمارے بیشتر جدید شعراء جوان ہیں یا جوانی کے دنوں میں انھوں سے کام لیا گیا۔ اور علاوہ برآں آزادی (سیاسی یا معاشی یا ذہنی) کی پیاس سے ہمیشہ ان پر ایک اضطراب طاری رہتا ہے اس لئے اس معاملے میں آپ تنہا نہیں مگر آپ کی محبوب نظمیں وہی ہیں جن میں اس شدت پر شاعری غالب آئی اور اسے اپنے پہلے سے بڑھنے نہ دیا۔ مثلاً میں کہتا ہوں کہ جہت میں آپ اس شدت پر پورا قابو پا سکے جن کا "درویش" اور "تیل کے سوداگر" میں قائل ہونا پڑتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری پختگی کے اس درجہ تک جا پہنچی ہے۔ جہاں درشتی سے آپ کا قلم ناآشنا ہو جاتا ہے۔ "درویش" اور "سوداگر" جیسی نظمیں دیر تک دلوں میں گونجتی رہیں گی۔ کیونکہ کنایہ جو شاعری کی جان ہے ان نظموں میں باوجود جوش اور جذبہ کے شدت کے ہاتھوں گند ہونے نہیں پایا۔

میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو
میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو

کو دیکھی ہیں میں نے بہارِ دراز کی چوٹیوں پر شعاعیں

یہ حسن کی وہ تمثیلیں ہیں جنہیں شاعر نے بے ساختگی کے ساتھ دو تین مصرعوں میں پیش کر دیا ہے اور "درویش" کا یہ پارہ بھی آپ کو یاد ہوگا ——

یہ درویش
جن کے آبا و جد
وہ صحرا کے دیوانوں کی ریت پر
تھک کے مر جانے والے
اسی کی طرح تھے
تہی دست، درماندہ، تیرہ نصیب، غلطاں
جو تسلیم کے بے نیازی کی خاطر
ہمیشہ کی محرومیوں ہی کو اپنے لیے
بال و پر جانتے تھے
جنہیں تھی فروغِ گدائی کی خاطر
جلالِ شہی کی بقا بھی گوارا
جو داشتوں میں پلتے تھے
کہتے تھے داشتوں سے
"سوتے رہو
صبحِ فردا کہیں بھی نہیں ہے"
وہ جن کے لیے حریت کی نہایت یہی تھی
کہ شاہوں کا اظہارِ شاہنشہی حد سے بڑھنے نہ پائے
بھلا اس کی کس کو خبر ہے؟

"داشتوں" کا ذکر آیا تو میں نے سمجھا کہ آپ پھر بہکنے لگے۔ نہ معلوم کیا درشت کلامی کریں گے لیکن ضبط ہاتھ سے نہ چھوٹا اور آخری جملے نے اپنی ملائمت سے وہ اثر پیدا کیا جو شدت سے نہ ہو سکتا۔ اس مجموعے میں "درویش" کیا بہ اعتبار صنعت اور کیا بہ اعتبار وارداتِ قلب اور مزاجِ شاعری کے کامل کلام ہے۔

آپ نے بجا فرمایا کہ "بعض قطعے محض منظوم مختصر افسانے ہیں جن میں زیادہ زور کسی تصویر کشی پر ہے یا کسی واقعے کو بیان کرنا ہے تاکہ اس سے وہ تاثر پیدا ہو سکے جو شاعر کے دل پر ہوا تھا۔ بعض نظموں کی حیثیت اسکیچ یا اشارے کی سی ہے بعض خود کلامی سے زیادہ نہیں"۔ یہ ہنرگری بھی جدید شاعری کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ آپ نے اس نئے اسلوب کو جس کے آپ بانیوں میں ہیں ہر طرح آزمایا ہے جس کی مثالیں اس مجموعہ میں جابجا پائی جاتی ہیں۔ آپ نے داستان کو جس بے تکلفی سے اپنی نظموں میں نبھایا ہے وہ یقیناً پڑھنے والوں کی نظر سے چھپی نہ رہے گی۔ ہماری شاعری میں داستان گوئی نئی چیز نہیں

اور جہاں داستان یا افسانہ ہو وہاں مکالمے سے مفر نہیں۔ لیکن قدما کے مکالمے الف سے الف بے ..... کی ترتیب سے سیدھی سڑک پر لڑھکتے چلے جاتے تھے ـــ

یک بیک تھرا رہی تھی وہاں

ہل رہی تھی عرش تک ایوان

رقص کرنے لگا۔ لیکن جدید شاعری میں مکالمہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے جہاں متکلم کے جذبات کے ساتھ ساتھ لب و لہجہ، شاعر کے خیالات، کرداروں کی آپس میں الجھن سب کو ایک ساتھ نبھانا پڑتا ہے۔ یہ مہم آپ کو اس مجموعے میں جا بجا پیش آئی۔ اور آپ نے اسے جا بجا چابک دستی سے سر کیا ہے۔ آپ وسعت مضامین میں قدرتی مناظر کا ذکر کرنا بھول گئے۔ حالانکہ یہ خوبی آپ کی نظموں میں بہت نمایاں ہے ـــ

زمستاں کے دن تھے

تماشا ہو رہی تھی سر شام سے برف باری

دریچے کے باہر سپید سے انبار سے لگ گئے تھے

مگر برف کا رقص پیہم تھا جاری

......

مگر رات ہوتے ہی چاروں طرف بے کراں خامشی چھا گئی

خیاباں کے رو رویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ

برف کے گالے پرندوں سے بن کر ٹھٹھر سے گئے تھے

زمیں ان کے بکھرے ہوئے بال و پر سے

کفن آلود ساحل سا بنتی چلی جا رہی تھی

بہاری شاعری ـــ

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی

بن گیا روئے آب پر کائی!

ـــ کتنی دور نکل گئی ہے۔

آپ نے یاد دلایا کہ آپ کی نظمیں قسم قسم کے نقوش کا مجموعہ ہیں تو رابرٹ براؤننگ یاد آیا۔ اس کی نظموں میں بھی افسانے، اسکیچ، خود کلامی، مکالمے، کہانیاں غرضیکہ ایک فراوانی پائی جاتی ہے۔ اسے بھی وہی مشکلات پیش آئی تھیں جو غالباً آپ کو بھی پیش آئی ہوں گی۔ اس کے کلام کو بھی بعض اوقات ایسا اختصار اختیار کرنا پڑتا تھا کہ معنی کا سمجھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے لیکن اس کی قوت تخلیق بھی ایسی تھی کہ بہتے چشمے کے پانی کی طرح ہر قسم کے پتھر کو ٹھکراتی ہوئی چلی جاتی تھی۔

"پطرس"

نیو یارک

[illegible]

معاوضے میں اپنا وقت دیتا ہوں - ہادی - مولوی بھی کام [illegible] کرتے ہیں طالب العلموں کو پڑھاتے ہیں - لوگوں کو مسئلے مسائل بتاتے ہیں - کیا ان باتوں میں ان [illegible] نہیں ہوتا ؟ آزاد - تو لوگ ثواب [illegible] مولویوں کی خدمت [illegible] کو مزدوری دیتے ہیں ہرگز ثواب کی توقع نہیں رکھتے - حق دار کو اس کا حق دینے میں کاہے کا ثواب ہادی - ثواب اس بات کا کہ ہمارا روپیہ نیک کام میں صرف ہوا - مولوی معاش [illegible] ہوں گے تو لوگوں کو ہدایت کریں گے - آزاد - وہی ایک ثواب بگولی [illegible] الگ اس کے [illegible] میں اور مولویوں کے خدمت گزار الگ اس کے امیدوار - ہادی - کیا خدا کے یہاں کسی چیز کی کمی ہے وہ بڑا کریم ہے [illegible] کو اختیار ہے ایک عبادۃ پر جس کو جتنا چاہے ثواب بخش دے - تم تو کبوں دیکھنے لگے تھے اور دیکھا ہوگا تو یاد کیوں رہنے لگا تھا - حدیث شریف میں آیا ہے (بلفظہ یا [illegible] یعنی کو خدا [illegible]) کہ پیغمبر صاحب نے یہود اور نصاری کی اور اپنی اُمت کی مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص نے صبح سے دوپہر تک چند مزدوروں سے مزدوری ٹھہرا کر کام لیا اور دوپہر ہی ان کی مزدوری پوری پوری چکا دی چار گھڑی دن رہے سے شام تک دو مزدوروں سے دگنی مزدوری پر کام لیا اور دن چھپے ان کو دوہری مزدوری دی - تو کیا جن مزدوروں نے پہلے کام لیا شکایت کر سکتے ہیں کہ ہم کو مزدوری کم ملی ؟ ہرگز نہیں - یہ مثال اس لئے بیان فرمائی تھی کہ ہمارے پیغمبر صاحب کی اُمت کی عمر تھوڑی عبادۃ کم اور ثواب زیادہ - خواجہ آزاد - اس حدیث کو مطلب سے کچھ بھی مناسبت نہیں - اگر خدا اپنا ثواب ایسی بے احتیاطی سے لٹانا چاہتا ہے جیسے ہندوستانی رئیس اپنی دولت کو تو بے شک اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا لیکن میں اس وقت اس میں بحث نہیں کرتا - میں کہتا ہوں کہ مولوی اور جو لوگ مولویوں کی خدمت کرتے ہیں تمہارے عقیدے میں یہ دونوں ثواب کے مستحق ہیں لیکن میرے نزدیک اسلام کا ضعف - مسلمانوں کی تباہی - خستہ حالی - مفلسی - دون ہمتی - نالیاقتی سب کا وبال مولویوں کی گردن پر ہے خدا نے انگریزوں کو وقت کا حاکم بنایا باستحقاق - اور ہم پر ان کو مسلط کر دیا بزور عقل - [illegible] سے سند پکڑتی ہو اور میں قرآن سے استشہاد کرتا ہوں [illegible] ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عبادی الصالحون - کیوں یہ قرآن کی آیۃ ہے یا نہیں ؟

ع۱ اور ہم نے زبور میں [illegible] یہ بات لکھ دی تھی کہ میرے [illegible] زمین کے وارث ہوں گے

چھپے چوری

ہاجرہ مسرور کی کتاب "چھپے چوری" کا دیباچہ

جب بیسویں صدی پروان چڑھی اور ادیبوں کی فہرست میں کئی عورتوں کے نام چمکنے لگے تو بعض نقادوں کو جن میں خواتین بھی شامل تھیں اس سوال نے گدگدایا کہ کیا عورتوں کا ادب مردوں سے جدا ہوتا ہے؟

انسان ہمیشہ سے یہی پوچھتا چلا آیا ہے کہ عورت اور مرد میں کیا فرق ہے؟ جو فرق آنکھوں کو نظر آیا اس سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اس سے تو الجھن اور بھی بڑھی کہ ظاہر کا یہ حال ہے تو باطن میں خدا جانے کتنے فاصلے ہوں گے۔

عورت مرد نہیں بن سکی۔ مرد عورت نہیں ہو سکا۔ آدھی دنیا آدھی دنیا سے اجنبی۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کو چھوتی اور ٹٹولتی چلی آئی ہے لیکن جب عورتیں بھی ادب کی دنیا میں مردوں کی ہمسایہ بن کر رہنے لگیں تو اندھیرا کچھ کم ہوا کیونکہ سب سے بڑھ کر ادیب کی فطرت کا مخبر اور غماز کوئی نہیں۔ یہ تو پوچھنے سے بھی زیادہ پردہ در ہے۔ پہلے پہل تو ادیب عورتوں نے مردوں کی نقل کی۔ گویا اپنے روپ میں سامنے نہ آئیں یا ادب کے کسی روایتی مسلک پر اوڑھ کے ساتھ ہو لیں۔ جہاں سب ہم سفروں کا بھیس ایک سا ہوتا ہے اور ایک سے دوسرا پہچانا نہیں جاتا۔ لیکن جب خود اعتمادی بڑھی اور سچی باتیں کہنے لگیں تو مردوں سے الگ نظر آنے لگیں۔

ایک جدید انگریزی ناول کی ہیروئن کہتی ہے "میں ایک عورت ہوں، میری زندگی کیا ہے، ایک لمبی مضبوط سی رسی جو کئی شخصی اور ذاتی رشتوں کے دھاگوں سے بٹی ہوئی ہے۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔" عورتوں کے ادب کو غور سے دیکھئے تو یہ کلیہ کچھ ایسا غلط معلوم نہیں ہوتا۔ ادیبوں کی فہرست میں کئی مرد آپ کو ایسے ملیں گے۔ جن کی روح کائنات کے جنگل میں آسودگی ڈھونڈتی پھرتی ہے یا انسانی رشتوں کو توڑ کر منہ زور گھوڑے کی طرح سب کچھ پھاند جانا چاہتی ہے لیکن عورتوں کی جذباتی دنیا شخصی اور ذاتی ماحول تک ہی محدود رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ ادیب عورتوں نے جو رتبہ افسانہ اور ناول میں حاصل کیا ہے کسی اور صنف ادب میں نہیں کر سکیں معلوم ہوتا ہے فطرت نسوانی شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال ہی میں الجھی رہتی ہے اور یہ جال سب سے زیادہ دل جمعی اور فراغت کے ساتھ ناول اور افسانے ہی میں بُنا جا سکتا ہے۔

شخصی رشتوں کی دنیا محدود سہی لیکن پایاب نہیں۔ اس کی گہرائیاں آفاق کی وسعتوں سے کم نہیں، اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ عورتوں کا ادب مردوں کے مقابلے میں ہمیشہ دبا دبا رہے گا۔ فطرت نسوانی نے پنہائی اور وسعت کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہو، عمق کو اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتی۔

یہ خصوصیت یعنی شخصی رشتوں میں انہماک۔ آپ کو ہماری اکثر ادیب عورتوں میں ملے گی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی فطرت کو جھٹلاتی نہیں۔ بلکہ خلوص اور دیانت داری سے نبھاتی ہیں، سچ پوچھئے تو اس معاملے میں ان کا اندازِ عمل مردوں سے زیادہ روشن ہے ہمارے ہاں ادیب عورتوں

کی تعداد بہت زیادہ نہیں لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کی روداد جس جرات اور بے ساختگی کے ساتھ انہوں نے پیش کی ہے اس سے ہمارے موجودہ ادب کو بھی نیا ملکی کے گن گنانے والے پڑھے ہیں اور سب اردو ادب کو ان کی بدولت تازہ ہوا نصیب ہوئی ہے

ہاجرہ مسرور کا یہ مجموعہ تانا بانا کا ایک اور مجموعہ ہے۔ پہلے مجموعوں میں بھی انہوں نے اپنی نسوانی فطرت ہی کو نبھایا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی فطرت ہی کو نبھا رہی ہیں۔ ان کی نظر پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور گہری ہے۔ لیکن شخصی اور ذاتی رشتوں کے جال وہ یہاں بھی بن رہی ہیں۔ انہوں نے ادھر پیار سے ان رشتوں کی دنیا میں ایک حیرت انگیز دیا ہے۔ ان میں انسان ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں، اور دھکیلتے بھی ہیں اور یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ سے کھینچے اور دوسرے سے دھکیلتے ہیں۔ اور زندگی اس جال میں تنی تنی سی رہتی ہے۔ شوپن ہاور کا قول ہے کہ "انسانوں کی مثال ان خار پشتوں کی سی ہے جنہیں سردی لگ رہی ہو، ٹھٹھرنے لگتے ہیں، تو گرمی کے لیے ایک دوسرے کے قریب سرک آتے ہیں۔ کانٹے چبھتے ہیں تو ایک دوسرے سے پرے ہٹ جاتے ہیں۔ اور پھر ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔"

کیا آپ کو بھی نقشہ "آپ ہی کی دنیا کا ذکر ہے کہ...." میں نظر نہیں آتا؟ اس میں شوہر اور بیوی کے درمیان ایک تناؤ اور ایک تڑپ ـــ ایک بیر اور ایک کشش ہے جسے ہاجرہ نے بہت نزاکت سے بیان کیا ہے۔ اس کہانی میں ہاجرہ چھوٹے چھوٹے بے وجہ جھگڑوں کو اس بے تعلقی سے بیان کرتی چلی گئی ہیں کہ تھوڑی دیر کے بعد منافرت کے اس ریشے ہوئے سلسلے سے ڈر لگنے لگتا ہے جس فریب خوردگی کو وہ بیان کرنے چلی تھیں، وہ شاید کہانی کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے لیکن کوئی پڑھنے والا اس کہانی کی اٹھان ہی کو دیکھ کر افسانہ نویس کے فن کا قائل ہو جائے (کہانی کا انجام خواہ کچھ ہی ہو) تو ہاجرہ کو اس پر برہم نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ اسے بھی قدردانی ہی سمجھنا چاہئے۔

• "کانچ" بھی ایک شوہر اور بیوی کی کہانی ہے۔ یہاں بھی بیوی کے دل میں احتجاج اور تسلیم کے جلے بھنے جذبے پلتے جاتے ہیں اور اگر فریب خوردگی نہیں تو ایک بے بسی ضرور ہے لیکن بیوی اسے ظاہر نہیں کر سکتی کیونکہ اسے ظاہر کرنا آتا ہی نہیں۔ اس الجھاؤ کو میاں بیوی دونوں میں سے کوئی بھی ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکتا۔ شوہر کبھی چٹکیاں لے گا کبھی بیوی کی خاموشی سے اکتا جائے گا۔ بیوی کبھی ہنس دے گی، کبھی اس کے آنسو نکل آئیں گے اور ان دو ہم بستر اجنبیوں کی عمریں یوں ہی ایک دوسرے سے بے خبر گزرتی چلی جائیں گی۔

• "ایک بچی" کو آپ محروم ممتا کا افسانہ کہنا چاہیں تو نہ افسانہ کو اس سے انکار ہوگا نہ افسانہ نگار کو، لیکن یہاں بھی اس کے علاوہ تعلقات اور رشتوں اور ماحول کی کئی الجھنیں ہیں جن کا حال زاہدہ (ہاجرہ سے پوچھے بغیر) ہمیں سناتی چلی جاتی ہے:

"نہ جانے کیوں دبی دبی کیفیتوں سے نفرت ہونے لگتی ہے . . . گلی کے اس مکان میں
رہ کر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اس کے باپ نے ناراض
ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا..... میرے اندر ہی اندر کوئی الجھ کر ٹھنکنے لگا . . . .
میری جوان جوان بہنیں اور بوڑھی ماں۔ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ گھسیٹ کر گلی
میں ڈال دوں ...... گلی میں جیسے کوئی نشہ میں ہنکتا ہوا گزرا، مست اور بے پروا، اور
مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری بانہیں بھی تھک گئی ہیں، پانی بھرتے بھرتے تھیں، سینے
پر بے کار پڑے پڑے، پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پر اٹھاتے اٹھاتے۔"

ایسے جال ہاجرہ بہت ہی پھرتی اور بے تعلقی سے بُن لیتی ہیں۔ تار تار کر کے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی گتھیاں تھیں اس جال میں اور

معلوم ہو سکنے سے پہلے انہیں اپنے دماغ میں کیوں کر سلجھایا ہوگا۔ اور دھاگوں کے سب پیچ کیوں کر یاد رہے ہوں گے۔ اس سینے کی اصلی قدر کوئی مشاق افسانہ نگار ہی کر سکتا ہے جو آپ کو بتائے گا کہ یہ کام کتنا مشکل ہے اور ہاجرہ نے اپنے تخلیقی جذبے کی بدولت اسے اپنے لئے کتنا سہل بنا لیا ہے۔

اس مجموعے میں کم از کم دو کہانیاں ـــ "سرگوشیاں" اور "لا علاج" ـــ ایسی ہیں کہ ہمارے جدید ادب کو ان پر فخر کرنا چاہیے۔ دونوں کا حسن ایک دوسرے سے جدا ہے۔ "سرگوشیاں" ایک کردار کی مسلسل تقریر ہے جو اپنی تیز ندی میں ماضی کی باتیں بہا بہا کر ہمارے سامنے لاتی چلی جاتی ہے۔ بخار کی سی تیز گفتاری نے کہانی میں ایک بے پناہ قوت، شدت اور حرارت پیدا کر دی ہے۔ جو ہر پیراگراف کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کا خطیبانہ انداز شروع شروع میں کھٹکتا ہے۔ جیسے کوئی شیر آیا شیر آیا وہ دنا پکار کر ہمیں زمانے کی کشش کرتا ہو لیکن جب پتہ چلا کہ گزشتہ زندگی کے اوراق ایک ایک کر کے الٹنے لگے ہیں۔ تو گہرائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ بالآخر بات بہشت کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ یہ خطابت کا انداز خطرات سے پُر ہے لیکن ہاجرہ نے باوجود ڈرامائی طمطراق کے کہانی میں کہیں بھی کھوٹ نہیں آنے دی۔ "لا علاج" میں ایک دادی ہے ایک پوتی ـــ دونوں میں سے جسے چاہیں آپ کہانی کا محور سمجھ لیں۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاجرہ نے یہ کہانی پوتی کو سامنے بٹھا کر لکھی ہے لیکن مجھے تو پوتی بھی دادی ہی کی طویل الجھی ہوئی زندگی میں ایک الجھن معلوم ہوتی ہے۔ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے بکھرے ہوئے زندگی کے ٹکڑوں کو ہاجرہ نے ایک مختصر افسانے کی حدود کے اندر اس خوبی اور حسنِ انتخاب سے سمیٹا ہے کہ اس کی مثال اردو میں مشکل سے ملے گی۔ ہمارے دور میں کوئی کہانی اپنی تکمیل، اصلیت اور حساسی کے اعتبار سے اس رتبے کو پہنچی ہے تو وہ کم از کم میری نظر سے اب تک نہیں گزری۔ اس افسانے میں بڑھیا، جن کی بجائیں بجائیں کرتی تنہائی کو دیکھ کر مجھے ایک اور ناول نگار عورت کا ایک کردار یاد آیا جو کرین ہی کی طرح عمر بھر انسانی رشتوں کا محتاج رہا اور یہی رشتے ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چلے گئے۔

"اس کی روح ایسی ویران اور اجاڑ تھی کہ اس ویرانی کے مقابلے میں بیرونی ماحول کی کوئی حقیقت ہی معلوم نہ ہوتی تھی۔ تنہائی نے دل میں اپنے پنجے گاڑ دیے اور ایسے معلوم ہوا جیسے سن و سال کی ایک منہ زور ندی ہے کہ بہے چلی جاتی ہے اور اس کی سطح پر پڑے اکھڑے ہوئے درخت کی مانند ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ بڑا اکھڑ پن اور زندگی کو نہ جانے کس وقت کوئی پھونک مار کر بجھا دے۔ کہنے کو زندہ ہے لیکن ایک طوفانی سطح پر بے اختیار بہے چلی جاتی ہے آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں جسے کمزور انگلیاں پکڑ سکیں۔ پیشتر اس کے کہ منہ پھاڑتی ہوئی لہریں اسے نگل جائیں......"

ہاجرہ ہمارے کئی افسانہ نگاروں سے زیادہ حساس اور نازک بین ہیں ان کی نظر دور تک پہنچتی ہے اور ان کے افسانوں میں اکثر گہرائیاں ایسی آ جاتی ہیں جو اور افسانہ نگاروں میں نہیں ملتیں۔ ان کی یہ ادا بھی حساسی سے خالی نہیں کہ ان کے کم از کم تین افسانے حال سے ماضی کی طرف چلتے ہیں جب کوئی انسانی الجھاؤ انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے تو ان کا ذہن ٹٹولنا شروع کر دیتا ہے کہ یہ الجھاؤ کہاں سے شروع ہوا۔ یہ تجسس حساسی کی ہی ایک الٹ کا نام ہے۔ یہی انہیں ماضی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ الجھے ہوئے دھاگوں کے سرے تو اکثر ماضی ہی میں ملتے ہیں انسانی رشتوں میں جنس کا رشتہ سب سے زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے جنس کا پیڑ ایک ایسا پیڑ ہے جس میں لاکھوں قسم کے کڑوے، میٹھے، کھٹے پھل لگ سکتے ہیں، اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ جو اسے بوئے گا وہ کیا کاٹے گا۔ اس کی جڑیں دل اور دماغ اور اعصاب اور گوشت میں نہ معلوم کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس نے جہاں تک چیر کر دیکھا، نئی

سے ترجمہ طراز ہیں۔ ہاجرہ مسرور نے کرداروں کا جنسی شعور جیلانی صاحبہ سے بہت آگے نکل جاتا ہے اور ہاجرہ کے احساس میں گہرائی اور تیکھا پن بھی ہے جن کی وجہ سے ان کے جنسی افسانے اوروں سے زیادہ دقیق اور عمیق معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنسی تعلقات میں تنوع اوروں سے زیادہ ہے اور ان تعلقات کی ترکیبیں بھی زیادہ لطیف اور نگاہ فریب ہیں۔

ہماری عورتیں اپنی فطرت شعاری کی وجہ سے معاشی اور معنوی اولی زبان سے بہت حد تک امون رہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جب لکھنا شروع کیا تو بیٹے جاگنے مفاظت کے سوا ان کے قلم سے کچھ نہ نکلا۔ ہاجرہ کی زبان بھی جیتی جاگتی زبان ہے جو سیدھی مطلب کی طرف کھینچتی ہے اِدھر اُدھر کی طرف دیکھتی نہیں رہتی اور اس الھڑ پن کی وجہ سے بے تکلف وہ باتیں کہہ جاتی ہے جو مصنوعی ادبی زبان کے کششانے گلے میں اٹک کر رہ جاتیں یا بڑے تکلف سے ادا ہوتیں۔

لیکن الفاظ کا ذخیرہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کہنے کی باتیں بہر حال ان گنت ہوتی ہیں اور لفظ اکثر بار بار کہہ جاتے ہیں اسی لئے ادیبوں کو بار بار استعاروں اور تشبیہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور بالخصوص ان کی ندرت نگاہی کا پتہ ان کی تشبیہوں ہی سے چلتا ہے۔ یہئے تو ہاجرہ کی تشبیہوں پر ایک نظر ڈال لیں:

"کوئی ساتھ دینے والا ہو تو اپنے آنسو گالوں پر چنگاری بن کر نہیں لڑھکتے۔"

"نگاوٹ بھی کہیں چھپتی ہے؟ جامن چاہے کہیں بھی چھپا کر کھائی جائے کم بخت منہ کی اور ہونٹ چغلی کھا دیتی ہے۔"

"آپا کی آنکھیں کیا تھیں۔ بس ڈگڈگی تھیں کہ سب بندر کی طرح اس کے گرد ناچتے۔"

"سبھی لفظ مطلب کے نہیں ہوتے۔ قلم روشنائی میں ڈبو کر لکھنے بیٹھو، درخت نب پر زور دے کر گھسیٹو تو یونہی کتنے ہی بے معنی نقطے کاغذ پر پھیل جاتے ہیں۔"

"محبت مرد کی کا ایک ایسا جالا ہے جو اگر کونوں کھدروں میں گھس کر جسم سے لپٹ جائے تو جھاڑنے کے باوجود کہیں نہ کہیں ذرا بہت چپکا ہی رہ جاتا ہے۔"

"تم کہنا چاہتی تھیں کہ تمہیں جو کچھ دیا گیا ہے یہ تو صرف اتنا ہے جیسے کسی کو تحفہ میں بغیر دستے کی کٹار پکڑا دی جائے۔"

"تم تو ایسی ٹھنڈی نظر آ رہی ہو جیسے کسی بنگالی قحط زدہ کا چولہا۔"

"اس کے احسانات پر جیسے سڑا ہوا آم نچڑ رہا تھا۔ گھٹا گھٹا اور گرا ہوا رس ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔ وہ کوئی بڑا زہریلا جواب دینا چاہتی تھی لیکن اس کے ذہن کے سیال زہر کا کھولاؤ ہر ڈھنگ ہوئے فقرے کو کھنور میں پڑی ہوئی سیپ کی طرح نچا ڈالتا۔۔۔"

"یہ کتنے مزے کی بات ہے کہ جن لڑکیوں کے لئے فساد ہوتے ہیں وہی چند روز بعد ایسی معقول ہو جاتی ہیں جیسے نارنگی کا چھلکا۔۔۔"

"کتنی مشکل سے تو انہیں بات کرنے کا ایک موضوع ملا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے پر تیزاب چھڑکنے کی کوشش میں اسے بھی ختم کر دیا۔۔۔"

"مگر وہ دونوں اس سے محظوظ ہونے کا خیال نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے دونوں کی زندگی میں سوائے نیم کے کچھ پھولتا ہی نہ ہو۔۔۔"

"وہ اس کی نظر سے دور ہوتے ہی اپنی ہستی کو ایسا بے بس اور دور تک محسوس کرنے لگی۔ جیسے میٹھا میٹھا کوئی ریت کے پہاڑوں میں دبی ہوئی لگتا۔۔۔"

"شادی کے بعد ایک سال ایسا گزرا جیسے کوئی ننھی چڑیا پھدکتے پھدکتے ایک درخت سے دوسرے پر جا بیٹھے۔"

"جتنی لمبی عمر ہو، اتنی ہی لمبی الجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگا ڈال کر سینے بیٹھو تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ ..."

ماننا پڑے گا کہ ہاجرہ کی تشبیہیں بیشتر انوکھی اچھوتی ہیں، خیال کے ساتھ ہی بے تکلف ان کے ذہن میں چلی آتی ہیں۔ جس ادیب کو اپنی سوچی ہوئی، اپنی دیکھی ہوئی، اپنی بیتی ہوئی بات کہنی ہو، اس کا کام گھڑی گھڑائی تشبیہوں سے نہیں چل سکتا ہے، اور جو گھڑی گھڑائی تشبیہیں استعمال کرتے ہیں وہ اپنے دل کی بات کیونکر کہہ پاتے ہوں گے۔

اس مجموعے میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی ہے جسے شاید افسانہ نہ کہہ سکیں۔ میرا بس چلتا تو اس کی جگہ بھی ہاجرہ کو افسانہ ہی لکھنے پر مجبور کرتا لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسے جبر کی ضرورت آئندہ کبھی پیش نہ آئے گی۔ ان کی طبیعت کا اصل جوہر جو ان کے تین مجموعوں میں چمکا ہے، انہیں خود افسانہ لکھنے پر مجبور کرے گا۔ اور انہیں افسانہ لکھے بغیر چین نہ آئے گا۔

جب تک ان کا چوتھا مجموعہ نہ چھپے، ہمیں بھی چین نہ آئے گا

"پطرس"

جاتے ہیں۔ آئس کریم کے بیچ کو نمک کھلیاں ڈال دیتے ہیں اور پھر نمک کے ذریعے آئس کریم کھانے لگ جاتے ہیں۔ پھر کچھ نے تمکتا ہر وقت عجیب نظروں سے دائیں بائیں جھانکتے رہتے ہیں۔ کسی کو دائیں ہاتھ میں چھری پکڑے دیکھا تو خود بھی دائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر جو کسی کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے ہے تو بائیں ہاتھ میں منتقل کر لی۔ سور کا گوشت ہر روز کھانے میں ہوتا ہے۔ لیکن کھانی اب تک ہم نے کھایا نہیں۔ آگے بھی خدا حافظ و نگہبان ہو۔

عدن پہنچے تو ساحل پر گئے۔ ہم چار ادمیوں نے مل کر ایک ٹیکسی کرایہ پر لی جس پر سوار ہو کر ہم عدن اور اس کے گرد و نواح ۲۵ میل گھومے۔ اس کا کرایہ کوئی ایک پونڈ کے قریب بنا۔ وہ غوطہ لگانے والے لڑکے جن کا بہتر احاطہ شخص کیا کہیں نظر نہ آئے۔ خدا جانے متقدمین یونہی گپیں ہانکتے تھے یا اب ان کی نسل ہی ناپید ہو گئی ہے۔ عدن ہندوستان کے عام شہروں کی نسبت بہت ستھرا شہر ہے۔ بلکہ بہت بے رونق سا مقام ہے۔ پارسیوں کی دکانیں جابجا نظر آتی ہیں۔ عدن میں پہنچ کر ٹکٹ وغیرہ خریدے اور خط پوسٹ کئے۔ تمہیں ایک پوسٹ کارڈ بھیجا تھا جس پر ہمارے جہاز کی تصویر تھی۔ امید ہے مل گیا ہو گا۔

یہاں سے ۸ ستمبر کو دن کے ۱۲ بجے روانہ ہوئے اور بحیرۂ احمر میں داخل ہوئے جہاں کی گرمی توقع سے بہت ہی کم ہے البتہ رات کو کمرے کے اندر نہیں سویا جاتا۔ دن بھر سب سے اوپر کے تختے پر کرسی بچھائے بیٹھا رہتا ہوں اور رات کو وہیں بستر بچھا کر سو جاتا ہوں۔ طلوع اور غروب کے نظارے لب اوقات بہت ہی شاندار ہوتے ہیں۔ وسیع سمندر، وسیع آسمان اور آفتاب کا بہت بڑا آتشیں گولہ جب صبح ہوتی ہے یا شام پڑتی ہے تو سمندر جیسے پگھلنے لگ جاتا ہے۔

ایک دن رات کو جزیرہ پیرم کے پاس سے گذرے۔ جزیرے کے ایک برے پر لائٹ ہوس ہے جس کی روشنی ایک ایک منٹ کے وقفہ کے بعد چمکتی ہے اور جزیرے سے لے کر جہاز تک ایک چمکتا ہوا شاہراہ سا بچھا دیتی ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جزیرے کے لیمپوں کی مدھم سی قطار دکھائی دیتی تھی۔ یہ تمام نظارہ کچھ ایسا پُراسرار معلوم ہوتا تھا کہ مجھے عمر بھر نہ بھولے گا۔

جب سے سمندر کا طوفان بند ہوا ہے ہر روز رات کو سینما کا تماشا اور ناچ ہوتا ہے۔ کھانے پر بھی دعوتی معقول جا لگتی ہے۔ ایک پروگرام میں تمہیں اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ تماشا جہاز کے تختے پر ہوتا ہے نہ کہ بند کمرے میں۔ اور مفت ہوتا ہے۔ جہاں خاصا لطف ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا گراموفون بمنزلہ بینڈ کے بجتا ہے۔ سوائے ایک فلم کے (THE BACK BITER) باقی کی سب میرے لئے نئی تھیں۔ اس پروگرام کی فلم مسٹر بیرلڈ لائڈ کا کمک تھا۔ دل بہلاوے کو کافی سامان ہے۔ باقاعدہ سینما نہ سمجھو۔

اب ہم بحیرۂ احمر میں سے کے اور مدینے کے عرض البلد سے اوپر گذر چکے ہیں۔ شروع شروع میں ساحل عرب کے پاس اکثر جزیرے نظر آتے رہے۔ اب کوئی ساحل نظر نہیں آتا۔ کل دوپہر کو سویز پہنچنے کی توقع ہے۔ پرسوں پورٹ سعید۔ جہاں یہ خط پوسٹ کروں گا۔ ہوا بہت خوشگوار اور فرحت افزا ہے۔ سمندر کا رنگ بالکل سلیٹ کا سا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی ہیں اور افق تک جابجا سفید جھاگ کے گالے سے دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاز تھوڑا سا ڈگمگانے لگ گیا ہے جس کی وجہ سے لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔

روانہ ہونے سے پہلے تمہیں یاد ہو گا میں نے اسی کمپنی کے پراسپکٹس وغیرہ منگائے تھے۔ ان میں لکھا تھا کہ جہاز پر انگریزی بولی ہی بولی جاتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مسافر تو انگریزی بول بھی لیتے ہیں اور کچھ سمجھ بھی لیتے ہیں مگر جہاز کے افسر اور ملازم سب مسافر ہی ہے۔

بہت سی باتیں کہنے کو ہیں۔ خطوں کے بس کا روگ نہیں۔ واپس ان شاء اللہ پہنچوں گا تو سناؤں گا۔ ہزارہا لطیفے ہیں جو عمر بھر نہ بھولیں گے۔ قبلہ مولوی صاحب۔ حمید علی صاحب۔ سالک صاحب۔ چغتائی صاحب۔ مغلی صاحب۔ اختر صاحب۔ حفیظ صاحب سب کو میرا نیازمندانہ سلام۔ بہت یاد آتے ہیں۔ کیا کروں۔

خاکسار

بخاری

(۲)

لندن ۲۲ ستمبر ۱۹۲۶ء

امتیاز بھائی۔ میں تم کو وینس یا یورپ کے کسی اور مقام سے خط لکھتا لیکن اس لئے نہ لکھا کہ یورپ کا سفر ایک ہنگامہ تھا جس میں ہندوستان کو تقریباً بھول ہی گیا اور دوسرے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں ہندوستانی ڈاک کا کچھ ایسا انتظام ہے کہ وہاں کا لکھا ہوا خط تم کو اس خط سے جلدی نہ ملتا۔ پچھلا خط میں نے آپ کو سویز سے لکھا تھا اور پورٹ سعید میں پوسٹ کیا تھا۔ پورٹ سعید میں ہمارا جہاز دن کے دس بجے پہنچا۔ کشتیوں میں سوار ہو کر ساحل پر گئے۔ پورٹ سعید کی عمارتیں نہایت خوش وضع اور خوبصورت ہیں۔ حفظانِ صحت کے اصول کے مطابق مغرب کی تقلید کی ہے لیکن افریقی طرزِ تعمیر کا رنگ غالب ہے۔ بازار صاف ستھرے اور کشادہ ہیں۔ دکانیں خوش رنگ ہیں۔ تعجب ہمیں اس بات پر ہوا کہ قہوہ خانوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے اور دن کے دس بجے بھی ان میں اس قدر بھیڑ تھی کہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کے لوگ بالکل بے کار ہیں۔ انگریزی سوٹ، سر پر ترکی یا انگریزی وضع کی پھوس کی ٹوپیاں، ہزاروں کی تعداد میں لوگ بیٹھے کافی پی رہے ہیں، حقے کے کش لگا رہے ہیں اور جوا کھیل رہے ہیں۔ دوکاندار بہت خوشامد اور چاپلوسی کے ساتھ دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ بے نیازی کے انداز میں چل دیں تو فحش گالیاں سناتے ہیں۔ بے شمار گائیڈ بازار میں چلنا مشکل کر دیتے ہیں اور ازحد بے حیائی کے مشاغل کے متعلق نہایت بے باکانہ گفتگو کرتے ہیں۔ آپ جیسے تیسے ہو کر ان سے کنارہ کریں تو گالیاں دینے لگ جاتے ہیں۔

بارہ بجے ہمارا جہاز وہاں سے روانہ ہوا اور ہم بحیرۂ روم میں داخل ہوئے۔ سب نے گرم کپڑے پہن لئے گو موسم کچھ اتنا سرد نہ تھا تاہم یورپ کی تعظیم لازم تھی۔ تین دن کے بعد ہم برنڈیزی (BRINDISI) پہنچے۔ وہاں بھی ساحل پر اتر کر شہر کا ایک چکر لگایا۔ برنڈیزی میں فروٹ بہت ہی سستا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک بہت بڑا ٹوکرا کوئی دس آنے میں خرید لیا اور پیٹ بھر کے کھایا۔ یہاں ہم نے پہلی مرتبہ اطالوی فوج اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا۔ فوجی سپاہی کی وضع ہمارے ہاں سے ملتی جلتی ہے۔ سر پر دیسی سی ٹوپی اور اس میں ایک پر جس کا مدعا یہ بانکپن کی شان دکھانا ہے۔ پولیس کے افسر بیچارے ڈیوک آف ولنگٹن کی سی ٹوپیاں پہنے سرخ اور نیلی وردی پہنے کھڑے تھے جس پر پیتل کی آرائش عجب بہار دکھا رہی تھی۔ سفید دستانے اور چمکدار تلوار۔ جب بازار میں کھٹ کھٹ کرتے گزرتے تھے تو آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔

ایک دن کے بعد شام کے وقت ہم وینس پہنچے اور وہاں چار دن قیام کیا۔ وینس ایک معجزہ ہے۔ ایک طلسم ہے۔ ایک [illegible] انگیز خواب ہے۔ اطالوی آتشیں شراب کے نشے کی ایک ترنگ ہے جو مجھے عمر بھر نہ بھولے گی۔ اس حسن کی شہزادی کے متعلق آپ نے جو کچھ [illegible] سب سچ ہے۔ تصویریں اس کے حسن کی داد نہیں دے سکتیں اور دنیا بھر کے شاعر یہاں کی دلکشی کا بیان نہیں [illegible]

اچھا اپنے میکے میں جاکر تحقیق کر لینا کہ مفسروں نے صالحون کے معنے لکھے ہیں جن کو ملک داری کی صلاحیت ہو
[illegible] کے مقابل نہیں ہو سکتے۔ نہ بہادر ہیں۔ نہ محنتی ہیں۔ نہ جفاکش ہیں نہ سلیقہ
[illegible] میں یہ [illegible] ہوتا تو انگریز پانچ ہزار کوس سے ہندوستان میں آکر عمل داری
[illegible] ہی کیل [illegible] میں [illegible] ہے تو زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ ایسے سیکڑوں بڑ
[illegible] ہماری خیر نہیں۔ دریا میں رہنا
[illegible] مچھ سے بیر؟ لیکن مولویوں کی عقل پر [illegible] ہیں کہ اتنی موٹی بات بھی
ان کی سمجھ میں نہیں آتی یہ ہدایہ اور دُرِّ مختار کیا جانیں [illegible] ہوں گے؟ اجی غرض کے لئے
[illegible] کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ اور انگریز تو اہلِ کتاب ہیں [illegible] کئی جگہ قرآن میں اُن کی
[illegible] کی ہے منھ سے بولو کہ ہاں کی ہے؟ اور اہلِ کتاب ہونے [illegible] قرآن کی عمل داری میں
[illegible] اور آرام اور انصاف اور رعایا پروری اس قدر ہے کہ ہندوستان کو ایسا اطمینان کبھی
نصیب ہوا ہی نہیں۔ مولویوں نے کفر کو مولیوں اور گاجروں سے زیادہ سستا کر رکھا ہے اور
بات بات پر لوگوں کو کافر اور مشرک ٹھہرا دیتے ہیں مگر یہاں چوں کر اپنا قدم درمیان میں
ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ[1]۔ پر کبھی بھول کر بھی لحاظ نہیں کرتے۔ حالانکہ انگریزی
عمل داری کی قدر نہ کرنا صریح کفرانِ نعمتِ الٰہی ہے [illegible] مولویوں کے پیچھے
پڑے ہو اُن بیچاروں نے تمھارا کیا لیا ہے یہ غریب کسی [illegible] نہیں۔ دینے میں نہیں۔
[illegible] پاس بلاؤ نہیں لشکر نہیں؟ مسجدوں میں بیٹھے [illegible] کرتے ہیں۔ کوئی پڑھنے آیا
اس کو پڑھا دیا کسی نے مسئلہ پوچھا بتا دیا یا وعظ کہا اس نے دو چار مسلمانوں کو جنھیں
دین کا خیال ہے اور جو اُس کے پاس آ بیٹھے نماز [illegible] کی باتیں سکھا دیں۔ اس کے سوا
مولوی کچھ اور بھی کرتے ہیں؟ تم کو خدا [illegible] کی صلوٰۃ اُن کے ساتھ آپڑی ہے۔ طویلے کی
بلا بندر کے سر۔ ہر پھر کے مولویوں پر۔ غریب کی جورو سب کی بھابی۔ خیال تو کرو
کتنے آدمی مولویوں کی طرف رجوع کرتے ہیں؟ سو میں مشکل سے ایک۔ اور مولویوں کی طرف
[illegible] رجوع ہونے کا کوئی سبب بھی تو نہیں [illegible] کوئی تو یہی کہیں گے کہ نماز پڑھو۔ رمضان

[1] جو آدمی کا شکر گزار [illegible] خدا کا شکر گزار نہیں ۱۲

وہ اسلام نعوذ باللہ تنگ معلوم ہوتا ہے (سالک صاحب کو یہ فقرہ سنا دیجئے)

میرا یہ خط احباب کو سنا دینا۔ جنگل سے کہنا کہ کوئی تم تو نہیں ہو نہ بجا سنڈر کی سپیل جو بھائی تیرے پیلے ہو دست سالک کو میری طرف سے بہت بہت پیار کرنا (کہاں وعدہ کیا ہے؟ پیار دینا! لیکن سالک کو پیار لینا۔ مجھے حق سا معلوم ہو کہ ہے۔ سالک سے پیار لینا کچھ کاروباری سا معلوم ہوتا ہے خیر)

میرے ذمے منشی صاحب کے کچھ روپے نکلتے ہیں۔ تین پاؤنڈ یہ چلہ آئی وہ ان کے لئے چاکلیٹ کا ایک ڈبہ خرید لاؤنگا اور میں کیا کر سکتا ہوں۔ حفیظ صاحب کی نظمیں وغیرہ یہ بہت یاد آئیں۔ مثلاً کشتی میں سوار ہو کر میں "تنگو ترکی سے چلی" گنگنا تا۔

قبلہ مولوی صاحب اور برادر مکرم حمید علی صاحب کی خدمت میں میرا اسلام عرض کر دیجئے۔ گورداری بابو، واسطے صاحب، اختر صاحب.... اور منشی رشیمین کو نیاز۔

حکیم یوسف حسن سے کہئے نیرنگ خیال خدا کے لئے بھجواتے رہیں۔ معلوم ابھی تک تہذیب کیوں نہیں چلا۔ حکیم احمد شجاع کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ اور کہیئے کہ یہاں لندن میں ایک ہندوستانی تھیٹر کی سخت ضرورت ہے۔ کچھ اس کے متعلق بھی غور فرمائیں۔

اختر صاحب کو سلام۔ باقی جو نتھو خیرا ہے اس سے کہیئے تمہاری کلنے تمہیں سلام بھیجا ہے۔ آئندہ میں ایک فہرست بنا کے رکھ چھوڑتا ہوں۔ اس کی ہزار دو ہزار کاپیاں چھپواؤں گا۔ میرا پتہ یہ ہے۔

(۳)

امتیاز بھائی! غالباً میں نے تمہیں آخری خط لندن سے لکھا تھا۔ بجز اس ایک کاروباری خط کے جو کیمبرج سے اس کے بعد بھیجا اس وقت دل کی کیفیت یہ تھی کہ انگلستان میں نو وارد تھا۔ ہر ایک چیز کو بظاہر متانت سے دیکھتا تھا لیکن اندر ہی اندر گنواروں کی مانند تحیر العبد جاس سا ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں مرعوب کر دیتی تھیں اور لب اوقات انگریزوں کی اور خصوصاً کیمبرج کی روزمرہ کچھ یہ نہ آتی تھی سیکھنے کا بے حد شتاق تھا لیکن کوئی سکھانے والا نہ ملتا تھا۔ سوائے ان چند ہندوستانیوں کے جو پرانے واقف تھے اور جن کو انگلستان میں تم ہوئے کچھ عرصہ گذر چکا تھا۔ لیکن ان کے رویے میں ایک تصنع، ایک رعونت، ایک سطحی پن، ایک "کھوکھلاہٹ" پائی جاتی تھی جس سے میں گھبرا جاتا ہوں۔

اب یہ حالت ہے کہ کیمبرج کے علمی، ادبی، معاشرتی مشاغل میں منہمک ہوں اور جس سہولت اور سلیقے سے میں نے یہاں کی زندگی اختیار کی ہے اس پر میں خود حیران ہوں۔ ہندوستانیوں سے رفتہ رفتہ قطع تعلق ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج کسی ہندوستانی سے بات کئے چند مہینے ہو جاتے ہیں۔ انگریز دوستوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے اور گزر اوقات کا ایک خاص ڈھنگ بنتا چلا جا رہا ہے؟ دل و دماغ نے اپنے لئے ایک معیار اختیار کر لیا ہے اور ہر سرگرمی اس معیار پر پورا اترنے کے لئے وقف ہے۔

جب میں کیمبرج میں پہنچا تو تمام کالج بند تھے۔ بازار بے رونق اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس عرصہ میں میں نے چھوٹی چھوٹی ضروریات بہم پہنچا لیں اور کیمبرج کے گرد و نواح سے خوب اچھی طرح واقف ہو گیا۔ جب کالج کھلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دائیں بائیں اور ہر طرف ہزاروں دروازے یک لخت کھل گئے۔ جن میں سے ہجوم کے ہجوم نکلنے لگے۔ گویا تمام شہر پر چھا گئے۔ لدھے پھندے گون، سہا سہا چہرہ، ہانپتے کانپتے گویا کسی گرد کیا کیا کلیے چتیر سے چال میں بے پروائی۔ چہرے پر ایک تیقن، استفادہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دھن

یہ معلوم ہوتا ہے یہ یونیورسٹی نے سانس کیا لیا ایک جھٹکا سا دیا جس سے کیمبرج بھر میں ایک لرزہ سا آ گیا جیسے کسی گھڑی ساز کی دکان میں سب گھڑیاں یک لخت چلنے لگ جائیں۔ اس ہما ہمی میں میں بھی ایک طرف کو دھکے دیے چلا جا رہا تھا۔ سینے میں ایک عجب متحرک دھڑکن تھی اور دل میں ایک اداسی چھائی ہوئی تھی یا الٰہی اب کیا ہو گا۔ یہ تو دنیا ہی نرالی ہے اور یہ بے یار و مددگار: نہ ہم سخن نہ ہم نوا۔ گھر سے کوسوں دور۔ پھر اپنے دل کی تقویت کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ سنتے سنتے گھر سے خط آتا تو اپنی تنہائی کو اور بھی زیادہ محسوس کرنے لگ جاتا۔

جب لیکچر شروع ہوئے تو اس مایوسی نے کشمکش کی صورت اختیار کر لی۔ وہ یوں کہ بعض لیکچروں میں تو قویٰ میں ایک حرکت اضطراری سی پیدا محسوس ہونے لگی۔ اور بعض لیکچروں میں یہ حالت تھی کہ نوٹ بک کھولے بیٹھا ہوں۔ پنسل ہاتھ میں ہے۔ آنکھیں لیکچرار کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔ ہاتھ پر قیدی سی ہے۔ ہمہ تن گوش ہوں۔ ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہا ہوں اور ہر فقرے کو دل میں دہرا رہا ہوں لیکن وقت گزر جاتا ہے اور دماغ کسی چیز پر قابو نہیں پاتا۔ کچھ سمجھ لگتا ہوں لیکن نہیں لکھ سکتا۔ خیالات میں ایک گونج سی ہے جس میں کچھ معنی نہیں ڈال سکتا۔ ایسے لیکچر کے خاتمے پر مجھ سا دل شکستہ اور حیران انسان کیمبرج بھر میں نہ ہوتا ہوگا۔ اپنی کم مائیگی پر بے انتہا ندامت، زندگی کے جو سال ہندوستان میں ضائع کئے ان کا بیجا افسوس، دل میں خفیف سے نئے ارادے، نخوت علم کو شدید صدمہ، غصہ، رشک، خطرہ اور امنگ، سر جھکا ہوا، ایک نیم مردہ، مایوس انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے لائبریری کی طرف جا رہا ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو ہندوستان جنت نشان میں انگریزی کا ماہر، نحو عربی کا لامحدود قابلیتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ دھوکا، اعتماد سب دھوکا۔ اسے میرے بچپن کے رفیق اسے اپنا ناز ہم عصر سب مانا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ایک تپسوی کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اپنے آپ کو یونیورسٹی لائبریری کے ایک کونے میں گم کر دیا۔ اس فقرے کے صحیح معنی جب تمہاری سمجھ میں آئیں گے جب تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ لندن کے عجائب خانہ کی لائبریری کی طرح یہاں کی لائبریری بھی ولایت میں جو کتاب چھپے اس کی ایک کاپی کی حقدار ہے۔ اس کتب خانے میں وہاں ہاتھ پاؤں مارے جیسے شناور رود بار انگلستان کو تیر کر عبور کرنے کی کوشش کرے۔ غرضیکہ ایک بخار چڑھا ہوا تھا۔ ایک دیوانگی سی طاری تھی۔ چاہتا تھا کہ چاسر سے لے کر ٹامس ہارڈی تک شعر و سخن کی تمام دنیا پر ایک بجلی سی چمکے اور روشن تصویر پوری کی پوری ایک لمحے کے اندر میرے دل پر نقش ہو جائے لیکن یہ کیونکر ممکن تھا۔ چنانچہ دیوانگی نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی۔ کیمبرج کے طوفان نے میرے قدم کہیں بھی نہ جمنے دیے اور علوم و فن کے اس سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

اس کے بعد مجھے کیا پیش آیا؟ اس کے متعلق مجھے یہاں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھنا پڑے گا۔

یہاں کے کالجوں کی تعداد چودہ پندرہ کے قریب ہے۔ ہر کالج کا انگریزی لیکچرار لٹریچر کے ایک خاص موضوع پر لیکچر دیتا ہے اکثر ہفتے میں ایک دفعہ اور بعض اوقات ہفتے میں دو دفعہ۔

بعض کالجوں میں انگریزی کے دو تین لیکچرار ہیں اور بعض لیکچرار ایک سے زیادہ موضوع پر لیکچر دیتے ہیں۔ اس طرح انگریزی لٹریچر یونیورسٹی بھر میں ایک ہفتے کے اندر تیس پینتیس لیکچر ہوتے ہیں۔ ہر کالج میں ایک لیکچرار انگریزی کا انچارج ہوتا ہے جس کو ڈائرکٹر یا اوورسیر سٹڈیز کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

کے شروع ہوتے ہی یک لخت غائب ہو جاتے ہیں ان کو GOWN MAN کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر شہر کے اصلی باشندے ہیں وہ سب کے سب دوکاندار پیشہ یا مزدور پیشہ ہیں۔ ان کو TOWNS MAN اور طلبا کی اصطلاح میں ٹاؤنی کہا جاتا ہے۔ یہ سب لوگ نچلے طبقے کے ہوتے ہیں۔ کیمبرج میں کالج کی حدود کے باہر شرفا مفقود ہیں۔

انڈر گریجویٹ UNDER GRADE لڑکوں کا یہ حال ہے کہ اگرچہ موسلا دھار پانی برس رہا ہو بہر صورت ٹوپی پہننا گناہ سمجھتے ہیں۔ نیم آکٹ اور فلالین کی پتلون یہاں کا لباس ہے۔ پتلون پر بڑے بڑے سیاہی کے داغ۔ گون کی بے عزتی کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جان بوجھ کر اس میں جا بجا سوراخ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ نادار معلوم ہوں۔ ان کے مشاغل کی کثرت کا کچھ نہ پوچھو۔ قسم قسم کے جنون ہیں۔ پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی ایک کلب بنا لیتے ہیں جس میں جنوبی افریقہ تک ہو آتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑتے۔ گولف کھیلتے ہیں۔ کشتیاں چلاتے ہیں۔ طرح طرح کے ساز بجاتے ہیں۔ ناچتے ہیں۔ گرجاؤں ہیں۔ تبلیغ کا کام سیکھتے ہیں۔ تصویر کشی کرتے ہیں۔ بعض رؤسا بہت اعلیٰ درجہ کی پوشاک پہنتے ہیں۔ بعض کسی سیاسی کلب کے ممبر ہیں جہاں ہمیشہ کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کے لیکچر ہوتے رہتے ہیں۔ بعض ایک پیانو کرایہ پر لے آتے ہیں۔ بعض نے دو موٹر کاریں رکھی ہوئی ہیں اور کسی موٹر کار کلب کے ممبر ہیں جس کے نمائندے دنیا کی ہر بڑی سڑک پر مل جاتے ہیں۔ بعض کی زندگی گھوڑ دوڑ کے لئے وقف ہے۔ بعض صبح سے شام تک لیباریٹری میں بھاڑ جھونکتے ہیں۔ ڈرامیٹک کلبیں بے شمار ہیں۔ بعض صرف اوپیرا اور میوزیکل کامیڈی کرتے ہیں۔ بعض صرف یونانی کھیل۔ بعض سیدھی سادی کامیڈی۔ سینری۔ ڈریس وغیرہ سب خود بناتے ہیں۔ یا کم از کم وضع کرتے ہیں۔ غرضیکہ ایک تعلیمی میلہ ہے جس میں جو کام ہوتا ہے انہیں کے ساتھ انہماک و انضباط۔ یہاں کے دو بڑے اصول ہیں۔ اور ان سب کی تہہ میں وہ حیرت انگیز طاقت کارفرما ہے جس کو TRADITION کہتے ہیں۔ ہفتہ بھر پسینہ بہا دینے والی مصروفیت میں گزرتا ہے۔ دن کو بھاگتی ہوئی ٹانگیں۔ رات کو بند کمرے، روشن چراغ اور کھلی ہوئی کتابیں۔ اتوار کے دن کیمبرج کی سب آبادی، سب مصروفیت، سب چہل پہل خدا جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ اتوار! یہاں کی اتوار ایک معجزہ ہے۔ دن کے گیارہ بجے میلوں گھوم جاؤ۔ ایک درجن سے زیادہ آدمی نہ پاؤ گے۔ وہ بھی سیاہ پوش، سست رفتار، سوائے گرجاؤں کے گھنٹوں کے اور زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ بازاروں کو دیکھو تو ہو کا عالم۔ آہیں بھرنے کو دل چاہنے لگتا ہے۔ شام کے وقت دن کی کسر پوری کر دی جاتی ہے اور مرد و زن کے جوڑے ہزاروں کی تعداد میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اکثر قبل ازدواج کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور یہ وہ شغل ہے جو انگلستان میں شادی سے پہلے بھی جائز ہے اور شادی کے بعد بھی۔ شادی کا ارادہ نہ ہو جب بھی۔ حق تو یہی ہے کہ اسے شادی سے کچھ چنداں تعلق نہیں اور چونکہ کیمبرج کے لوگ تمام تر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے قبیح ترین پہلو بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

کیمبرج آکسفورڈ کی بہ نسبت بہت زیادہ قدامت پرست ہے۔ چنانچہ گو یہاں لڑکیوں کے دو کالج ہیں لیکن وہاں کی طالبات نہ تو یونیورسٹی کی ممبر شمار کی جاتی ہیں نہ کسی ڈگری کی حقدار۔ البتہ لیکچروں میں آتی ہیں اور امتحانوں میں بیٹھ سکتی ہیں لیکن امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو ڈگری نہیں ملتی۔ باوجود اس کے انگریزی کی کلاس میں پچاس ساٹھ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ اگر اتفاق سے لیکچر میں کوئی ساتھ بیٹھ جائے تو شامت آ جاتی ہے۔ ہم لوگ ایک نوٹ بک کھول کر نوٹ لینا شروع کر دیتے ہیں اور

لوسٹن ـــــ ۲۰۵ ـــــ پڑ نمبر

دولیٹن کے فلسطین پر تقاریر ہوتے رہے اور شام تک بغیر ایک دوسرے کی بات سننے کے دونوں ایک ساتھ بکتے چلے گئے کبھی کبھی لوگ جسے نے کبھی شور پیٹنے لگ جاتے غرضیکہ عجب ہنگامہ رہا، عجب عجب قصے دہرائے گئے۔ ہندوستان کی حالت زار پر بہت افسوس کیا گیا۔ اور آپ سب لوگوں کا انگلستان آنے پر محرومی لعنت وغیرہ کے ووٹ پاس کئے گئے۔ شام کی گاڑی سے وہ لندن چلے گئے اور دو ماہ تک کا وعدہ کر گئے تھے۔ تم پوچھو گے! شمی کا کیا حال ہے؟ بہتر بالکل ویسی چیز ہے بالکل وہی۔

اس ہفتے کی ڈاک میں تمہارا خط ۔ ہر سیفی کا خط، زبیدہ کا خط، بچوں کی تصویریں سب ایک ساتھ ملیں یعنی ہندوستان میں جو کچھ محبوب ترین اور عزیز ترین ہے وہ یک لخت مجھ پر چھپڑ پھاڑ کے سر پر آگرا۔ جنگل کے خط کا بہت بہت شکریہ۔ ان کی غزل نے مجھے گھنٹوں مست رکھا۔ جنگل میرے بھائی اور حفیظ میرے بھائی اور امتیاز میرے بھائی اور سالک میرے بھائی خط ضرور لکھتے رہا کرو۔ اگر تم سب لوگ باری باری بھی خط لکھو تو ہر ہفتے مجھے اپنے احباب کی ایک جیتی جاگتی تصویر مل جایا کرے اور تم میں سے ہر ایک کو مہینے میں ایک دفعہ خط لکھنا پڑے۔ اور میرے بھائیو تم خود ہی سوچو کہ مجھے ہر ہفتے ایک خط والد کو۔ ایک خط ڈپٹی صاحب کو ایک خط اپنی رفیق حیات کو۔ ایک رفعت صاحبہ کو لکھنا ہوتا ہے۔ اے میرے بھائیو! میں تم سے ہر ایک کو ہر ہفتے کیسے خط لکھ سکتا ہوں (میری آنکھ اس وقت بھر آئی ہوئی ہے) لہٰذا اے میرے بھائیو! اسلامی اخوت کا ثبوت دو اور خط لکھو۔

میں نے اس اپیل کو بہت رقت انگیز بنانے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے شبہ ہے کہ دورانِ اشاعت میں اس کی ہنسی اڑائی جائے گی۔ اور میرے جذبات کو غائبانہ مجروح کرنے کی از حد سعی کی جائے گی۔ تلک حقہ باز کو کیا کہوں؟

سالک صاحب! استاذی وحبیبی! خدا کے لئے خط لکھو۔ جنگل کے خط نے تڑپا تڑپا دیا۔ خدا اسے خوش رکھے۔

خاکسار بخاری

عمانوئیل کالج کیمبرج

۵ر نومبر ۱۹۲۶ء

میکسیکو کے کوچہ و بازار

پروفیسر احمد شاہ بخاری جب ۱۹۴۷ء کی یونیسکو کانفرنس میکسیکو میں پاکستان کے نمائندہ کی حیثیت
سے تشریف لے گئے تو آنریبل خواجہ شہاب الدین وزیر داخلہ کے نام حسب ذیل خط بھیجا۔

مکرمی و مشفقی، سلام مسنون

ڈان کے ایک تازہ نمبر میں یہ خبر پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی کہ کراچی میں بازاروں اور سڑکوں کے نام مشاہیر قوم کے نام پر رکھے جائیں گے۔ اس سلسلے میں میکسیکو کے بعض طور طریقے انوکھے ہیں اور دلچسپ بھی۔ ان کا مختصر حال لکھتا ہوں۔ ممکن ہے کوئی بات آپ کے کام کی نکل آئے۔

جہاں تک مجھے نظر آیا۔ یہاں کسی بازار یا سڑک کا نام کسی زندہ شخص سے منسوب نہیں۔ ہمارے لاہور کی طرح نہیں کہ جو شخص دو تین سال کے لئے میونسپل کمشنر ہوا۔ وہ کسی نہ کسی سڑک کو اپنے نام سے مزین کر گیا۔ چنانچہ لاہور میں کئی سڑکوں اور محلوں کے نام اب ایسے ہیں کہ کسی کو یاد بھی نہیں کہ کن کے نام منسوب ہوئے تھے اور اگر وہ اب تک زندہ ہیں تو سب کے گمنام یا بدنام ہو چکے ہیں۔ میکسیکو کی تاریخ یہ ہے۔ تین سو سال تک یہاں ہسپانوی حکومت رہی۔ وہ لوگوں کا خون چوسا۔ ۱۸۱۰ء کے لگ بھگ اس ملک نے بزور شمشیر آزادی حاصل کی۔ اس کے تقریباً سوا سو سال تک خانہ جنگی رہی۔ جس میں بڑے بڑے لیڈر اور بڑے بڑے اولوالعزم محب وطن دونوں قسم کے لوگ پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں ایک انقلاب عظیم ڈکٹیٹری کے خلاف برپا ہوا جو کتنے سال تک رہا اور جس میں میکسیکو کے بیشتر ذکر مارے گئے۔ اس سوا دو سو سال کی تاریخ میں کئی محبان وطن اور مشاہیر قوم پیدا ہو کر کٹے اور اکثر قوم کی راہ میں شہید ہوئے یعنی قوم کے دشمنوں یا غداروں یا کوتاہ نظر لوگوں اور اہل ہوس کی گولی یا تلوار کا نشانہ بنے۔ ان سب کے نام آج بازاروں کی زینت ہیں۔ محض ناموں ہی سے میکسیکو کے قومی عروج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ تین نام تو بالخصوص جا بجا ملتے ہیں۔

ایڈالگو (HIDALGO) موریلاس (MORELOS) جواریز۔ ان میں سے دو مشاہیر نے ۱۸۱۰ء میں ہسپانیہ کے خلاف علم آزادی بلند کیا تھا۔ تیسرا انیسویں صدی کے وسط میں میکسیکو کا پریذیڈنٹ تھا اس نے نیا کانسٹی ٹیوشن ۱۸۵۷ء میں بنایا تھا اور کئی اصلاحات مرتب کی تھیں اس کے علاوہ ہر شہید پریذیڈنٹ کا نام کسی نہ کسی بازار پر ثبت ہے۔ اس کے علاوہ ایک ادا ان کی مجھے بہت پسند آئی۔ وہ یہ کہ کئی بازاروں کے نام میکسیکن قوم کی اہم تاریخوں سے منسوب ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا پیرس میں بھی ایک مشہور بازار کا نام "۴ ستمبر" ہے۔ یہاں یہ رسم عام ہے۔ ہر بڑے شہر میں ایک نہ ایک بازار کا نام "۵ مئی" ضرور ہوگا۔ اس تاریخ کو میکسیکو کی حکومت نے فرانسیسیوں کو شکست دی تھی۔ ایڈالگو (HIDALGO) نے آزادی کا اعلان ۱۶ ستمبر ۱۸۱۰ء کو کیا تھا چنانچہ ایک بازار کا نام "۱۶ ستمبر" ہے اسی طرح ایک اور بازار کا نام "۲۰ نومبر" ہے۔ غالباً آپ ابھی یا سیاحت جب میکسیکو آئیں تو [illegible]

روزے رکھو۔ جن کو مقدور ہی زکوۃ و حج کرو۔ فتنہ [illegible] کھیلے تھیلے میں نہ جاؤ۔ ناچ تماشہ
نہ دیکھو۔ اجنبی عورت پر بری نظر نہ ڈالو۔ چوری نہ کرو۔ [illegible] لڑو جھگڑو نہیں۔
کسی کو ستاؤ نہیں۔ سازگاری [illegible] انسانی سے زندگی [illegible] ہنسو کھیلو۔ کسی کو اس کے
پیچھے برا نہ کہو۔ چھوٹوں پر مہربانی اور بڑوں کا ادب ملحوظ رکھو۔ وقت جو خدا نے تم کو دیا
ہی اس کو ضائع نہ ہونے دو [illegible]
جواب دہی کے لئے طیار رہو۔ کتنے آدمی ہیں جو ایسی باتوں کو [illegible] سمجھتے [illegible] ہیں گے۔
وہی سو میں مشکل سے ایک [illegible] پس اگر [illegible] لوگوں کو مولوی بگاڑتے ہیں تو آپ سے
صبر کرو۔ ننانوے کی درستی کا تم ٹھیکہ لو۔ کیا الٹی سمجھی ہی مولویوں پر لوگوں کے بگاڑنے کا الزام
لوگ بگڑے اپنی بے دینی [illegible] خدا رسول کی نافرمانی سے۔ لوگوں میں وہ اگلی سی سچائی نہیں
خوش معاملگی نہیں۔ حلال کی کمائی نہیں۔ ویسی ہی برکت نہیں۔ آج کو اسلام کی عملداری
ہوتی تو لوگوں میں اس قدر بے دینی کیوں پھیلنے پاتی؟ جو جس کے جی میں آتا ہی کر گزرتا ہی
کوئی اس کا روکنے منع کرنے والا نہیں۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز۔ مولویوں کی کون
سنتا ہی؟ اور تم نے ایسی گھڑی کا مولویوں کو ہونسنا شروع کیا ہی کہ اب [illegible] بھی کہاں؟
غدر کے پہلے تک یہ حال تھا کہ مدرسے اور خانقاہیں تو رہیں الگ۔ کوئی مسجد [illegible] سے
خالی نہ تھی۔ اور مولوی بھی [illegible] نام [illegible] مولوی نہیں۔ ایسے ایسے جید کہ سارا ہندوستان ان کا
لوہا مانتا۔ عرب تک ان [illegible] چلتے۔ اور پھر قدر بھی ایسی تھی کہ بادشاہ تک ان کے
گھر آتے۔ بہتیرا ہی اکبر شاہ نے مولوی اسمٰعیل کو وعظ کے لئے بلوایا۔ مولوی صاحب نے
صاف کہہ دیا کہ حرموں اور خواصوں کو طلاق دو تو آتا ہوں۔ اکبر شاہ منہ تکتے رہ گئے اور
مولوی اسمٰعیل نے قلعے کے اندر پاؤں نہ رکھا پر نہ رکھا۔ مشہور بات ہی کہ مولوی شاہ اسحاق
صاحب نے ہجرت کی تو ان کا کتب خانہ مال متاع چار بیٹیوں کو ملا۔ ایک ایک بیٹی کے
حصے میں ایک ایک لاکھ روپیہ آیا [illegible] کیا ہوا تھا مولویوں کے حصے کی قیامت تھی
بہتیرے مر کھپ گئے۔ بہتیرے جلاوطن ہو گئے۔ خال خال بچے تو وہ سرکاریں جن کے
گھر سے مولویوں کی پرورش ہوتی تھی۔ باقی نہ رہیں۔ مولوی لگے دربدر بھیک مانگنے

ایک دن ان تاریخی ناموں کی اہمیت دریافت کرتا ہے گویا وہ خود میکسیکو کی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ غرض قدم قدم پر بھی اس کا تربیت اچھا پڑتا ہے۔ بچے بچے کو اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

صرف مشاہیر اور تاریخوں ہی پر کفایت نہیں۔ ایک بازار کا نام آرٹیکل ۱۲۳ (ARTICLE 123) ہے یعنی میکسیکو کے آئینی دستور کی طرف اشارہ ہے جو آئینی دستور ۱۹۱۷ء میں مرتب ہوا تھا۔ اس آئینی دستور کی دفعہ ۱۲۳ میں مزدوروں کے حقوق بالوضاحت محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ اس بازار کا نام گویا اس بات کی یادگار ہے کہ میکسیکو کا آئینی دستور مزدوروں کی دوست اور خیرخواہ ہے۔

میکسیکو کا شہر اچھا خاصا وسیع ہے۔ آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے۔ چنانچہ سینکڑوں بڑے اور چھوٹے بازار ہیں۔ ناموں کی تلاش میں یہاں کے ارباب اقتدار نے بڑی بڑی جدتیں دکھائی ہیں۔ اپنے مشاہیر کے ناموں اور اپنی تاریخ کے اہم واقعات سے پورا پورا فائدہ اٹھا چکے تو دنیا کی تاریخ اور دنیا کے جغرافیہ کی طرف رجوع کیا۔ یورپ کا کوئی مشہور نامور مخلوق یا شہر ایسا نہیں جس کے نام پر کسی نہ کسی بازار کا نام نہ ہو۔ ایک بازار کا نام پیرس ہے، ایک کا نام "مارسیلز" ایک کا نام "لندن" "وینس" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسے بازار سب کے سب ایک دوسرے سے متصل اور ایک ہی علاقے میں واقع ہیں۔ چنانچہ آپ سے اگر کوئی بازار پیرس کا ذکر کرے تو آپ کو نام سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ شہر کے کس حصے میں واقع ہے۔ علیٰ ہٰذا ایک اور علاقہ ایسا ہے کہ اس میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور دریاؤں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً نیل، ڈینیوب، دجلہ، فرات، رائن وغیرہ۔

شہر کے ایک اور علاقے میں سب بازاروں کے نام دنیا کے مشہور اہلِ فن اور اہلِ علم کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً شیکسپیئر، ڈارون، ریگان، کوپرنیکس وغیرہ وغیرہ۔ ایک اور علاقہ میں سب بازاروں کے نام جنوبی امریکہ کے نام پر رکھے گئے ہیں مثلاً برازیل، ارجنٹائن، کیوبا، اگوائی وغیرہ۔

لیکن جہاں کسی بازار کا نام پہلے ہی کوئی خاص تاریخی یا اسی قسم کی کوئی اور اہمیت رکھتا ہو وہ بالکل نہیں بدلتے، خواہ یہ تاریخی اہمیت قومی ہو یا محض مقامی اور خواہ کوئی ادبی یا کوئی اور اہمیت ہو۔ اس کی مثال لاہور میں یہ ہے کہ انارکلی بازار، چوک وزیر خان وغیرہ انداز کی گلی۔ ایسے نام نہ بدلے جائیں کیونکہ ان میں مقامی تاریخ کے کئی دلچسپ پہلو نکلتے ہیں۔ یہاں ہر شہر کی مقامی تاریخ میں خاص طور پر دلچسپی پیدا کی جاتی ہے۔ ہر شہر کا اپنا ایک عجائب خانہ ہے جس میں مقامی تاریخ، تصاویر یا نقشے یا دیگر یادگاریں اور علاوہ بریں مقامی صنعت و حرفت کے نمونے خاص طور پر رکھے جاتے ہیں تاکہ سیاح فوراً اس شہر کی تمام خصوصیات سے آگاہ ہو جائے اور اہلِ شہر خود بھی جان لیں کہ ان کے شہر کی تاریخ میکسیکو اور میکسیکو کی قومی زندگی میں باعتبار صنعت و حرفت اور فن اور کاری گری کے کیا اہمیت رکھتی ہے۔

تاریخ اسلام بے شمار مشاہیر کے ناموں سے پُر ہے اور عالمِ اسلام میں بہت سے شہر مثلاً مکہ، مدینہ، بغداد، قرطبہ، غرناطہ، ایسے شہر ہیں جو قوم کے ذہن میں محکم ہو جائیں تو احساسِ قومی کو تقویت پہنچے گی۔ علیٰ ہٰذا تہذیبِ اسلامی اکثر مشہور مفکر اور ادیبوں کی ممنونِ احسان ہے۔ مثلاً جلال الدین رومی، خواجہ معین الدین چشتی، یا شعراء میں حافظ، عمر خیام اور ہمارے اپنے شعراء میں غالب، ذوق، محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔ مزید غور کیا جائے تو ہماری تاریخ اور تہذیب کے کئی اور پہلو ایسے نکلیں گے جن سے ہماری قوم کو آگاہ ہونا چاہیے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس نقطۂ نظر سے تجویز اور مشورہ کے طور پر ناموں کی ایک فہرست مرتب کی جائے اور اس فہرست کو پاکستان کے تمام صوبوں اور صوبوں کی معرفت میونسپل کمیٹیوں کے پاس بھیجا جائے اور ان کی توجہ بالوضاحت اس مقصد کی طرف مبذول کرائی جائے جس کی تہ میں ہے اور اس غرض کے لئے ہر جگہ ہوشیار لوگوں کی کمیٹیاں بنائی جائیں جو شہر کے تمام بازاروں کے ناموں پر غور کریں۔ میری ناقص رائے ہے کہ یہ نیک کام پاکستان کی وزارت داخلہ بوجہ احسن انجام دے سکتی ہے۔ اسی لئے یہ مشورہ آپ کے گوش گزار کرنے کی جرأت کی علاوہ بریں انگریزی الفاظ مثلاً روڈ، اسٹریٹ وغیرہ کی لعنت سے بھی نجات حاصل کرنی چاہیے۔ مغلوں کی دلی میں ہر سڑک اور بازار کا نام موجود تھا لیکن

سکے کا لیکن "ما یا غلط" تو "پھینک" سکتے ہیں۔

ہندوستان سے جو تار آتا ہے اس کی خبر محض سرکاری ذرائع سے ہم تک پہنچتی ہے۔ تفصیلات سے تشنہ رہتے ہیں اس لئے طبیعت متفکر رہتی ہے۔ نہ معلوم ان دو صاحب کے سر پر کیا سودا سمایا ہے کہ حق و راستی اور صلح کوشی سے انہوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ شاید آئندہ الیکشن کی مہم نے عمل و فکر میں بھی پیدا کر دی ہے۔ اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ لندن میں ظفر اللہ خان نے ذہن کو رکھا ہے۔ خدا ہم لوگوں کا حامی و ناصر ہو۔ پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے لیڈروں کی دانائی اور مدبری کے یہاں سب لوگ قائل ہیں اور ہمیشہ کا قائل ہوں ان سے عزت بنتے چلے جاتے ہیں۔ خدا کا بندہ ہندوستان کے کان میں مروڑتا۔ سب اپنا زور ہی صرف کر سکتے ہیں۔

مجید لاہوری صاحب کا سلام پہنچا۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ ان سے ملاقات افسوس کہ بہت مختصر ہوئی ہے۔ ہم یار زندہ صحبت باقی۔ انہیں میرا سلام متواتر بھی پہنچا دیجئے۔

خاکسار
بخاری

---

(۲)

نیویارک، ۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

برادر محترم سلام مسنون۔ امید ہے آپ صحیح بخیر لاہور پہنچ گئے ہوں گے۔ انقلاب کے معطل ہو جانے کے بعد آپ اغلباً مسلم ٹاؤن ہی میں خانہ نشین ہوں گے تاہم جب کبھی شہر جانا ہو اور دوستوں سے ملاقات ہو تو انہیں میرا سلام کہئے۔ چند دن ہوئے میں نے امتیاز کو خط لکھا تھا جواب سے حسب معمول محروم ہوں اور شاید محروم رہوں۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم میری محرومی ہی کا احساس ان تک پہنچا دیجئے۔ گزشتہ کے کاروبار میں اس سے بھی لبا ملاقات نہ ہو سکی ہے۔ کیا صوفی صاحب بدستور نیو ہاسٹل میں نگران ہیں یا کچہری، وہ کسی سرکاری کوٹھیوں میں سے کسی کوٹھی میں پہنچ گئے ہیں۔ نہ معلوم پرنسپل کون ہیں۔ آخری اطلاع ڈاکٹر صادق کے متعلق تھی۔ اور کیا شریف صاحب کراچی ہی میں ہیں یا لاہور واپس آ گئے؟ ان سوالات سے مکمل معاملہ کر لینا مطلوب نہیں محض احباب کے مستقر و احوال کا نقشہ ذہن میں جمانا چاہتا ہوں اسی طرح کے سوالات ہاشمی صاحب اور عابد علی صاحب کے متعلق بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ عابد صاحب نے زندگی میں چند در چند ڈرامے پیدا کر لئے ہیں۔ میں ابتدائی مناظر سے بھی بے خبر ہوں۔ اس لئے تکمیل کا خاکہ تک سمجھ میں نہ آیا۔ خلیفہ حکیم کے متعلق آخری اطلاع تھی کہ وہ اقبال اکیڈیمی کے ڈائرکٹر ہیں۔ کیا یہ اکیڈیمی پنپ رہی ہے اور لاہور میں ہے؟ میں نے خلیفہ صاحب سے اسلامی کلچر پر یہاں کے ایک مقتدر مؤلف کے لئے ایک مضمون لکھوایا تھا وہ عنقریب اور فلسفیان عالم کے رشحات قلم کی معیت میں کتابی شکل میں شائع ہوگا اور یہ پہلا موقع ہوگا کہ اسلام پر کسی پاکستانی کا مدلل مضمون اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ چھپے۔ یہاں کی ایک یونیورسٹی میں مذاہب قدیم اور حقوق انسانی کے مضمون پر دسمبر میں ایک مناظرہ ہوگا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے خلیفہ حکیم صاحب کے لئے بے حد سعی کی کہ اسلام کی نمائندگی وہ کریں۔ آخر اس میں کامیاب ہوا۔ خلیفہ صاحب کا کرایہ وغیرہ یونیورسٹی دے گی۔ کینیڈا کی McGill یونیورسٹی فیصلہ کر رہی ہے کہ اسلامیات کے طلباء اور فارغ التحصیل بزرگوں کو سال دو سال کے لئے یہاں بلانا چاہتی ہے۔ عنقریب وہاں کے پروفیسر سمتھ انتخاب

شائع کئے ہیں۔ پاکستان کا دورہ کرنے گئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ آپ سے بھی ملیں۔ سمتھ صاحب جو ہمارے ملک کی سیاحت کر چکے ہیں —— "MODERN ISLAM IN INDIA" کے مصنف ہیں۔ آغا سید وغیرہ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ چودھری ظفر اللہ خاں صاحب آج کل یہاں ہیں۔ مباحثۂ کشمیر کے آنے والے سیشن کے لئے نتیجے تیار کر رہے ہیں اور سب انتظامات میں معروف ہیں۔ خدا کرے ہم اس قضیے سے عزت کے ساتھ اور بہ احسن عہدہ برآ ہوں۔ ایک امریکی یونیورسٹی خشک علاقوں [illegible] پر ریسرچ کرنا چاہتی ہے لیکن کسی ایشیائی یونیورسٹی کے ساتھ مل کر۔ بیروت اور پنجاب دونوں زیر غور ہیں۔ میں پنجاب کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ خدا کرے ہو جائے گا۔ لیکن پنجاب حکومت اور پنجاب یونیورسٹی کے اشارے کا منتظر ہوں کہ وہ یہ بوجھ اٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔ ڈاکٹر [illegible] (سابق پرنسپل فارمن کالج) میرے مددگار ہیں اور خوب زور لگا رہے ہیں۔

آپ کے لاہور میں ہو جانے کا خیال آتے ہی تو کچھ [illegible] ہو جاتی ہے تاہم جب تک آپ کراچی میں تھے آپ کی موجودگی سے زبیدہ اور ان کے تعلق سے مجھے ایک اطمینان تھا۔ سب لوگ کراچی کی صحت بہت کر رہے ہیں لاہور کا (بقول [illegible]) اب کیا بنے گا؟

مہر صاحب کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ انہوں اب بھی اپنی پرانی [illegible] سانپ مارنے کے لئے جنگل میں گشت لگاتے ہوں گے۔ انہیں بھی میرا سلام کہئے گا۔

آج اتوار کا دن ہے۔ [illegible] یہ مشغلہ ہر ملک اور ہر زمانے میں [illegible] رائج ہوتا چلا آیا ہے۔ اگلے ہفتے سے پیرس کے سفر کے لئے تیاریاں شروع کر دوں گا۔ پہلے [illegible] سب [illegible] پوچھتے ہیں۔ کل شام ٹیلی وژن پر [illegible] ہوئی۔ کچھ شعر کچھ جاپانی عہد نامہ کچھ کوریا۔ وقس علیٰ ہذا۔ غرضیکہ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے [illegible]

خاکسار

بخاری

---

(۳)

12 E 65th STREET NEWYORK

۲۲ر مارچ ۱۹۵۲ء

برادرم تسلیم و سلام مسنون۔ نہ معلوم آپ کا کیا حال ہے بڑے عرصے سے آپ کا خط نہیں آیا۔ یہ آپ کا شیوہ نہیں۔ اس لئے آپ کے متعلق تشویش ہے۔ خدا آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ چند دن سے بیماری ہی بیماری سننے میں آ رہی ہے۔ سلمان بے چارے کو نمونیا ہو گیا۔ انور کا خط آیا تھا کہ اب بہتر ہیں۔ اس سے بھی ایک دو ہفتے گزر گئے۔ نہ معلوم اب ان کا کیا حال ہے۔ میں پیرس سے یہاں [illegible] فروری کو پہنچا۔ بالکل چور۔ پہلے انفلوئنزا ہو گیا اس سے صحت پائی تو خون کا دباؤ یک لخت گر گیا۔ سر میں چکر آنے لگے اور صاحب فراش ہونا پڑا۔ اب بالکل تندرست ہوں۔ زبیدہ کو عرصے سے [illegible] کی شکایت ہے۔ وہ آج کل پنجاب میں ہیں۔ امید ہے آپ سے ملاقات ہوئی ہوگی (بشرطیکہ آپ کراچی نہ آ گئے ہوں) آج کل کام میں گھرا ہوا ہوں۔ سیکورٹی کونسل اور ڈس آرمامنٹ کمیشن میں ہونے کی وجہ سے مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان کے لئے [illegible] آگ میں ہیں ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کوئی غلط قدم نہ پڑ جائے۔ اسد صاحب بحیثیت وزیر کے میرے معاون مقرر ہو سکتے۔ جنوری کی بجائے مارچ میں یہاں پہنچے۔ وزیر خارجہ

آپ دونوں سلمان پر پورا بھروسہ ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔
اور کچھ حصے کچھ منگوانا ہو تو ابھی سے لکھ بھیجئے۔ یہاں کا شاپنگ ازحد صبر آزما ہوتا ہے۔

خاکسار
بخاری

---

(۶)

نیویارک۔ ۹ فروری ۱۹۵۸ء

برادر محترم سلام مسنون۔ جب نیویارک پہنچا تو جہاز سے بیمار اترا۔ بے آرامی میں ایک قیمتی اوورکوٹ بھی جہاز ہی میں رہ گیا اور اب اس کے ملنے کی کوئی امید نہیں۔ سخت نزلہ اور بخار۔ سیدھا ہسپتال لے گئے۔ اب افاقہ ہے۔ لندن میں چوبیس گھنٹے ٹھہرنا پڑا۔ جہاز والوں نے ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرایا جو مضافات میں واقع تھا۔ بڑی سی عمارت جیسے کسی انگریز رئیس کا محل ہو۔ اردگرد وسیع باغ۔ دن بھر ہوٹل ہی کے آفتاب خانے میں بیٹھا رہا۔ دوست آشنا جو لندن میں رہتے ہیں ملاقات یا ٹیلیفون کی کوشش نہ کی۔ موسم صاف تھا خیال تھا لندن سے میں کچھ تخفیف ہو جائے گی۔ لیکن نہ ہوئی۔ قاہرہ کسی کو آنے کی اطلاع نہ دی تھی۔ البتہ روم کے ایئرپورٹ پر اسلم ملک اور اس کی بیوی ملنے آئے۔ گھنٹہ بھر کا وقفہ ان کی معیت میں گزرا۔ کراچی سے میرے ہی جہاز میں طیب حسین واپس قاہرہ جا رہے تھے۔ قاہرہ کے ایئرپورٹ پر ان کی بیگم صاحبہ (مرزا محمد سعید کی صاحبزادی) انہیں لینے آئی ہوئی تھیں۔ ان سے کچھ گپ رہی۔ نیویارک ابھی خالی خالی ہے ابھی تک کسی دوست سے تجدید مراسم کی ہمت نہیں کی۔ چودھری ظفر اللہ خاں یہاں سے جنیوا پہنچے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ دفتر گیا۔ جاتے ہی کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مجبوراً اور کچھ دل بہلانے کے لئے۔ [illegible] تفکرات ہوتی ہے۔ آج ہارون کا خط آیا ہے کہ میں شادی مارچ کے آخر میں کرنا چاہتا ہوں۔ اسے میں نے لکھا ہے کہ زبیدہ اور منصور کے ساتھ مشورہ کر کے خرچ کا تخمینہ لکھ بھیجیے۔ منصور کی شادی کے اخراجات کا نقشہ اسے میں نے یہاں سے بھیج دیا ہے۔ اس سے مدد ملے گی۔ وہ کہتا ہے کہ شادی بجائے اپریل کے مارچ ہی کے مہینے میں مناسب ہو گی۔ خدا کرے اس وقت تک میں کچھ پونجی جمع کر سکوں۔ فی الحال تو تجوری بجائیں کرتی ہے۔ اندازہ ہے کہ گھر کے لوگ اس وقت سب منتشر ہوں گے اور زبیدہ اکیلی ہوں گی۔ خیریت دریافت کرتے رہیے گا۔ جب میں کراچی سے روانہ ہوا تھا تو اسے بھی بخار اور زکام تھا۔ شادی کی بھاگ دوڑ نے کافی تھکا دیا۔ منصور اور زرینہ غالباً تعطیل منانے دلی چلے گئے ہوں گے۔ ہارون لاہور میں ہے [illegible] کل دورے پر ہے وہ ۲۲ فروری تک دورے پر رہے گا۔ ذوالفقار کے اوقات جیسے مصروف ہیں وہ آپ جانتے ہیں۔

کراچی آنے کا وہ لطف نہ آیا جس کی امید تھی لوگ پژمردہ اور ان کی گفتگو اکثر مضطر تھی۔ علاوہ بریں شادی کے تفکرات ہمیشہ دماغ پر حاوی رہے۔ دو مرتبہ لاہور گیا لیکن لاہور سے محض بالطبع ہونے کی فراغت نصیب نہ ہوئی۔ تاہم غنیمت ہے کہ سب احباب سے (بجز ایک عابد علی کے جو بارات میں بھی شامل نہ ہوئے) ملاقات تو ہو گئی۔ اب دیکھئے اگلے دو ایک سال میں زمانہ ہر ایک سے کیا سلوک کرتا ہے۔ آپ کی صحبت بدستور فیض کا سرچشمہ تھی۔ جو قہقہے نصیب ہوئے وہ آپ ہی کی بدولت نصیب ہوئے اور شادی کے انتظام میں بھی آپ ہی کی ذات سے بہت کچھ ڈھارس بندھی رہی ورنہ میں بالکل ہی بہک گیا ہوتا۔ خدا آپ کو سلامت اور شاداں رکھے۔ مجید لاہوری کی صحبت بھی حاصل ہوئی تھی۔ ان سے میری

جانب سے حضرت کر دیجئے گا کہ وہ خدا حافظ کہنے آئے تو میں گھر پر موجود نہ تھا۔ ان کی علالت [illegible] سے بھی اور سب سے بڑھ کر ان کے اخلاقِ حسنہ کی علالت کی یاد سے طبیعت تا دیر بے تاب سی رہی۔ خدا ان کے دماغ کو اور جلا دے۔ ان پر سلام، پروفیسر ندوی صاحب پر بھی جن کی کتاب پڑھی۔ وہ جو آپ کو انہوں نے تحفۃً دی تھی، اردو والی میرے گھر پر ہے آپ وہاں سے وصول کر لیجئے گا۔

شاہد سہروردی نیویارک میں آ کر مقیم ہو گئے ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی میں ان کا منصب آرٹ لیکچرار کا ہے۔ ابھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پرسوں، یہاں کے سب سے بڑے عجائب خانے میں تصویروں کی ایک نمائش کا افتتاح ہے۔ ڈائریکٹر اور ان کی بیوی نے مجھے نمائش سے پہلے کھانے پر بلایا ہے۔ ارادہ ہے شاہد کو بھی ساتھ لے جاؤں۔ انہیں وہاں بہت سے ہم سخن اور ہم زبان ملیں گے۔ تنہائی ان پر غالب آ گئی ہے اور ان کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ آخری عمر میں تنہائی کا عالم اور تلاشِ معاش میں وطن سے اس قدر دور۔ ان پر ترس آتا ہے۔ طبیعت کی ان کی حساس ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی سی خوشدلی ان میں نہیں (وابستہ رہ فرہنگ و اس کا روزن کی نذر سے پھر!) یہ محض نیویارک پہنچنے کا خط ہے اس سے اختصار مقصود ہے باقی آئندہ!

ترجمے کے لئے اردو کے مختصر افسانوں کا انتخاب۔ عباس کو یاد دہانی کراتے رہئے گا۔ حسرت کو سلام۔ پڑھا انہوں نے کہ ایران میں بھی مکتب بیدار ہو رہا ہے؟

خاکسار

بخاری

---

(۷)

نیویارک

۱۱ فروری ۱۹۵۳ء

برادر محترم بلوچ صاحب! آپ نے بھیجا تھا اس کے مطابق آپ کا ۱۵ فروری کا لکھا ہوا گرامی نامہ آج ۱۹ فروری کو نہیں بلکہ ۱۰ کو یہاں پہنچ گیا۔ میرا یہ خط آپ کے خط کا جواب نہیں بلکہ خود بخود خط ہے۔ ایک مدت سے آپ کو لکھ رہا ہوں۔ "بھنگیوں کی توپ" کے مکمل حالات مطلوب ہیں۔ کس نے بنائی؟ کہاں بنائی؟ کیا توپ ساز کا نام اور کوائف معلوم ہیں؟ توپ کا اصل مالک کون تھا؟ توپ کی عمر کتنی ہے؟ ہوتے ہوتے لاہور کے عجائب خانے کے سامنے کیسے پہنچ گئی؟

اس ریسرچ کا محتاج لیفٹیننٹ جنرل کی استدعا کرتی ہے۔ ان حضرت کی کیفیت یہ ہے کہ انہیں پاکستان کی کسی چیز کا مطلقاً کوئی علم نہیں بجز بھنگیوں کی توپ کے۔ اور اس توپ کے بارے میں ایسا شغف ہے کہ عشق و جنون کی حد تک۔ کپلنگ کی کتاب "کم" Kim میں اس کا حال انہوں نے پڑھا ہے (اس لئے کہتے بھی "کم کی توپ" ہیں) اس کے مفصل حالات ان تک پہنچا سکا تو وہ پھولے نہ سمائیں گے بلکہ شاید انہیں مطلقاً و مجملاً کاغذ پر لکھوا کر اپنی لائبریری میں محفوظ کروا دیں۔ پہلے خیال آیا کہ لاہور کے عجائب خانے کے مہتمم صاحب سے رجوع کروں مگر جواب جلد دینا انہیں گوارا ہو گا یا میرا خط ان کے کاغذوں ہی میں کہیں پڑا رہے گا۔

اول تو مفصل حالات آپ کو خود ہی معلوم ہوں گے ورنہ آپ کا دماغ اور علم ... ورنہ معلوم ہو سکے تو آپ کراچی میں کسی ماہر

[illegible] حقیقت میں یہ جو تم دیکھتے ہو بھیک ہی مانگنا ہی - آخر معاش سے تنگ ہو کر مولویوں [illegible] بھی چھوڑ دیا - شہر میں سیکڑوں آدمی اس طرح کے نکلیں گے جن کے بزرگ نامی [illegible] مگر [illegible] کے نام بے بھی نہیں جانتے [illegible] جو ابھی تک مولویۃ کا پیشہ [illegible] بھی [illegible] کوئی بچا ہو تو بچا ہو [illegible] کے کھلا کھلا نہیں تو چوری چھپے برابر انگریزی [illegible] مولویت کا نوین بھی خاتمہ ہی [illegible] شے جو اپنی وضع کو [illegible] چلے جاتے ہیں بس ان کی آنکھ بند ہوئی [illegible] [illegible] - غرض مولویوں پر تو نرا ناحق کا الزام ہی - قصور تو اپنا اور تھوپیں دوسروں پر - خواجہ آزاد یہ صحیح ہی کہ مولویوں کے دام میں بہت تھوڑی مچھلیاں پھنسی ہوئی دکھائی دیتی ہیں لیکن جس طرح ایک دیا سلائی سارے شہر کے جلانے کو کافی ہی - ایک مولوی ملک کے مسلمانوں پر اثر ڈال سکتا ہی - سُنتا ہی ایک اور آس سے سیکھتے ہیں ہزار - [illegible] لوگ ہیں جو ظاہر میں مولویوں کے ساتھ کسی طرح کا تعلق نہیں رکھتے وہ شاید سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتے کہ مسجد میں جائیں مولوی صاحب کے مقتدی بنیں یا اُن کا وعظ سُنیں [illegible] وہ صرف نام کے مسلمان ہیں اس لئے کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوگئے - نہ اُن کو دین [illegible] سے بحث - نہ خدا کے حکم کی پروا - نہ رسول کے فرمانے سے مطلب - انھوں نے زندگی کا ایسا طرز اختیار کر رکھا ہی کہ ان میں اور عام حیوانوں میں امتیاز کرنا مشکل ہی - لیکن با ایں ہمہ یہ لوگ بھی مولویوں کی حکومت سے بری نہیں - [illegible] نفرۃ - عام وحشۃ عام اجنبیۃ جو مسلمانوں کو انگریزوں سے ہی اور جس نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا اور رہا سہا اور تباہ کرکے رہے گی اس کا ماخذ کیا ہی اور یہ بلا آئی تو کہاں سے آئی - بے شک یہ خیال مولویوں سے پیدا ہو کر عام مسلمانوں میں پھیلا - ہندو کھلے بت پرست اور ان سے ایسا میل جول کہ ہندو مسلمان چولی دامن کا ساتھ - ان کے میلوں میں شریک - ان کی رسموں [illegible] پیرو - اور اہل کتاب سے اتنا پرہیز - بادی بگمہ - ایک جگہ کا رہنا سہنا تیر میر تن [illegible] - خواجہ آزاد - جو آپ کا [illegible] تو انگریزوں کے ساتھ بدرجۂ اولیٰ ملاپ رکھنا ضرور ہی - ہندو اور ہم پڑوسی [illegible] ہیں [illegible] انگریز اور ہم حاکم و محکوم - پڑوسی کی بے پڑوسی کے

پوری طرح پاکستان سے ایک سال کی رخصت لی۔ اس میں تلاشِ معاش شروع کی۔ کچھ تدبیریں کامیاب ہوتی نظر آنے لگیں تو بیمار پڑ گیا۔ اب اچھا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے پھر کوشش شروع کروں گا۔

لاہور سے چلے آنے کا صدمہ نہیں۔ آپ مرزا، عزیز، ملک، ناصر، فیض، صوفی صاحب جانتے ہیں آپ کے گرد عقیدت مندوں کا حلقہ ہے مستقبل قریب میں شہرِ لاہور کی صحبت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم آپ کے بیروں سے بھی لاہور کے نام پر آنسو نکل آئے۔ حمید نظامی کی طرف سے ایک خط کی بیجھے [illegible] ماہی کی توقع کر رہا تھا مگر وہ لکھے گا۔ لیکن وہ بیکار۔ باقاعدہ بیان خط کے معاملے میں [illegible] ہے۔ تیاز نے بھی سلسلہ یاد [illegible] ہے۔ بشیر ہاشمی کا ایک خط [illegible] البتہ چند دن ہوئے آیا تھا۔

پچھلے ایک مدت کا جواب دینے کا اتفاق ہوا۔ ایک پبلشر نے مجھ سے ایک بچوں کی کہانی مانگی ہے (تخمیناً ایک ہزار الفاظ)۔ یہ ایک مجموعہ میں شامل کی جائے گی جس میں سب دیگر اقوام کے بچوں کی کہانیاں بھی شامل ہوں گی۔ کہتے ہیں کہانی ایسی ہو جو قدیم FOLKLORE پر مبنی ہو۔ دس بارہ سال کی عمر کے بچوں کے لئے موزوں ہو اور ممکن ہو تو ایسی ہو کہ اس سے صلح و آشتی کا سبق نہ دیا جا سکے۔ نہ قتال و جدال کا۔ یعنی وہ ہو کہ [illegible] جو بچوں کے کام کی اور ایمان کے نصب العین پر بھی پوری اترے۔ اب ایسی کہانی کا انتخاب وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی کوئی [illegible] مضمون کا [illegible] کرتے رہتے ہوں۔ پہلے خیال آیا تیاز سے پوچھوں لیکن ان سے بعد جواب کی توقع نہیں۔ اس لئے آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ عباس بھی کراچی میں ہیں۔ آپ دونوں مل کر ایسی کہانی انتخاب کر دیجئے تو اور کون کرے گا۔ کہانی اردو میں بھجوا دیجئے۔ میں اس کا ترجمہ یہاں کر لوں گا۔ [illegible] کہ ان کی کہانیوں کا ترجمہ بھی جاری ہے (یعنی بیماری تک جاری تھا۔ اب پھر شروع ہوگا) امین الدین کے انتقال کی خبر آپ کے خط سے ملی۔ زبیدہ نے میری بیماری کے پیشِ نظر اسے مجھ سے پوشیدہ رکھا۔ حسرت کاشمیری اور مجید لاہوری (کو میرا سلام) وہ کاشمیری اور لاہوری ایسے ہی ہیں جیسے میں پاکستانی ہوں۔ ہم تینوں کی قسمت ایک ہی نوشتے نے متعین کی تھی۔ جس دیار کو فخر سے ہم نے اپنایا اسی سے اخراج ہوا۔

خاکسار

بخاری

عنقریب ایک اور خط لکھوں گا۔ پیاس نہیں بجھی۔

---

(۱۴)

نیویارک ۱۰ نومبر ۱۹۵۳ء

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ کریم نومبر کا لکھا ہوا ملا۔ مختصر لیکن بہرحال مکتوبِ محبوب۔ دل سیر نہ ہوا آنکھیں تو روشن ہوئیں۔ اس اثنا میں بشیر ہاشمی کا خط بھی ملا جن دنوں آپ لاہور میں تھے، اور [illegible] آپ کے اعزاز میں ہو رہی تھیں۔ ان دنوں وہ پہلے چار ماہ نابینا خانہ میں مبتلا تھا اور ماتم کر رہا تھا کہ آپ کی صحبت سے محروم رہا۔ ان کے میرے درمیان خط و کتابت نے حال ہی میں ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا ہے۔ وہ بھی بیمار میں بھی بیمار۔ وہ بھی بر لبِ پنشن میں بھی بر لبِ پنشن۔ دونوں کے خط ایک ہی زمین میں ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے کلام میں سوز مجھ سے زیادہ ہوتا ہے اور نزاکتِ طبع بھی مجھ سے وافر۔ چغتائی کے خطوط بھی حال ہی میں مسلسل آئے۔ وہ اپنے گنبدِ علاج میں میری بیماری سے بے خبر ہے چنانچہ ان کے خطوں کا لہجہ بے حد تندرست ہے اور اکثر [illegible] ثابت ہوا

میرے خیال میں یہ مضمون مختصر ہے لیکن اس لیے مزید تفتیش کا وعدہ کیا ہے۔ ایک کتاب "PUNJAB PRELUDE" نامی میرے پاس ریویو کے لئے آئی ہے۔ مصنفہ کا نام مس MAUD ہے جو کہ ہوم ہیرا ایجسن کالج میں پڑھاتی تھیں۔ ستا داب بھی پڑھاتی ہوں۔ پاکستان، دو پنجاب پر فدا ہیں اور ہندوستان سے متنفر۔ بار بار ثابت کرتی ہیں کہ پنجابی اور انگریز دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ایک باب ہاشم صاحب کے خاندان پر (مع تغیر اسما) ہے اور بیاہ سے لکھا کر ہیر رانجھا کے بیاہ سے بھی واقف ہیں۔ ایک حصہ نبات اینڈ گرل ڈبل کے متعلق ہے جنہیں لواسے اینڈ لائسنڈ ڈبل کا حال بھی بیان کیا ہے۔

خاکسار

بخاری

تم یہاں کے اخبار میں خبر چھپی ہے کہ کابینہ میں ردوبدل ہونے والی ہے جو بڑا لوگوں کے افسروں میں مولی ہے۔ اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہر قسم کی آفت سے بچائے۔ ہم یہاں پاکستان کی بہبود اور پاکستانیوں خصوصاً اپنے احباب اور اقربا کی بہبود اور سلامتی کے لئے دست بدعا رہتے ہیں۔

---

(۱۵)

برادرم بشیر!

برادر محترم سلام مسنون۔ گرامی نامہ ۳۰ نومبر کا ملا۔ یہ آپ کے مفصل ترخطوں میں تھا۔ لہٰذا بہت لطف آیا۔ اور ذہن نے لمبی چوڑی مسافت مرے سے کرلی۔ مضمون کے متعلق عرض یہ ہے کہ قبل پاکستان کے ان اخباروں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو موجودہ پاکستانی علاقہ سے شائع ہوتے تھے تاکہ اس علاقے کی صحافتی روایت کا کچھ حال معلوم ہو نیز ان اخباروں کا ذکر بھی مناسب ہوگا جو پاکستانی علاقے سے شائع تو نہ ہوتے تھے لیکن جن کا پاکستانی تحریک سے گہرا تعلق تھا مثلاً ڈان۔ اتنا لکھنے کے بعد یہ بھی کہنا لازم ہے کہ میرا یہ مشورہ کچھ فضول سا ہے۔ دراصل پاکستانی صحافت کا احوال بیان کرنا ہے۔ اب اس کا پس منظر بیان کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے یہ آپ کے حسن مذاق اور احساس ربط پر چھوڑتا ہوں۔ ان سے بڑھ کر کسوٹی بھی کوئی نہیں۔ البتہ یہ خیال رہے کہ قارئین انگریز اور امریکی ہوں گے۔ اور جس بنچ سے یہ باب کتاب میں شامل ہوگا اس سے پاکستانی معاشرت پر روشنی ڈالنا مقصود ہوگا۔ فرنگی لوگ ایشیائی ممالک کے بارے میں اکثر بالکل بے خبر ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایشیا کے لوگ کس قسم کے لوگ ہیں کیا کر رہے ہیں کیا سوچ رہے ہیں کس رخ جا رہے ہیں اور کس کے ہاتھ میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان خیالات کے زیر عنوان صحافت کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس آلۂ جمہور کا ایشیا میں استعمال کیا ہے کون کر رہا ہے؟ کون لوگ اس سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی باتیں کہ کتنے لوگ اخبار خریدتے ہیں اور فی اخبار کتنی کاپیوں کا تداول ہے گزرتا ہے کتنے لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ کس طبقے کے ہیں کس قسم کی خبریں سب سے زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہیں۔ کس قسم کی خبریں نادر یا مفقود۔ کون سے طبقے اخبار کے اثر سے بالکل ہی مامون یا محروم ہیں؟ اس طرح کی باتیں یہاں لوگوں کے لئے ازحد دلچسپ ہوں گی۔ لوگوں کو یہاں کریدتی ہے کہ ایشیائی ممالک جنہوں نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے۔ اپنی آزادی کو کیا لباس پہنا رہے ہیں۔ اس کے تحت میں آپ جانتے ہیں صحافت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے لوگ اکثر اس کے متعلق سوالات پوچھتے رہتے ہیں مثال کے طور پر جب میں کراچی میں تھا تو مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آئین کے متعلق ابھی بڑی تفتیش بھی بیٹھی ہوئی ہیں اور مطالبات کے کالموں ہی میں ہو رہی ہیں۔ اور ملک میں اس کے علاوہ جتنی سیاسی جماعتیں جلسوں اور لیکچروں میں بھی رفاقت آرا کا اظہار کیا جا؟

گزر بھی سکتی ہی محکوم کی بے حاکم ایک گھڑی نہین گزر سکتی - ہادی بیگم - [illegible] آپ بھی برابر
والوں ہی میں ہو سکتا ہی - انگریز ہندوستانیوں کو کیوں [illegible] [illegible]
یہ بات بھی سچ ہی مگر میری مراد یہ ہی کہ تم کو اپنی طرف سے بیکار نہیں رکھنا چاہئے - ہادی -
بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہی ؟ خواجہ آزاد [illegible] بہتی ہو کہ ہو سکتا ہی ؟ اجی یہی تو بڑا بل اگریڑا
ہی - مولویوں نے مذہب کا حیلہ بنا کر لوگوں کو کچھ ایسا ڈرایا ہی کہ اب بھی صاف دل سے
نہ کوئی انگریزی پڑھتا ہی اور نہ انگریزوں کا علم سیکھتا - ہادی - کیوں ناحق تارو مولویوں
کا گناہ سمیٹتے ہو کیا مولوی لوگوں کے پیچھے درہ لئے پڑے پھرتے ہیں - تم حاکموں کے آگے
بھی مولویوں کی ایسی ہی بدیاں رہتے ہوگے - خواجہ آزاد [illegible] حاکم ؟ میں تو خدا کے آگے ان کی
شکایت کرنے [illegible] - ہادی - شنوائی بھی ضرور ہو گی - بھلا کس قسم کی شکایتیں آزاد -
ایک شکایت ہو تو بیان کروں درجنوں - کوڑیوں - اوّل نمبر تو وہی کہ ان کو دوسروں کی کمائی
کھانے کا کوئی حق نہیں [illegible] یہ کہ اوروں کو زہد کی تعلیم کرتے اور آپ مُردے کی جانماز
تک نہیں چھوڑتے - میرے آپ تو نکمے تھے سو تھے انھوں نے احدیوں کی ایک پلٹن کی
پلٹن طیار کی یعنی اُن کے شاگرد جو سارے ملک کو لوٹ کر کھا گئے اور ڈکار تک نہ لی - چوتھے
ریاکاری کہ لوگوں کے دکھانے کو بتکلف نیک بنتے اور حقیقت میں جیسے نیک ہیں سو معلوم
پانچویں [illegible] ٹھگنے اور دھوکا دینے کے لیے اپنے اپنے ڈھب یاد ہیں کہ بڑے شاطر چور کی
بھی کیا اصل ہی - مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کے نام سے چندے جمع کرتے اور بے دریغ
اپنے خرچ میں لاتے گویا شیر مادر یا میراث پدر ہی - کلکتہ اور بمبئی اور ڈھاکہ اور پٹنہ اور
حیدرآباد اور [illegible] دور کے شہروں کے دھاوے مارتے کہ ہم نے دلی میں
اسلامی مدرسہ جاری کیا [illegible] مسلمانوں کو چاہیئے کہ مدرّسوں کی تنخواہوں طالب العلموں
کے وظیفوں اور کتابوں کے لئے جس سے جتنا ہو سکے اس کار خیر میں ضرور مدد کرے
انّ اللہ لایضیع اجر المحسنین[1] - لوگوں نے دیکھا ایک مقدس وضع آدمی کرتہ جبہ پہنے
سر پر عربی عمامہ باندھے [illegible] پر گھٹا پڑا ہوا - نیچی ڈاڑھی - اونچا پاجامہ - پھندنی جوتی

[1] - نیکی کرنے والوں کے عملوں کو اکارت نہیں جانے دیتا ۱۲

آپ کی بہت شفقت، عنایت کی بہت بہت ممنونیت ہے [illegible] جب آپ پرسوں [illegible]
[illegible] آپ کے پاس [illegible]

میرا دوروں کا سلسلہ [illegible] اور بہت [illegible] سے [illegible]
[illegible] سلام
[illegible]

خاکسار

بخاری

---

(۱۸)

۲ تغلق روڈ

نئی دہلی ۱۱ دسمبر

برادر محترم سلام مسنون۔ فی الحال نیوز ایجنسیاں غیر انگریزی اخبارات کو بھی خبریں انگریزی ہی میں بھیجتی ہیں۔ یہ اخبارات خود اپنے مترجموں سے ان کا ترجمہ کرا کر چھاپتے ہیں۔ اس سسٹم کے نقائص یہ ہیں: —

(۱) نیوز ایجنسیوں کو خبریں جمع کرنے کے لیے ایسے کارسپانڈنٹ رکھنے پڑتے ہیں جو انگریزی سے کما حقہٗ واقف ہوں۔ بعض دیسی زبانیں جاننے والے کارسپانڈنٹ محض اس وجہ سے کہ انہیں انگریزی زبان میں کافی مہارت حاصل نہیں، کارسپانڈنٹ نہیں بن سکتے۔

(۲) تمام واقعات کی خبریں انگریزی ہی میں جمع کی جاتی ہیں حالانکہ مضافات میں کئی ایسے دلچسپ واقعات پیش آتے ہیں جو دیسی زبانوں کی دلچسپی کے ہو سکتے ہیں۔

(۳) ہر غیر انگریزی اخبار کو ایک دو تین مترجم رکھنے پڑتے ہیں۔ بعض اوقات کم ہو تو مترجم [illegible] اور کم [illegible] ہوتے ہیں۔ اور خبروں کی ہیئت ناقص ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ترجمے میں وقت صرف ہوتا ہے۔

ان نقائص کو رفع کرنے کے لیے نیز دیسی زبانوں کی عزت افزائی کے پیش نظر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ نیوز ایجنسیاں اپنے کارسپانڈنٹوں سے خبریں دیسی زبانوں ہی میں منگائیں۔ اور انہی زبانوں میں اخبارات کو بھیج دیں۔ یعنی اے پی آئی یا پریس ٹرسٹ کا نامہ نگار (مثلاً) اپنے ہیڈ آفس کو خبر اردو میں بھیجے اور نیوز ایجنسی کا ہیڈ آفس آپ تک وہ خبر اردو ہی میں پہنچا دے جو آپ بعینہٖ یا انتخاب و اختصار کے بعد بغیر مترجم کی مزاحمت پیش آنے کے اخبار میں چھاپ سکیں۔

اس سکیم میں آپ کو کوئی خامی سوائے صعوبت نظر آتی ہے تو پھر دوسرا سوال یہ ہوگا کہ ایسی خبریں ٹیلی پرنٹر پر کیونکر بھیجی جائیں گی۔ اس کا جواب سوائے رومن رسم الخط کے اور کچھ نہیں۔ رومن حروف اور دیسی زبانوں کے حروف کی آپس میں پوری پوری تطبیق ممکن نہیں لیکن اس کی شاید ضرورت بھی نہیں۔ دیسی زبانیں بھی خاصی آسانی کے ساتھ رومن حروف میں منتقل کی جا سکتی ہیں۔ شاید کہیں کہیں ابہام رہ جائے لیکن سیاق و سباق اکثر ابہام کے رفع کرنے میں مدد دے گا۔ جہاں اس سے بھی کام نہ چلے وہاں شاید دقت ہو لیکن ابہامات کا خطرہ تو موجودہ سسٹم میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ بعض تراجم اصل سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

قیام تھیلیاں ان کے پاس ہوگا۔ ہر صفحے سے پہلے ایک دفعہ ممنہ ور دیکھ لینا چاہیے کہ آپ ابھی سو دو سو سال زندہ رہیں گے۔ تاہم

خاکسار

تخدی

۱۹ اکتوبر

---

(۲۴)

۳ جولائی

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ گرامی نامہ ملا۔ میں بمبئی میں تھا۔ آپ کا خط دہلی میں میرا انتظار کرتا رہا۔ اسی لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔

انقلاب افکار و حوادث کے باب میں محروم و نادم ہوں۔ کچھ کسالت کچھ مصروفیت اور پریشانی علاوہ ہوتاں ہیں۔ نئے یہ کام توقع سے زیادہ محنت طلب اور وقت طلب پایا۔ آپ کی برہمی اور بے قراری حق بجانب۔ ۱۵ جولائی کی صبح کو لاہور آ رہا ہوں۔ تین چار دن ٹھہروں گا۔ تہامہ فن بعد از تکمیل کار ساتھ لیتا آؤں گا۔ یہ وعدہ بھی وفا نہ ہوا تو آپ مجھے حلقہ و حلقہ بگوشاں سے خارج کریں گے اور ڈانٹیں گے۔ وہ میرے سر آنکھوں پر۔ کام تو یہ مجھے ہی کرنا ہے مگر مزید کروں گا لیکن مذاق برطرف۔ اس مہینے میں یہ کام مزید ختم ہو جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

دو بکریاں جو آپ نے پال رکھی ہیں ان کے حالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ میں انشاءاللہ ہر طرح سے خیال رکھوں گا۔

ا۔ب صاحب اپنے بارے میں خوش فہمی کے طور پر مبالغہ کرتے ہیں۔ جب عہدہ ہی عارضی ہے تو جو اس عہدے پر مقرر ہے وہ کیونکر مستقل ہو سکتا ہے اور عہدہ عارضی یوں ہے کہ ابھی اس کام کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوا ممکن ہے یہ کام رہے نہ رہے۔ ا۔ب کی قسم کے اہل علم کی ضرورت ہو یا کسی اور قسم کے آدمی کے سپرد یہ کام کیا جائے یہ تمام معاملے فیصلے کے محتاج ہیں۔ اور اس فیصلے میں ابھی کچھ عرصہ لگے گا۔ اس دوران میں ا۔ب صاحب کا کام اکثر کمزور پایا گیا۔ اس میں کسی کی شرارت مضمر نہیں۔ کیونکہ ان کوتاہیوں کا علم خود براہ راست مجھ کو ہے تاہم ان کو ہم گھسیٹے چلے جاتے ہیں۔ اب یہ استدلال ان کا عجیب و غریب ہے۔ کیونکہ مجھے برخواست نہیں کیا اس لئے میں مستقل ہونے کا حق دار ہوں۔ اگر چہ ہر کوئی ہے تو ردو بدل ہوئی چاہیئے اور وہ خواہ مخواہ ایذا طلبی کرتے رہتے ہیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تو سیکھتے ہی نہیں۔ سفارش اور دستگیری کے عادی ہو چکے ہیں دوسروں کو ظالم اور بے انصاف اور اپنے آپ کو مظلوم اور ہمدردی کا مستحق سمجھتے رہتے ہیں۔ لہذا القرآن کی بصیرت کام نہیں دیتی۔ کبھی خدا کا شکر نہیں کرتے بلکہ گوشہ گیر ہی رہتے ہیں ایسے شخص کا مطمئن کرنا یا اس میں ہمت پیدا کرنا مشکل ہے کیونکہ ایسا شخص ہر وقت مدد کا طالب ہوتا ہے۔ اور جب تک زندگی اس کے لئے وقف نہ کی جائے وہ خوش نہیں ہوتا۔

باقی عند الملاقات۔ کیا آپ کو دہلی بلایا جائے؟ بے فتح ؟

خاکسار

بخاری

۹ر نومبر

محترم بھائی۔ گورنمنٹ کا اس سال کے بجٹ میں کچھ خسارہ نظر آتا ہے۔ اس سے خیال آتا ہے ہیوں کی بحری بیڑے یک قلم رک گئی ہے۔ وہ معلوم نہیں کہ کب تک ملکی معاملوں کی اس سلسلے ہر کام میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ یہ جواب ہے آپ کے اس خط کا جو دوسرا جو آپ نے لکھا تھا۔ اور جس سے جواب سے آپ مایوس ہو گئے ہوں گے

پچھلے دنوں ابوالکلام سے ہم کلامی کا فخر حاصل ہوا۔ بڑی صحبتیں گرم ہوئیں۔ آپ کا ذکر دو تین بار آیا۔ دوسرا نام مختار علی مرحوم کا ذکر بھی آیا اور امتیاز کا ذکر بھی کیا۔ اور حمید علی صاحب کا ذکر بھی آیا۔ دیر تک اس پر تبصرہ خواجہ حسن نظامی رہے) شبلی کی ادب و تاریخ پر ندوہ کی بحثیں رہیں۔ شعر خوانیاں ہوئیں۔ بدقسمتی ہوئی علامہ اقبال کی بات نہ ہوئی۔ کیونکہ بجز اقبال اور ابوالکلام کے اور کوئی شخص ایسا نہ تھا۔ جو عالم اسلام اور اس کی رنگینیوں اور رنگ آفرینیوں کا آئینہ دار ہو۔ یہ نسل ہی اب ختم ہوتی جاتی ہے

اس خط کو دیکھتے ہی رائے بہادر موہن صاحب سے ملئے۔ ان سے پوچھئے کہ کوئی رکاوٹ تو نہیں۔ اگر ہو تو اس کا مداوا کیجئے۔ تفصیلات انہیں سے معلوم ہوں گی۔ ضرورت ہو تو حمید علی صاحب کو بھی شامل کر لیجئے

اب کے کرسمس میں پھر ایک چکر ہے۔ بشیر ہاشمی غالباً ادب پرستی کے سلسلے میں دہلی آئیں گے۔ ممکن ہے امتیاز بھی بحیثیت ویمنز کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے آ جائیں۔ آپ ویمنز کانفرنس کی ایک ڈیلیگیٹ کے شوہر کے دوست کی حیثیت سے آ جائیے۔

زبیدہ سلام کہتی ہے۔ خاکسار،

بخاری

بمبئی انقلاب بھیج کر لاتعداد احسان کرتے ہو۔ جس روز انقلاب نہ پہنچے دن خالی معلوم ہوتا ہے کل یہ عنوان نظر آیا

لاہور میں گداگروں کی اکثریت

یہ اکثریت کی بھی ایک ہی کہی۔ مگر اس کے لئے سند موجود ہے۔ "قلت مال و کثرت عیال" مشہور فقرہ ہے

ابوالکلام نے شاد عظیم آبادی کا ایک شعر سنایا تھا آپ بھی سن لیجئے۔ خوب ہے۔

جان پہ وہ صدمے ترستے ہیں ہنرمند تیرے

وہ اور کوئی نہیں عاشقان چند تیرے

بخاری

---

(۲۷)

۲۳ر دسمبر

برادر محترم۔ یاد آوری کا شکریہ۔ خط کے مضمون سے آگاہ ہوا اور اس کو ذہن میں محفوظ کیا۔ کام کی کثرت اور تنوع کی وجہ سے اکثر فرد ہی خواہ مخواہ کتنوں کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔ اور جیسا کہ تقاضا ہے ان میں حتی الوسع دخل نہیں دیتا۔ تاآنکہ کوئی اہم نکتہ اس میں پوشیدہ نہ ہو۔ آپ نے جس امر کا ذکر کیا ہے وہ بھی ایسی فرد تک

آنکھیں میچ میچ اور گردن ہلا ہلا کر ایک [illegible] خیر کے لئے امداد چاہتا ہے اور دلی ہے بھی والاسلام
اور وہاں [illegible] مشہور بھی ہو گئے ہیں اس مدرسے میں دینا چین خدا
کی مٹھی میں سونپنا اور فردوس کا مول لینا ہے - دیا اور خوب جی کھول کر دیا - اتنی دور کون تحقیق
کرنے آتا ہے کہ مدرسے کا کہیں وجود بھی ہے یا نہیں اور ہے تو اس میں ادھی کا خرچ بھی ہے یا
جو کچھ ملا نقد و جنس مولوی صاحب نے لاکر والی کے حوالے کر دیا کہ رہے نیک بخت
[illegible] ورجہاں باقی ست مفلس کس نمی ماند [illegible] اور رہے مگر اس طرح کہ کسی
کی نظر نہ لگے - العین حق - اکثر لوگوں کا قاعدہ ہے کہ زکوٰۃ یا جاڑے کے دنوں میں لحاف جو
کچھ خدا کے نام دینا ہوا اکٹھا مولوی صاحب کی خدمت میں لا حاضر کیا کہ آپ جس جس کو مستحق
سمجھیں بقدر مناسب پہنچا دیں - اتنا تو ہم بھی کہیں گے کہ [illegible] صاحب کو بیووں اور
یتیموں اور مسکینوں [illegible] اور درماندوں اور مسافروں خیال تو سبھی کا آیا اور
سب کے ساتھ اپنا اور اپنے خاندان کا بھی اب یہ تخالف الاجتہاد ہے کہ انھوں نے اپنے
ہی تئیں زیادہ مستحق سمجھا - بدگمانی بُری ہوتی ہے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ - خاص کر عالم کی شان
میں لیکن آج تک یہ عقدہ حل نہ ہوا کہ مولوی صاحب اس کثرت سے گاڑھے کی چاندنیاں کیوں
بنوایا کرتے ہیں؟ بھلا خیر اپنا اپنا شوق ہے تو ہر ایک چاندنی میں ٹھیک لحافوں کے پیوت
کے جوڑ کیسے؟ مولوی صاحب کی نیت کے بارے میں تو جو چاہے کلام کرے - کہتے کی زبان نہیں
پکڑی جاتی لیکن تاویل کا تو یہ شخص بادشاہ ہے مسلم الثبوت - سوچ کر ایسا حیلۂ شرعی مغز
سے اُتارتا ہے کہ چاروں اماموں میں سے کسی کی گرفت میں نہیں آتا - باوجودے کہ اضعاف
نصاب کے مالک ہیں مگر صدقہ لینا جائز سمجھتے ہیں - ایک دن کوئی ہم جیسا بدعقیدہ بول
پڑا کہ آپ تو غنی ہیں تو فرماتے ہیں کہ خدا تو مجھے فقیر کہتا ہے - اللہ الغنی و انتم الفقراء -
انتم جمع مخاطب کی ضمیر ہے اور تم غنی بناتے [illegible] میں معلوم تم دونوں میں کون سچا ہے
پیغمبر صاحب کے تو بڑا انتظام تھے کہ اپنی نسل پر زکوٰۃ کو حرام کر گئے تاکہ مولویوں کی طرح کاہل

۱؎ نظر کا لگنا حق بات ہے ۱۲ ۲؎ [illegible] ۱۲ ۳؎ بعض گمان داخل گناہ ہیں ۱۲ ۴؎ نصاب
مال کی وہ مقدار جس پر زکوٰۃ دینی ہوتی ہے اور اضعاف نصاب یعنی ویسی ویسی کئی مقداریں ۱۲

ہو سکتا ہے دونوں فاصلے زیادہ ہیں۔ دوستوں کا تعلق انہیں سے ہم روف ہوتے ہیں۔ وہ یہاں میسر نہیں بجز اس کے کہ ایک آدھ پرانی ملاقات کا تعلق سمجھئے لیکن یہ سفید پوشیاں صرف سیاست دانوں کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ ان سے عہدہ برا ہونے کے بعد جیسی آتا پاس نہیں ہوتا کہ انسان پاؤں پھیلا کے بیٹھے دو تین مشغول اور ایک آدھ تیزی کے جواب میں وعدے سے ملاقات ہے ان کی بدولت کبھی کبھار شام رنگین ہو جاتی ہے مگر آپ جانتے ہیں۔ دوستی کے رشتے جو شباب ہی میں قائم ہو جاتے ہیں۔ ان کا بدل باقی تمام عمر میں نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے تشنہ رہتا ہوں۔ اب کچھ معقول کتابیں ہی تسکین کا باعث ہیں۔ تین ہو چکے اردو کی صحبت سے محروم رہا یہاں کے ملنے سے زبان باہر نکلنے لگی ہے۔

صحت کے متعلق پریشانی بدستور ہے ڈاکٹروں سے پوچھتا ہوں نہیں ہوتا۔ خدا حکومت پاکستان کا بھلا کرے کہ علاج معالجے کے اخراجات برداشت کرتی ہے۔ ورنہ یہاں کی فیسیں ایسی ہیں کہ خود ادا کرنی پڑتیں تو حالت ہی خراب ہوتا۔ ذیابیطس مجھے نہیں تاہم احتیاط ضرور کرنی پڑتی ہے۔ وہ کچھ برسوں سے عود کر آتا رہا۔ پھر جگر میں خرابی پیدا ہوئی چنانچہ ہر ہفتے ایک نہ ایک ٹیسٹ ہوتا رہتا ہے۔ ناک میں دم آ گیا ہے۔ (ان باتوں کا ذکر بیوی سے ہرگز ہرگز نہ کیجئے گا وہ بے چاری ناحق پریشان ہوں گی)

احباب سے کس سے بے خبر ہوں۔ تاثیر کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔ آغا حمید کی شادی بیان کی جینیت کا ایک تحفہ دیا۔ جواب نہ آیا۔ حسرت صاحب ہاشمی عابد کسی نے بھی خط نہیں لکھا۔ دیکھ دہم ہی کی جیب زدہ انتقاد ہونے سے علاوہ بخیدہ ہے۔ اس کی بچیوں کو یہاں سے کچھ تحائف بھیجے۔ اسے بھی ایک دو خط لکھے لیکن کسی چیز کا جواب نہ آیا۔ جو پاکستانی یہاں آتے ہیں ان سے داستانیں سنتا رہتا ہوں لیکن وہ اپنی دنیا کا حال بیان کرتے ہیں۔ میری دنیا کی بات کوئی نہیں کرتا۔ نیا شعر ایک برس سے نہیں سنا۔ بار بار وہی شعر گاتا رہتا ہوں جو عہد رنگین میں فردوس گوش ہوئے تھے۔ راویوں نے ساتھ نایا تھا کبھی کبھی اس پر قوالی کرتا ہوں۔ پاکستانیوں میں سے محمد علی۔ آفتاب۔ عبدالقیوم۔ زینہار خاں۔ عبدالقادر (فائننس) غلام محمد وغیرہ یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان سے چند مجلسیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ملاقاتوں کا اس سے کیا تسکین ہو سکتی ہے۔

بڑھاپا بھی آ رہا ہے۔ اس کا احساس مجھے ابھی تک نہیں ہوا لیکن آثار تو ضرور کبھی دکھائی دے رہے ہیں۔ وزیر اعظم کے ساتھ جو دورہ کیا تھا اس سے صحت پر سخت چوٹ پڑی کسی دن دو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سویا اور عظیم ذمہ داری کی وجہ سے اعصاب پر بھی بہت اثر پڑا۔ اس کے بعد آج تک تعطیل نصیب نہ ہوئی۔ اکتوبر، نومبر میں تین مہینے کے لئے پیرس جانا ہوگا۔ کیونکہ جنرل اسمبلی اس سال وہاں ہوگی۔ اس دوران میں کرسمس کے لگ بھگ دو تین ہفتوں کے لئے کراچی کا چکر لگاؤں۔ لیکن دیکھئے حالات کیا کروٹ لیتے ہیں۔

آپ کی زندگی میں بھی انقلاب کی وفات سے انقلاب آ گیا ہوگا۔ خدا کرے آپ کی ہمت میں خم نہ آئے اپنے حالات سے مجھے مطلع رکھئے گا انشاء اللہ میں اب خط و کتابت میں کوتاہی نہ کروں گا۔ خط ضرور لکھئے۔ کوئی شعر مل جائیں تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ کوئی کتاب کام کی ہو تو وہ بھی۔ منصور سے کہئے فارن آفس کی معرفت ڈپلومیٹک بیگ میں بھجوا دے گا۔

خاکسار

بخاری

اس خط پر نظر ثانی کی تو احساس ہوا کہ رونا رو دیا ہے۔ اور پژمردگی کے سوا کم کسی چیز کا ذکر کیا ہے۔ اسے مکمل تصویر نہ سمجھئے۔ پہلا خط ہے۔ اس لئے دکھڑا سا معلوم ہوتا ہے۔

(نوٹ) یہ خط نقوش مکاتیب نمبر میں اور خط نمبر ۲۱، ۲۰ اور ۲۸ نقوش کے سالنامہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

بنام مولانا غلام رسول مہر

یہ مکاتیب مختصر سی تمہید کے متقاضی ہیں۔

۱۔ یہ اس زمانے کے ہیں جب بخاری صاحب کی خدمات آل انڈیا ریڈیو نے مستعار لے لی تھیں۔ حکومت پنجاب کے ملازمان کے گریڈ کا معاملہ پیش ہوا تو یہ اعتراض اٹھا کہ جن اصحاب کی خدمات دوسرے محکموں میں منتقل ہو جاتی ہیں وہ اپنی سابقہ تنخواہ سے زیادہ تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ نئے محکمے میں ترقی کے زیادہ مواقع ہوں تو ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ادھر سابقہ محکموں میں نہ صرف اپنی ملازمتوں کا رشتہ استوار رکھتے ہیں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ گریڈ سے اسی طرح مستفید ہوتے رہیں جس طرح اصل محکمے میں رہتے ہوئے مستفید ہوتے۔ ان حالات میں اس وقت کی حکومت پنجاب کا رجحان یہ تھا کہ کسی ایسے شخص کو گریڈ سے مستفید ہونے کا موقع نہ دیا جائے جو اصل محکمہ میں برسر کار نہ ہوں۔

۲۔ اس وقت سردار سکندر حیات خاں مرحوم نے وزارت قائم کر رکھی تھی۔ میاں عبدالحئی مرحوم وزیر تعلیمات تھے۔ میں نے میاں صاحب اور سردار صاحب دونوں سے عرض کیا تھا کہ اول جس شخص کی خدمات سے کوئی دوسرا محکمہ فائدہ اٹھانے پر آمادہ ہو جائے لازماً وہ وسیع صلاحیتوں کا مالک ہو گا اور اسے ان خوبیوں کی سزا نہ دینی چاہیے۔ دوسرے بخاری صاحب کی غیر معمولی شخصیت پیش کی تھی اور کہا تھا کہ ان کے معاملے کو مستثنیٰ سمجھا جائے۔ دونوں نے میری درخواست منظور کر لی اور بخاری صاحب کو گریڈ مل گیا۔

۳۔ مسٹر من موہن ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیمات تھے اور جن اصحاب کو ان سے ملنے کا موقع میسر آیا وہ اعتراف میں متحد ہیں کہ موصوف بلند قابلیت اور بلند اخلاق کے افسر تھے۔ آج یہ حقیقت عرض کر دینا غالباً غیر مناسب نہ ہو کہ مسٹر من موہن کے خلاف سب سے زیادہ شکایات جنوبی و مشرقی پنجاب کے جاٹ ممبروں نے پیش کی تھیں جو اتحاد پارٹی کا ایک اہم عنصر تھے اور چودھری چھوٹو رام کو اصرار تھا کہ مسٹر من موہن کو ڈپٹی ڈائریکٹری سے ہٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں تک کہ چودھری چھوٹو رام کی خدمت میں بھی تمام تفصیلات عرض کر کے انہیں راضی کیا گیا کہ مسٹر من موہن لیاقت کے لحاظ سے بہترین شخص ہیں۔ مسٹر من موہن بخاری صاحب اور بعض دوسرے اصحاب کے عزیز دوست تھے۔ ان سب نے اس دور ابتلا میں موصوف کے لیے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ بخاری صاحب نے ان کے معاملے کو اپنے معاملے پر بھی مقدم رکھا۔ اس کا نتیجہ بھی حسب مراد نکلا یعنی مسٹر من موہن اپنے عہدہ پر برقرار رہے۔

۴۔ دھرم پور میں ملاقات نہ ہو سکنے کا معاملہ یہ ہے کہ بخاری صاحب اپنے حقوق کے سلسلے میں ڈائریکٹر صاحب تعلیمات نیز وزیر تعلیمات و وزیر اعظم سے ملنے کے لیے شملہ گئے تھے۔ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کے پاس سناور میں ٹھہرا ہوا تھا جو دھرم پور (کوہستان شملہ) سے قریب ہے۔ فون کے ذریعے سے طے ہو چکا تھا کہ بخاری صاحب موٹر میں واپس ہوں گے۔ تو میں دھرم پور پہنچ کر ان سے مل لوں گا۔ بخاری صاحب کو شملہ سے آنے میں دیر ہو گئی اور کسی قدر

نہ صرف ہو گیا۔ میں ادھر پریشانی میں بیٹھا رہا۔ جب کوئی موٹر نہ آئی تو کسی آدمی کو بھیج کر دریافت کرایا۔ بخاری صاحب ایلیٹ سے گئے، یہ خیال کر کے اس سڑک پر میرا انتظار کرتے رہے جو کسولی اور سناور کی طرف جاتی ہے۔ میں مایوس ہو کر سناور چلا گیا۔ وہ مایوس ہو کر کالکا پہنچے اور وہاں سے سناور ٹیلی فون کرتے رہے۔ جونہی میں دھرم پور میں تھا اس سے فون پر گفتگو ہو سکی۔ سناور پہنچنے پر ان کے فون کا علم ہوا اور وہ کالکا سے ٹرین میں سوار ہو کر دہلی پہنچ چکے تھے۔

۵ بخاری صاحب نے ایک مکتوب کے آخر میں لکھا ہے کہ اول اس کی رسید بھیجی جائے دوسرے اسے پڑھنے کے بعد چاک کر دیا جائے۔

اس آخری ارشاد کا مدعا یہ تھا کہ خط کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے کہ اس کی اشاعت سراسر خلاف مصلحت تھی۔ میں نے اسے چاک نہ کیا اور یہ ارادۃً نہیں بلکہ اتفاقیہ محفوظ رہ گیا۔ اب اس کی اشاعت کسی بھی مصلحت کے خلاف نہیں۔ اور یہ میرے عزیز دوست کی نگارشات کا ایک مرقع ہے جس کی ہر تحریر اس وقت ایک بیش قیمت تحفے کی حیثیت حاصل ہے

---

(۱)

۲۰ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

بروز اتوار

مشفق محترم! نہ معلوم کیا بات ہوئی دھرم پور میں آپ دکھائی نہ دیے۔ سناور کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر میں آدھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ کالکا پہنچ کر آپ کو سناور ٹیلی فون کیا اور ساڑھے نو بجے تک تین مرتبہ ٹیلی فون کیا لیکن آپ سناور میں تشریف فرما نہ تھے اس سے خیال ہوتا ہے کہ آپ ضرور دھرم پور تشریف لے گئے ہوں گے۔ اور وہاں میرے منتظر ہوں گے۔ مجھے یہ خیال کر کے آپ کو بے انتہا کوفت ہوئی ہو گی جس کے لیے میں بہت نادم ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ معلوم ہوتا ہے میری بصارت نے مجھے دھوکا دیا۔ آپ ضرور سڑک پر ہوں گے لیکن مجھے نظر نہ آئے۔

بہرحال شملے کی داستان سن لیجیے۔ ڈائریکٹر صاحب سے ملا پھر میاں صاحب قبلہ سے ملا دونوں نے حامی بھر لی کہ تمہیں سیلکشن گریڈ دے دیا جائے گا اس مسئلے پر کہ میں پنجاب میں واپس آؤں یا نہ آؤں یا آؤں تو کب آؤں بحث ہی نہ ہوئی۔ بلکہ اس بات کا ذکر تک نہ آیا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت میں نے واپس آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میاں صاحب کے لیے گوناگوں دقتیں پیش آئیں گی۔ اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس وقت مشکلات میں مبتلا کیا جائے جب انہوں نے مجھے بغیر واپس جانے کے سیلکشن گریڈ دینے کا وعدہ کر لیا تو اسی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ میاں صاحب کا رویہ از حد مشفقانہ اور ان کا سلوک بہت ہی اچھا تھا۔ خدا ان کو خوش رکھے انہوں نے ہر طرح سے میری تسلی کر دی۔ وزیر اعظم صاحب سے بھی ملا انہوں نے بھی امداد کا وعدہ کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ کو شملہ جانے کی تکلیف دی جائے یا نہ؟ بظاہر تو اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن فی الحقیقت اس کی ضرورت ابھی تک موجود ہے۔ جانے سے فائدہ نہ ہو لیکن نہ جانے سے اغلباً نقصان ہو گا۔ اس لیے مجھ پر اتنا کرم کیجیے کہ ایک دن کے لیے شملہ چلے جائیے میاں

صاحب سے مل کر پاسپورٹ کے سیکشن کے متعلق انہوں نے کیا فیصلہ کیا اور میرے پنجاب واپس آنے کا تذکرہ نہایت سرسری۔ وہ بھی اگر ضرورت پڑے تو لیجئے ورنہ خیر۔ میاں صاحب سے ملنے سے پہلے من موہن صاحب سے ضرور مل لیجئے۔

اس کے علاوہ ایک اور کام ہے اور وہ شاید میرے کام سے بھی زیادہ ضروری ہے معلوم ہوتا ہے کہ بعض شریر لوگ اور بعض نیک مگر غلط فہمی میں مبتلا لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ من موہن کو موجودہ عہدے سے ہٹا دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب ان کے کام سے خوش ہیں میاں صاحب تو ہر طرح سے خوش اور مطمئن ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ خواہ مخواہ من موہن صاحب پر کلنک کا ٹیکہ لگایا جائے؟ لیکن اہل غرض کا وار دور تک پہنچ چکا ہے۔ جب میں شملے سے روانہ ہوا حالات تشویش ناک تھے آپ سے ملاقات ہو جاتی تو بیشتر وقت میں اسی بات پر صرف کرتا اب حقیقت یہ ہے کہ حکومت خواہ مسلمانوں کی ہو خواہ ہندوؤں کی، ہندو افسروں کا وجود تو ضروری ہے اگر یہ سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایسے ہندوؤں کی حمایت نہ کی جائے جو لائق، فہیم اور دیانت دار ہیں اور خدا گواہ ہے کہ من موہن سے بہتر آدمی اس وقت کسی مذہب میں بھی نہیں مل سکتا۔ ان کا کیریکٹر خفیف سے خفیف شبہے سے بھی پاک ہے، اور ان کی دیانت اور صائب رائے مسلّم ہے۔ اور پھر کوئی ایسا مسلمان افسر بھی موجود نہیں جو ان کی جگہ مقرر کیا جا سکے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا جائے۔ وہ اس قدر دلگیر ہیں کہ استعفیٰ تک دینے پر آمادہ ہیں۔ ذرا ان سے مل لیجئے اور اس کام کو میرے کام سے بھی ضروری سمجھ کر ان کی مدد کیجئے۔ میں آپ کی عنایتوں کا بے انتہا ممنون ہوں آپ نے میرے لئے بہت زحمت برداشت کی اور آپ کا احسان میں عمر بھر نہ بھولوں گا آخر میں دو ضروری باتیں عرض کرتا ہوں ایک تو اس خط کی رسید ضرور بھیجئے دوسرا اسے پڑھ کر چاک کر دیجئے۔

خاکسار

بخاری

---

۱۰ پرتھوی راج روڈ، نیو دہلی

۸ جون

محترم دوست۔ سلام مسنون۔ میں ایک معافی کی عرضی پہلے آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں۔ آپ گرامی نامہ کے نے پر دوبارہ لکھ رہا ہوں یقین جانیئے میں از حد شرمندہ ہوں کہ آپ کو اس قدر زحمت ہوئی۔ واللہ اس میں میں بالکل بے قصور ہوں۔ دھرم پورہ میں آپ کو تلاش کیا۔ ستارہ کی سڑک اور بڑی سڑک کے مقام اتصال پر طویل انتظار کیا۔ کالکا پہنچ کر دو تین مرتبہ آپ کے نام سے آپ کو پرنسل ٹیلی فون کیا اور ایک تو نہ ملنے کا اور دوسرے آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا، ان دونوں باتوں کا انتہائی افسوس دل میں لے کر آیا۔ للہ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں از حد نادم ہوں کہ آپ جیسے مشفق کرم فرما کو اس قدر رنج پہنچایا اور وہ بھی اس حالت میں کہ آپ میرے کام کے لئے اس قدر تکلیف اٹھا رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن احتیاط برتی اور ہر پیش قدمی کی لیکن میری بدقسمتی اور انتہائی بدقسمتی کہ پہلے اس کے کہ آپ کا شکریہ خود اپنی زبان سے آپ کی خدمت میں ادا کر سکتا الٹا آپ کو پریشان کیا۔

میں کل ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں اب اپنے کسی کام یا غرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کس منہ سے آپ کو کہوں کہ آپ مجھے دوست سمجھئے۔ بہرحال اگر آپ جو گستاخی یا غفلت میری طرف سے سرزد ہوئی ہے اس کے لیے مجھے معاف کر دیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت

بھجوں گا۔

صرف عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں انصرام اور معافی کا خواستگار رہوں۔ میرا قصور میری بدقسمتی کے سوا کچھ نہیں۔ اور آپ کی پریشانی کی کوئی قیمت میں ادا نہیں کر سکتا۔ سوائے اپنے عجز و انکسار کے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خط ہمیشہ مکان کے پتہ پر لکھا کیجئے۔ خاکسار

بخاری

---

(۲)

پرتھوی راج روڈ۔ نئی دہلی

برادر محترم۔ سلام مسنون۔ پے در پے آپ کو دق کر رہا ہوں۔ لیکن آج گرامی نامہ مورخہ ۵ جون ملا۔ اس میں ایک فقرہ ایسا ہے کہ

"بہر حال اس معاملے میں آپ کی طرف سے جواب کا انتظار ہوگا۔"

بمقتضا اس فقرے کے آج پھر آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہوں۔ واپسی کا مسئلہ اس وقت چھیڑنا اس لئے مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ

(۱) گریڈ اور واپسی بیک وقت دو مسئلے سامنے آجانے سے صاحب موصوف کو پریشانی ہوگی اور ایک کے پیچھے دوسرا بھی معرض خطر میں پڑ جائے گا۔

(۲) اگر میں واپس نہ آؤں اور مجھے گریڈ مل جائے تو اس گریڈ میں وہاں کوئی اور قائم مقام ہو گا چنانچہ ایک کی بجائے دو آدمیوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اغلباً صاحب موصوف کو یہ شکل زیادہ مرغوب ہو گی۔

(۳) بعض کوائف یہاں ایسے ہیں کہ اگر میں فی الحال کچھ عرصے یہاں اور ٹھہر جاؤں تو غیر مناسب نہ ہو گا۔

(۴) واپسی کا مسئلہ ہر وقت چھیڑا جا سکتا ہے بلکہ واپسی کا حق میرے پاس ہے جب چاہوں واپس آسکتا ہوں کوئی مجھے روک نہیں سکتا اور کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ جب واپسی کا موقعہ آئے گا تو اس وقت اس مسئلے کو بھی چھیڑا جا سکتا ہے کہ کس عہدے پر واپس آؤں۔

(۵) گریڈ کا مسئلہ جولائی کے شروع ہی میں ختم ہو جانا چاہئے اس کے بعد اگر اکتوبر تک بھی واپسی کا سامان ہو گیا تو جو مصالح آپ کے پیش نظر ہیں ان کو گزند پہنچے گا۔

(۶) فی الحال میری واپسی کی وجہ سے صاحب موصوف کو یقیناً بعض دقتیں پیش آئیں گی جن کی وجہ سے وہ پریشان ہوں گے اور ان کی قوت فیصلہ متذبذب ہو جائے گی کچھ عرصہ بعد حالات میں زیادہ سہولت کی گنجائش ہو گی۔

ان سب باتوں پر اچھی طرح غور کر لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فی الحال باقی سب باتوں سے قطع نظر کر کے گریڈ کے معاملے کو پختہ اور مستحکم کر لینا چاہئے اصل چیز یہی ہے واپسی کا مسئلہ ایسا ہے ——— کہ اسے ہر وقت اٹھایا جا سکتا ہے اور اسی زور سے اٹھایا جا سکتا ہے جتنا کہ آج۔ البتہ آج اٹھانے سے گریڈ کے معاملے میں کچھ رکاوٹیں حائل ہو جائیں گی اور ممکن ہے غلط بحث کی رو میں اصل مقصد ہی بہہ جائے

...م طلب اور دوسروں کے دست نگر نہ ہوں۔ مولوی صاحب کو یہ مشکل کہ سید بنا
...زمرہ۔ شرافتِ نسب بھی تو ایک ذریعۂ عزۃ ہو اور سامنے آئی ہوئی زکوۃ بھی نہیں چھوڑی
...۔ خدا دے اور بندہ لے۔ تم نے پہیلیاں بہت بوجھی ہوں گی۔ شاید مشکل سے مشکل
دھندے بھی سُلجھائے ہوں گے مگر جب جانیں ایسا کوئی رستہ نکالو کہ سیادۃ اور
دونوں میں سے کسی پر حرف نہ آئے اور زکوۃ بھی نہ جانے پائے۔ خیر تم تو کیا بتاؤ گی
...ی ہتیرا سر مار چکے ہیں آخر ہار کر جھک مار کر مولوی صاحب ہی سے رجوع کیا تو معلوم
...یہ اُن کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ایسے ایسے سیکڑوں چٹکلے اُن کے ناخنوں
بھرے پڑے ہیں۔ ایک ادنیٰ سا حیلہ تو یہ ہے کہ کسی مستحق کو [illegible] کر اُس سے اپنے
...ی بہانے سے ہبہ کرا یا۔ لکِ صدقۃ ولنا ہدیۃ [illegible] سی طرح کا ایک حیلہ ہم نے
دوست کو کرتے ہوئے دیکھا۔ [illegible] ہو کسی مولوی ہی سے سیکھا ہو گا۔ کیوں کہ
...ب کا ذہن تو اس طرف کیوں منتقل ہونے لگا۔ چاندی کے خاصدان میں گلوریاں
...ہیں۔ خاصدان میں سے گلوری نکالی اور ذری کی ذری تکیے پر رکھ دی۔ تکیے
...اُٹھا مُونہہ ہیں۔ اے صاحب یہ کیا؟ تو کہا [illegible] کی صفائی ہو کہتے ہیں کہ چاندی
...عمال منع ہی۔ ایسے بہانے ڈھونڈنے پڑاؤ تو یہ کوئی ام[illegible] کوئی ہی نہیں
...مولوی لوگ اپنے کمانے کے لئے جو جو جتن کرتے ہیں [illegible] وہ
...دل کا کھوٹ ہی مجکو تو ان کے اس [illegible] عصہ آتا ہی کہ [illegible] چڑھے
...پھل توڑ رہے ہیں دشمنِ عقل [illegible] کھا کئے والتے میں [illegible]
...ہ قہ کے لئے ایک نہ ایک [illegible] جو [illegible] مسلمان [illegible]

دو چار روز سے ٹینس گرینڈ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اس کا انتظار ہے ورنہ اب تک آپ کی مدد تک پہنچ جاتا۔ اس لئے پہلے وہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

ان تینوں امور پر آپ روشنی ڈال سکیں تو میں کچھ راستے بھی دے سکوں اور ضرورت ہو تو خود بھی آجاؤں گر ہفتہ عشرہ سے پہلے کام شروع ہو گا
میں نے پتہ جو خط پیشانی پر لکھ دیا ہے اسی پتہ سے خط بھیجئے تار کے لئے بھی کافی ہو۔ سلام شوق۔

خاکسار

بخاری

---

(۵)

۔ تنت وحدہ پڑھیے ہم ..... الخ

۱۔ سالک صاحب کو راستے دیکھا[1] میری ہستی کیا آپ کا گھر رستے میں حائل تھا۔[2]

بخاری

(۳) آپ خط کا جواب ہمیشہ کسی ایسے کاغذ پر دیتے ہیں جو انگریز لوگ حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں استعمال کرتے ہیں۔[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ قدیم عرصے کی وجہ سے بیت الخلا میں بھی خط لکھتے رہتے ہیں لہذا ایک سادہ کاغذ بھی ارسال خدمت ہے۔[4]

---

[1] مراد یہ ہے کہ سالک اکیلے تھے۔ مہر ساتھ نہ تھا دوسرے معنی ظاہر ہیں۔

[2] بخاری صاحب اس زمانے میں بیڈن روڈ پر اس مکان میں رہتے تھے جو شاہ ابوالمعالی والے چوک اور میکلیگن روڈ والے چوک کے تقریباً وسط میں تھا۔ میں اس کے قریب رمضانی بلڈنگ میں موجودہ قومی دواخانے کی بالائی منزل میں تھا۔ سالک صاحب بک روڈ پر مقیم تھے بخاری صاحب اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھے تھے دور سے دیکھا کہ سالک صاحب آرہے ہیں لیکن وہ راستے میں میرے ہاں ٹھہر گئے۔

[3] جو کچھ لکھنا ہوتا تھا پنسل سے مضمون لکھنے کی سلپوں پر لکھ دیتا تھا۔ بخاری صاحب کے نزدیک وہ کاغذ حوائج ضروریہ کے سلسلے میں استعمال

[4] تاکہ جواب اس پر لکھوں

[illegible]

بنام عبدالرحمٰن چغتائی

①

محترم بندہ جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون

سر عبدالقادر اور عبدالمجید ... [illegible] ... مگر بھیجیے ... مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں۔ کیا آپ [illegible] کی ایک جلد بہت جلد بھجوا سکتے ہیں۔

خاکسار

بخاری

اور اگر ممکن ہو تو مرقع چغتائی کی [illegible] جلد ... [illegible]

---

②

ہارڈنگ ... نئی دہلی

۱۱ر اکتوبر

شفیق و مکرم جناب چغتائی صاحب۔ سلام مسنون۔ افسوس کہ لاہور میں آپ کی ملاقات سے محروم رہا۔ معلوم ہوا آپ شکار کو تشریف لے گئے تھے۔

واپسی پر ایک خط ملا جو بعینہٖ ارسال خدمت ہے۔ خط کے دو حصے ہیں ایک آپ کے نام، ایک میرے نام۔ دونوں بھیج رہا ہوں۔ مطلب آپ پر خود ہی ان کے پڑھنے سے ظاہر ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ خط لکھنے والے یعنی EVELY WOOD صاحب آج کل والٹر تھامسن کمپنی میں ملازم ہیں جو ADVERTISING کمپنی ہے اور آرٹ کے نقطۂ نظر سے اپنی پبلسٹی کو ہر وقت دل کش بنانے کے درپے رہتی ہے۔ WOOD صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں لٹریچر اور مصوری دونوں کے مشہور طالب علم اور نقاد ہیں۔ اور آپ کے معترف۔ اصطلاح معلوم ہوتے ہیں آج کل لندن میں ہیں لیکن اس سے پہلے سالہا سال بمبئی میں رہے۔ یہیں ان کا روزگار تھا۔ علاوہ بریں بمبئی کے اہل فن میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور اکثر تصویروں کی نمائشوں میں کنٹال والا، مسز ... اور اس قسم کے لوگوں کے ساتھ شریک رہتے تھے۔ جو جواب آپ ان کو بھیجنا چاہیں وہ خواہ براہ راست ان کو بھیج دیں خواہ میری معرفت۔

بندۂ خاکسار

بخاری

(۳)

۳ تغلق روڈ، نئی دہلی

۱۹ اکتوبر

سلام مسنون۔ گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ کے خط آنے پر میں نے ڈوڈ صاحب کو لکھ دیا ہے۔ مزید گفت و شنید وہ لاہور جا کر براہ راست آپ سے کریں گے۔ کوئی خدمت میرے لائق ہوئی تو یہ خیر خواہ دریغ نہ کرے گا۔ ایچنگ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے نقش جتنے مجھے سب نے بخشے اب تک میرے مکان اور دفتر کی زندگی کی زینت ہیں اور میں ان کا ذکر ہمیشہ فخریہ کرتا ہوں۔ وہ آپ کو یاد دیتا ہوں علم دانش کا معاملہ میں نے ثابت پڑھا اور وقت طلب ہے ملاقات ہوئی تو تفصیلاً عرض کروں گا۔

خاکسار

بخاری

---

(۴)

۳۰ جیل روڈ

۱۰ اگست (۱۹۵۳ء)

مشفق من جناب چغتائی صاحب سلام مسنون! بیگم سراج الدین صاحبہ کا جواب آگیا ہے ان کے خط کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

"آپ کے خط کا شکریہ۔ یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ مجھ پر اس قدر اعتبار رکھتے ہیں۔ چغتائی صاحب سے کہہ دیجئے کہ میں ان کی بھی بہت ممنون ہوں کہ وہ باوجود اس امر کے کہ فن کے متعلق میرا علم بہت محدود ہے۔ اپنی کتاب کی تمہید مجھ سے لکھوانا چاہتے ہیں۔ میں اسے آپ کو بہت عزت سمجھتی ہوں اور کوشش کروں گی کہ ان کے کمال کی کما حقہٗ داد تحسین دے سکوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ مجھے کتنے دن کی مہلت دی جائے گی علاوہ بریں مجھے "مرقع" کی ایک جلد بھجوا دیجئے کیونکہ میرا نسخہ میرے پاس موجود نہیں۔"

آپ ان کو مرقع کی نئی ایڈیشن (یعنی جس شکل میں اب آپ اسے شائع کرنا چاہتے ہیں) بھجوا دیجئے۔ عبدالرحیم صاحب جو مجلد میرے پاس لائے تھے جن میں سولہ صفحے دیباچہ کے لئے خالی چھوڑے ہوئے تھے وہ بیگم سراج الدین صاحب کو بھجوا دیجئے اس کے علاوہ میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلی ایڈیشن کے دیباچے یعنی کزنز صاحب اور ڈاکٹر اقبال کے مقالے بھی انہیں بھیج دیجئے تاکہ وہ ان کے پیش نظر رہیں کہ پہلے کیا کچھ کہا جا چکا ہے۔ اگر اس دوران میں آپ کے مرقع پر اخبارات یا رسائل میں کہیں کوئی ریویو چھپا ہو اور اس کی نقل آپ کے پاس موجود ہو تو وہ بھی بھیج دیجئے۔ ایسی چیزیں ان سے

کا اجلاس روزانہ ہوتا ہے۔ اجلاس گاہ ۱۵ میل دور ہے۔ صبح جاتے ہیں رات کے ساڑھے سات بجے لوٹتے ہیں۔ یک لخت ارادہ کیا کہ آپ کو خط لکھوں
کسی زمانے میں تم سعدی اور حافظ کی طرح تھے اس کے سلسلے میں باتیں کیا کرتے ہیں کہ ان کی حقیقت کھل گئی ہے اور تمہاری اور تمام محبت کی
ایک ترکیب معلوم ہونے لگی ہے اس لئے اتوار (یعنی آج) کا انتظار کیا تاکہ آپ کو خط لکھ سکوں۔ ہو سکتا ہے آپ کو پہلے ہی اس کے متعلق میں کیا بات ایسی
کہہ سکتا ہوں جو پامال اور بے معنی نہ ہو گئی ہو لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ آپ کے گھر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ
کی بیوی، آپ کی بیٹیاں تھیں آپ کی بہنیں انہیں کی جگہیں تھیں۔ نہ معلوم اب آپ پر کیا گزرے گی یقیناً آپ کو بار بار ایسا خلا محسوس ہوتا ہوگا۔
جس کو اب آپ کسی طرح پر نہیں کر سکتے۔ میری ہمدردی بے کار ہے تاہم اگر اس سے آپ کا غم ذرا بھر بھی کم ہو جائے تو مجھے اطمینان ہوگا۔ خدا ان کو
جوار رحمت میں جگہ دے اور خدا آپ کی زندگی کا انتظام آپ پر آسان کرے۔ مرنے والے مر جاتے ہیں زندوں کا خیال نہیں کرتے۔

پچھلے مہینے میں نے سعدی سے ایک نادرہ لوح میں امتیاز کو ایک طویل خط لکھا تھا خیال تھا دوستوں کے دل کو اس سے رشک ہوگی امتیاز
سے کہا بھی تھا کہ خط احباب میں نشر کر دینا اگر وہ آپ کی نظر سے گزرا ہے تو میری زندگی کا نقشہ آپ کو معلوم ہوگا۔ نئے ملک میں گھر بار کرنا خصوصاً اس عمر
میں جب کہ عادتیں راسخ ہو چکی ہوں اور دل کا ہر حالت تنزل پر ہو ایک مہم ہے۔ بہرحال کچھ صحت سہولت کی پیدا ہو گئی ہے۔ صحت کے متعلق
تشویش رہی اور تشویش سے زیادہ مصروفیت۔ یا انسان ڈاکٹروں کا ہو رہے یا زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ دونوں باتیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں
کی گود میں بیٹھ رہنا زندگی نہیں۔

حمید الدین سے ایک مفصل ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن یہ اب دو مہینے پرانی بات ہے ذرا اسمبلی کا کام ہلکا ہو لے تو پھر ان سے ان کے دل کا حال سنوں گا۔

آپ کو خط کی اتنی ضرورت نہ ہوگی جتنی مجھے ہے سالک کو میرا پیار اور سلام کہئے گا انہیں بھی خط لکھتا ہے ہو سکے تو مجھے کوائف سے آگاہ کیجئے۔ عابد، عاشق، تاثیر اور دیگر احباب آج کل کس بحر میں شعر کہتے ہیں؟

خاکسار بخاری

(یہ خط سالنامہ نقوش ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے)

صوفی میرے بھائی۔ ایلس فیض کی معرفت آپ کو شاید میرا پیغام پہنچا ہو کہ مجھے یہاں اس سال کے دوران ، ایک یونیورسٹی میں
اردو زبان اور اردو ادب کی تاریخ و ارتقاء پر چند لیکچر دینے ہیں چاہتا ہوں اس کے لئے مکمل تیاری کروں آپ کی خدمت میں بوسیلہ ایلس یہ درخواست
کی تھی کہ فی الحال ایسی کتابوں کی فہرست (تیس یا چالیس) بھیج دیجئے جنہیں پڑھ لینا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کلیات اساتذہ اور تنقید کی کتابیں
(اردو اور انگریزی) سب شامل ہوں گی۔ چنانچہ آپ بھی فہرست مرتب کرتے وقت اس بات پر نگاہ رکھئے۔ جب یہ فہرست میرے پاس پہنچ جائے
گی تو دیکھوں گا کہ اس میں سے کون کون سی کتابیں یہاں موجود ہیں۔ باقی پاکستان سے منگوا لوں گا۔ فی الحال صرف فہرست کتب مطلوب ہے جو آپ کو

انشاء اللہ نیویارک۔

وطن کا سفر ہمیشہ مبارک ہوتا ہے خواہ حالات تلخ یا باعث تشویش ہی کیوں نہ ہوں۔ سچ بھی یہی عالم تھا جب سے مل کر ایسا اطمینان ہو کہ اب اونٹ کی طرح اسے کوہان میں برس دو برس اٹھائے پھروں گا اور تشنگی اس سے پردیس کے صحراؤں میں بجھاتا پھروں گا۔ اس مرتبہ آپ سے بھی ملاقات ہوگئی اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا۔ بندے اپنی محرومی کا ماتم بھی کیا کہ اس سے پہلے آپ سے نیاز کیوں حاصل نہ ہوا تھا۔ آپ جس لطف اور محبت سے پیش آئے۔ اس کی دل کشی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ دو حرف شکریہ کے اور سلام قبول کیجیے۔

ع تنت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

مجھے اپنا خادم سمجھیے اور کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بلا تامل ارشاد کیجیے۔ بیگم صاحبہ سے بھی میرا سلام کہیے گا۔

بندہ خاکسار

۲۳ نومبر ۱۹۵۴ء — احمد شاہ بخاری

بیگم آمنہ مجید ملک کے نام

(۱)

نیویارک

۵ ستمبر ۵۱ء

عزیزہ بہن۔ وہ جسے فراغت کہتے تھے نہ معلوم وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ یا دل پر تکان چھا گئی یا بڑھاپے نے سب کو آن لیا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ انقلاب ضرور آگیا ہے۔ دفتری خط اور تار دھڑا دھڑ آتے ہیں کسی دوست کا خط نہیں آتا۔ حال میں ریاض احمد صاحب (ریڈیو انجینیر) آئے تو ان کی زبانی معلوم ہوا کہ مجید صاحب بہت عرصہ صاحب فراش رہے۔ زمانے کا رنگ بدل نہ گیا ہوتا تو میں اتنا عرصہ ایک عزیز دوست کی حالت سے بے خبر نہ رہتا۔ آپ ہی مجھے لکھ بھیجتیں کہ مجید صاحب بیمار ہیں دعا کیجیے۔ گنہگار کی دعا پر آپ کو کیا تکیہ کرتیں لیکن دوستوں بھائیوں اور عقیدت مندوں کو اپنے دکھ میں شریک کرنے کا ایک بہانہ ہوتا۔ کچھ عرصہ ہوا ایک شناسا سے سرسری سنا تھا کہ مجید صاحب کو دل کی تکلیف ہے میں نے سن کر حسب معمول ہنسی میں اڑا دیا۔ ان کا یہ وہم یاران سرکل کے حلقہ میں مدت سے ایک لطیفہ بن چکا ہے۔ جنھوں نے خبر سنائی وہ کچھ تفصیل بھی نہ بتا سکے لیکن جب ریاض صاحب سے مفصل حال معلوم ہوا تو بہت تشویش ہوئی اور میں از حد اداس ہوگیا۔ مجید صاحب کے کئی نقشے ذہن میں آتے ہیں اور آ سکتے ہیں۔ ایک سے ایک بے ڈھنگا لیکن یہ نقشہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بستر پر دراز ہوں۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہو اور خدا انہیں اور آپ کو ہر پریشانی سے مامون و محفوظ رکھے انہیں میرا بہت بہت پیار دیجیے۔ اے کاش میں ان کے پاس ہوتا۔ اور ان کا دل بہلا سکتا۔ ہو سکے تو ان کی خیریت کے متعلق دو حرف لکھ بھیجیے تاکہ مجھے کم از کم اس قدر بُعد کا احساس نہ ہو اور میں آپ کی تشویش میں آپ کا ان کا شریک ہو سکوں۔

میں کام کرتے کرتے تھک گیا۔ خیال تھا کہ جن زمانے میں ڈاکٹر گراہم کشمیر کی الجھن سلجھانے میں مصروف ہوں گے میں چپکے سے ایک مہینہ تعطیل

تھا کہ اس نے تو مولویوں کی شکایت کا ایک تار باندھ دیا۔ ہادی بیگم آخر کار دق ہو کر سامنے سے
اُٹھ گئی اور اگر اُٹھے نہیں تو آزاد گھنٹوں کی خبر ہے۔ آزاد نے جاتی کو روکا بھی کہ ذرا تو آؤ
سنو ذرا تو آؤ رسنو مگر ہادی بیگم یہ کہتی ہوئی اُٹھ کر چلی گئی کہ بس بہتیرا سن چکی۔ مولوی
ورثۃ الانبیاء اور ان کا توبہ توبہ یہ فضیحتا۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں کوئی کوئی
ان میں ایسے بھی ہونگے۔ تم لگے سب کو ایک لکڑی ہانکنے۔ لیکن اتنا میں پھر بھی کہوں گی
کہ مکار ہیں تو اور فریبئے ہیں تو۔ دین اسلام کا جو کچھ چرچا ہے ان ہی کے دم قدم سے
ہے تم جیسے مسلمان ہوں تو اذان تک کی آواز کان میں نہ پڑے ✣

چھٹی فصل مولویوں [illegible] کے بارے میں آزادی کی رائے

آزادی [illegible] بھی کوئی بات کہی نہیں جس سے معلوم ہوتا کہ ماں باپ کے
اس [illegible] کی کیا [illegible] ہے مگر ہاں عمر کے لحاظ سے اور اب جو مولویوں میں
اپنی منگنی سن کر وہ کچھ اداس سی ہوئی [illegible] ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اگر باپ کی طرح
مولویوں سے برگشتہ [illegible] بھی بری عقیدہ بھی نہیں رکھتی تھی۔ لوگوں
نے اس کی افسردگی کو اس پر محمول کیا کہ یہ معمولی طور کی لڑکی تو ہے نہیں کہ اس کو زیور
اور کپڑوں کی خوشی ہو ماشاء اللہ بڑی سمجھ دار ہے کچھ نہ کچھ بیاہ کا سوچ کرتی ہوگی؟
آزادی کے خیالات اب دوسری طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے خیال کیا کہ جس طرح بے پوچھے
میری منگنی کر دی اسی طرح ایک دن بے پوچھے نکاح بھی پڑھا دیں گے۔ اور منگنی اور
بیاہ میں ایسا فرق بھی کیا [illegible]یف لوگوں میں جیسا مونہہ سے کہا ویسا نکاح پڑھایا
اچھا تو مجھے [illegible] کیا کرنا چاہئے؟ [illegible] نازک مقدمہ مشکل کسی سے صلاح لینے کا موقع نہیں
وہ اکیلی بیٹھی ہوئی آپ ہی آپ دل ہی دل میں سوچتی کہ میری حالت میں ایسا بڑا انقلاب
ہو [illegible] کے لئے مجھکو کچھ بھی طیاری کرنی نہیں۔ ابھی تک تو میں نے
میکے میں ایسی [illegible] سے زندگی بسر کی کہ میں نے نہیں جانا کہ کدھر صبح ہوتی ہے اور کدھر
شام۔ مجھکو نہ کھانے کا فکر نہ پہننے کا تردد۔ پکی پکائی کھالی اور سلا سلایا پہن لیا۔

یہاں گوشۂ عافیت میں گیارہ صفحے چھاپ دوں گا۔ اور صحت کچھ رفو کر لوں گا۔ لیکن کام کے شروع ہوتے ہی وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میں کام سے ہل نہ سکا۔ اب نومبر میں چھٹی ملتی ہے وہاں سے کہیں تین چار ہفتے رہوں گا۔ درمیان میں کرسمس کا وقفہ بھی ہوگا۔ لیکن نہیں معلوم کتنا طویل یا کتنا مختصر۔ نہ معلوم پاکستان کب آنا نصیب ہو۔ دل سخت اداس ہے۔

احباب کی یاد کبھی دل سے محو نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کوئی لطیفہ کان تک پہنچ جاتا ہے تو طبیعت دن بھر کو رنگین ہو جاتی ہے صرف اکثر یہ کیفیت رہتی ہے کہ اماں میرے بھیا کو بھیجو ری کہ ساون آیا۔

ہم نے دوست خدا کے فضل سے ایسے پائے ہیں کہ کہنے کو تو ان میں ہر ایک عالم اجل اور شاعر بے بدل اور جانے کیا کیا ہے لیکن خط لکھنا کسی کو نہیں آتا۔ کسی زمانے میں ایسے ہی بے بس لوگوں کے لئے شاہ عالمی دروازے اور چاندنی چوک وغیرہ میں ایک کتاب "عاشقانہ خط و کتابت" کے نام سے بکا کرتی تھی۔ کئی عشق اس کتاب کی بدولت پنپے اور سرخرو ہوئے وہ کتاب بھی اب نایاب ہے

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

نہ معلوم خلیفہ حکیم صاحب کا کیا حال ہے اور وہ کہاں ہیں میں نے امریکہ میں کئی مرتبہ ان کا ذکر سنا یا اس کی گونج ان تک بھی پہنچی ہوگی لیکن ان کی جانب سے تاحال تک بھی نہ سنائی دی۔ بیگم شاہد علی صاحبہ (کس قدر ادب سے ان کا نام لے رہا ہوں) کو میرا سلام پہنچے۔ خدا کرے میرے خط پہنچنے تک آپ کی تشویش مجید صاحب کے بارے میں دور ہو چکی ہو۔ اور آپ اطمینان سے مجھے ان کا اور اپنا اور احباب و اقربا کا حال بتا سکیں۔

آپ کا خاکسار بھائی

بخاری

بیگم فیض کے نام

(۱)

لندن

۹ اپریل ۵۰ء

پیاری ایلس

سخت تعجب ہے کہ تم میرا القاب صرف "بخاری" لکھتی ہو، نہ مسٹر نہ صاحب نہ پروفیسر، تم عورتیں ہم مردوں کے برابر کب سے ہوتی ہیں جو یہ بے تکلفی برتنے لگیں۔ بچے بڑوں کے ہمسر کب سے ہو گئے، کب سے ۔۔۔۔ لیکن خیر اتنا ہی کافی ہے۔ میں ہمیشہ سے مختصر ڈانٹ کا قائل ہوں جو شفقت اور قرینے سے پلائی جائے اس کا اثر زیادہ دیرپا ہوتا ہے مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ تم ابھی سے اپنے کئے پر نادم اور آئندہ کے لئے مؤدب اور محتاط رہنے کا عہد کر چکی ہو۔

منیزہ فیض کے نام

۴۔ ریورویو ٹیرس۔ نیویارک

۲۰ر نومبر ۱۹۵۰ء

پیاری منیزہ۔ کافی عرصہ ہوا تمہارا ۲۶ راگست کا خط ملا تھا۔ تم میری دیر کی خاموشی کے باعث تعجب سے، بلکہ شاید ناراض ہوئی ہو، تو حق بجانب ہو گی۔ سچی بات یہ ہے کہ ان دنوں میری صحت اچھی نہیں رہی۔ اس کے باوجود مجھے کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے خط و کتابت کا سلسلہ بند رہا۔ اب میں تندرست ہوں اور تمہارا خط سامنے رکھ کر جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

میں تمہیں خط اپنے دفتر سے لکھ رہا ہوں جو اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی عمارت میں ۲۰ ویں منزل پر واقع ہے۔ اس عمارت کی انتالیس منزلیں ہیں۔ ایک مستطیل مینار کی مانند دور سے دیکھو تو ایسی لگتی ہے جیسے ماچس کی ڈبیہ کنارے پر کھڑی ہو۔ مطلع آج اتفاقاً نہایت صاف ہے۔ سورج کی روشنی کھڑکی میں سے اندر آ رہی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی جانب کھلتی ہیں جو دور تک نظر آتا ہے۔ دراصل یہ ہڈسن کی ایک شاخ ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پر جا کر اوقیانوس میں ملتی ہے۔ اسے یہاں دریائے ایسٹ کہتے ہیں۔ اس وقت جب میں لکھ رہا ہوں تو بڑی بڑی کشتیاں اور تیل کے بڑے جہاز اس میں تیرتے پھرتے ہیں۔ پانی دھوپ میں چمک رہا ہے۔ دور نیچے کی طرف مجھے ان پلوں میں سے ایک پل نظر آ رہا ہے جو دریائے ایسٹ پر باندھے گئے ہیں۔ اس پل کا نام ولیمز برگ ہے۔ ویسے ان سب میں مشہور پل بروکلن ہے۔ یہ اتنا ہی مشہور ہے جتنا ہڈسن کی مغربی شاخ پر جارج واشنگٹن پل ہے۔ جس کی تصویر تم نے ضرور دیکھی ہو گی۔

موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ اگرچہ ابھی سردی بہت ہلکی ہے۔ نیویارک شہر میں بھی برف نہیں پڑی۔ کہیں دسمبر کے آخر اور جنوری فروری میں پڑے گی۔ یہاں خزاں کا موسم سب سے دلکش ہوتا ہے۔ امریکی لوگ اسے "Fall" (فال) کہتے ہیں۔ یہ ستمبر میں ہوتا ہے۔ اس موسم میں درختوں کے پتے پہلے زرد اور پھر نارنجی کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔ جنگلوں میں جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔ جہاں کہیں درخت اُگے ہوتے ہیں وہ جگہ بس رنگ رنگ کا ایک ہجوم ہوتا ہے، جیسے کسی نے پیارے پیارے شالوں میں اپنے رنگ کو رکھنے کے لئے پھیلا دئے ہوں۔ بڑی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک قدرتی مناظر کمال دکھاتے ہیں۔ سڑک پر کار میں چلنے میں بڑا لطف آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں ان گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر نالوں اور جھیلوں میں پڑتے ہوئے آتشیں رنگ کے درختوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔ اس سال بھی فصل خزاں خوب رہی۔ عام طور پر موسم خوشگوار رہا۔ کئی روز تک لگاتار جنگلوں میں گھوما جا سکتا تھا اور سیر کی جا سکتی تھی۔

جب تم نے مجھے خط لکھا تو تمہاری امی ولایت سے واپس آ چکی تھیں اور ابا ابھی وہیں تھے۔ اب تک تو وہ بھی لوٹ آئے ہوں گے۔ انہیں میرا سلام کہنا اور سلیمہ کو پیار دینا۔ مجھے یہ بھی بتانا کہ تم نے اب تک تیرنا سیکھ لیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کی مشق کرتی رہو۔ یہ ایک ایسی تفریح ہے جو حاصل نہ کی جائے تو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ تمہارا سنڈے کلب تو خوب ہی چلتا ہو گا۔

جب بھی چاہے مجھے خط لکھنا۔ سلیمہ کو کہنا ضرور۔

اور دیکھو سب کو میری جانب سے ایک بار پھر پیار دینا۔ مع السلامت۔

تمہارا پیارا

اے ایس بخاری

٭ یہ خط فیض احمد فیض کی بچی کے نام ہے۔

مایوس ہو چکے ہوں گے۔ ہمارا رنگ ہیں اوراق کی محبت بھی مرہم کا کام دے گی سب سے بڑھ کر خدا نے تمہیں نیک طینت اور ذہانت فہم بیوی عطا کی ہے اور ایک بچی جو حقیقتاً تمہاری بہترین امیدوں کا مظہر ہو گی ان کی صحبت میں تفکرات کو بھول جاؤ۔ اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم روز چند گھنٹوں ہی کے لئے سہی۔ جو لوگ تمہیں اطمینان سے محروم کر رہے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو ان کو خود تم سے آدھا اطمینان بھی نصیب نہیں۔

کتابیں میں نے کتب فروش کی دکان پر منتخب کی تھیں۔ اور وہاں ہی سے کہا تھا کہ پارسل بنا کر تمہارے پتہ پر بھیج دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تمہیں کوئی خط یا پرزہ نہ ملا۔ بلیوں کی کتاب میں نے اس خیال سے بھیجی تھی کہ شاید اس کا اردو میں ترجمہ ہو سکے۔ ان بلیوں کے کام آئے جو بلیاں پالتی ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خود حجاب ہی سب سے پہلے اس کی قدردان ہوں گی۔

اس سال کے آخر تک یونیورسٹی سے کنارہ کش ہونے کا ارادہ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی نے پروفیسری کا وعدہ کر لیا ہے اس کے علاوہ ایک آدھ سبیل کچھ اور کرنی پڑے گی ورنہ آمدنی میں جو کمی واقع ہو گی اس کا سہارنا مشکل ہو گا۔ دو گھر چلانے پڑتے ہیں، ایک یہاں ایک زبیدہ کے لئے کراچی میں۔ پھر کچھ فکر کی تدبیر بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں کے ڈاکٹر قابل سہی لیکن دنیا بھر سے زیادہ فیس لیتے ہیں۔ سالک صاحب کا خط آیا۔ انہوں نے اطمینان قلب کے لئے ترجمے کی راہ نکال لی ہے۔ وہ ادھر ادھر ترجمے کر رہے ہیں۔ از بس غنیمت ہے۔ ترجموں کے علاوہ موت کا خوف ان پر ضرورت سے زیادہ طاری رہتا ہے۔ شاید انہیں یہ احساس ہے کہ زندگی سے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا وہ نہ ہوا۔ حالانکہ کم از کم ان کو یہ شکایت نہ ہونی چاہئے۔ آپ اور وہ دونوں ہمیشہ دوستوں اور سب لوگوں کے منظورِ نظر رہے ہیں۔ یہ بھی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ ہمیشہ عزت اور آبرو سے رکھے۔ کولمبیا میں مجھے اردو زبان پر بھی لیکچر دینے ہیں۔ اس کے لئے میرے پاس کوئی کتاب یہاں نہیں۔ ضرورت پیش آئی کہ کسی مخلص دوست کی معرفت ایسی کتابیں فی الفور جمع کروں۔ تاکہ دسمبر جنوری تک لیکچر تیار کر سکوں۔ صوفی تبسم ذہن میں آئے۔ انہوں نے فہرست تو مرتب کی لیکن کتابیں بھجوانے کا کام مستعدی سے سرانجام نہ دے سکے چنانچہ معاملہ کبھی ان کے اور کبھی پبلشر کے مابین لٹک رہا ہے۔ آپ مدد کر سکیں اور اس کے لئے فرصت نکال سکیں تو کیا کہنے۔ میں نے تو دانستہ آپ کو تکلیف نہ دی تھی کہ آپ اپنے مشغلے میں گرفتار ہوں گے۔ اردو افسانوں کا ترجمہ میں پھر بھی کرنا چاہتا ہوں بلکہ یہ میری زندگی کی بہت بڑی آرزو ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب . . . سے امید نہیں کہ وہ میری مدد کریں گے۔ آپ اور فیض صاحب خود ہی افسانوں کا انتخاب کر لیجئے۔ حجاب کو میرا سلام اور یاسمین کو میرا پیام پہنچے۔ خط لکھتے رہا کیجئے۔

آپ کا خادم

بخاری

۵؍ اگست

---

(۵)

۱۱ مئی ۵۵ء نیویارک

ڈیر امتیاز۔ واپس پہنچنے کے چند دن بعد آپ کو ایک خط لکھا تھا جو ہر چند کہ جواب طلب نہ تھا تاہم بتقاضائے عشق جواب کا منتظر رہا۔ لیکن اب تک آپ کے خط سے محروم ہوں۔ خیال تھا آپ اپنے ادبی عزائم کے متعلق مزید کچھ بتائیں گے۔ کیا ادھر کیا بنا۔ وہ ایک کتابیں بھی آپ کو بھجوائی تھیں۔ بہت اچھی تھیں لیکن میری کفایت شعاری کا ثبوت مزید ان سے ظاہر ہو گا۔ افسوس کہ کتابیں بجائے سمندر کی ڈاک سے بھجوانی پڑی ہیں۔ ہوائی ڈاک سے بھجوائیے تو پانچ ڈالر کی کتاب پر کم و بیش اتنا ہی خرچ آئے۔ جیب اجازت دے تو عقل اجازت نہیں دیتی۔ میتھ (۲۶۲۲۷) کے آغاز کے بارے میں میں نے اپنے ماہر دوستوں سے اظہار کہانی سننے کو کہا۔ وہ ضرورت سے زیادہ ماہر نکلے۔ سب کہتے ہیں کہ اس کے متعلق تین نظریے ہیں۔ میں فلاں کا قائل ہوں۔ اور فلاں تو اس

لوگ جن میں رہی پرورش پائی بڑی ہوئی ہر وقت سب کے سب میرا دل ہاتھوں میں لئے رہے۔ اماجان کا یہ حال کہ ایک دم کے لئے مجکو اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں ذری کی ذری ہمسائے میں جا کھڑی ہوتی ہوں تو تراہ تراہ مچ جاتی ہو۔ آباجان نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا اور مجکو پکارا۔ بھائیوں میں کسی کو اتنی سہار نہیں کہ میری آنکھ پر میل آئے وہ تو کچھ ایسی ہی مجبوری ہو کہ ان کو [illegible] سے بچھڑنا بچارا [illegible]۔ آباجان جب میں [illegible] بھائی بھی اداس معلوم ہونے لگیں۔ اور اماجان تو میری فکر میں گھر کر دو دو دن [illegible] روبھی لیتی ہیں۔ میکے کے سے چین تو نہ کسی کو نصیب ہوئے [illegible] میں۔ میں نے بھی بہتیر [illegible] بیاہی لڑکیوں کو دیکھا جب میکے سے گئیں روتی ہوئی۔ لیکن جب ایک حالت پیش آنے والی ہو اور ضرور پیش [illegible] تو پہلے سے طبیعت کو اس کے لئے آمادہ بلکہ اس سے مانوس کر رکھنا [illegible] ضرور مفید ہوگا۔ اب اس نے اپنے طور پر بیاہی ہوئی عورتوں کے حالات کی تفتیش [illegible] دیکھا تھا اس کو بھی غور سے دُہرایا۔ [illegible] شروع ہوتی ہو۔ گویا ہندوؤں کے خیال کے مطابق [illegible] تعلق [illegible] رفتہ رفتہ نہیں تو رفتہ رفتہ موقوف اور [illegible] ہو کر آدمی کے پیچھے نئے تعلقات [illegible] میں۔ ماں بہنوں کی جگہ ساس نندیں ہیں اور باپ بھائی کے بدلے سسرا اور دیور [illegible] ایک شخص اَور ہی جو کسی کے عوض نہیں اس سے ایک [illegible] طرح کا تعلق ہی اور وہی تمام جدید تعلقات کی اصل ہی۔ بلکہ یوں کہو کہ اگلے پچھلے سارے تعلقات رد ہو کر یہی ایک تعلق ہی جسے ساری عمر نباہنا [illegible] کی تقدیر ہی اور یہی اس کی قسمت۔ یہی اس کے حق میں رحمت ہی اور یہی زحمت۔ اگر [illegible] تعلق میں [illegible] اری ہی تو دنیا کا عیش ہی آرام ہی عزت اور آبرو ہی۔ اور اگر کہیں خدانخواستہ اس میں بے لطفی ہی تو بدنامی اور رسوائی کے علاوہ زندگی تلخ ہی۔ پس بڑی بات جو بیاہ کے بعد مجکو کرنی ہی یہ ہی کہ جس شخص کے ساتھ ایسا قوی تعلق ہی کسی ڈھب سے اس کو رام کروں اور اپنے قابو میں لاؤں۔ اور اسی دن کے واسطے تو میں سٹ پٹائی پڑی پھرتی تھی کہ جس کے پلے مجکو باندھیں

لکھیے گا ہے کو کوئی کتاب، انگریزی رسالہ، کوئی نظم، کوئی افسانہ، کوئی جرعہ مجھ تک پہنچتا رہے گا۔ سعید رعنا یہاں رفاہ ہوا کر اردو تحریر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ کیلیفورنیا کو حسب توقع دل کش اور رنگین پایا اور کانفرنس کی وجہ سے مصروفیت اس قدر رہی کہ اپنی دوا تازگی پر آہ بھرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ تاہم کسی گیتار بجانے والے کی تان کبھی رات کی خاموشی میں تیرتی ہوئی دل کے پاس سے گزر جاتی ہے یا ہسپانوی وضع کے مکانوں کی رومانی کھڑکیوں اور محرابوں اور سرو کے درختوں پر بہار کی سی شوخ دھوپ چمکتی ہے اور ٹھنڈے ٹھنڈے سایے گھاس پر لیٹ جاتے ہیں یا کونوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں تو لاہور والوں کا مالیخولیا یاد آتا ہے۔ سالک صاحب کے انقلاب کا جوبلی نمبر دیکھا تو بس یوں آپ کی نظم سے آنکھیں سیراب ہوئیں۔ اب معلوم ہوا کہ نقوش پھر آزاد ہو گیا ہے تو دل چاہا کہ آپ کو مبارک باد کا خط لکھوں۔ ہاجرہ کی کتاب غالباً چھپ گئی ہوگی۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو انہیں بھی میری طرف سے مبارک ہو اور ہاجرہ اور خدیجہ دونوں کو میرا سلام پہنچے۔ نہیں معلوم کہ کب واپس آؤں گا۔ دل چاہتا ہے جنوبی امریکہ میں کچھ آوارہ گردی کروں۔ اور نیویارک، واشنگٹن وغیرہ کا طلسم تو بہرحال رہے گا۔ ابھی جنتری پر نگاہ ڈالنے کا موقع نہیں۔

خاکسار

بخاری

(نوٹ: یہ خط سالنامہ نقوش لاہور ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکا ہے)

بنام حکیم یوسف حسن

محترم بندہ جناب حکیم صاحب!

آپ کا خط ملا۔ گویا آوری سلام روستائی کے سلسلے میں کچھ تھی لیکن پھر بھی ممنون ہوں۔ ڈاکٹر اقبال کی ذرہ افزائی سے میرا حوصلہ تو بہت بڑھا لیکن نہ اتنا کہ مضمون کا وعدہ کر سکوں۔ جون کو میرا پہلا امتحان ہے اور موسم اس قدر خوش گوار ہو رہا ہے کہ دریا کے کنارے اس جھیل کے پاس جہاں بائرن کے تخیل کو پرواز نصیب ہوئی تھی، کسی پھول سے لدے ہوئے سبزہ زار میں گھنے اور بلند درختوں کے درمیان زندہ رہنے کو دل چاہتا ہے۔ اس دوگونہ عذاب کا نتیجہ یہ ہے کہ آستانہ جیسے عزیز دوست کی فرمائشوں کی تعمیل سے بھی معذور ہوں اور سالک جیسے مقتدر شفیق کے خط کی رسید تک بھیجنے سے قاصر۔ سزا بھگت رہا ہوں، عرصہ ہوا، دوستوں نے خط لکھنا بند کر دیا۔

سوچتا ہوں تعطیلات شروع ہو لیں، وہ خط لکھوں گا کہ دوستوں میں کھلبلی مچ جائے۔ اس ہیجان کے دوران میں ہو سکا تو نیرنگ خیال کی خدمت بھی کروں گا۔

رسالہ دیکھ کر آنکھیں روشن ہو گئیں پھر بھی میری کج بین طبیعت کو اصلاح کی گنجائش نظر آئی۔ لیکن اس کا الزام آپ کو نہیں دیتا۔ ہندوستان کی بدنصیبی ہے اور کیا کہوں۔ مجھے ذرا لاہور واپس آ لینے دیجیے۔

خاکسار

بخاری، عمانوئیل کالج، کیمبرج

(نیرنگ خیال ستمبر ۱۹۲۷ء)

کیا تسیاد مضامین ابھی بغیر مزید مسالے کے انتظار کے بیٹھے رہوں تاکہ کتابت شروع ہو جائے؟

مشفقی، سلام مسنون!

ابھی ابھی آپ کا رجسٹری خط مورخہ ۴ ستمبر معہ بقیہ مسودات کے ملا۔

مضامین کی ترتیب کے متعلق میں حال ہی میں آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں لہٰذا اس کے متعلق جو میرا مشورہ ہے اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

امید ہے آپ اس سے متفق ہوں گے۔

اب اگلی ڈاک سے انشاء اللہ دیباچہ ارسال خدمت کروں گا اور مسودات بھی واپس بھیج دوں گا۔ | خاکسار

نیویارک۔ ۹ ستمبر ۱۹۵۰ء | بخاری

---

(۳)

مشفقی جناب حامد علی خاں صاحب، سلام مسنون!

آج ہی ایک علیحدہ پیکٹ بصیغہ رجسٹری آپ کے نام روانہ کر دیا ہے۔ جس میں ۲۹۔ پاکستانیوں کے مسودے اور ۳ غیر پاکستانیوں کے شامل ہیں نیز ۱ منظوم کی اصل انگریزی بھی اسی پیکٹ میں بھیج دی ہے۔ زحمت نہ ہو تو رسید سے مزور مطلع فرمایئے۔ میں متشکر ہوں گا۔ دیباچے کا مسودہ منسلک ہذا ہے۔

ترجموں پر نیز دیگر مضامین پر میں نے حتی الامکان بڑے غور سے نظر ثانی کی ہے مترجمین نے بعض حصے تو اپنی بساط سے بڑھ کر پاسے بعض جگہ ذرا گھاس کاٹی۔ مضامین یوں بھی ABSTRACT ہیں۔ اگر ان میں روانی اور سلاست بھی نہ ہو تو ان کا پڑھنا اور ان سے لطف اندوز ہونا بالکل ہی مشکل ہو جاتا ہے بہرحال اب جس حالت میں مسودات آپ تک پہنچ رہے ہیں امید ہے آپ انہیں خاطر خواہ پائیں گے۔

تاخیر کے لئے میں آپ سے نادم ہوں اوّل تو اسمبلی کی وجہ سے اور کچھ بیماری کے بکھاڑ کی وجہ سے فرصت کم رہی پھر ایک طویل دیباچہ لکھا تھا، جسے حالات کے تغیر و تبدل نے بے کار بنا دیا۔ دوسری مرتبہ لکھا تو پھر وہی کیفیت ہوئی آخر تنگ آ کر میں نے ایک مختصر سے دیباچے ہی پر اکتفا کی ہے۔ آپ پڑھیں گے تو یقیناً اندازہ ہو جائے گا کہ میرے دیباچے کس وضع کے اور کس موضوع پر تھے۔ سو اب ان کا موقع نہیں۔

مضامین کو ابجد کے لحاظ سے آپ خود ترتیب دے لیجئے۔ اور اپنے نظم و نسق کے مطابق کتابت موقع پر شروع کرا دیجئے۔ اب تو سب مرحلے طے ہو چکے اب زیادہ تاخیر کے لئے کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

جب میں نے سنا کہ مکتبہ فرینکلن سے کرتا دھرتا آپ ہیں تو بے حد مسرت ہوئی۔ آپ یقیناً اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ہرگز مجھ سے دریغ نہ رکھیں۔ بلکہ خادم دیرینہ سمجھیں۔ | خاکسار | بخاری

(انشاء یہ خط ۵ دسمبر ۱۹۵۰ء کو ملا۔ اس روز شام پطرس کی وفات کی خبر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی۔ یہ خط اسی کتاب سے متعلق ہے جس کا ذکر ملحوظہ دیباچہ اس رسالے میں درج ہے اور یہ کتاب مکتبہ جدید نے چھاپ دی ہے۔)

یعنی مضامین

اے۔ ایس۔ بخاری

بی۔ اے (کینٹب) ایم۔ اے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور

سابق ڈائرکٹر جنرل براڈکاسٹنگ

فہرست مضامین

اظہارِ عقیدت

میں اپنے استادِ محترم پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب دہلوی کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور اسے بعض لغزشوں سے پاک کیا۔

میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ مجھے اب بھی اُن سے فیضِ تلمّذ حاصل ہے۔

پطرس

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چُرائی ہے۔ تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے۔ تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔

ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں۔ حتیٰ کہ جن کے لیے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ وہ بھی ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔ آپ تو اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں۔ جنھوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا ہرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں۔ وہ پہلے اس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کریں۔

"پطرس"

ہاسٹل میں پڑھنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی۔ اور رفتہ رفتہ بی۔ اے بھی پاس کر لیا۔ لیکن اس نصف صدی کے دوران میں جو کالج میں گزارنی پڑی ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا۔ یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔

جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لئے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس لئے وظیفے کا نہ ملنا بھی خصوصاً ان رشتہ داروں کے لئے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے فخر و مباہات کا باعث بن گیا۔ اور "مرکزی رشتہ داروں" نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مراتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت و نجابت کو بے حد سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لئے بلا تکلف یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک و قوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ کیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور بے لاگ اور منصف مزاج یونیورسٹی ہماری بیدار مغزی کی تصدیق کر چکی تھی۔ اب ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریق تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس دے کر بیک وقت جرنلزم۔ فوٹوگرافی۔ تصنیف و تالیف۔ دندان سازی۔ عینک سازی۔ ایجنٹوں کا کام وغیرہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جا سکتے ہیں۔ اور تھوڑے سے عرصے کے اندر انسان ہرفن مولا ہو سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لئے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے محلے والوں میں سے کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا۔ اس لئے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی۔ اور ہمارے والد، ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔ جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی رومان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی میں آج تک کلام نہیں۔ اگر وہ صرف ایک معمولی سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان، اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا، چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر یا تو شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں، یا کسی جوئے خانے میں ہزارہا روپے ہار کر خود کشی کر لیتے ہیں۔ یا فرسٹ ایر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک۔ مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے۔ تو کسی نہ کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کئے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لئے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا۔ وہ کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا۔ یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا اور تعلیم کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا۔ جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے۔ اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا کیونکہ ہمارے

مجھ سے پوچھ کر باندھیں - خیر وہ تو نہ ہوا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا تو کیا جب تک مجھکو
اُس کا طرز مزاج معلوم کرنے کا موقع ملے صبر کئے بیٹھی رہوں - اور اگر آن جان پنے میں مجھ سے
کوئی بات سرزد ہو گئی اور اُس کو ناگوار گزری اور بگاڑ کی بنیاد پڑ گئی تو پھر تیں کدھر کی ہوئی
اس سلسلے میں اُس کو پھر وہی خیالات عود کرنے لگے جن کو اُس نے ہار کر زبردستی دل سے
دور کر دیا تھا - لیکن اُس کی طبیعت اس طرح کی واقع ہوئی تھی کہ اس کو بے چین کئے رہتی تھی
وہ کہتی تھی کہ بلا سے کسی طرح ایک نظر [illegible] بھی دیکھ پاتی تو کچھ نہ کچھ عقل دوڑاتی شرافت
بعلمنا [illegible] ہی - ہنس مکھ جو جیسا ہوتا ہے اُس کا قیافہ بول اُٹھتا ہے
[illegible] کی پہچانا جاتا ہے [illegible] ہی تا روز بلا ناغہ خیر صلاح کی خبر کو آتی ہے اور
[illegible] بیٹھ کر وہاں کی باتیں کیا کرتی ہے مجھکو تو سامنے جانے کا حکم نہیں ورنہ اتنی ہی
باتوں سے سارا پتہ لگا لیتی - خیر اتنا بھی غنیمت ہے کہ مولوی لوگ ہیں اگرچہ آپا جان مولویوں کا
بہت ہی بُرا بُرا کرتے ہیں مگر ان کے اعتراضات دوسری قسم کے ہیں اور یہ بھی سچ ہے
[illegible] مولوی مولوی برابر [illegible] سارے جاہل جاہل یکساں - بلاشبہ بعض مولوی دکھاوے
کے لئے بھی روزہ نماز کرتے ہوں گے اپ [illegible] نصیحت [illegible] دوسروں کو نصیحت - لیکن بلا سے ان کا ظاہر
تو اچھا ہے [illegible] کرے گا تو ایک نہ ایک دفعہ اُس کو خیال آ ہی جائے گا
[illegible] ظاہر اور باطن [illegible] ہوں - اس کے علاوہ ظاہر کا پاس
بھی انسان کو [illegible] آپا جان کا یہ اعتراض تو میری سمجھ میں
نہیں آتا - اور [illegible] یہ ہے کہ جب میری تقدیر میں مولوی لکھے ہیں اور
چار و ناچار مجھکو مولوی سے گھر جانا ہے تو میں جو ابھی سے ان کے عیبوں پر نظر کر کے اپنے
دل کو اُن کی [illegible] پھیر لوں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ لڑائی کی ابتدا اور بگاڑ کی تمہید
میری طرف سے ہوئی تو میں کسی کو رام کیا کروں گی خاک ؟ دوسرے رام کرنے کی تدبیر
تو یہ ہے کہ میں خود رام ہو جاؤں اور یہ بدون اس کے ہو نہیں سکتا کہ اُن کی خوبیاں
اس طرح میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہوں جیسے پتھر میں نقش - اور مولویوں میں چاہے کچھ ہی
عیب کیوں نہ ہوں خانہ داری کے تو بُرے نہیں ہوتے اور مجھکو اور چاہیے بھی کیا ؟

ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو۔ جسے تیرنا آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر لکھے جانے والے خطوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں۔ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگرٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔ گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی، سیر کو بھی چلے جاتے تھے۔ ہنس بول بھی لیتے تھے۔ لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی، ایک فراخی، ایک وارفتگی ہوتی ہے۔ وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا۔ کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں۔ کس وقت باہر جاتے ہیں۔ کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی۔ کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے۔ کون سا ملازم موافق ہے۔ کون سا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشوونما کے لئے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا۔ والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں۔ لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا، ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں ہم دلّی کو واپس گئے تو چند مختصر مگر جامع اور مؤثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار کر رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لئے ازحد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کئے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم و تشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بیچارا ہاسٹل سے واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی۔ دو منٹ دیر سے پہنچا۔ صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس سے تحقیقات کرنے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لئے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔ توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بیچارے محمود کا واقعہ بیان کیا۔ کہ ایک دفعہ شامت اعمال بیچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر سینما جانے کی ممانعت ہو گئی۔ لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہئے تھا۔

انہی ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں۔ اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک آدھ نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ اور سال بھر تعلیم پانے کے بعد

ہماری حیات سے بیرون نکل ہی گئی تھی۔ پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں۔ وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگیں تھیں اب کہ ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا۔ کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی۔ لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا۔ اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی۔ تو دشواری محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلبا کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں۔ ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی۔ کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ جانتا ہے کہ "والدین بغرض اطلاع" کے لیے واقعات کو ایک نئے انداز اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر پہ منی آرڈر چلا آتا ہے۔

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ تو ایک دن والد نے پوچھا۔

"تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟"

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا "دیکھئے نا! مثلاً ایک طالب علم ہے۔ وہ کالج میں پڑھتا ہے۔ اب ایک تو اس کا دماغ ہے۔ ایک اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے۔ میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم سے ہوتا ہے نہ دماغ سے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو۔ لیکن پھر بھی اس کی شخصیت ——— نہیں خیر دماغ تو بیکار نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے ——— لیکن پھر بھی اگر ہو بھی ——— تو گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے ——— ٹھہریے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کی بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی۔ جس کے دوران میں وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے شخصیت نہیں کہنا چاہیے۔ شخصیت ایک بے ڈھنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنا لیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے "کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟"

میں نے کہا "چال چلن ہی کہہ لیجئے۔"

"تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "بس یہی تو میرا مطلب ہے۔"

"اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے؟"

میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا "جی ہاں۔"

"یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ سچ زیادہ بولتے ہیں۔ نیک زیادہ ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔"

کہنے لگے "وہ کیوں؟"

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیم انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا۔ اے کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں "زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن" گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا۔ نئی نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب "شخصیت اور سیرت" والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا۔ اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان "بیرون از کالج" ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لئے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں۔ تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے ہیں۔ اس سے رسوخ بڑھتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا۔ معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے۔ اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی ایک طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے۔ کہ ان کی شفقت کچھ کم ہو گئی تھی۔ ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہو گیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی۔ اے کا امتحان دیا۔ تو فیل ہو گیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی ہوا۔ تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی۔ اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آ گیا تھا۔ لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلے جیسی وقعت اب نہ رہی تھی۔

میں زمانۂ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ

میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے۔ اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی۔ اے میں کیوں فیل ہوا۔ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف۔ اے امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا۔ اس لئے ہم اس میں "کچھ" پاس ہی ہو گئے۔ بہر حال فیل نہ ہوئے۔ یونیورسٹی نے ب[illegible] تو ہمارا داخلہ کر ڈالنے سے پہلے انتظامات کیا۔ لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ مہینے کے بعد دوبارہ دو (ایسے امتحان کو اصطلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لئے کہ مغربی ہند میں اپنے ہمراہی مسافروں کے ساتھ گاڑی میں سفر کر رہے ہوں۔ نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے)

اب جب ہم بی۔ اے میں داخل ہونے لگے تو ہم نے یہ سوچا کہ بی۔ اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح سے کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لئے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں کوئی معقول جواب نہ دیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہو گئے۔ چنانچہ بی۔ اے میں ہمارے مضمون انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کی بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورتِ حالات پیدا ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوتِ مطالعہ منتشر ہو گئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کی بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے۔ تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا۔ وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانئے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا۔ اور فرض کیا اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا۔ بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے لئے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر کماحقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا۔ لیکن بی۔ اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا۔ اب آپ ہی سوچئے تا کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا۔ وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا۔ بلکہ اس کی بجائے ——— مگر خیر یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لئے لاحد حیرت کا موجب ہوا۔ اور سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے۔ اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے۔ اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔ اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو۔ مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید۔ باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے۔ لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا۔ اسی نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔ پہلے دو میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہے:۔

(۱) انگریزی۔ تاریخ۔ فارسی۔

(۲) انگریزی۔ تاریخ۔

(۳) انگریزی۔ فارسی

(۴) تاریخ۔ فارسی۔

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا۔

(۵) تاریخ میں فیل۔

(۶) انگریزی میں فیل۔

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو اپنے سامنے رکھ کر غور کیا تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ فارسی میں فیل ہو جائیں لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے۔ ہر چند کہ یہ سانحہ ازحد جانکاہ ہو گا۔ لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائیگا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار در اصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا۔ بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لئے بی۔ اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا۔ تو والدین کو نتیجے کے لئے پہلے ہی سے تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت اور فوراً۔ رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور پریشانی مفت میں طول کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے۔ والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ میں پرچوں پر کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن ترک اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں۔ تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے تاکہ وقت پر انہیں صدمہ نہ ہو۔ لیکن بہی خواہ ہیں کہ میری تمام تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آجایا کرتا تھا۔ کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔ لیکن ادھر ادھر کے لوگ "اجی نہیں صاحب؟" "اجی کیا کہہ رہے ہو؟" "اجی یہ

بھی کوئی بات ہے کہ ایسے نفرتوں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہرحال اب کے ہم گھر پہنچتے ہی ہم نے حسبِ دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ ساتھ ہی تسلی دی کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیشین گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہئے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے تو ماموں کے ڈربے میں۔ اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال۔ صرف ایک سال۔ اور یہ آخری موقعہ ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا۔ جن پروفیسروں سے مجھے اب ہمسری کا فخر حاصل تھا۔ ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبا کے والدین سے بھی اسی مضمون کی عرضداشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت ہی کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہو سکا۔ کہنے لگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو۔ وہ ہاسٹل کی بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے۔ جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہو سکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحرِ علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو سو تین تین سو لڑکے رہتے ہیں۔ پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جابجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لئے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں۔ کامن روم میں۔ غسل خانوں میں۔ برآمدوں میں۔ ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے۔ وہ دن رات آپس میں شکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبا اپنے ہر ایک خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبا رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں تاریخ کے دلدادہ ....

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں اور کب اگلے سال کے لئے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی۔ جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہو گی۔ اور انہیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لئے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لئے ہاسٹل میں آ رہے ہیں۔ جس سے ہم طلبا کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادرِ مہربان کی سی سوچ لی۔ جس کے ارد گرد ناتجربہ کار طلبا مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں گے۔ تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے۔ اور فلاں فلاں۔

تو ان سے اپنے آپ کو سنبھال سکیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا۔ یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی برہمچاری سے برسبیلِ تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں۔ ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجیے۔"

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے۔ نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اُٹھتے ہی انہوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالمِ خواب ہے۔ ابھی سے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے۔ لیکن یہ گولہ باری لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی گئی۔ اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا۔ اور دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر، پنڈولم کی طرح ہلنے لگا۔ تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمتِ خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہو گی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں...... "اچھا!...... اچھا!...... تھینک یو!...... جاگ گیا ہوں...... بہت اچھا! نوازش ہے!" آپ جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا! کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جِلا رہے ہیں! اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا۔ نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مُردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے؟ توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اُٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے! پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہلِ ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخرکار جب لیمپ جلایا۔ اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں۔ کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا آج پتہ چلائیں گے۔ یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبحِ کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں۔ ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا۔ کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی۔ "لالہ جی!...... لالہ جی!"

جواب آیا۔ "ہوں۔"

میں نے کہا "آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیرا اندھیرا سا ہے؟"

کہنے لگے: "تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟"

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا۔ "کیا کہا تم نے؟ تین بجے ہیں؟"

کہنے لگے: "تین ...... تو ...... نہیں ...... کچھ سات ...... ساڑھے سات ...... منٹ ٹوٹ گئی ہیں۔"

میں نے کہا: "ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے۔ ہم نے تجھ سے یہ کہا تھا۔ کہ صبح جگا دینا۔ یا یہ کہا تھا۔ کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے؟ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظورِ نظر نہ ہوتے؟ ابے احمق کہیں کے تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ امیر زادے ہیں۔ کوئی مذاق ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔"

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و شدد کو خیرباد کہہ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے۔ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک کی سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوشِ شباب تو ہے ہی اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلفِ جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی: "مسٹر!"

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہوا۔ "یہ آپ گا رہے ہیں؟" (زور "آپ" پر)

میں نے کہا: "اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمائیے؟"

بولے "ذرا ...... وہ میں ...... میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔"

بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا: "او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں۔" صاحب۔ خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ "خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔"

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لئے۔ نکٹائی کھول دی۔ آستینیں چڑھا لیں۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد، سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطاروں میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر ۱۵ اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو

جواب آیا۔ کیوں اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں البتہ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو ذرا اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغویات ہے۔ البتہ پانچ، چھ، سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی۔ اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیے۔ کھانا باہر ہی سے کھا آئے تھے۔ بستر میں ۱۰ بجے کے چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ تو دیا ہی نہیں! یوں ہماری اپنی قوت ارادی کوئی زبردست ہے جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی "لالہ جی!"

انھوں نے پتھر کھینچ مارا: "جی!"

ہم اور بھی سہم گئے کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ "لالہ جی۔ صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوگی میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔ اگر ذرا مجھے بھی جس وقت آپ جاگیں . . . . . "

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا: "جب آپ جاگیں تو . . . . . سنا آپ نے؟" چپ۔

"لالہ جی!"

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا "سن لیا۔ سن لیا۔ صبح بجے جگادوں گا۔ تھری کواٹرس پورا لفافہ پس . . . . .!"

ہم نے کہا: "ب۔ ب۔ ب۔ بہت اچھا۔ یہ بات ہے!"

توبہ۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی بہت شریف آدمی ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہولے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہر صورت جیسا کہ میرا فرض تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اسے اسی شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب ہیں۔ اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہر حال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں۔ کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا پتہ نہیں۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسا یا خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہر صورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ۔ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر ہی سے بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے

میں جب کبھی ننھیال جاتی ہوں نانا ابا کے پاس میاں بیاہ میں سبھی کے اکثر جھگڑے دیکھتی ہوں مگر مولویوں کا اس قسم کا کوئی جھگڑا دیکھنا کیسا۔ سننے میں بھی نہیں آیا۔ ہاں وہ مولوی محمد عمر کا مذکور البتہ خدا جانے کس سے سُنا تھا کہ اُنھوں نے اپنی بی بی کو طلاق دے دی تھی تو اس سے مولوی صاحب کی اعلے درجے کی دین داری پائی جاتی ہے۔ بہت دنوں کی بات بھول سی گئی تھی اب سوچا تو یاد آئی کہ مولوی صاحب بڑے ہی متقی پرہیزگار [illegible] رات دن سوائے عبادۃ کے اَور کوئی کام نہ تھا۔ ان کو اپنی بی بی [illegible] بڑا ہی [illegible] ہوتا یہی تو اُن کے سچے دیندار ہونے کی شناخت تھی [illegible] بی بی [illegible] مولوی صاحب [illegible] یا چار بچے بھی تھے۔ مولوی صاحب [illegible] کھانے کے بعد لیٹے ہوئے کتاب دیکھ رہے تھے اتنے میں سُسرال کے رشتے کی کوئی بی بی آئیں اپنے میاں کا حال بیان کرنے لگیں کہ آج پانچواں دن ہے اس طرح کا بخار چڑھا ہے کہ بدن پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔ یہ آبخورہ لائی ہوں [illegible]نی دم کر دو اور کوئی دوا بھی [illegible] نے پانی دم کر دیا اور طب نبوی پر سے دیکھ کر کوئی دوا بتا دی۔ دوا کا نام سن کر گھر والی بی بی بول اٹھیں ای ہی بوا یہ دوا تو نہ دینا یہ تو بڑی گرم آگ ہی ایسا نہ ہو سر کو گرمی چڑھ کر سرسام ہو جائے؟ مولوی صاحب نے کہا دوا میں نے طب نبوی میں سے دیکھ کر بتائی ہے خدا نے چاہا پیغمبر صاحب [illegible] سے فائدہ دے گی۔ بی بی کی جوانی شامت لگیں کہنے یہ بلا کی تو گرمی پڑ رہی ہے اور [illegible] ور کا بخار ہے اور تم کہتے ہو شہد میں کلونجی لے کر کے چٹا دو؟ نسخہ [illegible] یہ میری صلاح تو نہیں۔ مولوی صاحب۔ جب میں طب [illegible] دیتا ہوں تو اس پر جرح کرنا خلاف شان اسلام ہے۔ اس پر بھی بی بی [illegible] کی کہے ہی گئیں [illegible] جوش میں آکر فوراً بی بی کو طلاق [illegible] دونوں میاں بی بی ایک دوسرے [illegible] غم میں برس کے اندر ہی اندر مر گئے [illegible] صورۃ تھی اور اس میں مولوی صاحب پر کسی طرح کا الزام بھی نہیں۔ دنیا دار لوگ مولویوں کو چھیڑنے کے طور پر [illegible] کہا کرتے ہیں۔ لیکن کوئی اُن کی بیبیوں کے دل سے پوچھے؟ میں تو ایسا سمجھتی ہوں [illegible] کوئی مولون بادشاہ بیگم ہونا بھی پسند نہیں کرے گی۔ امیروں میں بس یہ ظاہر ہی کے

آپ کو تو ستارہ ہی لگا۔ لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں ہوئیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو بعد میں بھی یہی نیت
ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے ہم نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا۔ ورنہ اوروں کی طرح آج بھی دس بجے
اٹھتا۔" لالہ جی صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے۔ جو پڑھو فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔
یعنی اگر صبح کی بجائے صبح شام ہوا کرتی، تو دن کیا بری طرح کٹا کرتا

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے۔

"تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں، واہ۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بے شک۔"

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ دیں۔ کرسی کو چارپائی کے قریب
سرکا لیا۔ اوور کوٹ اور گلوبند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیاسلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔
تین دفعہ آیۃ الکرسی پڑھی۔ اور دل میں نہایت ہی نیک نیت باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو
گڈمارننگ کیا۔ اور نہایت بیدارانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا۔ کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا "دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض
ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے۔" دل نے کہا "اور کیا! ہمارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں۔"
ہم نے کہا "سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں۔ تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی
میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے
ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور خندہ پیشانی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار سعادت
آثار واقع ہوئے ہیں۔" ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی۔ تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا۔ اور پھر سوچنے لگے۔
"خوب۔ تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع
کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا
خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بیچارہ یہی کہتا کہتا مر گیا۔ لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی
.........(لحاف کانوں پر سرک آیا)......... تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں......... بہت
ہی پہلے یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے......... کیا بات ہے۔ خداوندا! کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر
ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے.......
........"(لحاف سر پر)"......... بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔
عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے......... (آنکھیں بند)"......... تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین
گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کون سی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈز ورتھ؟ میں جانتا

شیکسپیئر بہتر ہو گا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار نظر آ رہے تھے اور صبح کے وقت اللہ میاں کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دو گھڑی جذبات کے محشرستان سے فرار کے لئے ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈز ورتھ پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہو گا۔ اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش وادیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے....... لیکن شیکسپیئر

.... نہیں ورڈز ورتھ ہی ٹھیک رہے گا....... شیکسپیئر........ ہیملٹ........ لیکن ورڈز ورتھ

.... ٹیمپسٹ........ ڈیفوڈلز........ سبزہ زار........ سبز سبز........ باد بہاری....

.... شیدا ہوں........ کنیز........ میں آفت کا پرکالہ ہوں........؟

یہ سب ما بعد الطبیعیات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو جھنے لحاف سے سر باہر نکالا۔ اور ورڈز ورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تو دس بج رہے تھے۔ اس میں نامعلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے کہنے لگے "مسٹر! صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہ دیا؟"

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا "اوہو! لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا۔ میں تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔"

بولے "وہ تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں........ اس کے بعد........ کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔ آپ بولے ہی نہیں؟"

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تصنع میں رہے۔ پھر یکایک ایک مجذوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا "ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں اس وقت..... اُسے........ اُسے.. نماز پڑھ رہا تھا۔"

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دیئے۔ اور ہم اپنے زہد و اتقاء کی تسکین میں سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دل مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ "ہمارا فرق ناز محو بالش کم خواب ہو" اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پُر پیچ بالوں پر پڑ رہی ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسین ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سُریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

"تم جاگو موہن پیارے"

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہِ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور نگاہ

ہم نے کبھی شیر کو ... سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلّی سمجھیں لیکن خدا شاہد ہے [illegible] دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیے کہ دافعِ بلیات ہے۔ لیکن ہم تو اس سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے۔ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سُروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہماری طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیۃ الکرسی آپ کے ذہن سے اُتر جائے گی۔ اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔

بعض وقت ایسا بھی اتفاق ہوا ہے کہ رات کے دو بجے چھڑی گھماتے تھیٹر سے واپس آ رہے ہیں۔ اور ناٹک کے کسی نہ کسی گیت کی طرز ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چونکہ گیت کے الفاظ یاد نہیں۔ اور نو مشقی کا عالم بھی ہے۔ اس لیے سیٹی پر اکتفا کی ہے کہ بے سُرے بھی ہو گئے تو کوئی یہی سمجھے گا۔ انگریزی موسیقی ہے۔ اتنے میں ایک موڑ پر سے جو مڑے تو سامنے ایک بکری بندھی تھی۔ ذرا تصور ملاحظہ ہو۔ آنکھوں نے اسے بھی کتا دیکھا۔ ایک تو کتا اور پھر بکری کی جسامت کا۔ گویا بہت ہی کتا۔ بس ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چھڑی کی گردش دھیمی ہوتے ہوتے ایک نہایت ہی نامعقول زاویے پر ہوا میں کہیں ٹھہر گئی۔ سیٹی کی موسیقی بھی تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔ لیکن کیا مجال جو ہماری تھوتھنی کی مخروطی شکل میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ گویا ایک بے آواز لے ابھی تک نکل رہی ہے۔ طب کا مسئلہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اگر سردی کے موسم میں بھی پسینہ آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بعد میں پھر سوکھ جاتا ہے۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لیے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کی بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرعہ دعائیہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو" لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

جب تک اس دنیا میں کتے موجود ہیں اور بھونکنے پر مُصر ہیں۔ سمجھ لیجئے کہ ہم قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ اور پھر ان کتوں کے بھونکنے کے اصول بھی تو کچھ نرالے ہیں۔ یعنی ایک تو متعدی مرض ہے اور پھر بچوں۔ بوڑھوں سبھی کو لاحق ہے۔ اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے۔ تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک۔ (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہوا ہونا چاہیے) لیکن یہ کم بخت دو روزہ، سہ روزہ، دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز، ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دُم تک پہنچتی ہے۔ اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ کر گویا اُسے روک ہی تو لیں گے۔ اب اگر یہ خاکسار موٹر چلا رہا ہو۔ تو قطعاً ہاتھ کام کرنے سے انکار کر دیں۔ لیکن ہر کوئی یوں ان کی جان بخشی تھوڑا ہی کر دے گا۔

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا ایک پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آ کر تبلیغ کا کام شروع کر دے تو آپ ہی کہیے ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؟

ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب)، بے ڈھنگی حرکات و سکنات (حرکات ان کی، سکنات ہماری)، اس ہنگامے میں دماغ بھلا خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے نہیں معلوم کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا؟ بہرصورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفرین رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آ کر کہہ دے کہ عالی جناب، سڑک بند ہے۔ تو خدا کی قسم ہم بغیر چون و چرا کیے واپس لوٹ جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے کتوں کی درخواست پر کئی راتیں سڑکیں ناپنے میں گزار دی ہیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔ (قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر ان کا کوئی عزیز و محترم کتا کمرے میں موجود ہو تو یہ مضمون بلند آواز سے نہ پڑھا جائے۔ مجھے کسی کی دل شکنی مطلوب نہیں)

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کیے ہیں۔ کتے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دُم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیوجانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں۔ تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورتِ حالات کو ایک نظر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا۔ تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے۔ اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی۔ تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ رستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

رات کے وقت یہی کتا اپنی خشک پتلی سی دُم کو تا بحدِ امکان سڑک پر پھیلا کر رکھتا ہے۔ اس سے محض خدا کے برگزیدہ بندوں کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔ جہاں آپ نے غلطی سے اس پر پاؤں رکھ دیا، انھوں نے غیظ و غضب کے لہجہ میں آپ سے پرسش شروع کر دی۔ "بچا فقیروں کو چھیڑتا ہے۔ نظر نہیں آتا، ہم سادھو لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔" بس اس فقیر کی بددعا سے اسی وقت رعشہ شروع ہو جاتا ہے۔ بعد میں کئی راتوں تک یہی خواب نظر آتے رہتے ہیں۔ کہ بے شمار کتے ٹانگوں سے لپٹے ہوئے ہیں اور جانے نہیں دیتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو پاؤں چارپائی کی ادوان میں پھنسے ہوتے ہیں۔

اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے تو جنونِ انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لیے کسولی پہنچ جائیں۔ ایک شعر ہے

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں　　آوازِ سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

یہی وہ خلافِ فطرت شاعری ہے جو ایشیا کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں کرتے۔" یہ بجا سہی، لیکن کون جانتا ہے کہ ایک بھونکتا ہوا کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے۔

———

اُردو کی آخری کتاب

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے۔ باپ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے۔ اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

(۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو۔

(۳) دولہا کب بنے گا۔ اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم کب بڈھے ہوں گے؟

(۵) تو کب کمائے گا؟

(۶) آپ کب کھائے گا؟ اور ہمیں کب کھلائے گا؟ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے اور کلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے جب ننھا سا ہونٹ نکال کر باقی چہرے سے رونی صورت بناتا ہے۔ تو یہ بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے۔ سلانا ہو تو افیم کھلا کر اس میں ڈال دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے (باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے) جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے۔ اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے۔ کبھی نیند میں رونے لگتا ہے تو بے چاری ممتا کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ایک ابال دیتی ہے۔ صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ دھلاتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے۔ کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ واہ۔

کھانا خود بخود پک رہا ہے

دیکھنا۔ بیوی آپ میٹھی پکا رہی ہے۔ ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز کو قرینے سے رکھتی ہے۔ دھوئے دھائے

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں۔ جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجئے! اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے۔ تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے۔ ہمارے گھر میں "موئے کبوتر باز" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے! چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ

گھگیا کر کہنے لگے۔ اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا۔ نہیں آتے۔ تم باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر کمبل ڈال کر ایک کرسی پر پاؤں سمیٹے منہ میں سگریٹ دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ بیٹھو نا۔ ہم نے کہا۔ بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے کیوں بھئی خیر باشد! ہم نے کہا۔ کچھ نہیں۔ کہنے لگے۔ اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھیں گے۔ اس لئے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن کچھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:

"مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟"

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق کل انتالی کرتے رہے۔ اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے۔ لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل، چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لئے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو کہ گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں۔ تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا۔ کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پُراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری ....." اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لئے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی: تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں چلی جاؤں؟ میں نے کہا اور کیا!

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کئے۔ یعنی اب بے شک دوست آئیں۔ بے شک اودھم مچائیں۔ میں بے شک گاؤں۔ بے شک جب چاہوں اٹھوں۔ بے شک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:

"روشن آرا جلدی کرو ورنہ گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کرا چکا تو کہنے لگی "خط ضرور لکھتے رہیے۔" میں نے کہا "ہر روز اور تم بھی؟"

پہننے پاننے کپڑے لتے ہیں خیر وہ تو گر دیکھو تو دلوں کا خدا مالک ہی میاں الگ تھلگ ہوئے
ہیں اور بی بی علیحدہ منہ پھلائے بیٹھی ہیں۔ ہفتوں صاحب سلامت ندارد۔ مہینوں گفتگو
ترک۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہی۔ اس سے کہیں بہتر ہی فاقہ اور موافقت۔ تنگی اور یکرنگی۔
[illegible] یہ بات کہ مولویت کا پیشہ فی نفسہ کیسا ہی؟ سو ابا جان بے شک اس کو نظرِ حقارت سے
دیکھتے ہیں [illegible] یہ حقارت بھی خدانخواستہ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ معاذاللہ مولوی کمینے
[illegible] ہیں۔ یا علم قدر و عزت کی چیز نہیں۔ بلکہ صرف اس
خیال سے کہ بعض مولوی ریاکار اور طماع ہیں [illegible] پیشے کی نہیں بلکہ اُن خاص لوگوں
کی [illegible] ہوئی جن میں ریاکاری اور طمع کا عیب [illegible] ہوں تو بہتیرے نوکری پیشہ رشوت
لیتے [illegible] ہیں تو کیا اس سے نوکری ذلیل سمجھی جائے گی؟ نہیں نہیں۔
ریاکاری اور طمع کا عیب بھی اکثر اُن ہی مولویوں [illegible] جو ہیں تو کٹھ ملا اور کہلاتے ہیں
مولوی۔ کہ اُن کو قصورِ استعداد کی تلافی کے لیے ناجائز تدبیروں کی ضرورت واقع ہوتی ہی
اور جو مستند عالم ہیں جیسے ہمارے نانا یا بڑے ماموں اِن پر تو ابا جان بھی کوئی حرف نہیں
لگا سکتے؟ اور گنجایش پاتے تو بھلا کہیں وہ چوکنے والے تھے؟ اگرچہ انگریزی پڑھ پڑھ کر
لوگ مولویوں کی طرف سے بدعقیدہ ہو جاتے [illegible] مگر جو سچ مچ کے مولوی ہیں ان کا خدا کے
فضل سے ابھی تک [illegible] قائم ہی اور خدا نے چاہا تو ہمیشہ ہمیشہ کو قائم رہے گا۔ لوگ
مولویوں کا ادب نہیں کرتے بلکہ سچ پوچھو تو ادب کرتے ہیں دین کا۔ ادب کرتے ہیں خدا
اور خدا کے رسول کا [illegible] تو کہتی ہوں مولوی کیسا ہی کیوں نہ ہو چاہے وہ خود اپنا ادب
[illegible] کہ آپ اپنے حال سے آگاہ ہی پھر بھی اُس کا پیٹ خدا عزت ہی سے بھرتا ہے
[illegible] اور اُسی حیثیت کے [illegible] لوگوں کو دیکھو کس مصیبت اور بے قدری
معاش پیدا [illegible] علم کو تصرف دیا ہی۔ کسی کے پاس اور کسی پیرائے میں
ہو وہ صرف اُس کو لازم ہی۔ ابا جان مولویوں پر تو اعتراض کرتے ہیں غیر مردوں کا حال
میں کیا جانوں لیکن جہاں تک عورتوں کو دیکھا اور اُن کے حالات سُنے دنیادار ور
کی عورتوں کو مولویوں کی عورتوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں۔ یہ آدمی ہیں وہ حیوان

کھانا وقت پر کھا لیا کیجیے۔ اور دُھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی۔ تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا۔ اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا۔ اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو یا وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں۔ تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگایا۔ ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں۔ اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے سن لیا نا! کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان۔ آدمی کا نام و نشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی۔ شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟"

کہنے لگا "حضور آپ جانتے ہیں۔ اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے۔

"تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی نبٹا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا "تھیٹر؟"

کہنے لگے "یہ بہت ٹھیک ہے۔ تو باہر بیٹھو، میں ابھی آیا!"

باہر کمرے میں ایک پھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی بارہ بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی۔ جمائی پہ جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا "ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا مردود کہیں کے۔ سارا دن میرا ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لئے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیئے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا۔ کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا۔ تو خدا جانے کیا خیال دل میں آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سردئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا۔ باہر نکالا۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے۔ لیکن نا معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں تم فوراً آ جاؤ!

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لئے تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے

کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مزے ہی نہیں مزے کہہ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا، بہت متین طریقے سے قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا لیا نہیں۔ اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پر بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ کوئی لطیفہ کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے!" ایک بولا "پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آ جائے گی۔" دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا۔ بادشاہ کوئی ایسا ویسا کھیل ہے، سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے!"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کے لائے۔" کوئی کہے "نہیں حضور، سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔" دوسرے نے کہا "نہیں صاحب، ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔" آخر میں بادشاہ سلامت بولے، "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا سزا تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں، کل کسی اور کی باری آ جائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئیں۔ منہ سے برقعہ الٹا تو روشن آرا! دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آ جاؤ۔ میں بہت اداس ہوں۔ اور اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے۔ سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی۔ اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی، اور پھر کہنے لگی ... لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بے ہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود از حد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک میں میں ہوں، مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکئے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"سنئے!"
"کہاں؟"
"مرے جاؤ، چلے جاؤ!"
"ناخن تراش دو!"
"بھاگ جاؤ!"
میں اس سے زیادہ کھلا ہر کروں تو آپ دیکھیے تو سہی!

مریدپور کا پیر

اکثر لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ میں اپنے وطن کا ذکر کبھی نہیں کرتا۔ بعض اس بات پر بھی حیران ہیں کہ میں اب کبھی اپنے وطن کو نہیں جاتا۔ جب کبھی لوگ مجھ سے اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ہمیشہ بات ٹال دیتا ہوں۔ اس سے لوگوں کو طرح طرح کے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہاں اس پر ایک مقدمہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے روپوش ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ وہاں کہیں ملازم تھا۔ غبن کا الزام لگا۔ ہجرت کرتے ہی بنی۔ کوئی کہتا ہے والد اس کی بدعنوانیوں کی وجہ سے گھر نہیں گھسنے دیتے۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ آج میں ان سب غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والا ہوں۔ خدا آپ پڑھنے والوں کو انصاف کی توفیق دے۔

قصہ میرے بھتیجے سے شروع ہوتا ہے۔ میرا بھتیجا یوں دیکھنے میں عام بھتیجوں سے مختلف نہیں۔ میری ہی طرح خوبیاں اس میں موجود ہیں اور اس کے علاوہ نئی پود سے تعلق رکھنے کے باعث اس میں بعض فالتو اوصاف نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک صفت تو اس میں ایسی ہے کہ آج تک ہمارے خاندان میں اس شدت کے ساتھ کبھی رونما نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ بڑوں کی عزت کرتا ہے۔ اور میں تو اس کے نزدیک بس علم و فن کا ایک دیوتا ہوں۔ یہ خبط اس کے دماغ میں کیوں سمایا ہے؟ اس کی وجہ میں یہی بتا سکتا ہوں کہ نہایت اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں میں بھی کبھی کبھی ایسا دیکھنے میں آ جاتا ہے۔ میں نے شائستہ سے شائستہ والدین کے فرزندوں کو بعض وقت بزرگوں کا اس قدر احترام کرتے دیکھا ہے کہ ان پر نیچ ذات کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔

ایک سال میں کانگریس کے جلسے میں چلا گیا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ کانگریس کا جلسہ میرے پاس چلا آیا۔ مطلب یہ کہ جس شہر میں میں موجود تھا وہیں کانگریس والوں نے بھی اپنا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی ٹھان لی۔ میں پہلے بھی اکثر جگہ یہ اعلان کر چکا ہوں اور اب بھی ببانگ دہل یہ کہنے کو تیار ہوں کہ اس میں میرا ذرا بھی قصور نہ تھا۔ بعض لوگوں کو یہ شک ہے کہ میں نے محض اپنی تسکین نخوت کے لئے کانگریس کا جلسہ اپنے پاس ہی کرا لیا۔ لیکن یہ محض حاسدوں کی بدنیتی ہے۔ بھانڈوں کو میں نے اکثر شہر میں بلوایا ہے۔ ایک مرتبہ بعض تھیٹریوں کو بھی دعوت دی ہے۔ لیکن کانگریس کے مقابلے میں میرا رویہ ہمیشہ ایک گمنام شہری کا سا رہا ہے۔ میں اس سے زیادہ اس موضوع پر کچھ نہ لکھوں گا۔

جب کانگریس کا سالانہ جلسہ بغل میں ہو رہا ہو تو کون ایسا شقی ہو گا جو وہاں جانے سے گریز کرے۔ زمانہ بھی تعطیلات اور فرصت کا تھا۔ چنانچہ میں نے شغلِ بیکاری کے طور پر اس جلسے کی ایک ایک تقریر سنی۔ دن بھر تو جلسے میں رہتا۔ رات کو گھر آ کر

اس دن کے مختصر سے حالات اپنے بھتیجے کو لکھ بھیجتا تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے

بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھتیجے صاحب میرے ہر خط کو بے حد ادب و احترام کے ساتھ رکھتے۔ بلکہ بعض بعض باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس افتتاحی تقریب سے پیشتر وہ باقاعدہ وضو بھی کر لیتے۔ خط کو خود پڑھتے۔ پھر دوستوں کو سناتے۔ پھر اخباروں کے ایجنٹ کی دکان پر مقامی لال بجھکڑوں کے حلقے میں اس کو خوب بڑھا چڑھا کر دہراتے۔ پھر مقامی اخبار کے بے حد مقامی ایڈیٹر کے حوالے کر دیتے۔ جو اسے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپ دیتا۔ اس اخبار کا نام مرید پور گزٹ ہے۔ اس کا مکمل فائل کسی کے پاس موجود نہیں۔ دو مہینے تک جاری رہا۔ پھر بعض مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کا حلیہ حسب ذیل ہے۔

رنگ گندمی۔ ناک نقشہ معمولی۔ شکل سے چور معلوم ہوتے ہیں۔ کسی صاحب کو ان کا پتہ معلوم ہو تو مرید پور کی خلافت کمیٹی کو اطلاع پہنچا دیں۔ اور عند اللہ ماجور ہوں۔ نیز کوئی صاحب ان کو ہرگز ہرگز کوئی چندہ نہ دیں ورنہ خلافت کمیٹی ذمہ دار نہ ہوگی۔

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس اخبار نے میرے ان خطوط کے بل پر اپنا ایک آدھ نمبر بھی نکال مارا۔ جو اتنی بڑی تعداد میں چھپا کہ اس کے اوراق اب تک بعض پنساریوں کی دکانوں پر نظر آتے ہیں۔ بہرحال مرید پور کے بچے بچے نے میری قابلیت۔ انشا پردازی۔ حب الوطنی اور جوش قومی کی داد دی۔ میری اجازت اور میرے علم کے بغیر مجھے مرید پور کا قومی لیڈر قرار دیا گیا۔ ایک دو شاعروں نے مجھ پر نظمیں بھی لکھیں۔ جو وقتاً فوقتاً مرید پور گزٹ میں چھپتی رہیں۔

میں اپنی اس عزت افزائی سے محض بے خبر تھا۔ سچ ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنے بھتیجے کو محض چند خطوط لکھ کر اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس قدر گھر کر لیا ہے۔ اور کسی کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی سا انسان جو ہر روز چپ چاپ سر نیچا کئے بازاروں سے گزر جاتا ہے مرید پور میں پوجا جاتا ہے۔ میں وہ خطوط لکھنے کے بعد کانگرس اور اس کے تمام متعلقات کو قطعاً فراموش کر چکا تھا۔ مرید پور گزٹ کا میں خریدار نہ تھا۔ بھتیجے نے میری بزرگی کے رعب کی وجہ سے کبھی بہ سبیل تذکرہ اتنا بھی نہ لکھ بھیجا کہ آپ لیڈر ہو گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مجھ سے یوں کہتا تو برسوں تک اس کی بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ لیکن بہرحال مجھے کچھ تو معلوم ہوتا کہ میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوں۔

کچھ عرصے بعد خون کی خرابی کی وجہ سے ملک میں جا بجا جلسے نکل آئے جس کسی کو ایک میز، ایک کرسی اور ایک گلدان میسر آیا اسی نے جلسے کا اعلان کر دیا۔ جلسوں کے اس موسم میں ایک دن مرید پور کی انجمن نوجوانان ہند کی طرف سے میرے نام اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا۔ کہ آپ کے شہر کے لوگ آپ کے دیدار کے منتظر ہیں۔ ہر کہ و مہ آپ کے روئے انور کو دیکھنے اور آپ کے پاکیزہ خیالات سے مستفید ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ مانا ملک بھر کو آپ کی ذات بابرکات کی از حد ضرورت ہے۔ لیکن وطن کا حق سب سے زیادہ ہے کیونکہ ؎

خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

اسی طرح کی تین چار براہین قاطعہ کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی گئی کہ آپ یہاں آ کر لوگوں کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کریں۔

خط پڑھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ لیکن جب ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیا۔ تو رفتہ رفتہ باشندگانِ مرید پور کی مردم شناسی کا قائل ہو گیا۔

میں ایک گمنام انسان ہوں۔ اور یہ لیڈری کا نشہ ایک لمحہ ہی میں چڑھ جاتا ہے۔ اس ایک نشے کے اندر مجھے اپنا وطن بہت ہی پیارا معلوم ہونے لگا۔ اہلِ وطن کی بے بسی پر ترس آیا۔ ایک آواز نے کہا۔ کہ ان بیچاروں کی بہبودی اور بھلائی کا ذمہ دار تو ہی ہے۔ تجھے خدا نے تدبر کی قوت بخشی ہے۔ ہزارہا انسان تیرے منتظر ہیں۔ آٹھ دس سیکڑوں لوگ تیرے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھے ہوں گے چنانچہ میں نے مرید پور کی دعوت قبول کر لی۔ اور لیڈرانہ انداز میں بذریعہ تار اطلاع دی کہ پندرہ دن کے بعد فلاں ٹرین سے مرید پور پہنچ جاؤں گا۔ اسٹیشن پر کوئی غُل نہ ہو۔ ہر ایک شخص کو چاہئیے کہ اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد جلسے کے دن تک میں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنی ہونے والی تقریر کی تیاری میں صرف کر دیا۔ طرح طرح کے فقرے دماغ میں صبح و شام پھرتے رہے۔

"ہندو اور مسلم بھائی بھائی ہیں۔"

"ہندو مسلم شیر و شکر ہیں۔"

"ہندوستان کی گاڑی کے دو پہیے۔ اے میرے دوستو ہندو اور مسلمان ہی تو ہیں۔"

"جن قوموں نے اتفاق کی رسی کو مضبوط پکڑا۔ وہ اس وقت تہذیب کے نصف النہار پر ہیں۔ جنہوں نے نفاق اور پھوٹ کی طرف رجوع کیا۔ تاریخ نے ان کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

بچپن کے زمانے میں کسی درسی کتاب میں "سنا ہے کہ دو بیل رہتے تھے اک جا" والا قصہ پڑھا تھا۔ اُسے نکال کر نئے سر سے پھر پڑھا اور اس کی تمام تفصیلات کو نوٹ کر لیا۔ پھر یاد آیا۔ کہ ایک اور کہانی بھی پڑھی تھی۔ جس میں ایک شخص مرتے وقت اپنے تمام لڑکوں کو بلا کر لکڑیوں کا ایک گٹھا ان کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ اس گٹھے کو توڑ دو۔ وہ توڑ نہیں سکتے۔ پھر اس گٹھے کو کھول کر ایک ایک لکڑی ان سب کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جسے وہ آسانی سے توڑ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ اتفاق کا سبق اپنی اولاد کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کہانی کو بھی لکھ لیا۔ تقریر کا آغاز سوچا تو کچھ اس طرح کی تمہید مناسب معلوم ہوئی۔ کہ

"پیارے ہم وطنو!

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے   فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے

نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے   یہ چاروں طرف سے ندا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم

ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

ہندوستان کے جس مایۂ ناز شاعر یعنی مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی نے آج سے کئی برس پیشتر یہ اشعار قلم بند کئے تھے۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس کے یہ الم ناک الفاظ روز بروز صحیح تر ہوتے جائیں گے۔ آج ہندوستان کی یہ حالت ہے...... وغیرہ

اس کے بعد سوچا کہ ہندوستان کی حالت کا ایک دردناک نقشہ کھینچوں گا۔ افلاس۔ غربت۔ بغض وغیرہ کی طرف اشارہ کروں گا۔ اور پھر پوچھوں گا کہ اس کی وجہ آخر کیا ہے؟ ان تمام وجوہ کو دہراؤں گا۔ جو لوگ عام طور پر بیان کرتے ہیں۔ مثلاً غیر ملکی حکومت۔

آپ ہیں مغربی تہذیب۔ لیکن میں سب کو باری باری غلط قرار دوں گا۔ اور پھر اصلی وجہ بتاؤں گا کہ اصل وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے۔ ہنوز میں اتحاد کی نصیحت کروں گا اور تقریر کو اس شعر پر ختم کروں گا۔ کہ

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس بارہ دن اسی طرح غور کرنے کے بعد میں نے اس تقریر کا ایک خاکہ سا بنا لیا۔ اور اس کو ایک کاغذ پر نقل کر لیا تاکہ جلسے میں اسے اپنے سامنے رکھ سکوں۔ وہ خاکہ کچھ اس طرح کا تھا۔

۱۔ تمہید۔ اشعار حالی (بلند اور دردناک آواز سے پڑھو)

۲۔ ہندوستان کی موجودہ حالت۔

(الف)۔ افلاس

(ب) [illegible]

(ج) قومی رہنماؤں کی خود غرضی۔

۳۔ اس کی وجہ۔

کیا غیر ملکی حکومت ہے؟ نہیں

کیا آب و ہوا ہے؟ نہیں

کیا مغربی تہذیب ہے؟ نہیں

تو پھر کیا ہے؟ (وقفہ جس کے دوران میں مسکراتے ہوئے تمام حاضرین جلسہ پر ایک نظر ڈالو)

(پھر بتاؤ کہ وجہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نفاق ہے (نعروں کے لئے وقفہ) اس کا نقشہ کھینچو۔ فسادات وغیرہ کا ذکر رقت انگیز آواز میں کرو۔

(اس کے بعد شاید چند نعرے بلند ہوں۔ ان کے لئے ذرا ٹھہر جاؤ)

(۵) خاتمہ۔ عام نصائح۔ خصوصاً اتحاد کی تلقین (شعر)

(اس کے بعد انکسار کے انداز میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ اور لوگوں کی داد کے جواب میں ایک ایک لمحے کے بعد حاضرین کو سلام کرتے رہو)

اس خاکے کو تیار کر چکنے کے بعد۔ جلسے کے دن تک ہر روز اس پر ایک نظر ڈالتا رہا۔ اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بعض معرکہ آرا فقروں کی مشق کرتا رہا۔ مسکراہٹ کے بعد کی مسکراہٹ کی خاص مشق بہم پہنچائی۔ کھڑے ہو کر دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومنے کی عادت ڈالی تاکہ تقریر کے دوران میں نگاہ سب طرف پہنچ سکے۔ اور سب لوگ اطمینان کے ساتھ ایک ایک فقرہ سن لیں۔

مرید پور کا سفر آٹھ گھنٹے کا تھا۔ رستے میں سات گاڑی کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔ لیکن وہاں انجمن نوجوانان ہند کے بعض جوشیلے ارکان استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہار پہنائے اور کچھ پھل وغیرہ کھانے کو دیئے۔ سات گاڑی سے مرید پور تک ان کے ساتھ تمام سیاسی

مسائل پر بحث کرتا رہا۔ جب گاڑی مرید پور پہنچی تو سٹیشن کے باہر کم از کم تین ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا جو متواتر نعرے لگا رہا تھا۔ میرے ساتھ جو والنٹیر تھے۔ انھوں نے کہا۔ "سر باہر نکالیئے۔ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں"۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ہار پہنائے گئے ہی تھے۔ ایک سگرٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھا تو لوگ اور بھی جوش کے ساتھ نعرہ زن ہوئے۔ بمشکل تمام باہر نکلا۔ موٹر پر مجھے سوار کرایا گیا اور جلوس جلسہ گاہ کی طرف چلا۔

جلسہ گاہ میں داخل ہوئے تو ہجوم پانچ چھ ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ جو یک آواز ہو کر میرا نام لے لے کر نعرے لگا رہا تھا۔ دائیں بائیں سُرخ سُرخ جھنڈوں پر خاکسار کی تعریف میں چند کلمات بھی درج تھے۔ مثلاً "ہندوستان کی نجات تمہیں سے ہے۔" "مرید پور کے فرزند خوش آمدید۔" "ہندوستان کو اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔"

مجھ کو اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ صدرِ جلسہ نے لوگوں کے سامنے مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور پھر اپنی تعارفی تقریر یوں شروع کی:۔

"حضرات! ہندوستان کے جس نامی اور بلند پایہ لیڈر کو آج کے جلسے میں تقریر کرنے کے لئے بلایا گیا ہے......"

تقریر کا لفظ سن کر میں نے اپنی تقریر کے تمہیدی فقروں کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت ذہن اس قدر مختلف تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا کہ نوٹ دیکھنے کی ضرورت پڑی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو نوٹ ندارد۔ ہاتھ پاؤں میں یک لخت ایک خفیف سی خنکی محسوس ہوئی۔ دل کو سنبھالا کہ ٹھہرو ابھی اور کئی جیبیں ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ رعشے کے عالم میں سب جیبیں دیکھ ڈالیں۔ لیکن وہ کاغذ کہیں نہ ملا۔ تمام ہال آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگا۔ دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کیا۔ ہونٹ خشک ہوتے محسوس ہوئے۔ دس بارہ دفعہ تمام جیبوں کو ٹٹولا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ جی چاہا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ بے بسی کے عالم میں ہونٹ کاٹنے لگا۔ صدرِ جلسہ اپنی تقریر برابر کر رہے تھے۔

"مرید پور کا شہر اس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ ہر صدی اور ہر ملک میں صرف چند ہی آدمی ایسے پیدا ہوتے ہیں جن کی ذات نوعِ انسان کے لئے......"

خدایا اب میں کیا کروں گا؟ ایک تو ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچنا ہے۔ نہیں اس سے پہلے یہ بتانا ہے کہ ہم کتنے نالائق ہیں۔ نالائق کا لفظ تو غیر موزوں ہوگا۔ جاہل کہنا چاہیئے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں۔ غیر مہذب۔

"...... ان کی اعلیٰ سیاست دانی ان کا قومی جوش اور مخلصانہ ہمدردی سے کون واقف نہیں۔ یہ سب باتیں تو خیر آپ جانتے ہیں۔ لیکن تقریر کرنے میں جو ملکہ ان کو حاصل ہے......"

ہاں وہ تقریر کاہے سے شروع ہوتی ہے؟ ہندو مسلم اتحاد پر تقریر چند نصیحتیں ضرور کرنی ہیں۔ لیکن وہ تو آخر میں ہیں۔ وہ بیچ میں مسکرانا کہاں تھا؟

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے دل ہلا دیں گے اور آپ کو خون کے آنسو رلائیں گے......"

صدرِ جلسہ کی آواز نعروں میں ڈوب گئی۔ دنیا میری آنکھوں کے سامنے تاریک ہو رہی تھی۔ اتنے میں صدر نے مجھ سے کہا۔

مجمع الفاظ یا قطعی سنائی نہ دیئے۔ اتنا محسوس ہوا کہ تقریر کا وقت سر پر آن پہنچا ہے۔ اور مجھے اپنی نشست پر سے اٹھنا ہے۔ چنانچہ ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر اٹھا۔ کچھ لڑکھڑایا۔ لیکن پھر سنبھل گیا۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ہال میں ایک شور تھا۔ میں بیہوشی سے ذرا ہی دور تھا۔ اور نعروں کی گونج ان لہروں کے شور کی طرح سنائی دے رہی تھیں جو ڈوبتے ہوئے انسان کے سر پر سے گزر رہی ہوں۔ تقریر شروع کہاں سے ہوتی ہے؟ لیڈروں کی خود غرضی بھی ضرور بیان کرنی ہے اور کیا کہنا ہے؟ ایک کہانی بھی تھی۔ "بھلا وہ لومڑی کی کہانی؟ نہیں ٹھیک ہے وہ بیل ...."

اتنے میں ہال میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ سب میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سہارے کے لئے میز کو پکڑ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ بھی میں نے میز پر رکھ دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میز بھاگنے کو ہے اور میں اسے روکے کھڑا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھول لیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ گلا خشک تھا۔ بصد مشکل میں نے یہ کہا کہ :-

"پیارے ہم وطنو!"

آواز خلاف توقع بہت ہی باریک اور منحنی سی نکلی۔ ایک دو شخص ہنس دیئے۔ میں نے گلے کو صاف کیا۔ تو اور کچھ لوگ ہنس پڑے۔ میں نے جی کڑا کر کے زور سے بولنا شروع کیا۔ پھیپھڑوں پر ایک لخت جو یوں زور ڈالا تو آواز بہت ہی بلند نکل آئی۔ اس پر بہت سے لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ ہنسی تھمی تو میں نے کہا -

"پیارے ہم وطنو!"

اس کے بعد دم لیا اور پھر کہا :-

"پیارے ہم وطنو!"

کچھ یاد نہ آیا کہ اس کے بعد کیا کہنا ہے۔ بیسیوں باتیں دماغ میں چکر لگا رہی تھیں۔ لیکن زبان تک ایک نہ آتی تھی۔

"پیارے ہم وطنو!"

اب کے لوگوں کی ہنسی سے میں جھنا گیا۔ اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا۔ ارادہ کیا کہ اس دفعہ جو منہ میں آیا کہہ دوں گا۔ ایک دفعہ تقریر شروع کر دوں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔

"پیارے ہم وطنو! بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آب و ہوا خراب ہے یعنی ایسی ہے۔ کہ ہندوستان میں بہت سے نقص ہیں .... مجھے آپ ؛ (وقفہ .....) نقص ہیں۔ لیکن یہ بات یعنی امرجس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ گویا چنداں صحیح نہیں۔" (قہقہہ)

حواس معطل ہو رہے تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر تقریر کا سلسلہ کیا تھا۔ یک لخت بیلوں کی کہانی یاد آئی اور راستہ کچھ صاف ہوتا دکھائی دیا۔

"ہاں تو بات دراصل یہ ہے کہ ایک جگہ دو بیل اکٹھے رہتے تھے جو باوجود آب و ہوا اور غیر ملکی حکومت کے -" (زور کا قہقہہ)

یہاں تک پہنچ کر محسوس کیا کہ کلام کچھ بے ربط سا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا چلو وہ لکڑی کے گٹھے کی کہانی شروع کر دیں۔

مثلاً آپ مکڑیوں کے ایک گچھے کو لیجیے۔ مکڑیاں اکثر تنتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں افلاس بہت ہے۔ گویا چونکہ اکثر لوگ غریب ہیں۔ اس لئے گویا مکڑیوں کا تماشا بھی آپ دیکھئے نا کہ اگر؟

(بلند اور طویل قہقہہ)

حضرات! اگر آپ نے عقل سے کام نہ لیا تو آپ کی قوم فنا ہو جائے گی۔ لیجیے مسٹر کانڈلار ہی ہیں (قہقہے اور شور و غوغا......

ایسے باہر نکالو۔ ہم نہیں سنتے)

شیخ سعدی نے کہا ہے کہ

چو از قومے یکے بے دانشی کرد

(آواز آئی کیا بکتا ہے) خیر اس بات کو جانے دیجیے۔ بہرحال اس بات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ: ؎

آمد بہار جل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس شعر نے دوران خون کو تیز کر دیا۔ ساتھ ہی لوگوں کا شور بھی بہت زیادہ ہو گیا۔ چنانچہ میں بڑے جوش سے بولنے لگا۔

"جو قومیں اس وقت بیداری کے آسمان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی زندگیاں لوگوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ان کی حکومتیں چاردانگ عالم کی بنیادیں ہلا رہی ہیں (لوگوں کا شور اور ہنسی اور بھی بڑھتی گئی) آپ کے لیڈروں کے کانوں پر خود غرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ زندگی کے وہ تمام شعبے......"

لیکن لوگوں کا غوغا اور قہقہے اتنے بلند ہو گئے کہ میں اپنی آواز بھی نہ سن سکتا تھا۔ اکثر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہجوم میں سے کسی شخص نے جوتوں کے پیچھے قطارے کی طرح ہمت کرکے سگرٹ کی ایک خالی ڈبیا مجھ پر پھینک دی۔ اس کے بعد چار پانچ کاغذ کی گولیاں میرے ارد گرد سٹیج پر آ گریں۔ لیکن میں نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

"حضرات! تم یاد رکھو۔ تم تباہ ہو جاؤ گے!

تم ذلیل ہو......"

لیکن جب بوچھاڑ بڑھتی ہی گئی۔ تو میں نے اس نامعقول مجمع سے کنارہ کشی ہی مناسب سمجھی۔ اسٹیج سے پھلانگا اور زقند بھر کے دروازے میں سے باہر کا رخ کیا۔ ہجوم بھی میرے پیچھے لپکا۔ میں نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا بلکہ سیدھا بھاگتا گیا۔ وقتاً فوقتاً بعض نامناسب کلمے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان کو سن کر میں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔ ایک ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں بے تحاشا اس میں گھس گیا۔ ایک لمحے کے بعد وہ ٹرین وہاں سے چل دی۔

اس دن کے بعد آج تک نہ مریدپور نے مجھے مدعو کیا ہے نہ مجھے خود وہاں جانے کی کبھی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

انجام بخیر

(منظر)

ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں بجز ایک پرانی سی میز اور ایک لنڈورا بداندام کرسی کے اور کوئی فرنیچر نہیں۔ زمین پر ایک طرف چٹائی بچھی ہے۔ جس پر بے شمار کتابوں کا انبار لگا ہے۔ اس انبار میں سے جہاں جہاں کتابوں کی پشتیں نظر آتی ہیں، وہاں شیکسپیئر، ٹالسٹائی، ورڈزورتھ وغیرہ مشاہیر کے نام دکھائی دے جاتے ہیں۔

باہر کہیں پاس ہی گھنٹے بج رہے ہیں۔ قریب ہی ایک برات اتری ہوئی ہے۔ اس کے بینڈ کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ جس سے بجانے والے دق، دمہ، کھانسی اور اسی قسم کے دیگر امراض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ ڈھول بجانے والے کی صحت البتہ اچھی ہے۔

پطرس نامی ایک نادار معلم میز پر کام کر رہا ہے۔ نوجوان ہے، لیکن چہرے پر گذشتہ تندرستی اور خوش باشی کے آثار صرف کہیں کہیں باقی ہیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے ہیں۔ چہرے سے ذہانت پسینہ بن کر ٹپک رہی ہے۔

سامنے لٹکی ہوئی ایک جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مہینے کی آخری تاریخ ہے۔

باہر سے کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ پطرس اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ تین طالب علم نہایت اعلیٰ لباس زیب تن کئے اندر داخل ہوتے ہیں۔

پطرس: حضرات اندر تشریف لے آئیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہٰذا اے میرے فرزندو۔ اس انبار سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کر لو۔ اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر چن کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی تم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی تم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کمرے میں ایک پُر اسرار نور سا چھا جاتا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

طالب علم: (تینوں مل کر) اے خدا کے برگزیدہ بندے، اے ہمارے محترم استاد! ہم تمہارا حکم ماننے کو تیار ہیں۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیے۔

(کتابوں کو چھوڑ کر اُن پر بیٹھ جاتے ہیں)

پطرس: ـ کہو اے ہندوستان کے سپوتو! آج تم کو کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

پہلا طالب علم: ـ اے نیک انسان! ہم آج تیرے احسانوں کا بدلہ دینے آئے ہیں۔

دوسرا طالب علم: ـ اے فرشتے! ہم تیری نوازشوں کا ہدیہ پیش کرنے آئے ہیں۔

تیسرا طالب علم: ـ اے ہمارے مہربان! ہم تیری مہربانیوں کا پھل تیرے پاس لائے ہیں۔

پطرس: ـ یہ نہ کہو، یہ نہ کہو! خود میری محنت ہی میری محنت کا پھل ہے۔ کالج کے مقررہ اوقات کے علاوہ جو کچھ میں نے تم کو پڑھایا۔ اس کا معاوضہ مجھے اس وقت وصول ہو گیا جب میں نے تمہاری آنکھوں میں ذکاوت چمکتی دیکھی۔ آہ تم کیا جانتے ہو کہ تعلیم و تدریس کیسا آسمانی پیشہ ہے۔ تاہم تمہارے الفاظ سے میرے دل میں ایک عجیب مسرت سی بھر گئی ہے مجھ پر عنایت کرو اور بالکل مت گھبراؤ۔ جو کچھ کہنا ہے تفصیل سے کہو۔

پہلا طالب علم: ـ (سر و قد اور دست بستہ کھڑا ہو کر) اے محترم استاد! ہم علم کی بے بہا دولت سے محروم تھے۔ درس کے مقررہ اوقات سے ہماری پیاس نہ بجھ سکتی تھی۔ پرمیں اور سول سروس کے امتحانات کی آزمائش کڑی ہے۔ تو نے ہماری دستگیری کی اور ہمارے تاریک دماغوں میں اُجالا ہو گیا۔ مقتدر معلم! تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ ہم تیری خدمتوں کا حقیر معاوضہ پیش کرنے آئے ہیں۔ تیرے عالمانہ تبحر اور تیری بزرگانہ شفقت کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ تاہم اظہارِ تشکر کے طور پر جو کم مایہ رقم ہم تیری خدمت میں پیش کریں، اُسے قبول کر کہ ہماری احسانمندی اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

پطرس: ـ تمہارے الفاظ سے ایک عجیب بیقراری میرے جسم پر طاری ہو گئی ہے۔

(پہلے طالب علم کا اشارہ پا کر باقی دو طالب علم بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باہر بینڈ یک لخت زور زور سے بجنے لگتا ہے)

پہلا طالب علم: ـ (آگے بڑھ کر) اے ہمارے مہربان مجھ حقیر کی نذر قبول کر (بڑے ادب و احترام کے ساتھ لفافہ پیش کرتا ہے)

دوسرا طالب علم: ـ (آگے بڑھ کر) اے فرشتے میرے ہدیے کو شرفِ قبولیت بخش (لفافہ پیش کرتا ہے)

تیسرا طالب علم: ـ (آگے بڑھ کر) اے نیک انسان مجھ ناچیز انسان کو مفتخر فرما (لفافہ پیش کرتا ہے)

پطرس: ـ (جذبات سے بے قابو ہو کر رقت انگیز آواز سے) اے میرے فرزندو خداوند کی رحمت تم پر نازل ہو۔ تمہاری سعادتمندی اور فرض شناسی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ تمہیں اس دنیا میں آرام اور آخرت میں نجات نصیب ہو اور خدا تمہارے سینوں کو علم کے نور سے منور رکھے (تینوں لفافیاں اٹھا کر میز پر رکھ لیتا ہے)

طالب علم: ـ (تینوں مل کر) اللہ کے برگزیدہ بندے ہم فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اب ہم اجازت چاہتے ہیں کہ گھر پر ہمارے والدین ہمارے لئے بیتاب ہوں گے۔

پطرس: ـ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہاری علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(طالب علم چلے جاتے ہیں) •

پطرس :۔ (تھوڑی دیر سر بسجود رہ کر) باری تعالیٰ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنی ناچیز محنت کے بدلے اتنے بہت سے رزق سے نوازا۔ بے شک تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن ہماری تمنائیں اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہیں۔ یہ تیرا ہی فضل و کرم ہے کہ تو میرے وسیلے سے اوروں کو بھی رزق پہنچاتا ہے اور جو ملازم میری خدمت کرتا ہے اس کا بھی کفیل تو نے مجھے ہی کر رکھا ہے۔ تیری رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور تیری بخشش ہمیشہ ہمیشہ جاری رہنے والی ہے۔

(کمرے میں پھر ایک پراسرار روشنی چھا جاتی ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد پطرس سجدے سے سر اٹھاتا ہے اور ملازم کو آواز دیتا ہے)

پطرس :۔ اے خدا کے رحمدل اور محنتی بندے! ذرا یہاں تو آئیو!

ملازم :۔ (باہر سے) اے میرے خوش خصال آقا! میں کھانا پکا کر آؤں گا۔ کیونکہ تعجیل شیطان کا کام ہے۔

(ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے کچھ لمبے ہو گئے ہیں)

پطرس :۔ آہ، انتظار کی گھڑیاں کس قدر شیریں ہیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کس خوش اسلوبی سے بینڈ کی آواز کے ساتھ مل رہی ہے۔

(سر بسجود گر پڑتا ہے)

(پھر اٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ اشرفیوں پر نظر پڑتی ہے۔ ان کو فوراً ایک کتاب کے نیچے چھپا دیتا ہے)

پطرس :۔ آہ! مجھے زر و دولت سے نفرت ہے۔ خدایا میرے دل کو دنیا کے لالچ سے پاک رکھیو!

(ملازم اندر آتا ہے)

پطرس :۔ اے مزدور پیشہ انسان! مجھے تجھ پر رحم آتا ہے کہ حرص و ظلم کی ایک کرن بھی کبھی تیرے سینے میں داخل نہ ہوئی۔ تم خداوند تعالیٰ کے دربار میں ہم تم سب برابر ہیں۔ تو جانتا ہے آج مہینے کی آخری تاریخ ہے۔ تیری تنخواہ کی ادائیگی کا وقت سر پر آ گیا۔ خوش ہو کہ آج تجھے اپنی مشقت کا معاوضہ مل جائے گا۔ یہ تین اٹھنیاں قبول کر اور باقی ساڑھے اٹھارہ روپے کے لیے کسی غیبی مدد کا انتظار کر۔ دنیا امید پر قائم ہے اور مایوسی کفر ہے۔

(ملازم اٹھنیاں زور زور سے زمین پر پھینک کر گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ بینڈ زور سے بجنے لگتا ہے)

پطرس :۔ خدایا تکبر کے گناہ سے ہم سب کو بچائے رکھ۔ اور ان نئے طبقے کے لوگوں کا سایہ ہم سے دور رکھ!

(پھر کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

باورچی خانے میں کھانا جلنے کی ہلکی ہلکی بو آ رہی ہے .... ایک طویل وقفہ جس کے دوران میں درختوں کے سائے پہلے سے چوگنے لمبے ہو گئے ہیں۔ بینڈ بدستور بج رہا ہے۔

یک لخت باہر سڑک پر موٹروں کے آ کر رک جانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

(تھوڑی دیر بعد کوئی شخص دروازے پر دستک دیتا ہے)

پطرس :۔ (کام پر سے سر اٹھا کر) اے شخص تو کون ہے!

ایک آواز: ۔ (باہر سے) حضور میں غلاموں کا غلام ہوں اور باہر دست بستہ کھڑا ہوں کہ اجازت ہو تو اندر آؤں۔ اور عرض حال کروں۔

پطرس: ۔ (دل میں) میں اس آواز سے ناآشنا ہوں۔ لیکن لہجے سے پایا جاتا ہے کہ بولنے والا کوئی شائستہ شخص ہے۔ خدایا یہ کون ہے (بلند آواز سے) اندر آجائیے۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ اور ایک شخص لباس فاخرہ پہنے اندر داخل ہوتا ہے۔ کہ چہرے سے وقار ٹپک رہا ہے۔ لیکن نظریں زمین دوز ہیں اور ادب و احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہے)

پطرس: ۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میرے پاس صرف ایک ہی کرسی ہے۔ لیکن جاہ و حشمت کا خیال بہت ہی پوچ خیال ہے۔ علم بڑی نعمت ہے۔ لہذا اے محترم اجنبی! اس انبار میں سے چند ضخیم کتابیں انتخاب کیجئے۔ اور ان کو ایک دوسرے کے اوپر تلے رکھ کر ان پر بیٹھ جاؤ۔ علم ہی ہم لوگوں کا اوڑھنا اور علم ہی ہم لوگوں کا بچھونا ہونا چاہیئے۔

اجنبی: ۔ اے برگزیدہ شخص، میں تیرے سامنے کھڑے رہنے ہی میں اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔

پطرس: ۔ تمہیں کون سے علم کی تشنگی میرے دروازے تک کشاں کشاں لے آئی؟

اجنبی: ۔ اے ذی علم محترم! گو تم میری صورت سے واقف نہیں لیکن میں شعبۂ تعلیم کا افسر اعلیٰ ہوں اور شرمندہ ہوں کہ میں آج تک کبھی نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر نہ ہوا۔ میری اس کوتاہی اور غفلت کو اپنے علم و فضل کے صدقے معاف کر دو۔

(آبدیدہ ہو جاتا ہے)

پطرس: ۔ اے خدا! کیا یہ سب وہم ہے۔ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟

اجنبی: ۔ مجھے تعجب نہیں کہ تم میرے آنے کو وہم سمجھو۔ کیونکہ آج تک ہم نے تم جیسے نیک اور برگزیدہ انسان سے اس قدر غفلت برتی کہ مجھے خود اچنبھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھ پر یقین کرو۔ میں فی الحقیقت یہاں تمہاری خدمت میں کھڑا ہوں۔ اور تمہاری آنکھیں تمہیں ہرگز دھوکا نہیں دے رہیں۔ اے شریف اور غم زدہ انسان یقین نہ ہو تو میرے چٹکی لے کر میرا امتحان کر لو۔

(پطرس اجنبی کے چٹکی لیتا ہے۔ اجنبی زور سے چیختا ہے)

پطرس: ۔ ہاں! اب مجھے کچھ کچھ یقین آگیا۔ لیکن حضور والا۔ آپ کا یہاں قدم رنجہ فرمانا میرے لئے اس قدر باعث فخر ہے کہ مجھے ڈر ہے کہیں میں دیوانہ نہ ہو جاؤں۔

اجنبی: ۔ ایسے الفاظ کہہ کر مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو اور یقین جانو کہ میں اپنی گزشتہ خطاؤں پر بہت نادم ہوں۔

پطرس: ۔ (مبہوت ہو کر) مجھے اب کیا حکم ہے؟

اجنبی: ۔ میری اتنی مجال کہاں کہ میں آپ کو حکم دوں۔ البتہ ایک عرض ہے۔ اگر آپ منظور کریں تو میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھوں۔

پطرس :- آپ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔ مگر مجھے یقین نہیں کہ یہ عالم بیداری ہے۔

(اجنبی تالی بجاتا ہے۔ چھ خدام چھ بڑے بڑے صندوق اٹھا کر اندر داخل ہوتے ہیں اور زمین پر رکھ کر بڑے ادب سے کورنش بجا کر چلے جاتے ہیں)

اجنبی :- (صندوقوں کے ڈھکنے کھول کر) میں بادشاہ معظم، شہزادہ ویلز، وائسرائے ہند اور کانگریس کی طرف سے بحیثیت ان چاروں کے ایلچی کے یہ تحائف آپ کی خدمت میں آپ کے علم و فضل کی قدردانی کے طور پر لے کر حاضر ہوا ہوں (بھرائی ہوئی آواز سے)۔ ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے۔ ورنہ ان سب کا دل ٹوٹ جائے گا۔

پطرس :- (صندوقوں کو دیکھ کر) سونا! اشرفیاں! جواہرات! سب مجھے یقین نہیں آتا (آبدیدہ ہو کر چیخنے لگتا ہے)

اجنبی :- ان کو قبول کیجئے اور مجھے مایوس واپس نہ بھیجئے (آنسو ٹپ ٹپ گرتے ہیں)

ٹھاٹا - آج موری انکھیاں نہ لاگیں۔

پطرس :- اے اجنبی! تیرے آنسو کیوں گر رہے ہیں۔ اور تو کیوں کانپ رہا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں۔ یہ تیری کمزوری کی نشانی ہے۔ خدا تجھے تقویت اور ہمت دے۔ میں خوش ہوں کہ تو اور تیرے آقا علم سے اس قدر محبت رکھتے ہیں۔ بس اب جا کر ہمارے مطالعے کا وقت ہے۔ کل کالج میں اپنے لیکچروں سے ہمیں چار پانسو روحوں کو خواب جہالت سے جگانا ہے۔

اجنبی :- (سسکیاں بھرتے ہوئے) مجھے اجازت ہو تو میں بھی حاضر ہو کر آپ کے خیالات سے مستفید ہوں۔

پطرس :- خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور تمہارے علم کی پیاس اور بھی بڑھتی رہے۔

(اجنبی رخصت ہو جاتا ہے۔ پطرس صندوقوں کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے اور پھر یک لخت مسرت کی ایک چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔ کمرے میں ایک پُراسرار نور چھا جاتا ہے اور فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ باہر بینڈ بدستور بج رہا ہے)۔

سینما کا عشق

"سینما کا عشق" عنوان تو عجب ہوس خیز ہے۔ لیکن افسوس کہ اس مضمون سے آپ کی تمام توقعات مجروح ہوں گی کیونکہ مجھے تو اس مضمون میں کچھ دل کے داغ دکھانے مقصود ہیں۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے فلموں سے دلچسپی نہیں۔ یا سینما کی موسیقی اور تاریکی میں جو ارمان انگیزی ہے، میں اس کا قائل نہیں۔ میں تو سینما کے معاملے میں اوائل عمر ہی سے بزرگوں کا مورد عتاب رہ چکا ہوں۔ لیکن آج کل ہمارے دوست مرزا صاحب کی مہربانیوں کی طفیل سینما گویا میری ایک دکھتی ہوئی رگ بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں اس کا نام سن پاتا ہوں۔ بعض درد انگیز واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ میری فطرت ہی تلخ بن گئی ہے۔

اول تو خدا کے فضل سے ہم سینما کبھی وقت پر نہیں پہنچ سکے۔ اس میں میری سستی کو زیادہ دخل نہیں۔ یہ سب قصور ہمارے دوست مرزا صاحب کا ہے جو کہنے کو تو ہمارے دوست ہیں۔ لیکن خدا شاہد ہے۔ ان کی دوستی سے جو جو نقصان ہمیں پہنچے ہیں کسی دشمن کے قبضۂ قدرت سے بھی باہر ہوں گے۔

جب سینما کا ارادہ ہو۔ ہفتہ بھر پہلے سے انہیں کہہ رکھتا ہوں کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا! میری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلے سے تیار رہیں۔ اور اپنی تمام مصروفیتیں کچھ اس ڈھب سے ترتیب دے لیں کہ جمعرات کے دن ان کے کام میں ہرج واقع نہ ہو۔ لیکن وہ جواب میں عجب قدر ناشناسی سے فرماتے ہیں:

"ارے بھئی چلیں گے کیوں نہیں! کیا ہم انسان نہیں! ہمیں تفریح کی ضرورت نہیں ہوتی؟ اور پھر کبھی ہم نے تم سے آج تک ایسی بے مروتی بھی برتی ہے۔ کہ تم نے چلنے کو کہا ہو اور ہم نے تمہارا ساتھ نہ دیا ہو؟"

ان کی تقریر سن کر میں کھسیانا سا ہو جاتا ہوں۔ کچھ دیر چپ رہتا ہوں۔ اور پھر دبی زبان سے کہتا ہوں:

"بھئی اب کے ہو سکا تو وقت پر پہنچیں گے۔ ٹھیک ہے نا!"

میری یہ بات عام طور پر ٹال دی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے ان کا ضمیر کچھ تھوڑا سا بیدار ہو جاتا ہے۔ خیر میں بھی بہت زور نہیں دیتا۔ صرف ان کو بات سمجھانے کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں۔

"کیوں بھئی سینما آج کل چھ بجے شروع ہوتا ہے نا؟"

مرزا صاحب عجب معصومیت کے انداز میں جواب دیتے ہیں: "بھئی ہمیں معلوم نہیں!"

"میرا خیال ہے چھ ہی بجے شروع ہوتا ہے؟"

"اب تمہارے خیال کی کوئی سند نہیں"

"نہیں مجھے یقین ہے۔ چھ بجے شروع ہوتا ہے۔"

"تمہیں یقین ہے تو میرا دماغ کیوں مفت میں چاٹ رہے ہو؟"

اس کے بعد آپ ہی کہئے میں کیا بولوں؟

تیر جناب جمعرات کے دن چار بجے ہی ان کے مکان کو روانہ ہو جاتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جلدی جلدی انہیں تیار کرا کے وقت پر پہنچ جائیں۔ دولت خانے پر پہنچتا ہوں تو آدم نہ آدم زاد۔ مردانے کے سب کمروں میں گھوم جاتا ہوں۔ ہر کمرے میں سے جھانکتا ہوں۔ ہر شگاف میں سے آوازیں دیتا ہوں۔ لیکن کہیں سے رسید نہیں ملتی۔ آخر تنگ آ کر ان کے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں۔ وہاں دس پندرہ منٹ سیٹیاں بجاتا رہتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ پنسل سے بلاٹنگ پیپر پر تصویریں بناتا رہتا ہوں۔ پھر سگرٹ سلگا لیتا ہوں۔ اور باہر ڈیوڑھی میں نکل کر ادھر ادھر جھانکتا ہوں۔ وہاں بدستور ہو کا عالم دیکھ کر کمرے میں واپس آ جاتا ہوں۔ اور اخبار پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ ہر کالم کے بعد مرزا صاحب کو ایک آواز دے لیتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید ساتھ کے کمرے میں یا عین اوپر کے کمرے میں تشریف لے آئے ہوں۔ سو رہے تھے تو ممکن ہے جاگ اٹھے ہوں یا نہا رہے تھے۔ تو شاید غسل خانے سے باہر نکل آئے ہوں۔ لیکن میری آواز مکان کی وسعتوں میں سے گونج کر واپس آ جاتی ہے۔ آخرکار ساڑھے پانچ بجے کے قریب زنانے سے تشریف لاتے ہیں۔ میں اپنے کھولتے ہوئے خون کو قابو میں لا کر متانت اور اخلاق کو بڑی مشکل سے مدنظر رکھ کر پوچھتا ہوں:۔

"کیوں حضرت! آپ اندر ہی تھے؟"

"ہاں اندر ہی تھا۔"

"میری آواز آپ نے نہیں سنی؟"

"اچھا یہ تم تھے! میں سمجھا کوئی اور ہے۔"

آنکھیں بند کر کے سر کو پیچھے ڈال لیتا ہوں۔ اور دانت پیس کر غصے کو پی جاتا ہوں۔ اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھتا ہوں:۔

"تو اچھا آپ چلیں گے یا نہیں؟"

"وہ کہاں؟"

"ارے بندۂ خدا آج سینما نہیں جانا؟"

"ہاں سینما، سینما (یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں) ٹھیک ہے سینما۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہے جو مجھے یاد نہیں آتی۔ اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا۔ ورنہ مجھے رات بھر الجھن رہتی۔

"تو چلو پھر اب چلیں"

"ہاں وہ تو چلیں ہی گے۔ میں سوچ رہا تھا۔ آج ذرا کپڑے بدل لیتے۔ خدا جانے دھوبی کم بخت کپڑے لایا ہے یا نہیں۔ یار اس دھوبیوں کا تو کوئی انتظام کرو۔"

مگر قتل انسانی ایک سنگین جرم نہ ہوتا تو ایسے موقع پر مجھ سے ضرور سرزد ہو جاتا۔ لیکن کیا کروں اپنی جوانی پر رحم کھاتا ہوں۔ بے بس ہوتا ہوں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ

"مرزا صاحب! للہ مجھ پر رحم کرو۔ میں سینما چلنے کو آیا ہوں۔ دھوبیوں کا انتظام کرنے نہیں آیا۔ یار بہت بدتمیز ہو۔ پونے چھ بج چکے ہیں۔ اور تم جوں کے توں بیٹھے ہو۔"

مرزا صاحب عجب مربیانہ تبسم کے ساتھ کرسی پر سے اٹھتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اچھا بھئی تمہاری طفلانہ خواہشات آخر پوری کر ہی دیں۔ چنانچہ یہ کہہ کر اندر تشریف لے جاتے ہیں کہ اچھا کپڑے پہن آؤں۔

مرزا صاحب کے کپڑے پہننے کا عمل اس قدر طویل ہے کہ اگر میرا اختیار ہوتا تو قانون کی رو سے انہیں کبھی کپڑے اتارنے ہی نہ دیتا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ کپڑے پہنے ہوئے تشریف لاتے ہیں۔ ایک پان منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ دروازے پر پہنچ کر مڑ کے جو دیکھتا ہوں تو مرزا صاحب غائب۔ پھر اندر آتا ہوں۔ مرزا صاحب کسی کونے میں کھڑے کچھ کرید کر رہے ہوتے ہیں۔

"ارے بھئی چلو۔"

"چل تو رہا ہوں یار۔ آخر اتنی بھی کیا آفت ہے؟"

"اوہ۔ یہ تم کر کیا رہے ہو؟"

"پان کے لئے ذرا تمباکو لے رہا تھا۔"

تمام رستے مرزا صاحب چہل قدمی فرماتے جاتے ہیں۔ میں ہر دو تین لمحے کے بعد اپنے آپ کو ان سے چار پانچ قدم آگے پاتا ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر جاتا ہوں۔ وہ ساتھ آ ملتے ہیں تو پھر چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ پھر آگے نکل جاتا ہوں۔ پھر ٹھہر جاتا ہوں۔ غرضیکہ گو چلتا دگنی تیز رفتار سے ہوں۔ لیکن پہنچتا ان کے ساتھ ہی ہوں۔

ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوتے ہیں تو اندھیرا گھپ۔ بہتیرا آنکھیں جھپکتا ہوں۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ادھر سے کوئی آواز دیتا ہے۔ "یہ دروازہ بند کر دو جی!" یا اللہ اب جاؤں کہاں۔ رستہ۔ کرسی۔ دیوار۔ آدمی۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا۔ ایک قدم بڑھاتا ہوں۔ تو سر ان بالٹیوں سے جا ٹکراتا ہے جو آگ بجھانے کے لئے دیوار پر لگی رہتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تاریکی میں کچھ دھندلے سے نقش دکھائی دینے لگتے ہیں۔ جہاں ذرا تاریک تر سا دھبہ دکھائی دے جائے۔ وہاں سمجھتا ہوں خالی کرسی ہو گی۔ خمیدہ پشت ہو کر اس کا رخ کرتا ہوں۔ اس کے پاؤں کو پھاند، اس کے ٹخنوں کو ٹھکرا، خواتین کے گھٹنوں سے دامن بچا، آخر کار کسی کی گود میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہاں سے نکال دیا جاتا ہوں۔ اور لوگوں کے دھکوں کی مدد سے کسی خالی کرسی تک جا پہنچتا ہوں۔ مرزا صاحب سے کہتا ہوں "میں نہ کہتا تھا کہ جلدی چلو۔ خواہ مخواہ میں ہم کو رسوا کروا دیا نا! الو کہیں کا!" اس شگفتہ بیانی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ کی کرسی پر جو حضرت بیٹھے ہیں۔ اور جن کو میں مخاطب کر رہا ہوں وہ مرزا صاحب نہیں کوئی اور بزرگ ہیں۔

اب تماشے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ فلم کونسا ہے، اس کی کہانی کیا ہے اور اب کہاں تک پہنچ چکی ہے۔ سمجھ میں صرف اس قدر آتا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جو پردے پر بغل گیر نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔ اس انتظار میں رہتا ہوں کہ کچھ لکھا ہوا سامنے آئے تو معاملہ کھلے۔ اتنے میں سامنے کی کرسی پر بیٹھے ہوئے حضرت ایک دفعہ فراخ انگڑائی لیتے ہیں۔ جس کے دوران میں کم از کم تین سو فٹ فلم گزر جاتا ہے۔ جب انگڑائی کو پیچھے ہٹاتے ہیں۔ تو پھر سر کھجانا شروع کرتے ہیں اور اس عمل کے بعد ہاتھ کو سر سے نہیں ہٹاتے۔ بلکہ بازو کو ویسے ہی اٹھائے رکھتے ہیں۔ میں مجبوراً سر کو نیچا کر کے چائے والی کے اس وسطے کے بیچ میں سے اپنی نگاہ کے لئے راستہ نکال لیتا ہوں۔ اور دام پھیلائے بیٹھے کے مقام سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہوں جیسے میں کٹ کھڑکی سے بغیر اندر گھسے تکا رہا ہوں۔ اور چمگادڑ کی طرح بیٹھا ہوا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد اگلی کرسی کی نشست پر کوئی مچھر یا پسو محسوس ہوتا ہے چنانچہ وہ دائیں طرف ذرا اونچے ہو کر بائیں طرف کو جھک جاتے ہیں۔ میں مصیبت کا مارا دوسری طرف جھک جاتا ہوں۔ ایک لمحے کے بعد وہی مچھر دوسری طرف ہجرت کر جاتا ہے چنانچہ ہم دونوں پھر سے پینترا بدل لیتے ہیں غرضیکہ یہ عمل یونہی جاری رہتا ہے۔ وہ دائیں تو میں بائیں۔ وہ بائیں تو میں دائیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ اندھیرے میں پیچھے کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ دل میں چاہتا ہے کہ اگلے درجے کا ٹکٹ لے کر ان کے آگے جا بیٹھوں اور کہوں کہ لے بیٹا دیکھوں تو اب تو کیسے فلم دیکھتا ہے۔

پیچھے سے مرزا صاحب کی آواز آتی ہے یار تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اب جو ہمیں یہاں لائے ہو تو فلم تو دیکھنے دو؟

اس کے بعد غصے میں آ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ اور قتل عمد، خودکشی، زہر خورانی وغیرہ معاملات پر غور کرنے لگتا ہوں۔ دل میں کہتا ہوں ایسی کی تیسی اس فلم کی۔ سو سو قسمیں کھاتا ہوں کہ پھر کبھی نہ آؤں گا۔ اور اگر آیا بھی تو اس کم بخت مرزا سے ذکر تک نہ کروں گا۔ پانچ چھ گھنٹے پہلے سے آ جاؤں گا۔ اوپر کے درجے میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھوں گا۔ تمام وقت اپنی نشست پر اچھلتا کودتا رہوں گا۔ بہت بڑے طرّے والی پگڑی پہن کر آؤں گا۔ اپنے اوور کوٹ کو دو چھڑیوں پر پھیلا کر لٹکا دوں گا۔ بہرحال مرزا کے پاس تک نہ پھٹکوں گا۔

لیکن اس کم بخت دل کو کیا کروں۔ اگلے ہفتے پھر کسی اچھے فلم کا اشتہار دیکھ پاتا ہوں تو سب سے پہلے مرزا کے ہاں جاتا ہوں اور گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ کہ کیوں بھئی مرزا اگلی جمعرات سینما چلو گے نا؟

غرض ان امیرزادیوں میں مَیں نے تو ایک بات بھی انسانیت کی نہ دیکھی۔ جو حرکت تھی نالائق اور جو ادا تھی بیہودہ۔ مَیں اِن امیرزادیوں کو دیکھ دیکھ کر برابر یہی سوچتی تھی کہ جن کے زنان خانوں میں یہ گندگی بھری پڑی ہے۔ ان کے مردوں کی کیا کیفیت ہوگی؟ خدا ان کے سائے سے بچائے اور کسی بھلے مانس کو ان کے پڑوس میں نہ بسائے۔ عین ان کے مقابل صحن بیچ مولنوں کا دالان تھا۔ آدمی اُدھر بھی اتنے تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی مگر کیا مجال کہ کسی کی آواز سُنائی دے [illegible] پردے چھوڑ دو تو صحن میں کسی کو یہ بھی [illegible] نہ ہو کہ دالان میں کوئی [illegible] لڑکیاں تک ایسی سدھی ہوئی کہ جس کو دیکھو نچلی ماکے [illegible] سے لگی بیٹھی ہے [illegible] مانگتیں۔ کھانے کے لئے یہ غل نہیں مچاتیں۔ بیٹی کا گھر تھا اور بیٹی بھی امیر۔ بیٹی کے نام کی خاطر مولنیں خوب بن سنور کر گئی تھیں اور کپڑے اور زیور سے سب کی حیثیت درست تھی۔ قیمتی جوڑے بھاری بھاری گہنے۔ اور اپنی اپنی [illegible] مطابق کنگھی چوٹی بھی کون نہیں کرتا اور پھر ایسے موقع پر؟ لیکن بات کیا تھی ان کی ہر ایک [illegible] میں لگا چھپا [illegible] سے خوش بُو کی لپٹیں کی لپٹیں چلی آرہی ہیں مگر چوٹی سیدھی ہے پٹیاں نہیں رکھیں ہیں جوڑا نہیں۔ مہک کہے دیتی ہے کہ کپڑے [illegible] ہیں۔ کان میں پھویا نہیں۔ کپڑا قیمتی ہے مگر پردہ دار اور شرع کے مطابق [illegible] کے پہننے کا ایسا انداز ہے کہ بہت دیر تک میں ایک بیوی کی تاک میں رہی کہ ان کی بالیاں دیکھوں کس وضع کی ہیں مگر نہ دیکھ سکی پر نہ دیکھ سکی۔ دو چار بیبیاں تو جس وقت سے ڈولی سے اُتریں میں نے جب دیکھا جا نماز ہی پر بیٹھے پایا۔ مولنوں میں بھی کسی قدر بے انتظامی ہوتی تھی کہ اِدھر اُدھر بھاگی بھاگی پھرتی ہیں مگر صبح و شام۔ کہ نماز کا وقت ہوتا تھا کہ [illegible] اور ایک دم سے سب کی سب وضو کے لئے اُٹھ کھڑی ہوتی تھیں گھر والی میکے کے لحاظ سے مولنوں کا بہت خیال رکھتی تھیں ناشتے اور کھانے کے لئے [illegible] پہلے اِن ہی کو پوچھتیں مگر یہاں سے جواب ملتا کہ ہماری کیا جلدی پڑی ہے؟ مہمانوں کو کھلاؤ پلاؤ ہم تو اسی سے بہت شرمندہ ہیں کہ تم ہم سے کچھ کام نہیں لیتیں ورنہ اپنے ہی دن کے لئے ہوئے میں [illegible] ہم میں سے مہمانوں کے ہاتھ دھلاتا کوئی [illegible]

میبل اور میں

میبل لڑکیوں کے کالج میں تھی۔ لیکن ہم دونوں کیونکہ یونیورسٹی میں ایک ہی مضمون پڑھتے تھے۔ اس لئے اکثر لیکچروں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم دوست بھی تھے۔ نئی دلچسپیوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے تھے۔ تصویروں اور موسیقی کا شوق اسے بھی تھا۔ مجھے بھی ہمہ دانی کا دعویدار۔ اکثر گیلریوں یا کانسرٹوں میں اکٹھے جایا کرتے تھے۔ دونوں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ کتابوں کے متعلق باہم بحث مباحثے رہتے۔ ہم میں سے اگر ایک کوئی نئی کتاب، نیا مصنف دریافت کرتا تو دوسرے کو فوراً اس سے آگاہ کر دیتا اور پھر دونوں مل کر اس پر اچھے برے کا حکم صادر کرتے۔

لیکن اس تمام یک جہتی اور ہم آہنگی میں ایک خلش ضرور تھی۔ ہم دونوں نے بیسویں صدی میں پرورش پائی تھی۔ عورت اور مرد کی مساوات کے قائل تو ضرور تھے۔ تاہم اپنے خیالات میں اور بعض اوقات اپنے رویئے میں ہم کبھی نہ کبھی اس کی تکذیب ضرور کر دیتے تھے۔ بعض حالات کے ماتحت میبل ایسی رعایات کو اپنا حق سمجھتی جو صرف صنف ضعیف ہی کے ایک فرد کو مل سکتی ہیں۔ اور میں بعض اوقات میں محکم اور رہنمائی کا رویہ اختیار کر لیتا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ گویا ایک مرد ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہی یہ ہے۔ خصوصاً مجھے یہ احساس بہت زیادہ تکلیف دیتا تھا کہ میبل کا مطالعہ مجھ سے بہت وسیع ہے۔ اس سے میرے مردانہ وقار کو صدمہ پہنچتا تھا۔ کبھی کبھی میرے جسم کے اندر میرے ایشیائی آباؤ اجداد کا خون جوش مارتا اور دل جدید تہذیب سے باغی ہو کر مجھ سے کہتا کہ مرد اشرف المخلوقات ہے۔ اس طرف میبل عورت مرد کی مساوات کا اظہار مبالغے کے ساتھ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتوں کو کائنات کی رہبر اور مردوں کو حشرات الارض سمجھتی ہے۔

لیکن اس بات کو میں کیونکر نظر انداز کرتا کہ میبل ایک دن دس بارہ کتابیں خریدتی۔ اور ہفتہ بھر کے بعد انہیں میرے کمرے میں پھینک کر چلی جاتی اور ساتھ ہی کہہ جاتی کہ میں انہیں پڑھ چکی ہوں تم بھی پڑھ چکو گے۔ تو ان کے متعلق باتیں کریں گے۔

اول تو میرے لئے ایک ہفتہ میں دس بارہ کتابیں ختم کرنا محال تھا۔ لیکن وہ ذہن جیسے مردوں کی طرح رکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام کر کے ان سب کا پڑھ ڈالنا ممکن بھی ہوتا تو بھی ان میں دو یا تین کتابیں فلسفے یا تنقید کی ضرور ایسی ہوتیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے مجھے کافی غور و فکر کرنا ہوتا۔ چنانچہ ہفتہ بھر کی جانفشانی کے بعد مجھے ایک عورت کے سامنے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا کہ میں اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ جب تک وہ میرے کمرے میں بیٹھی رہتی میں کچھ کھسیانا سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا۔ اور وہ نہایت

حالانکہ اندر ہی اندر جوش اُوپر کو چڑھا جو کچھ کر دیتی کرتی۔ جب میں اُس کے لئے دروازہ کھولتا یا اُس کے سگرٹ کے لئے دیا سلائی جلاتا یا اپنی نشست چھوڑ کر وہ آرام دہ کرسی اس کے لئے خالی کر دیتا۔ تو وہ میری خدمات کو حق نسوانیت نہیں بلکہ حق استادی سمجھ کر قبول کرتی۔

میل کے چلے جانے کے بعد ندامت بتدریج غصے میں تبدیل ہو جاتی۔ جاہل یا مال کا ایسا سہل ہے لیکن نیک سے نیک انسان بھی ایک نہ ایک دفعہ تو ضرور نامناسب ذرائع کے استعمال پر اتر آتا ہے۔ اسے میری اخلاقی پستی سمجھئے لیکن یہی حالت میری بھی ہو گئی۔ اگلی دفعہ جب میل سے ملاقات ہوئی تو جو کتابیں میں نے نئی پڑھی تھیں۔ ان پر بھی میں نے رائے زنی شروع کر دی لیکن جو کچھ کہتا تھا سنبھل سنبھل کر کہتا تھا۔ تفصیلات کے متعلق کوئی بات نہ کہتا تھا۔ سرسری طور پر تنقید کرتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنی رائے کو جدت کا رنگ دیتا تھا۔

کسی ناول کے متعلق میل نے مجھ سے پوچھا تو جواب میں نہایت لا ابالی سے کہا۔

”ہاں اچھی ہے لیکن کچھ ایسی اچھی بھی نہیں۔ مصنف سے دور جدید کا نقطۂ نظر کچھ نبھ نہ سکا۔ لیکن پھر بھی بعض بعض حصے نہایت عمدہ ہیں۔ بڑی بلند پروازی ہے“۔

کن انکھیوں سے میل کی طرف دیکھتا گیا۔ لیکن اسے میری چالاکی بالکل معلوم نہ ہونے پائی۔ ڈرامے کے متعلق کہا کرتا تھا۔

”ہاں پڑھا تو ہے۔ لیکن ابھی تک میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ جو کچھ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے وہ اسٹیج پر جا کر بھی باقی رہے گا یا نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

اس طرح سے اپنی آن بھی قائم رہتی اور گفتگو کا بار بھی میل کے کندھوں پر ڈال دیتا۔

تنقید کی کتابوں کے بارے میں فرماتا۔

”اس نقاد پر اٹھارھویں صدی کے نقادوں کا کچھ کچھ اثر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی نامعلوم سا کہیں کہیں۔ بالکل ہلکا سا اور شاعری کے متعلق اس کا رویہ دلچسپ ہے۔ بہت دلچسپ، بہت دلچسپ“۔

رفتہ رفتہ مجھے اس فن میں کمال حاصل ہو گیا جس روانی اور نفاست کے ساتھ میں ناخواندہ کتابوں پر گفتگو کر سکتا تھا اس پر میں خود حیران رہ جاتا تھا۔ اس سے جذبات کو ایک آسودگی نصیب ہوئی۔

اب میں میل سے نہ دبتا تھا۔ اسے بھی میرے علم و فضل کا معترف ہونا پڑا۔ وہ اگر ہفتہ میں دس کتابیں پڑھتی تھی تو میں صرف دو دن کے بعد ان سب کتابوں پر رائے زنی کر سکتا تھا۔ اب اس کے سامنے ندامت کا کوئی موقع نہ تھا۔ میری مردانہ روح میں اس احساس فتح مندی سے بالیدگی سی آ گئی تھی اب میں اس کے لئے کرسی خالی کرتا یا دیا سلائی جلاتا تو عظمت و برتری کے احساس کے ساتھ جیسے ایک تجربہ کار تنومند نوجوان ایک نادان کمزور بچی کی حفاظت کر رہا ہو۔

صراط مستقیم پر چلنے والے انسان میرے اس فریب کو نہ سراہیں۔ تو نہ سراہیں۔ لیکن میں کم از کم مردوں کے طبقے سے اس کی داد ضرور چاہتا ہوں۔ خواتین میری اس حرکت کے لئے مجھ پر دوہری دوہری لعنتیں بھیجیں گی۔ کہ ایک تو میں نے مکاری اور جھوٹ سے کام لیا اور دوسرے ایک عورت کو دھوکا دیا۔ اُن کی تسلی کے لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ یقین مانیئے کئی دفعہ تنہائی میں میں نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ بعض اوقات اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی

مشکل ہو گیا کہ میں بغیر پڑھے ہی کے حیثیت جتاتا رہتا ہوں۔ میبل تو یہ سب کتابیں پڑھ چکنے کے بعد گفتگو کرتی ہے۔ تو بہر حال اس کو مجھ پر تفوق تو ضرور حاصل ہے میں اپنی کم علمی ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے نا۔ کہ وہ کتابیں نہیں پڑھتا۔ میری جہالت اس کے نزدیک نہ سہی۔ میرے اپنے نزدیک تو مسلّم ہے۔ اس خیال سے اطمینانِ قلب پھر مفقود ہو جاتا اور ساتھ آپ ایک عورت کے مقابلے میں پھر حقیر نظر آنے لگتا۔ پہلے تو میبل کو صرف ذی علم سمجھتا تھا اب وہ اپنے مقابلے میں پالیسی کی اور ریاست بازی کی دیوی بھی معلوم ہونے لگی۔

علالت کے دوران میں میرا دل زیادہ نرم ہو جاتا ہے۔ بخار کی حالت میں کوئی بازاری سا ناول پڑھتے وقت بھی بعض اوقات میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صحت یاب ہو کر مجھے اپنی اس کمزوری پر ہنسی آتی ہے۔ لیکن اس وقت اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ میری بدقسمتی کہ انہی دنوں مجھے خفیف سا انفلوئنزا ہوا۔ معمولی تھا۔ بہت تکلیف دہ بھی نہ تھا تاہم گزشتہ زندگی کے تمام چھوٹے چھوٹے گناہ، گناہ کبیرہ بن کر نظر آنے لگے۔ میبل کا خیال آیا تو ضمیر نے سخت ملامت کی اور میں بہت دیر تک بستر پر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کے وقت میبل کچھ پھول لے کر آئی۔ خیریت پوچھی۔ دوا پلائی۔ ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں نے کہا (میری آواز بھرائی ہوئی تھی) میبل مجھے خدا کے لئے معاف کر دو۔ اس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ اور اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے میں نے اپنی مکاری کی ہر ایک تفصیل بیان کر دی۔ ہر اس کتاب کا نام لیا جس پر میں نے بغیر پڑھے لمبی لمبی فاضلانہ تقریریں کی تھیں۔ میں نے کہا "میبل پچھلے ہفتے جو تین کتابیں تم مجھے دے گئی تھیں۔ ان کے متعلق میں تم سے کتنی بحث کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں نے ان کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ میں نے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہی ہوگی جس سے میرا پول تم پر کھل گیا ہوگا؟"

کہنے لگی "نہیں تو۔"

میں نے کہا "مثلاً ناول تو میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ کیریکٹروں کے متعلق میں جو کچھ بکتا رہا وہ سب من گھڑت تھا؟"

کہنے لگی "کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔"

میں نے کہا "پلاٹ کے متعلق میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ذرا ڈھیلا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا؟"

کہنے لگی "ہاں پلاٹ کہیں کہیں ڈھیلا ضرور ہے۔"

اس کے بعد میری گزشتہ فریب کاری پر وہ اور میں دونوں ہنستے رہے۔ میبل رخصت ہونے لگی تو بولی "تو وہ کتابیں میں لیتی جاؤں؟"

میں نے کہا "ایک تائب انسان کو اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔ میں نے ان کتابوں کو اب تک نہیں پڑھا لیکن اب میں انہیں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انہیں یہیں رہنے دو۔ تم تو انہیں پڑھ چکی ہو۔"

کہنے لگی "ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔ اچھا میں یہیں چھوڑ جاتی ہوں۔"

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔ تینوں میں سے کسی ایک کے ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انہیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موٹر کار کو دیکھوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے میں پڑھی تھی۔ اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"مرزا، ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ ہو گا ہی نا آخر۔"

میں نے کہا "میں بتاؤں تمہیں؟"

کہنے لگے "بولو۔"

میں نے کہا "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں۔ ہم میں اور حیوانوں میں .... کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو کہہ دو گے۔ حیوان جگالی کرتے ہیں، تم جگالی نہیں کرتے۔ ان کی دم ہوتی ہے، تمہاری دم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے افضل ہیں۔ لیکن ایک بات میں، میں اور وہ بالکل برابر ہیں۔ وہ بھی پیدل چلتے ہیں، میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں، کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل!! تم پیدل کے معنی نہیں جانتے۔ پیدل کے معنی ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے۔

یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں اور دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں۔ تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔"

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگرٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پروائی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں۔ یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں۔ یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا "اچھا مرزا یوں ہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے دانت پچی کر لیے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف تھوڑا سا سرکا دیا۔ لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔ تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے "کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا "سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

مرزا بولے "ہوں!"

اب کے مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگرٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھا لیں۔ سگرٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹاتا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں!"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے۔ مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔ لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں!"

میں نے کہا "مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے سکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی سکول یا کالج یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت تمہاری جو ذہنی کیفیت ہے اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔"

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ تو میاں صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا۔ لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے کہا "میں اپنی کئی قیمتی اشیا بیچ سکتا ہوں۔"

مرزا بولے "تو کون کون سے مشغلے؟"

میں نے کہا "ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس بیچ ڈالوں گا!"

مرزا کہنے لگے "بہت اچھا، دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائیگا!"

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے "میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو۔"

میں نے کہا "وہ روپے کا مسئلہ تو پھر جوں کا توں رہا۔"

کہنے لگے "بامفت!"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "مفت؟ وہ کیسے؟"

کہنے لگے "مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان قبول کرنا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے!"

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں اس میں معصوم بچے کی مسرت، جوانی کی خوش دلی، ابلتے ہوئے فواروں کی موسیقی، اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے، اس سے محفوظ ہوں تو میں نے پوچھا "یہ ہے کس کی؟"

مرزا بولے "میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ تم لے لو۔"

میں نے کہا "پھر کہنا۔ پھر کہنا!"

کہنے لگے "بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے۔ جب میری ہے تو تمہاری ہے۔ تم لے لو۔"

یقین مانیے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ مجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

میں نے کہا "مرزا! سب سے پہلے میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں۔ جو ابھی ابھی میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو ازحد کمینہ، ممسک، خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے اس کی گود میں سر رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

"واہ! اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے۔ جیسے میں سوار ہوا ویسے تم سوار ہوئے۔"

میں نے کہا: "مرزا مفت میں نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

مرزا کہنے لگے: "بس یہی بات سے میں ڈرتا تھا۔ تم صاحب اپنے سوا کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں۔"

میں نے کہا: "خیر کچھ بھی سہی تم مجھے اس کی قیمت بتا دو۔"

مرزا بولے: "قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی وہ تو بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔"

میں نے پوچھا: "تم نے کتنے میں خریدی تھی؟"

کہنے لگے: "میں نے پونے دو سو روپے میں لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بائیسکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لئے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔"

میں نے کہا: "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے: "نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوگی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں۔ جنہیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔"

"مگر مرزا پونے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے۔ میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔"

مرزا کہنے لگے: "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا لیکن ...."

میں نے کہا: "نہیں مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔ اچھا تم یوں کرو۔ میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جا کے گن لینا۔ اگر تمہیں منظور ہوئے تو کل بائیسکل بھیج دینا۔ ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں۔ یہ تو کچھ دکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

مرزا بولے: "بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم نہ مانو گے۔"

میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔ تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بیچارا تو بلکہ یہی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو۔ لیکن مفت میں کیسے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بود کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس یا پچاس ہوں۔ جب بھی بات ہے۔ پچاس تو ہو نہیں سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیئے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے چالیس روپے دے دوں گا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا۔ چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے اور کہا: "مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا لیکن اگر ایک

جلدی جلدی چائے پی۔ غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ غسل کیا۔ پانی بالٹی میں ڈالتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلے۔ استاد کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا "کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لئے۔"

میں نے کہا "اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا "یہی تو ہے۔"

میں نے کہا "کیا بکتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی۔ وہ بائیسکل یہی ہے؟"

کہنے لگا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "اچھا!" اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"اور تیل دیا؟"

"ہاں حضور، لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور دھروں پر میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا۔ تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیسکل ہے۔ لیکن مجموعی ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ ہل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیئے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا۔ جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا اوپر اوپر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

آخرکار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلے ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی ہموار زمین آگئی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے کولتار زمین پر بہتا ہے۔ اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چاں چوں قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ۔ کھڑ کھڑ کھڑ کے قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چر چرخ چرخ چر قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھی۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا۔ زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی۔ اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی۔ اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنے کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو مڈگارڈوں کی بدولت تمازتِ دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ ...... کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اتار پر بائیسکل ذرا زیادہ تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سو رہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو سینوں سے لگا لیا۔ کھڑ کھڑ کھڑ کے بیچ میں چوں چوں کی آواز جدا سنائی دے رہی تھی۔ چونکہ بائیسکل اب پہلے سے تیز تھی اس لئے چوں چوں پھٹ کی آواز نے اب چچوں پھٹ۔ چچوں پھٹ چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گزری۔ چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتاً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا تھا۔

گدی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کو ٹھیک کروں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آ گیا ہوں۔ جیب سے میں نے رنچ نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کے ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا۔ جو ہینڈل پر رکھے تھے۔ اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصور میں لائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگتا تھا۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لئے میری مصیبت ضیافتِ طبع کا باعث نہ ہو۔

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی۔ اور میں تمام زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے

کہتا: "دیکھو جی تم کیا کر رہے ہو؟" یا اس بلندی کے نزدیک جو کوئی ترتیب دکھائی دیتا تھا اس نے آخر کار ہینڈل اور گدی کو از سر نو کس دیں۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ ایسے لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں، بہت ہی کم ہوتے۔ اور ان میں بھی یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گدی پہلے نیچی ہو گی یا ہینڈل۔ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتے بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا۔ لیکن اس سے ہینڈل پہ اتنا بوجھ پڑتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیسکل کی اکھاڑ پچھاڑ نے ایک معین باقاعدگی اختیار کر لی تو خیال آیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لینے چاہئیں۔ چنانچہ بائیسکل کی ایک دکان پر لے گیا۔

بائیسکل کی کھڑکھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے۔ سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا: "ذرا اس کو مرمت کر دیجئے۔"

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا: "کس کس پرزے کی مرمت کرائیے گا؟"

میں نے کہا: "بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کر کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا۔ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟"

مستری کہنے لگا: "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں؟"

میں نے کہا: "ہاں، وہ بھی ٹھیک کر دو۔"

کہنے لگا: "اگر باقی چیزیں بھی کس دی جائیں تو اچھا ہو۔"

میں نے کہا: "اچھا کر دو۔"

بولا: "یوں تھوڑی ہو سکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"

"اور پیسے کتنے ہوں گے؟"

کہنے لگا: "بس تیس، پینتیس روپے لگیں گے۔"

ہم نے کہا: "بس جی۔ جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گدی پھر اونچی کر کے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا تو مستری نے کہا: "میں نے کس تو دیا ہے۔ لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا: "بدتمیز کہیں کا۔ تو دو آنے پیسے مفت میں لے لئے؟"

بولا: "جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت میں ملی ہو گی۔ یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ ....للو یہ وہی بائیسکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گزر گئیں۔ لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا: "واہ، مرزا صاحب کے والد اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے۔ اور ان کو کالج چھوڑے صرف دو سال ہی ہوئے ہیں۔"

مستری نے کہا: "ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھتے تھے۔ تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی!"

میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ دراصل بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لئے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جابجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاتا۔ اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا۔ جس میں مرزا کی مکاری۔ بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا۔ اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک دکان آئی وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کوئی چیز بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں۔ آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے۔"

دکاندار کہنے لگا "پھر؟"

میں نے کہا: "لوگے؟"

کہنے لگا: "کیا مطلب؟"

میں نے کہا: "بیچتے ہیں ہم۔"

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کونسی ہے۔ آخرکار بولا "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر؟"

ایسے سوالوں کا خدا جانے کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے۔ ان کا مصرف کیا ہوگا؟"

کہنے لگا "وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کرے گا کیا؟"

میں نے کہا "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟"

کہنے لگا "اچھا! چڑھ گیا۔ پھر؟"

میں نے کہا "پھر کیا؟ پھر چلائے اور کیا؟"

دکاندار بولا "اچھا! ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

جن حضرت کا اسم گرامی خدا بخش تھا۔ انہوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بو سونگھ رہے ہیں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے "تو آپ

سرکس کی بائیسکل ہے جس کے دونوں پہیے الگ الگ ہو گئے ہیں!"

لیکن میں بچ نکلا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عجیب سی روانی باقی تھی۔ جو بائیسکل کے پرزوں سے ایک ٹکڑا میرے پیچ و تاب کھا رہا تھا، اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں اسے اٹھائے چلتا گیا۔ حتیٰ کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے، "اندر آ جاؤ!"

میں نے کہا: "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں!"

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو انھوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عطا فرمایا تھا اور کہا،

"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید ۔ تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کرّے کو دائیں سے بائیں گھمائیے حتیٰ کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے۔ پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقامِ انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے۔ جہاں یہ نام کرّے پر مرقوم ہو وہی لاہور کا محلِ وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں لوگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے۔ مگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا۔ تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محلِ وقوع ۔ ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے۔ لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ اور جو نصف دریا ہے، وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتہ یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے۔ بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے اب یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی رستے ہیں۔ لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں۔ ایک پشاور سے آتا ہے اور دوسرا دہلی سے۔ وسط ایشیا کے حملہ آور پشاور کے رستے اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے رستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہلِ سیف کہلاتے ہیں۔ اور غزنوی اور غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں ——— اور اس میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔

حدودِ اربعہ ۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدودِ اربعہ بھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن طلبا کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہوگا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے۔ لیکن ہر ورم موادِ فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا ۔ لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں۔ جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہلِ لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ صفا دعا ۔ کے کشش قابل شہر چھا لب ہو استعمال نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جابجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں۔ جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بمد رسانی آب کے لیے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے۔ یہ سکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں سخت دقت پیش آ رہی ہے اس لیے عملی ہے تحقیق و تدقیق میں چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے۔ اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے میں ایک دریا ہو گا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی۔ اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہو گی۔ جو انتخاب کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے۔ کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جابجا نل لگا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے۔ لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی ہو جائیں گی۔ چنانچہ بعض بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں۔ تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں مناتے ہیں۔

ذرائع آمد و رفت۔ جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔ تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنایا تھا۔ یہ آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور سب سے احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں۔ جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں۔ اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں۔ اور سامنے دو چھڑ لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانک دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو تانگہ کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختہ پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں۔ تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو۔ اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جائے۔

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں۔ قصابوں کی دکانوں پر انہی کا گوشت بکتا ہے اور زین کس کر کھایا جاتا ہے۔ تانگوں میں ان کی بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دُم دار تارے سے ملتا ہے۔ کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کرتے وقت اپنی دُم کو دبا لیتا ہے اور

اس خبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک بیجا اعتدال پیدا کرلیتے ہیں تاکہ سڑک کا ہر تاریک گوشہ اور تنگ گلی کا ہر موڑ اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کو ایک ہی بار لطف اندوز ہوچکے

قابلِ دید مقامات ۔ لاہور میں قابلِ دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں۔ اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکائے جاتے ہیں۔ مثلاً "آیہ ہوشدہ" "نیا" "اچھا اور سستا مال"۔ اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً "گریجویٹ درزی ہاؤس" یا "سٹوڈنٹوں کے لیے نادر موقع" یا "کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"۔ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری ایک مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے۔ بائیں طرف حافظہ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدامِ ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی پر کسی مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیئے گئے ہیں۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں۔ اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلابِ عظیم کی ابتدا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے۔ اس لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ اور ان کے پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بہت دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے۔ کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیاہی سے خود دیوار پر نقش کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ دقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے کسی دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ پچھلی مرتبہ وہاں چارپائیوں کا اشتہار لگا تھا۔ اور لوٹتے وقت وہاں اہالیانِ لاہور کو تازہ اور سستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جہاں بحروفِ جلی "محمد علی دندان ساز" لکھا ہے۔ وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ جہاں "بجلی پانی کا بڑا ہسپتال" لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر اقبال رہتے ہیں۔ "خالص گھی کی مٹھائی" امتیاز علی صاحب تاج کا مکان ہے۔ "کرشن بیوٹی کریم" شالامار باغ کو اور "کھانسی کا مجرب نسخہ" جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت ۔ اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ بازی اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے۔ اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں۔ اس سے ادب کو بہت فروغ نصیب ہوتا ہے۔ اور فنِ تنقید ترقی کرتا ہے۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے۔ پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں۔ اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے۔ سہ پہر کو کسی سینما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے۔ اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمحِ نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے۔ جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار ۔ لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبا ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور ہزاروں کی

تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔
طلبا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اوّل جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبا عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں بعد ازاں دھوبی اور حجام کے پاس بھیجے جاتے ہیں۔ اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔ غروب آفتاب کے بعد کسی سینما یا سینما کے گرد و نواح میں:

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

شمعیں کئی ہوتی ہیں۔ لیکن سب کی تصویریں ایک البم میں جمع کرکے اپنے پاس رکھ چھوڑتے ہیں اور تعطیلات میں ایک ایک کو خط لکھتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم جلالی طلبا کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے اس لئے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لئے نکلتے ہیں اور جود و سخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انہیں راس نہیں آتی۔ اس لئے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔ تیسری قسم خیالی طلبا کی ہے۔ یہ اکثر روپ اور اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند تبادلۂ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں۔ اور آفرینش اور نفسیات جنسی کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لئے علی الصباح پانچ چھ ڈنٹر پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں۔ لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم خالی طلبا کی ہے۔ یہ طلبا کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اسی قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو ساتھ لے کر کالج میں پہنچے تھے اسے آخر تک ملوث ہونے نہیں دیتے۔ اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے۔

پچھلے چند سالوں سے طلبا کی ایک اور قسم دکھائی دینے لگی ہے۔ لیکن ان کو اچھی طرح سے دیکھنے کے لئے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے اور اگر چاہیں تو اپنی اناؤں کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اب یونیورسٹی نے کالجوں پر شرط عائد کر دی ہے کہ آئندہ صرف وہی لوگ پروفیسر مقرر کیے جائیں جو دودھ پلانے والے جانوروں میں سے ہوں۔

طبعی حالات:۔ لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

سوالات

۱۔ لاہور تمہیں کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو۔
۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں؟ اس کیلئے سزا بھی تجویز کرو۔
۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

یہ مضامین بروقت نہ ملنے کی وجہ سے ترتیب سے بچھڑ گئے ہیں۔ اس لیے بہ امر مجبوری یہاں درج کیے جاتے ہیں

غنچۂ تبسّم کے دیباچوں پر ایک نظر

نیاز مندانِ لاہور

حال ہی میں تمکین کاظمی صاحب کے مضامین کا مجموعہ موسوم بہ "غنچۂ تبسم" حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ کتاب کے شروع میں پانچ دیباچے ہیں۔ ایک دیباچہ کاظمی صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہے باقی چار دیباچے چار دیگر مشاہیر روزگار کے لکھے ہوئے ہیں۔

کچھ عرصے سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دیباچوں کا مرض ہندوستان میں بڑھ رہا ہے۔ کوئی کتاب شائع کرتے ہیں تو آج کل ہر دیباچہ لکھتا ہے حالانکہ قلم اٹھاتے ہی [illegible] کا تعارف کراتا ہے۔ مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ ان [illegible] تعجب کیا جا سکتا ہے کہ ملک میں ابھی تک جہلا کی کثرت ہے اور ہمارے اہل قلم اتنی دقیق [illegible] سمجھتے ہیں کہ جب تک ایک مصنف کے نکات اسی پلے کا دوسرا مصنف مجبوراً اشاعت لوگوں کے سامنے کھول کے نہ رکھ دے تب تک نوع انسان کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے۔ لیکن "غنچۂ تبسم" کے ایک نسخے کے ہمراہ چار چار حکمائے زبان کا پروپیگنڈا [illegible] رسالہ کرنا [illegible] تمکین کاظمی صاحب کے نام اور ان کے ادبی کارناموں سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی کم و بیش واقف ہے کیا ان کی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ جب تک چار آدمی انہیں کندھا نہ دیں وہ نقل و حرکت نہیں کر سکتے؟

اور پھر دیکھئے بھی یہ کہ ان سے نہ تو تمکین صاحب کی شان سخن طرازی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ دیباچہ نویسوں کی شان سخن فہمی کی داد [illegible] البتہ نفرت ملتی ہے۔ ہم اصول پرورش [illegible] عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ یہ شعر شروع میں شیخ سعدی کی [illegible] اس لئے ہم بہرحال ناظرین و قارئین کے [illegible] کے چند غیر معروف [illegible] اور دیباچہ نویس حضرات بہرحال اہل قلم [illegible] کے بعض برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اور ان کی جرأت اس شعر میں شیخ سعدی کہہ گئے ہیں ہم اپنے الفاظ میں زیادہ تحقیق، زیادہ زور اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والے ہیں

پہلا دیباچہ تمکین کاظمی صاحب نے بقلم خود لکھا ہے لیکن اسے دیباچہ نہیں کہا۔ "سرآغاز" کا لقب عطا فرمایا ہے۔ دوسرے دیباچے کا نام "السلام" تیسرے کا نام "تاثر" چوتھے کا نام "تعارف" اور پانچویں کا نام "تقریب" ہے۔ (ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھٹا دیباچہ نہ لکھوانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے اس طرح کا موزوں نام نہ مل سکا ہوگا) یہ [illegible] الفاظ کتاب میں جابجا پائی جاتی ہے۔ فہرست مضامین کو "فہرست" نہیں لکھا گیا ہے کتاب کی تفسیر کی عنوان "مجموعہ نگارشات" لکھا ہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جدت کے پیچھے یوں ہی ہاتھ دھو کے پڑنا تھا تو صفحے کی بجائے "چہرہ" قرطاس" اور "سطر" کے بجائے "سبیل" بجائے "اصول" اور قیمت کی بجائے "نذر" یا "ہدیہ" کیوں نہ لکھ دیا۔ اگر محض الفاظ کی وحشت ناکی سے مرعوب کرنا مقصود ہو تو پھر قاموس کے بعد کسی اور کتاب کے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے البتہ اگر ان عنوانات میں یہ خوبی ہے کہ ہر ایک کے اعداد سے کتاب کی تاریخ نکلتی ہے

ژولیدہ سے

اس قدر تمکین صاحب کے سوانح نگار کا ذکر ہے۔ چار دیباچوں میں اپنی تعریف کرنے کے بعد بھی تمکین صاحب کی تسکین نہ ہوئی تو انہوں نے خود قلم اٹھایا۔ شروع میں آٹھ صفحے کا بنام خدا فہرست شائع کر دیے ہیں۔ لیکن اللہ کا نام لینے کے بعد سنبھالا اور تین صفحوں تک اللہ ہی کی تعریف کرتے چلے گئے۔ جا بجا تاریخوں کا حوالہ ساتھ ساتھ دیا ہے تاکہ زمانہ آئندہ کے مورخ کو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ ۱۹۲۷ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۲۹ء میں میں نے یہ کیا۔ ۱۹۳۰ء اور اواخر ۱۹۳۱ء میں مصروفیت زیادہ رہی۔ اور اولی اللہ دیا ان رسائل نے مضامین کے سلسلے تقاضوں کے نام میں ہم کر دیا۔ آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"بعض مضامین کی زبان پر اکثر احباب کو اعتراض ہو گا کیونکہ اکثر جگہ میں نے عمداً دکنی زبان اور محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور خصوصاً ان مضامین میں زیادہ کوشش کی گئی ہے، جو حیدرآباد کے رسائل میں طبع ہوئے ہیں یا جن مضامین میں حیدرآباد کی تمدن و معاشرت کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔"

یہ بیجا کوشش کے نشان پر ہم نے خط خود اس لئے کھینچ دئے ہیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ تمکین صاحب نے کتنی دفعہ اور کس خوب صورتی سے کوشش کی ہے۔ ساری جملہ غالباً اسی کو کہتے ہیں۔ اگر تمکین صاحب کسی طرح کی پیشین گوئی اردو لکھنے پر مصر ہیں تو ہم ان کو یہی مشورہ دیں گے کہ وہ تیا ملک دکن کو کھینچ بھیں۔ لیکن تمکین صاحب کی انانیت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اس طرح کی گل افشانی کے بعد بھی فرماتے ہیں۔

"میری مادری زبان اردو ہے، اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔"

نہ صرف یہ بلکہ کہتے ہیں،

"میں چاہتا تو ٹھیٹھ یوپی کے محاورات استعمال کر سکتا تھا۔"

اس تبحر علمی اور اس قادر الکلامی کے باوجود صرف ایک فقرے میں اتنی کوششیں بلکہ کاوشیں کرنے کی ضرورت پھر آخر کیوں پیش آئی؟

تمکین صاحب نے اپنی کتاب میں کئی دکنی الفاظ استعمال کئے ہیں ان کے متعلق دیباچے میں فرماتے ہیں،

"بعض احباب کا خیال تھا کہ آخر میں ایک فرہنگ لگا دی جائے مگر میں اس بد ذوقی کا محتاج ہوں جنہیں ضرورت ہو گی وہ کسی حیدرآبادی سے پوچھ لیں گے یا مجھ سے دریافت کر لیں گے۔"

الحمدللہ کہ آپ کو بھی خوش مذاقی کا خیال آیا کیوں حضرت ایک کتاب کے چار چار دیباچے بد مذاقی نہیں؟ ہر دیباچے میں اپنی تعریف بلکہ بعض اوقات اپنی ڈائرکٹری تک چھپوا دینا بد مذاقی نہیں؟ ہر نوٹ میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرنا بد مذاقی نہیں؟ لیکن جو الفاظ کسی لغت میں نہ پائے جاتے ہوں ان کے معنی بتا دینا بد مذاقی ہے۔ کیا آپ کو کوئی ایسا دوست نہ ملا جو یہ کام بھی کر دیتا جہاں اتنے گرانقدر قلموں عنوان قائم کئے تھے وہاں دکنیات کا ایک اور عنوان بھی بڑھا دیتے باقی رہی آپ کی خوش مذاقی سو اس کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔ اپنے کاتب کے متعلق فرماتے ہیں کہ روز ولیس ہیں مگر،

"وہ دو چار لفظ نویس اور بے انتہا غیر پابند نہایت کم سواد ہیں جنہوں نے املے کی غلطیوں کے علاوہ جملے کے جملے چھوڑ دیئے ہیں۔"

دل کی بھڑاس بھی نکالی تو بے چارے کاتب پر جسے عالم ہونے کا دعویٰ نہ فاضل ہونے کا اور غصے کے واسطے یہ تو بتائیے کہ یہ آپ نے

اپنے میاں سے بہت لڑی تھی۔ آخر انھوں نے کہا کہ نماز کچھ ایسی چیز تو نہیں کہ جس وقت
چاہی اور جس طرح پر چاہی پڑھ لی۔ نماز خدا کی اور اُسی نے جبرئیل فرشتے کے ذریعہ سے
حضرۃ پیغمبر صاحبؐ کو سکھائی۔ حدیث میں آیا ہو کہ پہلے حضرۃ جبرئیل نے امامت کی اور
پیغمبر صاحبؐ نے مقتدی بن کر جبرئیل کے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر دوسری بار حضرۃ پیغمبر
صاحب امام ہوئے اور جبرئیل مقتدی۔ پس ہم کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس طرح کی نماز تھی
جو پیغمبر صاحب نے جبرئیل سے سیکھ کر پڑھی اور پڑھائی ہے اس کا پتہ لگے حدیث کی کتابوں
سے۔ جن میں پیغمبر صاحب کے اقوال اور افعال موجود ہیں۔ نماز میں کئی باتوں کا اختلاف
ہی۔ اول تو آمین [illegible] پکار کر کہتے ہیں اور حنفی آہستہ۔ دوسرے رفع یدین کہ ہم لوگ
رکوع سے پہلے [illegible] رکوع سے [illegible] تکبیر اولی کی طرح ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔ یہ نہیں اُٹھاتے۔
تیسرے ہم امام [illegible] پیچھے ہر رکعۃ میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں یہ چپ کھڑے رہتے ہیں۔
چوتھے جلسہ [illegible] ہم لوگ دوسری اور چوتھی رکعۃ میں کھڑے ہونے سے پہلے
ذری کی ذری بیٹھ جاتے ہیں اور یہ سجدے سے اُٹھ کر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
پانچ[illegible] ہم لوگ امام کے پیچھے پانو سے پانو جوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں اور یہ ایک سے ایک
الگ [illegible] میں تو حنفیوں کے پاس بھی کچھ روایتیں ہیں
[illegible] یث ہیں مگر [illegible] کے خلاف تو کسی کتاب میں کوئی سند نہیں۔
یہ [illegible] کی ہیری [illegible] ہے۔ یہ سُن کر میں نے کہا کہ لوگ بُرا مانتے ہیں
تو کیا ضرور ہی جس طرح اور لوگ نماز پڑھتے ہیں تم اُسی طرح پڑھ لیا کرو۔ اور آخر اتنی
[illegible] سے پڑھتے ہی تھے۔ اس کا جواب اُنھوں نے ایسا برجستہ اور معقول دیا کہ میں چُپ
کی چپ رہ گئی اور سمجھ گئی حنفیوں ہی کی زیادتی ہی۔ اُنھوں نے مجکو رسان میں سمجھایا کہ
مجھ پر یہ اعتراض تو کرو نہیں کہ تم اتنی مدۃ سے حنفیوں کے طور کی نماز پڑھتے تھے۔ یہ
میری غفلۃ تھی۔ عام مسلمانوں کی طرح میں بھی جانتا تھا کہ امام ابوحنیفہ۔ امام شافعی۔
امام احمد بن حنبل۔ امام مالک۔ یہی عمارۃ دین کے چار ستون اور جسم اسلام کے چار عنصر ہیں
حق ان ہی چار میں دائر ہی۔ مجکو اپنی ذات سے تحقیقات کرنے کی کچھ ضرورۃ نہیں۔ اعد

کی نصیحتیں" جو آپ نے لکھا ہے تو یہ کاتب نے غلط کتابت کی یا آپ نے دکنی لغت کے اصول کے مطابق لکھا: اور کاتب صاحب کو کم سوادی کا قرآپ کہاں کہاں پیش کرتے پھریں گے۔ کیا ارنسٹ کے ترجمے میں "ایمبنی" کو ہر جگہ "ایڈمنان" لکھنا بھی بنی کے سر تھوپے گا: کم سوادی کوئی ایسی خاص صفت نہیں کہ صرف کاتبوں ہی میں پائی جاتی ہو۔

مولانا نیاز فتحپوری کے "اعلام" سے متعلق ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھیں۔ تین مختصر صفحوں کے اندر انہوں نے اپنی کم علمی، پریشان خیالی اور غلط نگاری کی اتنی مثالیں جمع کر دی ہیں کہ اس سے بہتر جامعیت کی مثال اردو میں مشکل سے ملتی ہے۔ دیباچے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

> "غنچۂ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ظرافت کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں۔ چونکہ میں طنزیات اور مزاحیات دونوں کو ظرافت میں شامل کرتا ہوں اس لئے میرا مقصود یہ ہے کہ دونوں رنگ کے مضامین اس مجموعے میں نظر آتے ہیں۔"

نیاز صاحب خود ہی بتائیں کہ "ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ظرافت کے سلسلے میں انہوں نے لکھے ہیں" کتنا بھونڈا فقرہ ہے۔ "سلسلے" کا لفظ جس طرح سے انہوں نے استعمال کیا ہے انتہا درجے کے عجز بیاں کی دلیل ہے۔ ہم اصلاح کے ذمہ دار نہیں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ فقرہ کو یوں لکھنا چاہئے تھا۔

> "غنچۂ تبسم" جناب تمکین کاظمی کے ظریفانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔"

اور یہ جو طنزیات اور مزاحیات کو ظرافت میں شامل کر کے لفظ بڑے بڑے جو دات سے ہم حیوانات کے سر چھوڑنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس پر ہمیں ایک کہانی یاد آئی۔ علم ریاضی کے ایک پروفیسر اپنی ماما پر ناراض ہوئے۔ دل غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن چونکہ کبھی گالی دینے کی عادت نہ تھی اس لئے اظہار ناراضگی کے لئے موزوں الفاظ نہ ملے۔ ماما کو ڈانٹنا بھی لازم تھا چنانچہ بھنا کر بولے "تم بڑی مثلث متساوی الاضلاع ہو"۔ ۔ ۔ بے چاری دبک کر رہ گئی۔

یہی حال نیاز صاحب کے اس فقرے کا ہے۔ جب انہوں نے نہایت زناٹے سے کہہ دیا کہ میں الف بے کو جیم میں شامل کرتا ہوں، تو کسی کی اب کیا مجال کہ کچھ بولے۔ نیاز صاحب نے اپنے دماغ پر آنچ بھی نہ آنے دی، ادھر میاں علم و فضل کا رعب بھی پڑ گیا۔ خود ہی اصطلاحات گھڑیں۔ ان کے مفہوم کو بھی اپنے بطن کے اندر ہی رہنے دیا۔ اور جس میں جس کو جی چاہا شامل کرتے رہے۔ اگلا فقرہ ملاحظہ ہو۔

> "اس وقت یورپ کا کوئی شعبۂ علم ایسا نہیں جس میں یہ مخصوص طرز تحریر (یعنی ہیومر) مقبول نہ ہو، خصوصیت کے ساتھ تنقید، کہ اس کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ظرافت کا گہرا رنگ شامل نہ ہو۔"

دیکھیں حضرت یہ یورپ کا ذکر بھی اسی رعب ڈالنے کے سلسلے میں کر گئے ہیں) اگر علم کے لفظ کا استعمال نیاز صاحب نے غلط نہیں کیا تو یقیناً فلسفہ، ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات، کیمیا، جغرافیہ، طبیعات، سبھی چیزیں شامل ہیں۔ خدا جانے نیاز صاحب کو ان علوم کی کون سی ایسی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں جو لطیفوں اور چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں؟ باقی رہی تنقید نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ ظرافت کے بغیر اس کی تکمیل ہی ناممکن ہے گویا اگر ایک بھی قابل قدر نقاد ہم انہیں ایسا بتا دیں جو ظرافت سے عاری ہو تو ان کا یہ دعوے پوچ ثابت ہو جائے گا۔ چونکہ نیاز صاحب کا فقرہ "اس وقت" سے شروع ہوتا ہے اس لئے ہم صرف دور حاضرہ اور اختصار کی غرض سے صرف انگریزی کے نقادوں کو پیش نظر رکھیں گے ان میں سے ٹی ایس ایلیٹ، اور جینیا وولف، میکتھر، نسفیلڈ، ڈاکٹر

ویسے پروفیسر گرنی، ولسن ناٹ، وغیرہ کی تصانیف خاص طور پر مستند مانی جاتی ہیں۔ اگر نیاز صاحب ان ناموں سے آشنا ہیں تو وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون مزاحیہ نگار ہے؟ یہ فہرست ان نقادوں کی تھی لیکن نیاز صاحب کی مراد شاید سوشل نقادوں سے ہے۔ ایچ جی ویلز نے موجودہ سوسائٹی کی تنقید میں بیسیوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ معدودے چند کو چھوڑ کر باقی کسی میں ظرافت کا نام یا اس کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ول برنارڈ شا جو دنیا کے عظیم فلاسفروں میں سے ہے اور جس نے موجودہ سوسائٹی کے کئی پہلوؤں سے نکتہ چینی کی ہے، بحیثیت سے بھی کبھی مزاحیات میں قدم نہیں رکھتا۔ نیاز صاحب نے اتنی بڑی بات منہ سے نکال دی اور یہ آپ کا شعبۂ علم اور تنقید اور تنقید کی تکمیل ہر بات میں، اپنی ٹانگ اڑا دی۔ آدھ کچی جہالت کر، اپنا مخاطب بنا رہے گئے؟ ایسی باتیں دوستوں کی صحبت میں کر لینی چاہییں۔ ان کو سپرد قلم کر کے تمام ہندوستان میں ان کی نشر و اشاعت کرنا بڈھوں کے بچپنے میں داخل ہے۔

یہ تو نیاز صاحب کے مطالعے کا حال تھا۔ اب ان کی انشا پردازی کا کمال ملاحظہ ہو سکتے ہیں:—

"جناب تمکین کاظمی نے حال ہی میں اس رنگ کو اختیار کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ وہ اس صنف ادب (یعنی ظرافت نگاری) پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

یہ "پر" آپ نے خوب لگایا۔ مراد یہ تھی کہ تمکین صاحب ہیومر لکھتے ہیں لیکن فقرے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمکین صاحب ہیومر پر لکھتے ہیں (یعنی ہیومر پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں)۔ فقرہ بہرحال مہمل ہے لیکن اگر نیاز صاحب کے الفاظ میں کم سے کم تغیر و تبدل کر کے اصلاح دی جائے تو یوں ہونا چاہیے تھا

"وہ اس صنف ادب میں بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔"

نہ یہ کہ وہ "اس صنف ادب پر بھی لکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔" اس صنف ادب "پر" لکھنے کی قابلیت تو خدا نے نیاز صاحب کو ہی عطا فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:—

"ظرافتی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیۂ جذبات کہلاتی ہے۔ سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔"

دوسرے فقرے میں "دونوں" کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پہلے فقرے میں واحد کا صیغہ۔ بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست۔ نیاز صاحب کا قول ہے کہ،

"جو محاورے یا اصطلاحات کہ اب سے کانوں میں پڑتے ہیں، ان کے خلاف اگر کوئی آواز کان میں آ جاتی ہے تو تھوڑی دیر کے لئے سماعت مشوش ہو جاتی ہے۔" ہم نیاز صاحب کی خدمت میں درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی شیر خواری کے زمانے کو یاد کریں۔ پھر اس فقرے کو پڑھیں اور پھر ہمیں بتائیں کہ ان کی سماعت کو تشویش محسوس ہوتی ہے یا نہیں؟ ہر طرح سے غیریت معلوم ہوتی ہے۔ کیا یہاں "خوبی" کی بجائے "خوبیاں" اور "ہے" کی بجائے "ہیں" نہ ہونا چاہیے؟

لیکن اس بات کو جانے دیجئے۔ یہ زبان کا مسئلہ ہے۔ اس میں اُن اہل زبان ہی کو آپس میں نپٹنے دیجئے جو صبح و شام اپنی زبان دانی کا ڈھول بجاتے رہتے ہیں۔ فقرے کے مفہوم پر غور کیجئے۔ نیاز صاحب نفسیات کا ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں اور کمال یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بیان کر گئے ہیں۔ کس بھولپن سے فرماتے ہیں کہ "ظرافتی مضامین کی بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ کہلاتی ہے۔" "کہلاتی ہے" کی بھی ایک ہی کہی۔ یہ نہ بتایا کہ کون کہتا ہے۔ بس کہہ دیا کہ کہلاتی ہے، خود بھی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے اور اس اجمال سے اثر بھی پیدا کر لیا کہ گویا ہم نے بڑے بڑے اہل الرائے کے خیالات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ (اب ہم تم اَن پڑھ لوگوں کے سامنے کس کس فلاسفر کا نام لیں، تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ کہلاتی ہے) افسوس نیاز صاحب نے یہ نہ بتایا کہ ظرافتی مضامین کی بڑی بڑی خوبیوں کی تخصیص انہوں نے کیسے کر لی؟ نہ انہوں نے کوئی مثال پیش کی ہے نہ دلیل۔ البتہ اس دعوے

حصہ کو سمجھ گیا۔ چلتے چلتے فن تنقید کی شاہراہ پر ایک سنگ میل ہی تو نصب کرنے ہیں۔ ماسی بے سود بات کی تردید کی کس طرح لے؟ البتہ اگر نیاز صاحب کبھی اس موضوع پر کوئی علیحدہ مضمون لکھیں اور اس میں اس دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کریں تو انشاء اللہ بشرط فرصت اس کا جواب عرض کیا جائے گا۔ اتنا ہم ان سے کہہ دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کا مضمون لکھنے سے پیشتر برسوں کی کتاب "موسومہ بہ خندہ" یا میریڈیتھ کا مضمون مزاح کسی سے پڑھ لیں کہ ان سے بہتر اس موضوع پر لوگوں نے لکھا ہے۔ حیرت ہے کہ نیاز صاحب جیسے "مشعر علم" کہہ کر بنتے ہوئے بھی ان کتابوں سے ابھی تک واقف نہیں۔ یہ ہم نے اس لئے فرض کر لیا کہ اگر انہوں نے ان دو مضمونوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو کم از کم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کہتے۔ ہم اور ہم جیسے کئی لوگ ابھی مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم پا رہے تھے۔ نیاز صاحب کا آفتاب شہرت نصف النہار پر تھا۔ لیکن ابھی تک اس کہنہ مشق کے مقابلے میں انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بہت کم ہے جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں ان کا دائرہ ماشاء اللہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے اگر ان کے شوق انشا پردازی کے ساتھ ساتھ ان کا علم بھی وسیع ہوتا رہتا یا کم از کم اگر وہ اپنے شوق کی جولانیوں کو اپنے دائرہ علم تک ہی محدود رکھتے تو بہت بہتر ہوتا۔

"ماثر" مولانا احسن مارہروی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے وہ یہ کہ مختصر ہے۔ شروع میں علم الاصوات کے ایک نہایت ہی سہل اور پیش پا افتادہ مسئلے کو ذرا بھونڈے طریقے سے بیان کیا ہے اور سیدھی سادی بات کو وہ الجھا دیا ہے کہ آشفتہ بیانی کو سیٹنے کے لئے احسن مارہروی کا عرفان بنا دیا ہے۔ اقتباس لکھنے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ہم انہیں کے الفاظ میں دہرائے دیتے ہیں (قارئین سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل فقرے کو ذرا غور سے پڑھیں)

"غرض یہ ہے کہ ہر زبان اپنے مراتب ترتیب میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے اور اس کی تدریجی حالت
عام تصنیف و تالیف، سیاسی لکچر، مذہبی مواعظ، روزمرہ بات چیت میں ایک دوسرے سے
جداگانہ نظر آتی ہے۔ ان سب نوعیات کے بعد تقریر و تحریر کی متانت و ظرافت ایک نوعیت خاص
ظاہر کرتی ہے جو ہر ادبی زبان میں تفنن طبع کے لئے مزدوری اور جزو لاینفک ہیں۔"

احسن صاحب علی گڑھ میں پروفیسر ادبیات ہیں۔ علی گڑھ میں نکتہ رس، قابل، ذہین اور زبان دان حضرات کی کمی نہیں۔ خدا کے لئے ان میں سے کوئی صاحب اس کا فارسی زبان کا اردو میں ترجمہ کر کے ہمیں اس کا مطلب سمجھا دیں۔ ان دو فقروں میں صرف اور نحو کی کئی غلطیاں ہیں۔ کئی الفاظ کا استعمال معنوی اعتبار سے غلط ہے لیکن اس کو گنوانے سے کیا فائدہ؟ تمکین صاحب خود ہی فرمائیں کہ کیا وہ اس فقرے کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اور اگر سمجھتے ہیں تو کیا انہوں نے خود ہی سمجھ لیا تھا یا کسی جوتشی سے اس کے معنی پوچھے ہیں۔ کیا سلاست، شگفتگی اور روانی اسی کا نام ہے؟ بہت ممکن ہے کہ ادبیات کے پروفیسر ایسی زبان لکھتے ہوں بہر حال احسن صاحب کی پروفیسریت کے سامنے اگر ہر فقرہ اس زور سے زانوئے ادب تہ کرتا ہے کہ مطلب تڑپ کر باہر نکل جاتا ہے اور الفاظ میں گتھے پڑ جاتے ہیں۔ اسی انداز کے ایک وصفے لکھ کر پروفیسر صاحب نے دیباچے کا خاتمہ ایک شعر پر کیا ہے۔

ہے غنچۂ تبسم تمکین کاظمی
ایا مذاق میں ہی نت نئے لازمی

جس طرح احسن صاحب پروفیسر ادبیات کے دیباچے میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ مختصر ہے اسی طرح احسن صاحب تلمیذ حضرت داغ کے شعر میں صرف ایک ہی خوبی ہے کہ تقطیع سے نہیں گرتا ورنہ کیا دیباچہ اور کیا شعر، "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست"۔ احسن صاحب سے ہم اور کیا کہیں، صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اگر لازمی کا لفظ آنا ایسا ہی لازمی تھا تو کاظمی کو کازمی تو لکھ لیا ہوتا کہ اس سے شعر کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا۔

دیباچہ نمبر ۲ ملا رموزی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ملا رموزی بھی تمکین صاحب کی طرح اپنے نام کے ساتھ ایم۔ کر۔ بے۔ ایس (السنتہ المشرقیہ) لکھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ کوئی علمی سند نہیں محض چند دینے رسیدوں کی علامت ہے یعنی اگر ہندوستان میں افلاس نہ ہوتا بیل، گدھے سب ایم۔ کر۔ اے۔ ایس ہو سکتے ہیں۔ اہلِ دانش کے نزدیک اس کی وقعت تو آر۔ ایس۔ وی۔ پی سے بھی کم ہے اور کچھ یہ لوگ ایم۔ کر۔ اے۔ ایس کے مخطط وہ حاملان کے اندر لندن اس التزام سے لکھتے ہیں گویا کاس جارج پنجم کے دست مبارک سے سند پائی ہے ان سے ہماری درخواست ہے کہ ابلہ فریبی کا یہ شیوہ ترک کر دیں اور نئے سال سے اپنے نام کے ساتھ یہ بے معنی حروف لکھنا چھوڑ دیں۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) لکھنے کو تو میٹرک (شکارپور) لکھنا زیادہ قدر افزائی کا موجب ہوگا۔

ملا رموزی صاحب کا دیباچہ بھی اسی بے ربطی کا آئینہ ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی لاہور والی تقریر میں کیا تھا نیاز صاحب کی طرح ملا رموزی صاحب نے بھی ظرافت نگاری پر افکارِ عالیہ کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ظریف تحریر وہ جو پڑھنے والے کو اس موقع پر ہنسا دے جہاں ہنسنے کے لئے اس کا دل نہ چاہتا ہو۔
اور ظریف وہ جو دوسرے سے ہنسی پیدا کرنے والی تحریر لکھتا چلا جائے اور یہ نہ سمجھے کہ میں ظریف
تحریر لکھ رہا ہوں۔"

ماشاء اللہ کیا حقائق بیان کئے جناب نے! گویا ظریف تحریر وہ ہے جو پڑھنے والے کو ہنسا دے۔ (یہ نکتہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی کے وہم میں انتظار کر رہا تھا کہ بیسوی صدی میں ایک ملا رموزی پیدا ہوں گے جو اسے معرضِ ظہور میں لائیں گے) ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ہنسا رہا ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہر بڑے سے بڑا بے وقوف، ہر نادان بچہ، ہر غلط سلط اردو بولنے والا انگریز ظریف ہے کیونکہ ان لوگوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم ہنسا رہے ہیں، اور اگر ان کی باتیں بعینہٖ لکھ لی جائیں تو ہنسی کا سامان بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ملا رموزی دراصل کہنا کچھ چاہتے تھے منہ سے نکل کچھ گیا (دیباچہ نویسوں میں یہ نقص اکثر پایا جاتا ہے) مطلب ان کا یہ تھا کہ ظریف وہ ہے جس کی تحریر پر ہنسی تو آئے لیکن اس میں ہنسانے کی کوشش نمایاں طور پر ظاہر نہ ہو۔ یہ معیار ایک حد تک صحیح ہے لیکن افسوس کہ ملا رموزی خود اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ دیباچے کا پہلا ہی فقرہ پڑھئے

"اگر کوئیں کے بار بار گہری اور تہہ کے بار بار چوڑی نظر سے دیکھا جائے تو۔۔۔۔"

اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس فقرے کو ظریفانہ فقرہ سمجھ کر ایک قہقہہ لگائیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہمارے اخلاق کی بہت بڑی آزمائش ہے۔
ملا رموزی صاحب بہت لکھنے کو انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں چنانچہ اسی سے اپنے اور تمکین صاحب اور سالک صاحب کے مداح ہیں فرماتے ہیں:—

"ہم تو مولوی تمکین کاظمی کی مضمون نگاری کے قائل ہوئے تو اسی لئے کہ انہیں جب دیکھا یہی
کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں۔"

ملا رموزی صاحب نے خود بھی مدت سے یہی شیوہ اختیار کر لیا ہے کہ بس لکھ رہے ہیں اور چھپوا رہے ہیں اس سے حضرت ضیاء الملک کی نظرِ انتخاب بہت کمزور ہو گئی ہے جب مضمون نگاری کا معراج یہی فرض کر لیا جائے کہ انسان روزانہ دو تین سو مضمون لکھ ڈالے تو وزن پورا کرنے کے لئے ادھر ادھر کی بے ربط باتیں کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔
رموزی صاحب نے اس دیباچے میں کئی جگہ بدذوقی کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ انہوں نے دیباچہ ظریفانہ رنگ میں لکھنے کی کوشش کی

ہے اس لئے ہم ایسی باتوں کو مذاق سمجھ کر ان سے درگزر کرتے ہیں۔ البتہ ایک بد ذوقی ایسی ہے کہ خود ظرافت بھی اسے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے سکتا۔ انہوں نے شہاب صاحب کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے وہ رنجہ قابلِ نفرین ہے۔ کسی شخص کے جسمانی نقائص کی ہنسی اڑانا خواہ وہ بھی ایک کتاب کے صفحے پر کسی مہذب طبقے میں جائز نہیں۔ یہ بات ہے تو کل کو آپ اندھوں اور کانوں اور لولوں اور لنگڑوں کی بھی ہنسی اڑائیں گے اور اسی ظرافت نگاری پر فخر کریں گے۔ یہ ظرافت جہلا کی ظرافت ہے۔ شرفا کے لئے اور بے شمار باتیں ہنسنے اور طنز کرنے کو موجود ہیں۔ ان پر طبع آزمائی کیجئے۔ فاضل الہیات کو کم از کم اخلاقیات سے تو واقف ہونا چاہیے۔

چونکہ یہ دیباچہ رموزی صاحب نے ظرافت آمیز رنگ میں لکھا ہے اس لئے تمکین صاحب کو خیال ہوا کہ ہم بھلا کیوں پیچھے رہ جائیں۔ جہاں جہاں رموزی صاحب نے کوئی مذاق کی بات کی وہیں آپ بھی نیچے ایک نوٹ دے کر دنیا کو یاد دلاتے چلے گئے کہ "اس ہنسی مذاق میں کہیں آپ نہ بھول جائیے۔ ملا صاحب ظرافت نگار سہی، لیکن کتاب تو بہرحال ہماری ہے۔" ملا رموزی نے کہا: "مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ تمکین صاحب کے اندر مہمان نوازی کی صلاحیت ہے یا نہیں۔" آپ نے اس پر نوٹ چڑھایا کہ "قطعاً صلاحیت نہیں ورنہ ضرور آپ کو حیدرآباد دکھاتا۔" (سخن سنج لوٹ لوٹ گئے۔ ہا ہا ہا)۔ ملا صاحب نے کہا: "آپ شیروانی کیوں پہنتے ہیں اور کوٹ سے کیوں نفرت ہے؟" آپ نے فوراً خوش تکلم سے جواب دیا کہ "میں کبھی کوٹ پتلون بھی پہنتا ہوں۔" (ہا ہا ہا)۔ ملا صاحب نے کہا: "ان مضامین کو حاصل کر کے دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو جیے۔" آپ نے نوٹ ایزاد کیا کہ "مسلمانوں عزت حاصل کرو۔" (ہا ہا ہا) ملا صاحب نے کہا: "اللہ انہیں منصب دار بنا دے۔" آپ نے جھٹ تصحیح کی کہ "آپ کی دعا سے منصب تو ہیں اب بھی ہے۔" دفتر مرفہ الحال لوگ فوراً مرعوب ہو گئے۔ (سبحان اللہ کیا ادبی پھلجھڑیاں ہیں۔

"تقریب" کے لکھنے والے مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بھی تمکین صاحب اور ملا رموزی کی طرح باکمال ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن) ہیں۔ ان میں صراحتہً انانیت باقی دیباچہ نویسوں کے مقابلے میں کم ہے لیکن کنایتہً اور عالمِ علم میں یہ بھی ویسے ہی بلند آہنگ ہیں۔ زورِ قلم خود نمائی کی بہ نسبت دوست نوازی میں زیادہ صرف کیا ہے تاہم ایک تمکین صاحب کی عظمت ثابت کرنے کے لئے وکٹر ہیوگو، ہربرٹ سپنسر، میتھیو آرنلڈ، کارلائل، رسکن، لنکن اور ایمرسن کے اقوال نقل کر کر کے ان مشاہیر کو مفت میں رسوا کیا اور اپنے دوست کو نہایت نیک نیتی کے ساتھ مضحکہ انگیز بنا دیا۔ اقتباسات کے نقل کرنے میں سعیدی صاحب کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا قول نقل کیا تو وہ غلط (اور اس کے معنی بھی غلط سمجھے) اور لنکن کا قول نقل کیا تو وہ غلط۔

حسن اور ہوی صاحب کی طرح سعیدی صاحب کا مذاق شعر بھی قابلِ ذکر ہے۔ غالب کا ایک مصرعہ نقل کیا کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" تو "حسن پرستی" کو "عشق پرستی" بنا دیا۔ اس کے علاوہ تین شعروں کو زینتِ کلام بنایا ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:

بتو شاباش کیا کہنا ترقی اس کو کہتے ہیں
نہ تر شکلے تو پتھر تھے جو ترشے تو خدا ٹھہرے

دوسرا مصرعہ آخر پھر بھی گنگنانے کے قابل ہے لیکن پہلے مصرعے میں جیسے بیلوں سے بھرتی کی گئی ہے۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو:

زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا
اسی کو اہلِ جہاں انقلاب کہتے ہیں

اگر سعیدی صاحب کو اسی پائے کے اشعار یاد رکھنے اور دہرانے کا شوق ہے تو مندرجہ ذیل شعر بھی نوٹ کر لیں کسی اور دیباچے میں کام آئے گا۔

ابھی سفید تھے بال اور ابھی سیاہ ہوئے
اسی کو لوگ عمر مختصاب کہتے ہیں!

تیسرا شعر البتہ اچھا ہے احساس کے اچھا ہونے کی وجہ سے سیدی صاحب کچھ ایسے تذبذب میں پڑ گئے کہ انہوں نے اس کے نیچے جملہ قوسین میں اقبال کا نام لکھ دیا تاکہ پڑھنے والے سیدی صاحب کو اس سے بری الذمہ سمجھیں۔

اس دیباچے کے پہلے حصے میں تمکین صاحب کے خاندانی حالات بالوضاحت بیان کئے گئے ہیں۔ ہم تمکین صاحب کے بزرگوں کو صاحب قابل احترام سمجھتے ہیں۔ اور ان کی شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا پرلے درجے کی شقاوت۔ لیکن انہی کے احترام کی وجہ سے یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر یہ حصہ حذف کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔ آخر اولاد کے گناہوں کی سزا آباؤ اجداد کیوں بھگتیں اور پھر یہ بات بھی بے محل کی جائے تو یہ معلوم ہوتی ہے تمکین صاحب آخر کہاں کے اتنے بڑے مصنف ہیں اور ان کی تحریریں ایسی بھی کیا خیال انگیز ہیں کہ پڑھنے والے ان کے خاندانی حالات بالوضاحت معلوم کرنے کے لئے بیقرار ہو جائیں۔

دوسرے حصے میں سیدی صاحب نے اردو کے مزاحیہ نگاروں پر طرز و فنی تنقید کی ہے یا تنقید کرنے کی کوشش فرمائی ہے سیدی صاحب کے پاس خیالات کی قیمت ہے اسی لئے بے چارے کسی کی تعریف کرتے وقت بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ تنقید کے تین چار نمونے ملاحظہ ہوں:۔

(۱) اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا اور عمدگی سے لکھتے رہے۔

(۲) پطرس نے لائٹ ہیومر لکھا اور خوب لکھا۔

(۳) فرحت اللہ بیگ نے بھی لائٹ ہیومر لکھنا شروع کیا اور خوب لکھا۔

(۴) امتیاز علی تاج صاحب نے بھی "چچا چھکن" کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھتے رہے۔

اس کے بعد ہم سوا ئے اس کے اور کیا کہیں کہ حضرت آپ نے بھی تنقید کا سلسلہ شروع کیا اور خوب لکھا لیکن باوجود اس کم مائیگی کے (یا شاید اسی کم مائیگی کی وجہ سے) معمولی سی بات کو بھی عالمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں مثلاً

"اردو ادبیات کا مطالعہ گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اس فن کو اردو میں مستقل طور پر سب سے پہلے منشی سجاد حسین نے اختیار کیا۔"

اتنی ذرا سی بات کے معلوم کرنے کے لئے جس سے ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا کچھ واقف ہے "اردو ادبیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا" "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے مصداق ہے۔ یہ شغل سیدی صاحب ہی کو مبارک ہو۔ ایک اور جگہ حق دوستی یوں ادا کیا ہے:۔

"بہرحال میں خوش ہوں کہ آج وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو ہر حیثیت سے کامل ہے۔"

ذکر تمکین صاحب کے مجموعۂ مضامین کا ہے لیکن فقرہ وہ استعمال کیا ہے جو اکثر پیغمبر بھی اپنے صحیفوں کے متعلق استعمال کرتے ہوئے متامل ہوں سیدی صاحب شاید کامل کے معنی نہیں جانتے تھے انہوں نے اسے بھی "خوب" اور "عمدہ" کی قسم کا ایک معمولی لفظ سمجھ لیا ہے۔ آخر میں سیدی صاحب نے تمکین صاحب کے ساتھ حسد اور بغض رکھنے والوں کے خلاف جن کی تعداد بقول ان کے بہت کافی ہو گئی ہے، بہت کچھ زہر اگلا ہے چونکہ ہم ان حاسدوں کے نام تک سے واقف نہیں نہ ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی تمکین صاحب کے ساتھ رشک اور حسد اور بغض رکھے۔ تو کیوں۔ اس لئے ہمیں سیدی صاحب کے زور دار فقروں میں بجز چند چٹپٹے پن اور سونے ہضم کے اور کچھ نظر نہیں آتا مگر ہمیں سیدی صاحب سے اتنا پوچھنا اتفاق ہے جو لوگ تمکین صاحب سے رشک

کرتے ہیں ان کی یہ حالت واقعی قابلِ افسوس ہے۔

آخر میں ہم نہایت واضح طور پر قارئین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان پانچ حضرات سے معاذ اللہ کوئی ذاتی عناد نہیں۔ عناد کیا معنی ہمیں تو افسوس ہے کہ ہمیں ملاقات تک کا شرف حاصل نہیں۔ لیکن جب یہ پانچوں سوار ایک ساتھ میدانِ ادب میں اترتے ہیں اور اپنے گھوڑوں کی رنگ خوردہ تلواروں اور ٹوٹے ہوئے دسوسہ سا زوسامان کے ہمراہ خوش منظروں کے ساتھ رواجِ ادب اور مذاقِ سلیم کو دعوتِ مبارزت دیتے ہیں تو ہر عاقل و بالغ کا فرض ہے کہ اس دعوت کا جواب دے۔ ہماری اپنی رائے ان پانچ انشا پردازوں کی تصنیفات کے متعلق یہ ہے کہ یہ لوگ اچھا بھی لکھتے ہیں اچھا بھی سکتے ہیں جب ہندوستان میں ادب و انشا کی یہ حالت ہے کہ ہر قبیلے بُرے کی کھپت ہو سکتی ہے تو ہم ان پر کیوں معترض ہوں؟ لیکن جب یہ لوگ تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں اس وثوق کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کی نخوت کے مقابلے میں چھپا کرنا ان پر احسان اور دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا ہے۔ تمکین صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی ترقی پسند موسیقی۔ متانت اور شرافت کے ساتھ اسے بازار میں بیچ دیتے۔ صحیح آرا سے مستفید ہوتے غلط آرا کو نظر انداز کر دیتے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ان کے اخلاق کی اکثر پڑھنے والے لوگ کتاب کی تعریف نہ کرتے لیکن انہوں نے کتاب کیا لکھی ہے کتاب کا جلوس نکالا ہے ایک صاحب ذوق انشا پرداز کو اس قسم کی سوقیانہ حرکات سے گریز واجب ہے۔ دیباچہ نویسوں کی مذمت میں ہماری مودبانہ عرض ہے کہ شوقِ مقبولیت علم کی کھیں۔ چلو بھر پانی میں گز بھر نہ اچھل پڑیں۔ عالم دین ہے جس کا انداز گر بہر طالب العلم ہے بڑے بڑے دعوے کرنا اور ایک دو نظم سے جو نکل جاتے ہیں ان کو اتنی ایک کا محتاج دیکھنا حیات کی نشانیاں ہیں یہ لنکن کا قول ہے۔

"تم کچھ لوگوں کو ہمیشہ کے لئے اور سب لوگوں کو تھوڑے عرصہ کے لئے دھوکا دے سکتے ہو، لیکن

سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اس مضمون سے نصاحبانِ زیرِ بحث کو تکلیف بھی ہوگی اور شرم بھی آئے گی۔ اگر شرم تکلیف پر غالب آگئی تو ہم ان کے جواب سے محروم رہ جائیں گے اگر تکلیف شرم پر غالب آئی تو حیدرآباد، مجبور، بھوپال، علی گڑھ اور لکھنؤ میں "تائیدِ قلمِ دان" کی آوازیں بلند ہوں گی تو ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ آپس بائیں شائیں کرنے کی بجائے چپ رہنا بہتر ہے آگے آپ خود سوچ لیجئے۔ ہماری طرف سے خواہ آپ سب حضرات کسی مرکزی مقام پر سرجوڑ کر کوئی جواب مرتب کر لیجئے خواہ الگ الگ جزو آزمائی کیجئے۔ ہم ہر طرح سے تیار ہیں۔ ہم تو طالب ہیں۔ چنانچہ ہم تو کھلے منتظر ہیں۔

باقی رہا "نخچیرِ تبسم"۔ یہ کتاب ایک قابلِ احترام بزرگ کی تصویر سے شروع ہوتی ہے اور ایک ایسے مضمون پر ختم ہوتی ہے۔ جو بلند اور فراخشات سے پُر ہے۔ اس مضمون میں تمکین صاحب نے جس لوک شاستری ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کے آثار نہ صرف ان کے باقی مضامین میں بلکہ ہندوستان کے اکثر مزاحیہ نگاروں کی تحریرات میں پائے جاتے ہیں۔ ان پر تنقید ہمارا ان کے تعلق کو اور زیادہ پھیلانا ہے۔

انارکلی، مخلص صاحب اور ہم نیاز مند

نیاز مندانِ لاہور

دسمبر ۱۹۳۰ء کے رسالہ ساقی میں "انارکلی پر ایک نوٹ" کے عنوان سے "ایک مخلص کے قلم سے" ایک مضمون چھپا ہے جو واقعی بے حد دلچسپ ہے۔ مضمون کا رقبہ ساڑھے آٹھ صفحے ہے لیکن فی مربع میل کے حساب سے خیالات کی مقدار یا آبادی بہت زیادہ نہیں۔ جہاں تک بدگوئی کا تعلق ہے مضمون نگار صاحب ہر سطر میں گز گز بھر اچھلے پڑتے ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے وسعتِ مطالعہ بیچ بھر سے بھی زیادہ نہیں، اور جتنی بھی ہے اس میں وہ خود باوجود اپنی سبک خیالی کے ادب مرتبے سے قاصر ہیں۔

تو پہلے بدگوئی کو لیجیے۔ کیونکہ مخلص صاحب نے اپنا زورِ قلم زیادہ تر اسی صنفِ ادب یعنی بے ادبی پر صرف کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انارکلی پڑھنے کے ساتھ ہی مخلص صاحب کو بدہضمی کی شکایت لاحق ہوگئی۔ چنانچہ ان کی بے قرار روح صحافت والت کی ذریعہ آوازیں نکالتی ہے۔ لکھتے ہیں انارکلی پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ انارکلی کی موت سے زیادہ خود تاج صاحب کی حالت پر رونا آتا ہے۔ وہ بجائے مبارکباد کے کسی اور بات کے مستحق ہیں۔ طبیعت چاہتی ہے کہ تاج صاحب آئندہ اس سفاکی سے لٹریچر کا خون نہ بہائیں تو بڑا احسان ہوگا۔ بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ وہ "تنقاد مرہ، مدیر" سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ انارکلی کو فقط لڑنا ہی بھاری پتھر نہیں جو چوم کے چھوڑ دے تو وہ کنارہ معمولی ذہنیت کے آدمی کو بھی بھا جائے یا اس پر ہاتھ ڈال سکے اور تاج صاحب کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ فوراً اسے دریا برد کر دیں۔

جب ہم نے یہ الفاظ پڑھے تو خیال آیا کہ کسی دوست کو تار دیں کہ کسی حکیم سے مشورہ کر کے مخلص صاحب کو یک جا جلاب دے دیں تاکہ یہ فاسد مادہ رفع ہو جائے، اور انہیں ہدایت کریں کہ آئندہ برس دو برس تک کے لئے اپنی ادبی غذا ذرا ہلکی رکھیں مثلاً مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کی نظمیں یا مولانا حسن نظامی کا روزنامچہ بس ایسی ایسی چیزیں پڑھ لیا کریں کیونکہ ان کا معدہ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب ذرا بڑے ہو جائیں گے اور کچھ لکھنا پڑھنا سیکھ لیں گے تو پھر ٹریجڈی اور ٹریجڈی کی تنقید سے بھی شوق فرمائیں۔ فی الحال انہیں مولانا راشد الخیری کے ناول ہی پڑھتے رہنا چاہیے کیونکہ وہ ایسے ہی ضعیف دماغ کے لئے لکھے گئے ہیں۔

لیکن پھر خیال آیا کہ اس سے ہونہار بچوں کی دل شکنی ہوگی اب تو ماشاءاللہ اہلِ زبان بھی سکولوں کالجوں میں داخل ہونے لگے ہیں، اور مذکر مونث کے جھگڑوں کو چھوڑ کر نقد و تبصرہ کے میدان میں زور آزمائی کرنے لگے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں شاید کوئی کام کی بات کہنا سیکھ گئے ہوں یہاں تو "اہلِ زبان" کی پت جھڑ شروع ہو کر ختم بھی ہونے کو آئی اور زبان کے "ہانکتے" اب کی دم میں نمدہ بھی باندھ سکے۔ لیکن شاید پھر بھی کسی ہونہار مضمون نگار کی دم میں کہیں کوئی چھیچھڑا لگا ہو اس خیال سے مضمون کو دوبارہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ جہاں مخلص صاحب نے دس بارہ جگہ اپنی جہالت اور بداخلاقی کا ثبوت

دیباچے دراما میں تیس جگہ اپنی قابلیت بھی مزید جتائی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا ماخذ علم ان کی بے ساختہ جہالت سے نہیں زیادہ دل چسپ ہے۔ لیکن مخلص صاحب کی ان خصوصیات کا پیش کرنا کچھ آسان کام نہیں ان کے مضمون میں خیالات کے موتی بکھرے پڑے ہیں (ان "بکھرے" پر سچے موتی پر نہیں۔ دراصل موتی کی جگہ ایک اور لفظ سوچا تھا لیکن استعمال اس لئے نہیں کیا کہ "اہل زبان" کہیں گے محاورہ غلط ہوگیا) ان موتیوں کو چن کر یکجا کرنے کے لئے اس مضمون کی بھول بھلیاں میں کئی دفعہ گھومنا پڑتا ہے کیونکہ زاویہ بیانی ایسے نقادوں کی خاص صفت ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں۔

"انارکلی . . . . تین ایکٹ کا ایک موضوعی (سب جیکٹو) ڈراما ہے۔ جسے غیر اصطلاحی زبان میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس تصنیف میں تاج صاحب آنکھوں دیکھی نہیں بلکہ من مانی پر داستان سنائیں گے۔"

اب اس فقرے کو کوئی کیا کرے۔ اتنی فرصت کہاں کہ دلی جا کر مخلص صاحب کے دار المطالعہ کے دروازے پر دستک دیں۔ اور وہ جیسے تیسے باہر نکلیں تو ہم اتنا پوچھیں کہ حضرت سب جیکٹو ڈراما دلی کا محاورہ ہے یا لکھنؤ کا ؟ کیونکہ الفاظ گو انگریزی ہیں لیکن انگریزی کی فن تنقید اس اصطلاح سے محض نا واقف ہے اس اصطلاح کی جو تصریح غیر اصطلاحی زبان میں مخلص صاحب نے ہم جاہلوں کے فائدے کے لئے کر رکھی ہے اس سے بھی نہ کھلا کہ یہ بددیانت کیا ہے کب ہوئی اور اس کا ملبس کون ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخلص صاحب نے شکارپور کے سفر کے دوران میں دہلی کے بک سٹال سے ڈراما پر کوئی کتاب لے کر پڑھ لی تھی جس سے ان کی جہالت میں اس قدر خوش گوار اضافہ ہوا کہ وہ اسے علم سمجھنے لگ گئے۔

غالباً اسی کتاب مستطاب کا لکھا ہے مخلص صاحب پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ —

"(انارکلی) ادب کی بنیادی تقسیم یعنی شاعری، نقش اور ڈرامے کی آخری صنف کی حیثیت سے پیش ہوئی ہے بلکہ یہ کہئے کہ اس صنف میں بھی کتاب نسبتاً ایک ایسی اہم شق یعنی ٹریجڈی کی حامل ہے جسے انسان کی دکھیاری زندگی کا نمونہ عبرت ہونا چاہیئے۔"

مطلب صرف اتنا ہے کہ انارکلی ایک ٹریجڈی ہے لیکن یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ اس کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اور اس اظہار علم کے شوق میں بات ایسی فرسودہ اور بے معنی کہی کہ معاذ گویا کی عزت کی باقی نہ رہی۔ خود اسی مضمون میں مخلص صاحب نے بڑے مربیانہ انداز میں حضرت آزاد مرحوم کی ایک تحریر کا نمونہ پیش کیا ہے اور اسے خوب سراہا ہے ہم علامہ مخلص صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ادب کی بنیادی تقسیم وہی ہے جیسے انہوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں یوں بگھار کر پیش کیا ہے تو وہ خود ہی بتائیں کہ آزاد کی یہ تحریر کس صنف میں شامل ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا "سی پارہ دل" کس خانے میں ڈالئے گا۔ غالب کے "اردوئے معلیٰ" کو کیا قرار دیجئے گا۔ آپ کی پڑھی ہوئی کتابوں میں سے یہی مثالیں کافی ہیں۔

آگے چل کر اعتراف کرتے ہیں کہ انارکلی کا قصہ خود تاج صاحب کے قول کے مطابق ایک بے بنیاد چیز ہے لیکن اعتراض فرماتے ہیں کہ مصنف ڈرامہ نے سر فہرست ہی میں انارکلی کا یہ واقعہ ۱۵۹۹ء کا لکھا ہے جبکہ اکبر کی عمر چھپن سال تھی اور متحیر ہوتے ہیں کہ اکبر جس نے جوانی میں ہیمو بقال کو نہ مارا وہ چھپن برس کی عمر میں انارکلی کو کیونکر مروا سکتا ہے اس استدلال سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی کہ قصہ بے بنیاد ہے پھر نہ معلوم مخلص صاحب تاج صاحب کی تائید کر رہے ہیں یا تردید ؟

برسبیل تذکرہ۔ ہندوستان کے تمام ججوں کو یہ بات نوٹ کر لینی چاہیئے کہ اگر ان کے سامنے کوئی چھپن برس کا شخص قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر پیش ہو تو اس سے پہلی بات یہ پوچھیں کہ کیوں بے تو نے جوانی میں ہیموں بقال کو مارا تھا ؟ اگر جواب نفی میں ہو تو اسے رہا کر دیں۔

ان مثالوں سے میں قارئین کو اس بات کا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مخلص صاحب کے مضمون کو سمجھنے کے لئے باقاعدہ اغلاط نامہ مرتب کرکے

ساتھ ملانا چاہئے کئی فقروں کی نحوی ترکیب بدلنی پڑی۔ کئی پیراگراف کو ازسرِ نو ترتیب دینا پڑا۔ کئی فقروں کے معنی جو تلخیص سے پہلے پڑھنے والوں کے ذہن میں آتے تھے
بد مطلب یہ واصل ہوا کہ مخلص صاحب کو بقول ان کے "نقش" تین چیزوں سے ہوتی ہے۔

،، فرماتے ہیں: "اکبر کے متعلق میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کہتا ہوں (مضمون نگار تو بے سی قسم کی تحقیر کا ممنون احسان ہے)، کہ انارکلی لکھ کر آپ نے اس کی با عظمت سیرت تباہ کی ہے"

اس سلسلے میں مخلص صاحب نے پھر اپنی پریشان خیالی کے کئی ثبوت دئے ہیں۔ ایک طرف یہ فرماتے ہیں کہ "اکبر بادشاہ کے نام کے ساتھ ہی جو تصویر ہندوستان کے بچے بچے کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، وہ آپ کے اکبر سے کوئی واسطہ بالکل نہیں رکھتی" جس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ مخلص صاحب کے نزدیک ڈرامے کا اکبر تاریخ کے اکبر سے مختلف ہے۔ اس کا جواب مختصراً تو یہ ہو سکتا تھا کہ ڈرامہ نویس یا کوئی بھی انشا پرداز اس بات کا حق رکھتا ہے کہ کسی تاریخی شخصیت کو جس طرح چاہے پیش کرے۔ اگر وہ تاریخ کے مطابق نہ ہو تو آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو مورخ کی حیثیت سے کوئی درجہ نہ ملنا چاہئے۔ اس کی انشا پردازی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ علم ادب کی تاریخ میں آپ کو کئی مثالیں اس بات کی ملیں گی کہ ایک ہی تاریخی شخص کو مختلف انشا پردازوں نے متباین اندازوں میں پیش کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو اس تباین سے کوئی صدمہ نہ پہنچا۔ لیکن یہ اصول ذرا مطالعے کے بعد سمجھ میں آئے گا۔

پھر آپ فرماتے ہیں:

"ڈرامہ نگاری کی تعریف یہی ہے کہ وہ جیتی جاگتی ہستیاں پیدا کرے اور کبھی بھی کوئی بات ان میں خلافِ فطرت نہ ہو۔"

مخلص صاحب یہ دوسری بات لکھنے کے ساتھ ہی بھول بھی گئے۔ یہ فقرہ تو کہیں سے سن پایا تھا جس کا آپ نے اپنے مضمون میں لکھ دیا لیکن اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس معیار پر انارکلی کو پرکھ کر دکھاتے اور ثابت کرتے کہ فلاں بات جو اکبر نے کی یا کہی وہ انسانی فطرت کے منافی ہے۔ اور پھر حقائق کی ادا کے ظہور میں نہیں آسکتی۔ جب یہاں مخلص صاحب نے خود ہی ہتھیار ڈال دئے تو ہم بھی ان کی جان بخشی کئے دیتے ہیں اور دنیا کو شاہد ٹھہراتے ہیں کہ ہم باوجود نوجوان ہونے کے بیچاروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

یہ خلافِ فطرت والی بات مخلص صاحب نے محض رعب گانٹھنے کو کہی تھی۔ اصل مطلب ان کا یہی ہے کہ تاریخ کا اکبر بہت شاندار ہے اور ڈرامے کا اکبر ظالم اور سفاک سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں ہم مخلص صاحب کی خدمت میں یہی مخلصانہ مشورہ پیش کرتے ہیں کہ وہ دس بارہ سال تک متواتر انارکلی کی تلاوت فرماتے رہیں۔ ممکن ہے اس کے بعد موٹے موٹے نکات ان پر واضح ہو جائیں۔ اگر اسے پڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے اکبر کی یہ تصویر نہیں کھنچتی تو ایک عالی وقار، علم دوست، روشن دماغ شہنشاہ جو ہر وقت ہندوستان کی عظمت کے خواب دیکھتا رہتا ہے اور جو ان خوابوں کی تعبیر کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ ایک نوجوان میں جو اس شان دار سلطنت کا ولی عہد ہے کمزوری یا بے راہروی کے ذرا سے آثار بھی پا کر اس قدر بیقرار و پریشان ہو جاتا ہے اور جہاں بانی کی اہم ذمہ داریوں کو اس درجہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے پدرانہ جذبات کا خون کر لینے سے بھی نہیں جھجکتا۔ اگر مخلص صاحب کی آنکھوں کے سامنے یہ تصویر نہیں کھنچتی تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ۔ اگر اب بھی مخلص صاحب کو ڈرامے کا اکبر محض ایک ظالم اور سفاک بادشاہ معلوم ہوتا ہے تو سوائے اس کے ان کا کیا علاج ہے کہ کوئی نیک انسان اپنی زندگی ان کی اصلاح کے لئے وقف کر دے خواہ مرتے وقت حسرت یہ تسکین اپنے ساتھ لے جائے کہ انما الاعمال بالنیات۔ اگر ادب کا ذوق نہ ہو، استفادے کی قوت نہ ہو، احساسات میں بیداری نہ ہو، دماغ میں روشنی نہ ہو تو مبادیات ڈرامہ کے متعلق کسی سرسری سی کتاب میں چند فقرے پڑھ لینے سے تنقید کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔

باقی اس قسم کے اعتراضات کہ فلاں باندی کی زبانی مغلِ اعظم کو صلاواتیں سنوائی ہیں۔ فلاں کنیز کی زبانی سلیم کی مٹی پلید کرائی ہے۔ صرف

چونکہ میں ایک حنفی کے گھر پیدا ہوا میں بھی حنفی ہوں اور امام ابوحنیفہ کی تقلید میرے لئے کافی ہے۔ چنانچہ میں نے حنفیوں ہی کی فقہ پڑھی اور جس مسئلے میں جو کچھ امام ابوحنیفہ نے کہا تھا میں اُسی کو وحی آسمانی خیال کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میں نے حدیث شروع کی جوں جوں حدیث پر عبور ہوتا گیا میری آنکھیں کھلیں اور میں نے سوچا کہ خدا نے اپنے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم پر ایک شرع نازل کی اور آخرکار فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ آج میں نے تمہارے دین کو پورا کر دیا۔ پیغمبر صاحب نزول وحی سے بیس برس تک زندہ رہے اور یہ سارا وقت اُن کا دین ہی کی تعلیم میں صرف ہوا جو کچھ خدا نے فرمایا بے کم و کاست قرآن میں جمع ہے۔ اور جو کچھ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اور کیا احادیث میں۔ پس مسلمانوں کو اپنے دین کی تکمیل کے لیے اول قرآن چاہیئے اور قرآن کے [illegible] میں جانتا کہ یہ چاروں امام بیچ میں کہاں سے کود پڑے۔ پیغمبر صاحب کے ساتھ نسبت نہ کرنے میں کوئی مصلحت تھی تو صحابی کا نام لیتے اور کوئی اپنے کو صدیقی کہتا کوئی عمری کوئی عثمانی کوئی علوی کوئی انسی کوئی ابوہریری وغیرہ تو [illegible] متعلق کیونکہ پیغمبر صاحب نے اپنے اصحاب کی شان [illegible] اصحاب [illegible] کی سی ہے جا ہو جس کے پیچھے ہو لو رستہ نہیں بھولوگے۔ پیغمبر کو چھوڑا اصحاب و تابعین سے منہ موڑا ایک دم سے تبع تابعین پر آ رہے جیسے کوئی زینے کی دو سیڑھیاں چھوڑ کر دھڑام سے تیسری پر گرے۔ میں اس کو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک طرح کی توہین سمجھتا ہوں۔ اسی طرح جو لوگ دوسرے بزرگان دین مثلاً حضرت پیران پیر یا قطب صاحب یا سلطان جی صاحب وغیرہ کے عرس کرتے ہیں ان کی نسبت بھی میں اکثر خیال کیا کرتا ہوں کہ پیغمبر صاحب کے بعد اصحاب کا درجہ ہے اصحاب کے بعد تابعین اور تابعین کے بعد تبع تابعین کا۔ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ[۵] - یہ بزرگان دین تو اُن کے آگے امتی ہیں۔ وہ بے شک اچھے اور بہت اچھے اور نہایت اچھے ہیں ہم سیاہ کاروں سے۔ اور ہم ان کی خاک پا کی برابری بھی نہیں کر سکتے لیکن ع گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی۔ سب کچھ ہی

---

۵ پھر جو اُن کے بعد پھر جو اُن کے بعد ۱۲

بیچی لکھنے کے لئے مسالہ مہیا کرسکتے ہیں تنقید سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ایسے اعتراضات صرف اس درجے کی ادب ناشناسی بلکہ انتہا درجے کی کم فہمی کی دلیل ہیں۔ اکبر اور سلیم تو نہایت معمولی انسان ہیں اگر آپ بلا تشبیہ کسی پیغمبر کا قصہ بھی لکھیں تو اس میں بھی یہ ذکر ضرور آئے گا کہ فلاں شخص نے ان کو پتھر مارے فلاں نے ان سے یہ بدسلوکی کی حتیٰ کہ بعض نے انہیں سولی پر لٹکا دیا اور پھر بھی ان کا مضحکہ اڑاتے رہے پھر اگر آپ پر کوئی اعتراض کرے کہ آپ نے معاذ اللہ فلاں پیغمبر کی توہین کرائی تو بتایئے کہ آپ اس شخص کی ذہانت کے حق اور ایک تھپڑ رسید کرنے کے سوا اور کیا کریں گے مخلص صاحب کی خدمت میں صرف یہی عرض کیا جاسکتا ہے کہ حضرت آپ ایک آدھ کتاب ابھی اور پڑھ لیجئے پھر تنقید نگاری بھی کر لیجئے گا آپ کا ہاتھ کس نے روکا ہے؟ لیکن اس نقادی میں بھی آپ کو کیا مزہ آئے گا کہ ہر مضمون کے بعد آپ خود ہی موضوع تنقید بن جائیں۔

ایک بات پڑھ کر ہمیں ہنسی بھی آئی اور رونا بھی آیا۔ فرماتے ہیں۔

"میں اپنی تو یہ کہتا ہوں کہ انارکلی کا ظاہری حسن دیکھ کر بڑی امیدیں بندھی تھیں۔ سوچتا تھا کہ واقعی یہ ڈرامہ مغلیہ شان و تجمل کا ایک سہانا خواب ہوگا جس میں شاہانِ سلف کے سفر و حضر کے حسین مناظر اس طرح دکھائے گئے ہوں گے کہ بس بنت رُت ہے۔ اکبر بادشاہ سیر و شکار میں ہیں۔ سینکڑوں ہاتھی گھوڑے اور ہزاروں خلق خدا کا لاؤ لشکر رکاب میں ہے گویا جنگل میں منگل ہو رہا ہے ..... وہ آشیانہ منزل (مجرد کر) سے لگا لگا دیوان خانہ عام ہے جس کے صحن کے بیچوں بیچ (۴۰) گز طولانی ستون پر آکاش دیا رات میں دور دور روشنی پہنچاتا ہے ..... اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو اکبری سلطنت کا حسین بازو ہی نورتن سے ایسا سج دیتے کہ سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔ اگر اس کا اہتمام بھی تاج صاحب کے بس کا نہ تھا تو جشن نوروز کے بیان میں کم سے کم مینا بازار کی پیاری تصویر کھینچ کے یہ تک تو دکھا دیا ہوتا کہ ملک تدبر کے بادشاہ اکبر اعظم نے اپنی خداداد طبیعت سے اس میں کیا ندرت پیدا کی .. یعنی یہی کہ بادشاہ امرا کو سلطنت کا رکن رکین جانتا تھا۔ اور انہیں اس طرح شیر و شکر رکھنا چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کی سنگت سے مزہ بڑھے ..... بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خود امرا باہم کھٹک بھی جاتے۔ جہاں یہ صورت پیش آئی اور بادشاہ نے رشتہ ناطہ کرکے دونوں گھرانوں کو ایک کیا۔"

اب قارئین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ مخلص صاحب ڈرامے کو سمجھنے کے کس حد تک اہل ہیں۔ تاج صاحب تو ڈرامہ انارکلی لکھ رہے ہیں کہ اس کنیز کا حسرت ناک انجام کیونکر ہوا لیکن مخلص صاحب کو یہی افسوس رہا کہ تاج صاحب نے ان کو چالیس گز طولانی ستون کیوں نہیں دکھایا۔ مخلص صاحب کو خود بھی اس بات کی نامعقولیت سوجھ گئی چنانچہ دبی دبی زبان میں فرماتے ہیں ۔۔

"اچھا یہ چیز تاج صاحب کی سمجھ میں نہ آئی تھی یا اس کا موقع نہ تھا تو ....."

برخوردار بات یہی ہے کہ اس کا موقع نہ تھا۔ سمجھ میں تو آپ کی آ گیا لیکن ہٹ آپ کی ویسی ہی قائم ہے پھر بھی کہے جاتے ہیں کہ اچھا یہ نہیں تو نورتن ہی دکھا دیا ہوتا۔ اچھا یہ نہیں تو مینا بازار ہی دکھا دیا ہوتا۔ اب اس بچپنے کا کیا علاج۔ مطلب مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب انارکلی کا قصہ ذرا تھوڑی دیر کو بند کر دیتے اور مخلص صاحب کو ایک ایسا سین دکھا دیتے جس میں اکبر امرا کے لڑکے لڑکیوں کے رشتے کراتے نظر آتے۔ کوئی تاج صاحب سے پوچھتا کہ حضرت یہ کیا جنون در معقولات ہے تو تاج صاحب جواب میں کہتے کہ قصہ انارکلی کا سہی لیکن اکبر کی خوبیاں اس تفصیل سے دکھانا بہر حال ثواب کا کام ہے۔ اگر ڈرامہ اسی اصول پر لکھا جاتا ہے تو تاج صاحب کو چاہئے کہ اگلے ایڈیشن میں ایک آدھ سین عزناطہ کا بھی دکھا دیں کیونکہ اس کی داستان بھی تو آخر اسلامی کلچر کی علمبردار

ہے۔ اگر غلط بہت ہے تو کم از کم ترک بابری کا تذکرہ ہونا چاہیے کیونکہ بابر بہرحال اکبر کا رشتہ دار تھا اور مخلص صاحب وہ مجدد گیہ زنگاں میں سے تھا۔ آخر میں ایک سین آل انڈیا مسلم کانفرنس کا بھی دکھا دیا جائے جو حال ہی میں قائم ہوئی ہے تو وہ بھی چار چاند لگ جائیں گے۔ مخلص صاحب کو تاریخ کا ہوش تو بہت ہے لیکن ان کا مذاق اکبر پیچھے سے آگے بڑھنے نہیں پاتا۔

(۲) دوسرا اعتراض مخلص صاحب کا یہ ہے کہ تاج صاحب کی قوت مشاہدہ بہت کمزور ہے۔ علامت کے طور پر آپ نے تاج صاحب کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"موسم بہار کی ایک دوپہر۔ ظہر کی نماز ادا ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ کے قریب وقت ہو چلا ہے۔"

اور اعتراض فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں بے ضرورت لفاظی ہے فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا۔

"بہار کا موسم سہ پہر کا وقت ہے۔"

دوپہر کے لفظ سے جو دھوپ کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور ظہر کی نماز کے ذکر سے جو ایک مسلمان گھرانے کی معمولیات کی طرف اشارہ ہے وہ آپ سے بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ وہ چیز جسے انگریزی میں ATMOSPHERE کہتے ہیں (معنی کسی پڑھے لکھے سے پوچھئے۔ ڈکشنری میں دیکھئے تو شاید واضح طور پر سمجھ میں نہ آئیں) اس کی طرف سے تو مخلص صاحب آپ نے دماغ کے دروازے بالکل بند کر رکھے ہیں۔

مگر جس فقرے کو وہ بقول خود ابھار کے دکھانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے،

"ستونوں اور محرابوں کے سایے طویل ہونے شروع ہو گئے۔"

فرماتے ہیں: "یہ ایک کھلی بات ہے کہ زوال کے بعد سایہ ڈھلنے لگتا ہے اور ظہر کی نماز ایک حد تک سایہ طویل ہونے پر ہی ہوتی ہے لیکن آپ کا جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ نماز ظہر کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے تو سایے طویل ہونے شروع ہوتے ہیں۔"

سایہ ڈھلنے اور سائے کے طویل ہونے میں جو فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ جس ستون پر دھوپ پڑ رہی ہے جب اس کا سایہ ستون کی لمبائی سے بھی بڑھ جائے تو اس کو سایے کا طویل ہونا کہتے ہیں۔ دھوپ کے متعلق جس قدر مشاہدہ آپ کا ثابت ہوتا ہے وہ تو بجز بال سفید کرنے کے اور کسی کام نہ آئے گا۔

(۳) تیسرا اعتراض زبان کے متعلق ہے۔ اعتراض اول تو ایسے فقرے پر ہے کہ "تم خلیل ہو شیخو؟" "تو معاملہ کیا ہے حضور؟" وغیرہ وغیرہ۔ جو شخص اہل زبان ہو کر بھی یہ نہ سمجھے کہ مخاطب کے نام کو فقرے کے آخر میں رکھ دینے سے فقرے کا تیور کس حد تک بدل جاتا ہے اس کو کوئی غیر اہل زبان، بذریعہ تحریر تین سو میل کے فاصلے سے کیا سکھائے اور کس طرح سکھائے اور اہل زبان کو یہ کس طرح بتائے کہ اہل زبان ہونا اور بات ہے زبان دان ہونا اور بات ہے۔ اے کاش کوئی قادر الکلام شخص بلند آواز سے ان فقروں کو مخلص صاحب کے سامنے پڑھے اور مخلص صاحب کے چہرے کا مطالعہ کرتا جائے اور جب آٹھ دس دفعہ پڑھنے کے بعد اسے مخلص صاحب کے چہرے پر انشراح کی کوئی جھلک نظر آئے تو ہمیں فوراً اطلاع دے تاکہ ہم شکرانے کے دو نفل پڑھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پرانی وضع کے ہندوستانی کھیلوں کے عادی ہو چکے ہیں وہ ان کی مصنوعی زبان اور مصنوعی طرز تحریر سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس قسم کی جیتی جاگتی زبان انہیں تکلیف دہ طور پر نامعلوم ہوتی ہے۔ شیکسپیئر نے بھی جب اس طرح کی جدت کی تھی تو لوگ اس پر ویسے ہی معترض ہوئے تھے اور ایک بہت بڑے نقاد نے اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ چھری اور کمبل جیسے الفاظ کو ڈرامے میں استعمال نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ لوگوں کو خنجر اور ردا" اور اسی صنف کے بلند آہنگ الفاظ کا چسکا پڑ گیا تھا اور جو مصنف اس تصنع سے گریز کرتا تھا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب سمجھا جاتا

مخلص صاحب تاریخ ادب سے واقف ہوتے۔ تو عبرت پکڑتے لیکن دامن از کجا آرد کہ جامہ ندارد۔

"پختہ حسن" اور "پھیلا آسمان" وغیرہ کے متعلق مخلص صاحب نے صرف اتنا فرما دیا کہ نئی ترکیبیں ہیں لیکن یہ نہ فرمایا کہ ان میں نقص کیا ہے۔ کوئی اعتراض کرتے تو جواب کی تکلیف بھی گوارا کرلی جاتی۔ فی الحال تو اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ بجا ہے حضور یہ نئی ترکیبیں ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً "پختہ حسن" صرف مبتدیوں کے لئے نئی ہیں۔

دو محاوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ ان کا محل استعمال غلط ہے آخر مخلص صاحب اپنی حرکتوں پر اتر آئے۔ ہم بھی متعجب تھے کہ "اہل زبان کی لکھی ہوئی تنقید ہو اور اس قدر جلدی کی گرہ بندی" "محاورے" کا تذکرہ نہ ہو جس کی بدولت یوپی کے کئی حضرات پنساری بن بیٹھے ہیں۔ تاج صاحب کا فقرہ ہے: "دنیا کی آرا نار کلی انار کلی کہتے زبان خشک ہوئی جارہی ہے۔ اور مجھے اتنی توفیق نہیں کہ چھوٹے منہ سے دو بول شکریئے کے کہہ دے۔"

مخلص صاحب لکھتے ہیں: "چھوٹے منہ" کا یہ محل استعمال نہیں یہاں "چھوٹے منہ" چاہیئے۔

اگر جناب مخلص صاحب نور اللغات کی ورق گردانی کی زحمت گوارا فرمائیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ چھوٹے منہ کے معنی ہیں بظاہر داری سے اور نمائش سے۔ ڈرامے کا جو فقرہ اوپر نقل کیا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا تو تیری تعریفیں کر رہی ہے اور مجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ ظاہر داری یا نمائش ہی کے طور پر دو بول شکریئے کے کہہ سکے۔

"چھوٹے منہ" کے معنی نور اللغات میں یوں لکھے ہیں "(تحقیر سے) عو۔ خراب منہ سے، برے منہ بدلی کے ساتھ: آئین میں جو "تحقیر سے" لکھا ہے اس سے مراد ہے کہ یہ محاورہ جس کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے اس کی تحقیر بھی مراد ہوتی ہے تو کیا مخلص صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ انار کلی کی ماں اس موقع پر ایسا فقرہ کیوں نہیں کہتی جس سے انار کلی کی تحقیر کا پہلو بھی نکلے! یہ اعتراض محاورے کا تو اعتراض نہیں۔

دوسرا اعتراض "سینخوں دار روزن" پر ہے۔ "سینخ" کے معنی نور اللغات میں یہ لکھے ہیں: "چھوٹی سیخ: لوہے کی چھوٹی سلاخ" "سینخوں دار روزن" لکھنے سے مصنف کی مراد یہی ہے کہ ایسا روزن جس میں لوہے کی چھوٹی سلاخیں لگی ہیں۔ اس لفظ کے استعمال سے روزن کے متعلق کبھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر بڑا تھا۔ اگر کسی بہت ہی چھوٹے روزن مثلاً کسی گڑیا کے گھر کے روزن کا ذکر ہو تو ممکن ہے وہاں سینخ کی بجائے سلائی کا لفظ استعمال کیا جائے اس وقت مخلص صاحب فرمائیں گے کہ سلائی سے تو سرمہ لگایا جاتا ہے۔ خدا کے لئے مخلص صاحب کے کوئی دوست انہیں سمجھائیں۔

باقی الفاظ کے متعلق اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کو شاید معلوم نہ ہو دہلی کے ایک مصنف منشی فیض الدین گزرے ہیں جو لال قلعے کی زبان لکھنے کے لئے مشہور تھے انہی کی ایک کتاب ہے "بزم آخر"۔ پچھلے دنوں تو نایاب تھی اب چاندنی چوک کی کسی دکان سے مزہ مل جائے گی۔ کبھی شام کو ایڈورڈ پارک سے فراغت پاکر ادھر سے گزریئے تو ایک نسخہ خریدتے جائیے اس میں آپ کو گنگا جل کرڑا اور گوش پیچ کی آرٹ اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ مل جائیں گے جن پر آپ یوں جاہلانہ معترض ہوئے ہیں۔ جو الفاظ وہاں نہ ملیں ان کے متعلق ابو الفضل کے آئین اکبری کا مطالعہ فرمائیے وہاں مل جائیں گے جو مغلیہ ڈرامہ لکھنے بیٹھتا ہے وہ ایسی مستند کتابوں کو ضرور دیکھ لیتا ہے۔ اے کاش جو لوگ تنقید لکھنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ بھی اتنی تکلیف گوارا کر لیا کریں۔

اب آپ کے پاس صرف ایک ہی جواب رہ گیا ہے وہ یہ کہ ہم نور اللغات کو مستند مانتے ہیں نہ بزم آخر کو اگر یہ واقعہ ہے تو مخلص صاحب کو چاہیئے پہلے اہل زبان آپس میں نپٹ لیں جب خود ان کا ایمان درست ہو جائے تو پھر باقی صوبوں میں بھی تبلیغ شروع کریں۔

تو درون در چہ کردی کہ برون خانہ آئی

۹

یہ تمام بحث دراصل ہے اس تنقید کی۔ قارئین نے دیکھ لیا کہ اس تنقیدی مضمون میں انار کلی کے اصل موضوع پر مخلص صاحب نے کچھ بھی نہیں، محض منطقی اور نحوی باتیں ہی ہیں۔ اچھا ہے خود انار کلی کے کیریکٹر کے متعلق کچھ نہ فرمایا جو اس کا اصل بیان ہے اور جس کے اردگرد تمام واقعات و کرامات کی تنظیم کی گئی ہے۔ مناظر کی تقسیم کے متعلق کچھ نہ لکھا۔ واقعات کے تناسب کے متعلق کچھ نہ فرمایا ٹریجڈی کی مختلف کیفیات کے زیروبم کے بارے میں خاموش رہے اردو ڈرامہ کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر یہ نہ فرمایا کہ انار کلی کا ڈرامہ کہاں تک رسمی ڈرامے کا ممنون ہے اور کہاں پرانی قیود کو توڑتا ہوا نظر آتا ہے اس بات پر بحث نہ کی۔ اگر یہ ڈرامہ سٹیج پر دکھایا جائے تو کیا دقتیں پیش آئیں گی پیشہ ور سٹیج اس کو کہاں تک قبول کر سکتی ہے اور کیوں ؟ کسی اور ٹریجڈی سے مقابلہ نہ کیا۔ یہ نہ اشارہ کیا کہ اردو ڈرامے کی موجودہ حالت کیا ہے اور اس میں انار کلی کس حد تک ترقی یا تنزل کا موجب ہوگا کیا تو کیا اگر بہت اچھا آدمی تھا سایہ دوپہر کے بعد ہی ڈھلنے لگ جاتے ہیں اور ہمارے ان سنجھ نہیں نقاد پھوٹا ہے اور اپنے زعم میں سمجھ بیٹھے ہوں گے کہ اور سٹ کے بعد اگر کسی نے ڈرامے کی تنقید لکھی ہے تو ہمیں نے لکھی ہے۔

اب صرف ایک بات کا ذکر باقی رہ گیا ہے اور چونکہ میں اس بات کو محض کنایتہ بیان کرنا چاہتا ہوں اس لئے ڈر ہے کہ مخلص صاحب کے پلے شاید نہ پڑے۔ تاج صاحب نے انار کلی کو مس حجاب اسمٰعیل کے نام ڈیڈیکیٹ کیا چغتائی صاحب نے اپنی قلم کاری سے اس ڈرامے کی ضبغت کو رونق بخشی تاج صاحب اور مس حجاب اسمٰعیل یا تاج صاحب اور چغتائی صاحب کے باہمی مراسم مخلص صاحب کو معرض بحث میں نہ لانے چاہئے تھے۔ مخلص صاحب اور مخلص صاحب کی قماش کے نقادوں کو ذہنی اعتبار سے ابھی بچونسی کے درجے سے بالاتر ہونے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور ابھی انہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس طرح کا واسوختانہ چڑچڑا پن خود نقاد کے سفلہ پن کی دلیل ہوتا ہے خصوصاً خواتین کا ذکر انہیں اس بے تکلفی سے نہ کرنا چاہئے جس سے شہدے پن کی بو آئے۔ یہ مس حجاب اسمٰعیل کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی انشاپردازی کی وجہ سے اس زمرے میں شامل ہیں جس میں اصطلاحاً مخلص صاحب بھی قدم رکھتے ہیں لیکن مخلص صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہئے اسے اپنے عدم تربیت کے اظہار کا ایک بہانہ نہ بنا لینا چاہئے۔

مخلص صاحب کے مضمون کے ساتھ رسالہ ساقی کے ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھ کر چار دانگ عالم میں اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ "مضمون نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے" اور یوں سمجھ لیا ہے کہ وہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے لیکن شاہد جیسے تربیت یافتہ نوجوان کو اس امر کا احساس ہونا چاہئے کہ جس بداخلاقی کی طرف ہم نے آخری پیراگراف میں اشارہ کیا ہے اس کی اشاعت ایک دوشمان عالیہ کے سپوت کو نہ کرنی چاہئے تھی مخلص صاحب کی نقادانہ بدتمیزیوں سے ہم شاہد صاحب کو بری الذمہ سمجھنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن مخلص صاحب کا ذاتی کلچر شاہد صاحب کے دامن پر چند ایسے بدنما دھبے چھوڑ گیا ہے جو بے تعلقی کا ایک نوٹ لکھ دینے سے نہیں دھل سکتے

ہم اس مضمون کے کسی کھسیانے سے جواب کے لئے چشم براہ ہیں خواہ وہ جواب مخلص صاحب لکھیں یا شاہد صاحب یا دونوں کے دونوں میں سے کسی ایک کے کوئی ایک یا ایک سے زیادہ گمنام یا نامدار، استاد، شاگرد یا ہمنوا۔

یہ عصمت چغتائی کا وہ مضمون ہے جس کا بعد اس نے انگریزی میں
ترجمہ کیا تھا۔ یہاں اصل اور ترجمہ دونوں پیش کیے جا رہے ہیں۔

ہیروئن

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ ادبی تالی بجانے کے لئے بھی دو ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے اور عرف عام میں ان دو ہاتھوں سے ہمارا مطلب ادب کے ہیرو اور ہیروئن سے ہے یوں تو ایسا ادب بھی ہے جس میں ہیرو اور ہیروئن نہیں ہوا ادب بھی ایسا ہی ہے جیسے کسی نے ایک ہاتھ اوپر سے کوسے کی مدد سے تالی بجا دی ہو السی تالی بج تو گئی مگر کتابوں کی جلدوں ہی میں گونج کر رہ گئی عوام تک اس کی رسائی نہ ہو سکی اور اگر سارے ادب میں ہیروئن اور ہیرو نہ ہوتے تو یقیناً یہ خشک ستو بن کر حلق میں پھنس جاتا

عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لئے بندر بندریا کو ڈگڈگی بجا کر نچانا پڑتا ہے ورنہ اگر وعظ کرنے کھڑے ہو جائیں یہ حالات زمانہ سنانے بیٹھیں تو کوئی بھی نہ سنے گا۔ دیکھئے! محکمۂ تعلیم اور مسجدوں سے لوگ کتنا کتراتے ہیں۔

لہذا جب کسی کو کچھ کہنا ہوتا ہے تو بندر بندریا کے گلے میں ڈوری باندھی اور ڈگڈگی بجانا شروع کر دی ہیرو اور ہیروئن کے رسیلے کارنامے سی رنگینیاں بھریں کہ لوگ ٹوٹ پڑے، کچھ احساسات کو پھسلایا کچھ جذبات کو گدگدایا اور مطلب حاصل ہو گیا شعبۂ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت دلچسپ اسباق کو حاصل ہے ہر بات ایسی صورت میں پیش کرنی چاہئے کہ بچے اس میں گم ہو جائیں اور کتابی کی رعنائیاں پاکر مست ہو جائیں۔ اب کا بھی کچھ یہی حال ہے کڑوی سے کڑوی خوراک شکر میں لپیٹ کر دے دیجئے لوگ واہ واہ کرکے نگل جائیں گے۔ مہابھارت اور رامائن کا زمانہ کیوں اب تک کل کی بات بنا ہوا ہے عظیم بیگ چغتائی نے قرآن کی مدد سے پردے کو چاک کرنا چاہا مگر سوائے مولویوں کی جوتیوں کے کچھ نہ ملا۔ لیکن شرر، ہیرو ہیروئن کو زمین کھلا کر، ڈپٹی نذیر احمد نے عقلوں پر سیاہ پردہ ڈال کر حجاب کو مار بھگایا، علامہ راشد الخیری اور پریم چند جی اگر ہیرو ہیروئن کے کندھوں کا سہارا نہ لیتے تو آج بجائے لوگوں کے دل و دماغ کے محض بوسیدہ کتب خانوں میں پڑے دیمک کھا رہے ہوتے۔

"ادب اور زندگی' ادب اور سماج' ادب اور تاریخ میں چولی دامن کا ساتھ ہے اگر انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو دونوں مٹ جائیں گے۔ دوسرے معنوں میں اگر ادب سے زندگی یعنی ہیرو اور ہیروئن کو الگ کر دیا جائے تو ایک خلا رہ جائے گی۔

بہر صورت زیادہ میں اس وقت ہیروئن کی حیثیت (جو ادب میں ہے) پر غور کرنا چاہتی ہوں۔ ہیروئن عام طور پر کسی حیثیت رکھتی ہے اس پر ایک نگاہ ڈال کر ہی ہم اس کے زمانے کی اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً "فسانہ آزاد" کی عورت کو دیکھ کر جو اس زمانے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت جو قابل ذکر عورت تھی وہ نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور دلچسپ طوائف تھی۔ سرشار کو بھلا

پرلے درجہ کی جذباتی احساسات کی قائل مقدس چیلی نیلے روف اور بزدل نظر آنے لگی اس کے فیصلے میں سے وہ بن جل گئی۔ جتنا بھی وہ اٹک رگڑائی گئی اس سے نفرت ہوتی گئی۔ جہاں تک بہادر وہ ہیروئن پر جا سکتی تھی جو منہ کا نوالہ اچک لے۔ بھڑوں کا چھتہ منہ پر دے مارے۔ بجائے تیکھی نظروں کے گولیاں میں بجھے ہوئے تیر دل سے کام دو پن کی تمام منع کرے۔ پڑھی لکھی چاہے خاک نہ ہو مگر رقیبا نہ تو تیر اور جاتوں سے کان سینک دے۔ تنخواہ کم کند مشکل لیکن اگر کسی شوخ شائستہ بیوی ہو تو سارے دکھ درد چٹکیوں میں اڑا دے تو پھر کون جنت کی آرزو میں مرے

مرد عورت کے ظلم سہنے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ اس کے بغیر تو جنت میں بھی جینے کو تیار نہ ہو سکا۔ حضرت آدم نے جیتے ہی جاتے پہلی چیز اس نتھے کو نکال ڈالا اور اپنے سر پر سوار کر لیا۔ خود بیوی ہر بار نڈی جو لگام پکڑے سنتے چلے جائیں گے۔ جتنے کوڑے زیادہ پڑیں گے چال میں مستی اور روانی بڑھتی جائے گی۔ مگر ہر بات کی حد ہوتی ہے دل کے ساتھ ساتھ وہ قول وفعل میں بھی بیوی بن بیٹھی اور دماغ کی پاسبانی شروع کر دی۔ سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گئی جو نگلی جائے نہ تھوکی جائے۔ چھتری، ٹوپی اور برساتی کوٹ کی طرف ہاتھ ٹنگ کر دی۔ یہاں تک کہ مرزا چیچی تھا سب سے پہلے پطرس تھے اور ان کے بعد عظیم بیگ اور شوکت تھانوی بھی چیخ چیخ کر ہاتھ دینے لگے۔ اب بیچاری چھکن منشی جی، مرزا جی اور مرزا دوں جی بھی پکار اٹھے۔

"یہ زیادتی ہے بیگم! ہمیں منظور مگر اتنا کہ پیٹ میں درد اٹھنے لگے"

دہر ہیروئن ڈھیلی ڈوری کھینچتی گئی۔ اس نے یہ راز بھی معلوم کر لیا کہ اگر وہ ذرا دبی ہوئی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ میاں پیسوں پر اکڑتے ہیں کیوں نہ چار پیسوں کی کمان توڑ کر الگ کر دی جائے نہ احمد نوری کی سلائی سے شروع کر کے اقتصادی بازار نے مرغے میں رنگ دیئے گئے اس نئے روپ نے اس میں چار چاند لگا دیئے۔ ویسے اگر عورت بھیس بدل کرنے تو خود اس کا میاں اس پر عاشق ہو جاتا ہے جب کھلنے لگی تو یوں معلوم ہوا جیسے کوئی شاندار سرکس شہر میں آگیا ہے عورت اسکولوں میں پڑھا رہی ہے۔ لاجی ہما کیا تماشہ ہو رہا ہے ہو گئے۔ عورت ڈاکٹر بن گئی حکیم جی مارے حیرت کے آنکھیں جھپکانے لگے۔ عدالت میں وکیل مخالف کو بوکھلاہٹ کے مارے کھانسی کا دورہ پڑ گیا "ہٹو۔ بچو! عورت آ رہی ہے" لوگ گھبرا کر ادھر ادھر ادھر میدان دینے لگے۔ اقتصادیات کے میدان کے ساتھ ساتھ بھلا دل کی دنیا کیوں نہ تاراج کرتی لہٰذا ہر طرف تباہی مچا دی۔

تو ——— یہ کھادہ ہیروئن جسمانی اور دماغی اعتبار سے چاق و چوبند بالکل لڑکوں کی طرح چاروں ہاتھ مارنے لگی۔ اب تو مذاق کی حد ہو گئی۔ جو کریلیں کھلاتی تھی سپر ڈالی بھی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ یہ تو ایک عورت کے نخرے ہوئے۔ جو ٹیداری کرتی تھی۔ ذرا سی بات پر آنسو سے بہلنے لگتی تھی۔ سر بن کر وقت بے وقت سوار رہتی تھی تو کیا تھا؟ تھی تو اپنی دست نگر! اپنی بی بھی کبھی پنجہ مار بیٹھتی ہے مگر خوخو کرکے پھر اپنا نرم نرم جسم پیروں سے رگڑا کرتی بھی تو لیتی ہے۔ فیشن بھی کرتی ہے۔ خرچ ہے تو کیا۔ ہے تو اپنی۔ ہم سے تو مانگ کر اترانی ہے۔ ساری ہی جیبوں سے تو کھلا کھلا کر پیسہ نکالتی ہے لیکن یہ بالکل مردانہ وار اقتصادی دنیا میں خم ٹھونک کر جو خود اپنی کمائی کہہ کر گھسوٹ سے جاتی ہے یہ تو سر سر ڈاکہ زنی ہے ——— صاف دھوکہ!

نتیجہ یہ کہ بڑی جلدی یہ ہیروئن ڈائن بن گئی۔ بہت سمجھایا، صاف صاف دکھا دیا کہ ایسی خود سر اور خود مختار عورتوں کا بڑا برا انجام ہو کے حرام کے بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ عصمتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ساری دنیا جنم میں تھوکتی ہے۔ دفتر میں کلرک بہکائے جاتے ہیں۔ ہسپتالوں میں ڈاکٹر روگ لگا دیتے ہیں۔ اسکولوں میں ماسٹر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ادھر والدین کو شمع ہدایت دکھائی: "اسکول میں لڑکی کو کم از کم ایک بار ضرور ناجائز بچے کی ماں بننا پڑتا ہے۔ پڑھنا لکھنا کچھ نہیں صرف عشق بازی سکھائی جاتی ہے۔" شرم دلائی: "بیٹیوں اور بیویوں کی کمائی کھاتے ہو۔ ڈوب نہیں مرتے۔" یہ ماسٹر دیکھئے میں کمائی جیسے چرغ گر ہر ایک اپنے وقت کا مجنوں اور فرہاد ہے۔ اس وقت کی جو کہانی اٹھا کر دیکھئے بس استاد اور طالبہ کے پرسوز عشق اور عبرت ناک انجام سے پر نظر آئے گی۔

نتیجتاً ادب بھی اپنا اثر دکھاتا اور ہیروئن واپس بچے کے پاس ہیں سرنگوں ڈھکیل دی جاتی۔ بات یہ ہوئی کہ بازار میں دیکھتے دیکھتے ضرورت
سے زیادہ لڑکیوں کی کھپت ہوگئی۔ اگر ایک گریجویٹ ہیں، روپیہ کماتا تو دو کی ایک سو بیس دے دیتی۔ جہاں جوں تعلیم نسواں کا رواج ہوتی گئی تعلیم مرداں مفلوج اور
بے کار ہوتی گئی۔ ہیروئن سے پیر جکڑنا بجائے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب و غریب کشمکش شروع ہو گئی۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کھپت پڑھی سوسائٹی میں تو کم
ہے نہیں جس تیزی سے تعداد بڑھی۔ جب ایک میٹرک پاس لڑکی لفٹ کی جاتی تھی اب گلی گلی گریجویٹ اُگ آئیں۔ شادی کے بازار میں بڑی افراتفری
مچ گئی۔ ایک پڑھی لکھی لڑکی کے لئے کم از کم آئی سی ایس یا پی سی ایس تو ہو، کاش گزشتہ لڑکیوں کی تعداد دیکھ کر افسروں کا تقرر کرتی۔ تو یہ
مصیبت کیوں نازل ہوتی۔ یہ گنے چنے افسر گورنمنٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ بن کر رہ گئے۔ جس نے اونچی بولی لگائی۔ وہی لے اڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گریجویٹ اور
تعلیم یافتہ لڑکیوں کی کثیر تعداد اس انتظار میں کہ کب گورنمنٹ آفیسر بڑھیں اور وہ سیٹ لیں مختلف شعبوں میں نوکر ہو گئیں۔ اس سے یہ دیکھا جا چکا افسروں
کی تعداد کم رہی تو کلرک بدقسمت اسکول ماسٹر ناکام اور اجڑے ہوئے ڈاکٹر نہیں پیدا ہوئے، وہ تو رہی شدت سے پیدا ہوئے۔ اب ان بے چاروں
کے پاس رہ ہی کیا گئے ماتو جاہل لڑکیوں سے نصیبہ پھوڑیں یا امیر اور تعلیم یافتہ لڑکیوں سے تخیلی عشق کر کے زندگی ان کی یاد میں گزار دیں۔ جنہوں نے
دل پر پتھر رکھ، سر پھوڑ لیے ان کی۔ جیسی بھی جیون ساتھی کی تلاش میں بھٹکا کیں۔ زندگی بھر ہم خیال و ہم مذاق بیوی کا ارمان دل میں لے کے اٹھ اور جو زیادہ
ہمت والے تھے وہ پڑوس کی کبھی کبھی مل جانے والی اپ ٹو ڈیٹ حسینہ کی آگ میں سلگتے رہے۔ غرض لڑکی تعداد میں زیادہ بڑھنے لگیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں
اور مرد پیدا ہوتے رہے اور دنیا میں رہتے رہے۔ ایک دوسرے کے لئے نہیں بلکہ موزوں رشتہ کے لئے، بالکل جیسے ایک دکان میں کپڑے کے تھان
پڑے گل سڑ رہے ہوں۔ اور دوسری طرف سڑکوں پر ننگے گھوم رہے ہوں۔ ایک ہوٹل میں باسی مٹھائیوں اور کھانوں کے انبار موریوں میں پھنکوائے جا رہے
ہیں۔ اور دوسری طرف لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ جوں جوں دکانیں اور ہوٹل لوازمات سے بھرتے جاتے ہیں سڑکوں پر ننگے اور بھوکوں کی تعداد بڑھتی
جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پنجرے میں لڑکے اور دوسرے میں لڑکیاں بند کر کے بیچ میں چال چلن کے پہرے دار بٹھا دئے گئے۔ لڑکیاں کنواری بیٹھی سوکھ
گئیں اور مرد لڑکے حیوان بنتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ کہ نسائیت زیادہ بھوکی، منہ زور اور غیر انسانی بنتی گئی۔ اور پھر ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جو برسوں کی چھپی ڈھکی
خواہشوں کے مواد کی طرح پھوٹ پڑا۔ اس نے جو پہلا کام کیا وہ تخریب تھا۔ بڑھے گھٹے ہوئے پیڑ کا تنا کاٹے بغیر نیا پودا لگانا دشوار ہے۔ پرانے مکان کو
ڈھا کر ہی نئی کوٹھیاں بنائی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے تو عورت اور مرد کے بیچ میں جو پاسبان بیٹھا تھا اس سے مڈ بھیڑ ہوئی، چونکہ بغیر عورت کے دنیا ادھوری
تھی۔ گھر میں اچھی کمائی سے عورت رکھنے کی نہ ہی اقتصادی حالت نے اجازت دی اور نہ پاسبانوں نے۔ لاچار ہو کر وہ واپس طوائف کی آغوش میں جا گرا۔
گرہست ہیروئن کے مارے میں طوائف مٹ مٹا کر خاک ہو چکی تھی۔ ناقدری اور پھٹکار نے اسے صورت سے بے صورت کر دیا تھا۔ کچھ ولی اللہ ہو کر نکاح کر
بیٹھی تھیں۔ کچھ لمبی چوڑی دکانیں لٹا کر گندی نالیوں کے پاس خوانچہ لگا چکی تھیں۔ کچھ نے روپ بدل ڈالا تھا۔ اور جیسے طوائف ہیروئن سے مرد کو چھیننے
کے لئے گرہستن نے گھونگھٹ اٹھایا تھا۔ آج اس نے اسی پھینکے ہوئے آنچل میں منہ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کبھی گرہستن نے اس ہتھکنڈے اور بناؤ سنگار
چھینے تھے آج اس نے گرہستن کی بے چارگی اور بے کسی کی آڑ لی اور سوائے بالکل نچلے طبقہ کے طوائف کو پہچاننا بھی دشوار ہو گیا تھا اور جب یہ باغی طبقہ
طوائف کی تلاش میں نکلا تو اس کی حالت زار دیکھ کر اس کا جی دہل گیا۔ طوائف اب وہ سرشار کی چہکتی ہوئی بلبل نہیں رہ گئی تھی بلکہ بھوکی کینی بلی بن
گئی تھی۔ سوائے فقیروں اور یکہ تانگے والوں اور مزدوروں کے کسی کو اس کا نام و نشان بھی معلوم نہ رہا تھا۔ اپنا مطلب تھا تو اسی طوائف کو شعروں میں پرو دیا
قصیدوں میں گوندھ کر، ناولوں میں سجا کر ادب کر اس کی لونڈی بنا دیا اور پھر جو بھرے تو ایسا بھرے کر روٹ کر خبر بھی نہ لی۔ گھر میں نل لگ گیا تو میٹھے پانی کی کریہہ بوتل
کو ایسا فراموش کیا کہ اندھی ہو کر سانپوں اور کنکھجوروں کا مسکن بن گئی۔ اور اب وقت پڑا تو اسی کے کنارے پیاسی زبانیں نکالے ہانپ رہے ہیں۔ یہی نہیں

بلکہ میونسپلٹی سے کہہ کر صفائی کرانے پر تلے ہوئے ہیں مگر یہ اندھا نقوش دوبارہ کارآمد ہونے سے پہلے بڑی سخت مدد کا طالب تھا جیسا کچھ باقی طبقہ اس کی حمایت میں چیخ پڑا، پکار پکار کر اس نے دنیا کے اس زخم کو دکھایا جو ناسور بن کر بیچ بجا رہا تھا۔ [illegible] اس طبقے کی حفاظت کو اٹھ کھڑا ہوا جس کی تھی۔ اس کے کلام آ سکتی تھی۔ اسے سارا حسن اور تمام لطافتیں اس شکیبائی اور فقیری میں نظر آئیں جس میں دنیا بھر کی غلاظتیں جذب ہو چکی تھیں۔ مگر جو آ ل سکتی تھی نا قدری کی وجہ سے دب گئی تھی۔ اور اسی کے کرم کی محتاج تھی۔ شریف عورت اس نوجوان کی زندگی سے دور تر ہوتی گئی۔ وہ اس کے بارے میں نہ کچھ جان سکا اور نہ اس نے جاننے کی کوشش کی۔ اس کی نظروں میں وہ مٹی تک پڑی تھی۔ [illegible] وہ خوبصورت مخلوق بن کر رہ گئی جو پیار بھری نظروں کو تاکے اور عشق کو گناہ سمجھتی ہے۔ جو محبت کرنا ہتک سمجھتی ہے، اور مرد کی حفاظت اپنی آمد ہے۔ اس میں عام طوائف جیسی لذت کہاں جاذبیت کہاں۔ عام طوائف سے وہ طوائف مراد نہیں جو بڑے آدمیوں کی دنیا میں چمکا کرتی ہے بلکہ سڑک کی وہ ننگی بھوکی کتیا جو راہ چلتے کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتی ہے جو ہر قیمت پر ہر حیثیت کے انسان کو لنگر بانٹتی ہے اس کی گندگی وہ غلاظت گھن کرنے کی چیز نہیں بلکہ اصلاح کی محتاج ہے۔ اگر ہمارے مکان میں نالی سڑتی ہے تو یہ اس بیچاری نالی کا قصور نہیں بلکہ مکان والوں کا قصور ہے۔ اسے گندہ کہہ کر منہ موڑ لینے سے گندگی دور نہیں ہو جائے گی۔ جو نفرت گندگی اور بیماری، مکھیاں اور جھلسانا ہے تو اس کا قصور نہیں بلکہ اس نظام کا قصور ہے جو انسانیت کی یوں بے قدری کرتا ہے۔ منٹو نے دہلی سے طوائفوں کا حال لکھ کر ایک متعفن پھوڑے کا منہ کھول دیا۔ جس نے نازک مزاج لوگوں کی لطیف طبیعتوں پر بڑا اثر ڈالا مگر اس پھوڑے کا مواد نکل جانے سے دنیا کے کٹ جانے سے بچ کر مٹ جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ طوائف کیسی بھی ذلیل ہو، ہماری دنیا کے جسم کا ایک حصہ ہے اسے پرے کر نہیں پھینکا جا سکتا۔ لوگ اسے عورت نہیں مانتے۔ وہ جو دنیا کے ہر دکھیا کا سہارا، ہر بھوکے کا دستر خوان ہے، وہ بے شک عورت نہیں مگر اس سے بھی زیادہ کارآمد ہستی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل کا نوجوان گرہستی سے زیادہ بازاری مال کی بہتری کا خواہاں ہے۔ وہ اس کی زندگی سے دور اور یہ قریب ہے۔ اسے کیا غرض جو تعلیم نسواں نہیں ہوتی یا ہوا میں بن بیاہی سوکھ رہی ہیں یہ میاں بیویوں کی ناکیں کاٹنے ڈال رہے ہیں اس کی بلا سے دنیا بھر بیوہ ہو جائے اور عورت بنے یا ہے۔ دیکھئے نا آپ کے محلے کی نالی خراب ہو جاتی ہے تو آپ غل مچا دیتے ہیں اور آپ پروا بھی نہیں کرتے کہ اس سال نالی کی وجہ سے دکھنیا گارڈن میں عمدہ بیج نہ بوئے جا سکے اس لئے اس سال تختۂ گل کی بہار سے لوگ محروم رہ جائیں گے آپ کی بلا سے پھول کھلیں یا نہ کھلیں مگر نالی ضرور صاف ہونی چاہیئے۔

اب خواہ دنیا موجودہ ادب کی ہیروئن کو ناپاک، عریاں، اور مکروہ کہے زمانے نے اسے ہیروئن کا رتبہ دے دیا۔ یہ زمانے کی نشیب و فراز کی ڈھالی ہوئی اینٹ ہے جو تعمیر میں اپنی جگہ جذب ہو گئی۔

یہ تو ہوئی ہیروئن سرشار کی ناز و ادا بھری نازنین۔ جسے دنیا میں سونے کھانے پینے اور عیش کرنے کے کسی بات کی فکر نہیں ـــــ میں نے غلط لکھا۔ ایک بات کی بے انتہا فکر ہے اور وہ عشق لڑانے کی۔ یہ زمانہ ہے فراغ البالی کا۔ پھر اس کے مقابلے میں پریم چند کی مظلوم عورت، اور راشد الخیری کی کچلی ہوئی بہو۔ یہ زمانہ ہے اقتصادی کش مکش کا اور سدھار کا۔ پھر لیجئے مزاح نگاروں کو ـــــ یہ ہنس سکے اور ہنسا گئے۔ چڑیا سی مگن، نہ آگے جانا نہ پیچھے ہٹنا۔ پھر ایم اسلم کی سادہ ہوئی لڑکی جسے سوائے ندی کے کنارے تتلے جانے اور [illegible] سے پریم کی پینگیں بڑھانے اور بھونڈے ن کے ساتھ گیت گانے کے اور کوئی کام نہیں۔ مس حجاب کی بے وقوف، جاہل اور بے مصرف دوشیزہ جسے سوائے چوہیوں سے ڈر کر بے ہوش ہو جانے کے اور کچھ نہیں آتا ـــ جہاں حسن و عشق کو بناوٹ نے اگرنبار کیا ہے۔ یہ زمانہ ہے [illegible] اور نگھنے کا۔ اور پھر کرشن کی زندہ عورت، بیدی کی کاروباری ہیروئن، منٹو کی جیتی جاگتی سب کی جانی پہچانی بے حیا رنڈی، عصمت کی بے چین منہ پھٹ اور بے شرم لڑکی، ستیارتھی کی خانہ بدوش، عسکری کی فلسفی میم صاحب ـــــ یہ زمانہ ہے زندہ رہنے کے لئے لڑ مرنے کا، کچھ تعمیر کرنے کے لئے جدوجہد کا، کچھ مٹانے کے لئے اور کچھ بنانے کے

لئے دین و دنیا کو تلپٹ کر دینے کا۔ جیسا کہ موجودہ فضا سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اب دیکھنا ہے کہ ہماری آئندہ زندگی کی ہیروئن کس شان سے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ خدا کے بعد عورت ہی کی پرستش ادب میں کی گئی ہے۔ یا شاید اس کا نمبر پہلے آتا ہے۔ اور پھر دنیا کی دوسری طاقتوں کا۔ جہاں تک اندازہ لگایا جا سکتا ہے آنے والی ہیروئن نہ تو ظالم ہوگی نہ مظلوم بلکہ صرف ایک عورت ہوگی۔ اور اہرمن و یزداں کے بجائے ادیب اسے عورت کا درجہ ہی بخشیں گے اور پھر تعمیر شروع ہوگی۔

(ایک بات)

---

custom to re-marry should live in misery, if jealous husbands should chop off their wives' noses. It would matter little to him if all respectable women were widowed or if the whole of their tribe was wiped out It is the drain in his own neighbourhood that he wants cleaned up. Whether the flowers in other people's gardens bloom or not is a matter of complete indifference to him, for in any case he has no access to such well-kept places. The heroine of present-day fiction may be an unclean outcaste Nonetheless she has been shaped and moulded by the vicissitudes of life itself and it is good that she has at last caught the artist's eye.

Faked Romance

Well, such is the story of our heroine. We have seen her as Sarshar's alluring courtesan, who ate and drank and was merry without a care in the world, except the worries of love-making. That was in the age of grace and good living. Next, we met her as "Prem Chand's" obedient housewife and Raashid-ul-Khairi's pathetic, downtrodden widow. That was in the age of economic stress and social reform Next came the humorists, full of fun and laughter, complacent and static And then the period of drowsiness, in which the sadhu's young daughter of M. M Aslam's stories wandered dreamily on the banks of brooks, singing among the butterflies and dallying with the passers-by ; and Hijab's stupid, indolent and futile maidens swooned away at the sight of a mouse and lived in a world of faked beauty and faked romance. And now, in our own day, we see our heroine as the living woman in Krishna Chandra's stories, as the business like woman in Bedi, as the lively, impudicious, common harlot in Manto, as the restless, outspoken unblushing girl in Ismet, as the nomad in Satyarthi and as the philosophising mem-sahib in Askari – all pointing to the fact that ours is the age of conflict ; of the struggle to live; to shape and to build ; to destroy, in order to create ; an age, in which everything between heaven and earth must be evaluated anew.

In fiction, woman is invested with a power greater than all other forces of nature, second only, if at all, to the Almighty. We must wait and see what role is assigned to her in the days to come. As far as one can peep into the future, the heroine of the coming age will be neither tyrant nor martyr, neither goddess nor hell-hag. She will be just a woman and writers will proclaim her as such. When that happens, the foundation of our fiction will have been well and truly laid.

had once borrowed her allurement and charm, she now adopted the submissive ways of the homely woman. So much so that unless she was the lowest of the low, it was difficult to recognise her as the prostitute. When the rebels at last sought her out, they were shocked to find her sunk so low that only the beggars, the coolies and the tonga-drivers knew where she lived. She was no longer the sweet little songstress of Sarshar's novels, but only a mangy and mean-looking cat rummaging about in the refuse heap. In the days gone-by, when man depended on her for his moments of supreme joy, how he had extolled her in prose and poetry, how fiction had paid homage to her charm and beauty! And how man had cast her aside now! Having installed a water pump in his house, he had let the wells of sweet water fall into disuse, till they were infested with reptiles and vermin. Panting with thirst, with his tongue hanging out of his mouth, he now returned in his desperation to the same wells.

Young Crusaders

Not only did he return, but he demanded that the municipality should clean them up and keep them in good repair. For, such a lot had to be done before the prostitute could once more become useful to him. So the rebels vehemently took up her cause and exposed this festering sore to the gaze of the world. Impecunious but spirited young men crusaded for her, for she, whom no one else seemed to want, could be a great source of comfort to them. They discovered all the beauties of the world in this wretched, down-and-out, fly-blow street-walker who lived in such filth and squalor because she was about the only kind of woman they could consort with. The respectable woman had so far receded from their life that they hardly knew anything about her and cared even less To them she was just a snooty, selfish sham of a woman who was outraged at every offer of love and indignant at the suggestion of male protection She lacked the squalid fascination of the harlot—not this time the demi-mondaine who scintillated in the highest social circles, but the hungry, street-bitch who tugged at every passer-by's leg and gave herself to every one for a handful of coppers. Her squalor, they argued, was not something to be shunned but a wrong to be redressed. If she had no morals or scruples, if she was filthy and disease-ridden, the fault was not hers but of the social system which permitted human beings to sink so low. The new writers, by dwelling on this theme, did a great deal of muck-raking which offended the fastidious, but they helped, nevertheless, by their frankness to lighten the burden of human misery. However disgusting the prostitute, she is after all part of our life and one cannot ignore her simply because she is unpleasant to contemplate. Because she is the common refuge of many frustrated and hungry men, because she is there for any one to have, the world denies her the status and dignity of woman. But she is even more useful than an ordinary woman. That is why the young crusader of to-day is more solicitous about her well-being than about the welfare of the woman-in-the-home whom he finds so aloof and remote. It is of no concern to him if women's education should not make much headway, if thousands of widows forbidden by

New Problem

In time, the supply outstripped the demand. There was a time when you had to go far to find a girl who had passed her school, now you found a whole crop of women graduates jostling with each other in the marriage market. This created a new problem. How could an educated woman marry any one who was not, at least, a civil servant? But Government unfortunately had forgotten to arrange that the number of its civil servants should keep pace with the number of educated women waiting to marry them. There was, therefore, a regular scramble for each eligible young man that appeared on the horizon and after he had been grabbed by the highest bidder, the rest of the crowd of women graduates returned to their perches and lay in wait for the next taking up various jobs in the meantime.

In the world of men, on the other hand although civil servants were few and far between, ill-paid school teachers and penniless doctors were rapidly growing in number. These unfortunate men had only two courses open to them - to marry some uncouth simpleton and be miserable for ever, or pine away, dreaming of a life of eternal bliss with this or that woman of education, refinement and charm. Some did both. They married as the fates ordained and at the same time continued to torture themselves with dreams of the ideal soul-mate. Most of them, of course, just fell in love with the chic young lady in the neighbourhood, who though utterly unapproachable was at least occasionally visible in the flesh.

So our world filled more and more with men and women whom nature had made for each other but whom the match-maker could not "suitably" pair off. It was a scene of poverty in plenty warehouses full of cloth and the streets full of naked people; food overflowing into the gutter and people starving by the thousand, all the men imprisoned in one cage, all the women in the other and Mrs. Grundy standing guard in the middle. Young women languished and became faded old maids, young men became sex-obsessed brutes; and the pangs of hunger dehumanized both and warped their souls.

At last the pent up forces found an outlet. These stresses and strains threw up a band of rebels, who set out to destroy, to uproot the old tree and plant a new one in its place, to demolish in order to build afresh. They first crossed swords with Mrs Grundy. She would not be easily bound and gagged. But what finally defeated their efforts was the impassable economic barrier that stood between them and the women of their choice. Thwarted and frustrated, man once more returned to the courtesan's bosom.

But the great courtesan of the early days was now just a common harlot. Gone was her glamour, for during the reign of the domestic heroine, she had been robbed of all her glory, and poverty and neglect had put their hideous stamp on her face. Some had sought refuge in marriage, some still plied their trade in the gutter, others camouflaged themselves as respectable women Years ago, the woman-in-the-home had thrown aside her veil to win back her man from the courtesan. The bankrupt courtesan now picked up this discarded symbol of modesty and tried to disguise herself in it. Just as the respectable woman

Unperturbed, the woman not only kept her hold, but set about tightening it, if she could. She discovered, for example, that her economic dependence on man was a bad chink in her armour which she must close up. She started in a small way, by taking in the neighbours' needlework, but very soon was found crawling about in every corner of the career market. The novelty of this role added to her charms. Let woman but appear in a new guise and even the husband would fall in love with her. She became a school-teacher and the old mullas gaped at her in wonder. She became a doctor and ancient apothecaries could hardly believe their eyes. She pleaded in law courts and men in the profession stammered and spluttered in her presence. The advent of the career woman was like a grand circus come to town: every one leaned out to watch and stare. Men shouted: "Look out, for there comes the New Woman", and fled in confusion. She advanced steadily and conquered new fields. The more she cut into men's wages, the more she captured their hearts.

This was too much of a good thing. This wage-earning heroine, physically fit and mentally alert, waylaid man like a brigand, So long as she was just saucy and pert and boisterous, she was rather delightful. Even if she was spoiled and moddlesome and difficult to shake off and somewhat of a nuisance, as long as she depended on man for her bread and butter, she was quite acceptable. Now and then, perhaps, she put out her claws but in the end she always made up for it by rubbing her soft body against his legs and putting him into good humour again. Vain and extravagant, she was nevertheless man's property, proud to live on his charity and willing to pamper him to earn her keep. For her, now, to fight man as his equal in the economic field and to cheat him of his last superiority over her was sheer highway robbery !

In fact, she became quite a terror and writers felt called upon to point out the error of her ways. They told her that independent women always came to grief; they were ravished, had illegitimate children, were seduced by clerks and doctors and school-teachers with whom they came into contact, were shunned and despised by society. They put husbands and fathers to shame for living on the earnings of their wives and daughters. They warned parents that in the schools and colleges, their daughters would learn nothing but lovemaking and would end up as unmarried mothers, for these weedy-looking school-masters were all gay Lotharios in disguise. Every other story written during this period is at pains to show how the school-girl and her teacher succumb to temptation, have a passionate affair and come to a pitiful end.

Deterred by this type of fiction, the heroine might have returned to her husband like a penitent who had learnt her lesson, but for some reason, just about this time women began to fetch higher salaries than men, which enabled our heroine to consolidate her newly acquired position. As education paid higher and higher dividends to women, it became less and less profitable to men.

Her success at first was partial, for though the courtesan had retreated, the field was held for a while by the Occidental and the Parsee, both of whom were regarded as "fashionable" types and had worked their way into many of our stories. But she, who had vanquished the courtesan, was not likely to be daunted by these. She knew, of course that as long as she stayed at home, there were dangers abroad that she was unable to avert. Confined to the four walls of the house, how could she dispel the loneliness that man would feel away from home? For, when on his jaunts, he rather fancied a woman in one hand as much as he fancied a walking-stick in the other. She was the tonic for domestic use only; how could she sustain him during his business hours, for example? True enough, as a temporary expedient, man did cast hungry looks on the typist girl or the manager's beautiful daughter, or found others to warm his blood. But the domestic heroines of such novels of the period as *Godari ka Lall*, *Rcushanak Begum* and *Zohra Begum* kept up the fight and very much held their own against such pirates.

The role of the docile, homely woman does not, however, seem to have satisfied her for long; for, in the next phase of her career, we find her very much bolder than she had ever been before, archly flirting with her cousins, with her cousins' friends and with the neighbours. She was now transformed into the saucy, boisterous, unabashed, self-assertive female that we find, for example, in Azim Beg's stories. The fact that she was still very much the woman-in-the-home living in purdah, added piquancy to the situation and made her sportiveness even more devastating. Beside her fetching ways, the erstwhile charms of the courtesan appeared commonplace, and "Prem Chand's" submissive and goody-goody heroines, insipid and irritatingly inane and their humility almost contemptible. The docile heroine now gave place to a much more robust and hearty female. True, she was unlettered, with no claim to grace or refinement, but she was full of crude vitality and primitive fun. She slapped and kicked and punched and played practical jokes and was up to all sorts of pranks. To the man with the modest income, such a vivacious wife was a great source of joy, brightening up his little home and lending colour to his dreary existence. Life for him had, indeed, become heavenly.

Willing Victim

The male, it is true, is ever the willing victim of the female. After all it was he, who finding even Paradise desolate without her, made her out of his rib. How gladly he hands over the reins to her, be she courtesan or wife, and follows her around. The harder he is driven and the more he is pulled about and whipped, the happier he feels. But once in a while, the limit is reached and the woman turns. It was all very well for our domestic heroine to be the queen of his heart, but when she entwined herself round him and began to bully and dominate and tantalize him and stood guard over his every word and act, man was exasperated. The first groan was at last heard in "Patras," and, later, Azim Beg and Shaukat Thanvi and many others joined the chorus. Before long, our fiction was crowded with male characters like Chacha Chhakkan, Munshiji, Mirzaji, etc, all of whom raised their voice in protest against woman's tyranny.

In those days were household drudges. They were the unappetising housewives and dowdy maids-of-all-work, from whom men turned to courtesans for heartsease and pleasure. The courtesan of Sarshar's days was not just a vulgar mercenary. She lived as graciously as any blue-blooded lady, except that she was even more refined and possessed greater wit and charm and gaiety. She was the town-garden, maintained by public donations for the pleasure of the community. Not every one could afford a fine house, adorned by an accomplished and elegant wife, flower-decked and attar perfumed. So man adopted a convenient formula for smooth living—in the home, the wife to bear him children and to minister to his daily needs; in the street, the courtesan to appease the hunger of the soul. A most useful compromise devised that could thus accommodate both the domestic ideal and the romantic urge.

Jealous of the courtesan, the woman-in-the home grew restive. When man was away from home seeking joy in the arms of the courtesan, she made eyes at the neighbours. Those husbands who had already found the public garden an expensive resort, promptly returned home, arguing that after all the little that belonged to you was better than the much that belonged to all. Having won the first round, the woman-in-the-home gained a new confidence and proceeded to fight the courtesan with her own weapons.

Woman Stoops to Conquer

She proceeded slowly and with caution. At first, she stooped to conquer and insinuated herself into man's affection by following the path of docility and self-abasement. In time, Sarshar's imperious courtesan was vanquished by "Prem Chand's" homely woman, and henceforth this soft-treading, feet-kissing, modestly-veiled, obeisant creature was found crawling shyly across the pages of fiction. Those who used to feast their senses on the riot of colour in the public park, were suddenly attracted by the modest little violet growing in their back garden. Surprised, and somewhat proud, to find it there, they began to tend it with gentle care and affection. The courtesan's sway was seriously challenged. Her blandishments were now found to be distasteful and her charms, which had once enslaved the hearts of men, were put down as mere tricks of the trade. The water-pump in the public square was contaminated, declared the male—and began to dig a well in his own courtyard. But every day, the well became deeper and deeper, till at last man lost his foot-hold and began to drown.

This stung the courtesan to exasperated fury. But her day of glory had passed. While she had been resting on her laurels, the modest, ingenuous, homely female had stolen a march over her by using weapons both old and new. On the ruins of the courtesan's world, the woman-in-the-home built her tower of victory and reigned supreme. Men who used to crush her under foot, now took up cudgels on her behalf. Chivalrously, they pilloried themselves and railed against their own kind for their past neglect of her. She watched this tournament with quiet confidence and took no sides. The docile believer in ahimsa fought no one, but just as Gandhiji exasperated the rulers by his acts of renunciation, she, with her downcast eyes and submissive ways, confounded the enemy from behind the veil.

"YOU clap with two hands, not with one," says the proverb. In literature, the two "hands" are the hero and heroine of fiction. No doubt there is a type of literature which does without them. But that is like striking your hand against the sole of your foot—you make some noise which echoes within the pages of the book, but seldom travels beyond them to the common reader. Banish the hero and the heroine and most literature would be hard to swallow and would stick in the throat like dry bran.

Make a performing monkey and his mate dance to the rattle of a dugdugi and you collect a crowd. Preach and exhort and you lack an audience. People never take kindly to the mosque and the school. So when you have something to say, you lead forth the performing monkey and his mate on a string and rattle the dugdugi. You exhibit the tactics and exploits of the hero and the heroine and collect a crowd. You tickle the senses and seduce the emotions and thus achieve your end. In short, you employ the same stratagem as the wise instructor who wins over his pupil by pretending that what he is about to teach them is just another game, like kabaddi or tip-cat. Sugar-coat the bitterest pill and people will swallow it with delight.

Literature Wedded to Life

How else should the ancient *Mahabharata* and *Ramayana* be as fresh after all these centuries as though it all happened only the other day? Azim Beg Chughtai tried to abolish the purdah by quoting from the Quran and only drew the imprecations of the maulvis on his head. But in *Sharir Bivi* and *Coal-tar* how easily was the veil rent with the help of his lively heroines! Were it not for their heroes and heroines, Rasshid-ul-Khairi and "Prem Chand" would now be rotting on the musty shelves of libraries instead of living in the hearts of men. Literature is wedded to society, to history; in other words, to life. Part them asunder and they both wilt and die. Banish the hero and the heroine from literature and you banish life, leaving a void behind.

Of the two, I wish to talk of the heroine and of the social level at which our fiction found her from time to time. For, she is like Jamshed's wine-bowl in which the whole universe and all eternity were reflected. Fix our gaze on her and the entire economic, social and political panorama of her age unfolds before our eyes.

Look, for instance, at the heroines in *Fasana-i-Azad*. They leave you in no doubt that the woman who really mattered in that age was that embodiment of refinement and charm, the courtesan. This is only to be expected, for where could Sarshar have come across a respectable woman in those days, above all a respectable Muslim woman? Respectable women

THE HEROINE IN URDU FICTION

By
ISMET CHUGHTAI
Translated by
A. S. BOKHARI

As a writer of short stories in Urdu, Ismet Chughtai is well known for her studies of middle class life, her intimate knowledge of woman's mind and her pungent prose. This is one of her critical articles appearing in her latest collection "Ek Bat".

قدیم یونانی حکما اور اُن کے خیالات

(۱)

مصنفین فلسفہ کی تاریخ کو عام طور پر حکما کے اس گروہ سے شروع کرتے ہیں جو چھٹی صدی قبل مسیح میں ایشیائے کوچک کے کنارے یونانیوں کے بسائے ہوئے شہر ملیطس میں آباد تھا۔ یہ حکما مسئلہ تغیر کے متعلق بہت کچھ سوچتے رہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ یہ دنیا عالم کون و فساد ہے۔ اشیاء بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ تعمیر کے ساتھ تخریب اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہوتی رہتی ہے۔ لیکن چونکہ وجود میں کوئی چیز بھی عدم مطلق سے وجود میں نہیں آتی۔ اور نہ وجود سے عدم مطلق ہی میں چلی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بالکل ہی برباد نہیں ہوتی اور نہ کبھی دنیا اختتام ہی پر پہنچتی ہے۔ ہر ایک چیز تغیر کے لامتناہی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مگر آخر یہ تغیر کس چیز کا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو مختلف صورتوں میں آ کر مختلف اشیاء اور اجسام بن جاتی ہے؟ وہ کون سا مادۂ بنیادی ہے جو متغیر ہو کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے؟ یہ ایک معمہ تھا جس کو حل کرنے پر قدیم یونانی حکما نے اپنی کمر ہمت باندھی۔

سب سے پہلے تھیلس نے پانی کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ اس کے بعد اینکسی مینڈر آیا اور اس نے کہا کہ یہ مادۂ بنیادی ایک غیر محدود مادہ ہے جس میں سے مختلف اجسام بنتے ہیں۔ اینکسی مینیز نے اس کو انجرات کہا جو رقیق حالت میں حرارت پا کر آگ بن جاتے ہیں یا منجمد حالت میں ٹھنڈے ہو کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں

مسیح سے ۴۹۴ سال پہلے ایرانیوں نے حملہ آور ہو کر ملیطس کو تاراج کر دیا اور حکما کے اس گروہ کا اپنے مرکز ملیطس میں ہی خاتمہ ہو گیا مگر انہی ایام میں ملیطس سے کچھ فاصلے پر شہر افیسس میں ایک فلسفی ہرقلیطس نامی موجود تھا جو ملیطس کے فلسفیوں کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ ہرقلیطس کو دنیا کی سب باتیں قابل تاسف و افسوس معلوم ہوتی تھیں۔ اسی لئے بعد میں وہ "حکیم باکی" کے نام سے مشہور ہو گیا جس طرح سے کہ دیمقراطیس کو لوگ "حکیم ضاحک" کے نام سے پکارتے تھے کیونکہ اس کے لئے زندگی کی سب باتیں ذریعہ فرحت و انبساط تھیں۔

ہرقلیطس کے نزدیک کائنات کا مادۂ بنیادی آگ ہے۔ وہ تو یہ کہتا تھا کہ ہماری قوت فکر بھی اس مادی آگ کا ایک حصہ ہے جس سے سرعت سے شعلہ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ کسی طرح بھی خیال کی سرعت سے کم نہیں۔ اور شعلے کا آخر لا مرسوا ہو جانا خیال کی اس بے قراری اور بے ثباتی کو ظاہر کرتا ہے جو شراب کے نشے کی حالت میں واقع ہوتی ہے۔

مگر تاریخ فلسفہ میں ہرقلاطیس کی اہمیت اس وجہ سے نہیں کہ اُس نے بھی اور حکما کی طرح کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ جس مسئلہ پر اُس نے بہت زور دیا ہے وہ مسئلۂ تغیر ہے۔ تمام دنیا ایک بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے جو ہر وقت اپنے آپ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ہم ایک ہی دریا میں دو دفعہ داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جس پانی میں ہم نے ایک دفعہ پاؤں ڈالا، دوسری دفعہ پاؤں ڈالتے وقت وہ کہیں کا کہیں بہ جاتا ہے۔ اس مسئلے کو مان لینے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے تمام علوم بے سود ہیں؟ جب اشیا کی حالت ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے۔ تو جو بات ہم کسی چیز کے متعلق اس وقت بیان کرتے ہیں۔ وہ ہمارے منہ سے نکلتے ہی غلط ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ چیز بذات خود، اس وقت تک بدل کر کچھ اور ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہرقلاطیس کے بعض معتقدوں نے اسی لیے کلام کرنا ترک کر دیا تھا اس کے بجائے وہ اشاروں سے باتیں کرتے تھے۔ کیونکہ جتنے وقت میں ایک جملہ تکمیل کو پہنچتا ہے اتنے وقت میں اُس جملہ کا مقصود غلط ہو جاتا ہے۔ بعض معتقد تو یہاں تک کہتے تھے کہ ہرقلاطیس کا یہ کہنا کافی نہیں کہ ہم کسی دریا میں دو دفعہ پاؤں نہیں ڈال سکتے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم کسی دریا میں ایک دفعہ بھی داخل نہیں ہو سکتے ———— کیونکہ ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی دریا ایک حالت میں نہیں ہوتا اور ہمارے پاؤں ڈالتے ڈالتے وہ بدل کر ایک دریا ہو، بلکہ ایک نیا دریا ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے۔

ہرقلاطیس کے مسئلۂ تغیر کے مندرجہ بالا نتائج کو ترقا تیس نامی ایک فلاسفر سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ترقا تیس ہرقلاطیس سے سو سال بعد میں ہوا ہے۔ اور افلاطون اپنے بچپن کے زمانے میں اسی ترقا تیس کا شاگرد رہا تھا۔ افلاطون کی پیدائش مسیح سے ۴۲۷ سال پیشتر ہوئی۔ اُس نے اوائل عمر میں جو کچھ اپنے استاد سے اس ہمہ گیر تغیر کے متعلق سنا اُس نے اسے اس بات کی ترغیب دلائی کہ وہ ایسی چیز ڈھونڈے جو اس گردش سے بالاتر ہو۔ جو ازل میں جیسی تھی ابد تک ویسی ہی رہے اور جس کی نسبت اگر انسان کوئی واقفیت حاصل کرے تو وہ واقفیت اور وہ علم ہمیشہ کے لیے درست اور کارآمد ہو۔ یہاں ہم کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ہرقلاطیس اور اس کے پیرو مسئلۂ تغیر کا اطلاق محض محسوسات پر کرتے تھے کیونکہ محسوسات کے علاوہ وہ اور کسی قسم کی حقیقت یا وجود کے قائل ہی نہ تھے۔ اس لیے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ان معنوں میں مادیت کے قائل تھے جن معنوں میں کہ آج کل مادیات کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے محسوسات اور غیر محسوسات کے درمیان خطِ تفریق کبھی کھینچا ہی نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ قوتِ خیال بھی اسی طرح جگہ گھیر سکتی ہے جس طرح مادہ اور مادہ بھی اپنے اندر قوتِ خیال رکھتا ہے۔ افلاطون عرصے تک کسی غیر متغیر و غیر محسوس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اور آخر میں اُس نے منزل پر پہنچنے کے لیے وہ راہ اختیار کی جو ایتھنز کے نامور حکیم سقراط نے اُس کو بتائی۔

دنیا میں بہت سی شاندار ہستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اخلاف کے لیے ورثے میں اپنی کوئی تحریر یا مکتوب یا تصنیف نہیں چھوڑا۔ اُن کا حال اُن کے ہمعصروں کی روایتوں سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ سقراط بھی انہی ہستیوں میں سے ایک تھا۔ اُس کے حالات زیادہ تر ارسطو فانیس نامی شاعر کے ایک ڈرامے سے ملتے ہیں جس میں سقراط کا مضحکہ اڑایا گیا ہے اور جب سقراط پچاس برس کی عمر کا تھا۔ تو پہلی دفعہ وہ ڈراما اسٹیج پر کھیلا گیا اور اس کے کچھ حالات نامور جرنیل زینوفون کی اُس تصنیف سے بھی کچھ ملتے ہیں جو سقراط کی موت کے بعد لکھی گئی اور یا افلاطون کے مشہور و معروف "مکالمات" سے کچھ پتہ چلتا ہے۔ ارسطو فانیس، زینوفون اور سقراط کی طرح افلاطون بھی ایتھنز کا باشندہ تھا۔ جوانی کی عمر ہی میں وہ سقراط کا شاگرد ہو گیا۔ بعد میں جب اُس نے وہ "مکالمات" لکھے جن کے اندر ڈرامے کی شکل میں اس کے اپنے اُستاد سقراط اور سقراط کے معترضین کے مباحثے مندرج ہیں تو اُس نے سقراط کے ذاتی خیالات کے علاوہ وہ نتائج بھی اُسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیے جن پر وہ سقراط کے

کسی مولوی کے گھر تو ہم بھی دیکھتے ہیں بیوی کیسی بنیں سنوری رہتی ہیں۔ ان خیالات نے
[illegible]زادی کو ہفتوں ماسے بنگان اور اپنی تنگی کی طرف سے پریشان رکھا۔ لیکن آدمی کا
دل ہر وقت یکساں نہیں رہتا۔ وہ ایک بار پھر سنبھلی اور خدا جانے کس کا مرنا سنا تھا
[illegible] دنیا کی بے ثباتی کا تصور بندھا اور اس نے سوچا دنیا ہے کیا چیز۔ لاکھوں کروڑوں
آدمی پیدا ہوتے اور ایک وقت خاص تک زندہ رہتے اور آخر کا[illegible]۔
بجنسہ کھیتی کا سا حال ہے کسان نے زمین کو جوت بو کر چھوڑ دیا[illegible]یا۔ ابھی
تھوڑے دن ہوئے کھیت میں خاک پڑی اڑ رہی تھی اور نظر بھر کر دیکھنے کو جی نہیں چاہتا
تھا یا اب لگا غلہ لہلہانے۔ جس کی سبزی سے آنکھوں کو طراوت اور دل کو فرحت پہنچ[illegible]
کسان ہے کہ کھیت کو دیکھ کر مارے خوشی کے پھولا نہیں سماتا۔ اور[illegible] دار امیر
صبح و شام سیر دیکھنے کے لیے اس کے گرداگرد منڈلاتے[illegible]
پھل آیا وہ جوبن تو گیا گزرا ہوا اگر کسان کی جان اس میں لڑی ہے۔ بادل آیا اور سہم گیا کہ
کہیں اولے [illegible] پچھوا ہوا چلی اور سرد ہو گیا کہ ایسا نہ ہو پالا مار جائے۔ ارے خدا خدا
کر کے غلہ طیار ہوا کاٹ کر چلتے ہوئے کھیت ہے کہ بڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے [illegible]
وہی سناٹا۔ وہی بے رونقی۔ وہی اداسی۔ دوسری فصل آئی اور [illegible] پھر
دنیا حقیقت میں ایک عجائب خانہ ہے جس میں ایک سے ایک چیزیں اچنبھے کی ہیں۔
آدمی عجیب۔ اس کا پیدا ہونا عجیب۔ اس کا جینا عجیب۔ اس کا مرنا سب سے زیادہ
عجیب۔ اتنی تو مختصر زندگی کہ بہت سے بہت ہوئی تو ساٹھ ستر اور وہ بھی بے ٹھور
بے ٹھکانے کہ صبح ہوئی تو شام کا بھروسا نہیں شام ہوئی تو صبح کا اعتماد نہیں۔ بچے کو
جوان ہونے کا یقین نہیں جوان کو بڑھاپا دیکھنے کا اذعان نہیں۔ اور اس پر کیسے کیسے ارادے کیسے کیسے
حوصلے کیسے کیسے سامان کرگھا[illegible]سدا کا رہنا اور ہمیشہ[illegible] اور عقل
کے ساتھ نادانی۔ ہوشیاری اور ہوشیاری [illegible] ساتھ غفلت [illegible] اور مجبوری کے
ساتھ سینہ زوری۔ یہ انتظام الٰہی نہیں تو پھر کیا ہے فرض کرو۔ کہ ایک فرشتہ انسان
اور انسان کے حالات سے ناواقف محض تھوڑی دیر کے لئے آسمان سے زمین پر اتر آئے

بتلائے ہوئے راستوں پر چل کر خود پہنچا تھا۔

ارسطوفانیس نے اپنے ڈرامے میں قدامت پسند اہلِ ایتھنز کا نمائندہ بن کر سقراط کے نئے نئے عقیدوں کی ہنسی اڑائی ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ نئے نئے خیالات اور بے منطق بحثیں مذہب اور اخلاق کے لئے از حد مضر ہیں۔ برخلاف اس کے زینوفن سقراط کو ایک کامل روحانی مددگار، پرہیزگاری اور نفس کشی کا ایک مجاہد اور ان تمام لغو اور بے ہودہ خیالات کا جو تو ہم پرستی اور گمراہیوں کی اشاعت کا باعث نہیں ہو سکتے دشمن بیان کرتا ہے۔ افلاطون نے اپنے استاد کی جو تصویر کھینچی ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس طرح مختلف زاویہ ہائے خیال سے ایک ہی شخصیت کو ان دو طریقوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس روحانی ترقی کے زمانے میں اس زبردست ہستی کے اندر ایک ایسی روحانی تڑپ تھی جو اس کے ہم صحبتوں کے دلوں میں برقی رو کی طرح سرایت کر جاتی تھی۔ اس کی شکل و صورت اگرچہ حسین نہ تھی لیکن اس میں وہ مقناطیسی کشش تھی جو شکل و صورت کی محتاج نہیں۔ وہ ایتھنز کے نوجوانوں کے دلوں کو اس کی طرف کھینچ لے آتی تھی جن کو اس کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع حاصل ہوا۔

وہ جانتے تھے کہ سقراط کی گفتگو محض منطقی ڈھکوسلے ہی نہیں۔ سقراط منطقی یا وہ گو نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ اس کو الہام ہوتا ہے۔ اور خدا نے اس کو ہدایتِ بنی نوعِ انسان کے اہم کام پر مقرر کیا ہے۔ یہ خیال اس کے دماغ کو ایک نئی قوت اور اس کی زبان کو ایک انوکھی بلاغت بخشتا تھا۔ اس کی آزاد زندگی ان تمام بندشوں سے۔ ہاں جن کی وجہ سے ایک دنیا دار پابہ زنجیر ہوتا ہے۔ اس کی روش میں غضب کی سادگی اور اس کی عادات میں اعلیٰ درجے کا ضبط تھا۔ ارسطوفانیس جو سقراط اور اس کے معتقد کو ایتھنز کے نوجوانوں کے لئے مخرب اخلاق سمجھتا تھا۔ اپنے ڈرامے میں سقراط کی زندگی کا وہ درخشاں پہلو ہرگز نہیں بتا سکتا تھا جس پہلوئے حیات نے افلاطون ایسا افلاطون کی طرح اور سینکڑوں کو سقراط کا گرویدہ کر رکھا تھا۔ ۳۹۹ قبل مسیح میں جب سقراط کی عمر ۷۰ سال سے کچھ زیادہ تھی۔ اہلِ حکومت نے اس پر دو الزام لگائے اول یہ کہ وہ نوجوانوں کے اخلاق کو خراب کر دینے کا باعث ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنے ملک کے دیوتاؤں کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ حکم دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے زہر کا پیالہ پی کر ہمیشہ کے لئے اپنی غیر مفید ہستی کو مٹا دے۔ سقراط اگر چاہتا تو جیسا کہ قانون اس کو اجازت دیتا تھا۔ اپنے جرم کے کچھ حصے کا اعتراف کر کے اپنی سزا میں تخفیف کر سکتا تھا۔ اگرچہ خود نادار تھا مگر اس کے پیرووں میں سے اکثر ایسے متمول تھے جو اس کے لئے بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کر سکتے تھے اور صرف یہی نہیں۔ بلکہ اگر وہ چاہتا تو اس کی ایک جنبشِ ابرو کی تعمیل میں اس کے بے شمار دوست اس کو قید سے نکال لے جاتے اور وہ اپنی باقیماندہ عمر اپنے وطن سے باہر آرام و آسائش میں کاٹتا۔ مگر مرتے دم تک اس کو اپنی بے گناہی کا یقین رہا۔

قانون کی خلاف ورزی کو وہ گناہ سمجھتا تھا۔ اور قید سے بھاگ جانے کا اس کے دل میں کبھی خیال تک بھی نہ آیا۔ جو الزام اس پر لگائے گئے ان میں سچائی صرف اتنی ہے کہ سقراط بعض ایسے گروہوں سے میل جول رکھتا تھا جنہوں نے مذہب میں نئی نئی رسمیں اور بدعتیں پیدا کیں۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اس نے بذاتِ خود مذہب کی علانیہ مخالفت کی ہو۔ اگرچہ اس کا کبھی کبھی الہام وغیرہ کے متعلق ذکر کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے عقیدوں کا چنداں قائل نہ تھا۔ سقراط کی تعلیم کا نوجوانوں پر یہ اثر ہوا کہ ان میں راست روی اور ضبطِ نفس کا مادہ پیدا ہو گیا۔ مطلق العنان زندگی کی بد اخلاقیوں اور بد عنوانیوں سے کنارہ کش ہو کر وہ اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلنے لگے۔ وہ پاکیزگی اور نیکو کاری کو زندگی کا مقصدِ اعظم سمجھ کر اسے ہمیشہ اپنے مدِ نظر رکھنے لگے۔ تخریبِ اخلاق کا شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ایامِ جوانی میں سقراط کی دوستی چند ایسے اشخاص سے تھی۔ جو بعد میں اپنی باغیانہ حرکتوں کے لئے بدنام ہو گئے۔ سقراط اپنی حکومت کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ پھر بھی مرتے دم تک قانون کا پابند رہا۔ اس کے مشہور جانبداروں میں سے افلاطون تو سپارٹا کی حکومت کو ایتھنز پر ترجیح دیتا تھا۔ اور زینوفن ایتھنز کو چھوڑ کر سپارٹا کی فوج میں شامل ہو گیا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ

ہرقلاطیس کے عقیدۂ تغیر کی وجہ سے افلاطون کا دل تذبذب کی حالت میں تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر ہر ایک چیز ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے تو علم کے کیا معنی ہو سکتے ہیں اشیائے تغیر کی وجہ سے ان کا علم بھی ہر لحظہ متغیر ہونا چاہئے اور متغیر علم کا حاصل کرنا بے سود ہے۔ ان خیالات سے اس کے دل میں کسی ایسی چیز کی جستجو پیدا ہوئی جس کی حالت ابدی ہو اور جس کا علم ہمیشہ کے لئے درست ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے وہ سقراط کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر اس علم صحیح پر پہنچا۔

سقراط ایتھنز میں فرقہ سوفسطائی کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں میں "سوفسطائی" محض دانا یا حکیم کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دنیا سقراط کو "سوفسطائی" کہتی تھی۔ مگر سقراط کے پیرو اس کو ان لوگوں کا دشمن خیال کرتے تھے جن کو "سوفسطائی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ لوگ اپنی تعلیم سے اس بات کی اشاعت کرتے تھے کہ نیکی اور بدی میں تمیز قدرت کی مقرر کردہ اور ابدی نہیں ہے۔ اس تمیز کا انحصار محض رسم و رواج پر ہے۔ جس فعل کو ایک حالت میں "نیکی" کہا جاتا ہے، وہی فعل بعض اور حالات کے ماتحت "بدی" ہو جاتا ہے۔ جس کا خطرہ تھا کہ ایسے بیہودہ خیالات سے وابستہ مرد زندگیوں کے عقیدے سے متزلزل ہونے لگ گئے۔ اور اخلاق انسانی ایسی ہی بحثوں سے معرض خطر میں تھا۔ اس وقت سقراط آگے بڑھا اور اس نے اپنی نیک نیتی اور صحیح الدماغی سے لوگوں کی رہنمائی کی۔ اس نے کہا "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک کام جو ایک حالت میں ٹھیک ہوتا ہے۔ کسی اور حالت میں برا ہو۔ اور اس صورت میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ فعل "نیک" یا "بد" ہے۔ مگر ہمارے ان فقروں سے کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ نیک و بد کچھ معنی اور حقیقت ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کی دیانتداری بیان کریں تو ممکن ہے کہ ہم کو اس کی نیت کا حال معلوم نہ ہو یا ہم حالات سے پوری طرح واقف نہ ہوں اور ہماری رائے اس کی دیانتداری کے متعلق غلط ہو۔ ہم کہیں گے "میرا خیال تھا کہ وہ دیانتدار ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں۔" مگر ہم یہ کبھی نہ کہیں گے کہ "ہم جانتے ہی نہیں کہ دیانتداری کیا چیز ہے۔" کیونکہ ہم اگر دیانتداری ہی سے ناواقف ہوتے تو غلط یا صحیح رائے کس طرح قائم کر سکتے تھے۔ اس لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ان الفاظ سے جن کو منطق میں موضوعات کہا جاتا ہے، پوری طرح واقف ہوں۔ مثلاً سچا، منصف، بہادر وغیرہ اور ہر ایک کی تعریف کر کے اس کے معنوں کی توضیح کریں؟

سقراط کے ان خیالات نے کہ انصاف، بہادری وغیرہ وغیرہ حقائق ابدی ہیں اور ان کے معنوں کی تحلیل ان کی تعریفوں سے ہو سکتی ہے، افلاطون کو اندھیرے میں شمع ہدایت دکھائی۔ ہرقلاطیس کے عقیدوں نے علم صحیح کے رخ تاباں کے آگے شک کی ایک دھندلی سی نقاب ڈال رکھی تھی۔ جس کو سقراط نے اپنے افواہ ادراک سے تار تار کر دیا۔ یہ حقائق محسوسات کے نظریے سے باہر ہیں۔ جن اشیا کا احساس ہمیں اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے، ان میں سے ہر ایک ان موضوعات میں سے کسی نہ کسی کی گواہی ہوتی ہے۔ مگر اس موضوع کو بذات خود ادراک سے تعلق ہے۔ مذکورہ امر سے سقراط ان باتوں سے اس نتیجے پر پہنچا کہ عالم محسوسات کے علاوہ جس میں اشیا ہمیشہ انتقال و تغیر کی حالت میں رہتی ہیں اور جہاں کسی چیز کا علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا، ایک اور دنیا حقائق ابدی کی بھی ہے۔ اور ان حقائق کا علم بھی انہی کی طرح ابدی ہے۔ عالم متغیر کی ہر ایک چیز کے ساتھ ایک حقیقت ابدی مخفی ہے اور جو رائے ہم عالم متغیر کی کسی چیز کی نسبت دیتے ہیں اس میں اس حقیقت ابدی کا علم مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ "فلاں شخص دیانتدار ہے" تو اس فقرے میں اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ ہمیں دیانتداری کی حقیقت کا علم ہے۔

سقراط نے اس بارے میں اپنے خیالات اخلاقیات کے دائرے تک ہی محدود رکھے مگر افلاطون بآسانی اس سے بہت آگے چلا گیا اور اس نے ان متغیر اور ابدی حقائق کا اطلاق ہر ایک چیز پر کیا۔ مثلاً یہ کہنا کہ خط ا ب خط ج د کے مساوی ہے، مساوات کے علم کو تسلیم کرتا ہے تو مساوات گویا ایک ایسی حقیقت ابدی ہے جس کا احساس حواس خمسہ سے نہیں بلکہ ادراک سے ہو سکتا ہے۔ "مساوات" بذات خود

میں کیا کرتے تھے۔ جس طرح کا تعلق افلاطون کے عقیدۂ حقائق ابدی اور فیثا غورس کے عقیدۂ اعداد میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کا تعلق ان دونوں حکیموں کے عقائدِ روح میں بھی ہے۔ افلاطون کے مطابق روح ایک ایسا رشتہ ہے جو حقائق بالا کی غیر فانی دنیا (جس میں کہ روح اپنی عقل اور ادراک سے سب چیزوں کو سمجھتی جانچتی ہے) اور فانی۔ تغیر پذیر۔ مادی دنیا کے درمیان قائم ہے۔ علاوہ ازیں یہی موخر الذکر دنیا کے تغیرات۔ حرکت اور انتقال سب روح کی بدولت ہیں۔ روح ہی تمام حرکت کا منبع ہے ——————— یہی ایک ایسی چیز ہے جو بذاتِ خود حرکت کر سکتی ہے۔ اجسام صرف اسی حالت میں حرکت کر سکتے ہیں۔ جب یا تو ان کو کوئی دوسری چیز حرکت دے۔ یا (جیسا کہ تمام جانداروں کی کیفیت ہے) خود ان کے اندر روح موجود ہو۔ جب روح کی سب سے بڑی علم پردازی اس کی وہ کیفیت نفسی ہے جس کی بدولت وہ ہر ایک حقیقت ابدی کو سمجھتا ہے تو افلاطون اس کے سوا اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کہ روح بھی ان حقائق کی طرح غیر فانی ہے۔ افراد کون و فساد کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے اور ان کے لئے غیر فانی ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر زندگی اور موت کا یہ تسلسل اور روح جو اس انتقال لامتناہی کا سبب ہے دونوں ابدی ہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس ابدی روح سے افلاطون کی مراد روحِ کائنات تھی نہ زید۔ عمرو۔ بکر کی روح۔ کیونکہ کسی ایک فرد کی روح تو خود اس فرد کی طرح موت اور زندگی کے سلسلے میں بندھی ہوتی ہے۔ اور نہ صرف حقائق ابدی کی فہیم ہے۔ بلکہ ان اوہام اور خواہشات کا مصدر بھی ہے۔ جو ہمارے فانی جسم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو پھر کسی ایک فرد کی روح کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے؟ افلاطون کے دفترِ خیالات میں سے اس سوال کا جواب ڈھونڈھنے کے لئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ افلاطون کے نزدیک فلسفہ صرف اُن نتائج کا نام ہے۔ جو غیر ہستیوں کے متعلق غور و فکر کرنے کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر فلسفے سے کسی سوال کا جواب طلب کیا جا سکتا ہے تو صرف ایسے سوال کا جس کا تعلق اُن غیر متغیر ہستیوں سے ہو اور بس۔ یوں تو تغیر پذیر حقائق کی نسبت کوئی سوال اگر کئے جائیں تو اُن کا جواب کہیں نہ کہیں سے ضرور مل سکتا ہے۔ مگر فلسفہ ان جوابات کے متعلق اپنے علم حقائق ابدی کے ساتھ مقابلہ کر کے صرف یہ بتا سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہیں۔ یا غلط۔ اس لئے جہاں پر ہمیں کوئی ایسا مورخ یا پیشین گو نہ مل سکے۔ جو ہمیں کسی چیز کے ماضی یا مستقبل کے حالات سے آگاہ کر سکے۔ تو ایسی حالت میں ہمیں اپنے فہم کے موافق ایک افسانہ گھڑ لینا چاہئیے جس کی کوئی بات علم حقائق ابدی کی مخالفت نہ کرتی ہو اور اس افسانے پر ہی اکتفا کرنی چاہئیے۔ افلاطون کے مکالمات میں کئی ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً دنیا کہاں سے پیدا ہوئی؟ تمدن کا آغاز کس طرح ہوا؟ افراد کی ارواح کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات درجہ یقین تک پہنچ چکی ہے کہ افلاطون بحیثیت ایک معمولی انسان کے ایک فرد کی روح کو بھی کسی حد تک ابدی مانتا ہے۔

اگرچہ وہ اپنی اس قیاسی رائے کو فلسفے میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب کسی ریاضی کے سوال کا صحیح حل کسی کے سامنے پہلی دفعہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ اس حل کے صحیح ہونے کو فوراً پہچان لیتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ غالباً یہ بات اُس شخص کو کسی پہلے جنم میں معلوم تھی۔ مگر وہ اُسے بھولا ہوا تھا۔ جب اُس کے سامنے وہ حل لایا گیا تو اُس کی یاد تازہ ہو گئی اور اُس نے فوراً صحتِ حل کو پہچان لیا۔ اس بات کے ممکن اور اغلب ہونے میں افلاطون کو کوئی شک نہ تھا۔ کہ ہر ایک روح جون بدلتی رہتی ہے اور اس کے ہر ایک جنم کی نوعیت اُس کے پہلے جنم کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح کا ایک عقیدہ، بدھ مذہب کا بھی ایک رکن ہے۔ بدھ مذہب اپنے پیرووں کو مختلف جنموں میں نیکیاں جمع کرنے کے بعد آواگون سے رہائی اور اس زندگی کے رنج و کرب سے نجات کی امید دلاتا ہے۔ مگر افلاطون چونکہ بدھ کی طرح اس زندگی کو سراسر عذاب نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے اُس نے کبھی ایسی مکتی کا خیال نہیں کیا۔

فیثاغورثیوں کے علاوہ افلاطون اپنے خیالات کے لئے ایک اور فرقے کا بھی ممنون تھا۔ اس فرقے کو فرقۂ ایلیائی کہا جاتا ہے اس کا بانی فرمانیدیس نامی ایک حکیم اٹلی کے جنوب میں شہر ایلیا کا باشندہ تھا۔ افلاطون نے اس حکیم کا ذکر اپنے ایک مکالمے میں کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سقراط کی جوانی کی عمر میں اُسے ملنے کے لئے ایتھنز آیا تھا۔ ہرقلیطس کے مسئلہ تغیر کے متعلق فرمانیدیس کے خیالات ہرقلیطس کے بالکل ہی متضاد جانب کو ہیں۔ ہرقلیطس کو اس دنیا میں ہر جگہ تغیر و حرکت کے آثار نظر آتے تھے۔ اور فرمانیدیس اس کو محض نظر کا دھوکا سمجھتا تھا۔ وہ سرے سے حرکت و تغیر کے امکان کا قائل نہ تھا۔ وہ کہتا تھا اگر ہم ذرا غور کریں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ جب بھی کوئی چیز حرکت کرے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں وہ پہلے تھی کسی ایسے مقام میں جائے جہاں پر اس کے جانے سے پہلے کچھ نہ تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقام ثانی پر اگر کوئی چیز پہلے موجود ہو تو وہ اس کو دھکیل کر وہاں سے باہر نکال دے اور خود اس کی جگہ لے لے۔ مگر جب شروع سے کوئی خلا ایسے لاموجود فیہ ہی نہیں تو حرکت کا آغاز ہی ناممکن ہے۔ فرمانیدیس کا یہ خیال تھا کہ کسی ایسے خلاء لاموجود فیہ یعنی نیست کے محل وقوع کی ہستی کا ذکر کرنا یہ کہنا ہے کہ نیست بھی ہست میں شامل ہے جو قضیے کے سراسر خلاف ہے۔ نیست کا محل وقوع تصور میں آنے سے انکار کرتا ہے اور جو چیز کہ تصور سے گریز ہو اس کی حقیقت فرمانیدیس تسلیم نہیں کرتا۔ ان خیالات نے اس کو یہ کہنے کی جرأت دلائی کہ کسی قسم کی حرکت، انتقال یا تغیر سب ہماری آنکھوں کا فریب ہے۔ دراصل جو کچھ اس دنیا میں ہے وہ ایک غیر متغیر غیر متحرک ناقابل انفعال حقیقت ہے جس کی نوعیت ہر سمت اور ہر حصے میں یکساں ہے اور جس کے وجود کی ساخت ناشکستہ وحدت میں کہیں تقسیم حصص یا تفریق و تمیز ممکن نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا کا جو متنوع نقشہ ہمارے حواس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اس یکرنگ مرقع سے بہت مختلف ہے۔ مگر ہمارے حواس جیسا کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اکثر ہمیں دھوکا دیتے ہیں۔ جو علم ہمیں ان کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اس کو ہمیشہ اپنے فہم و ادراک سے پرکھ لینا چاہئے۔ سو فرمانیدیس کے ادراک کا یہی فیصلہ تھا کہ حواس غلطی پر ہیں اور ہم فریب خوردہ ہیں۔

افلاطون جس کی بلند پرواز طبیعت کی خواہشات کو یہ خیال کہ اس دنیا کو تغیر و گردش سے رہائی اور مکمل سکون و استقلال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ بیدردی سے پامال کر دیتا تھا۔ قدرتی طور پر فرمانیدیس کے ساتھ ہم خیال ہونے پر رضامند تھا اور اس کے فلسفیانہ حقایق کی رو سے ہر ایک حقیقت ابدی کو ان بے شمار محسوسات سے جن میں وہ مخلوط ہے اور جن میں گویا اس کا تکرار پایا جاتا ہے۔ وہی نسبت ہے جو فرمانیدیس کی واحد الوجود اور سالم الوجود حقیقت کو اس متلون اور سراپا فریب نمود نما سے ہے جس کی حواس ہمیں تلقین کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرمانیدیس وحدت حقیقت کا مبلغ ہے اور افلاطون کثرت حقائق کا قائل۔ یعنی افلاطون کے خیال کے مطابق عالم حقائق ابدی اور عالم محسوسات ان دونوں میں سے ہر ایک میں کثرت و تفریق ضرور ہے۔ علاوہ بریں افلاطون عالم صوری کو بالکل ہی موہوم نہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک عالم صوری ہست و نیست کے درمیان ایک برزخ ہے کیونکہ اس کا وجود تو یقینی ہے۔ مگر اس کی شکل وہ نہیں جو ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے فرمانیدیس اس کو بالکل خالی از حقیقت، عاری از وجود اور نیست محض خیال کرتا تھا۔

فرمانیدیس کا حرکت جیسے امر واقعہ سے انکار اس کے ہم عصروں کو اس کی سمجھ کا پھیر معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ عدم حرکت کو خلاف قیاس سمجھتے تھے۔
فرمانیدیس کے ایک مشہور شاگرد زینو نے اپنے آقا کے اس بظاہر خلاف قیاس نظریہ کی حمایت یوں کرنی چاہی کہ جب ہم اس (بقول معترضین، ظاہر من النفس حقیقت الامر) یعنی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بھی اگر زیادہ نہیں تو کم از کم فرمانیدیس کے عقیدے سے جتنی خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر محاصرۂ ٹرائے کا نامور جانباز اخیلیس جو اپنی سرعت رفتار کے لئے مشہور تھا ایک کچھوے کے ساتھ دوڑے تو یہ کہہ دینا

بڑا ہی سادہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھوے سے آگے بڑھ جائے گا... فرض کرو کہ اکلیس کی رفتار کچھوے سے دس گنا ہے اور کچھوے کو تیز رفتار سبک رو کی رعایت دی گئی ہے یعنی وہ پہلے ہی سے سو گز آگے کھڑا ہے۔ دونوں ایک ہی وقت دوڑنا شروع کرتے ہیں۔ جب اکلیس وہ سو گز کا فاصلہ جو اس کے اور کچھوے کے درمیان ہے طے کر چکے گا تو کچھوا اتنے وقت میں دس گز آگے بڑھ جائے گا۔ اب اکلیس اور کچھوے کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہے۔ پھر جب اکلیس وہ دس گز طے کرے گا تو کچھوا اکلیس سے ایک گز آگے ہوگا۔ جب اکلیس وہ ایک گز طے کرے گا تو کچھوا ۱/۱۰ گز آگے ہوگا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ یہاں تک کہ کچھوا اکلیس سے آگے ہی رہے گا۔ زینو کا ایک اور بھی اسی طرح کا معمہ ہے جس کو چلنے والا تیر کہتے ہیں۔ جدید متحرک تصاویر کے اصول سے آشنا حضرات اس کو اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ تیر کا جب کہ وہ حالت پرواز میں ہو کسی خاص معین وقت پر فوٹو لیا جا سکتا ہے۔ جس کا مطلب کہ وہ اس نقطۂ وقت پر بے حرکت ہے۔ ورنہ کیمرہ اس کو ساکن نہ دکھاتا۔ اور چونکہ ہم جس وقت چاہیں اس کا فوٹو لے سکتے ہیں۔ اس لئے گویا وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ہر وقت ساکن ہوتا ہے تو ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کس وقت کرتا ہے۔ اس قسم کے معموں نے ہمیں یہ ثابت کرانے میں بڑی مدد دی ہے کہ مسافت اور مدت دونوں کو مسلسل اور ناقابل تجزیہ تصور کرنا چاہیے یعنی جس طرح ایک عدد اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اس طرح یہ نقطوں کا مجموعہ نہیں ہوتے۔

بحث کا یہ طریقہ جس میں بحث کرنے والا یہ ثابت کرتا ہے کہ فریق مخالف کی بات کو مان لینے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بعید از عقل ہیں، یونانیوں میں ڈائے لک ٹک (...... DIALECTIC) کے نام سے مشہور ہے۔ زینو اس کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ سقراط بھی اس فن میں پورا ماہر تھا۔ اور افلاطون نے اس کو اس قدر صحیح اور موزوں طریقے سے تکمیل کیا تھا کہ وہ بعض اوقات وہ ڈائے لک ٹک کے لفظ کو فلسفے کے معنوں میں بھی استعمال کر لیا کرتا تھا۔

افلاطون کے قدما میں سے انکساغورث کا ذکر بھی بیان ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ حکیم میلاطیسی حکما کی طرح ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا مگر کچھ عرصے تک ایتھنز میں نامور سیاسی مدبر پرقلیس کے ساتھ بحیثیت صلاح کار و مددرفیق رہا۔ آخر کار جب وہ یہ کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ سورج اور چاند دیوتا نہیں بلکہ روحانیت سے بالکل مبرا مادے کے بنے ہوئے معمولی اجسام ہیں جن کی کہ ہماری پائمالی روندی گئی حقیر زمین تو (نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد) اس نے ایتھنز کی جمہوریت کا قہر و غضب نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور وہ اس شہر کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اس زمانے میں (اور سقراط کے وقت میں بھی) جمہوریت حکومت کے مذہبی معاملات میں آزادی خیال کو گوارا نہ کر سکتی تھی بخصوصاً جبکہ انکساغورث اور سقراط کی آزاد خیالی کا اثر، علمی طبقوں پر پڑتا تھا جہاں سے لوگوں کی حساس طبیعتوں کو ہر وقت سیاسی خرابی کا ڈر تھا۔

جیسا کہ ہم اس تحریر کے شروع شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ اولین میلاطیسی حکما میں سے کئی ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق کسی نہ کسی چیز کو کائنات کا مادۂ بنیادی قرار دیا۔ مگر ان کا یہ نظریہ اس عقدے کے حل کرنے میں ناکام رہا۔ کہ اشیاء کی کثرت اور ان کی خاصیات میں اس قدر تباین کیوں ہے۔

انکساغورث کا خیال تھا کہ پہلے پہل سب اقسام کی اشیاء ایک ہی غیر متفرق جمعیت کی حالت میں ہوتی ہیں۔ جہاں سے بعد میں ہر ایک کو ہمارا نفس علیحدہ کر کے سب کو نظم و ترتیب دیتا ہے اور ہر ایک کو اس کی مخصوص جگہ پر متعین کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انکساغورث کے اس طرح نفس انسانی کو مطلق ایک مرتب اور ناظم کے اہمیت دینے نے سقراط کے دل پر بڑا اثر کیا۔ ترتیب نظام قدرت کو سمجھنے کا یہ طریقہ اس کو اور سب حکما کے طریقوں سے زیادہ امید دلانے والا معلوم ہوا۔ اور اس کے متذبذب دل کو اس خیال سے بہت سا اطمینان مل گیا

اس کو اس بات کی شکایت رہی کہ انکساغورث نے اتنا کچھ کر کے یہ کیوں نہ بتایا کہ اس نظم و نسق کی تفریحات بحیثیت مجموعی کیسے متعلقات کے کیونکر متقرر ہوتی ہیں۔ اس مسئلے پر اس نے خود اپنا دماغ لڑایا اور وہ ان پہلے شخصوں میں تھا جو جانداروں کے اجسام کی ترکیب اور ان کے اعضا کے اور قواسے کی قابلیت کی ان کے ماحول کے ساتھ مطابقت کو اس بات کی دلیل سمجھتے تھے کہ یہ دنیا کسی زبردست عقل اور حکیم صانع کا کام ہے۔ اور یہ عالم عالم شعور ہے۔

(۳)

افلاطون کو اپنے آقا کے اس خیال کے ساتھ پورے طور پر تعلق تھا کہ یہ دنیا عالم شعور ہے۔ اور مختلف حقائق بدن ایک ہی نظام کے عناصر ہیں جس میں ہر ایک حقیقت کا قیام اُس نوید پر مبنی ہے جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے تجسس اور اک کی تشفی درحقیقت اسی خیال سے ہو سکتی تھی کہ تمام اشیاء ایک آسمانی ترکیب اور روحانی نظام کے ماتحت اپنا اپنا کام کرتی ہیں۔

چونکہ کسی باقاعدہ سوسائٹی کے اعمال، افعال اور اس کے افراد کے فرائض کا مناسب عمل جب ہی معلوم ہو سکتا ہے جبکہ ان کا مقرر کرنے والا اس نظام عالم سے پوری طرح واقف ہو۔ اس لیے افلاطون کے خیال میں کسی قوم یا جماعت کے حکام ہمیشہ فلاسفر ہونے چاہئیں۔ اپنی عظیم الشان تصنیف "جمہوریت" میں اس نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطنت کے ان مدبر پیشواؤں کو کس قسم کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔

افلاطون اپنی موت (۳۴۷ قبل مسیح) کے بعد ایتھنز میں اپنا بنا کردہ ایک کالج چھوڑ گیا۔ جو بہت عرصے تک علوم اور فلسفے کا سب سے بڑا مرکز رہا یہاں تک کہ ۵۲۹ء میں جب شہنشاہ جسٹینین نے اس کا ذریعہ آمدنی ضبط کر لیا تو اس کالج کا خاتمہ ہو گیا۔ اُن نوجوانوں میں سے جنھوں نے اس کالج میں خود اس کے بانی افلاطون سے تعلیم حاصل کی۔ ایک ارسطاطالیس بھی تھا جس نے بعد میں وہ شہرت حاصل کی جو افلاطون کی شہرت سے کسی طرح کم نہ تھی۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ ہر شخص جبلی طور پر یا تو افلاطونی نقطہ خیال کا ہوتا ہے یا ارسطاطالیسی۔ اور ان دو یونانی حکما کو بلحاظ اُن کے اور اُن کے رجحان اور طریقۂ فکر کی نوعیت کے قوت فکر کی دو متضاد اقسام کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ، اپنے تخیل کی بلند پروازی کی وجہ سے حقائق حیات کو چشم و گوش کے معلومات سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اس کا توسن عقل و فہم اس میدان میں جولانی کیا کرتا تھا جو تجربے، مشاہدے اور حواس کی حدود سے باہر ہے۔ ارسطو کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس کی طبیعت افلاطون کی طرح آزاد نہ تھی۔ وہ عرصۂ حکمت میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ اور منطق کی زبردست بندشوں اور حواس اور تجربے کی مدد سے ایسے نتائج پر پہنچتا تھا جن کا ثبوت مشاہدے کی بنا پر ممکن تھا۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو دونوں فلسفیوں کی نسبت یہ رائے غلط ثابت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات فلسفے کا طالب علم یہ محسوس کرتا ہے کہ افلاطون ایک منطقی تھا اور ارسطو اس قدر متقیہ اور محتاط نہ تھا جس قدر اس کو سمجھا جاتا تھا۔

ارسطو (پیدائش ۳۸۴ قبل مسیح۔ وفات ۳۲۲ برس قبل مسیح) افلاطون کے کالج کا ایک ممبر تھا۔ مگر وہاں کا طرز خیال اور طرز تعلیم اُس کو پسند نہ آیا۔ اور اُس نے اس کالج کو چھوڑ کر خود ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ اگرچہ وہ اپنے ساتھیوں سے اس طرح کنارہ کش ہو گیا تھا مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ بحث کو ہمیشہ ایک افلاطونی کی حیثیت سے شروع کرتا ہے اور آخر میں ان افلاطونی عقاید پر نکتہ چینی کرتا ہے جن سے اُسے اتفاق نہ تھا۔ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ارسطو افلاطونی خیال کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہتا ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ ارسطو ان باتوں پر جن میں وہ اپنے استاد کا ہم خیال تھا بہت کم زور دیتا ہے ۔

ارسطو افلاطون کی طرح اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ صحیح علم صرف حقائق ابدی کا علم ہے۔ جن کی ہستی کی آگاہی ہمیں اپنے ادراک سے حاصل ہوتی ہے ۔ اور جن کو محسوس کرنے سے ہمارے حواس قاصر ہیں۔ مگر وہ افلاطونیوں کی طرح حقائق ابدی (اعراض) کو ان اشیاء (جواہر) سے جن میں وہ "منقسم" یا "منقول" ہوتے ہیں۔ علیحدہ نہیں سمجھتا۔ افلاطون کو بھی ایسا اچھا طریقہ بیان نہ سوجھا جس سے وہ جواہر کی کسی ایک نوع کا تعلق اس عرض سے ظاہر کرے۔ جو اگرچہ اس نوع کی سب اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی بذاتِ خود اس نوع کے کسی ایک فرد سے علیحدہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس تعلق کو "شرکت" کا تعلق کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ایک حقیقت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو مختلف اشیاء میں منقسم کیا گیا ہے۔ بڑی چیزوں کو بڑا حصہ ملا ہے اور چھوٹی چیزوں کو چھوٹا۔ جس طرح مختلف جسامت کے چند اشخاص ایک سائبان کے نیچے آ کھڑے ہوں تو ہر ایک کی جسامت کے مطابق سائبان کا تھوڑا یا بہت حصہ اس کے اوپر ہوگا۔ یا دوسرے پیرائے میں ہم اس تعلق کو "نقل" کہہ سکتے ہیں۔ مگر یہ فرض کرنا بھی مشکلات سے خالی نہیں۔ اگر ہم دو اشخاص کے ایک ہی نوع کے دو افراد ہونے کو اس طرح سے تعبیر کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی نمونے کی دو نقلیں ہیں تو ان دو افراد میں سے ہر ایک کی اس مفروضہ نمونے سے ہم نوعی کی تعبیر کے لئے ایک دوسرا نمونہ فرض کرنا پڑے گا۔ اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ شاید یہ کہنا سب سے بہتر ہوگا کہ ہم اس تعلق سے اتنا ہی آگاہ ہیں جتنا کہ جزو کل یا اصل و نقل کے تعلق سے ہمارے اس تعلق کو بیان کرنے کی قابلیت یا نا قابلیت اس بات کی دلیل نہیں کہ ہم اس تعلق کو زیادہ یا کم سمجھتے ہیں ۔

کئی لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ حقائق مشترکہ محض زائیدہ خیال اور ہمارے وہم و گمان کی پیدائش ہیں۔ مگر ارسطو کو اس بات سے انکار تھا۔ وہ ان کی ہستی کا با تعلق دماغ انسانی قائل تھا۔ دگرنہ علم طبیعی جن میں اشیاء کے چند خواص مشترکہ پر بحث کی جاتی ہے موہوم باتوں کے سوا کچھ نہیں رہتے۔ ارسطو نے مخصصات کی دو قسمیں کی ہیں۔ مخصصات ذاتی (مثلاً انسانیت وغیرہ) اور مخصصات صفاتی (مثلاً عقلمند، سفید یا عقلمندی وغیرہ)۔ مخصصات صفاتی، مخصصات ذاتی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ اور مخصصات ذاتی صرف کلام میں افراد موضوع سے علیحدہ شمار کی جا سکتی ہیں۔ ہر ایک فرد کی ایک مخصوص "شکل" (FORM) ہوتی ہے۔ انسان کی شکل کو دوسرے الفاظ میں "روح" کہا جاتا ہے۔ اس کا جسم جو تمام حرکات و افعال کے لئے روح کا محتاج ہے روح سے بالکل متضاد ہے۔ اس کو "مادہ" کہتے ہیں۔ جب بہت سی اشیاء ایک ہی نوع یا قسم کی ہوں تو کوئی قضیہ جو اس نوع کے ایک فرد کی نسبت قائم کیا جا سکتا ہے اور جو مستقل وقعت رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا جو اس نوع کے کسی اور فرد پر بھی صادق نہ آئے۔ ایسے قضایا کو "کلیات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔

ارسطو کے مطابق صرف اس دنیا میں ہی بہت سی اشیا ایک قسم کی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی اشیا کی ترکیب عناصر اربعہ، خاک، آب، آتش، باد سے ہے (ان چار چیزوں کو سب سے پہلے امفدا قلیس نے جو پانچویں صدی میں سسلی کا ایک ذی اقتدار فلاسفر تھا، عناصر قرار دیا۔ روایات کی رو سے اس فلاسفر نے اپنے آپ کو آتش فشاں پہاڑ اٹنا کے دہانے میں پھینک دیا تھا تاکہ اس کے اس طرح ایکا ایکی غائب ہو جانے سے وہ لوگوں میں دیوتا شمار کیا جائے۔) یہ عناصر اربعہ جو چار خواص بنیادی، حرارت، برودت، رطوبت، یبوست سے پیدا ہوئے ہیں۔ مختلف تناسب میں ترکیب پا کر مختلف اجسام بن جاتے ہیں اور عناصر کے باہمی تضاد کی وجہ سے وہ اجسام ہمیشہ بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ یہی افراد کی تکثیر کی وجہ ہے۔ اور تسلسل افراد سے ہی نوع (نہ کہ فرد) بقا حاصل کر سکتی ہے۔ کائنات کے بالائی طبقوں میں ہر ایک آسمانی جسم اس مرکب مادے کا نہیں۔ بلکہ ایک اعلیٰ عنصر خامس کا بنا ہوا ہے۔ اس لئے وہ کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی نوع کا ایک ہی فرد ہے۔ اس لئے اس کی بقا کے لئے اس کی

نوع کے اور افراد کا تسلسل ضروری نہیں۔

اس مختصر بحث سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ارسطو نے اس بارے میں اپنی توجہ زیادہ تر حیوانات اور نباتات تک ہی محدود رکھا۔ اسی سے اس نے اخذ کیا اور ہر گروہ کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں روح اشیا کی حرکت کسی اور متحرک شے کے تصادم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر ذی روح اجسام کی حرکت اس طرح کی نہیں۔ افلاطون نے ہمیشہ متحرک رہنے والی روح کو تمام حرکت کا منبع قرار دیا تھا۔ مگر ارسطو ذی روح اشیا کی حرکت کو خود نمائی سمجھتا تھا۔ ذی روح اشیا کی حرکت کی علت ہمیشہ مادہ میں حرکت ہوتی ہے یہ علت تصادم سے نہیں بلکہ ان اجسام کی خواہشات کو اکسانے سے ان کی حرکت کا باعث ہوتی ہے۔ اور اس نے ضروری خیال کیا کہ وہ خود متحرک ہو۔ کیونکہ خواہش ایسی چیز کی بھی ہو سکتی ہے جس میں خود کوئی خواہش نہ ہو یا جو اس خواہش سے محض بے خبر ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ بالآخر تمام اشیاء کی حرکت کا منبع ایک ایسا غیر متحرک محرک ہے جو ذی روح اجسام کی خواہشات کو حرکت دے کر خود ان کی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ کائنات کا یہ غیر متحرک محرک خدا ہے۔ وہ اپنے فضل سے دنیا کو اس طرح گردش میں رکھتا ہے۔ جس طرح کوئی محبوب اپنے عاشق کو۔ مگر جس طرح تمام اشیا اس کی طرف کھنچ کر رہ جاتی ہیں وہ کسی کی طرف کھنچ کر نہیں آتا۔ ایسی مکمل، اعلیٰ اور بے نیاز ہستی کے ساتھ اگر کوئی شغل منسوب کیا جا سکتا ہے تو وہ شغل علم ہے اور ایسی چیز جس کا علم اس کی شان کے شایان ہو اس کی اپنی ذات ہے۔ ارسطو کے خیال میں خدا دنیا کو بنانے والا نہیں۔ دنیا ازلی اور ابدی ہے۔ نہ ہی وہ دنیا کی روح ہے۔ وہ مکمل ذات ہے جس کے ساتھ اپنے آپ کو مطابقت دینے کے لئے تمام دنیا کوشاں ہے۔

ان اشیا کی حالت میں جو غیر ابدی ہیں اور جو ایک غیر مکمل صورت ہے۔ ایک دوسری مکمل تر صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ارسطو ان کے ارتقا کے اول ترین مدارج کا پتہ اس انتہائی صورت سے لگاتا ہے۔ جس کی طرف ان ارتقا کا رخ ہوتا ہے۔ حیوانات اور نباتات کی علت غائی بلحاظ اپنی جنس کے تکمیل حاصل کرنا ہے۔ نہ یہ کہ وہ انسان کے لئے مفید ترین ثابت ہوں۔ ارسطو نے علل کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ علت مادی۔ علت صوری۔ علت فاعلی اور علت غائی۔ غیاث اللغات مصنفہ محمد غیاث الدین میں لکھا ہے "علت کہ آن را سبب نیز گویند بر چہار قسم است۔ سبب در مسبب داخل بود یا خارج۔ اگر داخل بود و بالقوۃ۔ آن را علت مادی گویند بہ تشدید دال چون نسبت چوب با سریر۔ واگر داخل بود و بالفعل آں را علت صوری گویند۔ چوں صورت سریر کہ مربع باشد یا مسدس۔ واگر خارج بود اگر آں سبب موجد اوست۔ آں را علت فاعلی گویند چوں نجار۔ اگر ایجاد برائے آں نسبت آں را علت غائی گویند۔ چوں جلوس بر سریر۔ پس علت غائی در ظہور موخر از ہمہ علت ہاست و در وجود ذہنی و تعقل از ہمہ مقدم۔۔۔۔۔۔۔ علت غائی غایت و منتہائے جمیع علیتہائے اربعہ است۔۔۔۔۔۔۔۔ و بدانکہ اطلاق علت غائی در افعال حضرت حق سبحانہ و تعالےٰ روا ندارد چرا کہ حق تعالےٰ در خلقت اشیا محتاج بغرضے نیست" اگر بنظر دقیق دیکھا جائے تو سوائے علت مادی کے باقی علل ثلاثہ مائل بہ انطباق معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ نجار اسی حد تک علت سریر شمار کیا جا سکتا ہے جس حد تک کہ وہ تختہ کو ایک مخصوص شکل دینے کا باعث ہو۔ اور اس کی صنعت کا استعمال (علت غائی) بھی وہی ہے جو اس شکل کی ایک لکڑی کی بنی ہوئی چیز کا ہو سکتا تھا۔ گویا علت فاعلی اور علت غائی علت صوری کے دو متشابہ پہلو ہیں۔

یہ نظام علل اربعہ پھر وہی بات ظاہر کرتا ہے کہ تمام غیر ابدی اشیا کے دو متباین پہلو ہیں۔ اول مادہ جو ایک مخصوص شکل پا کر ایک مخصوص چیز بن جاتا ہے۔ دوم صورت جس کی بدولت ہر ایک چیز اپنا جنسی یا نوعی نام پاتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اشیا جو خود ایک خاص شکل و صورت

بلکہ جیسا وہ شخص سنگ مرمر کسی دوسری حالت میں کسی دوسری چیز کا "مادہ" ہو جائیں۔ مثلاً سنگ مرمر کا بت۔ مادہ بغیر شکل و صورت کے نہیں مل سکتا۔ اصلی حالت میں اس کی ہستی ہی نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے خدا ارسطو کے خیال کے مطابق شکل بغیر مادہ ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ارسطو اگر کسی فلسفی کو خدائی شان کے شایاں سمجھتا تھا تو وہ ایک قسم کا فکر ہے۔ اسی لئے وہ انسان کے لئے اس کو اعلیٰ ترین اشتغال جانتا تھا۔ وہ اپنی تصنیف "اخلاقیات" میں کہتا ہے کہ محض علم سے ہی انسان اپنی بہترین قابلیت کا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسی بات میں اس کو دوسرے باشندگان زمین پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اور یہی بات اس کی سب سے بڑی مسرت کا باعث ہو سکتی ہے چونکہ انسان اس محض ذہن نہیں بلکہ ذہن اور حیوانیت کا ایک مجموعہ مرکب ہے۔ اس لئے مسرت عقلی مشاغل اور معاشرتی فرائض کی پابندی سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسان فطرتاً ایک حیوان متمدن ہے۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح کی سوسائٹی میں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ سوسائٹی میاں بیوی یا لونڈیوں کی ہی ہو۔ مگر ارسطو جس کو سٹیٹ یا فرزندگی سمجھتا تھا وہ صرف آزاد شخصوں کے مہذب فرقوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ اور اس کا اپنے علم اور تجربہ کی بنا پر خیال تھا کہ صرف یونانیوں کی نسل ہی ایک ایسی مدنیت کے قابل ہو سکتی ہے۔

اپنی "سیاست" میں ارسطو نے اس قسم کی مدنیت کے آئین کا نقشہ کھینچا ہے۔ اگرچہ اس کے اپنے ہی ایک شاگرد سکندر اعظم کی بادشاہت میں یونانی مدنی حکومتوں کے اتحاد سے ایک وسیع سلطنت کے قیام سے یونانی دنیا کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ مگر ارسطو کو کبھی اس انقلاب کا خیال نہ آیا۔ اس کے نزدیک ایک مہذب حکومت وہی ہے جو ایسی خود مختار دولت مشترکہ ہی ہو سکتی تھی جس کی حدود ایک شہر اور اس کے مضافات کی حدود سے زیادہ نہ بڑھیں۔ کیونکہ اس کے تمام باشندے معاملات جمہوریت میں ذاتی حصہ نہ لے سکیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ شہریوں کو اس بات کیلئے فرصت کہاں سے ملے۔ سو اس کے لئے ارسطو کہتا تھا کہ اپنا روزمرہ کا کام غلاموں کے سپرد کر کے حکومت کیلئے وقت نکالنا چاہئے۔ طریقہ غلامی کو ارسطو جائز اور قدرتی امر سمجھتا تھا کیونکہ بعض انسان قدرتی طور پر حکومت خود اختیاری کے ناقابل ہوتے ہیں۔ قوموں کی قومیں اپنی اس ناقابلیت کا اظہار بعض اوقات اس طرح سے کرتی ہیں کہ اگر ان کو اپنے آپ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے لئے ایک خود مختار حکمران انتخاب کر لیتی ہیں۔ جس کی وہ غلاموں کی طرح خدمت کرتی ہیں۔ آزاد دولت مشترکہ میں سیاسی مساوات حقیقی مساوات کی بنا پر ہونی چاہئے۔ اگر سوسائٹی کا کوئی ممبر اپنی ذہنی برتری کی وجہ سے باقی سب پر ممتاز ہو تو سب کو چاہئے کہ اس کو اپنا قدرتی حاکم مان لیں۔ علاوہ بریں نوابی اور افلاس کی تمیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

افلاطون کہتا تھا کہ ہر ایک چیز تمام افراد جمہور کی ملکیت مشترکہ ہے۔ اور سلطنت کے "سرپرست" خواہ وہ مرد ہوں یا عورت کسی چیز کو بھی اپنا نہیں کہہ سکتے یعنی کہ وہ کسی شخص کو اپنا خاوند۔ اپنی بیوی۔ اپنا بچہ۔ اپنی ماں۔ اپنا باپ کچھ نہیں کہہ سکتے مگر ارسطو کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ وہ طبعی چیزوں اور جائداد کی اشتراکیت کے اصول کو ممکن العمل نہ سمجھتا تھا۔ دو قریبی دوست ایک دوسرے کی چیز کو اپنی چیز سمجھ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر جہاں ہر ایک شخص اپنی چیز پر اپنا حق دوسروں کے برابر سمجھتا ہو وہاں بدنظمی اور بے ترتیبی کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ اور نہ ہی اس طرح سب کو حقوق مساوی دینے سے اتحاد و موافقت کے بڑھنے کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ اس لئے ارسطو ایک شخص کے دوسرے شخص سے دولتمند ہونے کو اپنے آئین کے ماتحت ممکن و جائز سمجھتا تھا۔ وہ روپیہ والداروں کو اس حد تک حق مزید دلاتا ہے کہ اس کی بدولت وہ عوام کے نکموں کی دستبرد سے بچے رہتے ہیں۔ مگر ان کو بالکل ہی لاچار اور بے بس نہیں بنا سکتے۔

"پطرس"
کہکشاں - مارچ ۱۹۱۹ء

تو وہ ہماری کون سی ادا سے شناخت کر سکے گا کہ ہم مخلوق فانی ہیں۔ وہ دیکھے گا ہم نہایت
پائدار اور مستحکم عمارتوں میں رہتے۔ ہم آیندہ کے سیکڑوں برسوں کے انتظام سوچتے۔ ہم
بڑی سے بڑی اور لمبی سے لمبی میعادوں کے واسطے معاملات کرتے۔ ہم باغ لگاتے جن
میں بعض درخت ایسے بھی ہیں جو انسان کی عمر طبیعی میں بارآور نہیں ہوتے اور پھر
توقع رکھتے کہ ہم آپ ان کے پھل کھائیں گے۔ ہم ایک جوتی یا کپڑا خریدتے تو اس کو بھی
چلاؤ دیکھ کر لیتے [illegible] ہم میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو دوسروں کو مرتا ہوا دیکھ کر
کبھی خیال کرتے [illegible] ہم بھی مریں تو عجب نہیں لیکن وہ خیال ساون بھادوں کی
[illegible] نہیں [illegible] دھر آیا ادھر گیا۔ اپنے ہی جیسے آدمی کو بلکہ شاید
اپنے سے عمر میں چھوٹے ہاتھ پاؤں کے کھلتے اور کاٹھی کے مضبوط اور توانا و تن درست
کو اپنے ہاتھوں مٹی میں دبایا اور قبرستان میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بے شمار آدمی
مٹی میں دبے پڑے ہیں اکثر کی تو قبر تک کا بھی نشان نہیں۔ بعض کا ہے اور ان کی
قبر شاید پکی اور اس پر کندہ کیا ہوا پتھر بھی نصب ہے مگر کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس نام کے
کون صاحب تھے اور کہاں رہتے [illegible] سب کچھ ہے مگر گورستان سے لوٹے نہیں اور
وہی بے فکری [illegible] کہتے ہیں کہ خاک و آب و آتش و باد چار عنصروں
سے انسان کی ترکیب ہے مگر اس کے افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ غفلۃ بھی اس کے خمیر میں ضرور
ہے بلکہ دوسرے عنصروں سے زیادہ ہے۔ انتظام دنیا جہاں تک اس میں انسان کو دخل
ہے مبنی ہے اسی غفلت پر۔ غفلۃ نہ ہو تو انسان سے اٹھ کر پانی بھی نہ پیا جائے۔ کاشت کاری
[illegible] کی تو کون کہے۔ اور تحقیق سنا ہے کہ جن مجرموں کو پھانسی
کا حکم [illegible] اور ان کو یقیناً معلوم ہو جاتا ہے کہ اب ہم نہیں بچ سکتے تو ہفتوں آگے
سے وا[illegible] بدتر ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نیند ایسی بری چیز
ہے کہ پھانسی پر بھی لگے بدون نہیں رہتی لیکن یہ اُن کی کہن ہے جنھوں نے پھانسی
کا حکم نہیں سنا [illegible] پھانسی کا حکم سنیں اور سو کر دکھا دیں تو جانیں۔ انسان کی طبیعۃ
میں غفلۃ کا ہونا بھی حکمۃ سے خالی نہیں اگر ہر وقت موت آنکھوں کے آگے کھڑی رہے

خیال میں بہترین قومی گیت ہے۔ جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور جس سے بہتر گیت کی شاید مدت مدید تک بننے کی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن مذہب اسلام کے گہرے مطالعہ نے جو اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلسل جاری رکھا اس کے افق خیال کو وسعت بخشی۔ وطن اور ملک کی نسبت سے قوموں کا تصور اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اپنی شاعری اور اپنی گفتگو میں وہ ہمیشہ یورپ کی مثال دے کر انسانوں کو ملکوں اور وطنوں کے تنگ دائروں میں تقسیم کرنے کی بیہودگی ثابت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے تمدنی نصب العین کا قائل تھا جو انسانوں کو وطنوں اور قوموں کے اختلافات کی سطح سے بلند کر دے۔ جو زندگی کو ایک مقصد و مدعا بخشے کیونکہ اس کے نزدیک آرٹ کا با مقصد ہونا محض زندگی کے اصول علت اعلیٰ کا جزو لاینفک تھا۔ اسی قسم کی ہمہ گیری اور بامقصدیت انہیں نظر آئی تو اسلام میں، چند جرمن فلسفیوں کی تعلیمات میں جن سے وہ بے دریغ اپنی شاعری میں استفادہ کرتا رہا

حجازی خیالی دنیا

جس دور سے ہم ہندوستان میں گزر رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے امکانات پوشیدہ ہیں تاہم اس میں ایک خاص غم ناک کیفیت موجود ہے ہم میں شاید ہی کوئی فن کار یا مفکر ہو جن کے فن میں گم ہونے کے لئے اداسی معاصر حقیقت کے موجود ہو۔ ہم دور دراز خیالی دنیاؤں کے آرزومند ہیں۔ اور خواہ وہ دنیائیں خیالی ہوں یا حقیقی۔ ان کی زمانی یا مکانی دوری ہی ان کے اندر ایک بے پناہ دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ اقبال نے اسلام کے ابتدائی زمانے پر پرشوق نظر ڈالی۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ اس عہد کے مسلمانوں کی سادگی، بلند ہمتی، ایمان اور عزم و استقلال کو دوبارہ پیدا کر سکے۔ ایک عالمگیر تمدن کے لئے اس کی دلی خواہش انسان کی تقدیر میں اس کا زبردست ایمان، انسان کے ارتقا میں اس کا پختہ یقین کہ وہ مقصد کی بلندیوں کو منزل بہ منزل طے کرتا ہوا کمال کی چوٹیوں پر پہنچ سکتا ہے ان شرائط کے مطابق جو مسلم گھرانے میں پیدائش کے سبب اور اسلامی تعلیمات اس کے ذہن نشین ہو چکی تھیں۔ ان سب باتوں نے اس کی شاعری کو اسلامی رنگ دے دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں اس کے بعض قدردان اس سے چھن گئے۔

کسی شاعر کے کلام کی قدر اور اس کے اعتقاد کے باہمی تعلق کی بحث پرانی چیز ہے۔ اور میں اس کے متعلق یہاں کچھ نہ کہوں گا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو صرف اس لئے ملٹن کی شاعری سے لطف اندوز نہ ہوں کہ وہ اس کے مذہبی عقائد سے متفق نہیں یا جو شیکسپیر کا کلام محض اس لئے پڑھنا گوارا نہ کریں کہ وہ اس کے شاہ پرستانہ خیالات کو پسند نہیں کرتے لیکن دوسرے لوگوں کے لئے جو کارلائل کے لفظوں میں کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت " انکار کو معرض معطل کر دیتے ہیں " اقبال رہتی دنیا تک مشرق کا سب سے زیادہ ولولہ خیز شاعر رہے گا۔

فارسی اور اردو

اس کے بعض ہم وطنوں کی بدقسمتی ہے کہ اقبال کے بہترین کلام کا زیادہ حصہ فارسی میں ہے۔ اور اس کی صرف ایک طویل نظم اسرار خودی کا ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے، انگریزی زبان میں ملتا ہے۔ تاہم اس کا ابتدائی کلام جو اردو میں ہے وہی اس کو ہندوستانی شاعروں میں ایک بلند مقام دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن خواہ اس نے اپنی نظمیں اردو میں لکھیں خواہ فارسی میں، اس کا اردو شاعری پر گہرا اور مسلسل اثر پڑتا رہا۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ پنجابی تھا (اصل میں اقبال کشمیری اور ذات کا سپرو تھا) اسی لئے اس کے یو۔ پی کے نکتہ چیں اس کو ہمیشہ یہ حقیقت ایسے لفظوں میں یاد دلاتے رہے جن میں انصاف کم اور تلخی زیادہ ہوتی تھی اور اس کی شاعری کی زبان کو ٹکسال باہر ہونے کا طعنہ دیتے رہے۔ اور یہ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ داغ کا معنوی فرزند تھا۔ جو اردو زبان کا مسلم بادشاہ ہوا ہے۔ لیکن اس کی غیر معمولی قابلیت نے اس کے نکتہ چینوں کو جلدی خاموش کر دیا۔ اور اس کی طرز شاعری کے بے شمار مقلد ملک کے طول و عرض میں پیدا ہو گئے۔ اگر افراد کے وسیع اثرات کا تذکرہ کرنا اندیشناک نہ ہو تو اس ضمن میں تین ہستیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کو نئی اور متنوع صورت بخشی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے ابتدائی ایام میں اس میں مضمون لکھ لکھ کے اردو صحافت کو ایک ایسی زور دار اور لچکیلی زبان سے مالا مال کیا جس سے وہ پہلے قطعاً نا واقف

تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو نثر کو وہ شوکت، فراوانی اور شیرینی بخشی جس کا راز انہوں نے عربی زبان سے مطالعہ کرتے وقت پالیا تھا لیکن چھپے ہوئے مضامین یا پُراثر وعظوں کی نسبت شاعری لوگوں کے دلوں میں زیادہ دیرپا اثر رکھتی ہے اور شاعر زبان پر زیادہ گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ جدید اردو کے بنانے والوں میں اقبال (اور اسی طرح اس کا پیش رو غالب) ابھی تک سب سے نمایاں اور زبردست اثر ڈال رہا ہے۔ ہزاروں ترکیبیں اور الفاظ جو ان دونوں استادانِ فن نے گھڑے یا اپنے فارسی کے پیشرو استادوں سے مستعار لئے آج بھی اردو تحریر اور تقریر میں ان کی گونج سنائی دے رہی ہے۔

(پطرس کے انگریزی مضمون کا ترجمہ: صوفی ریاض حسین)

———————

پھرتے باندہ گلی کے قریب جا نکلتے، اور شک کرتا ہوں کہ ان کی ضرورت محسوس کرتا تو ان کی غیر حاضری میں ان کا کمرہ کھول کر وہاں بیٹھ جایا کرتا۔ سب چیزوں کو جیبوں میں ڈال کر احتیاطاً پھر پڑتال کی اور برانی کوٹ پہنتے پہنتے باہر نکلا۔ نوکر کو خواجہ صاحب کے نام پر ایک رقعہ اس مضمون کا لکھ کر دیا کہ "میں خدا جانے کس وقت واپس آؤں۔ آپ چائے اور کھانے پر میرا انتظار نہ کریں۔" یہ سب کچھ کر کے گھوڑے پر سوار ہو سرپٹ باندہ گلی کو روانہ ہو گیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد اس چھوٹی سی سطح مرتفع پر پہنچ گیا۔ جہاں باندہ گلی کا ایک رویہ بازار، ہوٹل، ڈاک بنگلہ وغیرہ ایک مسلسل سا نصف دائرہ بنائے کھڑے ہیں۔ باندہ گلی کا بازار بالکل قصبات کا سا ہے۔ دائیں ہاتھ کو ایک حلوائی کی چھوٹی سی دکان، اس کے سامنے میوہ فروش یا شراب، تمباکو، قلم، کاغذ، پنسل وغیرہ کا سٹور، پھر اس کے ساتھ ایک کنجڑے اور پھر شاید ایک بنئے کی دکان تھی۔ پاس ہی فاصلے پر تحصیل، تھانہ، کچہری اور سامنے ڈاک بنگلے کی چھوٹی سی چوکور عمارت تھی۔

بائیں ہاتھ کو باندہ گلی ہوٹل جیسے پیاسوں کے لئے اپنی آغوش شفقت کھولے بغیر کسی تکبر اور غرور کے کھڑا تھا۔ باندہ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے ہوٹل کا رخ کیا۔ گھوڑے کو اصطبل میں سپرد کر کے سیدھا ۲۵ نمبر کمرے کی طرف گیا۔ دروازے کو دھکیلا۔ لیکن دروازے کا تالا بند تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ولیٹن صاحب نے کیوں مجھے چابی ساتھ لانے کو کہا تھا۔ خیر دروازہ کھول کر میں اندر گیا۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ ایک سفید رنگ کا کارڈ تھا جو انگیٹھی کے اوپر طاق پر ایک پھولدان کے سہارے کھڑا تھا اور جس پر سرخ پنسل سے ولیٹن صاحب کے ہاتھ کے دو فقرے لکھے تھے۔

"میرا پتہ منیجر سے پوچھ لو ـــــ یہ کارڈ جلا دو۔"

میں نے ان دو فقروں کو شاید چھ دفعہ پڑھا۔ جیب سے دیاسلائی کا بکس نکال کر کارڈ جلا دیا۔ اور دروازے کا تالا پھر بند کر کے منیجر کے کمرے کی طرف آیا۔

میں نے جلدی سے منیجر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ لیکن جس تیزی سے میں نے اسے کھولا، ہرگز اس تیزی سے اسے بند نہ کر سکا۔ جان ولیم باندہ گلی ہوٹل کا مالک اور منیجر اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں بازو میز پر اور اس کا چہرہ اس کے بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ میں جان ولیم کو دو تین سال سے جانتا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے ولیٹن صاحب کو اس سے خاص انس تھا۔ جس کی بدولت مجھے جان ولیم سے ہزار دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں اس سے جب ملا اسے مسکراتا ہوا پایا۔ جب اس نے مجھ سے بات کی مجھے ہنسا کر ہی گیا۔ آج اس کو اس قدر مغموم دیکھ کر مجھے بہت ترس سا آیا۔ میں نہایت آہستہ سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھا۔ کمرے کے بیچ میں ایک چھوٹی سی گول میز تھی۔ اس پر اپنی ٹوپی اور برانی کوٹ کو پھینک دیا اور نہایت نرم آواز میں پکارا "ولیم!"

ولیم نے میز پر سے اپنا سر اٹھایا اور اگر مجھے اس کے غمزدہ ہونے میں کوئی شک تھا تو وہ سب رفع ہو گیا۔ اس کا چہرہ تبسم سے بالکل ناآشنا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ہونٹ ایک رحم طلب انداز میں ذرا نیچے کو جھکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ـــــ

"ولیٹن صاحب ۱۲ نمبر کمرے میں ہیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پوچھا:۔

"ڈیم! تم آج اس قدر متفکر کیوں ہو؟"

کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں اپنے کاروبار کے متعلق بیٹھا سوچ رہا تھا۔"

اور سر نیچا کر لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے مجھے ٹال دیا ہے۔ میں نے اس سے کہا:۔

"ڈیم! تمہیں مغموم دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ کیا تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرو؟"

شاید میرے خلوص اور صداقت نے اس پر اثر کیا۔ ایک آدھ منٹ تک وہ کچھ نہ بولا۔ اور دائیں ہاتھ کے ساتھ اپنے کوٹ کے ایک بٹن سے غافلانہ کھیلتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر کہا:۔

"آپ کسی سے کہیئے نہیں؟"

"مجھ پر یقین رکھو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔"

"ہوٹل میں ایک قتل ہوا ہے۔"

"قتل! کب؟ کس کا قتل؟"

میں حیران تھا کہ آج دو بجے سے جو بات ہو رہی ہے غیر معمولی، جو واقعہ پیش آتا ہے۔ فوق العادت۔ پہلے ونیٹن صاحب کا پراسرار خط پھر اس کارڈ پر وہ پراسرار تحریر اور اب یہ قتل کی خبر۔ میں نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ میرے دل میں پریشانی میری انگلیوں کی مضطربانہ حرکات سے ظاہر تھی۔ ڈیم کی آواز نے آخرکار مجھے اس طرف متوجہ کیا۔

"۱۲ نمبر میں براؤن نامی ایک شخص دو مہینے سے یہاں رہتا تھا۔ کل شام کو چار بجے ہوٹل میں چائے پینے کے بعد وہ سیر کو نکلا اور کھانے کے وقت تک واپس نہ آیا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ واپس کس وقت آیا۔ کیونکہ نہ تو اس نے آکر کھانا مانگا اور نہ رات کے دس بجے تک اس کے کمرے میں کسی نے لیمپ ہی جلتے دیکھا۔ جیسا کہ عام دستور ہے صبح سات بجے وہ چائے پیا کرتا تھا۔ آج صبح حسب معمول نوکر اس کے کمرے میں چائے لے کر گیا تو دیکھا کہ خواب گاہ از حد بدنظمی اور بے ترتیبی کی حالت میں ہے۔ تمام چیزیں الٹ پلٹ پڑی ہیں اور براؤن اپنے بستر پر بغیر کسی اوڑھنے کے ڈریسنگ گون پہنے بظاہر سویا پڑا ہے۔ وہ اسے جگانے کی غرض سے نزدیک گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی دائیں کنپٹی پر ایک بڑا سا مہیب زخم ہے۔ اس کا رنگ بالکل زرد اور اس کی آنکھیں کھلی اور پتھرائی ہوئی ہیں۔ دفعتہً نوکر پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے ایک سویا ہوا آدمی نہیں بلکہ ایک مرا ہوا آدمی پڑا ہے۔ نوکر بھاگا ہوا میرے پاس آیا۔ اور ٹوٹے پھوٹے فقروں میں براؤن کی موت کی خبر سنائی۔ میں اس کے ساتھ بارہ نمبر کمرے میں گیا اور حالات کو بعینہٖ ویسے پایا جیسے کہ اس نے مجھ سے بیان کیا تھا۔ مسٹر احمد! آپ خیال فرمائیے کہ اس ناگوار واقعہ سے میری اور میرے ہوٹل کی نیک نامی پر کس قدر برا اثر پڑے گا۔ اس وقت میرے ہوٹل میں سو کے قریب آدمی رہتے ہیں مگر اس واقعہ کے مشتہر ہو جانے کے بعد آپ یقین رکھئے کہ ایک شریف آدمی بھی یہاں قدم نہ رکھے گا۔ وہ کہاں رہیں؟ اس ہوٹل میں جہاں لوگ بلا وجہ قتل کر دیئے جاتے ہیں؟ جہاں مال کا نہیں جان کا خطرہ ہوتا ہے؟ میں کچھ عرصہ سے ہی بدقسمت ہوں اور مجھے نہیں معلوم میری بدقسمتی کا زمانہ کب تک رہے گا۔ آپ کو علم ہوگا جب میں اور میرا بھائی ہندوستان آئے تو پہلے پہل ہم نے بریلی میں مشترکہ سرمایہ سے ایک ہوٹل کھولا لیکن تھوڑے

	روپے	آنے	پائی
ایک ڈبہ پانامہ سگار	۲۵	۰	۰
ایک چھوٹا وسکی	۰	۶	۰
	۲۵	۶	۰

فارم پر سیٹھ فیروز جی کا نام وغیرہ رنگ دار روشنائیوں میں واقعی نہایت خوبصورت چھپا ہوا تھا۔

میں مسلمان مشرب، شراب نوشی کی اصطلاحات سے ناواقف۔ میں نے پوچھا:۔

"اس چھوٹا وسکی کا کیا مطلب؟ معمولی درجہ کی؟"

"نہیں۔ ایک چھوٹا وسکی کے معنی وسکی کا ایک چھوٹا پیگ۔ اب یہ دیکھو، ہمارے ہوٹل کے فارم اگرچہ سادہ ہیں اس سے بہتر ہیں مگر چھپائی میں کس قدر خراب ہیں۔"

اب کے بار انھوں نے باندرہ گلی ہوٹل کا بل فارم میرے ہاتھ میں دیا۔ میں حیران تھا کہ کیا ڈپٹی صاحب نے مجھے تحقیق کے لئے اس لئے بلایا ہے کہ انھیں بل فارموں کی چھپائی کے سے اہم مسئلے پر میری رائے کی ضرورت تھی۔ خیر میں نے بل کو دیکھا۔ چھپائی واقعی کچھ قابلِ تعریف نہ تھی۔ باقی تحریر عام بلوں کی سی تھی:۔

بل بنام ٹی براؤن صاحب کمرہ نمبر ۲، بابت ماہ جولائی

	روپیہ	آنہ	پائی
خوراک وغیرہ	۱۱۰	۰	۰
کرایہ	۳۰	۰	۰
	۱۴۰	۰	۰

سیٹھ فیروز جی کا بل میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اور ہوٹل کا بل بائیں ہاتھ میں۔ میں باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب بولے۔

"یہ دونوں بل مجھے براؤن کے اس کوٹ کی جیب سے ملے ہیں جو وہ کل شام کو پہن کر باہر گیا تھا۔ پہلا سوال جو ان بلوں کو دیکھ کر میرے دل میں اٹھا وہ یہ تھا کہ میری خوراک کا خرچ ایک سو پچاس روپے ماہوار ہوتا ہے۔ براؤن کا ایک سو دس روپے کیوں تھا۔ منیجر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ براؤن شراب بالکل نہیں پیا کرتا تھا۔ نہ کھانے پر نہ کسی اور وقت۔ اس لئے وہ شراب کے چالیس روپے جو ہوٹل والے ہم سے چارج کرتے ہیں اس سے نہیں لئے جاتے تھے۔"

(میں نے دل میں براؤن صاحب مرحوم کو آفریں کہا کہ ایک نیکی کا کام تو کرتا تھا) ڈپٹی صاحب نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا:۔

"اگر وہ شراب نہیں پیا کرتا تھا جیسا کہ مصدقہ ہے تو دوسرا سوال یہ ہے کہ اس نے کل کیوں سیٹھ فیروز جی کی دکان سے وسکی کا ایک پیگ پیا؟"

(افسوس براؤن مرتے مرتے یہ گناہ کر ہی بیٹھا)

"اب تم دیکھو۔ یہ طاق پر پانچ چھ سگاروں کے ڈبے پڑے ہیں۔ ایک میں تو کچھ سگار ہیں۔ باقی سب خالی ہیں۔ مگر سب ڈبوں پر سگاروں کا نام "سلطانہ" لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ براؤن کو "سلطانہ" سگار پینے کی عادت تھی۔ باوجود اس کے سیٹھ فیروز جی کا بل کہہ رہا ہے کہ کل اس نے "پانامہ" سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا۔ یہ کیا تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جس کی نسبت ہوٹل کے جو لوگ اسے جانتے ہیں، وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کی زندگی نہایت سنجیدہ و متین اور اس کی عادات نہایت سادہ اور باقاعدہ تھیں۔ اپنی موت کے دن شپ

مقررہ معمول سے اس قدر انحراف کرے۔ کہ شراب نہ پیتا ہو تو اس دن شراب پی لے اور سگار جو وہ غالباً برسوں سے پی رہا ہے چھوڑ کر ایک اور قسم کے نہایت قیمتی سگاروں کا ڈبہ خریدے۔ پھر وہ ڈبہ بھی تو اس کمرے میں کہیں نہیں ملتا۔ کیا اس نے وہ کسی دوسرے شخص کے لئے خریدا تھا؟ لیکن نہیں، انگیٹھی کے پاس سے مجھے یہ دو جلے ہوئے سگاروں کے باقیماندہ ٹکڑے ملے ہیں۔ جن کا تمباکو "سلطانہ" سگار کے تمباکو سے بہت مختلف اور اعلیٰ ہے۔ غالباً پاناما سگار ہیں (چونکہ میں خود سگار نہیں پیتا، اس لئے میری واقفیت اس بارے میں محدود ہے)، تو گویا اس کمرے میں دو پاناما سگار پیئے گئے لیکن باقی ڈبہ غائب ہے ـــــ اب چلو خوابگاہ کا معائنہ کریں!"

یہ کہہ کر ہم دونوں خوابگاہ میں گئے۔ ولیمز صاحب نے براؤن کی لاش پر سے چادر اٹھائی۔ براؤن ستر پچھتر برس کی عمر کا ایک پتلا دبلا قریباً چھ فٹ دو انچ قد کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے سے بے انتہا شرافت ٹپکتی تھی اور تعجب ہوتا تھا کہ ایسے آدمی کو کوئی کس طرح قتل کر سکتا ہے۔ اور گردوپیش کی سب چیزیں درہم برہم تھیں جیسے کوئی دو شخص ایک دوسرے سے کشتی لڑتے رہے ہوں۔

"کنپٹی کے زخم کے علاوہ براؤن کا دایاں بازو بھی ٹوٹا ہوا ہے اور یہ دونوں ضربیں معلوم ہوتا ہے کسی کند وزنی چیز سے آئی ہیں۔ اس قسم کی کند وزنی چیز دونوں کمروں میں کوئی نہیں۔ لیکن قابل غور ایک اور بات ہے۔ وہ سامنے کھونٹی پر براؤن کا وہ کوٹ لٹکا ہوا ہے جسے وہ کل پہن کر سیر کرنے گیا تھا۔ یہ کوٹ ایک دو جگہ بالکل تازہ پھٹا ہوا ہے۔ اب اگر یہ کوٹ اس کشمکش میں پھٹا ہے جس کشمکش کا نتیجہ براؤن کے لئے موت تھا تو کیا براؤن میں باوجود ایک مہلک زخم اور ایک ٹوٹے ہوئے بازو کے اس قدر ہمت تھی کہ وہ کوٹ اتار کر نہایت سلیقے سے کھونٹی پر لٹکاتا۔ پھر اس کی جگہ یہ ڈریسنگ گاؤن پہنتا جس کی ڈوری کی گانٹھ تم غور کرو نہایت احتیاط سے دی ہوئی ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ سب کچھ براؤن کا کام نہیں۔ اس کے علاوہ براؤن کے شام کے وقت پہننے کی ٹوپی جو کل شام ضرور اس کے سر پر تھی۔ یہاں کہیں نہیں ملتی۔"

یہ کہہ کر ولیمز صاحب نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ میں بڑے انہماک سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فی الحقیقت اس قتل کے گرد ایک ایسی تاریکی محیط تھی جس میں میرے متجسس دماغ کو کوئی راہ نہ دکھائی دیتی تھی۔ جب میں ولیم کے قتل کا ماجرا سن رہا تھا تو میرا دل قتل اور قاتل کی نسبت ولیم کی مصیبت کی طرف زیادہ متوجہ تھا۔ اور اب قتل مجھے ایسا اہم واقعہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں ولیم کی تکلیف کو بالکل بھول گیا۔

ولیمز صاحب مجھے ساتھ لے کر غسلخانے کے دروازے سے باہر نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا:۔

"یہ ہم چوروں کی طرح غسلخانے کے دروازے سے کیوں آتے جاتے ہیں؟"

وہ بولے۔

"ولیم نے جب تمہیں سارا حال سنایا تو اس نے تم سے یہ وعدہ نہیں لیا کہ تم کسی کو نہ کہو گے؟"

"لیا تھا!"

"ہوٹل میں تین چار آدمیوں کے سوا اور کسی کو اس واقعے کا علم نہیں۔ اور حتی الوسع کوشش کی جارہی ہے کہ جب تک تفتیش کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ جو نوکر صبح براؤن کی چائے لے کر آیا تھا۔ اور جس نے سب سے پہلے اس ہوٹل میں براؤن کو مرا ہوا دیکھا اس کو ولیم نے شاید کچھ روپے دے کر چند دن تک اس معاملے پر زبان بند رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ سب انسپکٹر صاحب بھی شریف آدمی تھے۔ انہوں نے بھی وعدہ کیا ہے کہ جب تک انہیں کسی خاص شخص کے مجرم ہونے کا پورا یقین نہ ہو جائے وہ کسی سے ذکر نہ کریں گے۔"

تو ایسے ڈر کے آدمی کے حواس مختل ہو جائیں اور اُس سے بُرا یا بھلا کسی طرح کا کام ہی
نہ ہو سکے۔ اور انسان کے پیدا کرنے سے جو غرض ہی بالکل فوت ہو جائے۔ پس غفلۃ کا ہونا
تو ضروری ہی اور بے غفلۃ کے دنیا کا کام چل نہیں سکتا لیکن نہ اس درجے کی کہ ہم موت کو
کبھی بھول کر بھی یاد نہ کریں اور اپنے تئیں ایسی گھڑی سمجھ لیں جس کی کوک کبھی ختم نہ ہوگی
یا ایسا چراغ جس کا تیل کبھی نہیں ہو چکے گا یا ایسی عمارۃ جو کبھی نہیں گرے گی۔ یا ایسا چشمہ
جو کبھی نہیں سوکھے گا۔ یہ سچ ہی کہ کسی آدمی کو مرنے سے انکار نہیں اور انکار ہو سکتا بھی
نہیں۔ کیوں کہ آج تک کوئی آدمی ایسا دیکھنا تو کیا [illegible] بھی نہیں آیا جو کسی تدبیر یا
بالائی سے حضرۃ عزرائیل کی نظر سے بچ گیا ہو۔ لیکن موت سے انکار نہ کرنا اور نہ کر سکنا اَور چیز
ہی اور معاملات سے اور روزمرہ کے برتاؤ سے ثابت کر دکھانا اَور چیز۔ مجھکو تو حضرۃ علیؓ کی وہ
حکایت کبھی نہیں بھولتی کہ جنگ جمل میں جب لڑائی کا بھاڑ سا بھُن رہا تھا حضرۃ خچر پر بیٹھے
اونگھ رہے تھے خادم نے بگڑ کر کہا کہ لوگ [illegible] کی طرح اُچھل رہے ہیں اور تم کو
سونا سوجھا ہی؟ حضرۃ نے مُسکرا کر فرمایا کیا تو قرآن کی وہ آیۃ بھول گیا؟ اذا جاء اجلہم
لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون[1]۔ وہ خادم بھولا تو کیا ہوگا [illegible] ہم مسلمان
ہی جس کو یہ آیۃ یاد نہیں اور لفظ نہ بھی یاد ہوں تو اس کا مطلب کیا [illegible] کی طرح زبان
پر چڑھا ہوا ہی لیکن علی کی طرح [illegible] وقت میں کوئی [illegible] کھاوے تو ہم
پرہیز کرنے کو طیار ہیں۔ جب [illegible] تھے تو ان کو یہ کہنا بھی پھبتا
لو کشف الغطاء لما ازددت یقینا[2]۔ ایک [illegible] طرح کا ایمان لائے
تھے اور ایک ہم ہیں نجاۃ کے طالب جنت کے امیدوار۔ شفاعت کے [illegible] حضرۃ کے
آرزومند کہ آنکھوں سے دیکھتے میں آ رہا ہے جی میں نہیں ٹھہرتی۔ اس واسطے کہ غور کی
عادۃ نہیں۔ سوچنے کی فرصت نہیں۔ سوجھ نہیں۔ رغبت نہیں۔ موت کا اگر کبھی خیال
آتا بھی ہی تو اسی قدر کہ موت کے معنے ہیں مرنا۔ بے شک موت کے معنے مرنا تو ہیں لیکن
اس کے لوازم پر بھی نظر کی۔ اس کے نتائج کو بھی سمجھا۔ آدمی جب تک مر نہ جائے اس کو

[1] جب اُن کی موت آئے گی تو ایک گھڑی کا پیچھا آگا نہیں کر سکتے ۱۲ [2] اگر پردہ اُٹھا دیا جائے تو میرا یقین اس سے زیادہ نہ ہو ۱۲

"اچھا تو پولیس کو اطلاع دی گئی ہے؟"

"او ہو۔ ولیم نے اسے نہیں کہا۔ صبح سب انسپکٹر صاحب حنائی کاغذوں کا ایک دستہ اور قلم دوات لئے کر یہاں آ گئے تھے۔ منیجر کے کمرے میں گھنٹہ بھر بیٹھ کر بیانات قلمبند کرتے رہے۔ پھر ایک نوکر کو گرفتار کر کے ساتھ لے گئے۔ مگر وہ بالکل بے گناہ ہے۔"

"تو انھوں نے اسے کیوں گرفتار کیا؟"

"پولیس کی تفتیش کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ سب انسپکٹر صاحب نے پہلے براؤن کے کمرے کا معائنہ کیا۔ اس قدر سرسری کہ اب ان سے جا کر پوچھو تو انھیں اس کمرے کی شاید ایک چیز بھی یاد نہ ہوگی۔ پھر ولیم سے پوچھا کہ کل رات یہاں کون کون آدمی فالتو آئے تھے۔ وہ صرف ایک فیروز خاں بہرہ تھا جو کل مری سے ولیم کے بھائی چارلس کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ چارلس تو کل شام پانچ بجے ولیم کے کمرے میں ایک چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ میرا نوکر فیروز خاں رات یہیں رہے گا۔ فیروز خاں اپنے آقا کی مرضی کے مطابق رات باندہ گلی ہی میں رہا۔ اور آج صبح گرفتار کر لیا گیا۔"

"چارلس یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اس کی بھائی کے ساتھ ناچاقی سی ہے۔"

"ناچاقی سی تھی۔ جان ولیم شریف خصلت انسان ہے۔ چارلس مغرور اور عیاش ہے۔ مگر آخر جان کا بھائی ہے۔ جان کو اس پر ترس آیا۔ اور ان میں پھر رابطہ محبت قائم ہو گیا۔ چارلس نے مری میں ایک ہوٹل کھول رکھا ہے۔ کل وہ یہ لینے کے لئے آیا تھا۔"

یہاں میں یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مری باندہ گلی سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے اور گھوڑے پر تین گھنٹے کا راستہ ہے۔

یہ باتیں ہم ہوٹل کے ٹینس کے چمن میں کھڑے ہوئے کر رہے تھے۔ یہاں سے ہم منیجر کے کمرے کی طرف گئے۔ جان ولیم نے ولیمز صاحب کو دیکھا تو ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہیں؟"

"ابھی تو نہیں۔ مگر بہت جلد پہنچنے والا ہوں...... ہم چائے ڈاک بنگلے میں پئیں گے۔"

میں نے اپنا باراں کوٹ منیجر کے کمرے سے اٹھایا اور ہم نے ڈاک بنگلے کی پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا تو چار بجنے میں سات منٹ تھے۔

ولیمز صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آج شام کو کھانا شاید نصیب نہ ہو۔ چائے کے ساتھ ہی جو کچھ کھانا ہو کھا لو۔ مجھے دوست یوں ہی دسترخوان کا خاص سمجھتے ہیں اور رات کو کھانا نہ ملنے کے ڈر سے تو خدا جانے میں نے کس قدر کھایا۔ جب میں رات کی فاقہ کشی کا خاطر خواہ انتظام کر چکا تو میں نے ٹانگیں پھیلا کر سامنے کی خالی کرسی پر رکھ دیں۔ ولیمز صاحب میرے پاس برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل رہے تھے۔ مجھے پیٹ کی فکر سے فراغت پاتے دیکھا تو میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

میں اکثر ان کے موزوں قد اور اعضا کے تناسب کو دیکھ کر رشک کے مارے جلا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت سواری کے لباس میں وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے برجس کی جیب میں سے پستول نکال کر اسے کھولا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کارتوس مانگے۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں چھ فالتو کارتوس بھی ساتھ لایا ہوں۔ اب جو انھوں نے مجھ سے ان کا ذکر کیا تو مجھے نوٹ پیپر بھی یاد آئے۔

میں کہنے کو تھا کہ وہ نوٹ پیپر بھی میرے پاس ہی ہے مگر کسی خیال سے چپ رہا۔ اور جیب سے کارتوس نکال کر ان کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ انھوں نے ایک ایک کر کے سب کارتوس پستول میں بھر دیئے۔ پستول بند کر کے پھر جیب میں ڈال لیا۔ اور مسکرا کر کہنے لگے:

"تمہارے کارتوس ختم ہو گئے تھے۔ اس لیے میں نے تمہیں لونے کو کہا تھا۔ میں تمہارا چھ کارتوسوں کا قرضدار ہوں۔"

ان کا یہ لہجہ بے تکلفی اور خصوصیت میں بے تکلفی تھا۔ لیکن مجھے کچھ عجیب کراہت سی ہوئی۔ میں اس کے جواب میں خدا جانے کیا کہتا۔ لیکن انھوں نے مجھے اس کی فرصت نہ دی اور دفعتاً پوچھا:

"تو تمہاری براؤن کے متعلق کیا رائے ہے؟"

"میں تو سب سے پہلے سیٹھ فیروز جی کے بل کا معما حل کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں ہیلوڈے کے پاس جا کر کسی ڈھنگ سے پوچھ آؤں کہ یہ پاناما کا ڈبہ اور ایک چھوٹا وسکی کس نے خریدا تھا؟"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم اب روز بروز عقلمند ہوتے جاتے ہو۔ اور چونکہ معلوم ہوتا ہے تمہیں تفتیش کے امور میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ اس لیے ساتھ ہی تحصیل سے یہ بھی پوچھتے آنا کہ چارلس نے کل شام کے پانچ بجے مری جانے کے لیے گھوڑا کرایہ پر لیا تھا؟"

مجھے پھر کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ لیکن پھر کچھ جواب بن نہ پڑا۔ کھسیانا ہو کر میں ڈاک بنگلہ سے باہر نکل آیا۔

پانچ منٹ کے بعد میں دور ہی سے مسکراتا ہوا ڈاک بنگلے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ ولیمز صاحب ٹہلتے ٹہلتے رک گئے اور ایک منتظرانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ "کل مورخہ م۔ اگست کو شام کے پانچ بجے چارلس ولیم صاحب مری ہوٹل کے مالک اور منیجر نے سیٹھ فیروز جی اینڈ برادرس کی دکان سے ایک ڈبہ پاناما سگار کا خریدا اور ایک پیگ وسکی کا پیا۔ تحصیل سے کل صبح کے سات بجے سے لے کر شام کے آٹھ بجے تک انھوں نے کوئی گھوڑا کرائے پر نہیں لیا۔ پہلی بات مجھے سیٹھ فیروز جی کی زبانی اور دوسری بات گھوڑوں کے ٹھیکہ دار کی زبانی معلوم ہوئی۔ مگر اس ڈھنگ سے کہ انھیں شاید محسوس بھی نہیں ہوا کہ ان سے یہ باتیں کوئی پوچھ گیا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ پہلوؤں پر رکھ لیے اور نہایت بے پروائی سے دو تین قدم برآمدے کے پتھر کے فرش پر ٹہلا۔ پھر مڑ کر میں نے ولیمز صاحب سے کہا:

"وہ سگاروں کے جلے ہوئے ٹکڑے جو آپ نے براؤن کے کمرے میں سے اٹھائے تھے۔ وہ تو ذرا دکھائیے۔"

انھوں نے فوراً میرے "ارشاد" کی تعمیل کی۔ میں نے ایک ٹکڑا لے کر اسے کھولا پھر ان چھ پاناما سگاروں میں سے جو میں سیٹھ کی دکان پر سے خرید کر لایا تھا۔ ایک سگار لے کر اس کے تمباکو کے پتے کو کھولا اور دونوں کا مقابلہ کیا۔ مربیانہ لہجے میں ولیمز صاحب سے کہا۔

"آپ کا قیاس صحیح تھا۔ یہ جلے ہوئے سگار سب کے سب پاناما سگار ہیں۔"

انھوں نے جھک کر کہا۔ "آپ کی عین نوازش۔"

"تو اب ہم مری چلیں گے نا؟"

"جس طرح حضور حکم کریں۔"

میں بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دیئے۔ وہ پاناما سگار سلگا کر ہم ڈاک بنگلہ سے تحصیل کی طرف آئے۔ وہ گھوڑے

نیچے اپنے بارانی کوٹ وہاں باندھے جہاں سبکتگین نے ہرن کے بچے کو باندھا تھا۔ اور اپنے پستولوں کو جیبوں میں ٹٹول کر گھوڑوں پر سوار ہو مری کی طرف روانہ ہو گئے۔

باڑہ گلی سے آدھ میل کے بعد ہم نے گھوڑوں کو دلکی پر چھوڑ دیا۔ چپ چاپ جنگلوں، مہیب عظمت، ہجر، تر، کھڈ اور چوٹیوں کے اونچے اونچے درخت ایک طرف پہاڑوں کی سپہر شکوہ بلندی، دوسری طرف کھڈ کی پراسرار گہرائیاں تنگ پیچیدہ سڑک، اس پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی مسلسل آواز آتی ہوئی کانتو؟ کوئلوں کی دردناک کوکو۔ میں تو بے خود ہو گیا۔ درختوں کے بیچ میں سے غروب آفتاب کے ہوتے ہوئے سنہرے نظارے بھی عجیب پرکیف منظر تھا۔ باہر ہو کر بے قرار کر رہے تھے۔ آبشاروں کا سفید پانی بڑے بڑے پتھروں پر گر کر تحت الثریٰ میں ہوئی چمک رہا تھا، یہ اول بار کھڈ میں دوڑنے کو جی چاہا۔

میرے کانوں نے ایک غیر مانوس آواز سے رنجیدہ ہو کر مجھے چونکا دیا۔ ملک سے جو مجھ سے دس گز آگے جا رہے تھے اپنا گھوڑا روک لیا تھا اور گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے لب پر تبسم سا ٹھہر گیا۔ وہ بولے:

"مری بائسکوپ کا تماشا کس وقت شروع ہوتا ہے؟"

"شاید پونے آٹھ بجے۔"

"اور اب ...... سوا چھ بجے ہیں اور مری یہاں سے پانچ میل ہے تو گویا ہم بائسکوپ کا تماشا دیکھ سکتے ہیں۔ اب ذرا جلدی جلدی نہ چلیں؟"

"میں خود یہی کہنے والا تھا۔"

ہم نے گھوڑوں کو قدم قدم لے جانا شروع کیا۔ کچھ دیر تو ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایک دم ویلش صاحب نے قماربازی کی اقتصادی، روحانی و اخلاقی قباحتوں پر ایک پُرزور لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اس شد و مد سے کہ میں بھی اس فعل مذموم کے مخترع کا مجرم وہ مجھے سمجھتے ہیں۔ دس منٹ تک لگاتار وہ اس موضوع پر ایک پُرمغز تقریر کرتے رہے۔ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر انہوں نے دفعتاً باگیں کھینچ کر گھوڑے کو ٹھہرا لیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگے:

"اور مجھے شرم کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ قبیح عادت اہل فرنگ میں کثرت سے ہے۔ وہ لوگ جو مہذب گھرانوں کی اولاد اور سوسائٹی کے معزز افراد شمار ہوتے ہیں، بلا تکلف شام کو کھانے کے بعد اپنی بیٹیوں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ جوا کھیلتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ہم صحبت دوست ایسے ہوں جو شام کو کلب میں تاش کھیلے بغیر رہ سکیں اور سارے کلب میں تاش کی ایک بازی ایسی نہیں ہوتی جس کی ہار جیت کے ساتھ روپے کی ہار جیت وابستہ نہ ہو اور اس کو یہ لوگ شغل سمجھتے ہیں۔ اس کو روحانی انبساط کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی پھر یہ دعویٰ ہے کہ تہذیب جدید بنی نوع انسان کی ترقی کا باعث ہوئی ہے۔ غلط اور سراسر غلط کہتے ہیں۔ تہذیب جدید نے کئی نئی خرابیاں ایجاد کی ہیں، مردہ عیوب کو از سر نو زندہ کیا ہے اور کئی پرانی قباحتوں کو پہلے سے زیادہ ہر دلعزیز کر دیا ہے۔"

میں حیران تھا کہ اس شخص نے اپنا دماغ کس قدر قابو میں رکھا ہے۔ مجھے ہرگز اس بات کی توقع نہ ہو سکتی تھی کہ چار گھنٹے برائیوں کی بابت پر تحقیق غور و خوض کرنے کے بعد وہ یکایک اس طرح لاتعلق باتیں کرنے لگ جائیں گے جیسے وہ اس سے محض بے خبر ہوں اور پھر اس وقت جب کہ کم از کم میرا دماغ خیالات کے عدم اظہار کی وجہ سے بیش از بیش اسی سوچ میں مصروف تھا۔ ویلش صاحب میں میں نے بڑی خاصیت دیکھی ہے

کر وہ یک لخت اپنے خیالات کو بغیر کسی تکلیف کے ایک طرف سے دوسری طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ وزیر اعظم انگلستان کے کیرکر ہیوپ بوٹ کو ختم کئے ابھی دو منٹ نہیں گزرتے کہ وہ چین کی ریشم کی تجارت کے متعلق باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں آدمیوں کے ساتھ نہایت انہماک سے متاثر ہو کر گھنٹے تک وہ اصلاحات ہند پر ملک کے ایک مشہور اسپیکر کی دھواں دھار تقریر سنتے رہتے ہیں اور پھر ہال سے باہر نکلتے ہی ہسپانیہ کی آب و ہوا کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ارد گرد عظیم الشان پہاڑ اور اونچے اونچے درخت اس شاندار انسان کو دیکھ کر خاموش تھے۔

ولیٹن صاحب ان سے بالکل غافل، چپ چاپ گھوڑے پر چلے جا رہے تھے۔

مری ٹیلسکوپ سے ہم دس بجے نکلے۔ ولیٹن صاحب برجس کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سگریٹ کے پیہم کش لگا رہے تھے۔ میں نے معمول کے مطابق اپنی گھڑی کو کوک کرنا شروع کیا۔ ولیٹن صاحب بولے:۔

"یہ بھی گھڑی کو کوک کرنے کا وقت ہے؟"

"میں سونے سے پہلے گھڑی کو کوک دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت اور کاموں کی وجہ سے یہ کام بھول جاتا ہوں۔ اب خدا کرے خواجہ محمد حسین وہاں میرے ٹائم پیس کو کوک رکھیں۔"

"تو تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو؟"

"اس میں کیا ہرج ہے؟ بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔"

"میرا بھی یہی قاعدہ ہے اور —— شاید...... ہر ایک...... عقلمند......"

اگر میرے حواس نے مجھے دھوکا نہیں دیا تو میرا خیال ہے کہ ولیٹن صاحب نے اتنا کہہ کر اگلا قدم ذرا آہستہ اٹھایا اور ایک لمحے کے لئے ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی ظاہر ہوئی۔ لیکن پھر وہ پہلے کی طرف لاابالیانہ طریقے میں چلنے لگے۔ آدھ منٹ کے بعد ایک معمولی فقرے کی صورت میں انہوں نے مجھ پر ایک بم گرا دیا۔

"اگر تم ٹائم پیس اور کلائی کی گھڑی کو ایک ہی وقت کوک دیتے ہو، تو براؤن کل شام کے چار بج کر ۵ منٹ پر مرا ہے۔"

مجھے ہرگز یقین نہ آیا کہ میں نے ٹھیک سنا ہے۔ چونک کے میں نے پوچھا۔

"کیا کہا آپ نے؟"

"میں نے کہا ہے کہ اگر تم دونوں گھڑیوں کو ایک ہی وقت کوک دیا کرتے ہو تو براؤن کل شام کے چار بجکر ۵ منٹ پر مرا ہے۔ اور چونکہ چار بجکر ۵ منٹ پر وہ یقیناً ہوٹل کے باہر تھا۔ اس لئے اس کی موت اس کے کمرے میں نہیں بلکہ باہر کہیں واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد غالباً رات کے وقت اس کی لاش اٹھا کر اس کے کمرے میں لائی گئی۔ وہاں اس کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا گیا اور بستر پر لٹا دیا گیا۔ اور پھر اس کی خوابگاہ کی چیزوں کو درہم برہم کر دیا گیا۔"

میں تحیر، استعجاب، انتقام اور اسی طرح کی ملی جلی چیزوں کا مجموعہ مرکب، ان کے چہرے کی طرف منہ کھولے باؤلا کرنے والی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ ولیٹن صاحب بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے، سگریٹ کو منہ سے نکال کر ہوا کی تاریکی میں

قتل کے الزام میں گرفتار رہے۔ گویا تم میں شرافت اور صداقت اس درجہ باقی ہے کہ تم ایک بے گناہ کو اپنے سامنے پھانسی پر چڑھتے دیکھو گے۔

چارلس کا چہرہ اس تقریر کے زیر اثر بتدریج بدلتا گیا اور اس کے چہرے پر مختلف جذبات ظاہر ہوتے گئے۔ استعجاب، غضب، بے بسی، توجہ، نرم دلی، ندامت و افسردگی سب باری باری اس کی آنکھوں میں سے جھانک کر چلے گئے۔ لیکن ڈیٹن صاحب نے اپنی تقریر اسی وقت ختم کی جب ضمیر پر درس کے سائے پر اور اس کے کندھوں کے نیچے جھکنے میں ہمت اور مردانگی کے آثار نظر آئے۔

چارلس نے کھڑے ہو کر کہا۔

"نیو فادر! بے گناہ پھانسی نہ پائے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ مجھے جو کچھ میں نے کیا بہت برا کیا اور میں ازحد شرم و ندامت کے ساتھ اس وقت اپنی ذلیل حرکت کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے قتل نہیں کیا اور خدا شاہد ہے میں کبھی قتل نہیں کر سکتا؟"

"او، تو میں نے اچھا کیا کہ میں تمہارے پاس آیا۔ اگر تم سارے حالات بیان کر دو تو میرے یہ دوست ساتھ ساتھ لکھتے جائیں گے!"

ڈیٹن صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے جیب میں سے نوٹ بک (جو میں احتیاطاً گھر سے ساتھ لایا تھا) نکال کر پنسل اور ڈیٹن صاحب سے اشارہ پا کر جو جو چارلس کہتا رہا لکھتا گیا۔

وہ تحریر تو اس وقت مجھے لفظ بلفظ یاد نہیں ورنہ اس کا بیان جوں کا توں نقل کرنا ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ چارلس جمعہ کے دن باندہ گلی گیا تو شام کو چائے پینے کے بعد براؤن کی طرح وہ بھی سیر کرنے نکلا۔ پہاڑیوں میں وہ ایک چھوٹی پگڈنڈی پر جا رہا تھا کہ سامنے اس نے ایک انگریز کو آتے دیکھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس انگریز کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا لڑھکتا پگڈنڈی سے صاف آٹھ فٹ نیچے جا پڑا۔ چارلس بھاگا بھاگا اس کے پاس گیا۔ اور اسے زمین پر سے اٹھایا۔ لیکن اس کا سر ایک بڑے پتھر کے ساتھ ٹکرانے کی وجہ سے اس کی کنپٹی کو ایک مہلک ضرب آئی تھی۔ اور وہ مر چکا تھا۔ چارلس کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے۔ اس کا نام و نشان معلوم کرنے کی غرض سے اس نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں سے باندہ گلی ہوٹل کا بل ملا جس سے چارلس کو معلوم ہوا کہ اس انگریز کا نام ایل براؤن ہے۔ اور یہ باندہ گلی کے ۱۲ نمبر کمرے میں رہتا ہے۔ پہلے تو اسے خیال ہوا کہ باندہ گلی میں جا کر اس کی موت کی اطلاع دے۔ لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے دل میں ایک شیطانی خیال آیا اور اس نے اپنا پہلا ارادہ ترک کر دیا۔ باندہ گلی آ کر اس نے پانامہ سگاروں کا ایک ڈبہ خریدا اور وسکی کا ایک پیگ پیا۔ اور پھر ہوٹل میں آ کر بھائی کے نام چٹ چھوڑ گیا کہ میں مری واپس جا رہا ہوں۔ لیکن خود ادھر ادھر پہاڑیوں میں رات کی تاریکی کا انتظار کرتا رہا۔ تقریباً گیارہ بجے براؤن کی نعش کو اٹھا کر وہ ہوٹل کی طرف لایا۔ اور موقع پا کر نعش سمیت براؤن کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں براؤن کا کوٹ اتار کر اسے ڈریسنگ گون پہنایا اور خوابگاہ کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ قتل اسی کمرے میں ہوا ہے۔ اور یہ سب باتیں اس نے بھائی کے حسد کے مارے کیں۔ اس کا مدعا باندہ گلی ہوٹل کو بدنام کرنے کا تھا۔ پھر وہ رات بھر براؤن کے کمرے ہی میں رہا جہاں وہ سویا بالکل نہیں اور صبح پو پھٹتے ہی پیشتر اس کے کہ باندہ گلی کا کوئی آدمی جاگے وہ پیدل ہی مری کو چل دیا۔

میں اس کا سارا بیان لکھ چکا تو ڈیٹن صاحب نے کاغذ مجھ سے لے کر چارلس کے آگے رکھ دیئے اور کہا "ان پر دستخط کر دو۔"

کچھ دیر تو چارلس ساکن رہا۔ پھر قلم اٹھا کر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد ہوٹل کے دفتر کے ایک بابو کو بلا کر اسے تحریر کا مطلب بتائے بغیر اس کے دستخط بھی بطور گواہ کے کرا لئے گئے۔ پھر ڈیٹن صاحب نے ان کاغذوں کو لفافے میں بند کر کے لفافے کے اوپر مجھ سے پتہ لکھوا لیا۔

سب انسپکٹر پولیس، باندہ گلی

معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ ضلع ہزارہ — ایبٹ آباد

لفافے کو ہاتھ میں لے کر چارلس سے کہا:۔

"اس لفافے کو میں ابھی ڈاک میں ڈال دوں گا۔ یہاں سے ایبٹ آباد، ایبٹ آباد سے باندہ گلی یہ تین دن میں پہنچے گا۔ تب تک تم اگر چاہو تو کہیں کے کہیں پہنچ سکتے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تمہاری یہ تحریر فیروز خان کی رہائی کے لئے کافی ہوگی۔"

دوسرے دن صبح ہم باندہ گلی پہنچے۔ گیارہ بجے کے قریب ہوٹل کے ۲۳ نمبر کمرے میں، میں اور ولسن صاحب آرام کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ولسن صاحب اخبار کا تازہ پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں سامنے بیٹھا ہوا خاموشی سے سگرٹ پی رہا تھا اور اس قتل کے واقعات کو ایک ایک کر کے دہرا رہا تھا۔

ولسن صاحب نے اخبار کو سامنے سے ہٹایا۔ تو میں نے پوچھا:۔

"وہ سیٹھ فیروز جی کا بل براؤن کی جیب میں کس طرح آگیا؟"

"سیٹھ فیروز جی کا بل؟ وہ تو معمولی بات ہے۔ جب چارلس نے براؤن کی جیب سے ہوٹل کا بل نکالا تو اسے پڑھ کر پھر جیب میں ڈال لیا۔ اس جیب میں جہاں بعد میں اس نے فیروز جی کا بل رکھا۔ مری جانے سے پہلے اس نے ہوٹل کا بل اپنی جیب سے نکال کر پھر براؤن کی جیب میں ڈال دیا اور غلطی کے ساتھ فیروز جی کا بل بھی چلا گیا۔"

"اور ہاں۔ آپ نے خاص مجھے نوٹ پیپر لانے کو کیوں کہا تھا؟"

"میرے اپنے پاس تو وہی نوٹ پیپر ہیں جن پر ہوٹل کا نام چھپا ہوا ہے۔ وہ میں نے اس لئے استعمال نہ کئے تھے کہ کوئی اگر چاہتا تو ان کے ذریعے سے میرا پتہ لگا سکتا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب میری اس حقیر سی خدمت کے لئے مجھ ناچیز کے شکرگزار ہوں۔ بازار سے نئے نوٹ پیپر خریدنا قرین مصلحت نہ تھا۔ اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دی۔"

"مگر وہ چارلس کا بیان تو نہ صرف میرے نوٹ پیپروں پر بلکہ میرے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس صاحب آپ کی بجائے میرے شکرگزار ہوں تو میں کیا کروں؟"

"تمہارے جی میں آئے کرنا۔ لیکن خدا کے لئے میرا نام نہ لینا۔"

سپرنٹنڈنٹ صاحب پولیس یوں تو مجھے اچھی طرح جانتے ہیں لیکن مجھے یقین نہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی تحریر پہچان لیں گے۔ ایک ہفتے کے بعد ان کا ایک نیم سرکاری خط میرے نام آیا:۔

ڈیر مسٹر امجد!

میرے پاس اس بات کے یقین کرنے کے لئے زبردست وجوہات ہیں کہ مسٹر براؤن ساکن باندہ گلی ہوٹل کی موت کے متعلق پولیس کو ناانصافی اور گمراہی سے بچانے میں آپ نے بہت سا حصہ لیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بجا

ہو گا کہ پولیس کو اس مقدمے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔ آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں تمام محکمہ کی طرف سے آپ کی بے غرضانہ مساعی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کروں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کے طریقۂ تفتیش کی تفصیل خالی از دلچسپی نہ ہو گی۔ اگر آپ ہمیں اس سے آگاہی بخشیں تو سب حالات کو پولیس جرنل میں شائع کر دیا جائے۔ امید ہے آپ میری اس درخواست کو قبول فرما کر مجھے فخر بخشیں گے۔

آپ کا مخلص

....

میں نے اسی وقت اس کا جواب لکھ کر ڈاک میں ڈال دیا۔

جنابِ عالی۔

مسٹر براؤن کی موت کے متعلق میں نے سوائے چپڑاسی ولیم کا بیان لکھنے کے اور کچھ نہیں کیا۔ یہ سب انکشافات مجھ سے ایک بدرجہا اعلیٰ دماغ کے غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں۔

شاید سپرنٹنڈنٹ صاحب اسے کسرِ نفسی ہی سمجھیں مگر میں اور کیا لکھتا۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۱۹ء)

کیفیت مرگ سے آگہی ہو ہی نہیں سکتی - دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھتے ہیں (بعض [illegible] سختی
سے جان دیتے ہیں - ان کے ہوش وحواس آخر تک برجا رہتے اور جو کچھ ان پر گزرتی ہو
دوسروں سے کہتے اور ان کے کرب سے ان کی تکلیف پہچان پڑتی - بعض جان کنی سے پہلے
بے ہوش ہو جاتے ہیں - ان کی ایذا اوپر والوں کو محسوس نہیں ہوتی - اور کوئی کوئی اللہ کے
بندے ایسے بھی ہیں کہ باتیں کرتے کرتے پھونک نکل گئی اور ہو چکے - کیا معلوم کس طرح اپنی
تقدیر میں مرنا لکھا ہو اور چونکہ [illegible] سے خوف کا انجام موت ہی اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ موت بڑی ہی خوفناک چیز ہے [illegible] ن اے کاش مرنے سے آدمی کی مصیبتوں
کا خاتمہ ہو جاتا - اگر ایسا [illegible] سخت جان کنی کے ساتھ سب سے پہلے مرنے کی
میسری درج [illegible] مرنے سے انسان کی ابدی اور دائمی زندگی
شروع ہوتی ہے جس کا بھلا یا برا [illegible] بہرہ مند ہونا موقوف ہے اعمال پر جو
[illegible] چند روزہ زندگی میں کئے - پس یہ زندگی بے ثبات اور غیر متیقن اور
چند روزہ ہونے کے علاوہ اور انواع مصائب اور اقسام تکالیف اور طرح طرح کے تردّدات
[illegible] کا ہے کو انسان کے حق میں عذاب اور وبال ہے جب کہ اس کا نتیجہ عاقبت معلوم
نہیں [illegible] بزرگان دین [illegible] منقول ہے کہ وہ تمنا کرتے تھے کہ ہائے ہم درخت
یا پتھر ہوتے تو ایسی [illegible] خیال ہے اور یوں آدمی اس کو اپنے
ذہن میں نہ آنے دے تو دوسری بات ہے گو [illegible] بھی سوچے اور غور کرے گا تو ممکن نہیں کہ
اس کو قائل [illegible] یوں بھی دنیا کی زندگی قدر اور پسند کی چیز نہیں - اور کیوں قدر اور
پسند کی چیز ہو [illegible] آج تخت نشین ہے اور کل پیوند زمین - آج صاحب
مقدور ہے [illegible] کے ساتھ ہے اور کل خالی ہاتھ - آج لباس
و پوشاک ہے اور کل بستر خاک - آج باوقعت و اعتبار ہے اور کل ذرۂ بے مقدار - آج عزیز ہے
اور کل حقیر و ناچیز - آج مرجع منظمات الامور ہے اور کل داخل اصحاب القبور (یعنی آج
زندہ ہے اور کل مُردہ - آج ہے اور کل نہیں) وہ کسی کا بندی دوسرا کیسا عمدہ ہو -

چلنا ہی رہنا نہیں اور چلنا بسوے بیس + ایسے سہج سہاگ پر کون گندھائے سیس +

کاغذی روپیہ

خواجہ علی احمد شہر کے بڑے سوداگر تھے۔ لاکھوں کا کاروبار چلتا تھا۔ لوگوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بچہ بچہ ان کی دیانت داری سے واقف تھا اور ہر شخص جانتا تھا کہ خواجہ علی احمد قول کے سچے اور بات کے پکے ہیں۔

ایک دن انہوں نے اپنے ایک آدمی کو جوتے والے کی دکان سے جوتا خریدنے بھیجا۔ جوتے کی قیمت بیس روپے تھی لیکن بجائے اس کے کہ خواجہ علی احمد اپنے نوکر کو بیس روپے دے کر بھیجتے، انہوں نے نوکر کے ہاتھ کریم خاں جوتے والے کے نام یہ رقعہ لکھ بھیجا۔

"میاں کریم خاں! مہربانی کر کے ہمارے آدمی کو بیس روپے کا ایک جوتا دے دو۔ ہمارا یہ رقعہ اپنے پاس سنبھال کے رکھ چھوڑو۔ جب تمہارا دل چاہے یہ رقعہ کسی کو یا ہمارے منشی کو دکھا دینا اور بیس روپے لے جانا۔ یہ رقعہ اگر تم کسی اور شخص کو دینا چاہو تو بے شک دے دو۔ جو ہمارے پاس لائے گا ہم اس کو بیس روپے دے دیں گے۔ راقم خواجہ علی احمد۔"

دکان والے نے جب رقعے کے نیچے خواجہ علی احمد کا دستخط دیکھا۔ تو اسے اطمینان ہو۔ جانتا تھا کہ خواجہ صاحب فریب کرنے والے آدمی نہیں اور پھر بات کے آدمی ہیں۔ روپے نہیں بھیجے تو نہ سہی۔ یہ رقعہ کیا روپوں سے کم ہے۔ جب چاہوں گا، رقعہ جا کر دے دوں گا اور روپے لے لوں گا۔ چنانچہ اس نے بلا تامل کے جوتا بھیج دیا۔

تھوڑی دیر بعد کریم خاں دکان دار کے پاس عبداللہ حلوائی آیا اور کہنے لگا "میاں کریم خاں! میرے تمہاری طرف پچیس روپے نکلتے ہیں۔ ادا کر دو تو تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

کریم خاں نے کہا: "ابھی لو۔ یہ پانچ تو نقد لے لو۔ باقی بیس روپے مجھے خواجہ علی احمد سے لینے ہیں۔ یہ دیکھو ان کا رقعہ۔ ذرا ٹھہر جاؤ، تو میں جھٹ ان سے بیس روپے لے آؤں۔"

عبداللہ بھی خواجہ علی احمد کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ شہر بھر میں خواجہ صاحب کی ساکھ قائم تھی کہنے لگا۔ "تم یہ رقعہ مجھے ہی کیوں نہ دے دو میں ان سے بیس روپے لے آؤں گا کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ جو شخص یہ رقعہ لائے گا اس کو بیس روپے دے دیے جائیں گے۔"

کریم خاں نے کہا: "یونہی سہی۔" چنانچہ عبداللہ حلوائی نے بیس روپے کے بدلے وہ رقعہ قبول کر لیا۔

کئی دنوں تک یہ رقعہ یونہی ایک سے دوسرے کے ہاتھ میں پہنچ کر شہر بھر میں گھومتا رہا۔ خواجہ علی احمد پر لوگوں کو اس قدر اعتبار تھا کہ ہر ایک اسی رقعے کو بیس روپے کی بجائے لے لینا قبول کر لیتا کیونکہ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ جب چاہوں گا اسے خواجہ صاحب کے منشی کے پاس لے جاؤں گا اور ان سے

بیس روپے وصول کر لوں گا۔

ہوتے ہوتے یہ رقعہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا بھائی کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ یہ شخص اپنے بھائی کو منی آرڈر کے ذریعے بیس روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ ڈاک خانے والوں نے اس رقعہ کو بیس روپے کے عوض میں لینا قبول نہ کیا۔ چنانچہ وہ شخص سیدھا خواجہ علی احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ رقعہ پیش کر دیا۔ منشی نے بیس روپے گن کر دے دئے۔ اس نے روپے جا کر ڈاک خانے والوں کو دے دئے اور انہوں نے آگے اس کے بھائی کو بھیج دئے۔

اس مثال سے یہ ظاہر ہوا کہ محض ایک کاغذ کا پرزہ کتنی مدت تک روپے کا کام دیتا رہا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کاغذ کے نیچے ایک ایسے شخص کے دستخط تھے جس کی دیانت داری پر سب کو بھروسہ تھا۔ اور جس کی دولت کا سب کو علم تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ شخص جب چاہے بیس روپے ادا کر سکتا ہے اور قول کا اتنا پکا ہے کہ کبھی ادا کرنے سے انکار نہ کرے گا۔

اگر ایسے ہی ایک رقعے کے نیچے ہم یا تم دستخط کر دیتے تو کوئی بھی اسے روپے کے بدلے میں قبول نہ کرتا۔ اول تو ہمیں جانتا ہی کون ہے۔ اور جو جانتا بھی ہے وہ کہے گا کہ ان کا کیا پتہ۔ آدمی نیک اور شریف اور دیانت دار سہی لیکن خدا جانے ان کے پاس بیس روپے ہیں بھی یا نہیں؟ کیا معلوم ہم مانگنے جائیں اور وہاں کوڑی بھی نہ ہو۔

خواجہ علی احمد کا رقعہ گویا ایک قسم کا نوٹ تھا۔ سرکاری نوٹ بھی بالکل ایسی چیز ہوتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے نیچے سرکار کی طرف سے سرکاری خزانے کے ایک افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔ اگر تم دس روپے کے نوٹ کو لے کر دیکھو تو اس پر اوپر حکومت پاکستان اور اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ عند المطالبہ حامل ہذا کو دس روپیہ سرکاری خزانہ کراچی سے ادا کروں گا۔" اس عبارت کے نیچے سرکاری افسر کے دستخط ہوتے ہیں۔

خواجہ احمد علی کو تو صرف ایک شہر کے لوگ جانتے تھے۔ حکومت پاکستان کو ملک کا ہر آدمی جانتا ہے۔ بلکہ اور ملکوں میں بھی اس کی ساکھ قائم ہے اس لئے سرکاری نوٹ کو ہر شخص بلا تأمل قبول کر لیتا ہے۔ اور کوئی قبول کیوں نہ کرے۔ لوگ جانتے ہیں کہ جب چاہیں خزانے میں جا کر اس کے روپے بھنا سکتے ہیں

خواجہ علی احمد کے رقعے اور سرکاری نوٹ میں ایک فرق اور بھی ہے۔ خواجہ علی احمد کا رقعہ تو ڈاک خانے والوں نے قبول نہ کیا تھا لیکن سرکاری نوٹ انہیں ضرور ہی قبول کرنا پڑتا۔ سرکاری نوٹوں کو قانونی طور پر ملک کا سکہ قرار دیا گیا ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان کو روپے کے بدلے لینے سے انکار کرے۔ اگر تمہیں کسی شخص نے دس چاندی کے روپے قرض دئے تھے اور اب تم اس کو یہ قرضہ اتارنے کے لئے دس روپے کا نوٹ دیتے ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو چاندی کے روپے ہی لوں گا۔ اسے دس کا نوٹ ضرور لینا پڑے گا۔

روپیہ ایسا ہونا چاہئے کہ آسانی سے پاس رکھا جا سکے۔ چاندی کے سکوں میں یہ خوبی ایک حد تک پائی جاتی ہے۔ تاہم چاندی کے سکے وزنی ہوتے ہیں۔ اتنی روپے کا وزن سیر بھر ہو جاتا ہے تو جہاں پانچ چھ سو روپے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا ہوں، وہاں اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔ نوٹوں سے یہ دقت رفع ہو جاتی ہے۔ ہزاروں روپے کے نوٹ ایک جیب میں آسانی سے ڈالے جا سکتے ہیں۔ نوٹوں کے جاری کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

باوجود ان سب باتوں کے جس شخص کے پاس بہت سا روپیہ ہو۔ اس کے لئے یہ مشکل ہے کہ بہت سے نوٹ، کچھ روپے، چونیاں، دونیاں یہ سب کچھ اپنے پاس سنبھال رکھے۔ ایک تو سنبھالنے کی تکلیف، دوسرے چوری کا خطرہ، اس لئے بہتر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب روپیہ بنک میں رکھوا دے۔

بنک میں روپیہ امانت کے طور پر رہتا ہے روپے کا مالک جب چاہے اس کو نکلوا سکتا ہے یا جس کو چاہے اپنے حصے کا روپیہ دلا سکتا ہے کسی اور کو اپنے حصے کا روپیہ دلوانے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو چیک لکھ کر دے دیا جائے۔

ہم یہاں چیک کے معنوں کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کرو، عبداللہ نے بنک میں بہت سا روپیہ جمع کر رکھا ہے۔ کریم خاں، اس سے دس روپے مانگنے آتا ہے۔ عبداللہ بجائے اس کے کہ کریم خاں کو دس روپے نقد دے۔ وہ اسے دس روپے کا چیک لکھ دیتا ہے۔ چیک گویا ایک قسم کا رقعہ ہے جو عبداللہ کریم خاں کی معرفت اپنے بنک کو بھیج رہا ہے۔ چیک پر مفصلہ ذیل الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔۔۔

بنام فلاں بنک

کریم خاں کو دس روپے دے دو

راقم عبداللہ

کریم خاں کی بجائے عبداللہ اگر کسی اور کا نام لکھ دے تو جس کا نام لکھے گا اسی کو روپے ملیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کریم خاں دس روپوں کی بجائے یہ دس روپے کا چیک کیوں قبول کر لیتا ہے؟ اس لئے کہ اسے عبداللہ پر اعتبار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بنک میں ضرور عبداللہ کا روپیہ جمع ہوگا۔ میں جب یہ چیک لے جاؤں گا۔ مجھے روپیہ ضرور مل جائے گا۔

اب فرض کرو کہ کریم خاں وہ چیک لے کے عبداللہ کے بنک میں گیا۔ اور کہا کہ مجھے اس چیک کا روپیہ ادا کر دو۔ بنک والوں نے عبداللہ کا حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کل تین روپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ چیک ادا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ انکار کر دیں گے اور کریم خاں کا عبداللہ پر اعتبار باقی نہ رہیگا لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بنک والے عبداللہ کو جانتے ہیں۔ مدت سے اس کا حساب کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں بنک میں تو عبداللہ کے تین روپے ہیں۔ مگر چلو فی الحال ہم باقی کے سات روپے اپنے پاس سے دے دیتے ہیں اور عبداللہ کی لاج رکھ لیتے ہیں ہم یہ سات روپے پھر اس سے لے لیں گے۔ لیکن عام طور پر ایسا کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگوں کا جتنا روپیہ بنک میں ہوتا ہے اس کے اندر اندر ہی چیک دیتے ہیں اور کم ہی ایسا موقع پیش آتا ہے کہ بنک چیک ادا کرنے سے انکار کر دے۔

اگر کریم خاں نے خود بھی کسی بنک میں حساب کھول رکھا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ عبداللہ کا چیک لے کر وہ خود عبداللہ کے بنک میں جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح وہ اپنا روپیہ بنک میں جمع ہونے کے لئے بھجوا دیتا ہے اسی طرح یہ چیک بھی بھجوا دے۔ اس کے بنک والے خود ہی عبداللہ کے بنک سے اس چیک کا روپیہ وصول کر لیں گے۔ یہ دس روپے کی رقم کریم خاں کے حساب میں جمع کر دی جائے گی۔ اور عبداللہ کے حساب میں خرچ کی مد میں چڑھا دی جائے گی۔

اس طرح سے یہ سہولت ہوئی کہ عبداللہ اور کریم خاں دونوں کا روپیہ اپنے اپنے بنک میں محفوظ پڑا ہے نہ تو عبداللہ کو روپیہ ادا کرتے وقت نہ کریم خاں کو وصول کرتے وقت بنک جانا پڑا۔ اور روپیہ ایک کے حساب میں سے نکل کر دوسرے کے حساب میں جمع بھی ہو گیا۔ یہ سب کچھ ایک چیک کی بدولت ظہور میں آیا۔

یہاں ہم نے صرف "کاغذی روپے" کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے، ایک سرکاری نوٹ اور دوسرے چیک، ان کے علاوہ اور بھی کاغذات ایسے ہیں جن کے ذریعے سے بڑی بڑی رقمیں یہاں سے دور دراز ملکوں تک پہنچ جاتی ہیں۔

(بچوں کے لئے) (خیابانِ اردو)

رونا رُلانا

یہ مرحبیں ادبی نقاد ایک مقام پر لکھتا ہے کہ مرد ایک مضحکہ خیز جانور ہے اور عورت ایک ایسا حیوان ہے جو اکثر رونی شکل بنائے۔ بتلیہ مصنف کی خوش طبعی نے اس فقرے میں مبالغے اور تلخی کی آمیزش کر دی ہے اور چونکہ وہ خود مرد ہے اس لئے شاید عورتوں کو اس سے کلی اتفاق بھی نہ ہو لیکن بہرحال موضوع ایسا ہے جس پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

میرے ایک دوست کا مشاہدہ ہے کہ عورتوں کی باہمی گفتگو یا خط و کتابت میں موت یا بیماری کی خبروں کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے واقعات کے بیان کرنے میں عورتیں غیر معمولی تفصیل اور رقت انگیزی سے کام لیتی ہیں۔ گویا ناگوار باتوں کو ناگوار ترین پیرائے میں بیان کرنا ان کا نہایت پسندیدہ شغل ہے۔ ان سے وہ کبھی سیر نہیں ہوتیں۔ کسی کی موت کی خبر سننے کے لئے اپنی شناساؤں میں سے زیادہ سے زیادہ سامعین کی تعداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی ہیں۔ ایسی خبر جب بھی نئے سرے سے سنانا شروع کرتی ہیں ایک نہ ایک تفصیل کا اضافہ کر دیتی ہیں اور ہر بار نئے سرے سے آنسو بہاتی ہیں اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ موت یا بیماری کسی قریبی عزیز کی ہو۔ کوئی پڑوسی ہو، ماما ہو، ملازم ہو، ملازم کے ننھیال یا سہیلی کے سسرال کا واقعہ ہو۔ گلی میں روزمرہ آنے جانے والے کسی خوانچے والے کا بچہ بیمار ہو، کوئی اتفاقی ازدواجی تجربہ ہو، کوئی افواہ ہو۔ غرضیکہ اس ہمدردی کا حلقہ بہت وسیع ہے ~

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

نہ صرف یہ بلکہ رقت انگیز کہانیوں کے پڑھنے کا شوق عورتوں ہی کو بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس بارے میں بھی اقوام کا ایک ہی سا حال ہے۔ غیر ممالک میں بھی رلانے والی کہانیاں متوسط طبقے کی عورتوں میں بہت مقبول ہوتی ہیں۔ گھٹیا درجے کے فرم نگار مصنفین کی اپنی کتابوں کی قیمت اکثر عورتوں کی جیب سے وصول ہوتی ہے۔ وہ بھی عورتوں کی فطرت کو سمجھتے ہیں۔ کہانی کیسی ہی ہو اگر اس کا سرورق پر نم دار کی ایک تصویر ہے تو اس کی اشاعت یقینی ہے اور عورتوں کی آنکھوں سے آنسو نکلوانے کے لئے ایسے مصنفین طرح طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ کبھی ایک بھولے بھالے بچے کو سات آٹھ سال کی عمر میں ہی مار دیتے ہیں اور بستر مرگ پر توتلی باتیں کرواتے ہیں۔ کبھی کسی یتیم کو رات کے بارہ بجے سردی کے موسم میں کسی چوک میں بھوکا اور ننگا کھڑا کر دیتے ہیں اور بھی رقت دلانی ہو تو اسے سینہ جا دیتے ہیں۔ یہ بھی کافی نہ ہو تو اسے بھیک مانگنا سکھا دیتے ہیں کہ "میری بوڑھی ماں مر رہی ہے۔ دوا کے لئے پیسے نہیں خدا کے نام اللہ دیتے جاؤ" کبھی کسی کمسن خوب صورت نیک طینت لڑکی کو چڑیل سی ساس کے حوالے کرا دیا۔ یا کسی بدقماش خاوند کے سپرد کر دیا اور کچھ بس نہ چلا تو سوتیلی ماں کی گود میں ڈال دیا اور دل کی بھڑاس نکال لی۔ پڑھنے والیاں زار و قطار رو رہی ہیں اور بار بار پڑھتی ہیں اور بار بار روتی ہیں۔

خود عورتوں کی تصنیفات اکثر ہچکیوں میں لپٹی ہوئی اور آنسوؤں میں تر ہوتی ہیں۔ پاکستان میں جو کتابیں عورتوں نے لکھیں، اکثر میں نوحہ،

یا مثلاً زہر، خودکشی، زہر، قلم تراش، ایک چیز کا سامان باندھ دینا گویا ذہن جا بجا بیان کر کے کر دینا یا کھانا پکانے کی کتاب سو تعصبات ہے۔
تو مصیبت کیا ہے؟ ہر بات بات پر ضرب ماتم کچھ بنا کیا معنی؟ بار بار سوچتا ہوں کہ آخر اس مرثیہ نگار نے کیا غضب کیا؟ جس کے کہا ہے لیکن بری بات کیا بھی؟

کسی گھر پر موت واقع ہو جائے تو رونے اور مرنے والے کا مقابلہ کیجئے۔ مردوں کا ماتم تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ بیچارے گھر کے باہر بیٹھے ہیں۔ سر نیچا کئے چپ چاپ۔ آنکھیں کچھ سرخ ہیں۔ کبھی کبھی آنسو بھی ٹپک پڑتے ہیں یا کسی نہ کسی انتظام میں مصروف ہیں۔ چہرے پر قلق سا ہے اور قدم ذرا آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں۔ اور رونے کا ماتم تو دور دور سے موت کے گھر کا پتہ دیتا ہے اور جب کوئی نئی عورت بی بی آتی ہے تو ذرا جاتی ہے تو ماتم کی جھنجھناہٹ میں از سر نو ایک ہلچل ہے جیسے یکسر کوئی ہوائی جہاز بم گرتا ہے۔ مرد تو دوسرے تیسرے دن کام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لیکن عورتوں کے ہاں سینہ بھر کو ایک شب قائم ہو جاتی ہے۔ گھروں پر گلوریاں کھائی جاتی ہیں اور چولہوں پر چیخیں ماری جاتی ہیں۔

کہیں بیمار پڑی رہ جاتی ہیں تو بیماری میں وہ وہ بیماریاں نکال کے آتی ہیں جو لڑکے وہم و گمان میں نہ تھیں جتنی دیر سرہانے بیٹھی رہیں بیمار کی ہر کروٹ پر ہاتھ ملتی ہیں۔ بیچارہ کہیں گلا صاف کرنے کو بھی کھانسے تو یہ سورۂ یٰسین تک پڑھ جاتی ہیں۔ رنگت کی زردی، بدن کی کمزوری، سانس کی بے قاعدگی، ہونٹوں کی خشکی ہر بات کی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیمار کو بھی اپنی یہ خطرناک حالت دیکھ کر چار ناچار سختی آ جاتی ہیں و ناچار ہے جوں جوں بیمار پرسی عورتوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے موت قریب آتی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بعض عورتوں کو مریض کے بچ جانے پر صدمہ ہوتا ہوگا کہ اتنی تو بیمار پرسی کی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

عورتیں نہ صرف دوسروں کے غم میں حصہ لے کر روتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کی اشک باری کے لئے خود بھی سامان مہیا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتیں۔ ایک پرانے زمانے کے بزرگ اپنی اہلیہ کے متعلق فرمایا کرتے ہیں کہ ساری عمر انہوں نے کبھی اپنا حساب نہیں رکھتیں۔ کہ کوئی پڑوسن آ کے کہہ دے کہ اے بوا! ماشاء اللہ آج تو تمہارے چہرے پر رونق برس رہی ہے تو جھنجھلا کر بول اٹھتی ہیں کہ تیرے منہ میں خاک۔ میں آدھی جاتی ہوں اور میرا جاننے والوں کو ابھی میں اچھی کی نظر آتی ہوں۔ اور کوئی آ کے کہہ دے کہ اے ہے بیٹی تجھے کیا ہو گیا۔ تو تو دن بدن گھلتی جاتی ہے۔ نہ جانے تجھے کیا غم کھا گیا؟ تو ایسی پڑوسن کو فوراً اگالدان کا طالب ل جاتا تھا۔ بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی۔ گھر کا کام کاج چھوڑ کر شام تک ان کو اپنے دکھڑے سنائے جاتے تھے اور چلتے وقت وہ پانچ روپے قرض بھی لے جایا کرتی تھیں جن کی ادائیگی کے لئے کبھی تقاضا نہ کیا جاتا تھا۔

اپنے اوپر رحم دلانے کا مرض جس کسی میں بھی پایا جائے۔ بہت ذلیل مرض ہے لیکن عورتوں میں یہ اس قدر عام ہے کہ خوش حال گھرانے کی بہو بیٹیاں بھی گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی دکھ وضع کر لیتی ہیں اور موقع موقع پر سنا کر رلا دیتی ہیں۔

اس تحریر سے میرا مطلب ان بہنوں کا مذاق اڑانا ہرگز نہیں جو فی الواقع غمگین یا مصیبت زدہ ہیں۔ ان کی ہنسی اڑانا پرلے درجے کی شقاوت ہے۔ جو خدا مجھے نصیب نہ کرے کسی کا غم ایسی بات نہیں جو دوسرے کی خوش طبعی کا موضوع بنے۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کا بہت سا دکھ ضبط، تحمل اور خندہ پیشانی سے دور ہو سکتا ہے۔ کسی مصیبت زدہ شخص کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہ ہے کہ اس کا غم غلط کرایا جائے۔ کسی بیمار کی سب سے بڑی تیمارداری یہ ہے کہ اس کی طبیعت کو شگفتہ کرنے کا سامان پیدا کیا جائے۔ غم کو برداشت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو ضبط کرنے کی کوشش کی جائے۔ مہذب شخص کی یہی پہچان ہے۔ اپنے دکھ کے قصے کو بار بار دہرا کر کسی دوسرے شخص کو متاثر کرنے کی کوشش کرنا گویا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے خود بھی ہنسو اور اوروں کو بھی ہنساؤ۔ دنیا میں غم کافی سے زیادہ ہے اس کو کم کرنے کی کوشش کرو۔ ہنسنا اور خوش رہنا دماغ اور جسم کی صحت کی نشانی ہے۔ غرضکہ مختصر یہ کہ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ شخص انمول ہے جو اپنی تحریر سے ہزاروں لوگوں کو خوش کر دیتا ہے اور وہ شخص خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا جو اپنے زور قلم سے ہزاروں جوان، معصوم، خوش مزاج عورتوں اور مردوں کو رلاتا ہے۔ اور رلاتا بھی اس طرح ہے کہ نہ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے نہ کوئی دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے اور ہزار قابل افسوس ہے وہ شخص جو یہ سب کچھ کر کے بھی اپنی انشاپردازی پر ناز کرتا ہے۔

(تہذیب نسواں)

مینہ برس رہا ہے

مینہ موسلا دھار برس رہا ہے۔ سندی نالے بڑھتے ہوئے ہیں۔ ہر طرف شام کی سی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ درخت، پودے ابھری ہوئی تصویر کی طرح اپنی سبزی میں زیادہ سبز اور اپنی پاکیزگی میں زیادہ صاف نظر آرہے ہیں۔ پھول اور پرندے، نغمہ اور نکہت، رنگ اور بو سب شاداں معلوم ہوتے ہیں۔ اے میری آرزوؤں کی ملکہ میرا دل اداس ہے۔

بارش کی چلمن میں سے کائنات کی دنیائے موہوم دکھائی دیتی ہے جس کو دیکھ کر دل میں ٹیس اٹھ سکتی ہے۔ مگر جہاں خواہشوں کا پورا ہونا اسی دنیا کے باشندوں کے لئے مخصوص ہے۔ درخت جھومتے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں۔ اُن کے پتے ہل ہل کے پھیلتے اور پھیل پھیل کے چومتے ہیں۔ ان کی لرزش میں مجھے تیرا تبسم نظر آتا ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تو اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔ پرندے کھیتوں میں چھپ چھپ کے گاتے ہیں۔ میرے کانوں میں تیری آواز پڑتی ہے۔ میں یہ سب دیکھتا ہوں۔ سب کچھ سنتا ہوں اور ترستا ہوں۔ یہ تو بارش کے اس پار کی دنیا ہے۔

بجلی چمکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس دنیا سے کوئی پیغام آیا۔ لیکن وہ تڑپ تڑپ کے ترساتی ہے اور میں ترس ترس کے تڑپتا ہوں۔ اس کو کہہ کر اپنا ایک نقرئی تیر میرے سینے تک پہنچا دے۔ اور اس کو میری حسرتوں میں بجھا کر تجھ تک لے جائے۔ لیکن اے میری حسرتوں کی امید! یا تو اپنی دنیا میں جہاں ہوائیں چل رہی ہیں اور نالے بہہ رہے ہیں، میری ضعیف التجائے درد کون سن سکتی ہے!

پرندے چہچہاتے ہیں۔ میں چپ بیٹھا ہوا سنتا ہوں۔ میرے سینے میں بھی ایک نغمہ ہے۔ ان کو کہہ کر وہ مجھے بھی اپنے ساتھ گانے دیں۔ کہ میرے ننھے ننھے گیت تیرے بالوں کی طرح کائنات کے دل میں بکھر جائیں۔ میں اکیلا اس کی مستی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک شراب ہے کہ جس میں ساقی قدرت نے ایک آبگینہ کے ٹکڑے چھلک دیئے تھے۔ میرے دل میں خواہش ہو رہی ہے اس بلبل کو بھیج دے کہ آ کے لے جائے اور تیرے پاس روتی ہوئی جائے۔

اے میری مقصودِ انتظار! تو بارش کے اس پار آجا۔ جہاں میرا دل اور میری آنکھیں تیرے لئے خواہشوں اور آرزوؤں کی پگڈنڈیاں سے تیری راہ تک رہی ہیں۔ اس پار آجا۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنے ساز کو توڑ دوں اور اپنی تمام آرزوؤں کو ایک درد انگیز چیخ کی صورت میں اپنے سینے سے نکال کر تیرے لئے ویسا ہی موہوم ہو جاؤں جس طرح تو آج میرے لئے ہے۔

"پطرس"

(کہکشاں۔ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء)

مسئلہ تیونسیہ

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ پروفیسر احمد شاہ بخاری کی اس تقریر کا متن درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو حفاظتی کونسل میں تیونسیہ کے مسئلے پر کی۔ پروفیسر مرحوم اس اجلاس کے صدر بھی تھے۔

اس اجلاس کے مقررین کی فہرست میں اگلا نام پاکستانی وفد کا ہے۔ اگر میرے رفقا کو اعتراض نہ ہو تو میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں تقریر شروع کروں۔

فرانس کے نمائندے نے اس معاملے کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں میرے وفد نے انہیں اسی غور اور توجہ سے سنا جس کے وہ مستحق تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی تھی کہ فرانسیسی نمائندے نے ایجنڈا منظور کرنے کے ضمن میں طریق کار کی بحث کے متعلق سب سے پہلے تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تاہم جب انہوں نے اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کی مخالفت کی تو میری خوشی حیرت میں بدل گئی۔ حیرت اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ فرانسیسی وفد کی جانب سے اس قسم کے رویے کی توقع نہ تھی۔ اس لیے ہوئی کہ اصل مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے سے تو سخت اختلاف کیا اور تقریر ایسی کر ڈالی جو یہ سوال ایجنڈے پر آجانے کے بعد ہی کی جا سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ نمائندے نے یہ طرز عمل بظاہر اس لیے اختیار کیا کہ کم از کم انہیں واقعی سیر حاصل بحث ضروری محسوس ہوئی۔ جب واقعہ یہ ہے تو اس کا یہ کہنا ہمارے لیے یقیناً حیرت کا موجب ہے کہ وہ ایجنڈے کی منظوری کے خلاف ووٹ دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے خود تقریر کے لیے موقع کی تلاش تھی اسے موقع مل بھی گیا اور اس سے فائدہ بھی اٹھا لیا گیا۔ گویا ایجنڈا منظور ہو چکا تھا۔ لیکن وہ دوسروں کو اس موقع سے محروم رکھنا چاہتا ہے۔ بلاشبہ دوسرے جو لوگ اس میز کے گرد جمع ہیں انہیں اس موقع سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انہیں بحث میں حصہ لینے کا ٹھیک ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا فرانس کے نمائندے نے اپنے لیے حاصل کرنا مناسب جانا۔ لیکن یہ بات ایک حد تک ناواجب و غیر مناسب ہے کہ خود تو تقریر کر لی اور فرانس کا نقطۂ نگاہ پیش کر دیا ـــ میں کہہ سکتا ہوں کہ بڑی قابلیت سے پیش کیا ـــ گویا اس نمائندے کی حد تک ایجنڈا منظور ہو چکا تھا پھر ایجنڈے کی منظوری کی مخالفت کر کے دس دوسرے وفود کو اظہار رائے کا موقع دینے سے اختلاف کی کوشش ان کے حقوق پر چھاپہ مارنا ہے جو اس غرض سے حفاظتی کونسل کو تحریری درخواستیں بھیج چکے تھے۔

نمائندہ فرانس نے اپنی تقریر میں جس منطق کا سہارا لیا ہے اگر اس کی پیروی کی جائے تو نہ محض یہی ضروری نہیں کہ ایجنڈا منظور کر لیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان دس وفود سے کہا جائے کہ وہ فوراً حفاظتی کونسل میں اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ اور فرانس کے زاویۂ نگاہ کی مخالفت میں اپنا موقف پیش کریں ـــ واضح رہے کہ یہ وفود ان قوموں سے تعلق رکھتے ہیں جو جمعیۃ اقوام متحدہ کی رکن ہیں اور اس معاملے کے متعلق حفاظتی کونسل سے

درخواست کر چکے ہیں۔

فرانس کا نمائندہ دو ایک قدم اور آگے بڑھ گیا یعنی دس وفود نے حفاظتی کونسل کے نام اپنے مکاتیب کے ساتھ جو ضمیمے منسلک کئے ان میں ریمارک ــــ نمائندہ فرانس کے نزدیک ناخوشگوار ــــ پیچ سکے ان میں سے وہ تمام تبدیلیاں بڑھ دیں جن کی تمنا یا ان کے خیال کے مطابق ضروری تھیں۔ موصوف نے ضرورت ان باتوں کا جواب دینے پر زور فصاحت صرف کیا بلکہ انہیں بہتان سے تعبیر کیا۔ مطلب یہ کہ انہوں نے گیارہ ممالک پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے حکومت فرانس کے خلاف بہتان آمیز بیان دیا ہے۔ میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اس الزام تراشی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ دوسرے دس وفود بھی ــــ اگر انہیں اظہار خیال کا موقع ملا تو ــــ اس سے اختلاف کا اظہار کریں گے۔ نہ ہمارا یہ منصب ہے، نہ ارادہ اور نہ خواہش کہ ان کے عظیم ملک کو یا اس کی حکومت کو غیر ذمہ دار طریقے سے بہتان طرازی کا نشانہ بنائیں۔

فرانس کے نمائندے نے اپنی تقریر میں متعدد واضح اشارے کئے ہیں اور مزہ کی یہ ہے کہ بجا کام لیا ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ہم دس یا گیارہ سادہ لوح قوموں نے "پیلس ڈی شیلو" کی راہ داریوں میں سوچے سمجھے بغیر بعض غیر ذمہ دار لوگوں کی باتیں سن لیں۔ پھر ہم نے وہ قدم اٹھالیا جو ہرگز اٹھانا نہیں چاہئے تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ موصوف نے ایسی بات کہہ کر مجھے یہ بیان کرنے کا موقع دیا کہ ہم نے کس درجہ صبر و تحمل سے کام لیا۔ ذمہ داری کے احساس کا کتنا اچھا ثبوت دیا اور کتنے تامل و تذبذب سے یہ معاملہ قرار داد کی غرض حفاظتی کونسل کے سامنے لائے ہیں۔

اب ساری دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ حکومت تونس کے دو وزیر ــــ ایسے وزیر جنہیں اپنی وزارت کے زمانے میں حکومت فرانس کا اعتماد بھی حاصل تھا ــــ پیرس پہنچے۔ حفاظتی کونسل کے صدر کو ایک مکتوب بھیجا جس میں کونسل کی توجہ تونس کے بعض افسوسناک اور الم انگیز حالات کی طرف منعطف کرائی۔ اس خط کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہ مکتوب طویل عرصے تک اقوام متحدہ کے دفتر خانہ میں پڑا رہا۔ سوء اتفاق کہ نہ اسے پیرس کے "پیلس ڈی شیلو" میں چھپ سکیں اور نہ نیویارک کے اس ایوان میں جس میں بے شمار کھڑکیاں موجود ہیں۔ اسے لوگوں کی نگاہوں تک پہنچنا اس دن نصیب ہوا جب میرے وفد نے درخواست کی کہ اس کی نقلیں تمام اراکان کے پاس بھیج دی جائیں۔

اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ یہ مکتوب حفاظتی کونسل کے صدر کو پہنچا دیا گیا تھا اور ہم یہ بھی جانتے تھے کہ اس دور میں تونس قتل عام، فسادات، گرفتاریوں اور تخریبی کارروائیوں کی جولانگاہ بنا ہوا تھا ــــ میں صرف تشدد کے واقعات کا ذکر کر رہا ہوں اور اس مرحلے پر کسی کو ان کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرانا چاہتا ــــ اس سارے علم کے باوجود ہم صرف اس امید پر بڑے صبر و تحمل سے انتظار کرتے رہے کہ حکومت فرانس خود دانش مندی سے کام لے گی موقع کی نزاکت کا احساس کرے گی۔ ان لوگوں کے ساتھ خوشگوار سمجھوتے کا بندوبست کرے گی جن کا شمار روئے زمین کے شریف ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

ہمارا انتظار بہت دنوں تک جاری رہا۔ ہم نے آپس میں مشورے کئے۔ اس مسئلے پر بحث و تمحیص جاری رکھی۔ ہم نے مختلف ذرائع کو غیر رسمی طور پر اور دوستانہ انداز میں حکومت فرانس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہمیں اس امر کا احساس تھا کہ یہ مسئلہ انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ ناواجب جلد بازی سے کام لیتے ہوئے حکومت فرانس کو پریشانی میں مبتلا کر دیا جائے بشرطیکہ اس کے ارادے نیک ہوتے، اور ہمیں یہی امید تھی کہ اس کے ارادے نیک ہیں۔

عام احساس یہ تھا کہ اس معاملے کو جنرل اسمبلی کے اجلاس پیرس کے آخری ہفتوں میں یا اس سے بھی پہلے پیش کر دیا جائے۔ لیکن زیادہ دور اندیش اصحاب کی رائے کو فوقیت حاصل ہوئی۔ ہم سے کہا گیا کہ تحمل سے کام لینا چاہئے۔ پندرہ ملکوں کے نمائندے ایک وفد کی شکل میں جنرل اسمبلی

کے صدر مسٹر پیڈا نردو کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استدعا کی کہ وفد فرانس سے نیز ان کی وساطت سے حکومت فرانس سے کہا جائے کہ اہل تونیسیہ کو اسی منزل پر نہ پہنچایا جائے جس کے بعد انسان تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن جاتا ہے۔ امن عالم کا تقاضا یہی ہے۔ مقاصد حفاظت کا تقاضا بھی یہی ہے اور دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کا تقاضا بھی اس کے سوا کچھ نہیں۔

جنرل اسمبلی کے صدر نے ہمارا پیغام پہنچا دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور اسے پورا کیا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ پلیس ڈی چیلو کے برآمدوں میں سراسیمہ گشت لگانے والے لوگ تونس کے وزیر نہ تھے بلکہ ہم تھے جو بھاگ دوڑ کرتے رہے۔ ہم اس پیغام کے جواب یا اس سلسلے میں کسی اشارے کا انتظار کرتے رہے افسوس کہ نہ کوئی جواب ملا اور نہ کوئی اشارہ ہوا۔

مزید انتظار کے بعد ہم ایک مرتبہ پھر جنرل اسمبلی کے صدر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ ہمارے جذبات حکومت فرانس تک ایسے ذرائع سے پہنچا دئے جائیں جنہیں وہ بہتر خیال فرمائیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے لئے قدرتی اور معمول کے عین مطابق طریق کار یہ تھا کہ ہم اپنے جذبات کا اظہار جنرل اسمبلی کے اجلاس میں کرتے۔ لیکن اس اجلاس کے آخری ایام میں ہمیں اچھا معلوم نہ ہوا کہ اقوام متحدہ کے کام میں مشکلات اور پیچیدگی پیدا کر دیں۔ صدر نے ہم سے پھر یہ وعدہ کیا کہ یہ پیغام حکومت فرانس تک پہنچا دیا جائے گا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ انہوں نے یہ وعدہ بھی پورا کر دیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پھر ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ آیا ہمیں یہ معاملہ جنرل اسمبلی میں پیش کر دینا چاہئے۔ اس ضمن میں ہمیں ایک بڑی رکاوٹ پیش آگئی کیونکہ کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ انہی ممالک کو جن کے نام موجودہ شکایت نامے پر درج ہیں۔ انتہائی الم انگیز، افسوس ناک اور ناخوش گوار تجربے سے گزرنا پڑا۔ ہم میں سے بعض نے مراکش کا مسئلہ جنرل اسمبلی میں پیش کرنا چاہا تھا۔ عارضی ایجنڈے کی اس شق کو جنرل کمیٹی کے روبرو زیر بحث آنا تھا۔ اس کمیٹی میں ان ممالک کو اکثریت حاصل نہ تھی جن کے نام اس دستاویز پر ثبت ہیں۔ جنرل کمیٹی نے اس مسئلے پر بحث کی اجازت نہ دی یقیناً اس نے کہا کہ اس سوال پر بحث فی الحال ملتوی کر دی جائے۔ اس وقت ہمیں خوب معلوم تھا کہ "فی الحال" کا مطلب ایک غیر معین عرصے کے لئے مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دینے کے سوا کچھ نہیں۔

پھر یہ معاملہ جنرل اسمبلی کے ابتدائی اجلاس میں زیر بحث آیا اور اس پر متعدد نمائندوں نے یکے بعد دیگرے اپنے شدید جذبات کا اظہار کیا۔ لیکن ہم اس سوال کو ایجنڈے پر لانے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے ہم دل شکستہ ہو گئے پھر بھی مزید انتظار مناسب سمجھا۔ نیویارک پہنچے۔ آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ ہم ہر روز اخباروں میں تشویش انگیز خبریں پڑھتے رہے ہر روز اصلاح احوال کی نئی امیدیں باندھتے رہے، ہر روز یہی توقع تھی رہی کہ فرانس اور اہل تونیسیہ کے درمیان بہتر مفاہمت ہو جانے کی علامات ظاہر ہوں گی۔ ہم اہل تونیسیہ اور جمہوریہ فرانس کی سلامتی کے لئے دعائیں کرتے رہے لیکن خبریں روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں۔

اب ہم نے سوچا کہ ہمیں اخبارات کی خبروں پر ہی کلیۃً انحصار نہ کر لینا چاہئے اور غالباً بہتر ہو گا کہ اہل تونیسیہ میں سے چند اصحاب کو نیویارک بلایا جائے تاکہ ہم ان پر جرح کر سکیں اور معاملے کو حفاظتی کونسل میں لے جانے سے قبل ذمہ دار وفد کی حیثیت میں یہ جان لیں کہ صحیح صورت حال کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اہل تونیسیہ کے نیویارک آنے کی راہ میں سخت اور ناقابل عبور مشکلات حائل ہیں۔ پتہ چلا کہ تونیسیہ کے ذمہ دار وزراء سے ان کے سفارتی پروانہ ہائے راہداری واپس لے لئے گئے ہیں۔ اگر فرانس کا نمائندہ اس بیان کی تردید کر سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ بہرکیف یہ امر واقعہ ہے کہ وزراء پروانۂ راہداری کی مشکلات کے باعث نیویارک نہیں آسکتے تھے۔ عالم اضطراب میں ہم نے کچھ اور لوگوں کو بلوانے کی بے انتہا سعی کی۔ لیکن ان کے راستے میں بھی ہر طرح کی مشکلات حائل تھیں۔

اس کے بعد ان جملہ اقوام کے عظیم دوستوں نے جن کے نام یہاں دئے گئے ہیں۔ ہمیں بتایا کہ حکومت فرانس کو پارلیمانی بحران سے سابقہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے جب تک یہ بحران دور نہیں ہو لیتا، حکومت مذکورہ سے اس معاملے میں کسی واضح اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم کچھ زیادہ پُر امید

نہ تھے۔ پھر بھی ہم نے سوچا دانش مندی یہی ہے جو انہی کی بات تھی یہی ہے کہ فرانس میں حکومت کا استحکام ہونے کا انتظار کیا جائے۔ آخر یہ بھی ہو گیا اور حکومت کا استحکام ہو گیا۔ ہمیں فرانس کی خاطر اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ اب ہم پر امید تھے کہ حکومت فرانس کوئی قدم اٹھائے گی۔

حکومت کے استحکام کے چند روز بعد ہم نے دیکھا کہ صرف یہی نہیں کہ تیونس میں صورت حال اصلاح پذیر نہیں ہوئی بلکہ ہمارے سامنے مایوسی دہشت اور حیرت کا ایک طوفان امڈ آیا۔ جب ہم نے سنا کہ جمہوریہ فرانس نے تیونس کی پوری کابینہ کو گرفتار کر لیا ہے۔ پوری کابینہ سے میری مراد وزارت کے تمام وہ افراد ہیں جو حکومت فرانس کے قابو میں آ سکے تھے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ حکومت فرانس کابینہ کے دو ممبروں کو پکڑ نہیں سکی۔ یہ وہ کابینہ تھی جسے ۱۹۵۰ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان مصالحت ہو جانے پر ترتیب دیا گیا تھا۔ اور یہی کابینہ تھی جسے فرانس اور تیونس کے درمیان بہتر مفاہمت کے لیے اصلاحات کے معاملے پر حکومت فرانس کے ساتھ بات چیت کرنا تھی۔ وہ سب اب جیل میں پہنچ گئی۔ تیونس کے ممتاز افراد میں یہ آخری لوگ تھے جو قید ہوئے۔ تیونس کے سب سے بڑی اور مقبول عام پارٹی نیو دستور پارٹی کا کوئی قابل ذکر لیڈر ایسا نہ تھا جو پہلے جیل میں نہ پہنچ چکا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہماری اطلاع کے مطابق ہزاروں تیونسی نظر بندی کے کیمپوں میں پہنچا دیے گئے تھے۔ سیکڑوں ہلاک کر دیے گئے تھے۔ اگر اس اطلاع کی تردید کی جا سکے تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ تیونس کے بعض علاقوں سے اطلاعات حاصل کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

ہم نے پھر بھی انتظار کیا۔ اور سوچا کہ بہرحال ہم پوپ سے بڑھ کے کیتھولک ہونے کا دعوے نہیں کر سکتے۔ اگر اہل تیونس ایک اور حکومت کی تشکیل کر لیں اور وہ خوش اسلوبی سے کام کرنے لگے تو ہمارے لیے کوئی وجہ اضطراب نہ ہو گی۔

ہمیں اس انتظار میں بہت دن گزر گئے اور پھر ہمیں پتہ چلا کہ بکوش نامی ایک صاحب کو وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا ہے۔ ہم نے اس کی سابقہ کیفیت معلوم کرنی چاہی اور ایسے لوگوں سے حالات دریافت کیے جو اس کے ماضی سے آگاہ تھے انہوں نے بتایا کہ یہ صاحب کسی وقت سول کے سرکاری ملازم تھے۔ دوران جنگ میں تھوڑی دیر کے لیے وزارت عظمیٰ کی گدی پر براجمان ہو گئے تھے۔ تیونس میں ان کی قیادت تسلیم کرنے والے افراد زیادہ نہ ہوں گے اور یہ تنہا بزرگوار ہیں جنہوں نے ہماری دانست میں فرانس کے باجے کے وقت وزارت عظمیٰ کا عہدہ قبول کر کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے ہمیں بتایا گیا کہ وہ کابینہ وزارت تشکیل کریں گے۔ ہم نے انتظار کیا اور دن گزرتے گئے۔

یہ مسٹر بکوش وزیر اعظم ہیں۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کی ساری قوت اور مادی وسائل ان کی پشتیبان ہے اور حکومت فرانس ان کی امداد و اعانت کے لیے کمربستہ ہے لیکن یہ حضرت اب تک کوئی کابینہ نہیں بنا سکے۔ "ہیرلڈ ٹریبیون" اور "نیویارک ٹائمز" میں یہ اطلاعات شائع ہوئی ہیں کہ تیونس کے اس وزیر اعظم کے خلاف عوام کی ناراضگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب وہ بے دست حکمران تیونس سے ملنے کے لیے محل میں تشریف لے جاتے ہیں۔ تو عقبی دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔

وزیر اعظم یا فرانسیسیوں نے دباؤ ڈال کر ایک اور ایسے شخص کو ڈھونڈ نکالا۔ جو وزیر بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ ان صاحب نے عوام کے جبر و قہر کا نشانہ بنتے ہوئے وزارت کے سنگھاسن پر بیٹھنے کی حامی تو بھر لی۔ لیکن جب عملاً وزارت سنبھالنے کا وقت آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ عوام کی خفگی اور نفرت اس کے خلاف حد سے بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے وزارت کا یہ "تاج" سر پر رکھنے سے انکار کر دیا اس پر فرانسیسیوں نے اسے جیل میں ڈال دیا۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تیونس نے آج کل برائیوں اور خرابیوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور وہاں کا دستور یہ ہے کہ آپ وزیر بنیے اگر اس سے انکار ہے تو سیدھے جیل جائیے۔

ان خیالات نے جو آزادی نے کچھ کتابوں میں پڑھے اور اکثر وعظ میں سُنے تھے اُس کے تمام جوش ٹھنڈے کر دیئے اور یہ باتیں ہیں بھی اسی قسم کی کہ ہر روز بلکہ دن میں کئی کئی بار آنکھوں کے سامنے گزرتی ہیں خدا دیکھنے اور سمجھنے کی توفیق دے۔ آزادی کو ایسا جان لیں جیسے جنتری میں نکلا ہوا تار۔ اب آزادی [illegible] میں پکا عہد کر لیا [illegible] کے بعد سے تو میں اپنی شادی بیاہ کی نسبت کسی طرح کا فکر [illegible] رہے گا۔ میں اپنی تدبیر سے پیدا نہیں ہوئی [illegible] ہی کبھی نہیں ہوئی [illegible] و آرام مجکو اس گھڑی تک [illegible] ہوا ہی [illegible] میں نے اس کو ہم نہیں پوچھا یا جس نے اپنے فضل سے یہ سب کچھ کیا ہو کیا وہ آگے کو میری خبر نہیں رکھے گا؟ رکھے گا اور ضرور رکھے گا۔ یہ بھی میرے ایمان کا ضعف ہو کہ اُس پر پورا بھروسا نہ رکھ کر اپنی تدبیر کو دخل دوں۔ کیا میں اور کیا میری تدبیر؟ قسمۃ اور تقدیر قسمۃ اور تقدیر +

ساتویں فصل آزادی مولوی [illegible] کے ساتھ بیاہی گئی اور آخر ان کو لو [illegible] کر دی

وہ بھی خدا جانے کیا بات تھی کہ آزادی کی منگنی پہلے ہو گئی ورنہ مولوی لوگ منگنی کے رگڑے جھگڑے کیا جانیں۔ بات پکی ہوئی گئے نکاح پڑھا کر رخصت کرا لائے۔ نہ باجا نہ گاجا نہ ڈھول نہ ڈھمکا نہ آرایش نہ آتش بازی نہ دھوم نہ دھڑکا۔ ایک زمانہ تھا کہ محلے میں کسی کھاتے پیتے گھر بیاہ ہوتا تو سارے شہر میں غل مچ جاتا۔ ہفتوں پاس پڑوس والوں کو نقار خانے کے شور سے رات کو سونے کی نوبت نہ آتی۔ آتش بازی سے دس بیس کے مُونہ جھلستے۔ آرائش کے لوٹنے میں دو چار کے سر ٹوٹتے۔ اُس وقت تو شیخی میں کچھ نہ سوجھ پڑتا پھر بیٹی والے تمام عمر بھیک مانگتے اور بیٹے والے بہو کا جہیز بیچ بیچ کر گذر کرتے [illegible] خدا [illegible] کا بھلا کرے کہ انھوں نے وعظ کہہ کہہ کر اس گھر کو توڑا اور خلاف شرع رسموں کو موقوف کرایا۔ اب کوئی خدا کا ایسا ولی پیدا ہو کہ مولویوں نے جو مسلمانوں کے پیچھے اپنے اور اپنے فضول [illegible] لگا دیئے ہیں کسی طرح ان کو بند کرے تو ہم بھی اپنے جیتے جی مسلمانوں [illegible] کی طرح دال کے ساتھ روٹی کھاتے ہوئے دیکھ کر ذرا سی دیر کو خوش ہو لیں۔ اب تو [illegible] میں لوگ

اس کے بعد ہم نے سنا کہ فرانس کی جانب سے موسیو ہاٹکلوک نئی اصلاحات لے کر تونیسیہ پہنچے ہیں۔ ہم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ اہل تونیسیہ کے لئے امیدوں کا جو پشتارہ لے کر گئے تھے اس کا کیا حشر ہوا۔ اس اجلاس میں دوسرے ممالک کے جو نمائندے تشریف فرما ہیں ان کے لئے میں فراہم کردہ اطلاعات میں سے چند فقرے پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے تمام مندوبین کو پتہ چل جائے گا کہ موسیو ہاٹکلوک کے تونیسیہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی اور یہ اس لئے گئے تھے کہ تونیسہ کو درست بنائیں۔ اور فرانس کے معاہدے کے مطابق اسے آزادی اور اصلاحات کی دولت سے مالامال کر دینے والے تھے۔

موسیو ہاٹکلوک ۱۳ر جنوری کو تونیسیہ پہنچے۔ ان کے استقبال کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کی سب سے بڑی تقریب بنایا گیا۔ جو پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ آپ نے ایک بحری جنگی جہاز سے اتر کر ساحل پر قدم رکھا۔ شہر پر فرانسیسی فوجوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ جدھر سے گذرے سڑکیں مسلح فوجیوں کی قطاروں سے اٹی پڑی تھیں۔ سارا شہر بکتر بند گاڑیوں، مسلح کاروں، اور ٹینکوں سے بھرا ہوا تھا۔ گویا یہ عام استقبال نہ تھا بلکہ فرانسیسی نمائندے کی آمد کو فرانس کی فوجی قوت کے مظاہرے کے لئے موزوں ترین موقع بنا لیا گیا تھا۔

ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے پہلی ہی ملاقات میں ان پر واضح کیا کہ وہ ان سے براہ راست رابطہ رکھنا پسند کریں گے۔ تاہم وزیر اعظم نے ریذیڈنٹ جنرل کو بے کی جانب سے مطلع کر دینا ضروری سمجھا کہ تمام سرکاری روابط وزیر اعظم کی وساطت سے ہونے چاہئیں۔

جب حکومت تونیسیہ نے ۱۴ر جنوری ۱۹۵۲ء کو اپنی شکایت اقوام متحدہ میں پیش کی تو اس وقت ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے علیحدگی اور تخلیہ میں گفتگو کرنے کا مطالبہ کیا۔ بے نے انکار کر دیا۔ اور انہیں وزیر اعظم سے بات کرنے کی ہدایت کی۔ ۱۵ر جنوری کو ریذیڈنٹ جنرل نے کہا کہ وہ بے سے وزیر اعظم کی موجودگی میں گفتگو کرنے کو تیار ہیں۔ اس ملاقات میں انہوں نے متعدد شرائط پیش کیں۔ ایک یہ کہ اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ دوسری یہ کہ وزارت بدل دی جائے۔ تیسری یہ کہ بے دو فرمانوں پر دستخط کریں۔ ایک کے ذریعے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو اپنا وزیر خارجہ مقرر کر دیں اور دوسرے کے ذریعے جنرل گاربے کو وزیر دفاع کا عہدہ سونپ دیں۔ یہ جنرل گاربے وہی ہیں کہ جس کے نامۂ اعمال میں مڈغاسکر میں سب سے بڑا فوجی اقدام شامل ہے۔ بے نے وزیر اعظم کو ہدایت کی کہ ریذیڈنٹ جنرل کو ان شرائط کا جواب دے دیا جائے۔ وزیر اعظم نے جو جواب دیا وہ ریکارڈ میں موجود ہے اس نے بتایا کہ وزیر اعظم کو بے نے تونیسیہ کے متعلق اقوام متحدہ میں شکایت پیش کرنے کا مجاز بنایا تھا۔ اس سے نمائندہ فرانس کے اس بیان کی قلعی کھل جاتی ہے کہ اقوام متحدہ میں یہ شکایت بے کی ہدایت پر پیش نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس کے لئے خود وزیر اعظم کے اختیارات ہی کافی تھے۔ لیکن اگر یہ موقف پیش کیا جائے کہ بے کو ہی اجازت یا ہدایت دینا چاہئے تھی تو ہم کہتے ہیں کہ یہ اجازت یا ہدایت بے سے حاصل کر لی گئی تھی۔

اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل اور جنرل گاربے کو پیرس طلب کر لیا گیا وہ ۲۲ر مارچ کو تونیسیہ واپس پہنچے اور وہاں پہنچتے ہی ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے بھی انٹرویو کے لئے وقت مانگا۔ چنانچہ ۲۴ر مارچ کو بات چیت کے لئے انہیں طلب کیا گیا۔ لیکن اس موقع پر تونیسیہ کے وہ تمام وزرا بھی موجود تھے جو اس وقت شہر میں تھے۔ ریذیڈنٹ جنرل نے بے سے کہا۔ حکومت فرانس بات چیت کرنے کے لئے تیار ہے لیکن اس شرط پر کہ کابینہ کو موقوف کر دیا جائے اور اقوام متحدہ سے شکایت واپس لے لی جائے۔ بے نے یہ دونوں باتیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے ایک دستاویز بے کو دکھائی جس پر فرانسیسی وزیر خارجہ کے دستخط تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ ریذیڈنٹ جنرل امن و قانون بحال کرنے کے لئے ـــــ مجھے امید ہے کہ میں بعد میں کسی موقع پر یہ واضح کر سکوں گا کہ استعمار پیشہ حکومتوں کے نزدیک "امن و قانون" کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے ـــــ اور فرانس کے مفاد کی حفاظت کے لئے جو کچھ بھی کارروائی کرنا مناسب سمجھیں اس کا انہیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ بے نے جواب میں اس مسئلے پر سوچنے کے لئے مہلت مانگی۔ اور اس سوال پر اپنی پوزیشن محفوظ رکھی۔ ریذیڈنٹ جنرل نے انہیں صرف تین گھنٹے کا الٹی میٹم دے دیا۔ یہ سلوک

فرانس کی حکومت تونس کے حکمران سے کر رہی ہے جس کے بارے میں فرانسیسیوں کا یہ حق کا دعویٰ ہے۔ ریذیڈنٹ جنرل پیتل کی اتالی سیاہی کر کے اور اسلحہ کی قوت کا مظاہرہ کر کے اس عمر رسیدہ اور قابلِ احترام بادشاہ کو ایسا جواب دینے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ اس طریقے سے جو جواب حاصل ہو اس کے متعلق سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ اس سے کسی ضمیر کی تسکین نہیں ہو سکتی۔

جب بے کے ساتھ یہ بدسلوکی کی گئی تو انہوں نے جمہوریہ فرانس کے صدر کو برقی تار بھیجا جس میں بتایا کہ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل نے حکومت کے نظام سے ان پر کس طرح دباؤ ڈالا ہے۔ ساتھ ہی ریذیڈنٹ جنرل کو واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔ اسی رات ریذیڈنٹ جنرل نے تونس کے وزیرِ اعظم اور تین دوسرے وزرا کو گرفتار کر لیا۔ ایک اور وزیر موجود تھا لیکن بڑھاپے اور بیماری کے باعث سے گرفتار نہ کیا گیا۔ یہ جناب سعد اللہ تھے۔ اس بوڑھے اور بیمار وزیر نے ریذیڈنٹ جنرل کو لکھا: "مجھے گرفتار کر لیجئے تاکہ میں قید و بند میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہ سکوں۔" ان سب کو تونس کے جنوبی علاقے میں بھیج دیا گیا۔ سینکڑوں سیاسی کارکنوں، صحافیوں، مدرسوں، وکیلوں اور دوسرے معززین کو جن کی بیویاں نیشنلسٹوں کے ساتھ تھیں، گرفتار کر لیا گیا۔ تمام نیشنلسٹ اخبار بند کر دیئے گئے۔ تمام قومی اسکولوں کے دروازوں پر قفل چڑھا دیئے گئے۔ اور مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ہمارے پاس ایسا ذریعہ نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ ملک بھر میں جس قدر گرفتاریاں ہوئیں ان کی صحیح تعداد کیا تھی تاہم یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ نظر بندی کے جو بڑے بڑے کیمپ قائم کئے گئے تھے ان میں مقید نیشنلسٹوں کی تعداد ہزاروں سے کیا کم ہو گی؟

اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ فرانسیسی فوجوں نے بے کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ ریذیڈنٹ جنرل ۵ ہی کی صبح کو بے سے ملنے کے لئے گیا۔ مگر اس نزدیک میں کسی دوسرے کو موجود رہنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس کے بعد ریذیڈنٹ جنرل نے اعلان کیا کہ بے نے ایک فرمان جاری کرنے کی منظوری دے دی ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس پر بے نے دستخط نہیں کئے تھے۔

ہماری اطلاع کے مطابق تونس کے حکمران اور ریذیڈنٹ جنرل کی اس خفیہ ملاقات میں جو کچھ ہوا وہ بے کے لئے ہرگز خوش گوار نہ تھا۔ لیکن جب ریذیڈنٹ جنرل ملاقات کر کے باہر آیا۔ تو اس نے موجود لوگوں سے ہنستے ہوئے اور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "اندر تو بڑے پیار محبت کی باتیں ہوتی رہیں۔" یہ ہولناک اور کرب انگیز تمسخر اس بوڑھے شخص سے کیا گیا جس کے تمام ساتھی اس سے چھین لئے گئے تھے۔ اور جو تونس میں فرانسیسی حکام کے بھاری فوجی دباؤ کا مقدور بھر مقابلہ کرنے کے لئے بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

موجودہ صورتِ حال کا یہ نقشہ ہے۔ فرانس نے اپنے ایک آلۂ کار کو جس کا نام باکوش ہے نیا وزیرِ اعظم بنا دیا۔ ہم یہ تو نہیں جانتے کہ وہ کب تک وزیرِ اعظم رہے گا۔ البتہ اگر مجھے پیش گوئی کرنے کی اجازت دی جائے تو کہوں گا کہ اسے اپنے ضمیر کی ملامت یا جیل میں اپنے محبوس نیشنلسٹ بھائیوں کی ملامت کے زیرِ اثر یہ عہدہ جلد از جلد ترک کرنا پڑے گا۔ حالت یہ ہے کہ وہ تا حال اپنی کابینہ میں ایک بھی وزیر نہیں لے سکا۔ اور ادھر ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ فرانس کے حکام اصلاحات کی خوب صورت سکیموں اور تونس کو خود مختاری دینے کے منصوبوں کے ساتھ منتظر کھڑے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ ان سکیموں اور تجویزوں کے بارے میں گفتگو کس سے کریں گے؟ انہیں آخر بات چیت کس سے کرنا ہے؟ کیا منشا یہ ہے کہ جس میز پر بیٹھ کر انہیں گفتگو کرنا ہے اس کے دونوں جانب صرف فرانسیسی ہی ہوں یا پھر ان کی کٹھ پتلیاں ہوں؟ اگر ان کا مقصد کچھ کام کرنا ہے اگر الفاظ بے معنی نہیں ہو گئے اور اگر وہ فی الواقع کوئی مفاہمت کرنا چاہتے ہیں تو نہ صرف انسانیت کے نام پر بلکہ عام عقل اور منطق کے نام بھی ہم دریافت کرتے ہیں کہ وہ بات چیت ان لوگوں سے کریں جو فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ ان لوگوں سے بات چیت کرنے کا کیا فائدہ جو خود فرانسیسیوں کے ہاتھ کٹھ پتلی کی طرح کام کر رہے ہیں؟

اس وقت صورتِ حال یہ ہے لیکن فرانس کے نمائندے نے کہا ہے کہ چند ہفتے قبل تو حالات ایسے تھے جن پر حفاظتی کونسل یا جنرل اسمبلی میں بحث کے لئے شاید کوئی وجہ جواز ہوتی۔ آج یہ صورت ہرگز نہیں اور حالات کی ابتری ختم ہو چکی ہے اب تونیسیہ میں امن، خوش حالی، شادمانی اور دوستی کا دور دورہ ہو رہا ہے ——— لیکن حالات ابھی بھی جوں کے توں ہیں جو اوپر پیش کئے گئے ہیں۔ ہزاروں تونیسی جیلوں میں بند ہیں۔ پوری کابینہ جیل میں ہے اور نیشنلسٹ تحریک کے تمام لیڈر جیل میں ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کی عزت و حرمت نہ صرف اپنے ملک میں ہے بلکہ باہر بھی ہر جگہ انہیں ویسی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کیا یہی وہ خوش حالی اور شادمانی کی صبح ہے جس کی نوید ہمیں فرانس کے نمائندے نے سنائی ہے اور کہا ہے کہ ہمیں اس صورتِ حال پر بحث نہیں کرنی چاہیئے؟

اس مسئلہ میں یہ میری پہلی مداخلت ہے۔ میں اسے مختصر رکھوں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے وقت کم ہے اور دوسرے مندوبین بھی کچھ کہنے کے خواہاں ہیں۔ میں اس مسئلے پر پھر اظہار خیال کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ مختصر طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سارے اطلاعات کے مطابق شاید ہم اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے لئے سات مثبت ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلے تو ہم سے زیادہ خوشی کسی کو نہ ہوگی۔ لیکن اب تک ہمارا خیال یہی ہے کہ اتنے ووٹ ہمیں نہیں مل سکیں گے۔ ہمارے رفقا کو معلوم ہے کہ یہاں ووٹ نہ دینے کا مطلب بھی منفی ووٹ ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اس مسئلے کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے قبل پیرس کے اجلاس میں مسئلہ مراکش کا ہوا تھا۔ لیکن کونسل میں یہ سوال گیارہ ملکوں نے پیش کیا ہے یہ تمام ملک اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ اور انہیں غیر ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو اقوام متحدہ کے رستوں میں یونہی گھومتے پھرتے ہوں۔ وہ اقوام متحدہ میں اقوام متحدہ کا مستقل جزو ہیں۔ انہیں اعتماد و یقین ہے کہ یہی ایک ادارہ ہے جس میں وہ دکھ درد کا مداوا تلاش کر سکتے ہیں۔ جن کے پاس اور کوئی راہ نجات نہ ہو۔

کیا فرانس کی حکومت اس بات پر خوش ہوگی کہ اہل تونیسیہ اپنی تکالیف کے ازالہ کے لئے تحریکات چلاتے رہیں؟ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے سبقت سے غیر ذمہ دارانہ طریقے اختیار کرنے لگیں؛ کیا کوئی اور تنظیم ایسی موجود ہے جو اقوام متحدہ سے بہتر کام انجام دے سکتی ہے؟ فرانس والے انہیں کہاں بھگانا چاہتے ہیں؟ میں یہ سوال تمام ان فرانسیسیوں سے کر رہا ہوں جن تک میری تقریر کے اجزا دنیا بدیر پہنچیں گے اگر تونیسیہ جیسی صورتِ حال پر اقوام متحدہ میں بحث نہیں ہو سکتی تو اقوام متحدہ کس مرض کی دوا ہے۔ اگر مظلوم و مقہور اقوام گیارہ ذمہ دار ممالک کی وساطت سے ——— نمائندہ فرانس اور دوسرے نمائندوں کو خوب علم ہے کہ یہ ممالک چند ملکوں کو چھوڑ کر سارے ایشیا سے عبارت ہیں ——— اپنی آواز یہاں نہیں پہنچا سکتیں تو پھر ہم لوگ یہاں کس غرض سے جمع ہیں؟ عملی طور پر سارا ایشیا اقوام متحدہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور یہ نہیں کہہ رہا کہ فرانس کو سزا دیجیئے۔ یہ بھی نہیں کہتا کہ تونیسیہ کو آج ہی پروانۂ آزادی دے دیجیئے۔ صرف یہ کہتا ہے کہ از راہ کرم اس سوال پر بحث کیجیئے لیکن اگر سلامتی کونسل کے سات ارکان اس مسئلے کو زیر بحث لانے کے لئے نہیں مل سکتے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گیارہ قوموں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم جہنم کی راہ لو۔ ہم تمہارے سوال پر بحث نہیں کریں گے تم اس مسئلے پر خواہ کتنے ہی شدید احساسات رکھتے ہو لیکن ہم اسے اپنے ایجنڈے پر بھی لانے کے لئے تیار نہیں۔ تاکہ سچائی بروئے کار آجائے۔

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے آگ لگی ہوئی دیکھی ہے۔ یہ آگ ہم نے خود نہیں لگائی۔ ہم نے شعلے بھڑکتے دیکھے ہیں اور ہم آگ بجھانے والے محکمے کے پاس یہ کہنے کے لئے آئے ہیں کہ ذرا اس آگ کو دیکھئے اور اسے بجھایئے۔ اب آگ بجھانے والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس طرف نگاہ بھی نہیں کریں گے یہ بڑی عجیب صورتِ حال ہے۔ اس کے باوجود ہم اس سوال سے دلچسپی لیتے رہیں گے۔ کیونکہ یہ مسئلہ ان مظلوم انسانوں کا ہے جنہیں ہم اپنے بھائی سمجھتے ہیں۔ جن ممالک نے اس مکتوب پر دستخط کئے ہیں ان میں سے اکثر ماضی قریب تک خود اسی طرح محکوم و مجبور تھے۔ ابھی اتنا وقت نہیں گذرا کہ وہ ان مصیبتوں کو بھول گئے ہوں جن کا تختۂ مشق وہ محکوم ہونے کے باعث بنے ہوئے تھے۔ بہرحال ہم اہل تونیسیہ کی حالت زار کو فراموش نہیں

کر سکتے ہیں۔ ہاں یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حفاظتی کونسل اپنے منصب کے مطابق جو کوئی فیصلہ صادر کرنا چاہے، اس کونسل کے میز پر بعض ایسے لوگ بھی براجمان ہوں گے جن کا طرز عمل بلند بانگ نہ رہا ہوگا اگر ہم اس صف کو آتے دیکھتے رہنے کے روادار نہیں، ہم اپنے دلوں میں چراغ روشن رکھیں گے، جو ہم سے ہوسکے گا اور کرنے میں تعاون پیش نہ کریں گے۔

اس تمام پیرا وغیرہ فی الحال ترک کیا جا سکتا ہے۔ نمائندہ فرانس نے تاریخ ماضی سے بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا وفد ان کے متعلق بھی جواب کا حق محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس وقت تونیسیہ کی صورت حال سے مزید پردے چاک ہو جائیں گے۔ اور وہ استعماری کیفیت سامنے آ جائیں گی، جو وہاں موجود ہیں، اور اس پہلو سے بھی ہم اضطراب کی زیادہ اساس ہیں۔ فی الحال ہم صرف طریق کار کی بحث میں حصہ لے رہے ہیں۔ مجھے ملاقات کرنا چاہیے کہ میری تقریر میں مطلب کے بعض نکات بھی زیر غور آ گئے ہیں لیکن ان کا باعث نمائندہ فرانس کی تقریر تھی جس نے مطلب کے معاملات اپنی تقریر میں شامل کر لیے۔

یہاں میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

---

(۲)

اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل میں تونیسیہ کا مسئلہ ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں پروفیسر احمد شاہ بخاری — پطرس —
کی دوسری تقریر جو انہوں نے ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کے اجلاس میں کی۔ بخاری اس وقت کونسل کے صدر بھی تھے۔

تقریر کرنے والوں کی جو فہرست میرے پاس موجود ہے، اس میں اگلا نام پاکستان کے وفد کا ہے۔ اگر حفاظتی کونسل کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں نمائندہ پاکستان کی حیثیت میں کونسل سے خطاب کروں گا۔

اب تک حفاظتی کونسل کے تمام گیارہ ارکان اس مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کرنے کے بارے میں اظہار رائے کر چکے ہیں۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ چھ ملکوں کے وفد اسے ایجنڈے میں شامل کرنے کی حمایت نہیں کریں گے۔ ان میں مختلف ملکوں کے وہ دوست اور رفیق بھی شامل ہیں جن کے لئے ہمارے دل میں انتہائی احترام ہے۔ ان میں سے تین ملک ایسے ہیں جو عام لوگوں کے نزدیک زبردست استعماری مفاد کے نمائندے ہیں۔ چوتھے ملک کی عظمت و شان میں بھی کلام نہیں۔ اسے استعماری مفاد سے بھی کوئی علاقہ نہیں۔ تاہم اس نے مذکورہ بالا ملکوں کا ساتھ دینا پسند کیا۔ اب یہ حقیقت بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اگر اس بارے میں ووٹوں کی نوبت آئی اور جب کبھی بھی آئی، ہم ہار جائیں گے۔

آج کا دن — ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء — اقوام متحدہ کی سرگزشت میں ایسا دن تصور ہوگا جب مختلف معاملات پر آزادانہ غور و بحث کو بادینے کی بنیاد رکھی گئی۔ میرے دوراندیش رفیق چین کے نمائندے ڈاکٹر سیانگ نے اقوام متحدہ میں وسیع تجربے کی بنا پر ہمیں بتایا ہے کہ یہ واقعہ اس انجمن کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا واقعہ ہوگا جب ایک معاملے کو محض ایجنڈے پر لانے کے سلسلے میں کونسل کے اندر اس درجہ شدت اختیار کی گئی کہ اسے ختم کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ اقوام متحدہ کی تاریخ میں آج کا دن ایک اور لحاظ سے بھی یادگار رہے گا اس لئے کہ ایک پالیسی کو حد درجہ افسوسناک اور المناک طریق پر الٹ دیا گیا۔

پچھلی مرتبہ میرے وفد نے حفاظتی کونسل سے خطاب کیا تو اس کی ضرورت میرے معزز دوست نمائندہ فرانس کے خطاب کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ میرے لئے یہ امر حد درجہ غیر مناسب ہوگا کہ میں اس دوسرے موقع کو بھی ان کی تقریر پر نکتہ چینی کے لئے استعمال کروں۔ مجھے ایسے طرز عمل سے احتراز

رہنا چاہئے۔ میری آرزو یہ ہے کہ اس موقع پر اپنے رفیق کے سامنے خود حکومت فرانس کی رائے میں سے چند اقتباسات پیش کروں۔ یہ رائے اس مسئلے پر دی گئی تھی کہ کسی مسئلے کو ایجنڈے میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے اور یہ اس وقت دی گئی تھی جب تیونس کا مسئلہ غالباً زیر بحث نہ تھا۔ ۴ ستمبر ۱۹۴۶ء کو حفاظتی کونسل یونان کے خلاف یوکرین کی شکایت پر بحث کر رہی تھی۔ اس وقت نمائندہ فرانس نے جو تقریر کی تھی اس میں کا ایک حصہ یہاں پڑھوں گا۔ نمائندہ فرانس مسٹر پروڈی (MR PARODI) نے اس موقعے پر کہا تھا:۔

"ایک معاملے کو ایجنڈے پر لانے سے انکار کا طریقہ سخت نقصان رساں اور خطرناک ہے۔ مزید برآں یہ فیصلہ کرنے کے کون سے وجوہ ہو سکتے ہیں کہ فلاں شکایت کے لئے مناسب بنیاد موجود نہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کونسل عام سیاسی صورتِ حال کے متعلق قیاسی علم کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر دیگی ایسا کرنا ممکن ضرور ہے لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا اس قسم کی شہادت سے پیش نظر کونسل کے لئے اس قسم کا طریقہ اختیار کرنا ایک حد تک خطرناک ہے اس لئے کہ جب تک کونسل پورے مسئلے پر تفصیل سے غور و خوض نہ کرے گی اسے شہادت کے بارے میں صحیح اندازے کا موقع کیونکر مل سکے گا؟ اندیشہ ہے کہ ایسے معاملات میں کونسل عام سیاسی مصلحت سے متاثر ہو جائے گی اور ان مقاصد یا انصاف کا پورا خیال نہ رکھ سکے گی۔ جو پیش کردہ مسئلے کے سلسلے میں ملحوظ رہنے چاہئیں"

فرانس بہت بڑا ملک ہے۔ وہ حفاظتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان میں سے ہے۔ یعنی ان پانچ ارکان میں سے ایک ہے جنہوں نے اقوام متحدہ کے پورے نظام کے نشو و ارتقا میں حصہ لیا تاکہ انصاف مساوات اور آزادانہ غور و بحث سے مسائل کا تصفیہ ہو سکے لیکن آج اسی فرانس کا وفد (اسی ملک کے ایک سابقہ نمائندے کے الفاظ میں) عام سیاسی مصلحتوں سے متاثر ہو گیا ہے اور اس نے انصاف کے وہ مقاصد پیش نظر نہیں رکھے جو اس خاص مسئلے میں پیش نظر رہنے چاہییں تھے۔

بس جہاں تک میرے معزز دوست نمائندۂ فرانس اور اس بحث میں اس کی حکومت کی ماخلت کا تعلق ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہ کہنا چاہئے۔

میں نے سلطنت متحدہ (برطانیہ) کے معزز نمائندے اور اپنے دوست سر گلیڈون جیب (SIR GLADWYN JEBB) کی تقریر سنی۔ مجھے اس سے بطور خاص مایوس ہوا۔ معزز سر گلیڈون جیب کی تقریر میں متعدد خوش گوار باتیں تھیں۔ جن میں میں بھی ان کا شریک ہوں۔ ان میں انگریزی زبان کے لئے محبت اور عزت بھی شامل ہے۔ مجھے گلہ ہے کہ سلطنت متحدہ کے معزز نمائندے نے آج ہمارے اس مشترکہ محبوب کی بے حرمتی کر دی ہے انہوں نے یہاں اس خط میں سے کچھ اقتباسات سنائے جس کے مطابق گیارہ ملکوں نے یہ معاملہ حفاظتی کونسل کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور جب وہ اس فقرے پر پہنچے جس میں حکومتوں نے کونسل سے درخواست کی تھی کہ موجودہ حالت کو ختم کرنے کی غرض سے وہ تمام ضروری تدبیریں منشور کے مطابق اختیار کرنے کے لئے اجلاس منعقد کیا جائے تو نمائندے نے فرمایا کہ یہ جملہ مبہم ہے دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک اس جملے کے متعدد مفہوم تھے۔ جن کی وجہ سے انہیں پریشانی لاحق ہوئی۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اس مفہوم کو بہترین طریق پر پیش کرنے کی شاید یہ صورت ہوگی کہ یہ گیارہ قومیں حفاظتی کونسل سے معتدل اور متوازن طریق پر درخواست کرتیں اور کونسل کو پورا موقع دیتیں کہ وہ اس مفہوم کے مطابق کم یا زیادہ جیسا مناسب سمجھے انتظام کرے میں نمائندۂ برطانیہ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں کوئی ابہام نہیں الا یہ کہ ہم انگریزی زبان کی بے حرمتی پر کمر باندھ لیں۔

سر جھاٹ یہ بات کہہ کر آپ نے تعلق سے آگے بڑھے اور فرمایا کہ کم از کم برطانوی وفد کے سامنے یہ نہیں کہ فرانس یا شام پر کوئی حل ٹھونسا جا سکتا ہے
میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ زیر بحث جملے میں ایک بھی ایسا لفظ موجود ہے جس سے قوت یا جبر کا مفہوم پیدا کیا جا سکے یا سمجھا جا سکے کہ کوئی چیز ٹھونسنا مقصود ہے؟
اگر سلطنت متحدہ کے وفد کو صرف اس بات پر اعتراض تھا تو وہ ایسی تجویز یا سفارش پیش کر سکتا تھا جو فریقین پر کوئی حل ٹھونسنے سے بالکل پاک ہوتی
سلطنت متحدہ کا وفد کہہ سکتا تھا کہ ہم اس مسئلے پر بحث کریں۔ ہمیں شام یا فرانس پر کوئی حل ٹھونسنا چاہیے۔ محض یہ سفارش کر دینی چاہیے کہ وہ الگ
بیٹھ کر جھگڑے کا تصفیہ کر لیں۔ کیا اسے فیصلہ ٹھونسنے سے تعبیر کیا جا سکتا تھا؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے نے اپنا نقطۂ نگاہ جس
انداز سے پیش کیا اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہم نے حفاظتی کونسل میں جو شکایت پیش کی وہ مبہم اور غلط تھی۔ ساتھ ساتھ ایک دھمکی بھی موجود تھی۔
ہماری درخواست میں کوئی ایسی بات موجود تھی جس کی بنا پر حفاظتی کونسل کے لئے لازم ہو جاتا کہ وہ اپنا حل شام یا فرانس پر خواہ مخواہ ٹھونس دے۔ یہ
امر حقیقت سے کوسوں دور ہے۔

سلطنت متحدہ کے نمائندے کا بیان ایک مسلمہ پالیسی کا بھی اہم اور المناک نقشہ ہے۔ قبل ازیں انجمن اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ پیش تھا کہ اس قسم
کے مسائل ایجنڈے میں شامل کئے جائیں یا نہ کئے جائیں؟ اس موقع پر سلطنت متحدہ کے وزیر خارجہ نے اپنے نظریات پیش کئے تھے۔ میں حفاظتی کونسل میں
سرکاری دستاویزوں سے اقتباسات پیش کروں گا۔ جب روس کے خلاف ایران اور احوال یونان کے متعلق روس کی شکایتیں زیر غور تھیں ـــ مسٹر بیون
(E. BEVIN) نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۶ء کو فرمایا تھا ـــ

> "میں دل سے چاہتا ہوں کہ حفاظتی کونسل ان تمام معاملات کے متعلق شکایت کرنے والوں کی باتیں
> سنے خواہ وہ کوئی ہوں۔ اگر کوئی حکومت محسوس کرتی ہے کہ کسی بڑی یا چھوٹی طاقت کے خلاف شکایت
> کے بعد وہ اس کونسل میں نہیں آ سکتی اور اپنا نقطۂ نگاہ بیان نہیں کر سکتی تو میرے نزدیک یہ غلط
> ہے جس حکومت کا میں نمائندہ ہوں۔ اسے بھی امن کو خطرے میں ڈالنے کا ملزم گردانا گیا ہے۔
> یونان کے معاملے میں جس حد تک میری یا کم از کم میری حکومت کی خاص ذمہ داری کا سوال ہے
> اس کی پوری تحقیقات کر لی جائے اور اس پر بحث بھی ضرور کی جائے۔ میری طرف سے قطعاً
> کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر حکومت ایران کو حکومت روس کے خلاف کوئی شکایت ہے تو میں
> سمجھتا ہوں کہ حکومت ایران کو ضرور موقع دیا جائے کہ وہ یہاں آئے اور اپنا معاملہ پیش کرے
> اس وقت ہم یہ اندازہ کر سکیں گے کہ شکایت درست تھی یا نہ تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے
> کو ایجنڈے پر رکھا جائے اور اس پر برسرِ عام بحث کی جائے اس لئے کہ مجھے یقین ہے حقائق کو
> دنیا کے سامنے لانے ہی پر امن کا انحصار ہے۔ خواہ وہ حقائق صحیح ہوں یا غلط۔" (سرکاری ریکارڈ
> سال اوّل سلسلہ اوّل صفحہ ۱۷)

آج یہ گراں بہا الفاظ بھلا دیئے گئے ہیں۔ آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کو بروئے کار لانے سے انجمن اقوام متحدہ کے اصول کو تقویت
نہیں پہنچے گی بلکہ ـــــ مجھے افسوس ہے کہ یہ بیان سلطنت متحدہ کے نمائندے کی تقریر میں ہے ـــــ اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانا اور اس
پر آزادانہ اور عام بحث کا موقع بہم پہنچانا انجمن اقوام متحدہ پر بہت برا اثر ڈالے گا۔

اگر ہم مسائل کے متعلق آزادانہ بحث سے اقوامِ متحدہ پر بڑا اثر پڑتا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کی دنیا میں اقوامِ متحدہ کا اور کونسا بڑا وظیفہ رہ جاتا ہے۔ سلطنتِ متحدہ کے نمائندے کے نزدیک اقوامِ متحدہ کو انحطاط سے بچانے اور گیارہ قوموں کو اس پر جو بڑا اثر ڈالنا چاہتی ہیں ان سے بچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمام بحثیں ختم کر دی جائیں اور ہم سب امن و سکون کی زندگی بسر کریں ساتھ ساتھ اس نئی عمارت کو تاکا کریں جس میں ہم بیٹھے ہیں۔

سلطنتِ متحدہ کے نمائندے نے اور میں سمجھتا ہوں کہ نیدرلینڈز کے نمائندے نے ایک بات جیسے خاص اندیشے سے کہی ۱ور وہ یہ: اگر ہم نے اب کوئی قدم اٹھایا یا اس مسئلے پر حفاظتی کونسل میں بحث کی تو تونیسیہ میں جو بات چیت ہو رہی ہے وہ ناکام ہو جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ بات چیت کس سے ہو رہی ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ ایک فریق فرانس ہے۔ دوسرا فریق کون ہے جو بات چیت کر سکتا ہے؟ تمام بڑے بڑے وزراء جیل میں ہیں۔ اور یہ آخری عوامی وزارت تھی جو تونیسیہ کو ملی۔ تمام قومی لیڈروں اور کارکنوں کو اور ہر ایسے شخص کو جس نے قومی مقاصد سے کم یا زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا یا تو پیٹا گیا یا کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ تونیسیہ میں اس وقت وسائل حمل و نقل پر شدید پابندیاں ہیں۔ یہ فرانسیسی اس وقت کس کے ساتھ معاملات پر بحث و تمحیص کر رہے ہیں؟ کونسی گفت و شنید ہے جو حفاظتی کونسل میں بحث کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے گی؟ ریذیڈنٹ جنرل تونیسیہ میں کون سا ایسا نازک کام انجام دے رہا ہے جو یہاں ہماری لفظی بحث سے معرضِ خطر میں پڑ جائے گا؟ اگر اقوامِ متحدہ میں اس مسئلے پر بحث تونیسیہ کے اندر ریذیڈنٹ جنرل کے کام کو تباہ کر دے گی اور اگر اس بین الاقوامی عدالت میں آزادانہ بحث اس کے لئے رکاوٹ بن جائے گی تو ہم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کسی بُرے کام ہی کے درپے ہوگا جس میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ کسی اچھے کام میں رکاوٹ کا امکان ہی نہیں۔ اور میں ہرگز نہیں سمجھ سکتا کہ اقوامِ متحدہ میں کوئی بحث بہبودِ انسانی پر ایسا مہلک اثر ڈالے گی۔

یہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ہم نے یہاں اس مسئلے پر بحث کی تو اس سے تونیسیہ میں بے چینی کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ یہ بات شروع ہی سے کہی جا رہی ہے۔ یہ پہلو سب سے پہلے نمائندہ فرانس نے پیش کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض دوسرے نمائندوں نے بھی خلوص کے ساتھ خطرہ محسوس کیا کہ ہمارے الفاظ کسی نہ کسی طرح وہاں کے عوام کو مشتعل کر دیں گے۔

تونیسیہ میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ اوّل وہاں کے اصل باشندے، دوسرے فرانسیسی۔ فرانسیسیوں نے ہزاروں فوجیں وہاں اتار دی ہیں ان کے ساتھ ٹینک ہیں توپیں ہیں۔ اور ہر قسم کے آلات و اسلحہ ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے اہلِ تونیسیہ کے پاس نہ کوئی اسلحہ خانہ ہے اور نہ کوئی حربی کارخانہ۔ اگر ہمارے الفاظ کسی کو مشتعل کر سکتے ہیں تو وہ صرف فرانسیسی ہیں۔ وہی مؤثر طریق پر مشتعل ہوں گے۔ اہلِ تونیسیہ میں کیونکر اشتعال پیدا ہو سکتا ہے؟ وہ بھی کبھار ایک آدھ بم پھینک سکتے ہیں، وقتاً فوقتاً شور مچاتے رہتے ہیں۔ لیکن وہاں کی پوری فوجی قوت فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے۔ ہم انہیں اس وقت (ان) کارروائیوں سے باز رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان افعال کے مرتکب نہ ہوں جنہیں "مظالم" سے تعبیر کیا جا رہا ہے ---- یہ ایسا لفظ ہے جو نمائندہ فرانس کے کانوں پر یقیناً گراں گزرے گا۔ تونیسیہ میں فی الحال اور کچھ نہیں ہو رہا۔ البتہ ریذیڈنٹ جنرل سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے تاکہ دنیا کو بتا سکے کہ بات چیت از سرِ نو شروع ہو گئی ہے۔

سلطنتِ متحدہ کے وفد کی طرف سے یہ بات سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ اس لئے کہ سلطنتِ متحدہ کے سوا دنیا کا کوئی ملک نہیں جسے اس قسم کے حالات کا زیادہ سے زیادہ تجربہ ہو۔ اس وفد کو خوب معلوم ہے کہ پاک و ہند کی سرزمین میں برطانوی اقتدار کی دست کشی سے پیشتر قومی لیڈروں کو بار بار جیلوں میں ڈالا گیا تھا اور ان کی جگہ "مقامی موزوں" لوگوں نے حکومتیں بنا لی تھیں (یہ وہی اصطلاح ہے جو فرانس نے تونیسیہ میں اپنے پٹھوؤں کے لئے استعمال کی) زیادہ معتدل اور زیادہ معقول عناصر سے سمجھوتے ہو گئے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی سمجھوتہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔ جب تک عوامی

خوش قسمتی سے اس موقع پر سب ... مصالحت کی کوئی تسلی بخش صلاحیت سے کامیاب نہ ہو سکی۔ انجام کار ایک فیصلہ کن عمل کی بنا پر جو میرے نزدیک تاریخ میں ہمیشہ شاندار اور بہترین ہے کہ سلطنت متحدہ نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں سے بات چیت کرے جنہیں ایک موقع پر جیلوں میں ڈالا گیا تھا۔ اس کے بعد ہی پاکستان، ہندوستان اور سلطنت متحدہ کے درمیان پائیدار امن و دوستی کی بنیاد پڑی۔ اس دوستی پر ہمیں فخر ہے۔

تاہم یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوا جب تک سلطنت متحدہ نے ایک جرات مندانہ اور فیاضانہ قدم نہ اٹھایا۔ معذرت خواہ وقت گزارنے اور بہانہ تراشی سے کام لینے اور دنیا کو اپنے اور دوسروں کے اور روش کے متعلق دھوکہ دینے کی کوشش کے بجائے سلطنت متحدہ جرات مندانہ اقدام سے اصل کام پر متوجہ ہوگئی، اور قوم نے حقیقی نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرلی۔ فرانس تیونس میں یہ طرز عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہمیں امید تھی کہ سلطنت متحدہ کے نمائندے حکومت فرانس کو یہی مشورہ دیں گے جو ماضی قریب کی تاریخ میں خود ان کے اپنے تجربے پر مبنی تھا۔

اخبارات سے معلوم ہوا کہ کوئی دو ہفتے پیشتر فرانس کے وزیر مستعمرات اور برطانیہ کے وزیر مستعمرات کے درمیان بات چیت ہوئی تھی اور موضوع گفتگو تیونس تھا۔ اگر سر گلیڈون کا بیان اسی مشورے پر مبنی ہے جو مذکورہ حکومت کو یہ معاملہ ایجنڈے میں شامل کرنے کے لیے دیا گیا ہے تو مجھے افسوس ہے کہ ان دو معزز اصحاب کی یکجائی سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سر گلیڈون جیب نے انگریزی زبان پر قابل رشک دسترس کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو گھوڑے اور مجھے خرگوش سے تشبیہ دی۔ اس طرح مجھے جلد بازی کا ملزم گردانا۔ موصوف نے بتایا کہ برطانوی دولت مشترکہ میں جس کے ساتھ وابستگی کی عزت انہیں، مجھے اور ہمارے ملکوں کو حاصل ہے بھانت بھانت کے سیاسی جانوروں کی گنجائش ہے۔ یہ تو غالباً درست ہے لیکن اگر برطانوی دولت مشترکہ میں شتر مرغ بھی موجود ہیں تو وہ میرے ملک میں نہیں پائے جاتے۔

اب میں اس معاملے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جو میرے نزدیک صحیح بنیادی دروازہ کھولتا ہے یعنی اس مسئلے کے متعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا موقف۔ جس حد تک آزادانہ بحث و تمحیص کا تعلق ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو نیا جرات مندانہ ریکارڈ پیش کر سکتا ہے۔ اس وقت تک امریکہ کی پالیسی ہر ابہام سے پاک رہی اور وہ ہمہ دم بلند آہنگ تھی۔ گزشتہ برسوں میں اس معاملے کے متعلق آزادی تقریر کے بارے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جو کچھ کہا ان میں سے بعض حصوں کو دہراتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے —— اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سے بہتر اصحاب کے قلوب میں حرارت پیدا ہو جائے گی۔ ان میں سے بعض حصے بڑے روح افزا ہیں —— میں ان حصوں کو اس غرض سے یہاں پیش کروں گا تاکہ اندازہ ہو سکے آج اقوام متحدہ کے بڑے ارکان کی روش میں کتنا نمایاں تغیر آچکا ہے۔

کیا مجھے ۱۹۴۶ء کی طرف توجہ کی اجازت دی جائے گی جب مسٹر سٹیٹنیس (Mr. Stettinius) نے روس کے خلاف ایران کی شکایت پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> "اگر ہم کونسل کے آئندہ اجلاس میں بحث کی غرض سے ایسے مسائل کو ایجنڈے میں لانے پر راضی ہو سکیں تو میں سمجھتا ہوں اس طرح صورت حال ہمارے سامنے واضح ہو جائے گی۔ میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کو یقین ہے اگر اقوام متحدہ کے ارکان میں سے کوئی ملک شکایت لے کر آتا ہے تو یہاں اسے اپنی بات سنانے کا حق حاصل ہے۔"

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اسی نمائندے نے فروری ۱۹۴۶ء میں یونان کے اندر برطانوی افواج کے مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے کہا۔

> "جب مختلف ملکوں کے درمیان شدید غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو بہتر یہی ہے وہ اپنے معاملات

کو اس کونسل میں لے آئیں۔"

امریکہ کے ایک اور معزز نمائندے مسٹر جانسن (MR. JOHNSON) نے یونان کے خلاف جمہوریہ شوسلسٹ یوکرین کی شکایت پر ۱۹۴۶ء میں بحث کرتے ہوئے کہا:—

"اس نظام (حفاظتی کونسل) کی تاسیس کے وقت سے میری حکومت کا موقف برابر یہ رہا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کا کوئی رکن کہتا ہے ایسے حالات موجود ہیں جن سے بین الاقوامی امن و حفاظت کے لئے خطرہ درپیش ہے تو کونسل اسے اپنا معاملہ پیش کرنے کا موقع دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔ میری حکومت اس اصول کو بہت اہم سمجھتی ہے۔"

امریکہ کے اسی نمائندے یعنی مسٹر جانسن نے ۱۹۴۶ء میں یہ کہا:—

"یہ واقعہ بھی بڑا اہم ہے کہ دنیا کے اس خطے میں گولی چل رہی ہے اور آدمی مارے جا رہے ہیں۔ لہٰذا حفاظتی کونسل کو اس پر توجہ کا حق حاصل ہے خواہ سیادت کا تصور کچھ ہی ہو اور انجام کار اس بارے میں کچھ ہی فیصلہ کیا جائے۔"

روس نے چیکوسلاکیہ کی آزادی میں مداخلت کی تھی اور اس پر چلی کی طرف سے شکایت پیش کی گئی تھی۔ مسٹر وارن آسٹن ــــــ (MR. WARREN AUSTIN) نے اس سلسلے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:—

"جو مسئلہ سامنے ہے اس کے متعلق فیصلہ اصل معاملے کا فیصلہ نہ ہوگا۔ اسے معاملے کے مالہ و ماعلیہ پر فیصلہ نہ سمجھا جائے گا۔ مگر جب ایک مسئلہ پیش ہو۔ جیسا کہ یہاں ہوا یعنی یہ کہ کوئی معاملہ بحث کے لئے ایجنڈے پر رکھا جائے یا نہ رکھا جائے تو اس معاملے کی نوعیت پر مزید غور کر لینا چاہیے، تاکہ معلوم ہو سکے حفاظتی کونسل کی دسترس میں وہ آتا ہے یا نہیں آتا۔"

مسٹر آسٹن نے مزید کہا:—

"کیا حفاظتی کونسل اس ذمہ داری سے اعراض یا اغماض کر سکتی ہے جو اس کے کندھوں پر ڈال دی گئی ہے کہ ان تمام الزامات کی سماعت کرے؟ ان وجوہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت اس امر کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں ووٹ دے گی۔"

میں وہ تمام اقتباسات پیش نہیں کروں گا۔ جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ میں اپنے رفیقوں کو تھکا دینے کا خواہاں نہیں۔ امریکہ کی حکومت زمانہ ماضی میں اس مسئلے کی حمایت میں بڑی جنہ آہنگ اور محکم رہی ہے۔ میں مسٹر جیسپ (MR JESSUP) کے بیانات میں سے بعض اقتباسات چھوڑتا ہوں اور اس اقتباس پر آتا ہوں۔ جو میرے ذخیرے کا آخری اقتباس ہے۔ یہ مسٹر وارن آسٹن کے بیان سے ماخوذ ہے جو اس شکایت کے سلسلے میں دیا گیا تھا۔ کہ حکومت ایران عالمی بین الاقوامی عدالت کی مؤقت تجاویز پر عمل کرنے میں ناکام رہی۔ موصوف نے فرمایا:—

"اقوام متحدہ اصولاً کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتی۔ تاہم دخل دینے سے انکار اس وقت پیش نظر آ سکتا ہے۔ جب ایجنڈا منظور کر لیا جائے اور اس پیش کردہ معاملے

ایسے چپ چپاتے بیاہ کر لیتے ہیں کہ جب ان کے نیچے گھٹنیوں کھسک کر گلی میں آ بیٹھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ فلانے کا فلانا ہے۔ ایک دن کیا اتفاق ہوا کہ ایک گلی میں برات چلی جا رہی تھی ساتھ والوں کے گھٹنیوں سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ[1] کے تو نہیں مگر کسی مولوی کے مقلد [illegible] آج دولہا صاحب بتلی گلی سے نکل کر نکڑ پر ٹھٹکے اور سب لگے کلمہ [illegible] لاحول ولاقوۃ ۔ [illegible] وقت کیا دھوکا ہوا ہے میں نے جانا [illegible] سادہ ہونے کی دو وجہیں ہوئیں۔ ادھر تو [illegible] کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد[2] [illegible] مولوی۔ [illegible] خیالات انگریزی۔ مولوی تو اتنا ہی چاہتے تھے کہ کانوں کان [illegible] سے قبلت[3] نہ کہے پہچان پڑے کہ ان میں دولہا کونسا ہے۔ باپ کی (کو اس نے ظاہر [illegible] کہ دولہا دولھن نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں جان پہچان نہیں ملاقات نہیں ایسا نکاح خلاف عقل بعید از مصلحت ۔ غرض آزادی کا بیاہ تو ہوا اگرچہ جہاں تک مولویوں [illegible] بن پڑا بے رونق ۔ آزادی آج کو کڑیا ہوتی مگر ہوتی کسی نواب کی کھلائی کی پوتی یا [illegible] کے کھیلنے کی ۔ تو بیاہ کی سیر دیکھتے ؟ نواب صاحب بیچارے کے لیے تو اب کیا [illegible] کے وقتوں کے گانو۔ باغات۔ کٹڑے۔ گنج ۔ معافیاں۔ دوکانیں [illegible] ہوئیں خالصے لگا چکے۔ رہنے کی محل سرا تک گروی پڑی ہے۔ بیگم صاحب کے پاس گہنے کا تار باقی نہیں۔ سو سوا سو روپے مہینے کی دوامی انگریزی پنشن تھی وہ ساہوکار کے قرضے میں نسلاً بعد نسل بطناً بعد بطن کے لئے منتقل کر دی گئی۔ گٹھڑی [illegible] چھپیئے میں سے ایک دقیانوسی جامہ وار [illegible] باغ رومال مگر بیسیوں جگہ سے رفو کیا ہوا۔ دو بڑے بچے تھے سو ایسا [illegible] آکر پڑا کہ پچھلی گرمیوں میں [illegible] پتنگ کرنے وہ دونوں ریزنسیکی کوڑیوں کے مول زبردستی کسی کے سر منڈھے۔ [illegible] دو پرانے چیتھڑے گئے تو گئے بارے بازی تو نواب

[illegible] اوپرے یا جاہلوں کی طرف اشارہ ہے ۱۲ [1] یہ طنز کی بات ہے کہ ابوحنیفہ کی تقلید کو تو بُرا سمجھیں اور [illegible] کے مولویوں کے مقلد ہوں ۱۲ [2] مشہور کہاوت کی طرف اشارہ ہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا ۱۲ [3] نکاح کے وقت مرد کو یہ لفظ کہنا ہوتا ہے جس کے معنے ہیں کہ میں نے قبول کی ۱۲

اندریں اثنا طریق کار کی بحث کے دوران میں ہماری ہتک کی گئی۔ دس قومیں اور جو حفاظتی کونسل سے باہر ہیں۔ اور ایک قوم وہ جو کونسل کی ممبر ہے ان سب قوموں نے بین الاقوامی امن کی خاطر یہ مسئلہ اٹھایا تھا۔ یہ سب فرانسیسی رفیق نے ہماری شکایت سنی۔ اس نے ہم پر الزام رکھا کہ جو بیانات پہلے سے ان کا مقصد یہ پایا جاتا تھا کہ جو اقدام ہم کریں وہ ہم میں سے بعض پر دنیا اعتماد نہیں رکھتا جیسا وہ سرحد پر کہتا ہے لیکن یہ زیادہ سے زیادہ دو متاثرہ ملک کا معاملہ سامنے لا سکتے ہیں کہ ہمارے پیمبر کے دل میں پریذیڈنٹ کی کرسی خالی ہو سکتی تھی جب وہ اس مسئلے کو حفاظتی کونسل میں لانے پر آمادہ ہوا۔ نمائندہ فرانس نے یہ فیصلہ اس موقعہ پر حفاظتی کونسل پہلے ہی کر چکی جب طریق کار پر بحث ہو رہی تھی اور اس مسئلے کو ایجنڈے پر لانے کے بارے میں غور و خوض کیا جا رہا تھا لیکن تب بھی فیصلہ کرنا نہ ہو سکا تھا۔ اس کے بعد دس قوموں اور ان کے نمائندوں نے درخواست پیش کی کہ اگر ناکامی ہمارے لیے مقدر ہو چکی ہے تو کم از کم ہمیں اتنا تو مروت تو ہے کہ اخلاقی حق سے محروم نہ کیا جائے ہم پر الزامات لگائے گئے ان کے جوابات کا ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم اقوام متحدہ کے تمام ساعت کے دوران میں اعلان کے علاوہ جواب کا حق اس طرح تسلیم کر چکے ہیں جسے قطعاً مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ شاید حفاظتی کونسل مسئلہ تونس پر بحث سے انکار کر کے گیارہ قوموں کی درخواست کو مسترد کر کے کم از کم تلافی کا موقع مزید پیدا کر سکے اور دس قومیں کونسل کی میز پر بلائی جائیں تاکہ وہ دروغ باقی۔ پروپیگنڈے اور جو منظم طور پر تہمت کے سنگین الزامات کا مفصل جواب دے سکیں جو فرانسیسی نمائندے نے گزشتہ جمعہ کے اجلاس میں ہم سب کے خلاف عائد کیے۔ اس وجہ سے نتیجتاً ایک تجویز یہ ہے کہ زیر غور مسئلے کے بارے میں فیصلے سے پیشتر ہمیں حفاظتی کونسل کی حیثیت میں ان دس ملکوں کو دعوت دینی چاہیے جنہوں نے آج کونسل کی خدمت میں تحریر پیش کی ہے۔ اور جن کے خطوط میں بحث کے آغاز میں پڑھ کر سنا چکا ہوں دعوت یہ ہو کہ وہ حفاظتی کونسل میں آئیں اور ان الزامات کے جواب کا اخلاقی حق استعمال کریں جو نمائندہ فرانس نے ان کے خلاف استعمال کئے۔

پاکستان کے نمائندے کی حیثیت میں میرا بیان یہاں ختم ہوتا ہے۔

اس بیان کا متن جو پروفیسر احمد شاہ بخاری نے حفاظتی کونسل میں ۱۴ اپریل ۱۹۵۲ء کو دیا

مسئلہ تونس کو ایجنڈے پر لانے کے حق میں پاکستان نے جو ووٹ دیا ہے اس کے ضمن میں مزید تشریحات کی غرض سے میں مندرجہ ذیل بیان دینے کا خواہاں ہوں۔

سال رواں کے قریباً آغاز ہی سے تونس میں شدید بے چینی جاری ہے۔ قتل، تشدد، آتش باری اور وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کی خبریں دنیا بھر کے اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ میری حکومت نیز اقوام متحدہ کے رکن ملکوں میں سے دس اور حکومتوں کے نزدیک یہ صورت حال بے حد تشویش ناک ہے۔ ہمارا قطعی یقین ہے کہ گزشتہ تین ماہ یا اس سے کسی قدر زیادہ مدت کے اندر تونس میں جو دردناک حالات پیش آئے انہیں محض مقامی ہنگامے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شہریوں میں کچھ فساد ہوا یا معمولی امن شکنی کے واقعات پیش آئے جسے روکنے کے لیے نظم و قانون کے محکمے کو عام اقدامات کرنے پڑے جن لوگوں کے ہاتھوں یہ واقعات رونما ہوئے ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فریقین کے احمق یا بدکردار لوگ تھے۔ اس صورت حال کی جڑیں ماضی میں چلی گئی ہیں۔ فی الحال توازن بڑی ہی نازک حالت میں ہے اور مستقبل کے دامن میں ناخوشگوار واقعات ہی نظر آرہے ہیں۔ اسی لیے ہمارے نقطۂ نگاہ سے یہ صورت حال بین الاقوامی امن و سلامتی کے لئے ایک شدید خطرہ بنی ہوئی ہے۔ میں اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے دعوے

اور مقتدر نگاہوں کی توضیح و تجزیہ کے لئے اس کے متعلق مزید کچھ عرض کروں۔

فرانسیسی حکام اور اہلِ تونیسیہ کی حکومت کے درمیان جس کش مکش نے حال میں ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے یہ اس کش مکش کا حسن . . . ترین منظر ہے جو سالہا سال سے جاری ہے۔

فرانس نے ۱۸۸۱ء میں تونیسیہ پر قبضہ جمایا تھا۔ جب کہ ایک فرانسیسی فوج (مورخ کے بیان کے مطابق) الجزائر سے اس بہانے تونیسیہ میں داخل ہوئی تھی کہ ایک قبیلے کو سزا دینی منظور تھی۔ داخل ہوتے ہی اس فوج نے دارالسلطنت تیزی سے آ گھیرا۔ حاکم حکومت کی طرف پیش قدمی شروع کر دی، اور حاکمِ تونیسیہ کو فرانس کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔

اسی سال معاہدۂ باردو قرار پایا۔ یہ معاہدہ اپنی عمومی وضع میں ان معاہدوں کے عین مطابق تھا۔ جو استعمار کے دورِ عروج میں طاقت ور اور ناتوانوں کے درمیان ہوتے رہے۔ بہ حال اس کی تمہید میں مرقوم ہے کہ "فریقین دوستی اور خوش گوار ہمسائیگی کے روابط کو مستحکم بنانے کے آرزو مند ہیں جو ان دو حکومتوں کے درمیان ہمیشہ سے چلے آتے ہیں۔" اس معاہدے کی دفعہ ۲ میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کا فوجی قبضہ اسی وقت ختم ہو جائے گا۔ جب فرانس اور تونیسیہ کے حکمران اس امر پر متفق ہوں گے کہ مقامی انتظامیہ قیامِ امن بحال رکھنے کا اہل ہے۔

یہ فوجی تصرف جس کا مدعا یہ تھا کہ نظم و قانون بحال رہے۔ بدستور اب تک قائم ہے اور اس کی گرفت میں ڈھیل کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ تونیسیہ پر فرانس کی گرفت بار بار سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔

فرانس کو تونیسیہ میں قدم جمائے دو سال ہو چکے تھے۔ جب ۱۸۸۳ء میں ایک کنونشن پر دستخط ہوئے جو لامرسی (LA MARSA) کی کنونشن کہلاتی ہے۔ اس میں پہلی مرتبہ تونیسیہ کے لئے "زیرِ حمایت علاقے" کا جملہ استعمال ہوا تاہم اس سے اس ابتدائی معاہدے کی بنیادی حیثیت میں نہ کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ اسے بدلا گیا۔ جو "دو حکومتوں کے درمیان" ہو چکی تھی۔ اس کا مقصد یہی تھا کہ دو حکومتوں کے درمیان تعاون رہے گا۔ یہ نہ تھا کہ فرانس انتظامیہ کا براہِ راست ذمہ دار ہوگا۔ تاہم عملاً یہ تونیسیہ کی محکومی کا آغاز تھا۔ کیونکہ اس کے بعد سے جمہوریۂ فرانس نے یک طرفہ حکم جاری کر کے پہلے حکمران تونیسیہ سے اس کے وابستہ تمام اختیارات اپنے قبضے میں لے لئے پھر بہت جلد بعد یک طرفہ حکم ناموں کے ذریعے تونیسیہ میں فرانسیسی نمائندے کے اختیارات اور بھی مستحکم کر دئے اور وہ نمائندہ بہ طورِ خود تونیسیہ میں فرانسیسی جمہوریت کے احتیاطات کا کوتوال بن گیا۔

کسی علاقے کو زیرِ حمایت لے لینے کی وجہ جو اس پیش کی جاتی ہے کہ پس ماندہ اقوام کو خود اختیاری حکومت کے راستے پر چلایا جائے۔ لیکن تونیسیہ کے متعلق میں اس کے برعکس عمل ہوا یعنی اس آزاد ملک کو آہستہ آہستہ آزادی سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی سیادت اور برتری کھا کھا کر ختم کر دی گئی۔ اور جو خود مختاری اسے ایک صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت سے حاصل تھی وہ غیر ملکی اقتدار میں بدل دی گئی۔

پھر تونیسیہ میں فرانسیسیوں کو آباد کرنے کا مسلک اختیار کیا گیا۔ ان آبادکاروں کو زمینیں بھی دی گئیں۔ اور مالی امداد سے بھی نوازا گیا۔ تونیسیہ کے نظم و نسق میں فرانسیسی کارندوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بہترین زمینیں ان آبادکاروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہیں جو براہِ راست فرانس سے آئے تھے یا مالی قریب میں انہیں تونیسیہ میں قومی حقوق مل گئے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کو خواہ مخواہ جنگلات قرار دے کر حکومت قابض ہو گئی۔ ایک اور قانون کے ذریعے سے ان تمام جنگلات کی حد بندی کر کے خاص آبادکاروں کے فائدے کے لئے از سرِ نو تقسیم کر دیا گیا۔ تونیسیہ کی آبادی تینتیس لاکھ کے قریب ہے ان کے مقابلے میں فرانسیسی صرف ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہیں۔ یہ تیس ہزار بیچ کے بڑے افسر ملک کا نظم و نسق سنبھالے بیٹھے ہیں۔ گویا ایک سو باشندوں کی ہر جماعت کے لئے ایک افسر مقرر ہے ان افسروں میں سے تین چوتھائی فرانسیسی ہیں۔ تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو مدرسوں میں جانے والے تونیسی طلبہ کا تناسب ۱۱ فیصد ہے اس کے مقابلے میں فرانسیسی

قضیہ کا مناسب فیصلہ

سب پروٹیکٹوریٹ ہے کہ فرانس کی طرف سے جو ریذیڈنٹ تونیسیہ میں مقرر ہے اس نے حکمران کے تمام اختیارات غصب کر لئے ہیں اور اس فریب کی داستان کا احساس قائم رکھنے کے لئے محض اس کی مہر استعمال کی جاتی ہے۔ تونیسیہ کے باشندوں کی کوئی قانون ساز مجلس یا پارلیمنٹ نہیں جس کے ممبر رائے عامہ کے منتخب ہوئے ہوں اور جسے کم از کم داخلی معاملات کے متعلق ہی قانون بنانے کا اختیار ہو اگرچہ چار وزیر مقرر کر دئے گئے ہیں تاہم احکام نافذ کرنے کا پورا اختیار فرانسیسی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اہلِ تونیسیہ نے فرانسیسی استبداد کو کبھی بطیب خاطر قبول نہیں کیا۔

موجودہ صدی کے آغاز سے تونیسیہ کی قومی تحریک میں زیادہ سے زیادہ قوت و حرکت پیدا ہو گئی اور اس نے وہی شکل اختیار کر لی جو دنیا کے دوسرے حصوں کی محکوم اقوام نے دور حاضر کی سیاسی فضا میں اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی وہ بیدار ہوئے، آزادی کے لئے جد و جہد شروع کر دی اور بعض حالتوں میں اب تک اجنبی اقتدار اور لوٹ مار کے خلاف سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

اہلِ تونیسیہ کو بھی وہی مشکلات پیش آئیں جو دوسرے لوگوں کو پیش آ چکی ہیں۔ یعنی جن اجنبیوں نے وسیع وسائل ملک پر قبضہ کر رکھا ہے ان کی طرف سے مخالفت اور استعماری طاقت کی طرف سے قوت کا کڑا اور بے دریغ استعمال۔ قوم پرست لیڈر یکے بعد دیگرے یا تو جیلوں میں ٹھونس دئے گئے یا جلاوطنی پر مجبور ہو گئے۔ اور یہ تمام لوگ بصیرت اور دانش و ہمت کے مالک تھے۔ ان میں سے بعض جلاوطنی ہی میں وفات پا چکے ہیں تاہم عارضی پسپائیوں کے باوجود تحریک برابر ترقی کرتی گئی۔ پہلی جنگِ عظیم اور پریذیڈنٹ ولسن کے چودہ نکات کے بعد اہلِ تونیسیہ کے دل نئی امیدوں کی روشنی سے چمک اٹھے۔ جریدہ ۱۹۱۹ء کے (Economist) کے بیان کے مطابق عین اسی وقت فرانسیسی حکومت نے اپنے افسروں اور چھوٹے چھوٹے آبادکاروں کی تعداد بڑھانے کا منظم سلسلہ شروع کر دیا اور فرانس کے سیاسی گروہ مختلف فریقوں کی حمایت میں لگ گئے۔ بعض سیاست دان بائیں بازو کی ترقی پسند جماعت "دستور" کے ساتھ ہو گئے۔ بعض نے آبادکاروں کی پشتی بانی اختیار کر لی۔

پیرس میں حکومتیں بدلتی رہیں۔ ہر حکومت کی ظاہری حیثیت کے ساتھ اہلِ تونیسیہ کی امیدوں اور آرزوؤں میں بھی نشیب و فراز کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۵۰ء میں انہیں حرفِ دستور پارٹی صدر درجہ مایوس ہو گئی۔ دراصل اس نے آخری فیصلے کا ارادہ کر لیا۔ دوسری طرف آبادکاروں کے حامی فرانسیسی حکام کریہہ کر تیار ہو گئے۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے پر تشدد کشمکش کا آغاز قائم ہو گیا۔ قریباً ایک ہزار قوم پرور جیلوں میں ڈال دئے گئے فرانسیسی حکام نے اعلان کر دیا کہ تونیسیہ میں محاصرے کی صورت پیدا ہو چکی ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق یہ صورتِ حال ابھی تک ختم نہیں ہوئی اگرچہ چودہ سال کے لیل و نہار گذر چکے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ تونیسیہ میں فرانس کا نظم و نسق نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ نظم و نسق نہ تو دو حکومتوں کے درمیان معاہدوں کی بنا پر جائز تھا نہ انصاف و آزادی کے اصول کی بنا پر حق بجانب ثابت کیا جا سکتا تھا میں یہاں پھر جریدہ اکانومسٹ سے اقتباس پیش کرتا ہوں۔ جریدۂ مذکور رقمطراز ہے:

"جس حکومت کو بدلنے پر وہ (تونیسی اور فرانسیسی) اصرار کر رہے تھے اس کے اجزائے ترکیبی اس وقت یہ تھے۔ بے (حکمران) ایک کابینہ کے ذریعے سے حکومت کا کاروبار چلاتا تھا جس میں سات فرانسیسی اور چھ تونیسی شامل تھے۔ لیکن اس کابینہ کے فیصلوں کو اوپر بھیجنے سے پیشتر ایک فرانسیسی کی توثیق لازم تھی۔ کابینہ کو معاشی اور مالی معاملات میں مشورے دینے کے لئے دو بڑی منتخب کونسلیں مقرر

کر دی گئی تھیں۔ جن کے ارکان کی تعداد یکساں تھی۔ ایک تونسیوں پر مشتمل تھی اور دوسری فرانسیسیوں پر
لیکن ان اسمبلیوں کی حیثیت محض مشیروں کی سی تھی۔ اصل گورنمنٹ بارہ اہم تونسیوں کے ۱۲ سے
کر دی گئی تھی۔ مگر پورا اقتدار فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے کہ ایک فرانسیسی افسر تمام
اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا۔ مگر ان تونسیہ کے ہر حکم پر کسی فرانسیسی کے دستخط بھی ضروری تھے۔
سب سے آخر میں اس لئے کہ جن فرانسیسیوں کے ہاتھ میں عام ملکی اختیارات تھے وہ بلدی اور
دیہاتی اداروں کے بھی نگران ہوا کرتے تھے:

۱۹۵۰ء کے موسم گرما میں، ۱۹۴۹ء کے واقعات نے وہ نتیجے پیدا کئے۔ فرانسیسی آبادکاروں کے سخت مخالفانہ مظاہروں کی مخالفت کے باوجود نئے فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کو ہدایت کی گئی کہ تین بڑی اصلاحات جاری کر دی جائیں اور اگر ممکن ہو تو اس بارے میں اہل تونسیہ کی حمایت حاصل کی جائے۔ اوّل فوراً حکومت از سر نو ترتیب دی جائے۔ دوم سول سروس میں داخلے کی شرطیں تبدیل کر دی جائیں تاکہ اہل تونسیہ بھی معقول تعداد میں لئے جا سکیں اور مقابلے کا امتحان ضروری نہ رہے جسے فرانسیسی آبادکار ترجیح دے رہے تھے۔ سوم بلدیاتی خود مختاری جاری کر دی جائے۔ اگست ۱۹۵۰ء میں ریذیڈنٹ جنرل نے حکمران کے مشورے کے بعد ایک ایسا قدم اٹھایا جس کی کوئی مثال پہلے موجود نہ تھی اس نے نئی وزارت کی ترکیب کا اعلان کیا جس میں پہلی مرتبہ تونسیوں اور فرانسیسیوں کی تعداد مساوی رکھی گئی۔ اور اس کی صدارت تونسی وزیراعظم ایم شینک (M. CHENIK) کے حوالے کی گئی۔ سات تونسی ارکان مختلف پارٹیوں کے نمائندے تھے۔ صرف کمیونسٹوں اور قدیم دستور پارٹی میں سے کوئی نمائندہ نہ لیا گیا۔ اس لئے کہ آخر الذکر بھی مشرق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہرحال نو دستور پارٹی اس کابینہ میں خدمت گزاری پر راضی ہو گئی۔

فروری ۱۹۵۱ء میں تونسیوں اور فرانسیسیوں نے باہمی رضامندی سے کئی تبدیلیاں کر لیں۔ ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ وزارت جو فیصلے کرے گی انہیں حکمران تک پہنچانے سے پیشتر کسی فرانسیسی کی نفرت انگیز توثیق ضروری نہ ہوگی۔ اب فرانسیسی آبادکاروں کے سامنے اس صورت حال پر غور سے پھر سوال یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں خرابی کہاں پیدا ہوئی؟ اس کا جواب مختصراً یہ ہے: ماضی قریب میں جو مشکلات پیدا ہوئیں۔ ان کی اصل وجہ اس میں ہے کہ نو دستور پارٹی نیز تونسیوں کی بہت بڑی تعداد ان اصلاحات کو جلد سے جلد کامل خود مختاری حاصل کرنے کی تمہید سمجھتی ہے۔ اس کے برعکس فرانسیسی آبادکاروں کی رائے یہ ہے کہ ان حدود سے آگے پیرس کو ایک قدم بھی نہ بڑھانا چاہیے۔

وزیراعظم تونسیہ نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کے نام ایک خط بھیجا: "موجودہ وزارت اس وجہ سے بہت بے بس ہے کہ جو نیا قدم یہ اٹھانا چاہتی ہے اس میں مسلسل مخالفت ہوتی ہے..... مذاکراتی وزارت کا قیام اس قسم کے دباؤ کا زیادہ دیر تک متحمل نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر اس لئے کہ مہینوں سے یہ وزارت تونسیہ اور پیرس دونوں مقامات پر فرانسیسیوں کی تحقیر آمیز اور معاندانہ سرگرمیوں کا ہدف بنی ہوئی ہے تونسیہ اور پیرس میں فرانسیسی نمائندوں کی اکثریت نیز فرانسیسی حکام کی کشمکش اور ان سب کی کوششیں کہ گفت و شنید ناکام ہو جائے ایک کھلے ہوئے راز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ تمام ذرائع استعمال کئے گئے جن کی بنا پر حکومت تونسیہ اور اسمبلی کے تعاون کو ناممکن بنا دینا منظور تھا۔ مثلاً اجتماعی طور پر استعفے دے دیئے گئے خاص سیاسی نقطۂ نگاہ سے قراردادیں پیش کی گئیں۔ وزیراعظم نے قرضوں کے سلسلے میں جو مطالبہ کیا تھا اسے مخلوط مندوبین کے سامنے پیش کر دیا گیا"
۲۲ اپریل ۱۹۵۱ء کو وزیراعظم نے پھر ایک چٹھی ریذیڈنٹ جنرل کے نام بھیجی جس میں ان تمام کارروائیوں کی قلعی کھولی گئی جو وزارت سے پہلے اور اس کے بعد اختیار کی گئیں۔ اس میں بڑی مجلس کے فرانسیسی حصے کے استعفے بھی شامل تھے جو فرانسیسی حکومت اور پارلیمنٹ کے بھیجے ہوئے وفدوں کے روبرو پیش کئے

گئے۔ دیلاؤ کی کارروائیوں کا بھی ذکر تھا۔ شفوپرس تار بھیجے گئے، مختلف انتظامی محکموں میں جو فرانسیسی کام کرتے تھے بجوٹے معاندانہ شمار بھی مقرر کر لیا تھا۔ میں ان تازیبا اشاعتوں کا ذکر نہ کروں گا جن کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہوا ہے۔ ان فرو گذاشتوں کو یہ وہ داؤں کا جنہیں میں سراسر غیرمادی سمجھنے کیلئے تیار ہوں۔ ـــــ البتہ میں آپ کی توجہ ان چند نمایاں واقعات کی طرف مزید منعطف کرانا چاہتا ہوں جن سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اہلِ تونیسیہ کی طرف بعض لوگوں کی غلط اندیش عداوت اور تونیسیہ میں فرانسیسی مفادات کے عجیب و غریب تصورات کس حد تک وسعت اختیار کر سکتے ہیں، تاہم اب بھی ہر چیز کا مداوا ہو سکتا ہے۔ مجھ سے کے امکانات موجود ہیں دیانت دارانہ اور خیرخواہانہ گفت و شنید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ سینیگال لوگ جن پر امارت مشکل ہے مایوسیوں، دردوں، بانیوں کے باوجود گفت و شنید جاری رکھنے کے لیے تیار ہیں اگرچہ بارہا اس میں مداخلت ہوتی رہی۔ اس مداخلت کے ذمہ دار وہ چند لوگ تھے جنہیں سیاسی و انتظامی تعطل ہی میں فائدہ نظر آتا ہے۔"

دوسرے لفظوں میں ۱۹۵۰ء کی روح ان فرانسیسیوں نے بالکل کچل کر رکھ دی جن کی ذہنیں نوفیہ سے وابستہ تھیں۔ تونیسیہ کی وزارت جو اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ حکمران اور اہلِ تونیسیہ کی خودمختاری بحال کرنے کے لیے حکومتِ فرانس سے گفت و شنید کرے، غلط طریق پر محروم اختیارات کر دیا گیا۔ فرانسیسی آبادکاروں کی سازشوں اور جابجا مداخلتوں نے وزارت کو بے عمل بنا دیا۔ تونیسی وزیروں کو مسلسل ذلت کا نشانہ بننا پڑا۔

یاس و ناامیدی کی یہ فضا تھی جس میں تونیسی وزیر ۱۹۵۱ء کے آخری حصے میں عازمِ پیرس ہوئے تاکہ حکومتِ فرانس کو از سرِ نو عہد و پیمان کی یاد دلائیں۔ فرانس کے وزیرِ خارجہ نے ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کو جو جواب دیا اس نے امیدوں کا آئینہ ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اس جواب میں جدی اصلاحات کی مذمت کے سوا اور کوئی چیز تسلیم نہ کی گئی۔ باقی جو کچھ تھا صرف یہ تھا کہ فرانس نے تونیسیہ میں تہذیب کے لیے جو کام کیا اس کی خوب قصیدہ خوانی کی گئی اور بتایا گیا۔ تونیسیہ میں فرانس نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس جواب نے اہلِ تونیسیہ کو صدر بد مایوس کر دیا اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو لوگ بس رہے تھے ان کے دلوں میں بھی شدید خطرات پیدا ہو گئے۔

۱۹۵۱ء میں ایم رابرٹ شومان (M. ROBERT SCHUMAN) نے کہا کہ "فرانسیسی یونین کے تمام علاقوں نے سے ہمارا نصب العین آزادی ہے"۔ اس سے اہلِ تونیسیہ کے دل مسرور ہو گئے۔ تاہم ۱۵ دسمبر ۱۹۵۱ء کے مکتوب میں یہ اعلان کر کے تاریخ کا رخ بدلنے کی کوشش کی گئی۔ حکومتِ فرانس موجودہ ادارے (گرانڈ کونسل) میں ترمیم پر غور و خوض سے نفور نہیں لیکن اس کے نزدیک مزید کسی سے بھی کی حکومت میں فرانسیسی نمائندگی کے اجرا کی حفاظت سراسر ناگزیر ہے۔"

اس بہت شکنی اور مایوسی سے اہلِ تونیسیہ کو جو صدمہ ہوا اسے اس خط سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا جو تونیسی وزیرِ اعظم نے حالات کی اس اچانک تبدیلی پر حیرت زدہ ہو کر صدرِ فرانس کو لکھا۔

> "تونیسیہ میں فرانس کے مفادات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حکومتِ تونیسیہ نہ صرف ان مفادات کو تسلیم کرتی ہے بلکہ ان کی حفاظت کی ضمانت دینے کے لیے بھی تیار ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ ہے اور اہلِ تونیسیہ کے خیالات کی صحیح ترجمانی کر رہی ہے۔ لیکن ان مفادات کو خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں سیاسی حقوق کی صورت اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جن کے تحت اہلِ فرانس کو تونیسیہ کے انتظامی اور منتخب اداروں میں دخل دینے کا حق مل جائے ..... جہاں تک فرانس کی طرف سے مالی امداد کا تعلق ہے اس امر کی پوری پوری وضاحت

ہو جاتا ظاہر ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت قرضے کی ہے جس کا اصل اور سود دونوں واجب الادا ہیں، اور
جس کے اخراجات سالانہ بجٹ میں بسلسلہ قرضہ زیر عنوان "قرضہ تونسیہ" کئے جاتے ہیں۔ اس میں
شک نہیں کہ اس قرضے سے ملک اور عوام کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچا ہے لیکن یہ بھی واقعہ ہے
کہ اس امداد سے جو مفادات سب سے زیادہ نفع حاصل کر رہے ہیں وہ قدرتی ذخائر، نقل و حمل
کے وسائل، اور بجلی وغیرہ کی تیاری کے فرانسیسی مفادات ہیں۔ ایسے مفادات میں تونسیوں کا حصہ
عملی طور پر صفر کے برابر ہے۔ جناب صدر! اخبارات کوئی سے یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اول
تونسیہ پر فرانس کے احسانات کا آج بے انتہا چرچا کیا جاتا ہے لیکن تونسیہ نے آڑے وقت میں فرانس
کی جو مدد کی اسے آنکھیں بند کر کے خاموشی سے ٹال دیا جاتا ہے ...... کیا یہ سب کچھ بھلا
دیا گیا ہے؟ کیا تونسیہ کو وقتی فرانس کا ہمیشہ کے لئے دست نگر تصور کر لیا گیا ہے؟

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا کسے علم نہیں؟ تونسیہ کے ہر دل عزیز محب وطن رہنما حبیب بورقیبہ (HABIB BOURQUIBA) اور دوسرے قومی لیڈر جنہیں تونسیہ کے عوام عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ۱۸ جنوری کو گرفتار کر لئے گئے۔ مظاہرات روکنے کے لئے گولیاں برسائی گئیں۔ جان و مال کا نقصان ہوا۔ ہزاروں تونسیوں کو اور انجام کار تمام تونسی وزیروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یہ سب حال ہی کی باتیں ہیں۔

ماضی کے حالات کا مختصر سا جائزہ پیش کرنے سے میری غرض محض یہ ہے کہ کشمکش کے گذشتہ تین مہینوں میں دونوں حالات جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان پر روشنی ڈالی جا سکے۔

میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر فرانس کے اس دعوے کو کہ وہ امن و قانون بحال کرنا چاہتا ہے اس، فسانوی کردار کے کٹہرے میں جانچئے جس نے ایک مظلوم کا گلا صرف اس جرم کی پاداش میں شدت کے ساتھ دبایا کہ دم گھٹنے کے باعث اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میری حکومت تونسیہ کی صورت حال کو محض ایک معمولی مقامی یا داخلی مسئلہ نہیں سمجھتی۔ حکومت فرانس کا یہ کہنا کہ وہ اصلاحات کا نیا منصوبہ رائج کرنا چاہتی ہے ہمارے دلوں میں اطمینان یا اعتماد کس طرح پیدا کر سکتا ہے جب کہ اس نے تونسیہ کے ان تمام قومی لیڈروں کو جیل میں ڈال رکھا ہے جن سے اس قسم کے منصوبوں کے بارے میں بات چیت ہو سکتی ہے؟

تونسیہ سے حال ہی میں جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں وہ بہت اضطراب انگیز ہیں۔ نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون "تونسیہ کی کابینہ" کے زیر عنوان ایسوسی ایٹڈ پریس کی یہ اطلاع شائع کرتے ہوئے کہ ۱۲ اپریل کو تونسیہ میں نئی کابینہ قائم ہوئی لکھتا ہے:—

"اس کابینہ کو کوئی قابل ذکر اختیار حاصل نہیں۔ فرانس کی طرف سے اعلان اصلاحات کی جو تقریب
قریب ہی قرطاجنہ میں منائی گئی اس میں شریک ہونے والوں نے بیان کیا کہ شمالی افریقہ کے زیر حمایت
علاقے تونسیہ کے برائے نام حکمران بے کے چہرے پر اس وقت تبسم کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے مجبور کر کے یہ کردار ادا کرایا جا رہا ہے۔ فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل جین ڈی
ہاٹی کلوک (JEAN DE HAUTECLOQUE) نے وزارت خارجہ کا عہدہ
سنبھال لیا ہے۔ تونسیوں کو اپنے ملک کے دفاع سے بھی سروکار نہ ہوگا۔ بیس ہزار سے زیادہ فرانسیسی

مراکش، تیونس اور الجیریا میں عوام کے جذبات پر نظر ڈال کر بالکل ظاہر ہے کہ ایک طرف تو یہ پابند تھا، اور شریف قوم اور ایک عرصہ سے آزادی یورپی طاقت کے درمیان خونریز جدوجہد جاری ہے وہ یورپی طاقت بھی جاپان سے آئی ہے اور دوسری قوم کے ذہن میں پے درپے تعریف کے لئے آزادی کا خواب جو جلد ہی پیش نہیں جا سکتی۔ باشندگان مراکش، تیونس و الجیریا کے جذبات کی بڑی تعیش کو عمدہ سے عمدہ کی ضرورت ہے۔

آخر میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میری حکومت اور میرے ملک کو فرانس کے ساتھ انتہائی محبت ہے اور وہ فرانس کی عظیم الشان آزادی پسندانہ روایات کو عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پاکستان کے ایک ممتاز روزنامے "ڈان" نے لکھا ہے۔ "بعض سیاسی مسائل میں ہمیں فرانس کے ساتھ گہرے اختلافات ہوں لیکن ہم فرانس کی انتہائی عزت کرتے ہیں اس لئے کہ وہی ہے جس نے حریت، اخوت اور مساوات کے بلند پایہ نعرے اٹھائے تھے۔ ہم فرانس کو آزاد دنیا میں اپنا دوست دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ اور فرانس و پاکستان کے درمیان تعلقات کو مستحکم کرنے کی کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔"

اگر ان اعلیٰ اصول کا علم بلند رکھنے کی کوشش میں جس کا سہرا تاریخ نے فرانس کے سر باندھا ہے میں نے اپنے رفیقوں اور ممتاز نمائندوں کے صبر و تحمل پر زیادہ بوجھ ڈالا ہے تو میں بصمیم قلب معذرت خواہ ہوں۔

کے ہاتھ رہی۔ ظاہر حال تو نواب صاحب کو کہیں سے کچھ آتے معلوم ہوتی نہیں لیکن جنیا جو ادھار دیئے چلا جاتا ہی بنیے کی ذات بھی بڑی ہی [illegible] اس نے کچھ نہ کچھ تو سہارا دیکھ لیا ہوگا۔ آیا تیسرا برس ہی پھول والوں کی [illegible] کی اشرفیاں دو سو بدل رکھوائی تھیں کہیں اُن کا لیکھا برابر سرابر [illegible] سوالاکھ کا ان کھول دینا کہ یہ اشرفیاں نواب صاحب [illegible] کی ہیں انھوں نے جناب بڑی بیگم صاحب سے لڑ جھگڑ کر بڑی مشکل سے نکلوائیں سو بھی کس طرح کہ اپنی جوانی کی قسم کھائی کہ ہیں بیچنے کا نہیں۔ بس ہم تو خاندانی امیروں کی اصلی ادا پر لٹو ہیں کہ کیسے ہی تنگ دست بلکہ تہی دست کیوں نہ ہو جائیں فطری سیر چشمی اور جبلی داد و دہش جو ہی سو ہی۔ امیر اگر اصیل نسل کا امیر ہی تو اس کی نظروں میں چاندی چکی خاک ہی اگرچہ اکسیر ہی۔ نواب صاحب ذرا سُن پائیں کہ دادا کی نواسی گڑیا کے بیاہ [illegible] مچل رہی ہی پھر چاہے ایک ایک کے چار چار بلکہ سو سو اور ہزار ہزار دینے پڑیں تو پڑیں مگر دادا کا دل میلا ہو یہ کب اُن کو گوارا ہو سکتا ہی۔ اور خدا رکھے زندہ دل بھی ایسے ہیں کہ گڑیا کے بیاہ کے ساتھ سارے مشغلے چھوڑ چھاڑ وہ تو اسی کے سر ہو جائیں گے۔ دیوانہ را ہوئے بس ست۔ وہ تو ایسے بہانے ڈھونڈتے ہیں ✤ آزادی ایسے دل و دماغ کی عورت تھی کہ اس کی پسند کے شوہر کا ملنا تھا [illegible] مشکل خدا جانے مولوی مستجاب کی کوتن [illegible] ت کی دعا بارگاہ الٰہی میں قبول ہوگئی تھی کہ آزادی جیسی بی بی اُن کو ہاتھ لگ گئی [illegible] ۃ اور سیرۃ ایک سے ایک عمدہ ایک سے ایک بہتر۔ مولوی صاحب آزادی کی نظر میں جچے تو کیا [illegible] آزادی کسی بات کی تنہا کی کسی مداراۃ کی فریادی بھی نہ تھی۔ ان میں جس چیز کی کمی رہی سو اس کی تلافی اس سے بخوبی ہوتی تھی کہ مولوی صاحب بی بی کی جورو بنے ہوئے اُس کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ آزادی کہتی اُٹھ تو بے تکان اُٹھ کھڑے ہوتے۔ وہ کہتی بیٹھ تو بے عذر بیٹھ جاتے۔ ادھر آزادی بھی ایسی نادان نہ تھی کہ میاں کو فرماں بردار دیکھ کر نخرے میں آجاتی اور اپنے تئیں کھینچنے لگتی۔ وہ میاں کو میاں ہی سمجھتی اور اس کی بہت احتیاط کرتی [illegible] آج جو میری جگہ ان کے [illegible] کل کلاں کو اس میں کسی طرح کا فرق آئے اور ان کی نظر میری طرف [illegible] رفتہ رفتہ

ماڈل جنرل اسمبلی

ذیل میں پاکستان کے مستقل نمائندہ و سفیر احمد شاہ بخاری کی اس انگریزی تقریر کا متن دیا جاتا ہے جو
انھوں نے برنارڈ کالج نیویارک کی ماڈل جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس میں ۶ اپریل ۱۹۵۲ء کو فرمائی۔

جناب صدر! سب سے پہلے میں آپ کی اجازت سے مس میکنٹاش[1]، پروفیسر پیئرڈن[2]، مسٹر ولیم ہینڈرسن[3] اور مس روتھ شاختر[4] کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کے طفیل مجھے آج شام یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ جب مجھ سے کہا گیا کہ مجھے اقوام متحدہ کی اس ماڈل اسمبلی سے مقرر خصوصی کے طور پر خطاب کرنا ہے تو ایک لمحے کے لئے مجھ پر صورت حال کے ابہام نے تحیر کی کیفیت طاری کر دی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ اجتماع جس نے اپنے لئے ماڈل اسمبلی کا نام تجویز کیا ہے، یہ عالم اقوام متحدہ کی اسمبلی کے نمونے پر تیار کرے گی۔ جو دنیا کے ایسٹ پر مصر ہی مگر تعجب ہے یا اقوام متحدہ کی اسمبلی کے متعلق یہ توقع قائم کی گئی ہے کہ وہ تندہی سے اپنے طرز عمل کو آپ کے نمونے کے مطابق بنائے گی۔ آپ یقین مانیں کہ ہر وہ شخص جو اقوام متحدہ میں ہے اور یقیناً وہ مقرر بھی جو آج شام آپ سے مخاطب ہے اپنے طرز عمل اور طریق کار کو آپ کے طرز عمل کے نمونے پر ڈھالنا پسند کرے گا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسا کرنے سے وہ دنیا میں بھی اچھی زندگی بسر کرے گا اور آخرت میں بھی۔

میں یہ پیش گوئی تو نہیں کر سکتا کہ آپ لوگ اس اسمبلی میں جو فیصلے کریں گے ان کا انداز کیا ہوگا لیکن اگر انہیں اسی مثال پر قائم رہنا ہے جو اقوام متحدہ میں پیش ہوتی ہے تو پھر میں ایک پیش گوئی کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ آپ کو آپس میں اختلافات سے بھی سابقہ پڑے گا اور میں یہ پیش گوئی بھی کر سکتا ہوں کہ ان اختلافات کی بنا پر آپ کبھی کبھار اور شاید بسا اوقات اپنے آپ کو شکست خوردگی کا شکار پائیں گے پھر آپ کے سامنے بار بار سوال آئے گا کہ آیا یہ تنظیم چل سکتی ہے؟

اختلافات کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ لیکن میں ایک نقطے کے لئے فقط دو ہی صورتوں پر زیادہ توجہ کروں گا۔ ان میں سے پہلے اختلاف کی توضیح بالکل سہل ہے اور مجھے اس پر زیادہ وقت صرف کرنا نہیں پڑے گا۔ یہ اختلاف بنیادی حیثیت کا ہے جس کی مثالیں اقوام متحدہ کے ایوانوں میں بار بار ملتی ہیں۔ اور جس کے نمونے اس مجلس میں بار بار جلوہ گر ہوں گے جسے مشرق و مغرب کی آویزش کہا جاتا ہے۔

۱۔ MACINTOSH. ۲۔ PEARDON ۳۔ MR WILLIAM HENDERSON, ۴۔ MISS RUTH SCHACTER

کو وصول کر رہا ہیں۔ آج بھی ایسا نہیں ہو رہا۔ اب کسی بھی متمدن ملک میں یہ تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں کہ امیر لوگوں سے غریبوں کی نسبت زیادہ ٹیکس کیوں وصول کرنا چاہئے؟ گویا یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ دولت مند اشخاص پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تاہم یہ صورت ابھی بین الاقوامی معاشرے میں پیدا نہیں ہوئی۔ آج اقوام متحدہ کا کوئی رکن ایسا نہیں جو یہ نہ مانتا ہو کہ دنیا کا بیشتر حصہ بیماریوں کا مارا ہوا ہے، افلاس اور قحط میں مبتلا ہے اور مدد کے لئے پکار رہا ہے۔ تاہم ابھی تک یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ امداد خیرات کے طور پر دی جانی چاہئے یا دی جا رہی ہے جیسا کہ ایک یا دو صدی پہلے ٹیکس دینے والے دولت مندوں میں ہوتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ قوم کے باقی افراد کو اپنی دولت کی زکوٰۃ دے رہے ہیں۔

تقریر کا وصیت نامہ یہ ہے۔ ہم اس امداد کو خیرات تصور نہیں کرتے۔ ہم سے بین الاقوامی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ اس عام مسلمہ اصول کی تکمیل ہے کہ ہر شخص سے اس کی مقدرت کے مطابق لیا جائے اور ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔ لیکن جب زیادہ ترقی یافتہ ممالک سے یہ امداد ان ملکوں کو حق اور احسان مندی کے ساتھ قبول کی جاتی ہے، تو کئی دوسرے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا اس قسم کی امداد سیاسی مصالح کی حامل تو نہیں؟ کیا اس کے ساتھ شرائط اور قیود کی پابندیاں تو نہیں؟ آخر اس امداد کا مقصد کیا ہے؟

یہ آخری سوال بہت اہم ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں نفس مضمون سے ذرا ہٹ کر اس حقیقت کی یاد تازہ کراؤں کہ ان میں سے اکثر ممالک جب استعماری اقتدار اور غیر ملکی سامراج کے محکوم تھے۔ تو انہیں صرف خام مال مہیا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اب دو صدی سے یہ کیفیت چلی آتی ہے کہ تمام صنعتیں اور ہر قسم کی حرفتیں دنیا کے ان ملکوں میں مرتکز ہو گئی ہیں جنہیں ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے تجربے سے معلوم کر لیا ہے کہ جب تک کوئی ملک خام مال مہیا کرتا رہتا ہے اس وقت تک وہ خود کفیل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر ہمارے ملک میں کوئی ایسی ترقیاتی سکیم پیش ہوتی ہے جس کا انحصار خام اشیا کی زیادہ سے زیادہ پیداوار پر ہو تو اس کے متعلق شک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے خام مال سے فائدہ اٹھانے کے لئے خود اس ملک میں صنعت رائج کی جائے، دوسری طرف ہمیں جو امداد مل رہی ہے ——— مثال کے طور پر اقوام متحدہ ہی کو لیجئے ——— ملتی ہے اس سے ہمارے دلوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اس امداد کو خام مال مہیا کرنے کی صلاحیت بڑھانے کے بجائے اپنی صنعتی ترقی میں صرف کریں گے تو دنیا ہمیں احمق سمجھے گی۔

لہٰذا جب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دنیا کی اقتصادی ناہمواری دور کرنے کا بہترین حل کیا ہے؟ تو میں نہایت ادب سے یاد دلاؤں گا کہ سب سے پہلے بین الاقوامی معاشرے کو ان ممالک کی امداد ان وجوہ کی بنا پر کرنی چاہئے۔ جو میں واضح کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ان ممالک کو ایک دور سے نکال کر دوسرے دور میں داخل کرنا لازم ہے جو ملک صدیوں سے زرعی دور کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان میں اور ایسے ملکوں میں جو بھاپ کی دریافت کے بعد صنعتی ترقی کے میدان میں سبقت لے جا چکے ہیں اتنا ہی وسیع اور بنیادی تفاوت ہے جتنا پتھر کے زمانے اور زراعت کاری کے زمانے میں تھا۔ سوال یہ نہیں کہ یہ ممالک جس کیفیت سے گزر رہے ہیں اسی میں ان کو ترقی دی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آج کی دنیا نے صنعتی ترقی اور مشینی پیداوار کے لحاظ سے جو شکل اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی طرف صحیح رہنمائی کی جائے۔

ان تین چار معاملوں کے بارے میں اختلافات ہمیشہ رہیں گے یہ اختلافات کبھی شدید اور کبھی کم تر ہوں گے۔ یہ ان ممالک میں بھی رہیں گے جن کے درمیان بنیادی اصول پر کامل اتفاق رائے موجود ہے۔

میں کسی ایسے آزاد فکر، حسن ظن پر مبنی کسی ایسے عقیدے اور آزادی کے لئے کسی ایسے تصور سے واقف نہیں جس کے لئے امریکہ کی بہت سی ممتاز اور قابل قدر ہستیوں نے جدوجہد کی ہو یا اس کے لئے انہوں نے اپنی زندگیاں ختم کر دی ہوں۔ ہم اپنی امیدوں کے محل اسی بنیاد

دونوں میں ایسی محبت پیدا ہوئی کہ مولونیں بھی آزادی کا رشک کرنے لگیں۔ جان پہچان میں
کہیں بیاہ ہوتا تو شگون کے لئے آزادی سے سورۂ اخلاص پڑھوا کر دولہا دولہن کے منہ پر
دم کرواتیں کہ جیسا پیار اخلاص ان دونوں میاں بی بی میں ہے خدا کرے ویسا ہی دولہا دولہن
میں بھی ہو۔ مولوی مستجاب کی زندگی تو معمولی طور کی تھی جیسے میزان و منشعب کی گردان۔
وہ کبھی اپنے حالات بیان کرتے بھی تو اسی قدر کہ میں نے اتنے دنوں میں قرآن حفظ کیا۔ پھر
فارسی پڑھی۔ پھر عربی شروع کی۔ صحاح ستہ میں بخاری کا نصف اخیر رہ گیا ہے یہ ہو جائے تو
حدیث کی سند لوں۔ فرائض کے فتوے میں ہی لکھتا ہوں ایسا ہی کوئی بکھیڑے کا مناسخہ آیا تو
احتیاطاً دکھا لیا۔ فتاوی عالمگیری کے معاملات مجکو خدا کے فضل سے مستحضر ہیں جواب استفتار
لکھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی ہے وعظ میں مجکو بڑی دقت پیش آئی میں مانتا تھا کہ یہ کام
اختیار نہ کروں۔ والد صاحب نے نہ مانا تو میں نے ان ہی کی صلاح سے پہلے اپنے ہی گھر کی عورتوں
میں وعظ شروع کیا۔ عورتیں اول تو لائق کم ہوتی ہیں بلکہ نہیں ہوتیں۔ دوسرے مذہبی باتوں کی
بڑی شیدا ... میں ... رفتہ رفتہ محلے کی عورتیں جمع ہونے لگیں۔ جب عورتوں میں میرا
حجاب کھل گیا تو پھر شہر کے گرد اگرد کے دیہات میں جا جا کر وعظ کہنے لگا۔ جیسے سبزی منڈی اور
پہاڑ گنج ... اب تو خدا کے فضل سے جامع مسجد کے ... میں ... جمعے کے جمعے وعظ ہوتا ہے۔
اور لوگ گھروں میں بھی بلانے لگے ہیں۔ ... اور ... کے بھی چھ سات سبق ہوتے
ہیں۔ غرض رنگ جمتا چلا ہے۔ مستجاب کے پاس اور تھا بھی کیا کہ وہ آزادی کے سامنے بیان کرتا۔
مگر آزادی کی داستان بڑی لمبی تھی کہ وہ پہروں اپنے ماں باپ کے اختلافات کو بیان کرتی۔
اور گھنٹوں اپنے ذاتی خیالات میں مستجاب کو ... رکھتی۔ یہاں تک کہ آزادی کی باتیں سن سن کر
مستجاب کے دل میں مولونی کی طرف سے ... مولونی کے پیشے کی طرف سے از خود ایک نفرت سی
پیدا ہوئی۔ اگر آزادی کی بھی غرض ... واقع میں اس نے بڑی عمدہ تدبیر سوچی۔ اس نے
منصب ناصح نہیں اختیار کیا جس سے سننے والوں کی طبیعت میں ضد اور مخالفت پیدا ہو قصہ کہانی
... بھی کہہ گزری اور دل بھی نہ دکھایا۔ نفرت سے پیدا ہوئی بے دلی اور بے دلی سے

ہماری تنقیدی کتابیں

اچھی تنقید کی خصوصیات مسلّم ہو چکی ہیں سے زیادہ ادبی شاہ پارے ... میں کیا مقام
سمجھا جاتا ہے یہ بھی لکھا جا رہا ہے اب ترقی کر رہی ہے نہیں اپنے ذہن ... کی ملاحظے ... کتابیں پڑھیے

اندازے

وقار عظیم جتنا بڑا افسانہ نگار ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ اندازے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ افسانہ تنقید میں اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی ———

قیمت ۴/-

اردو غزل گوئی

ذوقِ خیال کا بہت بڑا شاعر ہے ساتھ ہی نقاد بھی۔ ان کی تمام تر بحثیں غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں جن میں مغربی و مشرقی تنقید کا رچا ہوا مذاق ملتا ہے فراق کو پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے قابل ذکر تمام لٹریچر کا مطالعہ کر لیا۔

قیمت ۲/-

ہماری داستانیں

اگر آپ کو داستانوں سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں اس لئے کہ سید وقار عظیم نے ان کا ادبی مرتبہ متعین کرنے میں بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے اور ہمیں بتایا ہے ہزاروں، لاکھوں صفحات پر بکھری ہوئی داستانوں میں کیا کچھ ہے۔

قیمت ۵/-

انتقاد

سید عابد علی عابد نامور شاعر، بہترین افسانہ پرداز اور بے مثل نقاد ہیں۔ ان کی تنقید میں روایتی نقادوں کی طرح ثقالت اور یبوست نہیں ہوتی۔ یہ جو بات بھی کہتے ہیں اس کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین کی یہ کتاب مقبول ہو رہی ہے

قیمت ۳/-

ادارۂ فروغ اردو لاہور

(ایبک روڈ انارکلی)

[illegible] —— ۱۹۵۰ —— پرچہ نمبر

ہفت روزہ — نصرت — لاہور

یکے از مطبوعات مکتبۂ جدید

بہت سے لوگوں اور اداروں نے نصرت کو اپنی پسند کے موافق سمجھا ہے۔ امید ہے آپ بھی اس کا باقاعدہ مطالعہ کرنا پڑھنے کی لحاظ سے پسند کریں گے۔

ایک شاعر

نصرت واقعی پیارا ہے۔ نصرت نے جو معیار پیش نظر رکھا ہے۔ آج کل ہمیشہ اس کی ضرورت تھی۔ انسانوں کے دلوں میں بہتر زندگی کے لئے آرزو پیدا کرنا اور اپنے ملک و قوم کے مسائل میں تعمیری جذبات کے ساتھ خود حصہ لینا اور دوسروں کو مائل کرنا نصرت کا مطمح نظر ہے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

ایک مصور

روحانی نشوونما اور صلاحیتوں کی تکمیل کے لیے مکتبۂ جدید نے بے مثل خدمت کی ہے اور اب ہفت روزہ نصرت بھی ان خدمات کی ایک کڑی ہے جسے فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ نصرت نے اتنے تھوڑے عرصے میں جتنی ترقی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے ایک پیغام ہے اور اس میں بصیرت کی چمک ہے۔

مصور مشرق، عبدالرحمٰن چغتائی

ایک روزنامہ

نصرت میں باقاعدہ یہ کوشش نظر آتی ہے کہ ہماری زندگی کے جو مختلف اور متنوع پہلو ہیں ان کو سامنے لایا جائے اور یوں لوگوں میں اردگرد کی زندگی میں اور خود اپنی زندگی میں دلچسپی لینے کا مذاق پیدا کیا جائے۔ —— اور یہی ایک ہفتہ وار کا صحیح تصور ہے۔

روزنامہ 'آفاق' لاہور

بدل اشتراک

فی شمارہ چھ آنے —— ایک سال کے لئے پندرہ روپے —— چھ ماہ کے لئے آٹھ روپے
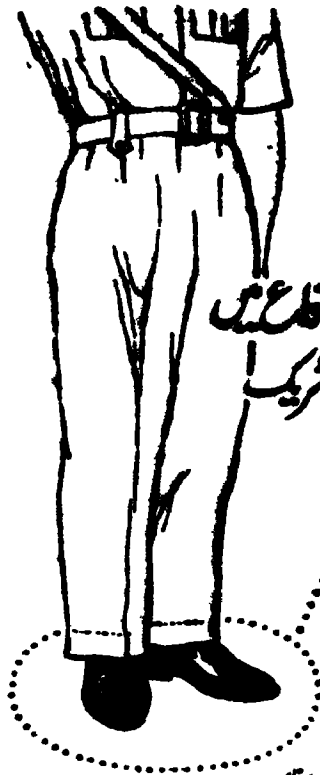
ناظم: ہفت روزہ نصرت —— ۶ —— فتح محمد روڈ —— لاہور

اپنے وطن کے دفاع میں
ہمارے شریک!

دوچار باتیں

۱۔ نقوش کا آئندہ شمارہ عام نمبر ہوگا۔ جو دیگر رسائل کے سالناموں سے زیادہ بہتر ہوگا۔ انشاءاللہ!

۲۔ عام نمبر کے بعد نقوش اپنے دس سالہ کارناموں کا انتخاب پیش کریگا جو بلاشبہ ایک کارنامہ ہوگا۔

۳۔ نقوش کا غزل نمبر کئی اہم اضافوں کے ساتھ جلد ہی مارکیٹ میں آجائیگا شاید نومبر تک۔

۴۔ افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، شخصیات نمبر (دوم) منٹو نمبر اور طنز و مزاح نمبر مل سکتے ہیں مگر صرف خریداروں کو

۵۔ نقوش کے پرانے نمبروں میں یہ شمارے بھی مل سکتے ہیں مثلاً نمبر ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴۔

۶۔ بعض دیگر نمبروں کے لئے ہماری ایجنسی طاہر نیوز ایجنسی نعل روڈ کراچی کو لکھیں شاید چند ایک شمارے مل جائیں۔

۷۔ ادارہ نقوش ڈرامہ نمبر کے لئے بھی پر تول رہا ہے۔ کچھ مشورے دیجئے، کچھ مواد کی فراہمی میں مدد کیجئے۔

۸۔ نقوش کے سابقہ کارناموں پر رائے اور آئندہ کے لئے آپ کے مشورے ہماری رہنمائی کا موجب ہوں گے۔ کچھ لکھئے تو۔

(ادارہ)

جولاہے اَور لوگوں کے ساتھ باہر صحن ہیں تھے۔ مجلس کے شروع ہونے میں کسی وجہ سے ہوئی دیر۔
جلاہوں کو اتنا ضبط کہاں۔ لگے آپس میں صلاحیں کرنے کہ آج یہ ماجرا کیا ہی؟ آخر ایک نے چاہا کہ
خود میر صاحب سے جا کر پوچھے۔ اُن تک پونہچنے کا موقع نہ تھا۔ کھڑے کھڑے اس کو خیال آیا
کہ آج کہیں چپ چپاتی مجلس نہ ہو تو پکار کر میر صاحب سے پوچھتا ہی کہ میاں جی روؤں؟
باوجودے کہ عزاداری کی مجلس تھی اور بسوریوں کا ہونا بھی سبھی کو معلوم تھا بناوٹ کا رونا کہیں
چھپ تھوڑا ہی سنبھلتا ہی لیکن جولاہے کا روؤں سن کر سب اہل مجلس بے اختیار ہنس پڑے
یہاں تک کہ میر صاحب بھی۔ انھوں [illegible] شرمندگی اُتارنے کو اپنے ہم پیشوں سے اتنا تو کہا کہ جیسا
میں عطائی مرثیہ خوان ہوں ویسے اناڑی رونے والے۔ غرض جس دن سے مولوی مستجاب نے مدرسے
میں وعظ کہنا شروع کیا ان کے والد مولوی ناصح نے اسی طرح کے اپنے سدھائے ہوئے کئی گرگے
ان کے ساتھ کر دیئے تھے۔ مستجاب کے وعظ ناغہ [illegible] پہلے ہی شکست پڑ چکے تھے۔ گرگے
بلا کے تاڑنے والے مولوی صاحب سے کہنا شروع کیا کہ [illegible] سے صاحب زادے کی طبیعت
کچھ اچاٹ سی [illegible] ہو [illegible] مولوی ناصح نے خلاف عادۃ گھر میں دوسرے تیسرے مستجاب
کے لئے کھانا رکتے ہوئے بھی دیکھا۔ کھٹکے [illegible] بیٹے سے پوچھا کیوں صاحب یہ کیا طریقہ ہی؟ دوکان
[illegible] ڈھنگ [illegible] جامع مسجد میں بھی بیچ کا در آج واعظ کے لئے معراج
ہی۔ میں نے اپنی [illegible] کی بھی جان کھپا کر تمھارے جوڑنے کی۔ چونکہ بے زحمت تم کو مل گئی تم نے
اُس کی یہ قدر کی کہ دو دو [illegible] ہو تو کیا جانتے ہو میں تو جانتا ہوں اتنی دیر بیٹھ
[illegible] کے ساتھ پاؤ کر کچ کا [illegible] کور اہیں ہوتا ہوگا۔ برخوردار اٹھارہ برس دو دو پہر برابر
اسی جگہ [illegible] کی ذرا سی بیچ میں نماز عصر کے لئے دم لیا اور پھر وعظ۔ معمول تھا کہ
رمضان میں سیپارہ شروع کیا [illegible] گھسیٹا گھسیٹا کہ مارا مار کرکے اگلے رمضان تک ایک
سیپارہ [illegible] وعظ کیا ہی لوگوں کا پالا چھوٹا ہی۔ تم کون وقتوں کے آگے ہو گئے ہو
اور ابھی نماز [illegible] میں بڑی دیر پڑی ہی۔ اتنے میں تم گئے بھی آ گئے بھی نماز بھی پڑھی اور وعظ
بھی کہا۔ کہیں حق اللسان کا عمل تو نہیں سیکھ لیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وعظ میں جانے سے
بھی تم کچھ جان سی چراتے ہو۔ اس سے بڑھکر بھی کوئی ناشکری کی بات ہوگی کہ خدا تم کو بے زحمت

بہشت ایسی ایسی نعمتیں مفت کھانے کو دے اور تم یوں بے قدری سے اُن کو لات مارو۔ اس سے
تمھارے اپنے بندہ میں وقتوں کا نقصان کیا سو کیا خوف ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کا نقصان نہ کر بیٹھو۔
بخندہ روار لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنا آسان کام نہیں ہے اس کو چاہیئے محنت۔ استقلال
تالیفِ قلوب۔ تم نے ابھی سے وہ شیوہ اختیار کیا ہے کہ اگر میں [illegible] منادی
کرنے لگوں تو تھوڑے ہی دنوں میں کوئی پاس آنے نہ دے [illegible]
اب تم بچے نہیں رہے زمانے کے رنگ کو دیکھو وقت [illegible] کیسی کیسی
مشکلات پیش آرہی ہیں۔ نصاریٰ کی عمل [illegible] اگرچہ کھلا کھلا تو
تعرض کرتے نہیں لیکن تعلیم کا اسلوب ڈھنگ ایسا ہے کہ لوگوں کو خود بخود دین سے نفرت ہوتی جاتی
ہے۔ ظاہر میں کسی پر جبر نہیں [illegible] ہیں مگر اس سے زیادہ اور کیا جبر ہوگا کہ مدرسے کا امتحان
پاس کئے بدون کسی کو نوکری نہیں ملتی۔ چاروناچار مدرسے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اور اگرچہ
مدرسے کی کتابوں میں کوئی بات خلافِ مذہب دیکھنے میں نہیں آتی مگر خدا جانے کیا تاثیر ہے کہ [illegible]
کا پڑھا ہوا اوّل تو مذہب پر قائم نہیں رہتا اور شاذ و نادر کوئی رہا بھی تو قسم کھانے کی بات ہے کہ
مولویوں کے بس کا نہیں رہتا۔ جس کو دیکھو مولویوں سے بدگمان۔ مولویوں کے ساتھ خدا واسطے
کی عداوت۔ مولویوں کی بیخ کنی پر آمادہ۔ تو اگر نظرِ غور سے دیکھو سرکاری انتظام کا لب لباب
یہ ہے کہ ہم مولوی روئے زمین کے پردے پر نہ رہنے پائیں لیکن ع دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست
بیچ میں تو مولوی کسی قدر جھوک سے بھی گئے تھے ان پر وہابیت کے الزام لگا کر انگریزوں کو بدظن
کیا۔ انگریزی خوان مسلمانوں نے بہت سر اُٹھایا۔ پادریوں نے بڑے زور مارے [illegible]
چاروں طرف سے حملے ہوتے ہوئے دیکھ کر خود بخود لوگوں میں جوشِ مذہبی پیدا ہوا۔ تائید اسلام
اور اعانت اسلام اور رعایت اسلام اور حمایت اسلام [illegible] سے جگہ جگہ انجمنیں قائم ہوئیں
قصبوں قصبوں اور شہروں شہروں انجمنوں کے وعظ گشت اور دورے کرنے لگے۔ دفتر
دفتر مذہبی مضامین اور لکچر اخباروں اور رسالوں [illegible] چھپے۔ بچوں کے لئے مناسب وقت
بہت سی کتابیں نئی نئی بن گئیں۔ تاکہ دنیاوی معلومات کے ساتھ ساتھ احکام دین سے
بھی آگہی ہوتی جائے۔ مبتدی لڑکے دین سے بے خبر مذہب سے ناواقف جو دن بھر تاریخ اور

جغرافیہ رکھیں - پھر پہر رات گئے تک حساب میں غلطاں پیچاں رہیں اور تمام عمر تحصیل میں عقائد کی بھنک تک اُن کے کان میں نہ پڑے بے ذہن نہ ہوں تو تعجب لا مذہب نہ بنیں تو اچنبھا یہ تمام چرچے جو تم دیکھتے ہو اور سُنتے ہو ہم مولویوں کے حق میں فال نیک ہے - ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ایک بار پھر مولویوں کی قدر و وقعت ہوا چاہتی ہے اور اب نہیں ہے تاہم معاش کا کوئی اور ذریعہ بہتر نہیں - لوگ ان [illegible] والوں کی طرف سے بڑے ہی دھوکے میں پڑے ہیں ایک عالم [illegible] میں گرفتار ہے کہ فارغ البالی بے نوکری کے ہونی ممکن نہیں اور نوکری بے مدرسے کی تعلیم کے - ابھی ہمارے ان اضلاع میں تو نہیں بلکہ [illegible] میں جہاں سب سے پہلی [illegible] ہے فی الواقع بعض بی اے خدمتگار بلکہ [illegible] بھی ہیں - بمبئی کلکتے میں انٹرنس [illegible] دس روپے کی نوکری کے لئے حیران [illegible] پھرتے ہیں اور نہیں ملتی - ہمارے یہاں مڈل جیسا بے قدر اور کس مپرس ہے غالباً تم بھی جانتے ہو گے - اور تم کو کچھ ان کی زحمتوں کی بھی خبر ہے - محنت کرتے کرتے مڈل والے اکثر مبہوت ہو جاتے ہیں - انٹرنس والے وہمی - بی اے سٹری - ایم اے از کار رفتہ - مولویت میں بڑی خوبی تو یہی ہے - زحمت کم بلکہ سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں اور کام یابی متیقن - اگر آدمی اتنی بھی شد بد رکھتا ہو کہ اُبجد و پڑھ سکے چاہے لکھنا بھی نہ جانتا ہو اُس کو بھی اس پیشے میں روٹیوں کی کمی نہیں اور روٹیاں بھی جوار باجرے کی نہیں بلکہ شیرمال اور باقرخانی -

مولوی ناصح تو بڑے پُرانے مشاق واعظ تھے اور خود کہتے تھے کہ ایک سیپارے کو برس روز تک گھسیٹتا ہوں ایسے آدمی کو بولنے کے لئے ایک بہانہ کافی ہے اور جب بولنا شروع کیا تو پھر کیا رکتا ہے - ناصح تو عشا تک بھی چپ نہ کرتے مگر اتنے میں موذن نے آواز دی کہ حضرۃ جماعت طیار ہے - ناصح تو نماز کے لئے تشریف لے گئے اور مستجاب نے تمام قصہ اُستانی کی بیوی کا [illegible] پھر دوہرایا - اور آج میاں بی بی کی گفتگو میں مولویت کا فیصلہ ہو [illegible] کی تقریر سُن کر کہا کہ مولوی صاحب نے کچھ بے جا بات تو نہیں کہی - اس میں شک نہیں کہ مدرسے کی پڑھائی میں محنت تو بڑی ہے - میری اماجان کے ماموزاد بھائی کو تو تم جانتے ہو جنھوں نے انگریزی میں امتحان دے کر کوئی بڑے سے بڑا خطاب حاصل کیا ہے

[illegible] نہیں۔ پانچ مہینے بیمار۔ کتاب دیکھتے دیکھتے دماغ اس قدر ضعیف ہو گیا ہے کہ
ایک منٹ درد سے نجات نہیں۔ یہ عمر ہے کہ بڑے بھائی کے دائیں داڑھ میں مگر سر کے
بال کھچڑی ہو گئے ہیں۔ اور شاید دو تین ڈاڑھیں بھی ہلتی ہیں۔ نگاہ ایسی کمزور ہے کہ سوتے
میں بھی عینک لگائے رہتے ہیں۔ ڈپٹیوں کی نوکری کے لئے شاید اور امتحان کی ضرورۃ ہے
بیچارے کتاب نہیں دیکھ سکتے اس پر بھی دو سال برابر لاہور گئے دونوں دفعہ فیل۔ اور اور
نوکریاں ملتی ہیں محنت یا کمی تنخواہ یا پردیس کی وجہ سے پسند نہیں کرتے۔ ناچار یہیں کے
مدرسے میں چالیس پچاس کی نوکری کر لی ہے۔ ان کا یہ حال دیکھ کر ہماری ننھیال کے لوگ کچھ ایسے
ڈر گئے ہیں کہ اب وہاں کوئی مدرسے کا نام بھی نہیں لیتا۔ اور واقع میں ایسی تعلیم کو لے کر
کیا چولھے میں ڈالنا ہے کہ آدمی اپنی جان کی جان ہلاک کرے اور انجام کار یہی چالیس پچاس
آٹا دال سو اس سے زیادہ تو مولوی سوتے بیٹھے کما لیتا [illegible] تمہاری آمدنی کا حساب لگایا جائے
تو میں جانتی ہوں کہ اس قدر یا اس سے کچھ ہی کم تم کو بھی پڑتا ہوگا۔ اچھا ابھی کے دن ہوئے
مستیاب۔ یہ سب سچ ہے مگر میں اس کمائی کو پسند نہیں کرتا جب [illegible] تمہارے والد
کے اعتراضات تمہاری زبان سے سنے [illegible] سے کچھ ایسا کھٹکا ہوا ہے کہ نہ تو مجھ سے
وعظ کہا جاتا ہے اور نہ پھر ابھی دعوۃ میں جانے کو جی چاہتا ہے۔ لوگ [illegible] میری تعظیم کرتے
ہیں اور میں اپنی نظروں میں آپ تھوڑا تھوڑا ہوا جاتا ہوں۔ آج کوئی پانچویں چھٹے دن کا ذکر
ہے کہ میں والد کے ساتھ دعوۃ میں گیا۔ [illegible] العلموں کی بھی دعوۃ تھی [illegible] لوگوں نے
کھانا کھایا۔ اور ہم دونوں باپ بیٹے معمول کے مطابق طالب [illegible] میں کھڑے ٹہلتے
رہے تو میں نے دیکھا کچھ لوگ صحن میں باہر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور ہماری
طرف کو دیکھتے جاتے ہیں۔ میں نے کان لگا کر سنا تو ایک شخص کہہ رہا تھا کیا بے خبری کی بات
ہے مولوی صاحب کی تو بات بھی نہ پوچھی طالب العلموں کو کھلانا شروع کر دیا۔ دوسرے نے
جواب دیا بھائی تم کو معلوم نہیں مولوی لوگ دعوۃ میں کھانا نہیں کھایا کرتے۔ ان کا حصہ ان کے
گھر جاتا ہے۔ یہ سن کر جتنے بیٹھے تھے تا بدیر کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ دیکھ کر
ہنستے رہے۔ اس سے بڑھ کر بے عزتی کی معاش اور کیا ہوگی۔ اگرچہ ہم کو نکلتے ہوئے دیکھ کر

وہ لوگ بھی ہماری تعلیم کو کھڑے ہوئے جو ہم پر ہنس رہے تھے۔ مگر تم سمجھ سکتی ہو کہ ایسی جھوٹی اور
منافقانہ تعلیم سے کیا خاک خوشی ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک مولویت کے ذریعے سے معاش پیدا کرنا کسی
طرح اور کسی پیرایے میں کیوں نہ ہو فی نفسہ بے عزتی کی بات ہے۔ مانگ کر لینا اور صورتِ سوال بنا کر
لینا لینے کا نام لینا۔ میں دونوں میں کچھ فرق نہیں سمجھتا۔ جو لوگ ہم کو دیتے ہیں وہ بھی آدمی ہیں
اور ہم بھی آدمی ہیں۔ وہی دو ہاتھ دو پاؤں اُن کے وہی دو ہاتھ دو پاؤں ہمارے۔ ہم کیوں
کسی کے دست نگر ہوں اور کس لئے اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالیں۔ آزادی۔ یہی اعتراض
تو اباجان بھی کرتے تھے مگر اباجان اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ جس طرح اور نوکریاں ہیں اسی طرح
کی نوکری مولوی گری بھی [illegible] اور اور کام نہ کئے لوگوں کو دین کی تعلیم و تلقین کی۔ اگر نوکری
میں بے عزتی نہیں ہے لیکن [illegible] مزدوری میں بے عزتی نہیں تو مولویت میں کیوں
ہونے لگی۔ مستجاب [illegible] مولویوں کی [illegible] ہوتی ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے اور خود مولویوں کو بھی
معلوم ہے کہ مولویوں کو جو کچھ دیا جاتا ہے [illegible] خیرات اور صدقہ سمجھ کر دیا جاتا ہے۔ سو میں
اس عار کو گوارا نہیں کر [illegible] بے شک یہ پیچ تو آ کر پڑا ہے ورنہ پیشہ تو بڑا شریف تھا۔
مستجاب [illegible] علم میں تو کلام نہیں مگر اس پیشے میں دو بڑے نقص ہیں۔ اول ریاکاری
کہ ایسی بری بلا ہے کہ یوں بھی آدمی کو خیال آ ہی جاتا ہے اور مولویت کے پیشے میں پڑ کر ریا سے
بچنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا کوئلے [illegible] دوکان میں رہنا اور مُونہ کو کالا نہ ہونے دینا۔ دوسرے
جب نظر پڑے گی دوسروں کے عیوب پر۔ وعظ و نصیحت اور عیب جوئی لازم و ملزوم ہیں۔
اور اس سے پیدا ہوتا ہے عُجب کہ آدمی اپنے تئیں بہتر اور برگزیدہ سمجھنے لگتا ہے۔ پس شاید وہ
دوسروں کے سنوارنے کی کوشش کرتا مگر آپ بگڑتا جاتا ہے۔ میں عالموں کی شان میں کچھ نہیں
کہہ سکتا مگر میں کیا کروں میں اپنے نفس پر مطمئن نہیں ہوں۔ آزادی۔ لوگوں کو ہدایت ہوتی
ہے۔ خدا کی نافرمانی سے بچتے ہیں۔ بھٹکے ہوئے راہ راست پر آتے ہیں۔ یہ کیا کچھ کم ثواب کا کام
ہے۔ مستجاب۔ سچ ہے مگر میرے نفس کا بھی مجھ پر حق ہے جس کی مجھ سے بازپرس ہونی ہے۔
وہی وقت جو دوسروں کی اصلاح میں صرف کرتا ہوں اپنی ہی درستی میں کیوں نہ صرف کروں
اور اگر میں اس کام کو کارِ ثواب سمجھ کر کروں تو سبحان اللہ بڑی عمدہ بات ہے مگر اس کا بھی

ہو کہ اس کو ہر یہ سمجھاؤں نہ ٹھیراؤں پیشہ نہ بناؤں۔ آزادی۔ تم نے اپنے یہ خیالات مولوی صاحب پر بھی ظاہر کیے۔ مستجاب۔ مولوی صاحب نے مجکو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ انھوں نے جو کہنا شروع کیا بس ایک تار باندھ دیا۔ اتنے میں نماز کے لیے طلبی آئی سیدھے اُٹھ کر چلے گئے۔ آزادی۔ اُن کو یہ شبہہ ہوگا کہ تم سے محنت نہیں ہو سکتی بلکہ تمھارے ساتھ مجکو بھی سمیٹ لیں تو تعجب نہیں۔ مستجاب۔ جو خیال بے اصل محض ہو زیادہ دن تک ٹھیر نہیں سکتا۔ میری بعد کی کارروائی ان کو ضرور متنبہ کر دے گی کہ اُن کا خیال غلط تھا۔ آزادی۔ متنبہ کر دے گی یا اَور اس خیال کو جما دے گی۔ دو چار دن گھر میں رہو گے آتے جاتے دیکھیں گے تو ضرور جی میں کہیں گے کہ بس گھر میں پڑے رہنے کے مزے ہیں اور میں تم سے بات کہوں صاف اگر اُن کو بار اخراجات بھی گراں گزرنے لگے تو تعجب نہیں۔ ماں باپ پر بار ڈالنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ پس اگر تم نے مولویت کا ترک کرنا ٹھان لیا ہے تو یہ بھی سمجھ لینا کہ مولوی صاحب ہمارے روادار ہونے والے نہیں۔ اور یہ کوئی الزام کی بات بھی نہیں آخر تا بکی۔ مستجاب۔ یہ میں خوب سمجھتا ہوں اور تم اتنا تو سوچو کہ میں جو مولویت سے گریز کرتا ہوں تو کیوں۔ صرف اس وجہ سے کہ طبیعت لوگوں کے احسان کی متحمل نہیں۔ پس والد کا یہ احسان میں کب گوارا کر سکتا ہوں کہ [illegible] کر سکنا [illegible] اس حالت میں کہ انھوں نے میرا بیاہ کر دیا [illegible] خیال کے سلالت [illegible] دیا۔ اور سچ پوچھو تو روٹی کے حیلے سے لگا دیا۔ اگر [illegible] کمائی نہ چاہوں تو یہ میرا قصور ہے نہ اُن کا۔ جس وقت سے میرے دل میں اس پیشے کی طرف سے کراہیہ پیدا ہوئی اُسی وقت سے میں نے علحدگی ٹھان لی۔ اور اتنے دنوں بھی تامل کیا تو تمھاری وجہ سے کہ دیکھوں تمھاری کیا رائے ہے۔ مالک مطبع محمدی سے اور مجھسے پُرانی ملاقات ہے معرفت کے درجے سے بڑھی ہوئی اور مجکو معلوم ہے کہ بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں اپنی کتابیں اسی مطبع میں چھپواتے ہیں اور وہاں تحشیہ اور تصحیح کے لئے ایک عربی دان آدمی کی ضرورت ہے بالفعل میں روپے تنخواہ ہے مگر بتدریج پچاس تک ترقی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے پندار میں اس کام کو بخوبی انجام دے سکتا ہوں ہر طرح کی کتابیں نظر سے گزرتی رہیں گی میری استعداد بھی بڑھے گی۔ اگر تمھاری صلاح ہو تو میں یہ نوکری کر لوں انتظام خانہ داری کو تم سوچ سمجھ لو۔ آزادی۔ ایسی

کون سی لمبی چوڑی خانہ داری ہے جس کے انتظام میں دقت ہوگی اس کا تو تم خیال بھی نہ کرو۔ رہی نوکری ظاہر حال ہر طرح پر عمدہ ہے کام بھی تمھاری طبیعت کے مناسب ہے ایک بڑی سرکار کے توسل کا ذریعہ ہے آیندہ کی ترقی کے لحاظ سے تنخواہ بھی کچھ ایسی تھوڑی نہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ ایک دوست کی ماتحتی ہے دوستی میں برابری کا داعیہ ہوتا ہے نوکری میں وہ داعیہ قائم رہ نہیں سکتا۔ مستجاب۔ وہ کام جو مجکو کرنا پڑے گا اُس میں مالک مطبع کو کچھ دخل نہیں ان کی ماتحتی صرف برائے نام ہے۔ اصلی تعلق تو نواب صاحب سے رہیگا۔ اور اگر ایک دوست کی ماتحتی ہو بھی تو اس سے بدرجہا [illegible] ہے یا ایک ایک دو دو وقت کے کھانے کے لئے ہر کس و ناکس کا احسان مند ہونا [illegible] ہے۔ ایک خیال مولوی صاحب کی نارضامندی کا بھی ہے [illegible] شاید [illegible] کے خلاف ہو۔ مستجاب۔ شاید کا کیا محل ہے؟ نوکری یقیناً اُن کی [illegible] ہوگی مگر [illegible] ذریعہ معاش کا متعین کرنا میرا کام ہے البتہ [illegible] صحیح نہ ہو اور جاندلی تعزز کو بٹہ نہ لگے۔ سو ان دونوں میں کوئی سی بات بھی نہیں۔ اور پھر باپ کی ناراضمندی کیا؟ دو چار دن ناخوش رہ کر آپ ہی مہربان ہوجائیں گے۔ اور جب ان کو میری وجوہ معلوم ہوں گی تو عجب نہیں دل میں قائل بھی ہوں ✤

آٹھویں فصل [illegible] مستجاب نوکر ہوکر بھوپال گئے۔ نوکری کی کیفیت

غرض مستجاب [illegible] مطبع کی نوکری کرلی اور چونکہ باپ کے حکم کے نہیں بلکہ ان کی رائے کے خلاف کی تھی اُس کو ایسی اچھی طرح نباہا جو نباہنے کا حق تھا۔ اور چھ مہینے نہ گزرنے پائے تھے کہ مولوی صاحب کے بیاس ہوگئے۔ کچھ عرصے کے بعد تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ نواب صاحب گویا ڈھانچ بناکر کھڑا کردیتے اور مولوی مستجاب تحشیے[۱] سے اُس میں جان ڈالتے۔ نواب صاحب کی کتنی کتابیں ایسی دیکھنے میں آئیں کہ مولوی مستجاب کی تقریظ لب لباب اور نفس کتاب پھوک۔ حواشی دل چسپ ہیں اور متن خبر۔ مولوی مستجاب کی نوکری کے تیسرے برس نواب صاحب نے ایک بڑے معرکے کی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اور چاہا جتنے بڑے بڑے مسائل ہیں جیسے تقلید

[۱] تحشیہ۔ حاشیہ چڑھانا ۱۲

الفتہ - رفع یدین - آمین بالجہر - طریقۂ صوفیہ - بیعۃ - جہاد - ربوا - تشبہ بالنصاری - مواکلۃ بالنصاری - اولوالامر وغیرہ وغیرہ کوئی اس کتاب سے چھوٹنے نہ پائے - اور یہ کتاب ایسی جامع ہو کہ چودھویں صدی کے مسلمانوں کو اس کے ہوتے کسی اور دینی کتاب کی حاجۃ باقی نہ رہے - یہ اتنا بڑا قصد تھا کہ اکیلے نواب [illegible] اس کی تکمیل ذری دشوار سی تھی اور مولوی مستجاب سے بہتر مددگار کا ملنا اُس [illegible] گوار - آخر مولوی صاحب کی طلبی کا تار آیا اور تار کے ساتھ زاد راہ - اور بعد کو خط [illegible] میں تفصیل لکھ آئی کہ تمہارے بلانے سے یہ غرض ہی - سو روپیے تنخواہ - کھانا اور رہنا سرکار کے ساتھ - کئی شخصوں نے بھوپال سے یہ بھی لکھا اور کچھ دیکھ سمجھ کر ہی لکھا ہوگا کہ سرکار تمہاری پرداخت کی طرف اس قدر ملتفت ہیں کہ عجب نہیں آنے کے ساتھ قاضی القضاۃ کی خدمۃ پر مامور فرما دیں - اور یہاں خاص خاص لوگوں کی بھی یہی رائے ہی - یہ سب ترغیبات ایک طرف تھیں اور بی بی کی ممانعۃ ایک طرف - مولوی مستجاب انکار کرنے ہی کو تھے کہ لوگوں نے سمجھایا کہ یہاں سے دھر بھوپال تک ریل ہی صرف ایک شبانہ روز کا سفر - مسلمان کی عملداری - رئیسہ کا شوہر سیاہ سفید کا مختار کل یوں بآرزو بلائے اور جانے میں تامل کیا جائے اپنی سمجھ میں تو نہیں آتا - ایسے مواقع ہمیشہ نہیں ملتے - تنہائی کا خیال ہو تو گھر کے لوگوں کو ساتھ لیتے جائیے - یا وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر بلوا بھیجیے - کیا معلوم آپ کی ذات سے کس کس کو نفع پہنچوانا منظور ہے اپنی قدرۃ سے یہ سامان کیا ہی - جائیے اور بے تامل جائیے اور ضرور جائیے اور جلد جائیے - ساری دنیا اگر جائیے جائیے کرتی تو مولوی مستجاب گھر سے نکلنے کی حامی نہ بھرتے - مگر بی بی سے صلاح لی اور اُن کے لئے اصل میں اُسی کی صلاح صلاح تھی - تو آزادی نے کہا کہ میں اندرون دل سے تو رضامند نہیں ہوں مگر کیا مرد کیا عورۃ - کیا اپنے کیا بیگانے سبھوں نے تو تمہاری جان کھا رکھی ہی کہ کہیں بھیج بھی چکو - میں نہیں جانتی لوگوں کو ایسی کاہے کی جلدی ہی؟ اور تم جانتے کے ساتھ ساری دلی کو ایسے کیا بھاگ لگا دوگے کہ جو آتا ہی یہی پوچھتا ہوا آتا ہی - ابھی گئے نہیں؟ اصل خیر سے کب سدھاریں گے؟ کہیں خدانخواستہ منع تو نہیں کر بھیجا؟ جانے کی صلاح بکی تو ہے نہ؟ پھر اس ہفتے کو یا جمعرات کو؟ ایسی حالۃ میں کہ جب ساری دنیا

ایک زبان جاؤ جاؤ بول رہی ہے۔ میں اکیلی سب کے خلاف کیوں کر کہوں کہ نہ جاؤ؟ [illegible]
اَوروں کی تو کیا کہوں خود مولوی صاحب اور اماں جان سب کو یہی شبہہ ہے کہ میں نے کہہ کہہ کر
وعظ چھڑایا۔ میں نے کہہ کہہ کر نوکری کرائی۔ بارے شکر ہے کہ نوکری میں کوئی اتفاق [illegible]
نہیں آیا ورنہ لوگ تو مارے طعنوں کے میرا جینا دشوار کر دیتے۔ نہ صاحب دل پر تمہارے
جانے کا جیسا کچھ صدمہ ہے سو ہے۔ میں تو اپنے مونہہ سے کوئی ایسا لفظ نکال نہیں سکتی کہ کل کلاں کو
قسم کھانے کی جگہ نہ رہے۔ اور میں خوب سمجھتی ہوں کہ تم سے بھی رکا نہیں جائے گا۔ موقع ہی
ایسا آکر پڑا ہے۔ جاؤ اللہ بیلی خدا کو سونپا۔ خدا حافظ و ناصر۔ میں نے میاں بی بی کے حقوق
کتابوں میں پڑھے اور وعظوں میں سنے ہیں [illegible] تولے دے کر تم پر ایک ہی حق مہر ہے اور بس
سو میں تو پکارے کہتی ہوں کہ [illegible] اپنا حق مہر خوشی اور رضامندی سے تم کو معاف کیا۔ لیکن
تمہارے مجھ پر بہت سے [illegible] ایسے کہ کسی بندے کے کسی بندے پر نہیں۔ اور میں خوب
جانتی ہوں کہ میں تمہارے حقوق کی قرضدار ہوں۔ میں نے اپنے میکے میں جا کر تمہاری
غیبتیں کی ہوں گی۔ اور کون سی عورت ہے جو نہیں کرتی؟ کسی بات میں قصور شاید تمہاری
ابہنوں کا ہو اور میں نے تمہاری طرف گمان بد کر لیا۔ شاید میں نے کوئی بے جا فرمائش کی
اور تم اس کو پورا نہ کر سکے اور میں ناحق ناخوش ہوئی۔ تم نے کوئی چیز لا کر دی اور مجھ کو گزار
نہ ہوئی۔ تمہاری خدمت کے بجا لانے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ ایک وقت تمہارا حکم نہ مانا۔
تمہارا ادب نہ کیا۔ ایسی ایسی سیکڑوں ہزاروں باتیں ہیں۔ غرض میں تو بال بال تمہاری گنہگار
ہوں۔ اور اس وقت ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ للہ مجھ کو معاف کرنا۔ زندگی کا کچھ بھروسا نہیں۔
کیا معلوم اب کے بچھڑے ہم پھر بھی اس دنیا میں ملیں گے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو میں تمہارے
پیچھے مر جاؤں اور تمہارے حقوق میری گردن پر رہیں۔ معاف کیا؟ مونہہ سے کہو کہ معاف کیا
اور دل سے معاف کیا۔ آزادی نے جو ایسے دردناک طور پر رخصت کی تقریر کی مولوی مستجاب
سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ روئے اور اس قدر روئے کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ ادھر آزادی
کی یہ کیفیت تھی کہ ہر چند مونہہ کو بھینچتی جی کو تسلی دیتی اور خیال کو دوسری طرف مصروف کرتی
ہے اٹھ کر پانی بھی پیا ایک جگہ سے دوسری جگہ بھی ہو بیٹھی مگر طبیعت ہے کہ کسی طرح قابو میں

نہیں آتی اور چیخ ہو کر بے اختیار نکل نکل جاتی ہی۔ آخر بڑی دیر بعد مولوی مستجاب ہی سنبھلے اور
لگے کہنے تم اس قدر بے قرار کیوں ہوتی ہو میں تو تم کو ساتھ لے چلتا مگر پھر اجنبی شہر ہی اور ہرچند
نواب صاحب سے خط وکتابت بہت کچھ ہی لیکن کبھی ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔ اُنھوں نے مجھے
نہیں دیکھا۔ مجکو اُن کی خدمت میں نیاز نہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ جاتے کے ساتھ مکان وغیرہ
کا ٹھیک ٹھاک کر کے تم کو بلواتا ہوں۔ آخر نوکری سے پہلے ہفتے ہفتے دو دو ہفتے وعظ کی
تقریب سے میں دیہات میں رہتا ہی تھا۔ تم سمجھنا اب بھی وعظ کو گیا ہی۔ اور اگر خدانخواستہ
تمھارے بلانے کا موقع نہ ہوا تو آٹھویں دن مجکو یہیں کھڑا ہوا دیکھنا۔ کیسی نوکری اور کہاں
کی چاکری ہی اگر وہ مجکو ریاست بھر پال بھی دیں گے تو [illegible] ی۔ یہ تو
میں جانتی ہوں کہ تم اطمینان سے بیٹھ کر مجکو ضرور بلا ئو گے [illegible] یہاں [illegible] کو بھی کیا کروں گی تم
اِدھر تم سدھارے اور میں نے چیز بست [illegible] در چلنے کی تیاری
کی۔ لیکن خدا جانے اس وقت کچھ ایسا ہی خیال آ گیا [illegible] ر چونکہ مجھے
روتا ہوا دیکھ کر تمھارا بھی جی بھر آیا تو میں اب نہیں رووں گی [illegible] بی ہنسی خوشی سدھارو۔
جس طرح پیٹھ دکھا کے جاتے ہو خدا وہ دن کرے کہ اسی طرح لوٹ کر [illegible] سے تو کہہ دیا
تھا کہ اب میں نہیں رووں گی مگر جوں مستجاب لے چلے ہو گئے ستودعکم اللہ[۱]۔ کہا آخری سلام کیا
اور دعاے رخصت پڑھی۔ اللّٰھم وجھنی الی الخیر اللّٰھم انت الصاحب فی السفر والخلیفۃ فی المال
والاہل[۲]۔ آزادی کی تو پھر وہی کیفیت ہو گئی بلکہ اُس سے [illegible] پیچھے پیچھے دروازے
تک چلی گئی۔ گلی کے نکڑ تک کھڑی دیکھا کی۔ اور لوٹ کر گھر میں آئی تو فرش پر اوندھے مونہ گر پڑی
وہ خود نہیں سمجھتی تھی کہ اُس کا دل آپ ہی آپ [illegible] قدر کیوں امڈا چلا آتا ہی [illegible]
محبت کا قاعدہ بھی کچھ ایسا ہی دیکھنے میں آیا کہ چپکے چپکے دل میں جگہ کر لی جاتی ہی اور انسان
کو اپنی شیفتگی اور فریفتگی اور گرویدگی کا شعور نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے آزادی کو معلوم
نہیں ہوا کہ اس کو مستجاب کے ساتھ ایسا قوی تعلق ہی۔ میاں بی بی راضی خوشی ایک جگہ رہتے تھے

---

[۱] میں تم کو خدا کے حوالے کرتا ہوں ۱۲
[۲] اے خدا مجکو بہتری کی طرف متوجہ کر۔ اے خدا تو سفر کا ساتھی اور مال اور اہل وعیال میں خلیفہ اور جانشین ہی +

اتنی مدۃ میں کبھی کسی بات پر جھگڑا یا تکرار ہوا ہی نہیں - اس کو ہمہ وقت اُس کی رضاجوئی منظور
اُس کو اس کی خاطرداری ملحوظ - یہ اُس کی مداح - وہ اس کا ثناخواں - مُونہہ پر کم اور پیٹھ پیچھے
زیادہ - یہ اُس کو دیکھ کر نہال وہ اس سے مل کر باغ باغ - علحدگی ہوئی تو جانا کہ نِرے میاں بی بی
نہ تھے بلکہ لیلی مجنوں کی طرح ایک دوسرے کے عاشقِ زار - جدائی پیش آئی تو معلوم ہوا کہ صرف
زن و شو نہ تھے بلکہ شیریں و فرہاد کی مانند یہ اُس پر قربان وہ اس پر نثار - ہم جتنے دنیادار ہیں
ویسی ہی غلطی میں مبتلا اور اسی طرح کے دھوکے میں گرفتار ہیں - دنیا میں رہ کر طرح طرح کے
تعلقات پیدا کر لیتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہم نے ان کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے - انواع و اقسام
کے بکھیڑے اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ ناحق کا بوجھ ہم نے اپنے سر پر اُٹھا رکھا
ہے - شاموں شام مولوی مستجاب روانہ ہوئے - آزادی نے اُس رات نہ کچھ کھایا نہ پیا کچھ روئی
کچھ سوئی - صبح اُٹھی تو لگی جی ہی جی [illegible] کرنے کہ بس اب دن بھر کا واسطہ آڈر ہے
خدا خیر رکھے تو عصر کی نماز [illegible] جا پڑھیں گے - اُترتے کے ساتھ ایک روپیہ کا تار
دیں گے [illegible] پڑھ چکی ہوں گی یا پڑھ رہی ہوں گی کہ رسید آجائے گی
کیا [illegible] ہوئی ہو ہیں نے کل [illegible] یا شام کا انتظار یوں بھی کرنا پڑے گا اور دوں بھی
کرنا پڑتا [illegible] پھر تا یا ہے - وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا - انسان بڑا ہی جلد باز ہے - آزادی نے صبح
[illegible] شام منانی شروع کی اور وہ دن اُس کے لئے ایک پہاڑ ہو گیا کہ کسی طرح کٹتا ہی نہ تھا - آج
اُس کو دنیا کے [illegible] بدلے ہوئے [illegible] ہوئے - وہ اپنی دُھن میں یہ تو سمجھتی نہ تھی
کہ آپ غلطی کرتی ہے لوگوں کو تعیین وقت میں غلطی کا ملزم ٹھیراتی تھی - وہ ایک دفعہ گھر کی ماماؤں
سے بگڑ کر بولی کہ تم کو اتنا خیال نہیں کہ رات قلیل تک میرے مونہہ میں اُڑ کر نہیں گئی اور تم
فراغت سے میٹھی نیند قلمتے ہانک رہی ہو - کون وقتوں کی صبح ہوئی ہے؟ کسی کو بھی ہنڈیا
چولھے کا فکر ہے - ابھی تو رمضان میں بہت دن پڑے ہیں - مامائیں یہ سن کر سٹ پٹا سی گئیں
اور ایک برقع سر پر ڈال گوشت ترکاری لینے بازار دوڑی گئی اور اُلٹے پانو پھر آئی کہ اس سرے
سے اس سرے تک کسی کی دوکان نہیں کھلی - نماز ظہر کے لئے اُس نے کئی بار مسجد میں پچھوایا
کہ کہیں موذن سو تو نہیں گیا - آزادی کو تو جلدی کرنے کی خیر ایک خاص وجہ بھی تھی کہ وہ

مہماں کے پہونچنے کے تار کی منتظر تھی اُس کا انتظار بھی واجب۔ اور اس کی جلدی بھی حق بجانب۔ مگر نہیں۔ آدمی کی کچھ خلقت بھی اسی طرح کی واقع ہوئی ہی۔ کہ وہ ہر ایک کام کو چاہتا ہی کہ اترسوں کا ہوتا پرسوں اور پرسوں کا ہوتا کل اور کل کا ہوتا آج اور آج کا ہوتا اب بھی اسی دم ہو جاے۔ طالب العلم اس فکر میں ہی کہ کب [illegible] سے فارغ ہو اور فضیلت کی پگڑی سر پر بندھے۔ دس والا اس کے لیے مستعجل ہی۔ انٹرنس والا ایف [illegible] کے لیے جلدی مچا رہا ہی۔ نوجوان آدمی کہتا ہی کب بڑا ہوں کب بیاہا جاوں۔ [illegible] میں کئی کئی بار جیب میں پڑا پکڑ کر دیکھتا ہی کہ کتنے بڑھے۔ سوداگر مال کی نکاسی کے لیے [illegible] ہی۔ ساہوکار سود کی قسط کے لیے بے قرار۔ غرض [illegible] انسان بھی عجیب مخلوق ہیں جن چیزوں کا ہونا ممکن ہی ان کو چاہتا ہی کہ ہوں۔ اور جس کا ہونا متیقن ہی اُس کی طرف سے مطمئن ہی کہ گویا نہیں ہوگی یعنی موت۔ اسی مطلب کو اسد اللہ خاں غالبؔ کیا ہی عمدہ طور پر ادا کیا ہی

موت کی راہ [illegible] دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے ۔۔۔ تم کو چاہوں کہ نہ آئے تو بلائے نہ بنے

[illegible] اضطراب اور اضطرار دیکھ دیکھ کر ہم کو یہ خیال آتا تھا کہ جہاں ریل نہیں تار نہیں وہاں کے لوگوں میں پیار اخلاص نہ ہوتا ہوگا۔ اور پیار اخلاص ہوتا ہی تو اُن کو سفر پیش نہیں آتا ہوگا۔ [illegible] تو آزادی جیسے لوگ زندہ نہ رہتے ہوں گے۔ بھلا ہوا کہ اُدھر مغرب کی اذان ہو رہی تھی اِدھر خیریت سے پہونچنے کا تار آگیا کہ آزادی نے اطمینان سے نماز پڑھی۔ میرے دن سے لگاتار خط آنے شروع ہوئے ہر روز ایک تو ضرور اور کبھی دو بھی۔ مولوی مستجاب نے لکھا کہ نواب صاحب نے مجکو اس قدر عزۃ و توقیر سے لیا کہ اُس کا عشر عشیر بھی میرے خیال میں نہ تھا۔ مجکو اپنے آرام گاہ خاص میں ٹھیرایا اور گفت وگو اور نشست وبرخاست میں میرے ساتھ مدارات بالمساواۃ کی جاتی ہی۔ اور چوں [illegible] بہت بڑے عالم اور علم دوست [illegible] مولوی اس کثرۃ سے جمع ہیں کہ صرف مولوی ہونا یہاں کوئی امتیاز کی بات نہیں یہ حکایت واقعی ہی کہ کسی ایجنٹ نے ایک بابو کو اپنا دباؤ ڈال کر کسی عدالت کا ناظم مقرر کرادیا۔ اُس نے اجلاس کا پہلا روبکار جو نواب [illegible] کی پیشی میں آیا تو اس کے نام کے ساتھ مولوی کا خطاب [illegible] روبکار نویس

ایک نا واقف اور بد استعداد سا آدمی ہی اس نے دیکھا کہ جتنے عہدہ داران ناظم ہیں سب مولوی لکھے جاتے ہیں بلکہ بڑی تنخواہ کے عملے بھی۔ سمجھا کہ مولوی منصبی خطاب ہی لازمۂ خدمت۔ بیچارے نے پارسی ناظم کو بھی مولوی لکھ دیا۔ بہت دنوں تک لوگوں میں اس کی ہنسی رہی اور ہنسی کی بات ہی تھی۔ کیونکہ پارسی مذہب کے اعتبار سے اصل میں تو بُت پرست ہیں مگر ہندو بنے لئے ہوئے اور وضع اور طرزِ تمدن کے لحاظ سے انگریز۔ اور ایک ظریف نے ان کی شان میں بالکل ٹھیک کہا کہ اگر پارسی [illegible] انگریزیت کو تفریق کریں تو جو باقی بچے گا وہ ہندو ہوگا۔ بہرکیف پارسی کا ظاہر انگریزوں سے ملتا ہوا ہی اور باطن ہندوؤں [illegible]۔ ایسے کو مولویت سے جو مسلمانوں کا مذہبی خطاب ہی کیا مناسبت؟ لیکن جب میں نے سنا کہ انگریز [illegible] رئیسوں کو ہمیشہ سے خان بہادر کا خطاب دیتی چلی آئی اور جب سے شمس [illegible] کا خطاب ایجاد ہوا کئی پارسی شمس [illegible] ہو گئے تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ روزنامچہ نویس کا مولوی انگریزوں کے شمس [illegible] سے زیادہ بے جوڑ نہیں۔ خیر یہ تو [illegible] تھا۔ میں مولوی نہیں ہوں مگر لوگ مجکو بھی مولوی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہیں نہیں بلکہ تمھاری دلی میں بھی۔ مجکو یہ بات کہنی زیبا نہیں مگر کیا کروں میرا اصلی خیال یہ ہی کہ مولویوں کا اتنا ازدحام اندیشے کا محل ہی اور خطر کا مقام۔ نتیجہ حاصل تو یہ ہی کہ انتظام میں تعصب کا رنگ جھلک رہا ہی خدا خیر کرے۔ نواب صاحب نے مجکو بلایا تو اسی غرض سے ہی کہ تصنیف وتالیف میں ان کی پیش دستی کروں مگر کسی وقت وہ ایسی باتیں بھی کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہی کہ کچہری کی کسی خدمت پر [illegible] سردست کوئی معزز نوکری خالی سُنی نہیں گئی۔ لیکن اگر ان کو میری پرداخت منظور ہوگی تو میرے لئے نئے عہدے کا تصنیف کر لینا کتاب کے تصنیف کر [illegible] آسان ہی۔ لوگ ایسی بہت سی مثالیں بیان کرتے [illegible] والا تنخواہ [illegible] اصلی خدمتوں میں گنجایش نہ ہوئی تو کوئی [illegible] بنا [illegible] سے پچھلاں بحث نہیں ہی جس کی جو تنخواہ مقرر ہوجاتی ہی ہی کام ہو یا نہ ہو۔ مگر میں نکما بیٹھا ہوا گھبراتا ہوں۔ یا تو کہہ سن کر کوئی کام لوں گا یا یہاں کے دستور کے مطابق تنخواہ سے کام رکھوں گا۔ لیکن جب تک ان میں سے کوئی

ایک طرح متعین ہو تمھارا بلانا مصلحتہ نہیں سمجھتا بلکہ موقع پا کر نواب صاحب سے کہہ کر فیس گزار بھی کر دوں گا - اسی لیت و لعل میں چھ مہینے گزر گئے نہ تو کتاب ہی شروع ہوئی اور نہ مہری کا کوئی کام ملا - دونوں وقت منہ میں سرکار کے ساتھ [illegible] پاب تنخواہ کو اور نکمے پڑے ایڈ اکرو - مستجاب کہتے کہتے ملول [illegible] بیٹھے بیٹھے اکتا گئے پر نواب صاحب وعدہ کرتے کرتے نہ تھکے [illegible] عرض کیا ان [illegible] یاد دلایا جدا جاہا پرسوں جد غریب مستجاب [illegible] بیچارے آزادی کو کیا معلوم کہ ہندوستانی سرکار [illegible] میں فردا سے قیامت کو کل [illegible] سوں کو پرسوں کہتے ہیں - تنخواہ کی ترقی اور مصاحبت اور آیندہ کی توقعات [illegible] آزادی اور دوسرے ملاقہ واسوں اور خواہی نخواہی زبردستی کے امیدواروں [illegible] ہی تھی روز کی ٹال مٹول آج دن کی وعدہ خلافی [illegible] بناخوشی ہو گئی - توقع کی جگہ نا امیدی پیدا ہوئی اور شکر گزاری کے عوض شکایت - بات یہ تھی کہ نواب صاحب بڑے عالم [illegible] بڑے لائق - بڑے تجربہ کار - بڑے مدبر - بڑے منتظم سب کچھ تھے اور اختیارات بھی ان کے اس قدر وسیع کہ گویا خود رئیس مستقل بالذات ہیں - لیکن ریاست کی افتاد آج سے نہیں بلکہ شروع سے کچھ ایسی بگڑی ہوئی تھی کہ کسی تدبیر سے انتظام درست بیٹھتا ہی نہ تھا - سیکڑوں سازشیں ہزاروں گھاتیں - جتنے منہ اتنی باتیں - خدا [illegible] ان صحبتوں کا اثر تھا یا نواب صاحب کی طبیعت ہی اسی طرح کی واقع ہوئی تھی کہ چاہتے اور نہ کر سکتے ارادہ کرتے اور رک جاتے مزاج پر اس قدر وہم غالب ہو گیا تھا کہ ہر چیز میں شک ہر بات میں شبہہ - شاکت ثم انہ شاک[1] [illegible] - مستجاب یہ رنگ دیکھ کر بہت ہی متاذی ہوا - مگر آ پھنسا تھا نہ پائے رفتن [illegible] ماندن - اس نے آزادی کو وہاں کے حالات لکھے تو سہی مگر دبی زبان سے - کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ پوست کندہ لکھوں گا تو سوائے اس کے کہ وہ وزارۃ کو بھی حقارۃ کی نظر سے دیکھے اور کیا ہوتا ہے - نوکری اور تنخواہ اور تقرب کسی چیز کی وقعت تو دل میں باقی رہی نہ تھی مگر مشکل یہ آ کر پڑی تھی کہ جا بھی نہیں سکتا [illegible] یا ارادۃ رخصت با جازۃ - اجازۃ لے تو کیا کہہ کر لے

[1] شک تو کر رہے ہیں پھر اس میں بھی شک ہے کہ ہم کو شک ہو یا نہیں !!

نویں فصل مولوی مستجاب نے بھوپال میں انتقال کیا۔ آزادی کی بیوگی۔

[illegible] آئی [illegible] تھا کہ شروع شعبان سے رمضان کی طیاریاں ہونے لگیں [illegible] ہوا کہ [illegible] بند [illegible] اور جتنے ملازم باہر کے ہیں سب کو عام اجازۃ [illegible] کی جس کا جی چاہے [illegible] اپنے گھر جا کر [illegible] کے لئے قیدیوں کی فہرست [illegible] ہوئی کہ بیس بیس پچیس پچیس ہر روز بوقت افطار چھوڑے جائیں اور جو باقی بچیں [illegible] عید الفطر تقسیم ہو اور ادھر بندی آزاد۔ یہ سن کر مستجاب کی جان میں جان آئی کہ بس اب خدا نے نجاۃ دی۔ پھر اس کو شک ہوا اور نواب صاحب کے مصاحب کو کیا اتنا بھی تنگ نہ ہوتا کہ کہیں ملازم سے اہل خدمات مراد نہ ہوں۔ مجھ سے تو کوئی خدمۃ متعلق نہیں چاہا کہ لفظ ملازم کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھ کر نواب صاحب کے ملاحظہ میں گذرانے اور عقلی دلیلوں اور نقلی روایتوں سے ثابت کرے کہ اطلاق [illegible] شرط نہیں مگر پھر خیال آیا کہ کیوں اتنا درد سر کیا غرض اصلی تو مخلصی ہی [illegible] قیدیوں کی فہرست میں نام لکھوا دینے سے بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ قیدیوں کی فہرست میں مولوی مستجاب کا نام دیکھ کر نواب صاحب چونکتے اور متنبہ تو ضرور ہوتے مگر اس سے فائدہ ہی کیا تھا؟ ان کا طریقہ تھا طبیعی تھا تو اور مجبوری سے تھا تو بہر حال تھا اضطراری۔ لیکن اس کی نوبۃ ہی نہیں آئی۔ خود نواب صاحب نے ایک دن مستجاب سے پوچھا کہئے مولوی صاحب رمضان کہاں کرنے کا ارادہ ہے؟ مستجاب کے دل میں تو آئی کہ جس طرح ہر بات کا گول مول جواب دینے کی عادۃ نواب صاحب کی ہے میں بھی ایسا ہی مبہم جواب [illegible] کہ غرہ شوال تک میرا رہنا اور جانا متحقق نہ ہو۔ مگر اس کو تو گھر کی لو لگی تھی بے [illegible] بول اٹھا۔ اَلرَّمَضَانُ فِي الْاَوْطَانِ مَعَ الْاَہْلِ وَالْخُلَّانِ۔ مستجاب نے فوراً گھر خط لکھا۔ اور لوگوں نے مستجاب کا آنا سن کر اظہار مسرۃ کیا بھی مگر آزادی بد ستور [illegible] مضطر اور بے تاب [illegible] تھی۔ بلکہ خدا جانے کس بی بی نے میاں [illegible] سے کہا کہ [illegible] صاحب خانہ کے آنے کی بھی خبر ہے تم نے

لے رمضان بال بچوں اور [illegible] کے ساتھ وطن میں ۱۲

مکان میں قلعی تو پھروالی ہوتی؟ آزادی بولی ہاں خبر تو ہی کل تنخواہ [illegible] خدا آج ہی لکھتے
ہیں کہ چاند رات تک ضرور ضرور آؤں گا۔ اجازت مل گئی [illegible]
[illegible]
نہیں معلوم کیا بات ہی میرے [illegible] نہیں لگتا [illegible] خیال [illegible]
بیٹھی تھی کہ کھول کر دیکھوں کی آپ ہی آپ دل بیٹھا سا جاتا ہی گھڑی لے کھولنے کی جی تو بہت
نہ آئی وہ دیکھو ویسی کی ویسی بند ھی رکھی [illegible] باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ڈاک کے ہرکارے
نے باہر ڈیوڑھی پر آواز دی تار آیا ہی۔ تار کا نام سنتے ہی آزادی کا رنگ فق ہوگیا۔ لگا دل دھڑکنے
ماما نے تار لاکر دیا تو ہاتھ قابو میں نہ تھا۔ پڑوس میں کوئی لڑکا انگریزی خوان رہتا تھا جلدی سے
بلاکر اُسے پڑھنے کو [illegible] جب تک وہ تار دیکھتا رہا آزادی عجیب گھبراہٹ کے ساتھ ٹکٹکی باندھے
کھڑی اس کا منہ تکتی رہی۔ زیادہ دیر ہوئی تو آزادی نے پوچھا بھئی خدا کے لئے کچھ کہو تو؟
ہی تو میرے ہی نام کا [illegible] کا ہی کیا لکھا ہی۔ لڑکے نے کہا ہی تو تمہارے ہی نام کا اور بھوپال
کے نواب صاحب [illegible] بھیجا ہی۔ اندر مولوی صاحب کا نام بھی پڑھا جاتا ہی۔ اس سے زیادہ
سمجھ میں نہیں آتا۔ کہو تو پڑھوا لاؤں۔ لڑکا تو تار پڑھوانے گیا اور یہاں وہ بی بی جو پہلے
سے آئی ہوئی آزادی کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی بولی تم اس قدر پریشان کیوں ہوتی ہو؟
نواب صاحب نے مولوی صاحب کی روانگی کی اطلاع دی ہوگی۔ آزادی کا دل بات کرنے کو
تو چاہتا نہ تھا۔ لیکن ایک دم سے ایسے صدمے کی بات یہ اپنے مونہہ سے کیونکر نکال بیٹھتی۔
اور یہ بھی خیال ہوتا تھا کہ میرے دل میں تو جس دن سے سدھارے بُری ہی بُری باتیں
چلی آرہی [illegible] خدا جانے میرے دل کو کیا ہوگیا ہی؟ کہیں یہ بھی کسی طرح کا جنوں نہ ہو؟
یا کیا معلوم جن [illegible] بیویوں کی محبت ہوتی ہوگی میاں کی مفارقت میں ان کا ایسا ہی حال
ہوتا ہوگا۔ سو مجھ کو تو خیر ایسی محبت بھی کیا تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ اُن کو کسی حالت میں میری آزردگی
گوارا نہ تھی۔ اگر [illegible] تو اُن کی طرف سے تھی۔ میری طرف سے تو محبت کی کوئی
بات نہیں ہوئی + غرض [illegible] اُس بی بی سے اتنا کہا کہ اے بی کیا تم نے
مجھ کو نرا بچہ سمجھا ہی؟ روانگی کا تار [illegible] طرف سے [illegible] کیا؟ خدا جانے
ایسی کیا آکر بنی کہ تار تک نہیں [illegible] آئی۔

گھر سے تو یہ سوچ کر آئی تھی کہ ان سے تو بیماری کا بہانہ کر دوں گی اور مرنے کی خبر ان کے میکے کہلا بھیجوں گی۔ لیکن جوں آزادی پر نظر پڑی تھی تو غیر مگر بے اختیار آزادی کو لپٹ کر رونے لگی پھر کیا تھا۔ آزادی تو دس دس مہینے سے گھٹی ہوئی بھری بیٹھی تھی ایک چیخ تو ماری پھر غش کھا کر ایسی [illegible] پلنگ پر سے گری کہ اگر اس کا دوپٹہ پائے میں الجھ نہ جائے تو زمین تھی یکی سر بے پائن پاس بوے نہ [illegible] جوان کا [illegible] گیا [illegible] اور پردیس۔ سارے شہر [illegible] پہنچ گیا۔ اور پرسے کے لئے ایک حلقۂ [illegible] اس پڑوس میں کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ آزادی کی تو رہی بات الگ اس کو مستجاب [illegible] ایک خاص تعلق تھا ایسا کہ گویا ایک جان دو قالب تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے آزادی کے دل کو بہت پہلے سے اس حادثے کی کچھ خبر سی ہو گئی تھی۔ جب مولوی مستجاب گھر سے رخصت ہونے لگے میں تو آزادی نے اسی وقت نا امیدی کی سی باتیں کی تھیں کہ کیا معلوم اب کے بچھڑے ہم پھر کبھی اس دنیا میں ملیں گے یا نہیں۔ [illegible] جس دن سے مولوی مستجاب گئے آزادی کا ایک دن بلکہ ایک لمحہ خوشی سے نہ گزرا۔ سدا مغموم۔ ہمیشہ متردد۔ اور غم بھی اس قسم کا نہیں جو اپنے پیاروں کی مفارقت کا ہوا کرتا ہے۔ بلکہ اس سے بہت زیادہ۔ کہیں بڑھا ہوا۔ [illegible] آخر کو تار آیا تو پڑھا تک نہیں گیا خود بخود اس کی حالت متغیر ہو گئی ٭ غرض آزادی کو تو بعد الیقین تھا کہ مولوی [illegible] وطن اوّل آؤں کہہ رہے تھے وطنِ اصلی کو [illegible] گئے۔ لیکن آؤر جتنے آدمی تھے اپنے عزیز۔ ملاقاتی۔ جان پہچان۔ اجنبی سبھی نے [illegible] طرح کے اشتباہات کیے۔ ایک نے کہا ضرور پڑھنے میں غلطی ہوئی ہے کل شاموں شام تو خط آیا ہے۔ اس میں بیماری کا کچھ اشارہ تک نہیں۔ دوسرا بولا خیر دفعتاً بیمار ہو جانے کا بھی مضایقہ نہیں مگر علالت کی خبر آتی تو ضرور تھی۔ تیسرا کنبے میں بہتیرے [illegible] جو میں مانا کہ گھر الگ تھا تاہم کسی مرد کے نام تار آنا چاہیتا تھا۔ چوتھا۔ اجی حضرت [illegible] کو تو یہ بات لگتی نہیں ضرور کسی دشمن کی شرارت ہے اور اگرچہ مولوی صاحب ایسے [illegible] تھے کہ کوئی اُن کا دشمن ہو مگر ہندوستانی [illegible] دشمن [illegible] ہو [illegible] سچ بولے۔ کام سے غرض رکھے۔ دیانت دار ہو۔ بھلو [illegible] ہزار دشمن۔ زمین و آسمان دشمن۔ در و دیوار دشمن۔

اور پھر سب سے بڑی عداوۃ کی وجہ نواب صاحب کا تقرب۔ ان کو نواب صاحب کے ساتھ
ہم پیالہ و ہم نوالہ دیکھ کر خدا جانے کتنے زہر کے سے گھونٹ پی پی کر رہ جاتے ہوں گے۔ غرض
وہ تار کالج کے پرنسپل پاس گیا۔ مدرسوں پاس گیا۔ پادری پاس گیا سب نے وہی پڑھا جو
اُس میں تھا کہ مولوی مستجاب نے دل کی بیماری [illegible] آج دن کے ۲ بجے انتقال کیا حالِ
مفصل خطِ متعاقب سے معلوم ہوگا۔ بعض نے یہ بھی صلاح دی تھی کہ جواب طلب تار دے کر
خبر کی تصدیق کر لو مگر وہ بات [illegible] ہی لی۔ لیکن مولوی صاحب [illegible] نے اُن کے
بیمار ہوتے ہی ایک مختصر سا [illegible] کر ڈاک میں ڈال دیا تھا کہ تار جمعہ میں مولوی صاحب [illegible]
رقت ہوئی اور اکثر ہوا کرتی تھی۔ یکایک بے ہوش ہو کر پڑے اور روح مفارقت کر گئی۔ انا للہ
و انا الیہ راجعون۔ تار کے تیسرے دن نواب صاحب نے اپنے قلم سے یہی حال لکھا [illegible]
ہی ملال ظاہر کیا۔ اور ہاں اُس خط میں یہ بھی تھا کہ مولوی صاحب کی بیوہ کو میں [illegible] روپیے
مہینا ملا کرے گا۔ جب تک دوسرا نکاح کرے ÷ آزادی کو جس وقت سے غش آیا اس کا تمام
بدن ٹھنڈا برف ہو گیا تھا اور دانت اس قدر بچی ہو گئے تھے کہ کوئی چیز حلق سے نہیں اتر سکتی
تھی۔ جب غش کو بہت دیر ہو گئی حکیم نے نبض دیکھ کر کہا کہ بارے غم کے حرارت غریزی شغاف
قلب میں مختفی ہو گئی ہے [illegible] مطلق ہو اور خوف ہی بھی اور نہیں بھی۔ ہوش میں لانے کی
تدبیریں کی جائیں۔ [illegible] صندل سنگھائی۔ گلاب کے چھینٹے دیئے۔ خس کے پنکھے
جھلے۔ پنڈلیاں باندھیں [illegible] ہتیلیوں اور تلوؤں کی مالش کی۔ مگر آزادی جیسی لکڑی
کی طرح اکڑی ہوئی پڑی تھی ساری رات اُسی وضع سے پڑی رہی۔ ذرا افاقہ نہیں مطلق
ہوش نہیں۔ اوپر والے اس جوان مرگ کو کیا روئیں کہ یہاں آنکھوں کے سامنے اس جوان
کے جینے کے لالے پڑ گئے۔ بارے صبح کی خنکی پونہچی تو آزادی نے ایک چھینک لی اور آنکھ کھول کر
دیکھا تو اپنے تئیں ماں کی گود میں پایا۔ [illegible] کے ڈر کے مارے کوئی آواز منہ سے نہیں نکال سکتا
سب کے سب دم بخود بیٹھے ہیں۔ آزادی کو ہوش تو آیا مگر عجیب طرح کا ہوش تھا۔ لیٹی تھی
اُٹھ بیٹھی۔ بولتی چالتی کچھ نہیں [illegible] روتی ہی [illegible] دل کو روتی ہی ہے۔
بُت کی طرح گم صم ایک طرف کو ٹکٹکی لگائے دیکھے جا رہی ہے۔ پلک جھپکا لی [illegible]

کو اپنا حال بتاتی۔ آخر ماں نے کہا بیٹا تم نے عشا کی نماز بھی نہیں پڑھی اب صبح کا وقت بھی تنگ ہونے کو ہے اٹھو وضو کرو نماز پڑھو یہاں نیچے آدمی بہت ہیں کوٹھے پر جاؤ نماز بھی پڑھ آؤ میں بھی چھوڑ آتی ہوں مَیں میں چلی جاؤ۔ آزادی نے اوپر جا کر وضو کیا۔ سنتیں پڑھیں۔ فرضوں کی نیت باندھی اور پہلی رکعت میں الحمد کے بعد سورۂ یوسف کا وہ مقام پڑھا جہاں حضرۃ یوسف کے بھائی باپ کو ملامت کرتے ہیں کہ یوسف کی اتنی یادگاری رکھو گے تو ایک نہ ایک دن ہلاک ہو جاؤ گے اور حضرت یعقوب [illegible] کو جواب [illegible] اِنَّمَآ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ میں تو خدا کی درگاہ میں اپنی پریشانی کی فریاد کرتا ہوں ان لفظوں [illegible] کا پڑھنا تھا کہ گویا فوارے کا منہ کھول دیا۔ آنسوؤں کی تللی اس زور سے جاری ہوئی کہ گویا [illegible] آنکھوں کی راہ پانی ہو کر بہہ جائے گا اور نالوں کا یہ جوش کہ سانس پیٹ میں نہیں سماتا کلیجہ مونہ کو نکلا آتا ہے کہتی کچھ ہے اور مونہ سے نکلتا ہے کچھ۔ مولویوں سے پوچھو تو صاف کہہ دیں گے کہ نماز نہیں ہوئی اور ہم کہتے ہیں کہ آزادی نے ساری عمر میں بس یہی ایک [illegible] ے خدا کبھی ہم کو بھی آدھی یا پوری رکعت اس خلوص اور اس استحضار کے ساتھ پڑھنی نص[illegible] ہولی۔ ادھر آزادی نماز پڑھ رہی تھی اور نیچے ریل کے بوائلر کی سی آواز چلی آتی تھی۔ [illegible] بیگم نے اسی مصلحت سے اس کو نماز کے لئے اوپر بھیج دیا تھا کہ تنہائی میں کچھ تو جی کھول کر [illegible] کہ اس کے اندر کی بھڑاس نکلے اور یوں تو گھٹے گھٹے اس کا دم [illegible] اثنا میں ایک دو عورتوں نے اوپر جانے کا قصد بھی کیا تو ہادی بیگم نے [illegible] عجب اچھے خاصے دو گھنٹے کامل گزر گئے تو ہادی بیگم خود اوپر گئی بیٹی کو دیکھا کہ [illegible] پڑی رو رہی ہے۔ اٹھا کر چھاتی سے لگایا اور جلتی ہوئی آگ کو اَور بھی بھڑکایا۔ جوں ماں نے بیٹی کو آغوش میں لیا بیٹی کا تو یہ حال ہوا جیسے کبوتر کو ذبح کر کے نیم بسمل تڑپتا ہوا چھوڑ دیں۔ ماں یہ حال دیکھ کر سہم گئی بے شک بڑی مصیبت تو آزادی پر تھی لیکن ماں پر بھی کچھ کم صدمہ نہ تھا۔ وہ مُردے کو روتی تھی اور یہ جیتے کو وہ مقتول کی عزادار تھی اور یہ مجروح کی غم خوار۔ اس کو ماتم شوہر تھا۔ اس کو غم لخت جگر بےقراری دیکھی نہیں جاتی اور تسکین کی کوئی تدبیر بن نہیں آتی۔ دور رہے دل نہیں مانتا۔

[illegible] جس میں پانی گھومتا ہے [illegible]

پاس بیٹھنے سے بیٹی کو آور ایذا ہوتی ہی اس بھید کو کوئی نہیں جانتا [illegible] چار پتھر کا دل اور فولاد کی چھاتی کرکے بیٹی کو لگی لپٹی رہتی۔ ورنہ وہ تو دیوار دن سے سر ٹکرا کر جدا جانے اپنا کیا حال کرلیتی۔ ہادی بیگم نے یہ بڑی دانشمندی کی کہ تین یا چار شبانہ روز برابر ایک دم کے لئے بیٹی سے جدا نہ ہوئی۔ نہ تو پرسہ لینے مہمانوں کے پاس جاکر بیٹھی اور نہ اُن میں سے کسی کو اپنے پاس آنے دیا + کیا برا دستور ہی نام تو کریں تعزیت کا جس کے معنے ہیں تسلی دینا۔ اور تسلی کی جگہ مرنے والے کی خوبیاں یاد دلائیں یعنی مرہم کے عوض [illegible] نون مرچیں لگائیں۔ مستجاب کو تو مارا تھا خدا نے اور آزادی کو مار رہیں یہ احمق [illegible] والیاں۔ کم بختوں کو موقع و محل کا بھی تو خیال نہیں۔ موتی میں آنا اور کپڑے بدلنا [illegible] بنانا۔ ہم تو سنتے تھے کہ عورتیں بڑی رقیق القلب ہوتی ہیں مگر آزادی کے مہمانوں کو دیکھ کر تو ہمارا خیال بالکل بدل گیا۔ سوائے اس کے کہ ڈومنیوں کا ناچ نہ تھا اور تو کوئی فرق نظر نہ آیا جس سے معلوم ہوتا کہ یہ شادی کی نہیں بلکہ غمی کی محفل ہی۔ وہی فرش۔ وہی زردہ پان۔ وہی ساز و سامان۔ وہی مہمان۔ وہی شان۔ وہی ان بان وہی قصے وہی داستان + موتی کی خبر پہنچی اور انھوں نے کپڑوں کی گٹھڑیاں پھنڈولنی شروع کیں۔ زیور کا صندوقچہ منگایا۔ اسباب کے صندوقوں میں سے ڈھونڈ کر بلیدار یا چمکی کی جوتی نکالی۔ بن سنور کر ڈولی میں بیٹھ روانہ ہوئیں۔ رستے بھر دل میں حساب کرتی گئیں کہ اس وقت کا کھانا تو میں کھا چلی ہوں۔ شام کے لئے اگر وہاں دیر ہوتی ہوئی دیکھوں گی تو پیسے بھیج دوں گی۔ یا کہلا بھیجوں گی بازار سے منگوالیں۔ غرض وہاں پہنچے پر بات سوجھا اور زیادہ وقت مل گیا تو جلدی جلدی کرکے کپڑے بدلے تھے ڈولی میں بیٹھے بیٹھے ان کو ٹھیک کیا گہنے کو سنبھالا۔ اتنے میں کہاروں نے آواز دی کہ ڈولی اُتھوالو۔ کہار مونہ پھیر کر کھڑے ہوئے بیوی [illegible] تکلف سے اتریں اور ڈیوڑھی تک پہنچتے پہنچتے مڑمڑ کر ڈولی کی طرف دیکھتی گئیں کہ کوئی چیز [illegible] نہیں گئی۔ کہار باہر ہیں اور بیوی ڈیوڑھی کے اندر گھرائے پر حجت ہو رہی ہی۔ بہتیرا [illegible] کہار کب ملتے تھے۔ آخر جو مانگا سو دیا مگر جتا کر کہ خیر موتی میں آئی ہوں اس وقت تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر محلے سے تمھارا اڈا اٹھا دوں تو سہی۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی تاکنا شروع کیا کہ پرسہ لینے والی کدھر ہیں۔ دوسروں کو

پھلا نکلتی ہوئی اُن تک پہنچیں۔ اس [illegible] ہو نہ ملال ہے۔ نہ کسی کے [illegible]
اور نہ مصیبت کا خیال ہے۔ مگر خدا [illegible] طرح کا کمال ہے کہ بیٹھتے دیر نہیں ہوئی اور [illegible]
پالی آنکھوں [illegible] کو مرتے دیکھا جو بچارے زندگی سے بھر
[illegible] دلیر لے [illegible] بیٹے پوتے پڑوتے نواسے نواسے کنبہ بھی
[illegible] جائے تو دو دو سرے باوا آدم تھے مگر عورتیں رونے پر آئیں تو ان کے
مرنے کا بھی ایک ماتم بنا کھڑا کیا۔ اور یہاں تو روداد حادثہ ہی ایسی غضب کی تھی کہ بیان کرتے
ہوئے جی لرزتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کان شق ہو جائے۔ آل صاحب کے مرنے کے بین پچھتے تو
قسم کھانے کی بات ہے کہ آزادی تو جان بر نہ ہوتی اور دو چار کو اور اپنے ساتھ لے مرتی تو بھی
عجب نہ تھا۔ لیکن بڑی خیر گزری کہ عین وقت پر ہادی بیگم کو یہ انجام سوجھ پڑا اور اُس نے
ایسی صورت ہی پیش نہ آنے دی۔ لیکن قریب کے رشتہ داروں کو تو منع بھی نہیں کیا جا سکتا
تھا اور اُن کا رنج بھی بناوٹ اور دکھاوے کا نہ تھا۔ شرع میں بین کی ممانعت ہے اور جس طرح کے
بین کئے جاتے ہیں بلا شبہ قابل ممانعت ہیں بھی۔ شارع کا منشا یہ ہے کہ اگر ہم پر کوئی مصیبت
نازل ہو تو شایانِ بندگی نہیں کہ ہم خدا سے ناراض ہوں۔ اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ ہم مصیبت میں
بھی اُس کے شکر گزار ہوں لیکن اگر اتنا نہ ہو سکے کہ آدمی بے صبر اور ضعیف الاعتقاد ہے تو منہ سے
لفظِ شکایت کا نکلنا کیا معنی دل میں بھی شکایت کا آنا بھی داخل کفر ہے۔ اور حقیقت میں جب معاذ اللہ
[illegible] نے خدا کو ظالم اور بے انصاف اور بے رحم سمجھا تو [illegible] اور کافر میں فرق بھی
کیا باقی رہا؟ ہائے میں لٹ گئی۔ اے خدا تجھ کو اتنا بھی [illegible] نہ آیا۔ تیری خدائی میں مجھ کو ایسے
کونسے بھاگ لگ گئے تھے کہ آج مجھ پر یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ [illegible] لوگو میری تو خدا بھی نہیں
سنتا [illegible] اور اس طرح کے بین آدمی کو [illegible] کافر بنا دیتے ہیں۔ یوں مطلق رونا اور رنا
اظہارِ مصیبت کا طریقہ [illegible] کا ضبط ہو سکتا ہے۔ آزادی کے
یہاں یہ مولویوں کی کہیں کہ بین نہیں ہوتے۔ ہوتے مگر [illegible] اور خلاف شرع نہیں۔ اور اس
پر بھی مولویوں نے باہر [illegible] آ منع کرنے کے لئے دروازے پر آ موجود ہوئے۔
[illegible] لوگوں نے بین [illegible] آزادی (چپکے چپکے) یا اللہ میں کیا کروں۔ تم تو بھوپال جاتے ہو

سخت رنج کیوں نہ ہو جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں اس کی گھٹی گھٹتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک
کہ مجھ [illegible] آ گئی کہ شخص اُس رنج کے پیچھے شاید خود کشی پر آمادہ تھا۔
اُس کی نظر میں بھی ایک [illegible] زیادہ اُس رنج کی وقعت باقی نہ رہے۔ جیسے زخم کہ سوزش
[illegible] ہو [illegible] ہے۔ اچھا ہوا تو صرف ایک نشان رہ گیا وہ بھی روز بروز مٹتا اور
[illegible] ہوتا چلا جاتا ہے۔ مستجاب کا مرنا اس عموم سے مخصوص اور اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھا۔
دور کے مہمان تیجا کر کے رخصت ہوئے اور اسی طرح آہستہ آہستہ ایک ایک [illegible] کر کے کھسکتے گئے
اب رہ گئی آزادی اور اُس کی ماما دی۔ کہ وہ اُس کو سلکے کی طرح لازم اور [illegible] ہمزاد کے ساتھ
ساتھ تھی۔ رنج بھی کیا بری چیز ہے۔ اتنے ہی دنوں میں آزادی کا یہ حال ہو گیا تھا جیسے برسوں کا
بیمار۔ بدن میں خون کا نام نہیں۔ رنگت دیکھو تو زرد جیسے ہلدی۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے
بیٹھنے میں ضعف تھا۔ اُٹھنے میں تکلف۔ چہرا اُترا ہوا [illegible] صورت اداس۔ ہر وقت گونگھ سی
چلی آتی ہے مگر نیند ایسی اچاٹ ہوئی ہے کہ ساری ساری رات بیٹھے اور کروٹیں بدلتے گزر جاتی ہے
ما کے اصرار سے مونہ میں نوالہ لیا ہی چاہتی ہے کہ نگلے حلق سے اُلٹا چلا آتا ہے۔ کسی نے پان بنا کر دیا
تلے ہیں تو رکھ لیا مونہ ہلانے کو جی نہیں چاہتا۔ خدا جانے کس خیال میں غرق ہے کہ لوگ پاس
بیٹھے ہوئے باتیں کرتے ہیں اور اس کو خبر تک نہیں۔ ما اُٹھا اُٹھا کے بٹھاتی ہے اور یہ گری پڑتی
ہے جب دیکھو چپ۔ جس وقت نظر کرو خاموش۔ گھڑی گھڑی ٹھنڈے [illegible] بار بار ماما
ہادی بیگم بیٹی کو دیکھ دیکھ کر سہمی چلی جاتی تھی الٰہی کیا کروں کیا نہ کروں [illegible] ہوتی تو
بلا سے اس کو باغوں میں لئے پھرتی۔ قطب صاحب کی سیر کراتی۔ شاید اس کا جی بہلتا اس کی
طبیعت سنبھلتی۔ او ما اگر چندے اس کی یہی حالت رہی تو اسی طرح گھل گھل کر ایک نہ ایک دن
تمام ہو جائے گی۔ آخر اس کے خیال میں آیا کہ اس کو مولویوں [illegible] وعظ سنواؤں۔ بس یہی
ایک تدبیر ہو نہ لگا تو تکا اور لگ گیا تو تیر ہے۔ ماما [illegible] کوڑیوں کی نہیں۔ آٹھ آنہ ورنا
نہیں تو ایک روپیہ کو صبر کرو اور جیسا چاہو مولوی بلوا لو اور [illegible] چاہو وعظ کہلوا لو۔
ہادی بیگم کے تو اپنے ہی گنے ہیں بہتیرے مولوی پھرے پڑے تھے۔ قاعدہ تو ٹوٹا تھا مگر [illegible] چلی جا
[illegible] اور [illegible] شہرہ۔ مولویوں [illegible] وعظوں کا مینہ برسا دیا۔ اور سچ

ان وعظوں نے آزادی کو فائدہ بھی بہت دیا۔ کہ [illegible]
دوا ٹھیک ہونی چاہئے حکیم کوئی [illegible] وعظ تو [illegible] لیکن دو تین وعظ
تو حقیقۃً میں بڑے ہی ہو گئے جیسے پہلا آزادی کے نا مولوی مقتدیٰ کا

دسویں فصل مولوی مقتدیٰ کی تعلیم صبر میں وعظ فرماتے ہیں

انھوں نے سورہ بقر کی یہ آیت لی۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ
وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ
أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۔ مولوی صاحب نے تحقیق لغوی اور
ترکیب نحوی اور فصاحت و بلاغت اور شان نزول اور اختلافات قرأت اور ربط سابق و لاحق کے
بعد [illegible] فرمایا بجائے خود عمدہ تھا مگر عورتوں کے وعظ میں بے محل اس قدر چھوڑ کر باقی
کو نقل کرتے ہیں مولوی صاحب نے اس طرح پر شروع کیا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ اُن مسلمانوں
کی طرف جو پیغمبر صاحب کے ہم عصر تھے خطاب کر کے فرماتا ہے لَنَبْلُوَنَّكُم ہم ضرور ضرور تم کو
آزمائیں گے۔ لَنَبْلُوَنَّ ایک لفظ ہے جس میں لام تاکید اور نون تاکید ایک چھوڑ دوہری دوہری
تاکید ہے اس سے مخاطبین کا متنبہ کرنا منظور ہے کہ ہماری بات کو سرسری اور چلتی ہوئی سی بات سمجھنا
جو ہم فرماتے ہیں ضرور ہو کر رہے گا۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ آفتاب اور ماہتاب اور
ستارے اپنی رفتار بدل دیں۔ دریا پچھم سے پورب کو بہتے بہتے الٹے بہنے لگیں۔ غرض دنیا و مافیہا
بدل جائے مگر خدا کا ایک لفظ بلکہ ایک حرف بلکہ ایک نقطہ اور ایک شوشہ نہیں بدل سکتا۔ دوسری
جگہ بھی فرمایا ہے۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ۔ اللہ کی باتوں میں ردو بدل نہیں ہوا کرتی۔ پھر اگرچہ لَنَبْلُوَنَّكُم کے
مخاطب پیغمبر صاحب کے زمانے کے مسلمان تھے مگر یہ خطاب متوجہ ہے تمام مسلمانوں کی طرف
الی یوم القیامۃ [illegible] غرض قیامت تک جتنے مسلمان زمین کے پردے پر ہوں گے سب کو آزمایا
اور سب کا امتحان لیا جائے گا۔ پس یہ ایسا امتحانِ عام ہے جس سے کوئی مسلمان بری نہیں
دوسرے ضرور امتحان [illegible] کرنے جو اب موجود ہیں ہر وقت زیرِ امتحان ہیں۔ اور جو
آیندہ ہوں گے اُن کو بھی یہ امتحان دینا ہوگا۔ [illegible] جس طرح دنیا کے امتحانوں میں پہلے

بتا دیا جاتا ہی کہ فلانے فن فلانے علم فلانی کتاب میں امتحان لیا جاے گا تا کہ امتحان دینے والا پڑھ سیکھ کر طیار [illegible] مدرسوں کے لڑکوں سے کورس کا لفظ سُنا ہوگا۔ کورس سے خاص خاص کتابیں اور کتابوں [illegible] خاص مقامات مراد ہوتے ہیں جن میں امتحان لیا جاتا ہی۔ اگر کورس مقرر نہ کیا جاے تو [illegible] مشکل پیش آئے۔ ایک علم میں بہت سی کتابیں ہوتی ہیں سب کتابوں پر ایک شخص کی نظر ایک [illegible] احاطہ نہیں کر سکتی۔ تو ضرور ہی کہ وہ بعض کو اختیار کرے لیکن اگر کورس نام زد نہ کیا جاے تو ممکن ہی کہ اس نے ایک کتاب اختیار کی اور ممتحن نے دوسری کتاب میں سے سوالات کئے تو یہ امتحان نہ ہوا بلکہ بڑی جانی [illegible] ہی جب کہ دنیا کے ممتحن اس قباحت پر نظر کر کے پہلے سے کورس مقرر کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ جل شانہ تو بڑا منصف اور بڑا رحیم امتحان لینے والا ہی اور دوسری جگہ فرماتا ہی۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ وَاِنْ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفْھَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ اللہ تو ایک رتی برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر نکوئی ہوتی ہی تو اُس کو چند در چند کر کے اپنے پاس سے بڑی اجرت عطا فرماتا ہی تو خدا نے بھی اپنے امتحان کا کورس مقرر کر کے سب ایمان والوں کو سُنا دیا۔ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ۔ ہم تمہارا امتحان کاہے میں لیں [illegible] تھوڑا ڈر تھوڑی بھوک تھوڑا گھاٹا۔ کیا شفیق پروردگار عالم ہی کہ امتحان کا نام [illegible] اور سننے کے ساتھ آدمی کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ عربی کی کہاوت [illegible] عِنْدَ الْاِمْتِحَانِ یُکْرَمُ الرَّجُلُ اَوْ یُہَانُ امتحان کے وقت آدمی کی عزت گئی یا رہی۔ تو خدا تعالیٰ نے [illegible] کے ضعف پر نظر فرما کر ارشاد کیا کہ امتحان کا نام سن کر گھبراؤ نہیں ڈرو نہیں ہم کڑا امتحان نہیں لیتے۔ زیادہ نہیں صرف تین چیزوں سے تھوڑا تھوڑا بھیج کر دیکھیں گے [illegible] خوف۔ تو اُس وقت کے مسلمان کافروں کی طرف سے ہمیشہ خائف رہتے تھے۔ اُس [illegible] عمل داری کا یہ رنگ تو تھا ہی نہیں کہ ایک بادشاہ ہی اور وہ رعایا کے [illegible] آسایش کا بندوبست رکھتا ہی سب اُس سے ڈرتے اور [illegible] ہر شخص آپ اپنا حاکم تھا وہ لوگ باپ دادوں پڑدادوں سے [illegible] پوجتے چلے آئے [illegible] گھروں اور قبیلوں میں جو بُت تھے سو تھے سیکڑوں بُت خانۂ کعبہ [illegible] بھر دیئے تھے۔ جب پیغمبر صاحب نے دعوتِ اسلام شروع کی [illegible] واحد کی پرستش کی طرف بُلایا تو وہ لوگ بہت بھنائے۔ اور

چونکہ اس جدید مذہب سے بت پرستی کی بیخ کنی اور بتوں کی توہین اور اُن کے بزرگوں کی تحقیر
لازم آتی تھی سارا ملک متفق ہوگیا کہ اس نئے مذہب کو پھیلنے اور بڑھنے نہ دیں۔ قاعدہ ہے کہ جب
کسی بات میں آدمی لاجواب ہوتا ہے تو سخن پروری کے لئے لڑائی پر اتر آتا ہے اور وہ لوگ بھی
لڑنے کو لگے پیغمبر صاحب اور ان کے ہمراہیوں سے جن کا مجموعہ اس وقت تک بہت ہی کم تھا
طرح طرح کی پرخاشیں کرنے۔ جو لوگ جماعت اور جتھے کے تھے وہ تو کسی قدر محفوظ بھی رہے باقی کوئی
متنفس مسلمان نہ تھا جس کو کافروں کے ہاتھ سے قسم قسم کی ایذائیں نہ پہنچتی ہوں۔ کافروں
نے اِن کا کھانا پینا بند کیا۔ رشتہ ناطہ چھوڑ دیا۔ اکیلے دوکیلے کو پاتے تو مارتے اور بے حرمت کرتے
مسلمانوں کی مجال نہ تھی کہ پکار کر اذان دیں یا خانہ کعبہ میں جا کر خدا کی عبادت کریں۔ مجبور مسلمان
گھر بار چھوڑ کر دین کے ڈر سے پردیس کو نکل گئے اور جو نہ جا سکے اُن کو ایسی ایسی مصیبتیں پیش آئیں
کہ اگر ان کی تفصیل بیان کی جائے تو سن کر تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ کافروں نے
مسلمانوں کو پردیس میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا ان پر چڑھ چڑھ کر آئے اور ان کے پناہ
دینے والوں کو [illegible] اور ستاتے۔ یہ سب کوششیں اس غرض سے تھیں کہ دین اسلام شائع
نہ ہو۔ لیکن جس کا خدا مددگار ہو اس سے کون برسر آ سکتا ہے۔ يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ
بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۔ کافر تو اس فکر میں ہیں کہ اللہ
کے نور کو پھونک مار کر بجھا دیں اور اللہ کو منظور نہیں وہ تو اپنے نور کو چمکا کر اور پھیلا کر
رہے گا کافروں کو برا لگے تو لگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ مسلمان جو جان کے خوف سے بھاگے
بھاگے اور چھپے چھپے پڑے پھرتے تھے خدا نے اُن کی مدد کی تو انھوں نے ملک فتح کئے اور وقت
کے بادشاہ ہو [illegible] مِنَ الْخَوْفِ۔ میں مسلمانوں کی اسی ابتدائی حالت کی طرف اشارہ ہے۔ بڑے
شکر کا مقام ہے کہ ایسی [illegible] کی حالت میں رکھ کر خدا نے ہم کو نہیں آزمایا۔ لیکن ہم کو اپنی جگہ سوچنا
اور اپنے نفس کا احتساب کرنا چاہئے کہ اگر ہماری ایسی حالت ہو تو ہم اپنے دین و ایمان پر
کہاں تک ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔ حالیہ میں تو مسلمانوں کا یہ رنگ دیکھتا ہوں کہ برادری
کے خوف سے لوگوں کے طعن [illegible] دنیا کی بدنامی کے خوف سے بہتیری باتیں خلافِ
مصلحت اور خلاف شرع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں۔ تو جن کے دل ایسے کمزور

اور ایمان اس قدر ضعیف ہیں اس خوف کی کب تاب لا سکتے ہیں جس سے خدا نے قرن اول کے مسلمانوں کو آزمایا تھا۔ دفع مضرۃ اور جلب منفعت دو چیزیں ہیں اور علم اخلاق میں ان ہی دو کو تمام انسانی خصائص کا ماخذ اور مرجع سمجھا لیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں دونوں شئی واحد ہیں اور فرق اگر ہے بھی تو اعتبار و عبارۃ کا ہے۔ کیونکہ فقدان منفعۃ بھی ایک قسم کی مضرۃ ہے۔ لیکن یہ بحث ذرا پیچیدہ ہے اور یہ موقع ایسے مباحث دقیقہ کے بیان کرنے کا نہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اخلاق والوں نے خوف اور حرص کو دو قرار دیا ہے میں ثابت کرنا چاہتا تھا کہ دونوں ایک ہیں۔ اگر ہم ایک چیز سے ڈرتے ہیں تو وہ خوف بھی منفعۃ کے زائل ہونے کا ہے۔ پس اس کو حرص سے کیوں نہ تعبیر کیا جاوے۔ غلاصہ یہ کہ میں لالچ کو بھی ایک قسم کا خوف ہی سمجھتا اور یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ جس طرح ہمار انقد ایمان الخ میں ہے چلنے کے قابل نہیں اسی طرح طمع کی کسوٹی پر کسے جانے کی بھی لایق نہیں۔ اول تو جب ایک آدمی دین میں خوف کو دخل دیتا ہے تو کیا اطمینان ہو سکتا ہے کہ وہ طمع کو دخل نہیں دے گا۔ کیا فرق ہے اگر ایک شخص فرض کرو خوف سے اسلام لائے اور دوسرا طمع سے دونوں یکساں دل کے بودے ہیں۔ وہ خوف کی مقاومۃ نہ کر سکا یہ لالچ کی۔ اسی طرح فرض کرو کہ ہم ایک چیز کو جانتے ہیں کہ مذہب کی رو سے اس کا کرنا مناسب یا جائز ہے اور ہم لوگوں کے خوف سے اس کو نہ کریں تو یہ اس بات کی شناخت ہے کہ اگر ہم کو اس کے نہ کرنے کے لئے خوف کی عوض طمع دی جاتی تو جیسے ہم ڈر کر اس کے کرنے سے باز رہے اسی طرح لالچ میں بھی آکر اس کے کرنے سے باز رہتے۔ اب دیکھو کہ اس ملک میں اسلام کے کتنے مخالف ہیں۔ اول سب سے زیادہ ہندو جن میں ہم کو چار و ناچار رہنا ہے۔ [illegible] ہم کو پورا اطمینان ہے کہ ذرا کوئی لالچ دکھا کر کسی طرح ہم کو اپنے [illegible] ہی نہیں سکتے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہندوؤں نے ہماری کون سی رسمیں اختیار کی ہیں۔ ہم تو ان کے ساتھ رہ کر آدھے ہندو ضرور ہو گئے ہیں۔ خوف نہیں لالچ نہیں اور ہم آدھے ہندو بن گئے تو خوف اور لالچ کی صورۃ میں کیا عجب تھا کہ کھلم کھلا بتوں کو پوجنے لگتے۔ اور حنفی [illegible] مسلمانوں میں اب بھی بہت [illegible] شاید تم کو یہ میرا کہنا مبالغہ معلوم ہو

اللہ کا بیٹا اور نصاریٰ کہتے ہیں مسیح ہی اللہ کا بیٹا یہ اُن کے اپنے مُونہ کی کہن ہی ان سے
پہلے جن لوگوں نے کفر کیا گئے یہ بھی اُنھی کی سی باتیں بناتے ان کو خدا کی مار کدھر بھٹکے جا رہے
ہیں - لیکن اَوْر کہیں ہو تو ہو جو نصاریٰ ہمارے مُلک پر مسلط ہیں نہ تو دوسروں کے مذہب
سے تعرض کریں اور نہ اپنے مذہب میں ملانے کے لئے کسی طرح کا لالچ دکھائیں - پادریوں کو
رہنے دو - میں تو یہ بھی نصاریٰ - مگر میں نے اچھی طرح تحقیق کر لیا ہی حکومت میں ان کو بالکل دخل
نہیں - لیکن نہ تخویف ہی اور نہ تطمیع اس پر بھی ہزاروں مسلمان ہیں کہ اپنا ظاہر انگریزوں
کا سا بنانا چاہتے ہیں تو کیا ان [illegible] جا سکتی ہی کہ اگر خوف یا لالچ کا دباؤ ڈالا جاوے تو
ایسے لوگ اسلام پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں - میں مسلمان بھائیوں پر بدگمانی نہیں کرتا اور گمان بد کرنا
ہی بھی بُری بات ہی اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (بعضے گمان گناہ ہیں) اور نہ اس پیرائے میں اپنی
بڑائی کرتا ہوں - فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى - (اپنے مُونہ اپنی صفائی بیان مت کرو
[illegible] پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہی) بلکہ میں ظاہر حال سے ایک نتیجہ نکالتا ہوں اور خیال
کرتا ہوں کہ جس طرح نوکریوں میں امتحان کی قید لگا دی ہی اگر خدانخواستہ مذہب کی بھی شرط
کر دی جائے کہ مثلاً تحصیل داری اور اس سے اونچے عہدے نصاریٰ کے سوائے کسی کو
نہ دیئے جائیں تو میں نہیں کہہ سکتا کتنے مسلمانوں کے ایمان متزلزل ہو جائیں - غرض افسوس
ہی کہ اب تک ہم [illegible] کے امتحان میں ناکام [illegible] ہے - لیکن امتحان کا سلسلہ بند نہیں ہو گیا
اے بھائیو ایسی کوشش کرو کہ امتحان دوبارہ میں فیل نہ ہوں - امتحان کی دوسری چیز ہی
جوع یعنی [illegible] ہے شاید مراد [illegible] پیغمبر صاحب نے کافروں کے ہاتھ سے عاجز
آ کر بددعا کی تھی - کہ اے [illegible] لوگ [illegible] سرکشی نافرمانی سے باز نہیں آتے ان پر ایسا قحط نازل کر
جیسا حضرت یوسف کے وقت میں ہوا تھا - چنانچہ سات برس پیہم اس طرح کا قحط پڑا کہ آدمیوں
[illegible] کو کھا لیا [illegible] تبوک کی طرف اشارہ ہو کہ جب پیغمبر صاحب نے تبوک
پر چڑھائی کی [illegible] کا لشکر اس قدر بے سروسامان تھا کہ مجاہدین درختوں کے پتے کھا کھا کر
گزر کرتے تھے - اللہ اللہ کیا ایمان تھے کہ خدا کی راہ میں جان دینے کو جاتے ہیں بھوکے پیاسے
نہ سواری نہ ہتیار - بخدا ان لوگوں کے سامنے اپنے تئیں مسلمان کہتے اور ایمان کا نام لیتے ہوئے

شرم آتی ہے۔ ہم میں کوئی ہے جو ایمان کی خاطر ایسی مصیبتیں جھیلے اور ایسی آفتیں انگیز کرے
لیکن زیادہ مناسب اور دل کو لگتی ہوئی وہ تفسیر ہے کہ جوع سے اصحاب صُفّہ مراد ہیں۔
اس میں اختلاف ہے کہ کتنے تھے مگر ساٹھ۔ ستر۔ سو۔ جتنے رہے ہوں اصحاب صُفّہ وہ لوگ
تھے جو کافروں کے ڈر سے ہجرت کر کے گئے سے مدینے میں آ رہے تھے۔ اپنے گھروں [illegible] کھاتے
پیتے خوش حال تھے لیکن جیب کر بھاگے تو بک میں و دو [illegible]۔
یہاں مدینے میں مسلمان بھائی جہاں تک ہو سکتا تھا۔ روٹی [illegible] گیری کرتے
تھے۔ مگر خبر گیری کی بھی کچھ [illegible] انتہا ہے۔ ایک [illegible] نٹ کھائیں اور گھر
میں ایک بھی نہ ہو یا آدمی میں جیسے لگا نا چاہیں آدھی [illegible] ہو جینے والا اور [illegible]
میزبان اور مہمان۔ دونوں بھوکے کے بھوکے [illegible] کہ اصحاب صفہ پیٹ پر پتھر [illegible]
رہتے تھے۔ نماز میں کھڑے [illegible] گر اٹھے۔ بیٹھتے تو مارے ضعف کے کھڑے نہ ہو سکتے
جن کے کھانے کی یہ کیفیت ہو ان کے لباس کا کیا پوچھنا۔ صرف ایک کملی وہی اوڑھنا وہی
بچھونا۔ وہی کرتہ۔ وہی پاجامہ۔ اور ای کاش وہ بھی اتنی بڑی ہو کہ اس کو اچھی طرح لپیٹ لیں
پرانی اور کثیف ہونے کے علاوہ اس قدر چھوٹی کہ ہاتھ سے پکڑے رہیں تو سجدے میں جائیں
کوئی اس طرح کا خستہ حال آدمی میلا کچیلا چیتھڑے لگائے تم میں آ بیٹھے تو تم کو ضرور نفرت آئے
لیکن جناب پیغمبر صاحب فرصت [illegible] پہروں بے تکلف ان میں آ کر بیٹھتے۔ ظاہر کے فقیر اور
باطن کے امیر۔ دیکھنے میں گدا اور حقیقت میں مہربان خدا۔ ایسے لوگوں کے حق میں جناب پیغمبرؐ
صاحب نے فرمایا۔ رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔ بہت سے لوگ ہیں جن کا ظاہر
پریشان اور گرد آلود ہے مگر خدا کو یہاں تک ان کی خاطر عزیز ہے کہ اگر کسی بات پر اڑ بیٹھیں
تو خدا کو ان کی ضد پوری کرتے ہی [illegible] ایک مصلحت الٰہی تھی کہ خدا نے [illegible] فقر
و فاقے سے آزمایا۔ بات یہ ہے کہ جن کی نظر میں دنیا کی وقعت [illegible] اور
آسائش کو آسائش سمجھتے ہیں ورنہ خدا کے نزدیک تو جیسا حدیث شریف میں آیا ہے جناح بعوضۃ
ایک پر پشہ کی برابر بھی دنیا کی حقیقت نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی آسودگی کے اعتبار
سے مومن و کافر میں کچھ فرق اور امتیاز نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا۔ کہ لولا

أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرُ بِالرَّحْمَٰنِ لِبُيُوتِهِمْ سُقُفًا مِنْ فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ
عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ وَلِبُيُوتِهِمْ أَبْوَابًا وَسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُونَ وَزُخْرُفًا وَإِنْ كُلُّ ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ ۔ فرماتے ہیں کہ دنیا ہماری نظر میں اس قدر حقیر چیز ہے کہ
اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ ساری دنیا کافر ہو جائے گی تو کافروں کو اتنی دولت دیتے کہ گھروں میں
چاندی کی چھتیں پاتے اور چاندی کے زینے چڑھاتے اور چاندی کے دروازے لگاتے اور
چاندی کے تخت بنواتے اور مزے میں گاؤ تکیے لگا لگا کر ان پر براجتے اور چاندی تو چاندی ہم چاہتے
تو اتنا ہی سونا ان کو بخش دیتے مگر ہوتا کیا دنیا کے لوگ احمق [illegible] سمجھتے کہ خدا کفر کو پسند کرتا
ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ جتنے کافر ہیں سب کو آسودہ حال رکھا ہے تو لگتے سب کے سب کفر کرنے
اسی سبب سے ہم نے دنیا میں کافروں کی تخصیص نہیں کی یہ سونا چاندی ان ہی کی نظروں
میں [illegible] کی چیز ہو گی خیال کر کے دیکھو تو یہ تمام تر دنیا کی چند روزہ زندگی کے عارضی
[illegible] اور ابدی فائدے تو عاقبت کے ہیں اور وہ مخصوص ہیں پرہیزگاروں کے
[illegible] بھائیو دنیا کی آسودگی پر کبھی مغرور نہ ہونا اور ہرگز ہرگز اس کو خدا کی خوشنودی کی
دلیل نہ گرداننا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں دنیا کی خوش حالی بڑی ہی خطرناک چیز ہے کیا تم نے قرآن
کی وہ آیت نہیں دیکھی۔ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ
الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ۔ اس دن کو یاد کرو کہ جن لوگوں نے کفر کیا آگ کے سامنے
لائے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم کو جو کچھ فائدہ پہنچنا تھا زندگانی دنیا میں
پہنچ چکا اور تم نے دنیا میں خوب خوب چین کیے اب بھگتو ذلت کا عذاب بدلہ اس کا کہ تم
[illegible] میں ناحق کی بڑائی مارتے اور [illegible] کا کہ تم بدکاریاں کرتے تھے۔ دنیا اور دین
[illegible] دنیا نہ بچ [illegible] وہ اگر ایسی توقع رکھیں کہ خیر دنیا بری
طرح گزری تو عجب نہیں کہ خدا وہاں اچھی گزارے تو جائے سر بھی ہے وہ بڑا کریم و رحیم
ہے [illegible] یا تو وہاں دے گا۔ لیکن جنہوں نے دنیا میں مزے اڑائے اچھے سے اچھا کھایا
اچھے سے اچھا پہنا آرام سے زندگی بسر کی ان کو ایسی امید لگانے کا کیا حق ہے۔ خدا کے

ساتھ ایسا کوئی عہد و پیمان ہو گیا ہو تو پیش کریں جس سے معلوم ہو کہ وہ [illegible] تو خدا
نے کو کسی پر سے پڑے پلے ہیں اور ان کو اپنے دستِ خاص سے بنایا ہے اور ان کے ساتھ ایک
خاص رعایت ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کوئی بات چھوڑی نہیں اسی مضمون کی آیت قرآن
میں موجود ہے۔ اَمْ لَکُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَۃٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ اِنَّ لَکُمْ لَمَا تَحْکُمُوْنَ
روزِ قیامت تک کی قسم لے لی ہے کہ جو تم حکم کرتے جاؤ ہم بجا لاتے جائیں یہ انسانی [illegible] ہے
کہ دنیا میں پیدا ہوئے آنکھ کھول کر دنیا ہی کو دیکھا سمجھے کہ بس جو کچھ ہے یہی دنیا ہے اور بس اور
یہیں انسان کے [illegible] ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا ہی کی خوشی اور ناخوشی پر خدا
کی رضامندی اور نارضامندی کو قیاس کر لیتے ہیں۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَکْرَمَهٗ
وَنَعَّمَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَکْرَمَنِ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْۤ اَهَانَنِ۔ کہ جب
خدا کی طرف سے دنیاوی اکرام و انعام ہوا سمجھے کہ ہاں خدا نے ہماری عزت کی رزق کی تنگی ہوئی تو
جانا کہ خدا کی نظر ہماری طرف سے پھری ہوئی ہے۔ لیکن یہ محض غلط خیال ہے۔ دنیا تو امتحان کا
گھر ہے اور نتیجہ جو اس امتحان پر مترتب ہونے والا ہے عاقبت میں مترتب ہوگا۔ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ اَللّٰهُمَّ
اجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْنَا مِنْهُمْ ایک فریق جنت میں اور ایک فریق دوزخ
میں۔ خدا نے بندوں کو اس غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے فرمایا اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ
بَنِیْنَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِی الْخَیْرٰتِ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ۔ کیا ایسا سمجھتے ہیں کہ یہ جو مال اور اولاد سے
ہم ان کی مدد کر رہے ہیں ان کی حسنات کا معاوضہ ہے جو سرِ دست ان کو دنیا میں مل رہا ہے
نہیں نہیں۔ تم اس کا مطلب [illegible] نہیں سمجھے۔ تو اے بھائیو ہر وقت خدا سے ڈرتے رہو اور
اگر انجام بخیر ہے اور وہاں چل کر خدا کے ساتھ اچھی بنی تو دنیا کی چند روزہ تکلیفات ہرگز اس
قابل نہیں کہ ان کی پروا کی جائے اگر خدانخواستہ وہاں بگڑی بنی تو دنیا کی فانی لذتیں کیا
فائدہ دے سکتی ہیں۔ تو یہ تو ایسی مثال ہوگی کہ جیسے تیمور کی اولاد اس [illegible] نہیں کہ
صحیح النسب ہیں یا نہیں صاحب علم [illegible] کہلاتے تو ہیں [illegible]
پھرتے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ۔ ان کو اس تصور سے کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ ان کے
باپ دادے واقع میں بادشاہ تھے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر ان میں کوئی سمجھ دار ہے۔ اور سمجھ دار

ہونے تو اس درجے کو کیوں پہونچتے بہرکیف اگر کسی کو ذری سی عقل بھی چھو گئی ہی تو اس شاہزادگی کا خلل ایسا ہی جیسے کوڑھ میں کھاج۔ یہی دنیاوی آسایش کا حال ہی عاقبت کی تکلیف کے مقابلے میں۔ قرآن سے اس کی تصدیق بھی ہو۔ اَفَرَاَیتَ اِن مَّتَّعنٰھُم سِنِینَ ثُمَّ جَآءَھُم مَّا کَانُوا یُوعَدُونَ مَآ اَغنٰی عَنھُم مَّا کَانُوا یُمَتَّعُونَ۔ بھلا دیکھو تو اگر ہم نے ان کو چند سال دنیاوی فائدوں سے متمتع ہونے بھی دیا اور پھر آخر کار عذاب موعود آ پونہچا تو وہ تمتع گزشتہ ان کے حق میں کیا مفید ہوگا۔ ہاں تو خدا نے [illegible] کے ساتھیوں کو جوع یعنی [illegible] سے آزمایا اور انھوں نے اس مصیبت کو [illegible] شکر گذاری اور خوشی [illegible] انگیز کیا اور خدا نے دنیا و دین [illegible] میں ان کو [illegible] رَضِیَ اللّٰہُ عَنھُم وَرَضُوا عَنہُ [illegible] ان سے راضی اور خوش اور وہ [illegible] راضی اور خوش۔ ہم میں بھی جس کو خدا چاہتا ہی (اور شاید ایسے بہت ہیں) بھوک کی تکلیف سے آزماتا ہی۔ کتنے خدا کے بندے ہیں جن کے عیال بہت۔ آمدکم۔ مہنگا سا۔ کمائی خرچ کو مکتفی نہیں۔ ان پر اکثر ایسے دن گزر جاتے ہیں کہ امرود۔ سنگھاڑے۔ بھٹے۔ گاجریں [illegible]۔ آم۔ خربوزے۔ موسم کی جو چیز سستی دیکھی اسی پر قناعت کر کے رہ گئے۔ چار پیسے کے چنے منگوا لئے مٹھی مٹھی سب نے [illegible] اوپر سے ڈگڈگا کر پانی پی لیا۔ پیٹ میں ہوا بوجھ۔ پڑ کر سو رہے۔ باوجود [illegible] اپنی اپنی جگہ سب محنت کرتے ہیں مگر کیا کریں کسی طرح پوری نہیں پڑتی۔ مصیبت خیال کرو کہ جو فاقے کرتے ہیں ان ہی کی آزمایش منظور ہی خدا ان کا صبر آزماتا ہی کہ دیکھیں تکلیف میں بھی ہم کو یاد کرتے ہماری شکر گزاری اور ہمارے فضل و کرم کی امیدواری [illegible] میں یا نہیں [illegible] والوں کا امتحان لیتا کہ کہاں تک غریبوں پر ترس کھاتے اور خدا کے دیئے [illegible] بقدرِ توفیق مساکین کو پونہچاتے اور محتاجوں کی ہمدردی [illegible] جس طرح کا میں بیان کر رہا ہوں اگر روزے کو بھی اس میں داخل سمجھا جائے تو کچھ نامناسب [illegible] بھی حقیقت میں بڑا امتحان ہی کہ ہوتے ساتے آدمی صرف خدا کے لئے [illegible] کو بند رکھے کچھ کھائے نہ پیئے۔ اس سے انسان کو رزق کی قدر ہوتی۔ [illegible] فاقہ کشوں کی مصیبت کو پہچانتا۔ اور اپنی درماندگی اس پر ظاہر ہوتی۔ کہ ایک دن کی بھوک پیاس میں کیا حال ہو جاتا ہی۔ حدیث سے ثابت ہوتا ہی کہ نفسانی خواہشوں کے روکنے

کے لئے روزے سے بہتر کوئی تدبیر نہیں - اب دیکھو کہ ہم اس بھوک کی کس طرح برداشت
کرتے ہیں تم مجھ سے بہتر جانتے ہو کہ کتنے لوگ بے عذر روزے نہیں رکھتے - اور جو رکھتے ہیں
اُن کا روزہ اتباع رسم کے طور پر ہوتا ہے - لوگوں کے چھیڑنے کے ڈر سے کہ نہ رکھیں گے تو
لوگ روزہ خور کہیں گے - خدا کا چور بتائیں گے - گرمی [illegible] کہ پہر دن چڑھے
سے پانی کا فوارہ ہاتھ میں ہے اور پکھالوں پانی اپنے [illegible]
کسی قدر ضعف بھی ہے مگر نہ ایسا کہ [illegible] ہیں - اگر لوگ روزے کو حکم خدا سمجھ
خوش دلی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل کریں تو [illegible]
واویلا نہ ہو جتنی کہ دیکھی اور سُنی جاتی ہے - اَلاَعمَالُ بِالنِّیَّات - عمل کا مدار نیت پر [illegible] حدیث
متواتر ہے اور نیت کا حال سب سے بہتر تو خدا جانتا ہے اور خدا کے بعد خود صا[illegible]
ظاہر پر حکم لگانے والے ہیں - آدمی اپنے اور خدا کے [illegible] کو لیوں عمل [illegible]
آپ ہی اپنے نفس کا احتساب کیوں نہ کر لیا کرے - ہر ایک [illegible] کی نصیحت لگا [illegible]
دوسرے مفتی سے تو غلطی کے ہونے کا بھی احتمال ہے اور یہ مفتی کبھی خطا کرتا ہی [illegible]
استفت قلبک - جب کسی [illegible] پوچھ لیا [illegible] الٰہی امتحان
کی تیسری چیز باقی رہی اور امتحان ختم - وہ کیا ہے؟ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ [illegible] الثمرات
کمی مالوں میں اور جانوں میں اور پھلوں میں - امام لغۃ صاحب [illegible] ہے کہ
اہل عرب میں مال کا اطلاق صرف چارپایوں پر ہوتا ہے جیسے [illegible]
بکری اس واسطے کہ ان لوگوں کے پاس [illegible] قسم کا مال نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو شاذ -
جیسے ہمارے ملک میں غالب غذا روٹی ہے اور [illegible] میں [illegible] پایا روٹی
کھانے گئے ہیں - اگرچہ بعض اوقات روٹی نہیں بھی ہوتی بلکہ اس کی جا [illegible] پلاؤ یا اور کوئی
چیز - اہل لکھنؤ اس لم کو تو پہنچتے نہیں اور ہمارے اس محاورے [illegible] کرتے ہیں - مالوں
جانوں اور پھلوں کی کمی اس قسم کے نقصانات [illegible] کسی زمانے میں کوئی صنف [illegible] بلکہ
غالباً کوئی فرد بشر ان سے محفوظ نہیں - اور قرن اول کے مسلمانوں کی کیا پوچھتے ہو وہ
بیچارے تو شروع شروع میں دنیا کے اعتبار سے ہر طرح گھاٹے ہی گھاٹے میں تھے سر سے

ان کو اپنی زندگی ہی کا بھروسہ نہ تھا - وہ ایمان لائے پیچھے اور ٹھان لیا پہلے - اُن کو یقیناً معلوم
تھا کہ ہم نے ایک خدا کا نام لیا اور سر قلم ہوا - خوب جانتے تھے کہ پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کی اور
زن و فرزند اور بھائی بند - اور گھر بار - اور مال و متاع اور عزیز و قریب اور دوست آشنا
اور اعوان و انصار سب کچھ چھوڑنا پڑا - کسی کا خون کیا ہو - ڈاکہ مارا ہو - چوری کی ہو - کسی کے
گھر میں کود پڑے ہوں تو کچھ دے دلا کر منت خوشامد کر کے کسی سفارش بہم پہنچا کر بھی بچ سکتے ہیں
ان لوگوں سے خدائے واحد پر ایمان لانے کے جرم کی معافی کی امید رکھنی ہی فضول ہے - وَمَا نَقَمُوا
مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ - ان پر قصور بھی ثابت
کیا تو یہ کہ خدا پر ایمان لائے جو سب پر غالب اور جس کا سارا جہان ثناخواں اور جس کی ملک زمین
و آسمان - میں تم سے شروع سے کہتا آتا ہوں کہ خدا نے اصحاب پیغمبر خدا صلعم کو ہر طرح سے جانچا
ہر ہر طرح سے آزمایا اور ان کو کامل العیار پایا - پھر اُس کی سرکار میں کاہے کی کمی تھی - دُنیا کی
بادشاہت تو اُن کی جوتیوں سے لگی لگی پھرتی تھی - ساٹھ برس کی بھی کچھ بساط ہے اتنے ہی قلیل
عرصے میں تمام روئے زمین پر اسلام کا سکہ بٹھا دیا - اور دین میں جو ان کے مراتب ہیں ان کی
تو خدا ہی کو خبر ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ - کسی شخص
کو معلوم نہیں ان کے لیے آنکھوں کی کیسی کیسی ٹھنڈک خدا نے لگا رکھی ہے بدلہ اُن کے عملوں کا
اُنھوں نے [illegible] کے پیچھے یوں اپنی جانیں کھپا دیں اور امت پیغمبر نے یہ اُن کا گن مانا کہ ان میں
سے جو پیغمبر کے بڑے مشیر اور جلیس اور ایک اعتبار سے محسن تھے لگے اُن ہی کو گالیاں دینے
اور تبرا کرنے - اس سے بڑھ کر بھی احسان فراموشی کی کوئی بات ہوگی - اب پھر امتحان کے
مضمون کی طرف عود کرتے ہیں - مگر ایک بات اس آیۃ میں خیال کرنے کی لائق ہے کہ اس آیۃ میں
عطف کے دو سلسلے ہیں ایک تو مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ - اور دوسرا مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ
وَالثَّمَرَاتِ - دونوں سلسلوں میں تین تین چیزیں ہیں پہلے سلسلے کی ترتیب میں ترقی ہے
ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف - کیوں کہ خوف ایک ہلکی اور آسان چیز ہے بمقابلہ جوع کے اور اسی طرح
جوع ہلکی اور آسان چیز ہے بمقابلہ نقص کے لیکن یہ ترتیب دوسرے سلسلے میں بظاہر اُلٹ پلٹ
سی ہو گئی ہے - کیوں کہ جان عزیز ترین اشیا ہے وہ تو آپڑی بیچ میں اور ثمرات آیا سب کے بعد -

لیکن اس میں ایک نکتہ ہے۔ میں نے تو کسی تفسیر میں دیکھا نہیں شاید کسی اَور کی نظر سے گزرا ہو۔ اور
وہ نکتہ یہ ہے کہ ثمرات سے مراد ہی رزق اور وہی مدارِ حیات۔ اس کی قدر کوئی زمینداروں سے پوچھے
جو غلہ پیدا کرتے ہیں۔ تم [illegible] کر [illegible] کمینہ کا بھی اتفاق
نہ ہوا ہوگا۔ زمیندار ایک [illegible] بالشت زمین کے لئے لڑنے اور مرنے کو [illegible]
زمین کو نہ صرف اپنی معاش کا ذریعہ سمجھتے ہیں بلکہ اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کی معاش کا بھی [illegible]
ثمرات مالی [illegible] زیادہ [illegible] اور یہی سبب [illegible] ثمرات کے سب کے آخر میں واقع ہونے کا۔
هٰذَا اِمَّا الْنَّمِیْ رَبِّیْ۔ غرض امتحان تو ہو چکا اب باقی رہیں دو باتیں۔ ایک تو معیار کامیابی۔ جس طرح مدرسوں
کے امتحانوں میں ہوتا ہے کہ مثلاً سو نمبر کامل میں اور پاس ہونے کے لئے کم سے کم ایک ثلث نمبروں
کا حاصل کرنا ضرور ہے۔ اسی طرح اس امتحان الٰہی کے لئے بھی کوئی معیارِ کامیابی مقرر ہونی چاہیئے۔ دوسرے
کامیابی کا صلہ کہ امتحان میں پورے نکلے تو سرکار سے کیا انعام ملے گا وظیفہ یا تمغا یا نقد یا کتابیں
یا نوکری یا خطاب۔ چاہیئے تھا کہ معیار کامیابی اور صلہ کامیابی دو چیزیں تھیں دونوں کا بیان الگ الگ
ہوتا۔ لیکن یہی تو کلام الٰہی کی خوبی ہے جتنا غور کرتے جاؤ وجوہِ بلاغت نکلتی چلی آتی ہیں۔ امتحان
دے چکنے کے بعد طالب العلموں کو نتیجہ معلوم کرنے کی جلدی ہوتی ہے اسی لئے خدا نے تو نے نتیجہ
اور صلہ دونوں کو ایک ساتھ بیان کیا بلکہ صلے کو پہلے ادا فرمایا۔ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ اور اے پیغمبر خوشخبری دو صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت
نازل ہو تو کہنے لگیں ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم کو اسی پاس لوٹ کر جانا ہے یہی ہیں جن پر ان کے
پروردگار کی عنایتیں [illegible] اور رحمت اور یہی ہیں ٹھیک رستے پر چلنے والے۔ صلہ انعام کو خدا
نے اس جگہ [illegible] تا ہم کہ اس سے بہتر کوئی اَور طریقہ ہو نہیں سکتا۔ نہیں کہا کہ ان کو
ابداً آلاباد تک رہنے کے لئے باغ ملیں گے جن میں [illegible] اور شراب طہور کی نہریں
بہہ رہی ہوں گی [illegible] پھل پھولے رہیں گے۔ جن میں خزاں کا گزر نہیں
نہیں کہا کہ ان کو دنیا میں بناؤ سنگار کی ممانعت کی گئی تھی کہ مرد ہو کر عورتوں کی طرح سونے
چاندی کے زیور اور ریشمی کپڑے نہ پہنو اب ان سے [illegible] بندش اٹھا دی جائے گی اور اجازت ہوگی

کہ جو چاہو کھاؤ جو چاہو پہنو۔ نہیں کہا کہ ان کو خدمت کے لئے حوریں ملیں گی۔ نہیں کہا کہ وہ کامل آسودگی اور خوشی اور [illegible] میان اور پوری آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ نہیں کہا کہ ان کو خدا کا دیدار ہوگا۔ بلکہ کہا تو یہ کہا کہ اے پیغمبر ان کو خوش خبری دو۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک بادشاہ کسی ملازم [illegible] کہے کہ تم فلاں خدمت بجا لاؤ گے تو ہم تم کو نہال کر دیں گے بادشاہ کے اس ابہام میں بہت بڑی گنجائش ہے بہ نسبت اس تصریح کے کہ ہم کو خلعت ہفت پارچہ یا جاگیر یا خطاب یا منصب دیں گے۔ وعدہ وفا کرنے کا وقت آئے گا تو [illegible] بادشاہ اپنے حوصلے کے مطابق داد و دہش کرے گا۔ جب دنیا کے بادشا[illegible] ہے تو یہ وعدہ تو شاہنشاہ دو جہاں کا وعدہ ہے جس کی سرکار میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ خوش نصیب اُن کے جن کو پیغمبر خدا صلعم خدا کی طرف سے خوش خبری دیں۔ بس سمجھو کہ سدا کے [illegible] پار ہو گئے۔ پھر خالی خوش خبری امیدوار بودہ بدانند۔ ہمیں خوشخبری کے ساتھ [illegible] کا خطاب بھی دے دیا۔ اس دنیا کو بھی نمونۂ عاقبت سمجھو۔ یہی باتیں جو یہاں ہیں وہاں بھی ہیں مگر یہ نقل ہیں وہ اصل۔ یہ مجاز ہیں وہ حقیقت۔ یہ ناقص ہیں وہ کامل۔ یہ فانی ہیں وہ باقی۔ دنیا کے بادشاہ بھی جس سے خوش ہوتے ہیں علے قدر مراتب خطاب دیتے ہیں تاکہ ہم چشموں میں صاحب خطاب کی عزت و آبرو ہو۔ لیکن چوں کہ دنیا خود تمام تر بیہودہ ہے اس کی کوئی بات بیہودگی سے خالی نہیں وہی کہاوت ہے کہ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ خطابات ہیں تو بیہودگی کی کوئی حد باقی نہیں رہی۔ مجکو فرعون کے انا ربکم الاعلے کہنے پر تعجب ہوتا تھا کہ وہ بھی آخر ہماری ہی طرح کا آدمی تھا۔ بھوک کی سہار۔ پیاس کی برداشت نہ کر سکتا ہوگا جیسے ہم نہیں کر سکتے۔ ذری سے دکھ میں بے چین ہو جاتا ہوگا جیسے ہم بے چین ہو جاتے [illegible] اُس کو بھی قرار نہ آتا ہوگا جیسے ہم کو نہیں آتا۔ پھر کس منھ سے وہ اپنے تئیں انا ربکم الاعلے۔ کہا کرتا تھا کم بخت اتنا تو سمجھتا کہ پیدا ایک نہیں کر سکتا۔ مرے ہوئے کو جلا نہیں سکتا۔ پانی مینہ نہیں برسا سکتا زمین سے غلہ میں نہیں اُگا سکتا۔ رب او رب بھی ربکم الاعلے کیوں کر ہو سکتا ہوں۔ لیکن جب سے میں نے فلک قدر۔ اور کیوان جاہ اور سلیمان شکوہ اور اسی قسم کے دوسرے خطابات سُنے سمجھ لیا کہ انسان کی شیخی کی کچھ انتہا نہیں۔ بے شک اُس احمق نے انا ربکم الاعلے کہا ہوگا۔ اور ابھی تک

ایسے احمقوں کا پیدا ہونا بند نہیں ہوا جو ریکم الاعلیٰ بننے کے لئے طیار ہیں۔ خیر غرض خداوند تعالیٰ جل و علا شانہ کی سرکار سے بھی نیکو کاروں کو خطاب ملتے ہیں۔ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ[1] - سب الٰہی خطاب ہیں اسی طرح مومنین [illegible] محسنین وغیرہ [illegible]۔ ان جملہ ایسے خطابوں سے ایک خطاب صابرین بھی ہے جس طرح دنیاوی خطابوں [illegible] متفاوت ہیں دینی خطابات کا بھی یہی حال ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ صابرین کا خطاب کس درجے کا ہے۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہ خطاب مقربانِ حضور ربوبیت کے ساتھ خاص ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) معیت دالہ کرتی ہے تقرب اور مصاحبت پر۔ پس کمال بندگی یہی ہے کہ بندے کو خدا کا تقرب ہو اور غلمان اور بلغ رضوان کسی کی تقرب الٰہی کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس خطاب معزز کے اہل اور مستحق وہ لوگ ہیں جو مصیبت پڑنے پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہتے ہیں۔ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ سے یہ مراد نہیں کہ بے سمجھے بوجھے عادۃً کے طور پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ زبان سے کہہ لیا۔ بعض لوگ قسم کی عادۃً ڈال لیتے ہیں اور بات بات میں بے ساختہ واللہ باللہ کہہ بیٹھتے ہیں۔ اس کو اصطلاح شرع میں یمین لغو کہتے ہیں ایسی [illegible] پر کفارہ تو نہیں آتا لیکن ایسی بے پروائی کے ساتھ خدا کا نام لینا بڑی بے ادبی اور [illegible] فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ منہ سے بولو کہ اب بھی باز رہو گے یا نہیں۔ اسی طرح بہت سے مسلمانوں [illegible] اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے کی بھی عادۃً سی پڑ گئی ہے۔ تو جیسے وہ واللہ باللہ یمین لغو ہے ویسا ہی یہ اِنَّا لِلّٰهِ استرجاع فضول۔ نہ اس پر کفارہ نہ اس پر ثواب۔ جو شخص صرف عادۃً منہ سے اِنَّا لِلّٰهِ کہتا ہے وہ نہ بشارۃ کا مستحق ہے نہ خطاب صابرین کا اہل۔ نہ صلوات پروردگار کا سزاوار۔ اور نہ اس کی رحمت کے قابل۔ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ سے مراد یہ ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا مفہوم اور مطلب اس طرح دل میں بیٹھا ہوا ہو جیسے پتھر میں نقش۔ کہ مصیبت کے وقت بھی اسی کا یقین ہو اور فریاد واویلا اور بین کے عوض منہ سے بھی وہی نکلے۔ تب صبر کا اجر ملے۔ اب سمجھو تو کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا مطلب کیا ہے یہ کہ ہم خدا کے ہیں [illegible] کو اسی پاس لوٹ کر جانا ہے۔ ظاہر میں کچھ بے تکی سی بات معلوم ہوتی ہے یعنی مصیبت [illegible] ساتھ اس کا تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔ بادی النظر میں تو اس طرح

[1] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے کہے پر چلتے ہیں ان کو بہشت [illegible] صدیقوں اور شہیدوں اور نیکوں کی رفاقت نصیب ہوگی جن پر اللہ نے فضل و کرم کیا ہے

کی کہ اُدعا ہوئی تھی کہ اے خدا ہم کو صبر کی توفیق دے - یا ہمارے گناہ معاف فرما - یا ہم پر
رحم کر - یا میت کو بخش - پس ماندوں کو صبر دے - [illegible] میں اور تیری طرف ہم کو لوٹ کر
جانا ہی - وعظ تو بہتیرے سُنتے ہو مگر یہ نکتے جو فقیر کی وعظ میں ہوتے ہیں ہمیں نہ سُنے ہونگے -
ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ - لیکن کلام الٰہی بے تکا نہیں
ہوسکتا - بے تکے ہم اور بے تکی ہماری سمجھ - خدا عقل سلیم دے تو معلوم ہو کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ
رَاجِعُوْنَ - میں رضا و تسلیم اور دعا دونوں باتیں ہیں - یہ کہنا کہ ہم [illegible]
خصوصیۃ پر دلالۃ کرتا ہی جو ہم کو خدا کے اور خدا کو ہمارے ساتھ ہی - مگر افسوس ہم اس کو نہیں
سمجھتے - اور کسی قدر سمجھتے بھی ہیں تو اُس پر عمل نہیں کرتے - یعنی ہمارے افعال سے ثابت
نہیں ہوتا کہ ہم خدا کے ساتھ ایک خاص طرح کی خصوصیۃ رکھتے ہیں - اب دنیا کی خصوصیتوں
پر نظر کرو جن کے پیچھے ہم شبانہ روز حیران سرگردان اور پریشان پڑے پھرتے ہیں - اول تو
دنیا جب آنی جانی اور ایک سرائے فانی ہی دنیا کی کسی خصوصیۃ کو گو وہ کیسی ہی قریب اور قوی
کیوں نہ ہو خصوصیۃ سے تعبیر کرنا ہی غلطی ہی - سب سے پہلی اور شاید سب سے زیادہ قوی اور
سب سے زیادہ خالص وہ خصوصیۃ ہی جو بچے کو ما باپ سے اور ما باپ کو بچے [illegible]
لیکن ہم جتنے اس جگہ موجود ہیں کیا مرد کیا عورۃ سب اپنی اپنی عمر میں بچے سے [illegible] ہیں
لڑکوں کے آگے اولاد ہی - اور گھر گھر اس کی مثالیں موجود ہیں - کیا ہم کو یا کسی کو ٹرے ہولے
پیچھے اپنی ما باپ کے ساتھ - یا ما باپ کو ہمارے ساتھ وہی پہلے کی سی خصوصیۃ باقی رہی ہی نہیں
جن ما باپ کی اولاد اُن کے آگے مر جاتی ہی - کیا وہ بھی اولاد کے ساتھ مر جاتے ہیں - نہیں
جس کے ما باپ اُس کے سامنے مرتے ہیں کیا وہ بھی دنیا سے ناراض ہو کر ما باپ کے ساتھ مر جاتا
ہی - نہیں - کوئی ما باپ اولاد کا - کوئی اولاد ما باپ کا دکھ میں - درد میں - بیماری میں تن دہی
میں ساتھ دیتا ہی - نہیں - ما ہو یا باپ یا اولاد سب اشخاص جدا گانہ ہیں - ہر ایک کی روزی
جدا - بھوک جدا - پیاس جدا - خواہش جدا - عمر جدا - تقدیر جدا - یہ ایک انتظام الٰہی ہی کہ
ایک سے ایک پیدا ہوتا چلا آیا ہی - یہاں تک کہ تمام روئے زمین پر ایک ہی آدم کی نسل پھیلی
ہوئی ہی - اور اسی طرح جب تک دنیا قائم رہی ایک سے ایک پیدا ہوتا چلا جائے گا - ما باپ اور

اولاد میں تو ایک طرح کی جز ... ایک کو ... خصوصیت نہیں تو
دوسرے رشتے ناطے ... کیا غرض ... جتنے رابطے ہیں
بس ان کو راہ چلنے ہی کی ... صاحب سلامت سمجھو اور جب تم اُس صاحب سلامت کو خصوصیت بنانا
چاہتے ہو تو قطع نظر اس سے کہ ... خصوصیت بن نہیں سکتی اس کا صاف مطلب
یہ ہے کہ تم در پردہ انتظام الٰہی میں دخل دیتے ہو۔ تو ایسے شخص کا وہی جواب ہے جو خدا نے قرآن میں دیا ہے
مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ
هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ۔ اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ دنیا اور آخرۃ میں خدا اس کی مدد نہیں کرے گا
تو چاہئے کہ آسمان میں ایک رسّی لٹکائے اور پھانسی لے کر مر رہے اور دیکھے کہ جو بات اس کو
ناپسند تھی اس ... سے بھی دفع ہوئی یا نہیں۔ آدمی کی بناوٹ ہی اس طرح کی واقع ہوئی ہے
کہ دنیا میں اکیلا با سائش زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے ایک دم کے لئے اتنے لوازم درکار
ہیں ... ایک تنکہ ہو تو سرکار کا کام چلے۔ کاشتکار۔ معمار۔ لوہار۔ بڑھئی۔ سنار۔ ... بقال۔
... کے تاجر۔ ہر طرح کے کاریگر۔ درزی۔ موچی۔ حجام۔ دھوبی۔ خاک روب۔ سقے۔ قلعی گر۔
ٹھٹیرے اور کون اور کون ایک دنیا اس کی ٹہل میں لگی ہے اور ذرا اس کے بھانویں نہیں۔
حاکم ... ہوئے وقت پر کچہری میں حاضر ہوتا ہے کہ شاید اس کو کوئی فریاد کرنی ہو۔ دن
رات میں چار چار پانچ پانچ مرتبہ ریل طیار رہتی ہے کہ شاید کسی طرف جانا چاہے یا کوئی خط یا اسباب
روانہ کرے ... تار کا بابو منتظر بیٹھا ہے کہ اشارہ پاؤں تو جہاں کی کہیں ابھی خبر منگاؤں۔ چھاپے خانے
کتابیں چھاپ رہے ہیں کہ خدا جانے کونسی کتاب مانگ بیٹھے۔ مدرس مدرسے میں موجود ہیں کہ
صاحبزادہ بلند اقبال تشریف لائیں اور سبق پڑھیں۔ ڈاکیں دوڑ رہی ہیں۔ سڑکیں
بن رہی ہیں۔ تفریح کے لئے باغ لگے ہیں۔ غرض عجیب سلسلہ ہے کہ ہر شخص خادم و مخدوم اور
محتاج اور محتاج الیہ اور آمر و مامور۔ اور حاکم و محکوم اور اجیر و مستاجر سب کچھ ہے ایسی حالت
میں وہ انسان نہیں جو کثیر العلائق نہیں۔ انسان کیسا ہی غیور اور تنگ مزاج کیوں نہ ہو
اس کو چار و ناچار دوسروں سے مدد لینی ہی پڑتی ہے۔ اور یہ امداد و استمداد کا علاقہ تعلق
کی اصل اور خصوصیت کا ماخذ ہے۔ ہم زیر بار احسان ہیں والدین کے۔ رشتہ داروں کے

عزیزوں کے۔ دوستوں کے، [illegible] کے۔ حاکم وقت کے۔ اور خدا جانے کتنوں کے ... جتنا جس کا
احسان اُتنا اُس کی طرف دل کا [illegible] کا میلان۔ غور کرکے دیکھا جائے تو اگرچہ ساری دنیا
ہمارے [illegible] آرام و آسایش کی تدبیروں میں لگ رہی ہے مگر اس کی کنجی کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے وہ ہاتھ
ہماری کل بے کار ساری [illegible] و آیندہ۔ اگر ہم کو کسی سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے تو وہی نفع رسانی
کا خیال اُس کے دل میں ڈالتا اور اُس کو نفع رسانی کی قدرت دیتا۔ پس سچ پوچھو تو اصل کارساز اور
محسن وہ ہے اور یہ ظاہر کے مددگار اُسی کے احسان کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ قطعہ

گر گزندت رسد ز خلق مرنج + کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج
از خدا داں خلاف دشمن و دوست + کہ دل ہر دو در تصرف اوست

پھر بعض چھوٹے چھوٹے اور ہلکے ہلکے احسان تو وہ ہم پر ان مددگارانِ ظاہر کے ذریعے سے کرتا
ہے اور بڑی بڑی سترگ باتیں اس نے خاص اپنے ید قدرت میں رکھی ہیں جن میں کسی فرد بشر کو
کچھ دخل نہیں۔ اور بدون ان کے ہماری زیست محال۔ آؤ اُسی کے لفظوں میں اُس کے احسان
گنوائیں۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّکُمْ وَسَخَّرَ لَکُمُ الْفُلْکَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ وَسَخَّرَ لَکُمُ الْاَنْھٰرَ وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ
وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ۔ اللہ ہی نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اُس کی
وجہ سے تمہاری روزی کے لئے غلے اور پھل نکالے اور ناوؤں پر تم کو اختیار دیا کہ اُس کے حکم سے
دریا میں چلیں اور سورج اور چاند کو تمہاری خدمت کے لئے مصروف کیا کہ دونوں رات دن اپنے اپنے
کام میں لگے ہیں اور تمہاری خدمت کے لئے رات اور دن کو بنایا اور جو کچھ تم کو درکار تھا بانداز
مناسب تمہارے لئے مہیا کیا اور اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو ان سب کو گن نہ سکو اس میں
شک نہیں کہ انسان بڑا ہی جفاکار اور کافر نعمت ہے۔ اگر اس آیت کی تفسیر کرنے بیٹھوں تو کہیں مہینوں
میں جاکر تمام ہو تو ہو اور مجھے ابھی اپنی وہی آیت پوری کرنی ہے جس کا بیان شروع کیا تھا تو اس
مقام پر میں اسی قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اس آیت میں جو خدا نے اپنے چند احسان گنوائے ان میں
ایک ایک ہماری زندگی کا موقوف علیہ ہے اور انسان کے اختیار سے خارج۔ سعدی نے اسی آیت سے

اقتباس کیا ہے۔ قطعہ

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند ۔ تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار ۔ شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نبری

پس اگر تعلق [illegible] احسان پر ہے اور یوں بھی ہے پھر بھی تو ہم کو سب سے
زیادہ خصوصیت خدا کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ لیکن خدا آنکھ سے دکھائی دینے کی چیز نہیں ۔ ہم کو
سوچنے اور غور کرنے کی عادت نہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل سے خدا کے ساتھ گویا کچھ تعلق
نہیں رکھتے ۔ نہ اُس کے حقوق مانتے ۔ اور نہ اُس کے حکموں پر چلتے ۔ نہ اُس سے محبت
رکھتے ۔ اور نہ اس کی خفگی سے ڈرتے ۔ مگر اُس کا تعلق ہمارے ساتھ ایسا لازمی تعلق ہے کہ
کسی طرح منفک اور جدا ہو ہی نہیں سکتا ۔ ہماری ہستی ہی اُس کے تعلق کی دلیل ہے ۔ ہم
آپ سے آپ پیدا نہیں ہو گئے ۔ ماں باپ نے ہم کو پالا پرورش کیا مگر اُس کے حکم سے ۔ کہ
[illegible] نے ہماری محبت ماں باپ کے دل میں ڈالی ۔ لیکن ماں باپ پر بھی پالنے اور پرورش کرنے
کا اطلاق مجازاً ہے ۔ حقیقت میں پیدا کرتا اور پالتا اور پرورش کرتا ہے خدا ۔ سیکڑوں ہزاروں
آدمی اولاد کی تمنا کرتے ہیں اور نہیں ہوتی ۔ ماں کا دودھ سوکھ جاتا ہے نہیں اُتار سکتی ۔ بچہ
بیمار پڑتا ہے کوئی تدبیر بن نہیں آتی ۔ اور بن آتی بھی ہے تو اُسی کے حکم سے اُسی کی مرضی سے
غرض نہ ہم اپنے ارادے سے پیدا ہوئے نہ کسی کے ارادے سے ۔ اور نہ اپنے ارادے سے
اتنے بڑے ہوئے اور نہ کسی کے ارادے سے ۔ جو کچھ کیا خدا نے کیا ۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے اُسی
کے کرنے سے ہو رہا ہے ۔ اور جو کچھ ہوگا اُسی کے کرنے سے ہوگا ۔ بے شک دنیا میں بڑی سے
بڑی محبت ماں باپ کی ہے وہ بھی میں خیال کرتا ہوں ایک خاص حالت اور ایک وقت خاص تک
لیکن ماں باپ کی محبت میں سے ایک اعلےٰ درجے کی محبت لو مثلاً اکلوتے بیٹے کی ۔ اور اس کو
خدا کی محبت کے ساتھ مقابلہ کر کے دیکھو تو دونوں محبتوں میں کچھ بھی مناسبت نہیں پاؤ گے ۔
وہ شاید اضطراری ہو اور یہ اختیاری ۔ اُس میں شاید کوئی غرض بھی ہے اور اس میں غرض کا
کہیں پتہ نہیں ۔ وہ پر تو ہے اور یہ اصل ۔ وہ برائے نام ہے اور یہ لا کلام ۔ ماں باپ نہایت
مافی الباب یہ کہ تدبیر کرنے والے ہیں اور خدا ہے نعمت سامان بہم پہنچانے والا ۔ ماں باپ کی

[illegible] جتنی اور جیسی کچھ ہی اسی پر اُن کی کس قدر اطاعت آئی ہی کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہی - وَقَضٰی
رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُہُمَآ اَوْ کِلٰہُمَا فَلَا تَقُلْ
لَّہُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْہَرْہُمَا وَقُلْ لَّہُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا وَاخْفِضْ لَہُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقُلْ رَّبِّ
ارْحَمْہُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا - اے پیغمبر [illegible] پروردگار حکم دیتا ہی کہ اس کے سوائے کسی کو مت
پوجو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرتے [illegible] اگر ان میں ایک [illegible] دونوں تیری زندگی میں
بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو خبردار اُن کے آگے ہُوں [illegible] [illegible] اُن کو جھڑکنا اور اُن سے
بات کرنا تو تعظیم اور تکریم کے ساتھ اور مارے ادب [illegible] [illegible] اور اُن کے
حق میں دعا کرنا کہ اے پروردگار جس طرح انھوں نے مجھے چھوٹے [illegible] پالا ہی اُن پر رحم فرما +
ماں باپ کے [illegible] کو ذرسی خیال کرنا کہ خدا نے اپنی عبادۃ کے ساتھ ماں باپ پر احسان کرنے کا حکم دیا
ماں باپ کے اتنے سے حق پر اُن کا یہ ادب ہی تو خدا کے حقوق کا تو کچھ شمار نہیں اُس کا کیا کچھ
ادب نہ ہوگا - مگر آدمی ایسا ناحق شناس ہی کہ ماں باپ کا تو بعض سعادۃ [illegible] نادر کچھ
حق مانتے بھی ہیں خدا کو تو اکثر خدا کے بندے اتنا بھی نہیں جانتے کہ اُس نے ہمارے ساتھ
کیا ہی کیا ہی کہ اس کی عبادۃ اور شکر گزاری کریں - تو جب مصیبۃ کے وقت بندے نے اِنَّا لِلّٰہِ
کہا تو اس کے یہ معنے کہ اُس نے خدا کے حقوق تسلیم کئے اور وہ تعلق اور خصوصیۃ جو خدا
کو اس کے ساتھ ہی اور وہ شفقۃ اور رحمۃ جو ہمہ وقت اُس کے حال پر مبذول ہی اور وہ ربو
اور مربوبیۃ اور مالکیۃ اور مملوکیۃ کی نسبۃ جو خدا میں اور [illegible] قائم ہی یہ سب باتیں اُس کو
یاد آگئیں - بس پھر کیا تھا انسان نے اس طرف [illegible] [illegible] غلط ہوا نہیں - اس کے
بعد اس کو ضرور دوسرے دوسرے خیالات آئیں [illegible] - اس کو [illegible] ہوگی اپنی تقصیر پر - تنبہ
ہوگا اپنی غلطی پر - کہ فانی ہوکر ایک فانی چیز کے ساتھ [illegible] ایسا تعلق پیدا کیا اور کس لئے
اُس کو اپنے دل میں اتنی [illegible] جگہ دی - مجھکو ادنے [illegible] حق کا تو پاس ہوا اور اعلے درجے
کے حقوق کو ضائع کیا - میں نے [illegible] نکل جانے دیا [illegible] کو پڑا پیٹتا رہا - میں نے باورچی
کا تو احسان مانا اور میزبان کی شکر گزاری کی - دریا کو چھوڑا اور سراب کی طرف دوڑا - پھر وہ
اپنے تئیں ملامۃ کرے گا کہ مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی [illegible] فراموش ہوگا کہ ساری عمر نعمتیں کھائیں

عزیز نے کیسے چین اڑائے جن میں سے مجکو ایک رتی برابر بھی کسی کا استحقاق نہ تھا اب جو ذرا
سی بات خلاف مزاج پیش آئی جس کی لم مجھے معلوم نہیں جس کی مصلحت سے [illegible] آگاہ نہیں تو
لگا منہ بنانے اور بڑبڑانے [illegible] کا مت کھلایا پلایا ضائع - میں اس کارخانہ
دنیا کا مالک نہیں مختار نہیں [illegible] نہیں صلاح کار نہیں - میں دخل در معقولات دینے والا
[illegible]ن - مجکو چون و چرا کرنے کا [illegible] حق - مجکو دیکھو اور خدا کی خدائی پر اعتراض کرنے کو دیکھو - کیا
میں اور کیا میری حقیقت کیا میری عقل اور اس کی اصلیت - یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ
ایسے خیال [illegible] رنج اور غم کم نہیں ہو سکتا اور تجربے میں بھی آیا ہے کہ اگر کسی طرح کا نقصان
ہو جائے یا کوئی آفت آئے اور صدق دل سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ - پڑھے تو اگر خدا کو منظور
ہوتا ہے تو نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے - گم شدہ چیز پا جاتی ہے ورنہ رنج و افسوس کا اثر تو دل سے
یقیناً گم ہو جاتا ہے اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کیسے پیارے لفظ ہیں دو لفظوں میں دو مطلب - دعا کی
دعا اور تسلین کی تسکین - دعا کیا ہے خدا سے آرزو کرنا سو اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ میں بھی آرزو ہے
مگر مقدر یعنی لفظوں میں مذکور نہیں - یہ اس قسم کا جملہ ہے کہ جیسے دو مسافر راہ چلے جاتے
ہوں اور ایک شکایت کرے کہ بھائی میں تو تھک گیا اور اس کا رفیق اس کو تسلی دے کہ گھبراتے
کیوں ہو چلا منزل پر پہنچنے والے ہیں یعنی منزل پر پہنچ کر آرام لے گا - اسی طرح یہاں ہے کہ [illegible]
سمجھو اپاس ٹپک کر جانے والے ہیں یعنی وہ ہماری تکلیف کی راحت دے گا - یہی دعا ہے بلکہ اذعانِ
قبولیت کے ساتھ اور اشارہ ہے اس آیۂ شریف کی طرف - یَا اَیُّہَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ
کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ - اے انسان تو اس دنیا کی زندگی کو بھی سمجھا ہے کہ کیا ہے - ایک سفر شاق
ہے اور جانا کہاں ہے پروردگار کی طرف پھر اس سے ملاقات ہوتی ہے - اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
سے یہ بات بھی نکلی کہ ہم سب کو یہی سفر در پیش ہے اگر ایک پہلے منزل پر پہنچ گیا تو زحمتِ سفر
سے اس نے سویرے نجات پائی اور چونکہ ہم بھی اسی کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں -
اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ - خدا نے چاہا تو ایک نہ ایک دن اس سے جا ہی ملیں گے اور
وہ ملنا ایسا ہو گا کہ اس کے پیچھے بچھڑنا نہیں اس کے بعد مفارقت نہیں - اُولٰئِکَ عَلَیْہِمْ
صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّہِمْ وَرَحْمَۃٌ - اب یہ ہے امتحان صبر کا پورا انعام - خدا کی عظمت اس کی قدرت

اُس کی شان - اُس کا جلال - اُس کا کمال ذہن نشین ہو تو معلوم ہو کہ یہ الفاظ کیسی نوازش اور کس درجے کی سرفرازی پر دلالت کرتے ہیں - آج ایک دنیا کا بادشاہ کسی کو ورد رحم لکھ دیتا ہی تو وہ مارے فخر کے جامے میں پھولا نہیں سماتا - اور یہ مورد مراحم تو مالک کون و مکان خلاق زمین و آسمان روزی دہندۂ انس و جان فرمان فرمائے کن فکان کا لکھوایا ہوا ہو سبحان اللہ خدا کی درگاہ میں صابرین کی کیسی عزۃ و توقیر ہی - تو اے بھائیو جو سامنے بیٹھے ہو اور اے بہنو جو قنات کی آڑ میں ہو اتنی بات سُن رکھو کہ دنیا کا انتظام ہزاروں برس سے جس طرح پر چلا آرہا ہی جب تک خدا کو منظور ہی اُسی طرح پر چلا جائے گا - موت سے تو کیا حقیقتہ ہی بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر - بڑے بڑے زبردست بادشاہ - بڑے بڑے حاذق طبیب موت کے آگے کوئی دم نہیں مار سکا تو ایسی مجبوری کے مقام میں بے فائدہ جزع و فزع کر کے اپنا ثواب بھی کیوں کھوؤ - اس سے کہ ہار کر جھک مار کر آخر کار چار و ناچار صبر کرو کہ صبر کا رتبہ ہی عین مصیبت کے وقت صبر کر کے اُن صابرین میں کیوں نہ داخل ہو جن کے مدارج میں نے تم کو سُنائے خدا مصیبت زدہ کو صبر جمیل کی توفیق دے آمین - سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَ سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ - (شرعی جبر)

گیارہویں فصل - آزادی کا سوگ اور اُس کے ابتداء بیوگی کے خیالات

جن دنوں مستجاب مرحوم نے بے دل ہو کر وعظ میں کمی شروع کی تو اُن کے والد نے نصیحت کے طور پر اُن سے کہا تھا کہ تمہارا وعظ ایسا ہی جیسا لڑکوں کا پالا چھونا - ایک وعظ ہمارا تھا کہ ایک ایک سیپارے کو سارے سارے برس گھسیٹا اور سوا سوا ڈیڑھ ڈیڑھ پہر وعظ کہا - تو ہم نے اُس کو خود ستائی اور مبالغہ سمجھا تھا کہ ایک سیپارہ برس روز تک کیوں کر گھسیٹا جا سکتا ہی - اب جو مولوی متقد علی کا وعظ سُنا تو یقین آیا کہ بعض مولویوں کو خدا نے ایسی ہی گویائی اور آمد عطا فرمائی ہی کہ سیپارہ کیسا - وہ چاہیں تو ایک رکوع کو برس روز تک گھسیٹ لے جائیں - مولوی متقد علی نے اچھا خاصہ ایک پہر ایک آیۃ میں لگایا اور پھر تنگی وقت کے خیال سے بہت سی موقوف کر دی ہوگی مجمع کوئی سو دو سو مرد عورۃ ملا کر پانچ چھ سو آدمیوں کا مجمع تھا - اپنی اپنی جگہ سبھی متاثر ہوئے اور آزادی پر بھی خاص اثر

ہوا ہوگا کیوں کہ تمام وعظ میں مولوی صاحب کا روئے سخن اُسی کی طرف تھا۔ لیکن ایسے
شوہر کے رنج اتنے بھاری صدمے بھولتے بھولتے بھولتے ہیں۔ بشاشت تو کہاں دھری تھی۔ عدۃ بھر
تو کچھ آپ ہی چُپ رہی۔ اتنا فرق ضرور ہوا کہ خدا جانے قضائے عمری تھی یا نفلیں نماز
بہت پڑھنے لگی۔ اور یوں سیپارے سوا سیپارے کی تلاوۃ کا معمول تھا اب بھی بشوق کا ورد بلا ناغہ
وہ بھی ترتیل کے ساتھ۔ غذا بھی شکم سیر تو نہ تھی مگر وہ بات بھی نہ رہی کہ تین تین چار چار
وقت صفایا۔ غرض رنج ہی رنج کچھ پنپتی سی چلی تھی کہ اتنے میں عدۃ پوری ہوئی۔ اس موقع پر
بچاری کو پھر ایک جھکولا لگا جیسے آبلے زخم کو ٹھیس۔ مگر وہ کچھ ایسا دیرپا نہ تھا۔ غم غلط
کرنے کی دو ہی تدبیریں ہوتی ہیں ایک یہ کہ خارج میں کوئی چیز طبیعۃ کی ہیجان دلانے والی
نہ ہو۔ دوسرے دل سے رنج کے خیالات کو پیدا نہ ہونے دیا جائے۔ ہادی بیگم نے بیٹی کے لئے
دونوں ہی طرح کی تدبیریں کیں۔ حتی الوسع پُرسے والیوں کو آزادی تک نہ آنے دیا کہ آکر
اس کے غم کو تازہ کریں گی۔ مولویوں کے وعظ سنوائے کہ اس کو خدا کی لَو لگے اور دل سے
رنج دور ہو۔ اس کے علاوہ آپ اس طرح ستّو باندھ کر بیٹی کے پیچھے لپٹی کہ ایک دم کے لئے
اُس سے جدا نہ ہوتی تھی۔ شوہر تو مرا ایک کا اور عدۃ میں بیٹھیں ماں بیٹیاں دو۔ پہلے تو ہم
سب کو یہی خیال ہوا تھا کہ بیٹی کی عدۃ پوری کرا کے گھر کا کام کاج دیکھنے بھالنے لگے گی۔
لیکن عدۃ ہو ہوا بھی چکی اور ماہر کہ بیٹی کو نہیں چھوڑتی۔ اور نہیں چھوڑتی تو پڑے چولھے
میں اپنا گھر تو سنبھالے۔ نہیں۔ بیٹی تو بیوہ ہوئی اس لئے کہ اس کا شوہر مرا۔ اور یہ شوہر
کے جیتے جی بیوہ بن بیٹھی۔ جس وقت سے داماد کے مرنے کا تار آیا وہ دن اور آج کا دن اس
بندی اللہ کی نے خواجہ آزاد کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھا کہ کون ہے اور اس سے بھی میرا کسی طرح
کا واسطہ اور سروکار ہے یا نہیں۔ خدا جانے ہادی کے جی میں کیا تھا مگر ظاہر ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ یا تو اُنہیں آپ جھینپتی سی تھی کہ جوان بیٹی بیوہ کے ہوتے لوگ کیا کہیں گے۔ یا بیٹی کے
ساتھ اپنا عشق جتانا منظور تھا۔ بیوی کا یہ برتاؤ دیکھ کر آزاد پہلے تو کچھ منقبض سا رہا اور
پھر لگا بگاڑ کی سی باتیں کرنے۔ اُدھر آزادی ماں کے ہر وقت چھاتی پر سوار رہنے سے بے زار ہو گئی
تھی۔ اس کی طبیعۃ ڈھونڈتی تھی تخلیہ کہ گھڑی دو گھڑی کو ماں سے الگ ہو تو سمجھے بوجھے کہ آگے کو

کیا کرنا ہوگا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ منہ پھوڑ کر اسے کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم کیوں ہر دم میری
گود میں گھسی رہتی ہو۔ بارے اپنے میں آزادی کی سسرال سے بلاوا آیا کہ یہ کہ کا کھر تو یہ تھا سو جو
خدا کو منظور نہ ہوا اور ہم بھی جانتے ہیں کہ علاقہ تو علاقے والے کے ساتھ گیا ہماری بہو کو
سہا نہیں جان پہچان سمجھ کر یا تو بھیرنے کے لئے ہفتہ عشرہ نہیں اگر رہ جائیں تو کیا ہے اس میں
مرنے والے کی روح خوش ہو جائے گی۔ آگے آنے والوں اور بھیجنے والوں کو اختیار ہے ہم تو اپنی
طرف سے اخیر دم تک لپٹے ہی چلے جائیں گے۔ ہندوستانیوں کا طرز معاشرت کچھ ایسا بے ڈھب
بگڑا ہے کہ ساس بہو دن۔ نند بھاوجوں یعنی دو سمدھیانوں میں رشتہ ہوتے پیچھے بہت ہی کم
صفائی باقی رہتی ہے۔ اور جس کو ہم صفائی سمجھتے ہیں اس کے بھی یہ معنے ہیں کہ ظاہر میں ٹھکا
فضیحتہ نہیں ورنہ دلوں میں گلوں کے انبار شکووں کے ڈھیر۔ قاعدے کے مطابق آزادی
اور اس کی سسرال والوں میں بھی لڑائی جھگڑا تو کبھی ہوا نہیں مگر دوستی اور محبت بھی نہ تھی۔
اور اس میں قصور آزادی ہی کا تھا۔ اس نے جاتے کے ساتھ میاں کو ایسا اپنے بس میں کر لیا
کہ وہ مرحوم بے اس کی مرضی کے تنکا نہ توڑتے۔ اس پر وطن کا چھوڑنا۔ مولوت سے منہ موڑنا
نوکری کا اختیار کرنا۔ بھوپال میں جا کر مرنا۔ گو آزادی کو ان باتوں میں کسی طرح کا دخل نہ تھا
۔ اس نے میاں کو بہکایا نہ سکھایا مگر بدگمانی کا کیا علاج سسرال والوں نے یہ سارے گناہ
اسی کے نامۂ اعمال میں لکھ رکھے تھے۔ آزادی کی ساس نے جو بیٹے کے مرنے کے بین کئے ان
میں بھی تو اسی کا رونا تھا۔ اب بلایا تو بلاوے میں بھی ہمدردی کی بو نہ تھی۔ لیکن آزادی
کو ماں کی گرفت سے نکل بھاگنے کا موقع ملا۔ وہ کتنے کتنے دنوں سے اس خیال میں تھی اور
اکثر سوچا کرتی تھی کہ اماجان جو ایک لمحے کے لئے میرے پاس سے نہیں کھسکتیں میں یہ تو
نہیں کہتی کہ انھوں نے میرے اوپر پہرہ بٹھایا ہے بلکہ وہ اپنے پندار میں میرا دھیان بٹوانا
چاہتی ہیں کہ اکیلی بیٹھے گی تو اس کو اپنے گھر کا خیال آئے گا اس کا دل کڑھے گا اس سے بہتر
ہے کہ اس کو ایسا موقع ہی نہ دو۔ ان کو اپنی ماتا کے آگے نہیں سوجھتا کہ ان کے ہر وقت
کے چمٹے رہنے سے مجکو قریب قریب ویسی ہی ایذا ہوتی ہے جیسی اپنی حالت کے
یہ حالت تو میری خدا نے کر ہی دی نہ سوچنے میں کوئی سہاگن نہیں ہوئی جاتی۔ ادھر آخر کب تک

[illegible] کر [illegible] ال والے ان [illegible] ہی آپ ہی آپ مجھ سے بگڑے رہتے تھے
[illegible] دھکیل کر پردیس بھیجا نہ پردیس جاتے نہ مفت میں اپنی
جان کھوتے [illegible] مجھے دیکھ دیکھ ان لوگوں کی آنکھ میں خون اُترتا ہی اور وہ مجھکو بیٹھنے والی ہی کب
سمجھے [illegible] میں شرطیں لگاتے اور قسمیں کھاتے ہیں کہ یہ دوسرا نکاح کرے اور کرے
رہا پر اپنا تو اُس پر (خدا میری اماں کو جیتا رکھے) میرا ہر طرح کا دعوے چل سکتا ہی بھاوجیں
بھی کبھی کبھو لڑائی میں تو ان کا میرا رشتہ ہی ایسا ٹھیرا۔ اور اماں کے ہوتے میں بھائی بھاوجوں
کی پروا بھی کیا رکھتی ہوں۔ لیکن یہ کیسا پیچ آکر پڑا ہی کہ میرے سبب سے اماں اور آپا میں بگاڑ
پڑ گیا اور پڑتا چلا جاتا ہی۔ کیا غضب ہی کہ اماں بالکل نہیں سمجھتیں اور میرے کارن اپنا عمر بھر کا
گھر غارت کئے ڈالتی ہیں۔ اور نواب نے جیتے جی میری تیس روپئے کی تنخواہ بھی کر دی ہی۔
ہی ہی رانڈ سمجھ کر۔ حاشا میں تو نہیں لینے کی۔ جس کی بیوہ بن کر تنخواہ لوں اُس کو تو ایسی
آمدنی کی چڑ تھی۔ بلا سے سلائی کا سیوں گی۔ دونوں وقت نہیں ایک ہی وقت کھاؤں گی
میرے اکیلے دم کے لئے بہت ہی۔ اور اب مجھکو چاہئے بھی کیا۔ موٹا جھوٹا پہن لیا۔ روکھی
سوکھی کھالی۔ الله الله خیر صلاح۔ لیکن نواب نے خط میں تو نہیں لکھا کہ بیوہ سمجھ کر تمھاری
تنخواہ کرتا ہوں۔ اپنا گھر کا بھولا۔ اُس کے اپنے ملک میں رانڈوں کی کمی پڑی ہی کہ یہاں
دلی میں میری تنخواہ مقرر کرنے آیا اور دلی میں بھی میری خصوصیت ہی کیا تھی۔ یہ تنخواہ تو
جان کا معاوضہ ہی۔ نواب کے اچھے سے لوں۔ اور نہ دے تو رزیڈنٹ کے آگے جا کھڑی ہوں
ماں باپ پر تو میں اپنا بوجھ ڈالنے سے رہی۔ اُنھوں نے ایک دفعہ مجھکو بیاہ دیا جو کچھ میری تقدیر
کا تھا دے دلا کر رخصت کر دیا میری ساری عمر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا کہ پھر اُن کے سر پر آ کر
پڑوں۔ کچھ ہی کہو میں ویسی عزت سے تو اس گھر میں نہیں رہ سکتی جو اُن کے جیتے جی تھی۔
اور پھر ایک بڑی قباحت یہ ہی کہ مجھے سینگ کٹا کر بچھڑوں میں ملنا پڑے گا وہ ایک طرح کی
خود مختاری جو بیاہے جانے سے مجھکو حاصل ہوئی تھی رفتہ رفتہ بالکل جاتی رہے گی۔ وہ انجام
مجھکو نظر آرہا ہی کہ اس گھر میں میرا وہی وقر ہوگا جو ایک ماما یا لونڈی کا ہوتا ہی۔ بلا سے اقیم
[illegible] رہوں گی اور بھائی بھاوجوں کے طعنے منہ سے میں نہ آئندہ سنوں گی۔ بات یہ ہی کہ

رنج کی وجہ سے آزادی تنک مزاج بھی ہو گئی تھی اور بدگمانی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ لفظوں کے ایسے پہلو سوچتی جن کی طرف سوائے اس کے کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ چیزوں کے سبب تراشتی بے اصل۔ باتوں کے نتیجے نکالتی غلط۔ پر بلاشبہ اس نے یہ خوب سوچا تھا کہ اس کا سسرال میں رہنا کہیں بھی گذر نہیں ہو سکتا۔ آزادی ان خیالات سے بھری بیٹھی تھی کہ سسرال کی ماما بلاوا لے کر آئی۔ ہادی بیگم نے تو ماما کو دالان میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا کہ آزادی کے روبرو اس سے بات چیت کرنا کیا ضرور ہے الگ لے جا کر کچھ عذر معذرت کر دوں گی۔ مگر آزادی تو میکے سے جانے کے لئے حیلہ اور نکلنے کے لئے بہانہ ڈھونڈ رہی تھی اُس نے ذرا ترشی کے ساتھ ماسے کہا اے بی لئے دو ماما نے بلاوا دیا۔ ہادی بیگم تو لگی عذر کرنے۔ آزادی بول پڑی کہ ہاں ہاں میں چلوں گی۔ ماں نے بیٹی کے ساتھ ردوکد کرنا مناسب نہ سمجھا اور اچھا کیا۔ آزادی سسرال گئی اور چند روز میں وہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھا۔ جیسا سمجھے ہوئی تھی اپنی طرف سے لوگوں کو زیادہ رُکا ہوا پایا۔ وہ لوگ دنیا سازی کے طور پر کہتے ہی رہے یہ چار دن رہ کر رخصت ہوئی۔ لوگوں نے جانا میکے جا رہی ہے اور یہ اگر اتر ہی اپنے الگ مکان میں جس میں میاں کے جیتے جی رہا کرتی تھی۔ میکے والوں کو بھی جب اگلے دن ماما معمول کے مطابق خیر صلاح کی خبر کو گئی تب معلوم ہوا۔ ہادی بیگم نے سنتے کے ساتھ ڈولی منگوائی۔ اتنے میں آنکلا آزاد۔ بی بی کو جانے کی طیاری کرتے دیکھ پوچھا کہ اس وقت کہاں جا رہی ہو۔ ہادی۔ آزادی کل کی سسرال سے آکر اپنے الگ گھر میں آتر پڑی۔ خواجہ آزاد۔ پھر؟ ہادی۔ جاتی ہوں اور ابھی اُلٹی اُس کو سوار کر کے لے آتی ہوں۔ خواجہ آزاد۔ اور اگر وہ نہ آئی۔ ہادی۔ تو میں وہاں رہ پڑوں گی اُس کو اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی۔ آزاد۔ بس اسی دن کے لئے کہتے ہیں کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ تم نے جو جو تدبیریں کی ہیں میں شروع سے دیکھ رہا ہوں اور مجکو تمھاری رائے سے اتفاق نہیں۔ مگر معاملہ تھا نازک میں کچھ بول نہ سکا۔ ہادی۔ تم اپنی وہی تدبیر پیٹے جاؤ تقدیر کے آگے کوئی تدبیر کام نہیں کرتی میں بیچاری کیا تدبیر کروں گی۔ مرنے والا مر گیا سب صبر شکر کر کے بیٹھ رہے۔ اُس کو تو مرنا ہی تھا یہاں رہتا تو بھی مرتا مگر چار و ناچار دو ادرمن میں دخل دنیا پڑتا تم تو ہم کو جیتا بھی نہ چھوڑتے اور یہی اُلاہنا دیتے کہ تمھاری بے تدبیریوں نے مارا۔ آزاد۔ میں تو اب بھی کہتا ہوں کہ تمھاری

مولویوں نے مارا - مجکو اب معلوم ہوا کہ اس کو اختلاج قلب کی بیماری تھی اور گرمیوں میں
اِس کا دورہ ہوا کرتا تھا اور بعض مرتبہ گرم غذا کھا لینے سے جاڑے میں بھی دھڑکن ہونے لگتی تھی -
اگر مجکو شرع تو میں ہرگز اس کو جانے نہ دوں - گرمیوں کے دن - ریل کا سفر - دکن کی لُو - گھر
کی مفارقت کا صدمہ - اُن پر مزید وہ انقباض جو ہندوستانی ریاستوں کے معاملات کی وجہ سے
خواہی نخواہی پیدا ہوا ہوگا - میں تو ایسی حالت میں اُس کی زندگی کا بیمہ ایک پیسے کو بھی نہ لیتا -
مگر خیر اس کا تذکرہ کیا ہے جو ہونا تھا سو ہوا - میں تو تمھاری ان بے تدبیریوں کو کہتا ہوں جو تم
آزادی کے حق میں کر رہی ہو - شروع سے تم کو اس کا اہتمام ہے کہ یہ رنج نہ کرے روئے نہیں
اور اسی غرض سے تم ہمہ وقت اس کو لازم رہتی ہو - اسی غرض سے تم نے اس کو مولویوں کے
وعظ سنوائے ہیں - لیکن تم اتنا تو سمجھو کہ رنج اور رونا تقاضائے طبیعت ہے کسی کے روکے رُک
نہیں سکتا - جس طرح چوٹ کو دکھ لازم ہے اسی طرح صدمہ رسیدگی کو رنج - اور جس طرح جوں جوں
وقت گزرتا جاتا ہے چوٹ کے درد کا احساس خود بخود کم ہو جاتا ہے بعینہ اسی طرح جوں جوں وقت
گزرتا جاتا ہے رنج بھی خود بخود گھٹتا اور کم ہوتا چلا جاتا ہے - مصیبت میں سب سے بہتر طریقہ
ہمدردی کا یہ ہے کہ مصیبت زدہ کو ایک وقتِ خاص تک اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے -
اس طریقے سے جو تسکین آخر کار حاصل ہوگی وہ ازبسکہ قاعدۂ طبیعت کے مطابق ہوگی زیادہ
پائدار ہوگی - تم نے قبل الوقت اس کو تسکین دینی چاہی اور سمجھیں کہ میری تدبیر کارگر ہوئی
مگر یہ تمھاری غلط فہمی تھی - نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے گھبرا گھبرا کر تمھارا علاج چھوڑ دیا - اب بھی
مصلحت یہی ہے کہ اُس کے حال سے بالکل تعرض نہ کرو اور اُس کو اسی کی رائے پر رہنے دو -
انسان کو خدا نے آزاد پیدا کیا ہے اور ہر ایک انسان آزاد رہنا چاہتا ہے - اگر آزادی کو سختی کے
ساتھ روکا جائے تو وہ دوسرے بُرے پیرایوں میں پھوٹ کر نکلتی ہے - اس کی ایسی مثال ہے
کہ زمین میں ایک بیج موجود ہے اور یقیناً معلوم ہے کہ اپنے وقت پر وہ بیج زمین کے اندر ہی
اندر پھولے گا - پھٹے گا - اس میں کونپل پیدا ہوگی - وہ بڑھے گی - پھیلے گی - یہاں تک کہ
اچھا خاصہ ایک درخت بن جائے گا - اب اگر ہم کونپل کے نکلنے سے پہلے اُس پر ایک
بڑا بھاری پتھر رکھ دیں اور اُس کو اُبھرنے نہ دیں تو ریشے دوسرا راستہ ڈھونڈ نکالیں گے -

ہوں۔ خود کی شاخیں کچھ ہوں تو ہوں مضمحل ہوں تو ہوں مگر نہیں ہو سکتا کہ نہ ہوں۔ غلاموں
اور ادنے درجے کے آدمیوں میں اکثر برے اخلاق کے ہونے کا یہی سبب ہوتا ہے کہ اُن کو
پوری آزادی نہیں۔ پس اگر تم بیٹی کی عافیت اور سلامتی چاہتی ہو تو میری [illegible] کہ اُس کو
اختیار خود رہنے دو۔ اب تم کو اس پر اپنی حکومت بٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ وہ بھی تم جیسی
عورت ہے۔ اپنا نفع نقصان خوب سمجھتی۔ اور مناسب نامناسب میں امتیاز کرنے کی [illegible]
مجھکو بڑا خوف یہ ہے کہ تمھارے بے جا دباو ڈالنے سے کہیں کوئی برا نتیجہ پیدا نہ ہو۔ اُس کا سسرال
سے اپنے گھر جانا اور تم سے اجازت نہ لینا اور تم کو خبر نہ کرنا اسی سے سمجھ لو کہ اُس کو تمھاری [illegible]
میں رہنا منظور نہیں۔ اَلعَاقِلُ تَکفِیہِ الْاِشَارَہ۔ خواجہ آزاد نے جو اس طرح کی باتیں کیں چونکہ
واجبی اور معقول تھیں ہادی بیگم نے ڈولی الٹی پھروا دی اور بیٹی کو اس کی شکایت بھی تو کہلا کر
نہ بھیجی کہ تم نے یہ کیا کیا؟ +

بارہویں فصل آزادی اپنے دل کے بہلنے کی تدبیریں سوچتی ہے اور آخر کار خود [illegible]

وہاں آزادی نے اپنے گھر میں اکیلی پائی تو اس کے دل کو بھی ایک طرح کی [illegible]
سوچنے خیال کرنے کی تو ماکے گھر میں بھی مناہی نہ تھی مگر نہیں اُس کو کچھ اسی کی خوشی تھی کہ کسی
کی صورت نظر نہ پڑے۔ گھر میں اُترتے کے ساتھ اُس نے ماماؤں سے کہہ دیا کہ خبردار ہر وقت
اندر کی کنڈی لگائے رکھو اور کسی کو نہ آنے دو۔ یہ وہی گھر تھا جس میں دو پونے دو [illegible]
مولوی مستجاب رہ سہ کر بھوپال گئے تھے۔ آزادی کو دیکھ کر یاد آیا کہ یہاں سوتے تھے
اس جگہ بیٹھتے تھے۔ اور آج وہ کوٹھری میں بند ہو کر اس طرح کا رونا رونی جس طرح اُس کا
جی چاہتا تھا۔ نہ کوئی چھڑانے والا۔ نہ کوئی سمجھانے والا۔ جب اچھی طرح دل کی بھڑاس
نکل لی تو آنسو پونچھ باہر آ گئی۔ اور اپنی دوا اور گھر کی دو ایک ماماؤں کو بات چیت
کے لئے بلا کر پاس بٹھا لیا۔ روتے روتے سر میں درد تو بڑے زور کا ہو [illegible]
طبیعت نسبتاً اور دنوں کے بہت ہلکی تھی۔ معمول یہ تھا کہ وقت پر نماز پڑھی۔ جب [illegible]
دیر طبیعت حاضر رہی قرآن کی تلاوت کی۔ ماماؤں کا [illegible] ہنسوا لیا۔ باورچی خانے میں

جا لگڑی ہوئی - اکیلی پڑی کچھ سوچا کی - سینا لے بیٹھ [illegible] یاں کے خط سب جمع کر رکھے تھے اُن کو پڑھا کی - دوا کو کہانیاں بہت یاد تھیں اس لے رات کے کھانے [illegible] واسطے کوئی مناسب وقت کوئی کہانی چھیڑ دی وہ سُنتی رہی - مولوی مستجاب کے [illegible] تو بھلا [illegible] - ان کے پیچھے اسی گھر میں اکیلی نے دس مہینے گزارے نہ کبھی وحشت ہوئی اور نہ تنہائی سے گھبرائی اس واسطے کہ پھر بھی ان کے آنے کی آس تھی - یا کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ [illegible] کام طلبی کا خط آنے والا ہے - اب باوجودے کہ جتنے ہی آدمی تھے [illegible] مکان ہے کہ بڑا بھائیں بھائیں کر رہا ہے رات کے وقت ایسا معلوم ہو کہ دیواریں چھاتی پر چڑھی چلی آتی ہیں - دن کٹتا ہی بے مزہ - رات گزرتی ہے بے لطف - یادگاری کسی قسم کی نہیں بھی ہوتی پر ایک کوفت ہے کہ دم بدم لحظہ بلحظہ دل کو نچوڑے چلی جاتی ہے - ایک وقت وہ تھا کہ آزادی بیاہ سے متنفر تھی اور جن دنوں اس کی منگنی کی بات چیت ہو رہی تھی یہ چاہتی تھی کہ کواری بیٹھی رہوں تو بہتر کیوں کہ وہ بیاہ کی حقیقت سے واقف نہ تھی اور کپڑے [illegible] اور مہمان داری اور سامان ظاہر یہ چیزیں اس کی نظر میں کچھ وقعت نہیں رکھتی تھیں [illegible] بیاہ ہوا تو اُس نے جانا کہ اب میں نے دوسرا جنم لیا - اور جس کو زندگی کہنا چاہیے [illegible] بیاہ کے بعد سے شروع ہوئی - ہر ایک بات میں غور کرنے کی عادۃ تو اس کی سدا سے تھی ہی بیاہ [illegible] بھی یہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ اگرچہ لوگ آپس میں رشتے قرابۃ دوستی ملاقات کے تعلقات رکھتے اور ان تعلقات کا لحاظ و پاس بھی کرتے لیکن خیال کر کے دیکھا تو بچہ جب تک ما کا دودھ پیتا ہے بس وہ ایک [illegible] تعلق ہے [illegible] دون ماں کے بچے کی گذر [illegible] سکتی - اور باقی تعلقات تو من سمجھوتی اور برائے [illegible] ہیں [illegible] تعلق ما باپ کا - اُس سے اتر کر بھائی بہن کا سو بچہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا ما باپ کا تعلق گھٹتا [illegible] یہاں تک کہ اولاد الگ گھر کر کے بیٹھی ما باپ غیر داخل - بلکہ بعض [illegible] باپ اور اولاد میں ایسے بگاڑ پڑ جاتے ہیں کہ ملنا جلنا موقوف - صاحب سلامۃ ترک [illegible] رہے بھائی بہن شاید ایسا کوئی [illegible] میں بھائی بہن آپس میں پیار اخلاص رکھتے ہوں ورنہ [illegible] تو ہو لیں اور حسد [illegible] کون سا دن ہے کہ چھوٹوں چھوٹوں میں سودے سلف کی بانٹ چونٹ پر مار کٹائی نہیں ہوتی - یہ [illegible] نہیں تو کیا ہے - یہی چھٹپن کی چشمک بڑے ہوتے ہوتے پیچھے لڑائیاں ڈلواتی جھگڑے کراتی - خون کا پہلا دھبہ

جورو سے زمین پر لگا وہی تھا کہ آدم کے بیٹے ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کو مارے حسد کے مار ڈالا
غرض بیاہ سے پہلے تک آزادی کسی تعلق کی قائل نہ تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ انسان کو اپنے ابنائے جنس
میں سے کسی کے ساتھ دل بستگی نہیں ہوتی۔ بیاہ کا ہونا تھا کہ اس کی رائے بالکل بدل گئی۔ وہ
پہلے حیران ہوا کرتی تھی کہ [illegible] کا اعتنا اس میں کیا مصلحت ہے۔
بیاہ [illegible] اس کی آنکھیں کھلیں اور سمجھی کہ انسان میں [illegible] مادہ بھی ودیعت رکھا گیا ہے
[illegible] روح کی غذا اس کے دل کی تسکین اور باغ زندگانی کی بہار [illegible] اپنے جدید تعلق
کو بہت عزیز رکھتی۔ اور اس کی بڑی قدر کرتی۔ اور اپنی حالت پر نظر کر کے خوش ہوتی۔ ہر شخص
سمجھ سکتا ہے کہ ایسی عورت پر بیوگی کس قدر شاق ہونی چاہیے اور واقع [illegible] میاں مرا
آزادی نہ زندوں میں تھی نہ مردوں میں۔ باولی نہیں کہ ننگے [illegible] ایسے ہوش نہیں
کہ آپے کو سنبھالے۔ سب سب جتن کر کے دیکھے کہ کسی [illegible] دل کو قرار [illegible] ہے کہ کسی طرح کام
پر نہیں جمتی۔ کسی شغل سے نہیں بہلتی۔ وعظ بیٹھی سن رہی ہے اور [illegible] آپ
[illegible] میں نہیں آتا کہ مولوی صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ نماز کو [illegible] ہے اور
[illegible] چاہتی ہے کہ دل رجوع ہو بھول بھول جاتی ہے کہ کے رکعتیں پڑھیں۔ نہیں معلوم نری
[illegible] جھک کر رکوع میں گئی اور سورۃ نہیں ملائی یا خدا جانے ملائی۔ یاد نہیں کہ ایک [illegible] یا دو
[illegible] کر بیٹھی نہ زبانی یاد آتا ہے نہ حرف سوجھ پڑتے ہیں۔ میکے میں رہی ایک دن جی نہ لگا۔
[illegible] سسرال گئی وہاں [illegible] وحشت ہوئی۔ الگ گھر میں آ کر رہی یہاں بھی وہی اس دھکا سہ
مولوی [illegible] سارے کپڑے اور تمام کتابیں کل چیزیں مساکین کو تقسیم کر دیں کہ آنکھوں
[illegible] رہیں کی کو یادگاری کو تازہ کریں گی [illegible] اس کی سمجھ کی غلطی تھی۔ باہر کی چیزوں سے
نہیں بلکہ یادگاری اس کے اپنے دل سے پیدا ہوتی تھی۔ [illegible] آپ ہی یاد کرنے والی۔ آپ
ہی یاد دلانے والی۔ آپ ہی رونے والی۔ آپ ہی رلانے والی۔ عدت کے کتنے دنوں بعد تک
[illegible] اس کا یہ حال رہا کہ جہاں اس نے لوگوں کو اپنی بابت کہتے ہوئے سنا تھا کہ اس کو کسی شغل
میں لگاؤ تو گو رنج کے خیالات اس کو [illegible] مگر اس تکلیف میں بھی اس کو
ایک طرح کا مزہ ملتا تھا [illegible] دوسرے [illegible] سے چڑتی تھی۔ آخر اس کو آپ ہی آپ

اتنی سمجھ آئی کہ یہ میری حالت نہایت خراب حالت ہے۔ دنیا تو خیر جیسی خاک ہوئی سو ہوئی اس رنج
کے پیچھے میرا دین بھی برباد ہوا چلا جاتا ہے [illegible] اتنا رنج کرکے کیا کر لیا اور آئندہ ساری عمر
اسی طرح رنج کئے جاؤں گی تو کیا کروں [illegible] اپنی طبیعت کا اندازہ کرتی ہوں تو یہ رنج میری
جان کے ساتھ [illegible] طبیعت کو کسی شغل میں لگاؤ تو ان کو میری [illegible] میں
میں کب چاہتی ہوں کہ یوں اپنے تئیں مٹی میں ملائے رہوں۔ مگر دل ہی اپنے اختیار میں نہ ہو
تو اس کا کیا علاج۔ میں نہیں جانتی کہ لوگ میرے لئے کونسا شغل تجویز کرتے ہیں۔ جانور۔ بالوں
تو بچپن میں میں نے جیسے جانور پال چکی ہوں۔ ایک دفعہ میری [illegible] لالوں سے کچا کچ دو پنجرے
بھرے۔ ایسے بلا کے بولنے والے کہ بس سارے دن یہ معلوم ہوتا تھا کہ ارگن باجا بج رہا ہے۔
آٹھ آٹھ دس دس ایک ساتھ مل کر بولیں تو دالان گونج اٹھے۔ جاڑا آیا خود بخود مرنے شروع ہوئے
ہتیری تدبیریں کیں جب صبح کو پنجرہ کھولوں ہر روز دو تین کو مردہ پاؤں۔ وہ دن [illegible]
آج کا دن پھر تو میں نے لالوں کے پالنے کا نام نہیں لیا۔ ہمارے طوطے کا بچہ ڈیڑھ دون سے منگوایا
[illegible] کے پیچھے سر کھپایا۔ بیٹا مٹھو نبی جی بھیجو۔ حق اللہ پاک ذات اللہ نبی تو خدا
خدا کا رسول [illegible] ہو خدا کو نہ بھول۔ قطب قطب ربانی بھوکے کو کھانا پیاسے کو پانی + یہ سب
[illegible] سے ادا کرے کہ خود ہم گھر والوں کو اکثر شبہہ ہو جاتا تھا کہ طوطا بول رہا ہے یا کوئی بچہ
گھر میں [illegible] کے نام اس کو معلوم ہر ایک کے ساتھ اس کی لیاقت کے مطابق گفتگو
محلے محلے اس کے بولنے کا شہرہ۔ کہ ہر روز دو چار نئے آدمی اس کی باتیں سننے کو آتے۔ ہر چند
میں چھپاتی تھی کہ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے مگر لوگ بہت منتیں کرتے تو ناچار پنجرہ لا کر سامنے لٹکا دیتی
اور طوطا گھنٹوں باتیں کرتا۔ ایک دن دیکھتی کیا ہوں کہ باتیں کرتے کرتے طوطے نے خلاف عادت
جنگلی طوطے کی طرح دو تین بار ٹائیں ٹائیں کی اور اڈے پر سے گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ جلدی سے کھڑکی
کھول کر نکالا تو مرا ہی پڑا تھا۔ اس طوطے کے مرنے کا ایسا صدمہ ہوا کہ مارے رنج کے
کئی دن تک میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اور میری طبیعت بھی [illegible] طرح کی ہو گئی کہ رنج
کی مطلق سہار نہیں [illegible] کے پالنے سے بھی کان [illegible] کوئی
بڑا آدمی آیا تھا اور اس نے نانا ابا کو ایک مینا نذر دی تھی۔ ان کو معلوم [illegible]

شوق ہی۔ نانا ابا نے وہ مینا مجکو دی۔ بس [illegible] کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ مینا کس کمال کی تھی۔
عربی۔ فارسی۔ اُردو۔ بنگالی۔ انگریزی۔ پانچ زبانیں بولتی تھی۔ بنگالی انگریزی تو میں سمجھتی
نہ تھی لیکن عربی فارسی اردو صاف سمجھ میں آتی تھی۔ اور بے تکان ایسی کہ کسی وقت بند نہیں
آدھی رات گئے تک [illegible] باتیں کرنے کو موجود۔ معلوم تھا کہ مینا کے کانٹا نکلا کرتا ہی اور اکثر اُس سے
جان بر نہیں ہوتی اُس [illegible] سیوں علاج بہم پہنچا—
اور سو دوائیں جمع کرکے رکھیں کہ ذرا کانٹے کا خلل ظاہر ہو اور تدبیریں کروں۔ کانٹا نکلا اور
[illegible] بھی ہوئیں مینا کی تو قضا آچکی تھی آخر اس کا چراغ حیات گل ہو کر رہا۔ سو لے مینا کے
[illegible] کا مجکو اس قدر قلق ہوا کہ اب بھی ایک گھنٹے میاں کو روتی ہوں تو ایک منٹ مینا کو۔
[illegible] یہ ہی کہ انسان کو جانوروں کے مزاج اور ان کی خصلت سے پوری پوری آگہی تو ہی نہیں آدمی
[illegible] نزدیک کرتا ہی بھلی اور وہ ہو جاتی ہی بُری۔ خدا جانے پنجرے میں بند رکھنے کی ایذا ہوتی ہی
یا اپنے ہم جنسوں سے نہیں ملنے پاتے یہ تکلیف اُن کو پہنچتی ہی غرض کوئی نہ کوئی [illegible] تو
ضرور ہوتا ہی کہ پلے ہوئے جانور اکثر کُڑھ کُڑھ کر اور گھل گھل کر وقت سے [illegible]
جانوروں کا ناحق میں خون ہوتا ہی تو خدا کا کتنا بڑا گناہ ہوتا ہوگا۔ اور پلے ہوئے جانور کا مرنا بس
اس کے صدمے کی اُسی کے دل کو خبر ہی جس نے کبھی جانور پالے ہوں۔ پس جانوروں کا پالنا مفت
میں اپنے جی کو جنجال میں ڈالنا ہی۔ کون بیٹھے بٹھائے یہ فیصلے مول لے۔ ایک تدبیر یہ ہی کہ
گھر کا صحن بہتیرا بڑا ہی اسی میں ایک خوش قطع سا چمن آراستہ کروں۔ [illegible] تو یہ بھی
خالی نہیں مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ہی تفریح کی چیز۔ لیکن کتنی دیر کی تفریح۔ گھنٹے دو گھنٹے صبح
گھنٹے دو گھنٹے شام۔ سو بھی سارے برس نہیں۔ جن دنوں گرمیوں میں لو چلتی ہی یا جب خزاں
کا موسم آتا ہی درختوں کو مرجھایا ہوا اور لٹا گھٹا دیکھ کر بڑی ہی کوفت ہوتی ہی۔ ناصاحب
یہ بھی میری وحشت کا علاج نہیں۔ میل ملاپ والیاں اور رشتے ناطے کی جتنی عورتیں ہیں اُن میں
سے اکثر کی یہ رائے ہی کہ میں کسی کا بچہ گود لوں۔ اول تو ایسا کوئی سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنا بچہ
میرے حوالے کر دے۔ جن کے خدا رکھے چار چار پانچ پانچ موجود ہیں اُن سے بھی پوچھو تو وہ
کہیں گے اتنے ہی اکارت ہوں۔ وہی کہاوت ہی کہ روٹی اور اولاد سے کسی کا پیٹ بھرا ہی۔ اور پھر

میری حالت ایسی ہی کہ وہم نہ آتا ہو تو آئے - اور جو [illegible] اس لالچ میں آ کر
کہ میرا اکیلا دم ہی تیس روپے مہینے کی بندھی ہوئی [illegible] ہی اپنی [illegible]
اتنی گنجایش نہیں پاتی - ہندوستانی سرکار [illegible] کا دنبالہ اٹھائے کیا اتفاق [illegible]
آگے کو ملے نہ ملے تو میں بچوں کو دلاؤں اُس کا خرچ کہاں سے چلاؤں - لڑکی ہو تو میری اس گئی گزری
حالت پر کچھ نہیں تو [illegible] روپے اُس کے بیاہ برات کو چاہئیں [illegible] لڑکا ہو تو [illegible] برات کے
[illegible] کے لکھانے پڑھانے کو - سو دو ہزار روپے تو یہاں دو ہزار برس
میں بھی اکٹھے ہوتے [illegible] نہیں آتے - میکے یا سسرال کے پرتے پر جو میں پرائی اولاد کا
بار اُٹھا بیٹھوں تو مجھ سے بڑھ کر کوئی احمق ہی؟ اور وقت [illegible] پر سکا تو جس کو گود لوں وہ
کیا کہے گا اور جو سنے گا وہ کیا کہے گا - وہ تو مجھے کوسے گا اور یہ میرے جنم میں تھوکیں گے
اور میں نے کسی کو گود لیا بھی تو ماں باپ سے لاکھ فارغ خطی لکھوالوں پنچوں میں دست برداری
کراؤں مگر قدرتی تعلق کو تو میں نہیں توڑ سکتی - تو اس کے یہ معنی کہ اُس کے ماں باپ یا جو کوئی
[illegible] کی نظر میں بچے کی تن درستی اور زندگانی کا بیمہ لینے والی
[illegible] اپر میرا ایسا ہی زور چلتا تو اپنے ہی میاں کو جوان کیوں مرنے دیتی - پھر
بیٹے لینا [illegible] سلا ہو - پالو - پرورش کرو - مصیبت اُٹھاؤ - آپ تکلیف میں ہو - اُس کو
آرام پہنچاؤ [illegible] پر کہ ہمارا کہلائے - اور وہ آخر کار کہلائے گا اُن ہی کا
جن کا ہی - ہاتھی پھرے گانو گانو جس کا ہاتھی اُس کا نانو - ہماری اماں کو رہ رہ کر اسی
کا بڑا [illegible] ہی کہ ہائے اس کے اولاد نہ ہوئی اور میں کہتی ہوں بھلا ہوا نہ ہوئی - آج کو
آگے اولاد ہوتی تو دوہری مصیبت تھی میں اپنی بیوگی کو روتی یا اُن کی یتیمی کو - اور پھر
لڑکا ہو یا لڑکی جس کے سر پر باپ نہیں اُس کا کیا ٹھکانا ہی کہ کیا اُٹھے - اور اگر اولاد
ہوتی اور بری نکلتی اور رو داد تو بری نکلنے کی تھی ہی تو خیر میری زندگانی جیسی برباد
ہوتی سو ہوتی خاندان کی عزت اور آبرو کا خطرہ تھا - خدا کا کوئی فعل مصلحت سے خالی
نہیں ہوتا میں تو اس کی بڑی ہی شکر گزار ہوں کہ اس آفت سے بچی رہی - تو میں سمجھی افسوس
کے قابل ہوتی ہیں خاص کر یہ موت کیا عمر اور کیا پردیس اور کیا یکا یک اور کیا نیک بختی اور کیا لیاقت

چاہیے اور جس وقت چاہے لے آسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ آنے ڈیڑھ آنے کی افیم میں اچھے جوان آدمی کا کام تمام ہے۔ تو مجکو کچھ [illegible] نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ دادا کی تفصیہ میں پانچ آنے کی افیم ہر وقت [illegible] رہتی ہے۔ وہ تو اپنی طرف سے ہزاروں قسمیں کھاتی ہے کہ افیم کو مدتوں سے کبھی چھوئے تک نہیں دیا سو بھی ایک وقت مگر کوئی اس کے کہنے کا یقین تھوڑا ہی کرتا ہے۔ مہینے کے مہینے بنیا دروازے پر آکر اڑ جاتا ہے کہ جتنی افیم تم دو دن میں کھاتی ہو ایک دفعہ مجکو کھلا کر سلا دو تو میرا [illegible] یہ تو منہ اپٹا رہا ہے اور ہم کو اپنے محل کے آگے کسی کی پروا نہیں۔ جب کبھی اگر تم سے مانگا تم نے نکا سا جواب [illegible] غرض افیم تو گویا میرے بٹوے میں ہے۔ جس وقت چاہوں کھا سکتی ہوں۔ اور چونکہ نشے کی چیز ہے زیادہ کھانے سے آدمی ضرور بے ہوش ہو جاتا ہوگا۔ اور بے ہوشی میں اس کو جان کنی کی کچھ تکلیف بھی نہ ہوتی ہوگی رات کو کھا کر سو رہا [illegible] صبح کے کا سو یا رہ گیا۔ لیکن یہ قباحت اس میں بھی ہے کہ ہضم نہ ہونے پائے اور خبر ہو جائے تو ڈاکٹر لوگ تو سوچی افیم پیٹ سے نکال لیتے ہیں اور ہم لوگوں میں بھی قئیں کراتے ہیں اور افیم کو ٹھیرنے نہیں دیتے۔ اور [illegible] کے محل پر اگر کوئی سرکار میں جا لگائے تو مردے کا پیٹ بھی چیرتے ہیں۔ یہ تو بڑا فضیحتا ہے جان کی جان گئی اور لاکھوں روپے کی آبرو خاک میں ملی سو الگ [illegible] پھر بھی افیم کا کھا لینا اور طریقوں سے بہتر ہے۔ جلدی کیا ہے پھر کسی وقت اس معاملے میں غور کروں گی ✤

جب جب آزادی نے خیال کیا اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ خودکشی کئے بدون بن نہیں پڑتی وہ اپنے تئیں دیکھتی تھی تو اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مکان ہے اور مکین نہیں۔ انگشتری ہے اور نگین نہیں۔ چمن ہے اور گل چین نہیں [illegible] اور مسند نشین نہیں۔ پس آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ زندگی اور بیوگی اور خوش دلی اور دینداری۔ یہ کسی طرح ان چیزوں کو جمع نہیں رکھ سکتی۔ وہ اپنی حالت سے اس قدر ناراض تھی کہ ڈرنا اور ہچکچانا کیسا ہزار جان سے مرنے کی آرزومند تھی۔ اس کو تامل تھا تو اسی بات کا تھا [illegible] کہیں میری عاقبت خراب ہو دانشمندی کی بڑی پہچان یہ ہے کہ [illegible] ہیں وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی دور [illegible] اصلاح لئے بغیر نہیں کیا کرتے [illegible] جان پر کھیل جانے کی بات تھی۔ آزادی

پیغام رسان تھی کس سے پوچھوں کس کی صلاح لوں - اسی پریشانی میں ایک رات اس کی آنکھ
لگ گئی تو خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ میں نے وضو کر کے دو رکعت نماز استخارہ پڑھی دعا مانگی جوں
فال دیکھنے کو قرآن کھولا تو اس کی پہلی سطر کے شروع میں تھا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اپنی
جانوں کو ہلاک نہ کرو) اور حاشیے پر کسی حدیث کے حوالے سے لکھا تھا کہ جو شخص جس طور
خودکشی کرتا ہے ابدالآباد تک اسی عذاب میں مبتلا رہے گا - اس خواب کے دیکھتے ہی چونک کر
اٹھ کھڑی ہوئی اور سمجھی کہ خدا کا حکم نہیں - اس سے تو اس کو کسی قدر ملال ضرور ہوا کہ
اس مصیبت سے بچنے کی ایک تدبیر سمجھ میں آئی تھی وہ بھی پیش رفت نہ ہوئی مگر اس نے
خدا کا بڑا ہی شکر کیا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس کو عذاب آخرۃ سے بچایا - اور آئندہ کو
توبہ کی کہ چاہے گھٹ گھٹ کر مر ہی کیوں نہ جاؤں پر ان شاء اللہ خودکشی کا تو کبھی بھول کر
بھی خیال نہیں کروں گی - آزادی نے مہینوں لوگوں کے آنے کی بندی رکھی - لوگ تو اس کی
بیوگی کے خیال سے بھی اس کے یہاں آنے میں مضایقہ کرتے تھے کہ کیا جائیں اور کیوں
بچاری غریب کو ستائیں - جاتی نہ جاتی خود آزادی - سو اس کو ایسی وحشت اچھلی کہ لوگوں
کی صورۃ تک دیکھنی بھی اس کو گوارا نہ تھی - اور واقع میں جو شخص اپنی ہی زندگی سے
ملول ہو اس کو لوگوں کے ملنے سے کیا حصول ہو - اب جو اس کا ایک بڑا منصوبہ خدا نے غلط
کیا تو اس نے چاہا کہ لوگوں سے ملوں جلوں - اپنی کہوں دوسرے کی سنوں - شاید
گفتگو کے سلسلے میں کوئی کام کی بات نکلے - لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ بندی اٹھا دی گئی تو
پاس پڑوس والے مدتوں سے اس کی تاک میں تھے دروازہ کھلا دیکھتے ہی آن بھرے
اور اب آزادی کی بیوگی کی زندگی کا نیا ڈھنگ پڑا +

تیرھویں فصل ایک شخص خواجہ مشتاق نام آزادی کے پیچھے پڑا اور اس نے ایک کٹنی کو بیچ میں ڈالا

[illegible] باپ کے ملاقاتیوں میں اور عجب نہیں دور کے رشتہ داروں میں بھی ایک
صاحب تھے خواجہ مشتاق ہم خیال ہونے کی وجہ سے دونوں میں بڑی راہ و رسم تھی - اگرچہ
مناسبت [illegible] ہی نہ تھی مگر چوں کہ طبیعۃ ایک ہی طرح کی واقع ہوئی تھی دونوں ایک دوسرے

کے ساتھ ایسے بے تکلف تھے جیسے ہم جولی۔ اور انگریزی خیال کے لوگ پاس مراتب کی پروا بھی
ذرا کم کرتے ہیں اور ان کے نزدیک ہندوستانیوں کا ادب اور لحاظ داخل بزدلی و لغا[illegible]۔
ہم تو اس کو بدتہذیبی ہی سمجھتے ہیں مگر آزاد کو مشتاق کی کچھ یہی ادا بہت بھائی تھی کہ وہ
آزاد کے بیٹوں کی برابر ہو کر اُس کے سامنے بے تامل حقہ بلکہ چُرٹ پیتا۔ آتے جاتے ان کی
تعظیم کو نہ کھڑا ہوتا۔ اس کا خیال نہ رکھتا کہ مجھ سے بڑے ہیں ان کی طرف پیٹھ نہ ہو یا ان سے
اُونچا نہ بیٹھوں۔ زبان پر آنا شرط ہے پھر اس کو شعر کے پڑھ دینے میں بھی باک نہ تھا۔ سیٹی
تو اس کی عادۃ تھی۔ بارہا دیکھا کہ لوگ جمع ہیں بعض اس سے بڑے اور بعض اجنبی ہیں
اس کے جی میں آگئی تو لگا تال سُر کے ساتھ اس طرح بے وقت کی گانے کہ گویا تنہائی ہے۔
بڑوں کی بات کاٹ دینا۔ اُن پر اعتراض کر بیٹھنا یہ تو اُس کے اور اُس کے قدردان خواجہ
آزاد کے نزدیک تقاضائے آزادیِ رائے تھا۔ ہم نے تو موقع پا کر دو چار بار اس کو ٹوکا بھی
مگر جب ٹوکا خواجہ آزاد نے اُس کو اُلٹی ہی شہ دی۔ بہرکیف مشتاق ہی ایک نوجوان آدمی
تھا خواجہ آزاد کی مرضی کے مطابق۔ جس کا نمونہ دکھا دکھا کر خواجہ آزاد اپنے بیٹوں کو بھی
ایسا ہی بے وحدۃ بنانا چاہتا تھا۔ نہیں معلوم مشتاق کے اپنے گھر جگہ نہ تھی اور اس کو دنیا
کا بھی کوئی کام تھا یا نہیں ہم نے تو اس کو جب دیکھا خواجہ آزاد ہی کے گھر دیکھا۔ اس
کثرۃ سے آنا جانا ہو تو پردہ کیا باقی رہ سکتا ہے۔ ساری عورتوں کے نام اُس کو معلوم۔
ہر ایک کی آواز وہ پہچانے۔ گھر کے رگڑوں جھگڑوں کی اس کو خبر۔ ایسے آدمی کی نسبۃ
گنتی کیا پوچھنی ہے کہ کی بار اس نے آزادی کو اور کتنی دفعہ آزادی نے اس کو دیکھا۔ آزادی
کی جھلکی تو اُس کے بیاہ کے بعد بھی مشتاق نے دیکھی ہو تو عجب نہیں۔ غرض دونوں ایک
دوسرے کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ مگر دونوں کے جاننے پہچاننے میں بڑا فرق تھا۔
آزادی تو مشتاق کو اسی قدر جانتی تھی کہ ابا جان کے ملنے والوں میں میں اور اکثر ابا جان
ہی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن مشتاق کا جاننا دوسری طرح کا تھا۔ وہ شروع سے اس کی
خوب صورتی اور ذہانۃ یعنی کُل اداؤں کا فریفتہ تھا۔ اور ابتدا سے اس کو خیال تھا کہ کسی
طرح اُس کے ساتھ میرا بیاہ ہو۔ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ بکثرۃ آنے جانے کی وجہ سے مشتاق

کو یہ خیال پیدا ہوا یا اس خیال کی وجہ سے وہ بکثرت آتا جاتا تھا - اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ
جن خیالات کی وجہ سے آزاد اس کو عزیز رکھتا تھا وہ اُس کے اصلی خیالات تھے یا آزادی پر
محبت رسی حاصل کرنے کے لئے وہ خواجہ آزاد کا ہم خیال بنا تھا - لیکن اس میں شک نہیں
کہ اگر خواجہ آزاد کا اختیار چلتا تو وہ آنکھ بند کرکے اس کے ہاتھ میں آزادی کا ہاتھ پکڑا دیتا -
آزاد اور مشتاق میں رُو در رُو اس کا تذکرہ ہوا ہو اور آزاد نے مشتاق کو امید دلائی ہو تو اس کا
بھی کچھ تعجب نہیں - جو شخص یہ چاہتا ہو کہ بیٹی دیکھ بھال کر اپنی پسند سے آپ اپنا بیاہ کرے اس کو
دوسرے احمق باپوں کی طرح سُسرا کہلانے کی کیا چڑ - خود اُس سے بیٹی کی خواستگاری کیئے جانے
کی کیا عار - مشتاق کو یہیں تو بڑا دھوکا ہوا - اس نے خواجہ آزاد کی مدارات اور اُس کے خاص
التفات سے جانا کہ آزادی میری ہو چکی - اس کو یہ خبر نہ تھی کہ آزاد مونہ ہی سے کہنے کے آزاد
ہیں - آزادی کے باپ ضرور ہیں مگر بی بی اور دوسرے کُنبہ داروں سے مجبور ہیں - اس کی
طرف سے نہ رقعہ نہ پیام اور وہاں تڑ سے آزادی کی منگنی ہو گئی - مشتاق منگنی کی سُن کر
بہت سٹ پٹایا اور تلے کی زمین اُوپر کر ماری کہ کسی طرح منگنی چھوٹ جائے مگر منگنی کا نام تھا
اور حقیقت میں نکاح کا سا استحکام - ہاں ذرا پہلے سے بھی اس کو معلوم ہو کہ منگنی کی چھیڑ چھاڑ
ہو رہی ہے تو یہ ایسا چلتا ہوا تھا کہ کسی کی دال نہ گلنے دے - مجبور صبر کرکے بیٹھ رہا اور سمجھا
کہ یہ شعر اسی کے حسب حال ہے - ؎

خیالِ زلفِ بتاں میں نصیر پیٹا کر ✤ ✤ گیا ہے سانپ نکل تو لکیر پیٹا کر

مگر مشتاق نے آزادی کا خیال نہیں چھوڑا - آزادی نے شوہر کے مرنے کا کیا غم کیا ہوگا جو
اُس نے آزادی کے دوسری جگہ بیاہے جانے کا کیا - مشتاق کی شوریدگی اور وحشت دیکھ کر
ہر چند اُس کے والدین اور رشتہ داروں نے چاہا کہ اس کو کسی اَور جگہ پابند کر دیں مگر اُس نے
بالکل ہامی نہ بھری - اُس کے یار دوستوں کو بیچ میں ڈالا اُنھوں نے سمجھایا کہ ایک آزادی
پر کیا موقوف ہے شہر میں ایک سے ایک بہتر خوب صورتیں بھری پڑی ہیں کہ آدمی بیٹھا اُن کا
مُونہ دیکھا کرے - اور اگر خوش حالی دیکھ کر گرے ہو تو خواجہ آزاد بچارے کس گنتی میں
ہیں جس امیر کے گھر کہو تمہارا پیام لے جائیں اور بیاہ نہ کرا دیں تو پھر ہمارا نام نہیں

حسب نسب کا خیال ہی تو ہیں خواجہ آزاد بھی شریف بھلے مانس مگر اصل سید نجیب الطرفین کی بیٹی مل سکتی ہی۔ تم نے اپنے تئیں سمجھا ہی کیا ہی ہم تو آج شہر میں کسی کو ایسا نہیں دیکھتے کہ تمھارا رقعہ جاے اور اُس کے مونہ میں پانی نہ بھر آئے۔ بھائی جان زمانہ ایسا نازک آگیا ہی کہ بیٹیوں کو بر نصیب نہیں ہوتے اچھے اچھے جتھے اور برادری والوں کو دیکھ لیا گھر دن میں جوان جوان بیٹیاں بیٹھی ہیں۔ صورۃ شکل پاکیزہ۔ ذات صفات عمدہ۔ دان جہیز کی کمی نہیں۔ اور بیسیوں مشاطیں چھوٹی ہوئی ہیں جھوٹوں بھی کوئی نہیں کہتا کہ ہم کو لڑکی کی تلاش ہی۔ ہم کو اندرونی حالات تو بہت معلوم نہیں مگر لڑکی کی ننہال تو کھلے ملانے میں۔ نانا ماموں کی یہی معاش ہی۔ اور ان لوگوں میں چاہیے ہزار خوبیاں ہوں مگر جس نے ملوئیت کی روٹی کھائی اس کی طبیعت میں ایک طرح کی دناءۃ تو ضرور آجاتی ہی۔ کہاں تک ننہال کی خو نے اثر نہ کیا ہوگا۔ تو ایسی عورۃ کے ساتھ کیا تمھاری مرضی ملتی۔ اسی میں کچھ مصلحۃ تھی کہ وہ عورۃ تمھارے پلّے نہ پڑی۔ تم نے اس کا بھلا خیال کیا ہے جانے دو دور کرو گوشتِ خر دندانِ سگ دیکھو تو تمھارے واسطے کیسی کیسی جگہیں تجویز کی ہیں کہ سنو گے تو پھڑک اُٹھو گے۔ مشتاق یہ ساری باتیں چُپ بیٹھا ہوا سُنا کیا اور وہ جو کہتے ہیں اصیل مُرغے کی ایک ٹانگ بولا تو یہ بولا میں بیاہ کرتا تو اُسی کے ساتھ کرتا اب وہ تو ہاتھ سے نکل گئی اور افسوس ہی کہ میری غلطی اور چوک سے پھنسا ہوا شکار چھوٹ گیا میں جب تک جیوں گا اس صدمے کو نہیں بھولوں گا۔ اور تم کیا مجھے شادی کی ترغیب دیتے ہو مجھے ہندوستانیوں کی سوسائٹی کا حال اچھی طرح سے معلوم ہی کیوں کہ میں بھی اسی سوسائٹی میں پیدا ہوا اور اسی سوسائٹی میں بڑا ہوا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ہندوستانی عورۃ مجکو وہ راحۃ پونہچا سکتی ہی جس کی میں شوہر ہونے کی حیثیۃ سے توقع رکھ سکتا ہوں۔ میں اس ملک کی عورتوں میں اور جانوروں میں فرق کرتا ہوں مگر بہت ہی کم۔ ان میں نہ بی بی ہونے کی صلاحیۃ ہی نہ ماں ہونے کی۔ اور صلاحیۃ ہو تو کہاں سے ہو تعلیم نہیں تربیۃ نہیں۔ بیبیاں نہ کہو۔ معزز لونڈیاں۔ مقرب مامائیں کیوں کہ گھر کی ٹہل اور خدمۃ کے سوا (اور ٹہل اور خدمۃ بھی مبتذل) ان کو کچھ آتا بھی آتا ہی۔ لیاقۃ کا تو یہ حال ہی کہ اگر کسی بدنصیب خانہ دار کو سفر در پیش آگیا تو

سفر میں گزرے۔ بیوی رانڈ اور میاں رنڈوے۔ دل کی بات نہ یہ لکھ سکتا ہی اور نہ وہ لکھوا سکتی ہی۔ بیوی سارے محلے میں بوجھ بجھکڑ کہلاتی میں کوئی سودا ہو جب تک دروازے پر آپ نہ چکا لیں اعتبار نہیں آتا مگر خیر سے اتنا نہیں بتا سکتیں کہ ساڑھے سترہ آنے سیر تانبا تو تین پاؤ ڈیڑھ چھٹانک دو پیسے اوپر کے کیا دام ہوئے۔ دو مہینے کی مہلت بیٹھی حساب کیا کرو مگر تم کو قسم ہی جو کسی مردمے پوچھا۔ بنیا اور قسائی اور گوٹے والا اور ٹھٹھیرا اور بزاز اور سنار غرض جس سے معاملہ پڑا اُسی نے دھوکا دیا اور ان بھولی بیگم کو کچھ خبر نہیں۔ باوجودے کہ آپ اور ما اور نانی اور شاید پرنانی بھی انگریزی عمل داری میں پیدا ہوئیں اور مزہ یہ کہ گھر کے جتنے مرد سب نوکری پیشہ کوئی سر رشتہ دار۔ کوئی منشی۔ کوئی تحصیل دار۔ غرض کوئی سرکاری محکمہ نہیں جس میں ان کے گھر کے ایک دو ملازم نہ ہوں۔ وائسرائے اور لفٹنٹ گورنر اور ہائی کورٹ کے جج اور بورڈ کو تو یہ کیا جانیں گی اتنا معلوم نہیں کہ کلکٹر اور مجسٹریٹ میں کیا فرق ہی۔ قسمیں کھائیں اور یقین نہ آیا کہ تار میں نہ جادو ہی اور نہ اس میں کوئی پُتلی دوڑتی ہی۔ کتنا کتنا سمجھایا کہ ریل بھاپ کے زور سے چلتی ہی مگر یہ جھٹلائے ہی گئیں۔ غالباً محلے کی حلال خوری سے سُن لیا ہوگا کہ ولی عہد روس آنے والا ہی اتفاقاً خدا جانے کس تقریب سے میرے سامنے اِن کے مونھ سے نکل گیا تو میں نے کہا آہا اب تو دنیا کی بڑی خبریں رکھنے لگی ہو۔ بھلا یہ تو کہو روس ہی کدھر تو کیا جواب دیتی ہیں جلنے بلا کدھر ہی پڑے چولھے میں کہیں کپنال بھی بکتی ہوئی دیکھی ہی۔ کئی سال سے سرکار موت اور پیدائش کے رجسٹر بنوانے لگی ہی تو اُن رجسٹروں سے ثابت ہوا کہ ہر چھ بچوں میں پانچ مر جاتے ہیں۔ ایک اس وجہ سے کہ ہم لوگ قواعد حفظ صحت کی تعمیل نہیں کرتے۔ ایک اطبائے یونانی کے اٹکل پچو علاج سے۔ اور تیسرے نادان دوستوں کی دوستی یعنی ماؤں کی بے تدبیریوں سے۔ کہ ان کے نزدیک نظر اور تصرفِ ارواحِ خبیثہ کے سوائے بچوں کو اور کوئی روگ ہی نہیں ہوتا۔ اور جو ایک گراں جان بچتا ہی چوں کہ جاہل ما کی نگرانی میں تربیت پاتا ہی بڑا ہو کر کودن کندۂ ناتراش ہوتا ہی اور اس کے ہونے سے وہ آدمی نہ ہوتا بھی کیا۔ پس اگر سچ پوچھو تو ان عورتوں نے بنی آدم کی نسل کو ایسا بگاڑ دیا کہ اب اُس کی درستی کی امید موہوم ہی۔ جس کے اپنے

خیالات ہوں وہ کیا کسی عورۃ کی طرف رغبۃ کرے گا سو وہ بھی نہیں معلوم کیا بات تھی کہ میں
ایک سے دام محبۃ میں گرفتار ہوگیا۔ تم کہتے ہو کہ اُس نے بہتر بہتر بہتیری حسین عورتیں
شہر میں بھری پڑی ہیں۔ میں خود حسین نہیں تو ہمارا خاندان شہر کے حسین خاندانوں میں
گنا جاتا ہی۔ میں نے بھی بہت حسین دیکھے ہیں۔ مگر جس کو میں نے پسند کیا تھا وہ کچھ اَور
ہی چیز ہی۔ میں نے اُس کو اُس عمر سے دیکھا جب اُس کو حُسن کے معنے بھی سمجھنے کی تمیز تھی
اُس وقت بھی اُس پر وہ خداداد جوبن تھا کہ بنانے سنوارنے سے بھی وہ بات نصیب نہیں
ہوتی۔ تم لوگ شاید گوری رنگت اور سڈول نقشے ہی کو خوب صورتی سمجھتے ہو اور میرے نزدیک
اصلی خوب صورتی یہ ہی کہ ہر ایک ادا دل فریب ہو۔ یہ بات تو میں نے اُس کے سوائے کسی
میں نہیں دیکھی۔ میں نے اُس کو روتے دیکھا مچلتے دیکھا۔ لڑتے دیکھا۔ بگڑتے دیکھا۔
ہنستے دیکھا۔ منتے دیکھا۔ مناتے دیکھا۔ شرماتے دیکھا۔ عجیب طرح کا حُسن خدا نے دیا ہی کہ
کسی حالۃ میں بے زیب نہیں۔ میرا عقیدہ تو یہ ہی کہ خدا نے اُس کو کمال حسن کا ایک اعلے درجے
کا نمونہ پیدا کیا ہی۔ اور قاعدہ ہی کہ لفافہ عمدہ ہوتا ہی تو ملفوف کہیں عمدہ ہوتا ہی۔ پس
جیسا اُس کا جسم لطیف ہی ویسا ہی اُس کا دل یقیناً پاکیزہ ہوگا۔ غرض اس کا تو خیال بھی
نہ کرنا کہ میں اُس کے سوائے کسی دوسرے کی طرف نظر بھر کر بھی دیکھوں گا۔ بے شک وہ
اس وقت میرے دست رس سے باہر ہوگئی ہی مگر اُس کی محبۃ میری جان کے ساتھ ہی*
آزادی کی طرف سے نا امید ہو کر مشتاق مہینوں قبرستانوں میں ملا مارا پڑا پھرا۔ پھر
مدۃ تک غائب رہا سنا کہ کہیں باہر نکل گیا۔ ایک عرصے کے بعد پتہ لگا لوگ جا کر لے آئے
یہاں آیا تو ایسا بیمار پڑا کہ آخر حکیموں نے جواب دے دیا۔ مستجاب کے مرنے کی خبر سُنی
تو اس توقع سے پھر جی اُٹھا کہ آزادی بیٹھنے والی تو ہی نہیں۔ جوان عمر۔ آگے کوئی اولاد
نہیں۔ سسرال والوں سے بگاڑ۔ ننہال مولوی۔ کہ اُن کی طرف سے نکاح ثانی کا تقاضا نہ ہوگا
تو مزاحمۃ بھی نہیں کر سکتے۔ باپ کی رائے معلوم ہی کہ وہ عدۃ کو بھی ضروری نہ سمجھتے ہوں گے
پس آزادی دوسرا نکاح کرے پر کرے۔ من جانب اللہ ایسا موقع پیش آیا ہی اس کو تو ہاتھ سے
نہ جانے دوں۔ اب یہ لگا منصوبے سوچنے کہ کیا تدبیر کروں۔ خواجہ آزاد کے ساتھ اگرچہ راہ و رسم

خصت کردی ہو مگر میں اِن سے خدانخواستہ کچھ لڑا نہیں۔ جھگڑا نہیں۔ رُو در رُو ان سے کسی طرح کی شکایت کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اور وہ آدمی اپنے وضع سے ہیں بھی ایسے بے تکلف کہ شاید اُن کو میری غیر حاضری کا خیال بھی نہ ہو۔ اور اگر خیال کرتے ہوں گے تو اپنے جی میں شرماتے بھی ضرور ہوں گے کیونکہ یقیناً اُن کی مرضی ملّانے کو بیٹی دینے کی نہ تھی۔ یہ جو کچھ ہوا اُن کی رائے کے خلاف ہوا اور اِس معاملے نے امورِ خانہ داری میں اُن کی بے اختیاری کا پردہ فاش کر دیا۔ اور اب اگر ایسا موقع آیا تو تلافیِ مافات کے لئے ضرور میری حمایت کریں گے۔ غرض اول تو وہ مجھ سے نارضامند نہیں اور نارضامند ہونے کی کوئی وجہ نہیں اور اگر ہوں تو ان کو رضامند کر لینا کچھ مشکل نہیں۔ نارضامند ہوں گے بھی تو اسی خیال سے کہ میں اُن سے رُوٹھ کر بیٹھ رہا تو یہ خیال میرے حق میں مفید ہی اور میں کہتا ہوں کہیں خدا کرے انہوں نے ایسا خیال کیا ہو اور نہ کیا ہو تو اب کریں۔ میرے روٹھنے کا خیال کریں گے تو اس کے ساتھ اُس کی وجہ بھی ضرور خیال میں آئے گی اور یہی تو میں چاہتا ہوں۔ اُن پر یہ تو ظاہر ہو جائے گا کہ میری خواستگاری عام طور کی خواستگاری نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ اصرار و ابرام بھی لیکن خیر وہ تو موقع اُن کے دخل دینے کا تھا بھی اب غالب یہ ہی کہ خواجہ صاحب بالکل بیٹی کی رائے پر رکھیں۔ وہ تو اُس وقت بھی چاہتے تھے کہ بیٹی ہی کی پسند پر ہو مگر ہندوستانی سوسائٹی ابھی ایسی باتوں کے لئے طیار نہیں۔ میں خیال کرتا ہوں ایک مرتبہ نکاح ہو جانے سے عورۃ پر لحاظ کی اس قدر قید باقی نہیں رہتی۔ تو اب جو کچھ ہی آزادی ہی اُسی کو راضی کرنا چاہیے۔ ہادی بیگم اپنی طرف سے بہتیرا زور ماریں گی کہ بیٹی اُن کے قابو میں رہے مگر آزادی کا مزاج بڑا ہی غیور واقع ہوا ہی میں نہیں خیال کرتا کہ اُس کو بھوپال سے تیس روپے مہینا ملے اور وہ باپ کے ٹکڑوں پر پڑی رہے۔ دوسرے بھائی بھاوجوں سے بھی کچھ ایسا میل جول نہیں۔ بہرکیف عدۃ تک تو کچھ ہوتا ہوا تا نہیں۔ بالفعل مجکو اتنا ہی کرنا چاہیئے کہ میرا کوئی آدمی آزادی کے پاس لگا رہے کہ یوماً فیوماً اور وقتاً فوقتاً مجکو وہاں کے حالات سے مطلع رکھے اور وہ آدمی ایسے سلیقے کا ہو کہ ان سب کے دلوں کو ٹٹولتا رہے اور جب معلوم ہو کہ نکاح ثانی کی تحریک ہونے کو ہی تو سوائے میرے کسی کی بات کو

بیش رفت نہ ہونے دے۔ مشتاق کہیں کا بہتا بہانا تو دلی میں آکر بسا نہ تھا پیڑیاں اسی شہر
میں گل گئی تھیں دور و نزدیک کے اتنے رشتہ دار تھے کہ چاہتا تو کوڑیوں عورتیں آزادی
کے پیچھے لگا دیتا کہ کراماً کاتبین کی طرح ہمہ وقت اُس پر مسلط رہتیں۔ مگر اس [illegible] کہ
یہ اخیر وار بھی ایسا نہ ہو خالی جائے ایسا آدمی تجویز کرو کہ جی کھول کر مجھ سے پوست کندہ
حالات بیان کرے مجکو صلاح بتائے اور آزادی کے دل میں اپنا اعتبار جمائے۔ آخر یہ رائے
قرار پائی کہ اس کام کے لئے تو کوئی مشاطہ ہونی چاہئے بڑی عیار بڑی تجربہ کار۔ اُن دنوں
چھلاوا اچھلاوا کر کے ایک کٹنی بڑی نامی تھی۔ مشتاق کو کبھی ایسی عورتوں کی ضرورۃ تو
پڑی نہیں۔ نہیں معلوم اُس نے چھلاوا کا نام کہاں سے سُن لیا تھا۔ بُلایا۔ خاطر داری سے
بٹھایا۔ سب حال سُنایا۔ لالچ دکھایا۔ مشتاق زیادہ منت سماجت کرنے لگا تو چھلاوا بولی اے میاں
یہ بھی کوئی کاموں میں کام ہے آزادی کو تو اپنی خدمت میں حاضر سمجھو مجھ سے کہو تو میں عدۃ
کے اندر ہی اندر اُس کو تمھارے پاس لا بٹھاؤں۔ مگر تم اس کو نکاحتا بی بی بنانا چاہتے ہو
تو جلدی کیا ضرور ہے بس اس بات سے خاطر جمع رکھو اور خانہ داری کا سامان درست کر چلو
تمھاری لونڈی نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے تو اطمینان رکھنا کہ آزادی دوسرا نکاح کرے
اور کرے اور تمھارے ہی ساتھ کرے۔ اس کے بعد چھلاوا آپ تو ظاہر نہ ہوئی مگر اپنے
طور پر ذرا ذرا سی بات کی ٹوہ لگاتی اور مشتاق کو پہنچاتی رہی۔ وعظوں کا ہونا۔ ماں کا ہر وقت
بیٹی کے پاس رہنا۔ آزادی کی بے قراری۔ ہر وقت مستجاب کی یادگاری۔ سُن سُن کر مشتاق
تو نا اُمید ہوا جاتا تھا کہ آزادی کا دوسرا نکاح کچھ ہوتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ اتنے وعظ
ہوئے جو مولوی آیا تلقین صبر ہی کرتا ہوا آیا کسی کے پھوٹے مُونہہ سے اتنا نہ نکلا کہ بیوہ عورۃ
کو دوسرے نکاح کا بھی حکم ہے۔ آج کل کے مولویوں کا تقاضائے دین داری معلوم ہے کہ
ٹھیرائے ہوئے فتوے۔ چُکائے ہوئے مسئلے۔ فرمائشی وعظ۔ یہ تو مولویت رہ گئی ہے تو جیسے
مولوی ویسے معتقد۔ جیسے وعظ ویسے اثر۔ جیسے فتوے ویسے معاملات۔ ماں کا ہمزاد کی طرح
بیٹی کو لپٹا رہنا یہی میرے لئے کونسی خوش خبری کی بات ہے۔ وہ تو ایک سے لاکھ تک
بھی میرے حق میں کلمۃ الخیر کہنے والی نہیں۔ وہ اچھی طرح مجکو جانتی ہے اور ایک اعتبار سے

اُس کو میرے نام کی چڑ ہی - اور یہی حضرت تو تھیں جنھوں نے مستجاب کو پسند کیا تھا - اور
یہاں کہ لوگوں ہی اس کے مزاج میں بڑا ہی تعصب ہی - رات دن میاں کے ساتھ بجتنی رہتی ہی
لے تو اس طرح کی ضدی عورت دیکھی نہیں کہ لاجواب ہو ہو جائے اور قائل نہ ہو - اس
بعلی کھوسے سے خدا پناہ میں رکھے - اور جب اصل الاصول آزادی ہی کا یہ حال ہی کہ کسی
وقت اپنے پہلے میاں کو نہیں بھولتی تو کنکوا ہتے سے اکھڑا ہوا ہی پیچ لڑیں گے کیا خاک -
غرض نوداد تو کچھ بگڑی ہوئی سی دکھائی دیتی ہی - آزادی ہی قسمت کی ہوتی تو پہلا ہی
کھیل کیوں بگڑتا - مشتاق کا یہ مایوسانہ کلام چھلاوا نے اُسی طرح پر سُنا جیسے کبھی ہم نادان
بچوں کی باتیں سنا کرتے ہیں - اور مسکرا کر کہنے لگی کہ حقیقت میں مرد وے بڑے ہی بھولے
ہوتے ہیں اور تم کو تو دنیا کی ہوا تک بھی نہیں لگی - میاں میرے آور رودادوں کی تو میں
کہتی نہیں آزادی کا کسی وقت میاں کو نہ بھولنا یہی تو اس بات کی بڑی شناخت ہی کہ وہ
بیٹھنے والی نہیں - اس سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس کی طبیعت اُنس پذیر واقع ہوئی ہی - اس
مزاج کے آدمی بے اس کے کہ اُن کو کسی نہ کسی کے ساتھ اُنس ہو رہ نہیں سکتے - تم اپنے
ملاقاتیوں میں خیال کرو جن کی بیبیاں مر جاتی ہیں ادیدا کر دیکھا ہی کہ جس کو بی بی کے ساتھ
زیادہ اُنس ہوتا ہی وہی جلد دوسرا نکاح بھی کرتا ہی - سبب کیا کہ عورت کا ہونا اس کے لئے
ضرور زندگی ہی - اس وقت تک تو روداد کچھ بگڑی بگڑائی نہیں اور تم بے موقع جلدی
مچا کر بگاڑ دو تو خبر نہیں صبر کئے بیٹھے رہو دیکھو تو کیا ہوتا ہی - اتنا تو میں کہتی ہوں کہ اگر آزادی
کو تمھارے گھر نہ لا بٹھاؤں تو چھلاوا اپنا نام نہ رکھواؤں - میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ آزادی
کی تو کچھ بات ہی نہیں کوئی مشکل سے مشکل کام بتا کر مجھ ناچیز کا کمال دیکھا ہوتا - بُرائی کرنے
پر آؤں تو شاموں شام آزادی کو یہاں لا کھڑا کر دوں - مگر وہ بات تم کو منظور نہیں میں بھی
کہتی ہوں خیر کچھ ضرور نہیں -

چھٹی فصل کُٹنی آزادی کے مزاج میں دخل پیدا کرتی اور آزادی کی رسوائی شروع ہوتی ہی

غرض اس وقت تک کہ آزادی نے اپنے گھر جا کر لوگوں کے آنے کی بندش رکھی چھلاوا کی

کوئی کارگزاری ظاہر نہ ہوئی۔ اندر اندر اور چپکے چپکے جو بدبیریں کرتی رہی ہو نہ ہم نے پوچھا نہ اس نے کہا۔ جب آزادی نے بندی اٹھادی اور لوگ اس کے پاس آنے جانے لگے تو دو چار دن کا غوطہ دے کر چھلاوا بھی ایک خاص وضع بنا کر جاموجود ہوئے آزادی نے ان کو دیکھا اجنبی صورۃ اوپری وضع پوچھا تو اس نے کہا مجکو آزمودہ خانم کہتے ہیں اور میں ہوں تو لکھنؤ کی رہنے والی مگر مدۃ سے بھوپال میں رہنے کا اتفاق ہوتا ہی تمھارے میاں مولوی مستجاب مرحوم کی اللہ اُن کو جنۃ نصیب کرے ہم لوگوں سے بڑی راہ و رسم تھی۔ میرے سامنے اُن کا انتقال ہوا۔ وہ اکثر ہم لوگوں سے تمھارا تذکرہ کیا کرتے تھے میں یہاں آنے لگی تو دل میں کہہ کر چلی تھی کہ تم سے ضرور ملوں گی۔ تو آج خدا نے یہ آرزو پوری کی۔ مگر جیسا حال تمھارا مولوی صاحب نے بیان کیا تھا اُس میں اور تمھاری اب کی حالۃ میں آسمان اور زمین کا فرق ہی۔ اب میں نے تم کو اٹکل سے پہچانا ورنہ تم کو اصلی حالۃ میں دیکھتی تو شاید ہزار بیبیوں میں بھی غلطی نہ کرتی۔ جتنا تم نے میاں کا غم کیا شاید دنیا میں اَور کوئی نہ کرتا ہوگا۔ چھلاوا نے جس کو اب آزمودہ خانم کہنا چاہئے جو تقریب ملاقاۃ کی نکالی اس سے بہتر کوئی اَور تقریب ہو نہیں سکتی تھی۔ مستجاب کا نام سُن کر آزادی روئی اور اس کا رونا حق بجانب تھا۔ مگر تعجب تو یہ ہی کہ آزمودہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ جب غم کی شورش فرو ہوئی تو آزادی نے مولوی صاحب کے تفصیلی حالات پوچھنے شروع کئے کہ کیوں کر بیمار پڑے اور کیا بیمار پڑے کس کا علاج ہوا کون اُن کی خبرگیری کرتا تھا اور مرتے وقت وصیۃ کے طور پر کچھ کہا یا نہیں۔ آزمودہ۔ مولوی صاحب کا مرنا تو عجیب طور کا مرنا ہوا۔ جمعے کا دن تھا معمول کے مطابق اصلاح بنائی غسل کیا۔ کپڑے بدلے۔ کھانا کھایا اور جیسی اُن کی عادۃ تھی ذرا کی ذرا لیٹے پھر اُٹھ کر وضو کیا نماز کو گئے۔ نماز میں کھڑے کھڑے چکر سا آیا بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لوگوں نے جانا غش ہی بہت دیر ہوئی تو کسی نے سمجھا سکتہ ہی۔ کوئی کہنے لگا مر گئے ہی۔ سلطان الحکماء اور جرنیل ڈاکٹر بلائے گئے دونوں نے یہی کہا کہ کچھ ہی نہیں۔ قضا مہلۃ دیتی تو وہاں دوا اور خدمۃ کی کیا کمی تھی آزادی۔ آخر حکیموں نے کچھ بیماری بھی بتائی۔ آزمودہ۔ کیا جانے تو اضعف قلب بتاتے تھے۔ میں نے نواب سلطان الحکماء سے پوچھا اور بڑے جحۃ کی تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک

خاص طرح کی بیماری ہی ریاح پیدا ہو کر دل کو گھیر لیتے ہیں اور جس طرح ملک میں ایک رئیس ہوتا
ہو اسی طرح انسان کے بدن میں دل سب کا سردار اور زندگی کا مدار ہی اور دل کو خدا نے ایسا نازک مزاج
پیدا کیا ہی کہ ذرا سی تکلیف کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا اور دل کی جتنی بیماریاں ہیں سب میں اسی طرح
جھٹ پٹ کا کام تمام ہو جاتا ہی تدبیر کی نوبت نہیں آنے پاتی - آزادی کیا اُس بیماری کی کچھ پہلے
سے خبر نہیں ہوتی - آزمودہ - اب تم اس کو تحقیق کر کے کیا کرو گی - آزادی - سچ تو ہی پھر تم
یہاں دلی میں کیوں کر آئی ہو - آزمودہ - میری یہاں کچھ قرابت بھی ہی مگر میں ایک ایسی ضرورۃ
سے آئی ہوں کہ ہی تو وہ سرکاری کام مگر ایک اعتبار سے میرا اپنا کام بھی ہی - آزادی - اگر کوئی
کام میرے کرنے کا ہو یا جس کو تم جانو کہ میں کہہ سُن کر کرا دوں گی تو شوق سے کہنا - کیوں کہ اول
تو میں یہاں کی رہنے والی ٹھیری دوسرے اُسی سرکار کی نمک خوار - تیسرے جان پہچان کا حق
ہوتا ہی اور تم سے اور مولوی صاحب سے تو عزیزوں کی طرح راہ و رسم تھی اور آج کو مولوی
صاحب زندہ ہوتے تو نہ تم دوسری جگہ اُترنے کا ارادہ کرتیں اور نہ وہ تم کو دوسری جگہ اُترنے
دیتے - آزمودہ - خدا گواہ ہی میں تو تم کو اپنوں سے بڑھ کر سمجھتی ہوں اور دوسری جگہ اُترنے
کا تم ذرا بھی خیال نہ کرنا جس کام کے لئے میں آئی ہوں اُس کام کا سر انجام وہیں سے خوب ہو سکتا
ہی جہاں میں ٹھیری ہوں - اور تمھارے کہنے کی کیا ضرورۃ ہی مجکو پہلے سے یقین ہی کہ تم میرے
کام میں دریغ نہیں کرو گی - مگر میں اچھی طرح سے تحقیق کر لوں تو پھر تم سے کہوں - اور
شاید یوں ہی میرا مطلب ہو جائے تو تم کو تکلیف دینے کی کیا ضرورۃ ہی - اور اب تو میں جاتی
ہوں پھر خدا نے چاہا کسی دن ذرا سویرے سے آؤں گی کہ تم سے جی کھول کر باتیں کروں - آزادی
مناسب تو یہ تھا کہ تم یہیں رہتیں مگر شاید تم کو میری غریبی کا خیال ہو تو خدا نے تمھاری سرکار
کی بدولت بہتیرا کچھ دے رکھا ہی بس ایسی گئی گزری بھی نہیں کہ تم کو مہمان نہ رکھ سکوں - یہی نہ
کہ تم کو ویسا مزہ دار کھانا نہیں ملے گا - لیکن ایک غریب کا جی خوش ہو جائے گا - آزمودہ
بس بھی ایسی کہاں کی امیر ہوں اور امیر بھی ہوتے ہیں تو چپاتیوں کی جگہ سونے چاندی کے
ورق نہیں کھاتے - خدا کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں وہ چاہے تو پل کے پل میں فقیر کو امیر کبیر
کر دے - کسی کے دن سدا یکساں نہیں رہتے خدا پر شاکر رہو اُس نے یہ مصیبت ڈالی ہی تو

وہی اُس کا عوض بھی دے گا ضرور دے گا۔ اور مجکو تمہارے یہاں کھانے میں کیا عذر تھا
مگر دعوتوں سے چھٹکارا نہیں جس کی ضیافت قبول نہ کرو وہی بُرا مانتا ہی اب میری بھانجی میری
بلا دیکھے نہیں ہوگی لو اللہ علی۔ آزادی۔ اپنا پتہ ٹھکانا بتا جاؤ تو میں ہی تم سے ملنے کو آؤں۔ آزمودہ
نہیں نہیں۔ تم گھر سے پانو نکالنے کا کبھی خیال بھی نہ کرنا میں ہی کل نہیں تو پرسوں ضرور ضرور
آؤں گی۔ دوسری ملاقات میں آزمودہ نے جہاں اَور بہت سی جھوٹ جھوٹ باتیں بنائیں
کم بخت ایک تہمت بیچارے معصوم مولوی مستجاب مرحوم پر بھی لے مری تاکہ آزادی کا دل
ان کی طرف سے پھر جائے اور آخرکار پھر ہی گیا۔ اُس نے بیان کیا کہ تم نے نازک اندام بیگم
کا نام تو سنا ہوگا یہ اصل میں لکھنؤ کے مرشد زادے عالی جناب کی خواص تھیں۔ غدر میں
جب لکھنؤ تباہ ہوا تو کسی طرح جو ایک قصہ طلب بات ہی بھوپال میں آکر سکندر بیگم کی مصاحب
ہوئیں۔ لکھنؤ کی سی ثروت تو کہاں نصیب ہونی تھی مگر جب بھوپال میں ان کی پچیس ہزار
روپیے سال کی جاگیر ہوگئی یوں کہو کہ آنسو پُچھ گئے۔ چوں کہ آدمی منتظم ہیں وہاں کی معتبر
سرکاروں میں گنی جاتی ہیں۔ ان کے اپنے بطن سے تو کوئی اولاد ہوئی نہیں۔ ایک لڑکی کو
گود لے رکھا ہی۔ اب وہ لڑکی خدا کے فضل سے جوان ہوئی اُس کے لئے شوہر کی تلاش تھی اور یہ
نازک اندام بیگم صاحب کا آنا جانا محلات شاہی میں تو لگا ہی رہتا ہی۔ خدا جانے کس طرح
اُنھوں نے تمہارے میاں کو دیکھا اور دیکھتے کے ساتھ لٹو ہوگئیں۔ سواری سے اُترتے
ہی مجھسے بولیں کہ لو بُوا آزمودہ آج میں اپنی مرضی کا داماد دیکھ آئی۔ حال دریافت کرنا کیا مشکل
تھا۔ اگلے ہی دن نواب صاحب سے کہلا بھیجا کہ ان مولوی صاحب کو تو ہمیں دے۔ یوں
مولوی صاحب سے اور ہماری سرکار سے راہ و رسم شروع ہوئی۔ مولوی صاحب آتے اور
بیگم صاحب جاگیر کے حکم احکام اِن سے لکھواتیں اور کچھ لکھوانا پڑھوانا نہ ہوا تو ادھر اُدھر
کی باتیں کرتیں۔ حاشا مولوی صاحب مرگئے اور مجکو مرنا ہی میں مرتے ہوئے آدمی پر جھوٹ
نہیں بولوں گی میرے سامنے تو کبھی شادی بیاہ کا مذکور آیا نہیں لیکن بیگم صاحب تو مولوی
صاحب کے سامنے ہونے لگی تھیں اور بیٹی کو بھی زیادہ نہیں بس ایک بار یا دو بار نہیں معلوم
قصداً یا دھوکے سے ذرا کی ذرا مولوی صاحب کے آگے ضرور کیا ہی لیکن اندر باہر سب تاڑ گئے تھے

[illegible] مولوی صاحب کا واقعہ ہو گیا۔ بیگم صاحب نے بڑا ہی رنج کیا مگر کیا ہوتا تھا۔ ایک
[illegible] داماد کی تلاش تھی اب ایک آدمی اپنی مرضی کا ملا تھا تو ذرا اطمینان ہو گئی تھیں اب پھر
بدستور پریشان ہیں۔ کچھ ایسے پیچ آ کر پڑے ہیں کہ وہاں اُن کو بیٹی دینی منظور نہیں۔ اور
ماشاء اللہ لڑکی ہے کہ بادل کی طرح اُمڈی ہوئی چلی آتی ہے۔ میں نے بھی اپنی قرابت میں لکھا تھا کہ
اگر کوئی لڑکا تمھاری نظر میں ہو تو لکھنا۔ انھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے پھر تقاضا لکھا کہ
ایسی عمدہ جگہ کے تو ہزاروں خواہاں ہوں گے تم کو دلی میں کوئی آدمی نہیں ملتا حقیقت میں دلی
والوں کی کچھ تقدیر ہی پھوٹی ہوئی ہے۔ اب ان لوگوں نے ایک شخص کا نام لیا اور لکھا کہ سرکار
دربار کی باتیں ہیں ابھی بیگم صاحب پر تو اس کو ظاہر کرو نہیں تم آپ آکر اپنی آنکھوں سے
دیکھ جاؤ۔ یہ میرے آنے کی تقریب ہے ورنہ کہاں میں اور کہاں دلی۔ آزادی۔ پھر تم نے اُس
لڑکے کو دیکھا اور کیسا پایا؟ آزمودہ۔ دیکھا اور خوب اچھی طرح سے دیکھا جو دیکھنے کا حق ہے
میں نے خود اس سے پہروں باتیں کیں اور ہر طرح سے اُس کو ٹٹولا۔ اس میں شک نہیں
کہ عورت کو اس سے بہتر شوہر۔ ساس سسرے کو اُس سے بہتر داماد۔ ماں باپ کو اس سے بہتر
بیٹا۔ غرض اُس سے بہتر آدمی ملنا مشکل ہے۔ مگر اس سے زیادہ مشکل ہے اُس کا راضی ہونا
آزادی۔ دلی میں ایسا کونسا بشر ہے؟ آزمودہ۔ پرکھنے والا ہو تو پتھروں میں سے ہیرے
کو ڈھونڈ نکالے۔ مگر ابھی میں اس کا نام نہیں بتانا چاہتی اس میں کچھ مصلحت ہے۔ خدا نے
چاہا پھر آؤں گی تو اس کی ساری حقیقت تم کو کہہ سناؤں گی۔ آزمودہ تو اتنی باتیں کر کے رخصت
ہوئی اور آزادی لگی دل ہی دل میں سوچنے کہ یہ عورت ظاہرا مجھ سے کوئی غرض اور مطلب
نہیں رکھتی۔ میں نے چاہا کہ میرے پاس ٹھیرے تو اُس نے ٹھیرنے سے انکار کیا۔ میں نے کہا
کہ میرے کرنے کا کوئی کام ہو تو میں تمھاری مدد کو حاضر ہوں اس وقت تک مجھ سے کسی طرح کی مدد
کی درخواست نہیں کی۔ جتنی باتیں کیں سب پتے اور ٹھکانے کی۔ بے شک مولوی صاحب
امیروں کی صحبت میں بیٹھ کر بہک گئے ہوں تو کچھ تعجب نہیں۔ دولت ہے بھی ایسی ہی بری
بلا کہ اس کا نشہ ایک بار تو فرشتے کو بھی بھوت بنائے بغیر نہ رہے۔ ہمارے ہی شہر کے امیروں
کا کیا حال ہے مردانے پلید ناپاک۔ زنان خانے گندے نجس۔ خراب۔ نالائق طریقے۔ لغو بیہودہ مشغلے

ایک لونڈی کا جنا ہی تو دوسرا رنڈی کے پیٹ کا۔ شرافت چھو نہیں گئی۔ چلمنیا بہت سے
پاس ہو کر نہیں نکلے۔ قلعے کے جو جو حالات سننے میں آئے اور لکھنؤ کی جیسی جیسی باتیں مشہور
ہا میں ہم لوگ تو کانپ کانپ اُٹھتے ہیں۔ بیچارے مولوی صاحب کا تو فرضی حضرۃ یوسف کا سا
حال ہوا ہوگا۔ بھلا وہ تو پیغمبر تھے اُن کو خدا نے زلیخا کے پھندوں سے بچا یا مولوی صاحب
اس بیسوا نازک اندام کے دام سے کیا محفوظ رہے ہوں گے۔ خیر اب مرے ہوئے آدمی کو میں
کیا کہوں مگر بے وفائی تو ضرور کی۔ دنیا دیکھ رہی ہی کہ میں نے اُن کے حقوق میں سے رتی برابر
بھی کوئی حق فروگزاشت نہیں کیا۔ جب تک یہاں رہے اُن کی فرماں برداری سے کسی حالۃ میں
باہر نہ ہوئی۔ پیٹھ پیچھے کسی سے اُن کا گلہ شکوہ نہ کیا۔ جو اُنھوں نے لاکر دیا تھوڑا یا بہت
خوش دلی سے سر آنکھوں پر رکھا۔ میری تو کیا حقیقۃ تھی مگر اُس پاک پروردگار کا شکر ہی اُن کی
امانۃ میں کسی طرح کی خیانۃ نہ کی۔ یہاں تک کہ اُس بے نیاز نے شریعۃ کے قاعدے کے مطابق
عدۃ بھی پوری کرادی اور میں اُن کی زوجیۃ سے ادا ہوئی۔ میں نے اُن کے مرنے کا اتنا
رنج کیا کہ بس خدا ہی پر خوب روشن ہی یہاں تک کہ میں نے اپنے تئیں اپنے ہاتھوں ہلاک کر ڈالا
اور سب طرح کے منصوبے سوچے مگر کبھی بھول کر بھی دوسرے نکاح کا خیال نہ کیا۔ صرف
اس لئے کہ وہ جیتے جی میرے ہو کر رہے شرط مروۃ یہ ہی کہ میں بھی جب تک دم میں دم ہی اُن ہی
کی ہو کر رہوں۔ لیکن آزمودہ کی زبانی جو حالات سنے اگر سچ ہیں اور کوئی سبب سمجھ میں نہیں
آتا کہ سچ کیوں نہ ہوں تو وہ شرط مروۃ بھی باقی نہیں رہی۔ اور اب میں غور کرتی ہوں تو
میرا یہ خیال بھی غلط تھا کیوں کہ اگر دوسرا نکاح داخل بے مروتی ہوتا تو خدا ہرگز اُس کا حکم
نہ دیتا۔ بے مروتی تو بُری بات ہی تو اس کے یہ معنے ہوئے کہ توبہ توبہ خدا اپنے بندوں کو حکم
دیتا ہی کہ بُرائی کرو۔ ایک بات اور بھی سمجھ میں آتی ہی کہ بے مروتی کے بُرا ہونے کا بڑا سبب
یہ ہی کہ بے مروتی سے اُس کو رنج پونہچتا ہی جس کے ساتھ بے مروتی کرو اور یہاں تو یہ صورۃ
بھی نہیں۔ تو دوسرے نکاح کو بے مروتی کہنا ہی غلط ہی۔ اگر میری عمر دوسرا نکاح کرنے کی
نہ ہوتی یا میرے آگے اولاد ہوتی تو شاید دوسرے نکاح کا خیال کرنا نامناسب تھا۔ لیکن
بے مروتی کی وجہ سے نہیں بلکہ دوسری دوسری باتوں کے لحاظ سے کنبے میں مجھ سے بڑی بڑی

کی بیٹھی ہیں جن کی منگنی کا بھی ذکر تذکرہ نہیں - اور میرا بیاہ بھی اس جلدی سے اماجان
نے کیا تھا اور نہ اباجان کی رائے پر ہوتا تو شاید ابھی تک میرے بیاہی جانے کی نوبت بھی
نہ آتی تھی اس سے تو میرا بیاہ نہ ہوتا تو بہتر تھا - اماجان نے ناحق میری منزل کھوٹی
کی سگھر گھر کواریاں بیٹھی ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا - ان کے آگے میری قدر کیوں ہونے لگی -
اور گو دوسرا بھی نکاح کیوں نہ ہو مگر اس کی چھیڑ چھاڑ میری طرف سے تو ہو نہیں سکتی - لوگ
شاید کرتے بھی ہیں تو میں نے ہی ایسا ڈھنگ ڈالا کہ کسی کو جرأة نہ ہوئی اور میرا وطیرہ دیکھ کر سب کے
سب اپنی جگہ رک گئے - لیکن ابھی بھی کیا گیا ہے - کے دن ہوئے کہ میں نے لوگوں کو اپنے پاس آنے کی
اجازة دی ہفتے عشرے سے عورتیں آنی شروع ہوئی ہیں میں ان کے ساتھ اُکھڑی اُکھڑی
باتیں نہ کروں ایسا تو کیا ہے کوئی نہ کوئی تو ان میں سے اس کا اشارہ کرے پر کرے - اگر میں سن کر
چپ بھی ہو رہوں تو لوگ سمجھ لیں گے کہ مجکو انکار نہیں پھر بات کا سلسلہ آگے کو چلے - لیکن
ابھی تو میری ہی رائے کا کچھ ٹھکانا نہیں - پہلے میں اپنے دل میں تو فیصلہ کر لوں کہ دوسرا
نکاح کرنا بھی یا نہیں کرنا اگر نہیں کرنا تو شاید لوگوں سے ملنے ملانے کی بھی چنداں ضرورة
نہیں - میں نے جو لوگوں سے ملنا جلنا شروع کیا تو اسی غرض سے کہ میری دل بستگی کی کوئی شکل
نکلے - سو میرے دل کا حال مجھ سے بہتر کیا کوئی جانے گا - عورتوں کے دل کے بہلانے کی
جو جو صورتیں ہیں یا ہو سکتی ہیں میں نے کوئی باقی نہیں چھوڑی جس کو ابتدا سے انتہا
تک اچھی طرح سوچا سمجھا نہ ہو - ان میں سے تو کوئی بات دل کو نہیں لگتی اور حقیقة میں
اس کی توقع کرنی ہی نادانی ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بھی بیوگی کی تلافی کر سکتی ہے - پھر اس کو
خیال آیا کہ کسی شخص نے بیوہ عورتوں کے دوسرے نکاح پر ایک رسالہ تصنیف کیا تھا
اور وہ کہیں نہ کہیں میری کتابوں میں ضرور ہوگا - اس کو ڈھونڈ کر نکالا اور دیکھا تو
اس میں لکھا تھا - کہ دیکھنے - سننے - سونگھنے - چکھنے - چھونے کی قوتیں جو خدا نے انسان
کو دی ہیں اور جن کو حواس خمسہ کہتے ہیں گویا اتنی قسم کی ضرورتیں ہیں - ایک ضرورة
کو دوسری ضرورة رفع نہیں کر سکتی - نہ دیکھنے کا کام سننے سے نکلتا ہے اور نہ سننے کا
سونگھنے سے - علیٰ ہذا القیاس آدمی کے دل میں بھی طرح طرح کی خواہشیں ہیں -

مثلاً دولة کی خواہش اولاد کی خواہش نام ونمود کی خواہش - تن درستی کی خواہش - جو
دولة کا خواہاں ہی اولاد اور نام ونمود اور تن درستی کسی چیز سے دولة کی طلب کم نہیں ہو سکتی -
اسی طرح جس کو اولاد کا ارمان ہی وہ تبھی خوش ہو کہ اس کو اولاد ملے - اگر اولاد کے بدلے روپیہ دیدیا
جاے یا اُس کے نام کے اشتہار چھپوا کر دنیا میں بانٹ دئے جائیں تو وہ کیوں راضی ہونے لگا -
تو جب کوئی ضرورة کسی دوسری ضرورة سے رفع اور کوئی خواہش کسی دوسری خواہش
سے پوری نہیں ہوتی اور نہیں ہو سکتی تو خانہ داری کی خواہش کو بھی خانہ داری ہی پوری کرے
تو کرے - اس میں شک نہیں کہ انسانی ضرورتوں کے درجے برابر نہیں - مثلاً ایک ضرورة
تو تنفس یعنی سانس لینے کی ہی کہ بدون اس کے آدمی دو یا تین منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا
اس سے اتر کر کھانے پینے کی کہ خیر جبراً قہراً جیٹھ کے رمضان میں بھی روزے رکھنے ہی
پڑتے ہیں - اور ایک ضرورة ابناے جنس کے ساتھ مل جل کر رہنے کی بھی ہی کہ آدمی اکیلا
تن تنہا جنگل بیابان میں رہنا چاہے تو نہیں رہ سکتا - ان ضرورتوں میں سے بعض ناگزیر
ہیں - بعض سخت - بعض سخت تر - اسی طرح خانہ داری کی ضرورة بھی ضرورة ہی گو تنفس کی
طرح ناگزیر نہ ہو - یہ ضرورة عمر کے ایک خاص درجے پر پہنچ کر پیدا ہوتی ہی مگر اس سے اس کے
ضروری ہونے میں کوئی کلام نہیں کرسکتا - یوں تو کھانے پینے کی ضرورة بھی دودھ چھوٹنے
کے بعد لاحق ہوتی ہی مگر پھر بھی کھانا پینا جیسا ضروری ہی سب کو معلوم ہی - خانہ داری کی ضرورة
کو ہر زمانے میں ہر ملک ہر قوم ہر مذہب ہر ملة کے لوگ تسلیم کرتے آئے ہیں - وحشی سے
وحشی قوموں میں بھی خانہ داری کا رواج ہی - اور چونکہ آدمیوں کی نسل کا پھیلنا اور باقی
رہنا موقوف ہی خانہ داری پر تو یہ ضرورة بڑی بکار آمد ضرورة ہی - ہندوؤں میں جوگی اور
عیسائیوں میں راہب اس ضرورة یا اس ضرورة کی شورش کو مٹانا اور دبانا چاہتے ہیں تو
اُن کو کیسی کیسی مشکلات پیش آتی ہیں یہاں تک کہ انسانیة سے گزر جانا پڑتا ہی - اور چونکہ
یہ انتظام الٰہی کا مقابلہ کرتے ہیں اُن کی ضروری سزا ہی کہ زندگی اُن کے حق میں عذاب
اور وبال ہو - اس پر بھی بہت کم ہیں وہ لوگ جو سچے طور سے اپنے ارادے میں کامیاب
ہوتے ہیں - اسی مصلحت سے اسلام نے رہبانیة کی سخت ممانعة کی کہ

تھم نہیں سکتی اور اگر بہزار مصیبت تھمی بھی تو انسان کو از کار رفتہ کر کے - یہ کچھ کم فخر کی بات
نہیں کہ کسی مسلمان بادشاہ نے رہبانیت کی حمایت نہیں کی - لکھنؤ کے بادشاہوں کو تو ایسی ہی ایسی
بونگی باتیں سوجھا کرتی تھیں - نصیر الدین حیدر نے اچھوتیاں ایجاد کی تھیں تو سارا لکھنؤ اُن
اچھوتیوں کے نام سے پناہ مانگتا تھا - لیکن اگرچہ یہ بڑے فخر کی بات ہی کہ مسلمان بادشاہوں نے
رہبانیت کی حمایت نہیں کی مگر اُس سے کہیں بڑھ کر شرم اور افسوس کی بات یہ ہی کہ کُل مسلمان رہبانیت
کے طرف دار اور اُس کے حامی و مددگار ہیں بیوہ کا دوسرا نکاح نہ کرنا کھلی ہوئی رہبانیت نہیں تو
کیا ہی - ہم جب جب خیال کرتے ہیں تو ہم کو سخت حیرۃ ہوتی ہی کہ دوسرے نکاح کے ضروریات
انسانی ہونے میں کلام نہیں - قرآن میں آنکِحُوا الْاَیَامیٰ مِنْکُمْ (اپنی رانڈوں کے نکاح کردو) کا
حکم صاف و صریح موجود ہی جس میں کسی طرح کی تاویل کی گنجایش نہیں - پیغمبر صاحب کی حدیث
تو حدیث اُن کا اپنا فعل اپنا عمل درآمد لہ بی بی حضرۃ عائشہ رضؓ کے سوائے آپ کی جتنی بیبیاں
تھیں کسی کے آپ دوسری جگہ تھے اور کسی کے دوسری سے بھی زیادہ - تین صاحبزادیاں -
حضرۃ فاطمہ تو جناب علی مرتضیٰ کے ساتھ بیاہی گئیں اور اُن ہی کے نکاح میں انتقال فرمایا
باقی رہیں دو صاحب زادیاں دونوں کے دو دو بار نکاح ہوئے - اور تمام خاندان نبوی
اور تمام اصحاب کے گھروں کا یہی حال تھا - ان لوگوں میں بیوہ کا دوسرا نکاح ایسا ہی ضروری
اور لازمی اور معمولی تھا جیسا ہم لوگوں میں عورۃ کا پہلا نکاح - اور اب بھی عرب شام روم
افریقہ فارس کہیں کے مسلمان بیوہ کے دوسرے نکاح میں کسی طرح کی عار نہیں سمجھتے - یہ خاص کر
کچھ ہندوستان ہی کے مسلمانوں کی شامت ہی کہ انھوں نے بیوہ کے دوسرے نکاح کو عیب
سمجھ رکھا ہی - یہ ان پر ہندووں میں رہنے کی پھٹکار ہی - احمقوں نے ہندووں کی رسم تو
اختیار کر لی مگر یہ نہ سمجھے کہ اس رسم کے پیچھے دنیا اور دین اور ایمان سب کچھ کھو بیٹھے - بیوہ
کا نکاح نہ کرنا ہی تو دہری بڑا بھاری گناہ - ایک چھوڑ دو دو - کیوں کہ بیوہ پر ظلم کرنے کا ایک
گناہ حق العبد - اور [illegible] گناہ حق اللہ - لیکن اس کو عیب سمجھ کر اور عار [illegible]
کر نہ کرنا اور نہ کر[illegible] نظر حقارۃ سے دیکھنا اور نکاح ثانی کی نسل کو
از روے شرافۃ [illegible] تو شرک اور کفر اور ارتداد سب سے بڑھ کر ہی

کیوں کہ اس سے خاندانِ نبوۃ اور بزرگانِ دین کی ناموس میں طعن لازم آتا ہی۔ کیا اچھا اسلام کہ مونھ سے صلی اللہ علیہ وسلم اور رضی اللہ تعالی عنہ اور کرّم اللہ وجہہ اور رحمۃ اللہ علیہ کہیں اور دل ہی دل میں معاذ اللہ توبہ توبہ نقل کفر کفر نباشد ان کو جو رو بیٹی کی گچی گالیاں دیں۔ گالی پتھر تو نہیں کہ اس کے لگنے سے ہڈی ٹوٹ جاتی یا گوشت پھٹ جاتا یا خون نکل آتا ہو۔ کسی کی آبرو میں جرح کرنے کا نام گالی ہی اور وہی صورۃ یہاں بھی ہی۔ آزادی تو اس مضمون کو پڑھ کر لرز گئی اور لرزنے کی بات ہی تھی اس نے توبہ اور استغفار تو بہت کچھ کی مگر پھر معذرۃ کے طور پر کہنے لگی کہ بے شک مجھسے اتنا قصور تو ہوا کہ میں نے دوسرے نکاح کا ارادہ نہیں کیا اور نہ اس طرف میرا ذہن منتقل ہوا لیکن نہ اس خیال سے کہ دوسرا نکاح بے عزتی اور بیغیرتی کی بات ہی بلکہ میں نے تو بیٹھے رہنے کو شیوۂ مروۃ اور شرطِ وفاداری سمجھا تھا سو یہ بھی میری غلطفہمی تھی۔ میں مروۃ اور وفاداری کو پیغمبر زادیوں سے بہتر کیا سمجھوں گی۔ میں تو کسی بات میں بھی اُن کی جوتیوں کی برابری نہیں کر سکتی ✣

پندرھویں فصل۔ کٹنی آزادی کو شہ دیتی ہی۔

آزادی کے خیالات یہاں تک پونہچے تھے کہ پھر آزمودہ اس سے ملنے کو آئی۔ آزادی نے خود ہی اس سے پوچھا کہو بی کیا خبر ہی۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم نے اپنی بیگم صاحب کے داماد کو راضی کر لیا ہوگا؟ آزمودہ۔ اے بی داماد تو نہ بناؤ ناحق گالی چڑھتی ہی وہ مردوا اس وقت تک تو راضی ہوا نہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ راضی ہوگا بھی نہیں۔ آزادی۔ آخر سبب کیا؟ وہ لوگ کوئی سڑی ہی کہ گھر آئی ہوئی دولت کو لات مارتا ہی۔ یا اپنے گھر کا ایسا بڑا امیر ہی کہ اس کو دولت کی پروا نہیں۔ سو میری نظر میں ایسا امیر اب کوئی دلی میں تو ہی نہیں۔ یا تمھاری لڑکی میں کسی طرح کی کوئی قبیح ہی اور نہیں مانتا تو پڑے چولھے میں۔ تم کسی مشاطہ کو اشارہ کر دو شام تک رقعوں کا ڈھیر لگا دے گی۔ پردیس کا معاملہ ہی جان نہیں پہچان نہیں اس سے لوگ ذرا ہچکچائیں گے لیکن کچھ بھی ہو دولت کے آگے کسی کو کچھ نہیں سوجھ پڑتا۔ ہائے افسوس میں مرد نہ ہوئی نہیں تو آنکھ بند کر کے تمھارے ساتھ ہو لیتی۔ مگر بیگم صاحب کیا مجھے خاطر ملے

لاتیں۔ آزمودہ۔ یہ بھی تم نے ایک ہی کہی کہ تم کو اور خاطر میں نہ لاتیں۔ تم کو اپنے حُسن کی قدر
معلوم نہیں۔ تمھاری صورۃ کے آدمی لاکھوں میں نہیں ہزاروں میں مشکل سے ایک دو
ہوتے ہیں۔ میری ساری عمر ایسے ہی لوگوں میں بسر ہوئی ہی اور لکھنؤ میں میری نظر سے ایک
وقت گزرا ہی کہ جدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھو بس ایک گل لالہ پھولا ہوا ہی۔ یہ میں کچھ تمھارے مونہ دیکھے
کی بات نہیں کہتی حقیقۃ میں ماشاء اللہ تمھاری سی آن بان کم ہوتی ہی۔ تم میں ایک بڑی عمدہ بات
یہ ہی کہ بڑھاپے تک تمھاری یہی سج دھج بنی رہے گی۔ اگرچہ تمھارے اولاد نہیں ہوئی مگر تم نے
ایسا روحی صدمہ اُٹھایا ہی کہ کیسے سے کیسا ہی حسین ہوتا اس جھکولے میں آکر اس کی ساری بخیہ
دانت نکال دیتی۔ لیکن چشم بد دُور تمھارے کسا دیں کہیں سے ذرا فرق نہیں آیا۔ تم نے چمپئی
رنگ ایسا پایا ہی کہ اس کو کبھی زوال ہی نہیں۔ آزادی۔ آئی ہی آگ لگے اس حُسن کو۔ بلا سے
کالی بھٹ ہوتی۔ مبی بے ڈول ہوتی۔ سوکھی لقات ہوتی۔ یا پھپس۔ بونی۔ بالشتن۔
غرض کچھ بھی ہوتی مگر ہوتی سُہاگن۔ اب اس کم بخت صورۃ کو لے کر چاٹوں یا تعویذ بنا کر گلے
میں لٹکاؤں یا کیا کروں۔ آزمودہ۔ جب خدا کسی کو کسی طرح کی دولۃ دے تو چاہیئے کہ اُس کو خرچ
کرے دوسروں کو راحۃ پونہچائے۔ حُسن بھی بڑی دولۃ ہی جس کے آج سیکڑوں طالب ہزاروں
خواہاں۔ تم پر تو لوگ اس طرح گریں جیسے شمع پر پروانے۔ اور تم اس حسن کی بدولۃ لاکھوں کی لاکھ
بنی بیٹھی رہو۔ مگر ہاں اپنے ہاتھوں اپنے تئیں خاک دھول میں ملانا چاہو تو اس کا علاج نہیں۔
سنو بُوا دنیا میں سدا سدا کو رہنا نہیں اور دوبارہ جنم لے کر آنا نہیں خدا ہی کوئی مصیبۃ ڈال دے
جیسے کوئی روگ پیچھے لگ جائے تو مجبوری ہی ورنہ اپنا مذہب تو یہ ہی جتنے دن جینا چین کرنا۔
مزے اُڑانا اور عیش کی شرابیں پینا۔ مرنا یوں بھی مرنا ووں بھی۔ آزادی۔ تو یہ کرو تو یہ۔
یہ تمھارے کیسے خیالات ہیں مر کر خدا کو بھی مونہ دکھانا ہی یا نہیں۔ آزمودہ۔ اری بُوا کس نے
دیکھا ہی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اچھے اچھے مولویوں کو دیکھ لیا بس کیوں کسی کا پردہ
کھلواتی ہو۔ ان دنوں ہمارے بھوپال میں مولویوں کی یہ کثرۃ ہی کہ ٹڈیوں کی طرح آسمان
سے برستے اور چینوٹوں کی طرح زمین سے نکلے چلے آتے ہیں۔ بس تقویٰ اور طہارۃ ہاتی
کے دِکھلانے کے دانت ہیں۔ اور اگر کوئی بڈھا ٹھڈا تو سوچ ہے پورے کر کے آخر عمر میں

گر یہ سکیں بنا تو اُس کی سند نہیں۔ اس عمر میں تو بھی نا تکہ خدا کو دھوکا دینے گئے لئے تہجد گزار ہو جاتی ہیں۔ آزادی۔ میں کہتی ہوں مولویوں کے فعلوں کو سند گردانو ہی مت۔ پیری کے ہوں تو اور جوانی کے ہوں تو۔ اچھا بُرا کسی کے کرنے نہ کرنے سے نہیں ہوتا بلکہ خدا رسول کے حکم سے۔ آزمودہ۔ دنیا کے مزے بھی تو خدا ہی نے بنائے ہیں اور پھر جو سب کا حال وہ اپنا حال۔ اور خدا کو ایسا ہی ترسانا منظور تھا تو پیدا کرنا ہی کیا ضرور تھا۔ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ خدا اتنے سارے بندوں کو دوزخ میں ڈال کر آپ بیٹھا تماشا دیکھے۔ خدا کا ہے کو ہوا انگوڑا ہلاکو ہوا۔ ہم تو ایسے خدا کی خدائی سے باز آئے۔ آزادی۔ خدا کے لئے تم میرے آگے تو ایسے کفر کے کلمے مُونہ سے نکالو مت۔ میں تو خیال کرتی تھی کہ مولویہ کا اتنا زور شور ہے تو بھوپال میں بڑی دین داری ہوگی۔ آزمودہ۔ میں نے تم سے کہا نہیں کہ بڑی دین داری تو نہ ہوت کی ہے۔ جس کے پلے ٹکا نہیں۔ پیٹ کو روٹی نہیں تن کو کپڑا نہیں۔ یا جو قبر میں پانو لٹکائے بیٹھے ہیں وہ دین دار نہ ہوں تو کیا ہوں۔ بھوپال کی کیا خصوصیت ہے غریب غربا۔ کنگلے۔ مفلس۔ نادار۔ بڈھے۔ بے کار ہر جگہ دین دار ہوتے ہیں وہاں بھی ہیں۔ اور جس کے پاس اپنی کائنات ہے اُس کو تو دن عید اور رات شب برات ہے۔

شب دلارام سے گزرتی ہے ✢ صبح اُٹھ جام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے ✢ اب تو آرام سے گزرتی ہے

آزادی۔ تو کیا تمھاری یہ رائے ہے کہ میں بھی اسی طرح کی زندگی کرنے لگوں؟ آزمودہ۔ بے شک جب سے میں نے تمھارا نام سنا تھا از خود تمھاری محبت میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ اب جو تم کو آکر دیکھا تو تمھاری صورت مجکو اس قدر پیاری لگی۔ کہ اگر تم مردود بھی تو جو چاہے کر ڈالتیں مگر میں تمھارا پیچھا نہ چھوڑتی۔ تم نے عورت اپنی عاشق نہ سنی ہوگی تو میں بیٹھی ہوں دیکھ لو۔ آزادی۔ یہ تم کیسے اشارے کنائے کی سی باتیں کرتی ہو کہیں تم نے مجکو لکھنؤ یا بھوپال کی ایسی ویسی آبرو باختہ تو نہیں فرض کیا۔ آزمودہ۔ وہ جو کہتے ہیں عشق کے نام سے گدھے نے کھیت کھانا چھوڑ دیا تھا تم تو لگیں ابھی سے بگڑنے۔ بیوی بو مشک کی مہک اور حُسن کی چمک سات پردوں میں بھی چھپائے نہیں چھپتی۔ پردے میں بیٹھے ہوئے تم کو خبر نہیں ہوتی اور میں اسی ٹوہ میں پڑی پھرتی ہوں۔ پندرہ بیس جگہ کا تو مجکو حال معلوم ہے کہ لوگ تم پر زہر کھائے بیٹھے ہیں۔ اور میری

اس وقت کی بات یاد رکھنا کہ تم بہتیر اچاہو مگر لوگ تم کو بیٹھنے نہیں دیں گے۔ آزادی۔ کسی کی کیا مجال ہی کوئی آنکھ بھر کر میری طرف دیکھے تو دیدے نکلوا لوں۔ بھلا ایک آدھ کا نام تو سنوں آزمودہ۔ ایک تو خواجہ مشتاق ہی ہیں جن کو تم خوب اچھی طرح سے جانتی ہو میرے بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اوّل دن سے تم پر مرتے ہیں اور اسی غرض سے اُنھوں نے تمھارے باپ کے ساتھ ایسا گاڑھا دوستانہ کر رکھا تھا بلکہ تمھارے باپ تو زبان بھی دے چکے تھے مگر مولوی مستجاب کی تقدیر وہ تم کو اوپر سے اوپر اُڑا لے گئے یہ بیچارہ مُونہہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس کے دل پر کچھ اس طرح کا صدمہ ہوا کہ مدتوں مُلک ورمُلک اور جنگل در جنگل سڑی بنا پڑا پھرتا رہا۔ پھر ایسا بیمار ہوا کہ کوئی نہیں کہتا تھا کہ جاں بر ہوگا۔ تمھارے میاں کا مرنا سُن کر از سرِ نو جی اُٹھا۔ یہی وہ شخص ہی جس کے لئے میں بھوپال سے دلی آئی۔ دریافت کیا تو یہ ساری حقیقت کُھلی۔ خود اُس سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا تمھاری توقع میں جیتا ہی۔ آج اُس کو تمھاری طرف سے نا امیدی ہو تو جان کا دے دینا اُس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں۔ اُس کو تو میں تمھارا عاشق صادق سمجھتی ہوں کیوں کہ اُس نے تمھاری دُھن میں بھوپال کی بات کو اچھی طرح کان لگا کر سُنا تک نہیں۔ اور یوں تمھارے معمولی چاہنے والے اَور بھی بہت ہیں اور صبح شام میں ان کے پیام بھی تمھارے پاس آنے والے ہیں۔ تو اگر چاہو کہ امن سے بیٹھی رہوں سو تو ہوتا نہیں۔ اور اس میں تعجب کی بھی کیا بات ہی۔ میوہ دار درخت ہوتا ہی تو اُس پر پتھر آتے ہی ہیں۔ جن دنوں تم کواری تھیں آخر نسبت ملنے کے پیغام آتے ہی ہوں گے اور سبھی کے یہاں آیا کرتے ہیں لفظوں کا ہیر پھیر ہی ورنہ بات وُہی ہی۔ آزادی۔ اچھا تو میں اس کو اپنی جگہ سوچ لوں پھر تم سے صلاح کروں۔ آزمودہ۔ مجھ سے کیا صلاح کروگی۔ میری تو وہی ایک صلاح ہی آج کی آج اور کل کی کل کہ تم اور مشتاق دونوں میرے ساتھ بھوپال چلو جس میں دونوں گھر بسیں سو تم ملنے والی نہیں۔ تم لوگوں میں یہ بہت ہی بُرا دستور ہی کہ میاں بی بی ایک دوسرے کو سریش کی طرح چمٹ جاتے ہیں۔ مگر میں یقین کرتی ہوں کہ ہم لوگوں میں رہ کر نہ تمھاری یہ وضع رہے گی اور نہ ایسے خیالات۔ میرا تو ارادہ تھا کہ آج سے رخصت ہولوں کیوں کہ میں بھی اب جانے ہی والی ہوں۔ لیکن تم کہتی ہو تو خیر دو چار دن اَور رہی۔ آزمودہ کے ملنے سے

پہلے آزادی کی اپنی رائے بھی یہی تھی کہ مَیں بیوگی کی حالت میں رہ نہیں سکتی اور عقل و مذہب کا فتویٰ بھی یہی ہے پس ایک اعتبار سے وہ گویا نکاح ثانی کا ارادہ کر چکی تھی اس کو اگر تامل تھا تو صرف اتنی ہی بات کا کہ گو حلال ہے مگر دوسرا نکاح کرنے سے لوگوں کی نظر میں کچھ وقعت باقی نہیں رہتی۔ یوں دنیا میں جو دولتمند ہے غریب کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے۔ اولاد والا لاولد کو۔ پڑھا لکھا اَن پڑھ کو۔ خوب صورت بدشکل کو۔ مگر یہ کیا مصیبت ہے کہ پاک دامنی کے بچانے کو تو دوسرا نکاح کرو اور اُسی صفت میں لوگوں کے نزدیک ہیٹے ٹھیرو۔ لوگ احمق سہی بے دین سہی مگر ان کو چھوڑ کر آدمی کہاں نکل جائے۔ وُہی مثل ہے کہ دس نکٹوں میں ناک والا نکو۔ اور پھر ایک دن دو دن کی ہو تو انسان صبر بھی کرے یہ کلنگ کا ٹیکا کیسا کہ ماں کالی اور اولاد پر گالی +

سولویں فصل۔ آزادی پر چاہنے والوں کا نرغہ

آزمودہ کے ساتھ جو باتیں تیسری ملاقات میں ہوئیں اُن سے آزادی کا وہ ارادہ اَور بھی پکا ہو گیا۔ ایسی تو کیا بات ہے کہ حسین ہو اور اتنی عمر تک اپنے حُسن کو نہ جانے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ آزادی نے اپنے حُسن کی قدر و قیمت آزمودہ کے کہنے سے جانی۔ جس دن سے رانڈ ہوئی نہیں بلکہ جس دن سے مولوی مستجاب بھوپال کو روانہ ہوئے کبھی آئینہ دیکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ آج اس نے آئینہ سامنے رکھ کر اپنے بال وال درست کئے کپڑے بدلے اور سمجھی کہ مَیں بھی کچھ ہوں۔ مگر وہ جو کہتے ہیں مَیش کے گلے پر چھری آج کا آئینہ آگے رکھ کر کنگھی کرنا اور کپڑے بدلنا غضب ہو گیا اور لوگوں نے جیسے جس کے جی میں آئے حاشیے چڑھانے کوئی صاحب دیوار بیچ ہمسائے میں رہتے تھے یا آرہے تھے لگے پکار پکار کر شعر اور غزلیں پڑھنے۔ کسی نے باہر دروازے پر دستک دی ماما پوچھنے گئی ایک لڑکا رقعہ دے چمپت ہوا۔ ماما نے کاغذ لا بیوی کے ہاتھ دیا بیوی نے پڑھا تو یہ غزل تھی +

آہ کیا جانیئے کچھ تجھ میں اثر ہی کہ نہیں	اُس کو بھی میری محبت کی خبر ہی کہ نہیں
میرا احوال سُناتی اُسے جا کر بارے	اُس کے کوچے میں صبا تیرا گزر ہی کہ نہیں
کون وقتوں کی مگر شام ہوئی ہی اللہ	شب فرقت کبھی تجکو بھی سحر ہی کہ نہیں

اِس قدر ظلم و ستم تم جو روا رکھتے ہو
ہم تو پڑھ لیتے ہیں مونہ تیری طرف کرکے نماز
جوہری ہوئے تو ہم پوچھیں دکھا کر دُرِ ناسُفتہ
ہوتے ہیں ہمیں جامعِ اقسامِ کمالاتِ انساں
ہم تو اصلاح نہیں لیتے کسی سے لیکن
ہمہ وقت اُس کے ہی در پہ جو پڑا ہی تو زار

آی بتو کچھ بھی خدا کا تمھیں ڈر ہی کہ نہیں
نہیں معلوم کہ کعبہ بھی اِدھر ہی کہ نہیں
آب دار ایسا ترے پاس گُہر ہی کہ نہیں
تجھ میں بھی مردِ خدا کوئی ہنر ہی کہ نہیں
دیکھ لیتے ہیں کہ یاں طرزِ ظفر ہی کہ نہیں
تیرے رہنے کا کوئی اپنا بھی گھر ہی کہ نہیں

باہر صحن میں چارپائی بچھا کر بیٹھی ہی گود میں کاغذ کی گولی آکر گری کھولا تو انشاء اللہ خان کا شعر تھا۔ ؎

دیوار پھاندنے میں دیکھوگی کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا لو جی سلام میرا

ماما دہی کا دونا بازار سے لائی ہی پتوں پر کچھ لکھا ہی اچھی طرح پڑھا نہیں جاتا مگر ہی کچھ اسی قسم کی بات۔ آٹا چھاننے میں بھوسی میں سے کاغذ کے پُرزے نکلتے ہیں۔ ڈاک میں گمنام خط چلے آتے ہیں۔ بات بات سے آزمودہ کے کہنے کی تصدیق ہوتی ہی اور معلوم ہوتا ہی کہ ایک دو نہیں بہت سے آدمی اسکی فکر میں ہیں۔ آزادی کو اپنی یہ حالت دیکھ کر چاہتا تھا کہ خدا یاد آئے مگر اُس کو یاد آیا فرعون کہ حضرۃ موسی کی بد دعا سے جوؤں اور مینڈکوں کے عذاب نازل ہوتے تھے کھانے میں جوئیں بالوں میں مینڈکیاں۔ یہی حال آزادی کا ہو گیا کہ جہاں کسی کا ذہن منتقل نہ ہو وہاں بھی پرچہ *

آزادی کے پاس تھوڑے ہی دنوں میں اتنے خطوط اور رقعے اور پرچے اور پُرزے اور غزلیں اور شعر جمع ہو گئے کہ اگر سب کو یکجا جمع کر دیا جائے تو اچھی خاصی دس بارہ جزکی کتاب بنے اور کتاب بھی ایسی مقبول کہ ہاتوں ہاتھ بکے اور وارنہ آنے پائے کیوں کہ لوگوں کے مذاق معلوم ہیں دو ہی قسم کی کتابیں چلتی ہیں اول درجے بوستان کا باب پنجم عشق و جوانی۔ اُس سے اُتر کر مذہبی رگڑے جھگڑے۔ آزادی نے تمام کاغذات مکتوب مسطور پر لپیٹ کر رکھ چھوڑے تھے تو بڑا سارا مٹھا تھا۔ مرتے وقت جب اُس نے اپنی مشہور وصیت کی جس کا ذکر آیندہ آئے گا تو وہ مٹھا ہمارے حوالے کیا اور وہ اس وقت تک

محفوظ ہیں۔ اُن کاغذات میں سے ایک خط ہم کو بہت پسند آیا جس کی نقل اس جگہ درج
کی جاتی ہے اُس میں رسمی القاب وآداب اشتیاق وغیرہ کچھ نہ تھا لکھنے والا ایک دم سے اپنا
مطلب لکھ چلا کہ۔ (خط) اگر میں تم کو معمولی طور کی عورۃ جانتا تو ہرگز اس تحریر پر جرأت
نہ کرتا کیوں کہ میں خوب جانتا ہوں کہ عام عورتوں کے خیالات اکثر باتوں میں عموماً اور تعلق
زناشوئی کے بارے میں خصوصاً تمام تر لغو۔ سرتاپا بیہودہ اور بالکل ہنسی کے قابل ہیں۔
میں عورتوں کی شرم وحیا کو نہایۃ ادب اور بڑی عزۃ اور حرمۃ کی نگاہ سے دیکھتا اور اُس میں
دست اندازی کرنے کو پرلے درجے کی کمینگی سمجھتا ہوں۔ حیا عورتوں کے حُسن کی زینۃ ہے۔
خوب صورتی کی رونق۔ ناموس کی حافظ۔ پاک دامنی کی سپر۔ وفاداری کی ضامن۔ شرافۃ کا
تمغا۔ بھلمنساہت کا شعار۔ کھرے کھوٹے کی کسوٹی۔ بھلے برے کی شناخت۔ خانہ داری کا لطف
تاہّل کا مزہ۔ اوروں کو جزو ایمان عورتوں کو شرط انسانیۃ ٭ عورۃ جس میں حیا نہیں آئینہ
ہے جس میں صفا نہیں۔ موتی ہے جس میں ضیا نہیں۔ پھول ہے جس میں مہک نہیں۔ گوٹا
ہے جس میں چمک نہیں۔ لیکن عورتوں نے ناحق کی شیخی میں آکر حیا کو افراط کے ایسے درجے
تک پہنچا دیا ہے کہ اب وہ عیب سے بدتر ہے جیسے تِل کہ وہ ایک طرح کی خوب صورتی ہے
مگر ایک حد معین تک۔ جب تل اُس حد سے متجاوز ہوا داغ بدنما سمجھا جائے گا نہ خالِ
دل رُبا۔ ع جو خال حد سے زیادہ ہوا وہ مسّا ہوا ٭ افراطِ حیا نے عورتوں کو نہ صرف
تمتعاتِ جائز سے محروم اور بے نصیب رکھا۔ نہ فقط اُن کو کسب کمالات سے جن کے
حاصل کرنے کی استعداد اور قابلیۃ خداداد اُن میں موجود ہے روکا بلکہ اُن کو مردوں کے
ہاتھوں میں اس قدر عاجز ومجبور کر دیا کہ گویا عورتیں مردوں کے استعمال کی چیزیں
ہیں اور اُن کی خدمۃ گزار نہ خانہ داری کی شریک یا معاملات کی صلاح کار۔ شادی بیاہ کے
بارے میں عورتوں کی درماندگی اس درجے کو پہنچی کہ اُن میں اور افریقہ کے لونڈی غلاموں
میں کچھ فرق نہیں۔ مالک نے جس کے ہاتھ چاہا لونڈی غلاموں کو بیچ ڈالا اسی طرح
ولی بزرگ سرپرست نے جس کے ساتھ اُس کے جی میں آیا عورۃ کو بیاہ دیا۔ اس سے
بڑھ کر کوئی اَور بھی ظلم اور بے انصافی کی بات خیال میں آسکتی ہے [illegible]

کے ساتھ ساری عمر گزارنی ہی نہ کچھ کہہ سکتی اور نہ کوئی رائے ظاہر کر سکتی - پس ہمارے یہاں
کے شادی بیاہ اندھے کی لاٹھی ہیں لگی تو انعام نہیں صلہ نہیں اور نہ لگی تو شکایت نہیں گلہ نہیں
اور سب نیا ۰۰ افسوس اور حیرۃ کی بات یہ ہی کہ عورتوں کو اپنی خستگی حالۃ کا شعور نہیں احساس
نہیں - یعنی ان کی بہتری اور اصلاح کی امید نہیں آس نہیں - شعور ہو تو فریاد کریں غل
مچائیں - احساس ہو تو اپنے حق کے لئے لڑیں جھگڑیں پانو پھیلائیں - میں تم کو اُس وقت سے
جانتا ہوں کہ جب تم کو ان باتوں کے سمجھنے کی تمیز نہ تھی - مگر کھیل کود کی باتوں سے بھی تمھاری عقل
و ذہانت ظاہر ہوتی تھی - تم کو تو کیا خیال ہوگا لیکن مجکو بیسیوں مثالیں یاد ہیں جن سے ثابت
ہوتا تھا کہ خدا نے تم کو فہم سلیم اور رائے مستقیم عطا فرمائی ہی - میں نے تم کو ناواجب بات پر
ضد کرتے یا ناحق کی تیج کرتے کبھی نہیں دیکھا - اس سے بڑھ کر خوبی یہ تھی کہ آخر تعصب تو بچہ
اگر تم سے کوئی قصور سرزد ہوا تم بے تامل اس کو تسلیم کر لیتی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ
تمھاری ہمۃ قوی اور طبیعۃ مضبوط اور آزاد اور بے پرواہی - تم نے ایک بار اپنے والد کا
ایک شاہ صروری سرکاری کاغذ بگاڑا - تم تو گئیں گھر میں اور تمھارے پیچھے اُس کی ڈھنڈیا پڑی -
تمھارے والد نوکروں پر نہایۃ درجے خفہ ہوئے اور قریب تھا کہ اُن میں سے بعض نکالے
اور بعض پر جُرمانے ڈالے جائیں - اتنے میں تم باہر آئیں اور تم نے سنتے کے ساتھ وہ کاغذ
قالین کے تلے سے نکال خواجہ صاحب کے ہاتھ دیا - تم نے سوائے اس کے کہ اُس کو پھاڑا
نہیں کوئی طریقہ نہ تھا جس میں اُس کو بگاڑا نہ ہو - اس کے بعد جو گفتگو تم میں اور خواجہ
صاحب میں ہوئی اِس وقت تک لفظ بلفظ مجکو یاد ہی اور مرتے دم تک لفظ بلفظ یاد رہے گی -
خواجہ صاحب - آزادی یہ تم نے کیا کیا - تم - یہ تو کچھ پوچھنے کی بات نہیں جو کچھ کیا آپکے
سامنے موجود ہی - خواجہ صاحب - تم نہیں جانتیں کہ میری میز پر سرکاری کاغذ رکھے رہتے ہیں -
تم - سرکاری کی تو مجکو شناخت نہیں - ہاں یہ جانتی ہوں کہ کاغذ رکھے رہتے ہیں - خواجہ صاحب
پھر تم بے میرے پوچھے کیوں میری میز پاس گئیں - تم - اس لئے کہ کبھی آپ نے مجکو
منع نہیں کیا - خواجہ صاحب - میری میز پاس تمھارا کام ہی کیا تھا - تم - کام جو تھا لا کر
آپ کے ہاتھ دیا - خواجہ صاحب - اب تم بتاؤ کہ میں اس کو کیا کروں - تم - اگر آپ

دو بار خشک نہ ہوں تو پھر مجھے کو دیجیے کہ چند لکیریں اس پر اَور کھینچ لوں یہ کاغذ چکنا بہت ہی
اور اس پر قلم خوب دوڑتا ہی - یہ جملہ سُن کر سب ہنسنے لگے اور خواجہ صاحب بھی ہنس پڑے -
خواجہ صاحب - افسوس آزادی تم نہیں جانتیں کہ تم نے اِس وقت میرا کتنا بھاری نقصان کیا
ہی - تم - بے شک مَیں نہیں جانتی اور نہیں جانتی تو یہ خوشی کی بات ہی نہ افسوس کی - جان
بوجھ کر نقصان کرتی تو افسوس کی بات تھی - خواجہ صاحب - اَب صاحب پوچھیں گے تو میں کیا کہوں گا - تم
آپ میرا نام لے دیجئے گا - خواجہ صاحب - تم کو صاحب سے ڈر نہیں لگتا - تم - حاکم کو تو لوگ
ماباپ کہتے ہیں ماباپ سے کوئی ڈرتا ہی - خواجہ صاحب - بھئی ہم تو ڈرتے ہیں - تم - تو آپ
اُس کا کچھ قصور کرتے ہوں گے - خواجہ صاحب - بس یہی قصور جیسے آج یہ کاغذ بگڑ گیا -
تم - اِس کا بگڑا ہی کیا ہی چھپا ہوا کاغذ ہی میں نے ہندوستانی قلم دوات سے خالی جگہ میں کچھ
لکیریں کاڑھ دی ہیں لائیے مَیں اس پر پانی بہا دوں سیاہی دُھل جائے گی - چنانچہ ایسا ہی
ہوا اور کاغذ پہلے سے بھی زیادہ اُجلا ہوگیا - تب خواجہ صاحب نے پوچھا کہ بھلا آزادی تم نے
کاغذ کو قالین کے تلے چھپایا کیوں تھا ؟ تم - چھپایا نہیں - مٹی سے خشک کرنے کے لئے
قالین کا پلہ اُٹھا پلے کے تلے رکھ اوپر سے تھپک دیا تھا اتنے میں خدا جانے کس نے آواز دی میں
کاغذ میں چھوڑ گھر میں چلی گئی - اس طرح کی تمھاری بہت سی حکایتیں مجکو معلوم ہیں اور تمھاری
ان ہی باتوں نے مجکو گرویدہ کیا ہی آج سے نہیں بلکہ تمھارے بچپن سے - لوگ حُسنِ صورۃ
پر فریفتہ ہوتے ہیں مَیں بھی ہوں مگر میری فریفتگی شروع ہوئی ہی معنے سے - صورۃ تغیر پذیر
ہوتی ہی اور معنی پتھر کی لکیر - پس لوگوں کی محبتہ بے ثبات ہی اور میری میری جان کے ساتھ
مَیں نے اسی غرض سے خواجہ صاحب کے ساتھ اس قدر ربط بڑھایا تھا کہ جو لوگ بخوبی واقف
نہ تھے مجکو اُن کا فرزند سمجھتے تھے اور مَیں اِن کی فرزندی کا آرزومند تھا بھی - بلکہ میں آج
تم سے کہتا ہوں کہ خواجہ صاحب ایک طور پر مجکو زبان دے چکے تھے - لیکن تم کو اپنے والدین
کی رائے کا اختلاف بخوبی معلوم ہی - تمھاری والدہ نے صرف خواجہ صاحب کی ضد سے کیا جو
اُن کو مناسب معلوم ہوا - جو اثر محرومی اور ناکامی نے مجھ پر کیا اس کے گواہ ہیں جنگل اور بیابان
جن میں مہینوں میں بے خود و سرگرداں پڑا پھرا ہوں - اس کے شاہد ہیں شہر کے ڈاکٹر اور طبیب

جن احمقوں نے مجکو معمولی طور کا بیمار سمجھ کر اپنا وقت اور میرے بیمارداروں کا روپیہ بہت کچھ ضائع کیا۔ خلاصہ یہ ہی کہ اتنے دن مجھ پر سکرات الموت سے بھی زیادہ سختی کے گزرے اور میں حیران تھا کہ الٰہی کس درجے کی گراں جانی ہی کہ اس قدر ایذا ہی اور جان نہیں نکلتی۔ بارے خدا کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ میرے نمرنے کی یہ وجہ تھی۔ میں اس مرتبے کی کام یابی کی جس کی مجھکو کامل توقع اور پوری امید ہی بڑی تردد وقعت کرتا ہوں۔ وہ دوسروں کی اور دوسروں کی بھی نہیں بلکہ صرف تمھاری والدہ کی تجویز تھی اور یہ تمھارا اپنا انتخاب ہوگا۔ وہ اوروں کی راے تھی یہ تمھارا اپنا میلان۔ وہ ڈفالیوں کا گانا تھا اور یہ کلاونت کا ترانہ۔ وہ کودک نادان کے تکے چلانا تھا اور یہ قادر انداز کا نشانہ۔ وہ ناواقف کا ٹامک ٹوئیے مارنا تھا اور یہ منزل شناس کا سفر وسیلۃ الظفر۔ ایک اعتبار سے تو تم کو پہلے سے زیادہ آسانی ہی کہ اس مرتبہ ویسی بندی نہیں اور تم جتنا دخل چاہو دے سکتی ہو۔ لیکن یہ ایک طرح کی مکروہ خود غرضی ہوگی کہ میں اُن مشکلات کو چھپاؤں یا گھٹاؤں جو تم کو پیش آنے والی ہیں۔ میں اس بات سے بالکل مطمئن ہوں کہ تم نکاح ثانی کی ضرورۃ کو تسلیم کر چکی ہو اور تم نے اس کا فیصلہ کر لیا ہی کہ تمھاری حالۃ دوسرے نکاح کی متقاضی ہی۔ لیکن راے سے ارادے میں اور ارادے سے عمل میں بڑا فاصلہ ہی۔ آدمی پرچند در چند طرح کے دباؤ میں۔ وہ محکوم ہی مذہب کا۔ حاکم وقت کا۔ بزرگان خاندان کا صحبۃ کا۔ تعلیم و تربیۃ کا۔ اور شاید سب سے بڑھ کر نہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ملکی رسم و رواج کا۔ بڑے شکر کا مقام ہی کہ ان موانع میں سے تم کو ایک ہی مانع در پیش ہی یعنی رسم و رواج۔ وہ بھی اُس سختی کے ساتھ نہیں جیسا قصباتیوں میں۔ خدا مولویوں کو جزاے خیر دے جنھوں نے نکاح بیوہ کے رواج دینے میں کوشش کی اور شہر میں اگلے وقتوں کا سا یا دیہات قصبات کا سا گریز باقی نہیں۔ لیکن ہر چند نکاح ثانی دشنام نہیں مگر رواج عام بھی نہیں۔ اس خیال سے کہ تمھارے ننہال کے لوگ اکثر مولوی ہیں مجکو امید تھی کہ شاید بیوہ کے دوسرے نکاح کے شواہد بہم پہنچانے میں دشواری نہ ہو مگر افسوس ہی کہ جہاں تک میں نے تحقیق کیا تمھاری ددھیال اور ننہال دونوں اس فخر سے محروم ہیں اور اسی سبب سے میں ڈرتا ہوں

کہ اگر کوئی تم کو بہکائے گا نہیں تو اکسائے گا بھی نہیں - بڑی دشواری یہ ہی کہ معاملہ ہی نازک اور ایسے ہی معاملات میں آدمی دوسروں کی صلاح کا سہارا ڈھونڈا کرتا ہی تمھارے صلاح کار اگر ہو سکتی ہیں تو تمھاری ہی ہم جنس عورتیں جن میں صلاح کار ہونے کی صلاحیت نہیں - پس تم کو جو کچھ کرنا ہی اپنی ہی اکیلی رائے سے کرنا ہی - یہ غنیمت ہی کہ روداد پیچیدہ نہیں مذہب اور عقل اور تقاضائے حالت - اتنی باتیں ایک طرف ہیں اور اُن کے مقابلے میں اگر ہی تو وہی ایک لغو اور بے اصل سا خیال کہ رواج عام نہیں - اگرچہ بیوگی کی تلخیاں تم نے تمام و کمال نہیں چکھیں لیکن جس قدر چکھیں اُن سے تم اندازہ کر سکتی ہو کہ بیوگی کیسی سخت مصیبت ہی اور اس مصیبت میں کتنی خدا کی بندیاں مبتلا ہیں اور اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی دوسری کوئی تدبیر نہیں پس تم نکاح کر کے نہ صرف اپنی مصیبت دفع کر دو گی بلکہ سیکڑوں ہزاروں بیووں کی مصیبتیں جو فقط اتنے اشارے کی منتظر ہیں کہ کوئی تم جیسی خدا ترس آگے بڑھے اور یہ اُس کے پیچھے ہو لیں تم نے ضرور کتابوں میں پڑھا اور وعظوں میں سُنا ہوگا کہ جو شخص مَری ہوئی سُنّت کو جِلائے اُس کو اپنے عمل کے سوائے روز قیامت تک اُن سب کے عملوں کا ثواب ہوگا - جو اُس کی دیکھا دیکھی اُس سُنّت پر چلیں - پس یہ موقع ہی کہ تم عقل و ہمت سے کام لو اور اِس ثواب عظیم کو ہاتھ سے جانے نہ دو - کون جانے کہ یہ اجر تمھاری تقدیر میں ہوا اور اسی غرض سے خدا نے تم کو بیوہ کیا ہو - آخر میں تم کو مَیں اپنی طرف بھی متوجہ کرتا ہوں - اگر تم نے دوسرا نکاح نہ کیا یا کیا اور کسی دوسرے کے ساتھ کیا تو مَیں مر کر نہ صرف تم کو بلکہ دنیا جہان کو دکھا دوں گا کہ میری طلب اِدّعائی اور ریائی تھی یا حقیقی اور واقعی - مَیں اس میں اپنے نام کا لفافہ ملفوف کرتا ہوں اور یہیں سے ڈاک کے ہرکارے سے اس کا پکا بندوبست کر لیا ہی کہ اس پتے کے خطوط میرے سوائے کسی غیر کے ہاتھ نہ پڑیں - اس سے اطمینان رکھنا کہ تم اگر مجھکو لکھنا چاہو گی تو ممکن نہیں کہ کسی دوسرے کو اُس کا علم ہو اور میں اپنے اس عہد کے لئے خدا کو کفیل گردانتا ہوں ٭

آزادی نے یہ سب سامان دیکھ کر اپنے دل میں کہا کہ جو دن آتا ہی بیوگی کی نئی مصیبت اپنے ساتھ لاتا ہی - جن کے مرد پاس ہیں اُن کا تو بھلا کیا مذکور ہی جن کے مرد پردیس میں ہوتے ہیں کیا سر نہیں دھوتیں - کپڑے نہیں بدلتیں - پھول چوڑیاں نہیں پہنتیں - مہندی نہیں

لگا تیں - بناؤ سنگار نہیں کرتیں - کوئی کچھ نہیں کہتا - میں نے ذرا کی ذرا آئینے میں مُونہ کیا دیکھا کہ لگی چاروں طرف سے بھد پار ہونے - اِن زبردستی کی بدگمانیوں کی روک تھام مجھسے کیا ہوسکتی مگر ہاں مُونہ کو کپڑ ملوں ہندنی رانڈوں کی طرح سر مُنڈواؤں سو یہ تو مجھسے نہ ہوا اور نہ آیندہ ہوگا - لوگ ایک بدگمانی نہیں لاکھ بدگمانیاں کیا کریں بلا سے - مردوں نے یہ کیا آفت برپا کر رکھی ہی - ناحق بیٹھے بٹھائے کسی کو رُسوا کرنا کچھ اچھی بات ہی - شادیاں بھی ہوتی ہیں - بیاہ بھی ہوتے ہیں - نکاح بھی ہوتے ہیں - مگر یہ طریقہ کہیں سُننے میں نہیں آیا - اور کسی کی پناہ پکڑے بغیر یہ فضیحتا بند ہوتا ہوا نظر نہیں آتا - اگر میں واقع میں خوب صورت ہوں جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں تو خوب صورتی کچھ رنڈاپے سے نہیں آئی - مگر لوگ جانتے تھے کہ ایک کے نکاح میں ہی اس سے کسی کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا - اب دیکھا کہ کوئی اِس کا سرپرست نہیں لگے عاشقی کا دم بھرنے - تو اس میں لوگوں کا کچھ قصور نہیں - قصور اگر ہی تو میرا ہی - آج میں کسی کی ہو رہوں عاشقی اور معشوقی سب کا خاتمہ ہی - لیکن اس جلدی سے کیوں کر ہو رہوں - مُونہ سے کہنا آسان ہی اور ہو رہنا مشکل - آپ رو گئی ہوئی پھر نہیں آتی وہ پہلی دفعہ کا تو معاملہ تھا اَور - کہ میں پرائے بس میں تھی اور اب دوسری طرح کا موقع ہی - بُرا کہنے والے دس اور صلاح بتلانے والا ایک اپنا دم اور بس - آدمی ہی تو ہی سمجھا کچھ اور نکلا کچھ تو وہ جو کہتے ہیں نقصانِ مایہ شماتتِ ہمسایہ لوگ مارے طعنوں کے میرا جینا بھی دشوار کر دیں گے - کروں گی بھی تو اچھی طرح ٹھوک بجا کر کہ کل کو کسی طرح کی کوئی بات نہ دینی آئے - یہاں میری عقل ہی ہی اَور بھی خبط ہو جاتی ہی کہ کیا اور پھر بھی اتفاق پیش آیا تو وہی کہاوت ہوگی نہ چکھا نہ کھایا ناحق اپنا نام دھرایا - غرض کیا معلوم کہ ہو بھی یا نہ بھی ہو - اور ہوا بھی تو کیا مُونہ کا نوالہ ہی کہ جھٹ سے نگل لیا - اور لوگ ہیں کہ مجکو دم نہیں لینے دیتے - الٰہی کس توائی میں جان ہی - اور خیر چٹھی چپاتی تک کا مضایقہ نہ تھا مگر دیوار پھاندنے کی دھمکی نے جورات کی نیند حرام کر رکھی ہی - ایک نامراد کالی سی بلّی ہی وہ کبھی کبھار دیوار کود کر آتی ہی تو میرا کلیجہ گھڑیوں اُچھلا کرتا ہی اگر خدانخواستہ رات کے وقت کوئی اوپری مرد آ کُودا آیا تو میں تو یقیناً سہم کر مر رہوں گی - لیکن انگریزی عمل داری میں ایسا کیا اندھیر ہی - دھمکی نہیں شاعرانہ ڈھکوسلا ہوگا - پھر بھی دو چار دن

کے لئے میں کہیں کو ٹل جاؤں تو بہتر ہو۔ ماما کہاروں کے اڈے پر ڈولی کو کہہ آؤ۔ میں ذرا اپنے میکے ہو آؤں۔ تم لوگ ہوشیاری سے رہنا چیز بست کی خبر رکھنا۔ ایک آدمی بچھو نے لو آگر آگے چلو ڈولی کے ساتھ ساتھ دوڑ نا کیا ضرور ہی +

سترویں فصل۔ آزادی میکے جاتی تھی کٹنی نے اس کی ڈولی اپنے گھر اُتروالی

آزادی بیٹھتے تو ڈولی میں بیٹھ لی مگر گلی سے باہر ہوتے ہوتے اس کو اشتباہ سا ہونے لگا کہ ڈولی کچھ نئی سی معلوم ہوتی ہی میں تو کبھی اس میں سوار نہیں ہوئی اور کہار تو یقیناً دوسرے ہیں نہ وہ رفتار نہ ویسی ہونکار۔ تھوڑی دیر بعد اس کو ڈولی کا رخ بھی دوسری طرف کو پھرا ہوا سا معلوم ہوا کیوں کہ کثرۃ سے میکے آنے جانے کا اتفاق ہوتا تھا ہر ایک بات کی اس کو اٹکل تھی سر راہ کہاروں سے بات نہیں کر سکتی۔ اپنا آدمی کوئی ساتھ نہیں۔ اور اب تو چلتے چلتے دیر بھی زیادہ ہوتی چلی۔ سمجھی کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہی۔ رستے میں ڈولی میں سے کود پڑوں تو بے پردگی ہوتی ہی۔ کہاروں سے پوچھوں تو ٹھٹ کے ٹھٹ آدمی بازار میں چلے جا رہے ہیں میری آواز سنیں گے اور ہوا ان میں کوئی جان پہچان بڑی بدنامی کی بات ہی۔ مگر دن دہاڑے کوئی کیا کر سکتا ہی آخر کہیں تو کہار ٹھیریں گے ٹھکانے پر پہنچ کر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا۔ یہ معلوم ہی کہ شہر سے باہر نہیں ہوئے اور ہی کوئی آباد جگہ۔ لیکن خدانخواستہ اگر یہ کرتوت کسی بدمعاش کی ہی تو مشکل معاملہ ہی۔ شہر کے بدمعاش تو اس بلا کے ہیکڑ ہیں کہ میرے اکیلے دم کی تو کیا اصل ہی کمسریٹ کا نالی کھول کرلے گئے انگریز ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہلاک ہوگئے آخر تھک کر بیٹھ گئے۔ کوتوالی کا من سوا من کا گھنٹہ دوہرے پہرے میں سے اڑا لے گئے آج تک تو سراغ لگا نہیں۔ پارسال کا مذکور ہی کہ لاٹ صاحب جامع مسجد دیکھنے گئے بگھی میں دھستہ چھوڑ گئے لوٹ کر آئے دھستہ غائب۔ لیکن جو اصل بدمعاش ہیں اُن میں یہ بڑی عمدگی ہی کہ کسی کی ناموس میں خلل نہیں ڈالتے۔ امانت میں خیانت نہیں کرتے۔ کل کے واسطے کچھ بچا کر نہیں رکھتے۔ ان باتوں کا بدمعاشوں میں بڑا پکا عہد ہوتا ہی۔ اتنے میں تو کہاروں نے ڈولی کندھے سے اتار کر نیچے رکھ دی۔ آزادی نے پردے کی دراڑ سے دیکھا تو ایک چھوٹے سے مکان کا

کوئی پانچ چھ چارپائی کا صحن ہی جس میں ڈولی رکھی ہی۔ ایک طرف کو کاٹ کا اکہرا دالان
ہی جس میں شاید آج ہی فرش بچھا ہی۔ دالان کی بغل میں کوٹھڑی ہی جس کے کواڑ بھڑے ہوئے
ہیں۔ باہر تو کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا اندر کوٹھڑی میں کوئی چھپا بیٹھا ہو تو خبر نہیں۔
مکان کی صورۃ حال کہے دیتی ہی کہ اس میں کوئی رہتا سہتا نہیں خدا جانے کس ضرورۃ سے
جھاڑو دلوا کر دری چاندنی بچھوا دی ہی۔ اب تو آزادی کو یقین ہو گیا کہ کسی نے کہاروں سے
مل کر میری ڈولی اس مکان میں اتروالی ہی۔ چاہا کہ الٹے پانوں بھاگ چلوں سر پر ڈالنے
کو برقعہ یا چادر نہیں۔ علاوہ بریں جگہ کا نام و نشان معلوم نہیں۔ خدا جانے محلے میں کون لوگ
بستے ہیں۔ بارے اس کو اس وقت اور تو کچھ نہ سوجھ پڑا ڈولی میں سے نکل چھپا چھپ
اندر سے ڈیوڑھی کی اور باہر سے کوٹھڑی کی زنجیریں چڑھا دیں کہ ایسا نہ ہو کوئی باہر سے اندر
گھس آئے یا کوٹھڑی میں کوئی چھپا بیٹھا ہو اور کنڈی کھلی پا کر باہر نکل پڑے۔ پھر کن سوئیاں
لینے کی غرض سے ڈیوڑھی میں کواڑوں سے لگ کر جا کھڑی ہوئی۔ دو چار آدمی آتے جاتے دکھائی
بھی دیئے ہمتہ نہ پڑی کہ بات کرے۔ بارے تنہا ایک حلال خوری گزرتی ہوئی نظر آئی اس نے
آواز دی قریب آئی تو کواڑ کھول کر اس کو اندر لے لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔
آزادی نے پوچھا اری کم بخت سبھاگی تو کہاں؟ سبھاگی۔ میری بیوی جی کو اللہ رسول کی امان
الٰہی دوست شاد دشمن پامال بیوی جی مجکو تو یہاں کنجنی گلی اپنی سسرال آئے دو دو مہینے ہوگئے
میری ماں تو اچھی ہی۔ روز جاؤں جاؤں کرتی ہوں کام سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ تمہاری جوتیوں
کے صدقے سے محلے بہت ہیں۔ جھان تو جھان صفائی والے چین نہیں لینے دیتے اور سب سے
بڑھ کر رپٹ کہ ذرا ذرا بات کی خبر سرکاری تھانے میں کرنی پڑتی ہی۔ بیوی جی خدا تم کو بنائے رکھے
یہ جگہ تمہارے لائق نہیں۔ آزادی کیوں کچھ حال تو بیان کر؟ سبھاگی۔ چھلاوا چھلاوا ایک
کٹنی ہی بہت بدنام ہی یہ مکان اسی نے لے رکھا ہی بند پڑا رہتا ہی آج ہی کھلا بھی ہی تو یہ
کٹنی اس کو خدا کی مار تم تک کیسے جا پہنچی؟ آزادی نے آزمودہ کا آنا۔ خواجہ مشتاق کا
پیام لانا۔ لوگوں کا غل مچانا۔ میکے کے ارادے سے چلنا۔ اور دھوکے سے یہاں آ نکلنا۔
کوٹھڑی اور ڈیوڑھی کی کنڈیاں بند کرنا ساری حقیقۃ بیان کی جس کو سن کر سبھاگی بولی

بے شک یہ سب اُسی کٹنی کا کام ہے اور وہ بڑی چلتی ہوئی ہے میں اُس کو خوب جانتی ہوں اور
جہاں جہاں اُس نے چھاپے مارے ہیں مجکو سب معلوم ہیں۔ اور بیوی جی بات کہوں صاف
میں نے اُس سے بہت کچھ کھٹکا کیا ہی ہے اور اگر وہ ہم لوگوں کو ملائے رکھے تو اس کا کام
ایک دن بھی نہ چلے۔ لیکن ظالم نے تمھارے ساتھ دغا کی تو بہت ہی بُرا کیا۔ میں ذرا بھی اشارہ
پاتی تو وہیں اس کو روک دیتی۔ اور تم کو ایسا ہی منظور ہوگا تو اُس کے ہزار رستے ہیں۔ ہے
چھلاوا ابھی بڑی بلی اس نے سب تھانے والوں کے مہینے باندھ رکھے ہیں مگر یہ جو اب تھانہ دار
ہے بڑا روکھا آدمی ہے کسی سے کچھ لیتا لواتا نہیں مدتوں سے چھلاوا کی تاک میں ہے ابھی تک تو اُس کے
قابو میں آئی نہیں مگر وہ جو کہتے ہیں سو دن چور کے تو ایک دن ساہ کا خدا جانے آج اُس نے یہ
کیا غضب کیا تھانہ دار کو ذرا بھی معلوم ہو جائے تو چھلاوا کو تو وہ بخشنے والا نہیں۔ کاٹھ میں
ٹھوک دے۔ جرمانہ ڈال دے۔ کالا مونہ کر کے کوچے کوچے گلی گلی منادی پھروا دے جو کرے
سو تھوڑا۔ اِدھر تو آزادی اور سبھاگی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر کوٹھری کے اندر سے
کوئی شخص کواڑوں کی چُول اُتارنے کی فکر میں تھا۔ باتوں کے بیچ بیچ میں کواڑوں کی کھڑکھڑاہٹ
کی وجہ سے آزادی اور سبھاگی دونوں نے کئی بار کوٹھری کی طرف کو دیکھا تو تھا مگر دونوں کا
دھیان باتوں میں تھا یا شاید اس خیال سے کہ کوئی بلی اندر بند ہو گئی ہو گی دیکھ دیکھ کر چپ ہو ہو بیٹھیں
اور اب جو بات ختم ہونے پر آئی تو دیکھا کہ بلی کے بند ہونے کی سی کھڑکھڑاہٹ نہیں ہے کوئی
شخص اندر سے دستک دے رہا ہے۔ آخر سبھاگی بولی بیوی جی سارا مدعا اسی کوٹھری میں ہے یہ
تو تم نے بڑی ہی ہوشیاری کی کہ آتے ہی آگے سے کوٹھری کی کُنڈی لگا دی نہیں تو بے ڈھب
آپھنسی تھیں۔ آزادی۔ سبھاگی میں تجھ سے کیا کہوں مکان کی شکل دیکھتے ہی میرے تو
سارے بدن میں تھرتھری سی پڑ گئی تھی۔ ایک تو جی میں آیا کہ چلا کر بھاگ کھڑی ہوں۔ پھر
سوچی کہ اوپری محلہ میرے پاس سر پر ڈالنے کو نہ چادر نہ برقعہ اور سب سے بڑھ کر یہ خوف
کہ غل مچے گا لوگوں کو خبر ہوگی۔ آخر اور تو کچھ نہ کرتے بن پڑا خدا نے مجکو اتنی عقل دی کہ اندر
باہر کی کُنڈیاں بند کر دیں اور بے شک یہ تو سچ کہتی ہے کہ سارا فساد اسی کوٹھری میں ہے۔ پھر
اب تیری کیا صلاح ہے۔ سبھاگی۔ اگر تم کہو تو میں ابھی تھانے دار کو جا کر بُلائے لاتی ہوں۔

بس ہمیشہ ہمیشہ کو محلے کی گند کٹ جاے گی۔ اُس کو تو چھلاوا کے نام کی چڑ ہی کئی بار مجھ سے کہہ چکا ہی کہ تو ضرور چھلاوا سے ملی ہوئی ہی اور اُس کی رازداری کرتی ہی خیر کبھی نہ کبھی تو میرے ڈھب پر چڑھے گی یہ مدعا پاکر تو تھانہ دار اچھل پڑے گا اور عجب نہیں مجکو سرکار سے کچھ انعام دلوا دے۔ آزادی۔ لیکن سبھاگی میں اپنا نام ظاہر ہونا نہیں چاہتی تو سمجھ تو ہی اس کا چرچا بھی بڑی بدنامی کی بات ہی۔ ہی یا نہیں؟ سبھاگی بدنامی کی بات تو ہی لیکن میں کہار لائے دیتی ہوں تم تو سوار ہو جاؤ پھر میں سمجھ لوں گی۔ میرا تو کہیں نہیں گیا۔ اول تو میں اِن ہی سے کچھ نہ کچھ لے مروں گی اور شاید آپ روپیہ کھیل جائیں۔ اور نہ دیں تو یہ کیا کم ہی کہ تھانہ دار میری مٹھی میں آجاے گا۔ آزادی۔ سبھاگی دیکھ تو جان خبردار جو کسی پر میرا نام ظاہر ہوا۔ سبھاگی۔ بیوی جی تمھارا کدھر خیال ہی جو تم سے دغا کرے اُس سے خدا دغا کرے میں تمھارے ساتھ کسی طرح کا سلوک کرنے جوگی نہیں تو تم نے میرا کیا بگاڑا ہی کہ حق ناحق تم کو بدنام کروں۔ اگر تمھارا برا چاہوں تو جاننا میری اصل میں فرق ہی۔ آزادی۔ خیر افسوس ہی کہ میں نے چھلاوا کو نہ دیکھا۔ سبھاگی۔ کالا مُونہ خدا تم کو کیا کسی اشراف زادی کو اس کی صورت نہ دکھائے اور میں کہتی ہوں کہ یہی چھلاوا آزمودہ بن کر تمھارے پاس پونہچی۔ بھلا آزمودہ کی صورت کیسی تھی؟ آزادی۔ لباس تو اُس کا باہر والیوں کا سا تھا تنگ پاجامہ چوڑیاں پڑی ہوئی۔ آستینوں دار نیچا کرتا۔ پُرانی وضع کی گھیتلی جوتی۔ مجھے ایسا خیال پڑتا ہی کہ اوپر کے اگلے دو دانت بندھے ہوئے ہیں۔ سانولا رنگ۔ چیچک رُو۔ دُبلی ٹھنگنی اور کچھ بیمار سی بھی معلوم ہوتی ہی۔ رنگت میں ایک طرح کی زردی ہی۔ سبھاگی۔ بس بس مجھے اپنے پیارے بچوں کی قسم چھلاوا۔ وہ ایک مکارہ عورت ہی تمھارے پاس بہروپ بھر کر پونہچی ہو گی باقی جتنا پتہ تم نے بیان کیا عین بَین چھلاوا۔ اُس کے بھی اگلے دو دانت بندھے ہوئے ہیں سانولی چیچک کے داغ۔ دُبلی۔ ٹھنگنی سب ہو بہو چھلاوا اور رنگت کی زردی جو تم نے کہی تو وہ یہ بڑا انٹا افیم کا کھاتی ہی آپ سے آپ زرد ہوا چاہیے۔ اور دیکھو میں سب باتوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگا کر تم کو ضرور خبر دوں گی۔ آپ معلوم ہو جاے گا کہ آزمودہ یہی چھلاوا تھی یا نہیں اور یہ آج کا ماجرا ہی کیا تھا۔ آزادی یہاں سے ڈولی میں

سوار ہوئی تو سیدھی میکے پہنچی - دیر تو کسی قدر ہو گئی تھی مگر کنجنی گلی کے معاملے کی کسی کو خبر نہیں ہوئی
آزادی نے جانا یا سُبھاگی نے - آزادی کا اپنا ارادہ تو دو چار دن سے زیادہ رہنے کا نہ تھا مگر وہاں
لوگوں نے روک روک لیا بڑی مشکل سے پورے ایک مہینے کے بعد چھوڑا - آزادی پھر اپنے
گھر آئی تو وہ شورش بالکل فرو ہو گئی تھی نہ تو ہمسائے سے کوئی آواز سُن پڑتی تھی اور نہ باہر
کے رقعے پرچے دوڑتے تھے - آزادی کی بھی عجیب کیفیت تھی کہ جن دنوں اس کی طلبگاری کا
ہر طرف سے پکار اٹھا تو اُس پکارے سے گھبراتی تھی اور اب جو لوگ اپنی اپنی جگہ چپ ہو کر بیٹھے
تو چاہتی تھی کہ کسی طرف سے چھیڑ چھاڑ ہو - اتفاق سے اس کے محلے کی حلال خوری سُبھاگی
کی تھی نند اُس کی معرفت سبھاگی کو بُلا کر گلہ کیا کہ تو نے تو اچھی خبر دی سُبھاگی - بیوی جی میں
دو دفعہ تمھارے گھر آ کر پھر پھر گئی تم اپنے میکے میں تھیں اور خبر بھی کیا تھی تم ڈیوڑھی سے
نکلی ہو کر چھلاوا میرے پیچھے کھڑی تھی - معلوم ہوا کہ وہ اُپلوں کی کوٹھڑی میں چھپی ہوئی
میری تمھاری ساری باتیں سنتی تھی تم سوار ہوئیں میں تمھاری ڈولی کی طرف دیکھنے لگی چھلاوا
نے باہر آ پہلے تو کوٹھڑی کی کنڈی جو تم لگا آئی تھیں کھول دی اور پھر میرے سر پر آ کھڑی
ہوئی اور کہنے لگی کہ ہاں اٹ کہہ کیا کہتی تھی - میں - کہتی کیا تھی اب تو یہاں تک چل نکلی ہی
کہ عزت دار اشراف زادیوں کو زبردستی بُلوا بلوا کر بے آبرو کرانا چاہتی ہی - تُف ہی تیری اوقات پر
یہ تو نے کیا حرکت کی اور اگر تھانہ دار کو خبر ہو تو تیری کیسی گت بنائے تو نہیں جانتی کہ وہ مدتوں سے
تیری فکر میں ہی اٹ جا کر کہتی ہوں تو دیکھ تجکو کیسا چمیخہ کرتا ہی - چھلاوا - اگر تو اپنے دھگڑے
تھانہ دار سے ابھی جا کر نہ لگائے تو تیری بھی سات پیڑھی پر لعنت ہی اور دیکھوں تو وہ ایسا تیسا
میرا کیا کرتا ہی اگر وردی نہ اُتروالوں تو چھلاوا نام نہ رکھواؤں - آئی بڑی اشراف زادیوں کی خیرخواہ
میری بلا کو کیا غرض پڑی ہی اشراف زادیاں مجکو گھر سے بُلا بُلا کر سیکڑوں دفعہ منتیں کرتی ہیں
تو میں ایک دفعہ اُن کو آنے دیتی ہوں - ہی آج کوئی ایسا کہ کسی گھر بیٹھی کو زبردستی اپنے یہاں
بلائے - چھلاوا یہ باتیں کر رہی تھی کہ اتنے میں ایک جوان گبھرو سا مردوا کوٹھڑی میں سے
باہر آیا کچھ بولا چالا نہیں - مجھے ایک اُنگلی کے اشارے سے کہا کہ باہر جا - میں تو چھلاوا سے
لڑتی مگر بے تمھارا نام لئے بات نہیں بن آئی تھی - اور اُدھر وہ مردوا کوٹھڑی میں سے نکل آیا تھا

بیوی جی میں تو دم دبا کر بھاگی - بڑی دیر کے بعد وہ مُرڈوا گلی کے پھاٹک میں سے ہو کر نکلا تو میں اُس کے پیچھے لگی لگی چلی گئی معلوم ہوا کہ یہاں جان نثار خاں کے چھتّے میں رہتا ہی اور مشتاق نام ہی اور تمھارے یہاں اس کا بہت آنا جانا رہتا تھا - آزادی - کیوں سُبھاگی اس چھلاوے نے مجکو اپنے گھر کیوں بُلوایا ہوگا - سُبھاگی - بیوی جی کسی کے دل کی کیا خبر ہی لیکن اُس کے اپنے رہنے کا مکان اتنا بڑا جہاز کا جہاز پڑا ہی کہ سیکڑوں آدمی اُس میں چھپ جائیں اور خبر نہ ہو - اور جس مکان میں تم گئی تھیں ہمیشہ باہر سے اُس کا تالا لگا رہتا ہی اس میں تو اُس نے کبھی کسی کو بلایا چلایا نہیں اس سے معلوم ہوتا ہی کہ تم سے او مشتاق سے کھڑے کھڑے دو دو باتیں کرا دینے کے سوائے اَور کچھ مقصد نہ تھا - پھر اگر تم کہو تو میں چھلاوے سے لگاوٹ کر کے پوچھوں میری اُس کی لڑائی پر تو جاؤ نہیں ہم لڑ بھی لیتے ہیں اور مل بھی جاتے ہیں - آزادی - سُبھاگی کیا بتاؤں کچھ عقل نہیں کام کرتی تو پھر کبھی آئے گی تو کہوں گی - سُبھاگی تمھارے دل پر جو کچھ گزر رہی ہی میں سب سمجھتی ہوں تم کہو یا نہ کہو اور تم آج کی آج اور آج کی برس دن پیچھے بلکہ ساری عمر اسی دُھکڑ پکڑ میں رہوگی - خیر مجھے تو تم آدھی رات کو بھی یاد کروگی تو لونڈی کو عذر ہوگا اور مجھے نہیں - کوئی آتا ہی پیروں سے اور میں آؤں سر سے آنکھوں سے لیکن اگر میرا کہا مانو تو جس سے تمھاری طبیعت ٹھکتی ہو کسی نہ کسی کو اپنا اصلاح کار بناؤ تم اُس سے اپنے دل کا بھید کہو وہ اس کا کوئی رستہ نکالے - آزادی - کسی بات میں صلاح لینی ہوگی تو تجھ سے بہتر صلاح کار اَور کون ہوگا تو میرے میکے کی مہترانی میرے ذرا ذرا حال سے واقف ہی کیا اتنی بات نہیں سمجھتی کہ سب سے پردہ ہو سکتا ہی اور نہیں ہو سکتا تو تم لوگوں سے اور نہیں معلوم خدا کو کیا منظور ہی کہ بیٹھے بٹھائے ایک معاملہ پیش آگیا جس کی وجہ سے تو میری خواہی نخواہی راز دار ہوئی - لیکن دیکھ سُبھاگی مجھے بار بار کہنا چاہیئے تو نہیں مگر کیا کروں دل نہیں صبر کرتا اتنی احتیاط کرنا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو - سُبھاگی - بیوی جی میں تم کو زبان دے چکی ہوں رتی برابر فرق نکلے تو تمھاری جوتی اور میری ناک - آزادی نے سُبھاگی کو تو رخصت کر دیا اور پھر سوفے سے سنجنی گلی کے معاملہ کو بیٹھی سوچا کی - اوّل اوّل تو آزادی کو بڑا ہی طیش آیا کہ یہ کون بدذات پاجی تھا جس نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا اس نے کیا سمجھ کر میری ڈولی بدون میری اجازت کے

اجنبی جگہ میں اُتروائی بدنامی کا خوف نہ ہوتا تو اس آب رُو باختہ بدمعاش کو ایسا ٹھیک بنواتی
کہ ساری عمر کو یاد کرتا اور افسوس چھلاوا میرے ہاتھ نہ لگی ہیں اس کو مارتی تو کیا وہ مرنے کے لئے
آپ ہی بہانہ ڈھونڈتی پڑی پھرتی ہی مگر مردار کی چُٹیا تو ضرور کاٹ لیتی اور تھوک کر اُس سے
چٹواتی سو الگ کہ پھر اس کو کسی اشراف زادی پر ہاتھ ڈالنے کی جراۃ نہ ہوتی۔ اس قدر جھوٹ۔
اتنا فریب اور یہ حوصلہ۔ جتنی دیر آزادی کنجنی گلی والے مکان کا خیال کرتی اس پر ایک نہ گت
آتی اور رہ جاتی۔ وہ اپنے دل میں کہتی تھی کہ اگر میں نے کوٹھڑی کی کنڈی باہر سے نہ چڑھادی
ہوتی اور کوئی مُردوا اندر سے نکل آتا تو میں کیا کرتی میرے پاس تو کوئی حربہ بھی نہ تھا اُس گھبراہٹ
میں مجکو اُپلوں کی کوٹھڑی کا ذرا دھیان نہ آیا اور چھلاوا مرے میں میرے پاس کے پاس چھپی
کھڑی رہی۔ ضرور وہ میرے ڈر کے مارے نہیں نکلی جانتی تھی نہ کہ مچھر کی طرح مسل کر دھر دوں گی
لیکن یہ بھی خدا ہی نے اُس کے دل میں ڈالی ورنہ اپنا گھر اپنا محلہ وہ اور کچھ نہ کرتی صرف غل مچادیتی
اور اس کے حمایتی پاس کے مکانوں سے ہو کر کود آتے یا باہر کے دروازے کی چول اُتار لیتے تو
بڑی قباحت کی بات تھی۔ غرض خدا ہی نے اپنی قدرۃ سے بچالیا ورنہ اس مردار چھلاوا نے میری
آبرو لینے میں تو کسی طرح کی کمی کی نہیں۔ لیکن سبھاگی تو اُس کی طرف ایسا شبہہ نہیں کرتی اور
سچ بھی تو ہی اگر اُس کو ایسا ہی منظور ہوتا تو اپنے مکان میں اُترواتی جہاں میری کوئی تدبیر بھی
پیش رفت نہ جاتی۔ مگر اُس نے مجھسے کہا کیوں نہیں۔ شاید میرے مُونھ سے اس طرح کی کوئی بات
نکلی جس کو وہ اس پہلو پر ڈھال لے گئی ہو۔ سو بے شک جب اُس نے خواجہ مشتاق کا نام لیا
اتنا میں نے ضرور کہا تھا کہ میں اس کو اپنی جگہ سوچ لوں پھر تم سے صلاح کروں۔ اسی جگہ تو پانی
مرتا ہی مجکو اُس سے بگڑ کر صاف دو ٹوک بات کہہ دینی تھی کہ خبردار جو آیندہ کسی کا مذکور کیا ہوگا۔
ایک گشتی سے یہ کہنا کہ اپنی جگہ سوچ لوں پھر تم سے صلاح کروں دبی زبان سے اقرار کر لینا ہی۔
اور پھر بات صاف یہ ہی کہ میری رائے دوسرے نکاح کی قرار پا چکی ہی اور دیکھ بھال کر کرنے
کی تو کچھ آج سے نہیں شروع سے میری مرضی ہی اور چھلاوا پیغام بھی لائی تو کسی اجنبی کا
نہیں لائی خواجہ مشتاق نے کچھ نہیں تو بھی سیکڑوں بار مجھے دیکھا ہوگا تو اگر چھلاوا نے ہماری
دونوں کی دو دو باتیں کرا دینے کی یہ صورۃ نکالی تو چنداں بے جا نہیں کیا بلکہ ایک اعتبار سے تو اُس نے

شاباش اور انعام کا کام کیا اِس کے سوائے وہ اَور کرتی بھی کیا۔ لیکن کیا میں خواجہ مشتاق
کے سامنے ہوجاتی رو در رو اُن سے باتیں کرتی۔ نہیں نہیں۔ کوٹھڑی کے کواڑ بھڑے رہتے۔
خواجہ مشتاق اندر اور میں باہر مجکو جو کچھ کہنا ہوتا چھلاوا سے کہلا دیتی میری جلدی نے سارا کام
خراب کیا پھر تو ایسا موقع کبھی ہاتھ آنا نہیں۔ بھلا اگر چھلاوا کو سبھاگی کے ہاتوں پھر بلواؤں
چلی تو آئے گی اِن لوگوں کا پیشہ یہی ٹھیرا نہ ان کو جھوٹ بولنے کی شرم نہ دھتکارے جانے کی غیرۃ
مگر مجکو ایسی ضرورۃ ہی کیا پڑی ہی کہ کٹنیوں اور حلال خوریوں کی خوشامد کرتی پھروں۔ کرنا ٹھیرا
تو پھر ڈرنا کیا۔ جھجک توکروں موقوف اور اپنے میل جول والوں میں سے زیادہ نہیں تو
دو چار پر اپنا منشاء ظاہر کردوں تو عمدگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ میرا مدعا حاصل ہوسکتا ہی۔
لیکن مجکو اسی اُدھیڑ بُن میں اتنے برس گزر گئے اور کوئی بات یکسو نہ ہوئی۔ سبھاگی سچ کہتی تھی
کہ تم ساری عمر اسی دھکڑ پکڑ میں رہوگی۔ میں بھی اِدھر یا اُدھر اب اس کا فیصلہ ہی کئے دیتی
ہوں۔ میں نے کچھ دھیان نہیں کیا کہ اس طرح کی دوسری عورتیں کیا سوچا کرتی ہوں گی۔ یا تو
اُن کو میرے سے خیالات ہی نہیں آتے تو وہ سب سے بھلی اور معلوم ہو تو میں بھی ایسی ہی
کوئی تدبیر کروں کہ ان فکروں سے میرا جی بچے۔ یا دوسری عورتوں کو میری طرح کے خیالات
آتے ہیں تو کیوں کر زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان خیالات نے تو مجکو ایسا بے چین کر رکھا ہی کہ جس کا
حد و پایاں نہیں۔ بہر کیف یہ تحقیقات فائدے سے خالی نہیں میرے مطلب کی کوئی نہ کوئی بات
ضرور نکلے گی۔ بیوؤں کی کیا کمی تھی ذرا کی ذرا خیال کیا تو بیسیوں رانڈیں سمجھ میں آگئیں۔
اس کے بعد سے آزادی نے یہ شیوہ اختیار کیا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیوہ عورتوں سے ملتی اور
اُن سے اختلاط پیدا کرکے اُن کے بطون دریافت کرتی۔ کئی برس تک اُس کو اسی کی دُھن رہی
آخر مرتے دم اُس نے بیان کیا کہ یوں تو سیکڑوں رانڈوں سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر دو اوپر پچاس
عورتوں کی نسبت میں کہہ سکتی ہوں کہ ان کا کوئی حال مجھسے مخفی نہیں رہا ✦

اٹھارویں فصل آزادی کا مرض الموت اور اُس کے آخری خیالات

یہ تحقیقات اس طرح کی دل چسپ تھی کہ اگر تن درستی اجازۃ دیتی تو آزادی جیتے جی اسی میں

مشغول رہتی مگر وہ کوارپیتے ہیں جو کوٹھے پر سے گری تھی اور اُس کا کولھا اُتر گیا تھا اب تیرہ چودہ برس بعد اُسی کولھے میں کبھی کبھی ایک چبک سی مارنے لگی۔ کولھے کی پرانی چوٹ کی طرف تو کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا ترڑیڑے اور بھپارے اور پچھنے اور جونکیں اور خالی بھری سینگیاں اور بارے اور مالش جس نے جو بتایا سب کچھ کر دیکھا اور وہی کہ جگہ سے جنبش نہیں کرتا۔ حکیموں نے جلابوں پر جلاب دیئے درد کو اُلٹی ترقی ہوتی گئی۔ عورۃ ذات۔ پردے کی جگہ۔ حکیموں اور جراحوں کے علاج بھی زبانی بیان پر ہوتے رہے۔ اسی میں کئی برس گھل گئے اور بانو کا یہ حال ہوا کہ گویا سارا جسم سمٹ کر ٹانگ میں آ رہا تھا۔ درد اور درد کے ساتھ سوجن۔ اب آخر آخر میں تو یہ کیفیۃ ہو گئی تھی کہ چھونا اور ہاتھ لگانا کیسا اس کی بھی برداشت نہ تھی کہ کوئی ٹانگ کی طرف مونہہ کر کے سانس لے یہاں تک نوبۃ پہنچ چکی تو وہ پادری کی میم صاحب یاد آئیں جنھوں نے اُترا ہوا کولھا چڑھایا تھا۔ وہ میم صاحب تو ولایۃ جا چکی تھیں مگر اُن ہی لوگوں میں کوئی اَور عورۃ جراحی کا کام کرتی تھی اس نے دیکھتے کے ساتھ کہا کہ اندر پھوڑا ہے چیرا جائے گا۔ کئی دن اسی پس و پیش میں گزرے کہ چیرا لگوائیں یا نہ لگوائیں۔ اور واقع میں پھوڑا ہی جیسا کہ میم ڈاکٹر کہتی ہے یا کوئی سوداوی مادہ ہے اور اُس میں سمیّۃ جیسا کہ حکیم لوگ تشخیص کرتے ہیں۔ بارے مجبور ہو کر اور عاجز آ کر نشتر دلوایا۔ تلی ہوئی چھٹانک کم ڈیڑھ سیر ریم نکلی جس کو دیکھ کر سب کے سب دھک سے رہ گئے۔ برسوں کا زخم۔ باہر کی کھال سخت۔ اندر ہی اندر کئی ناسور پڑ گئے تھے۔ نشتر سے ورم بھی گویا کہ جاتا رہا۔ کلفن میں بھی بہت کمی ہوئی۔ اور وہ جو مہینوں سے کبھی آدھ گھنٹے کے لئے بھی برابر آنکھ نہیں لگتی تھی اب متصل تین تین چار چار گھنٹے نیند بھی آنے لگی۔ طبیعۃ غذا کی طرف رغبۃ کرتی تھی۔ لیکن زخموں کے دھونے اور صاف کرنے اور بتی چڑھانے کی جو تکلیف تھی سو تھی۔ روگ تو ایسا ہی پیچھے لگا تھا کہ اگر دیسی جراح اور ہندوستانی طبیب علاج کرتے رہتے تو آزادی کبھی کی ہلاک ہو گئی ہوتی۔ بارے میم ڈاکٹر کی تدبیر سے کہیں نو دس مہینے میں جا کر سارے زخم مندمل ہوئے۔ توانائی بھی عود کر آئی اور آزادی اچھی خاصی طرح چلنے پھرنے لگی۔ اس پر بھی ایک چور رہ گیا کہ دوبارہ نشتر کے بدون اس کا درست ہونا متعذر تھا۔ میم ڈاکٹر منتظر تھی کہ آزادی ذرا پنپ لے اور اس میں طاقۃ آ جائے تو دوسرا نشتر دوں۔

مگر آزادی اور اُس کے بیمار دار پہلے ہی نشتر سے ایسے سہم سے گئے تھے کہ اُس کو ہاتھ ہی نہ لگانے دیا۔ ہر چند میم ڈاکٹر نے بہتیرا سمجھایا کہ گو زخم ہلکا اور برائے نام ہی اور ممکن ہی کہ خود بخود بھر جائے اور یہ جو کبھی کبھی پٹی پر دھبہ سا دیتا ہی شاید اتنا بھی نہ رہے مگر میں مطمئن نہیں ہوں اور میری رائے میں نشتر کا دینا ضرور ہی۔ اور میں نے زخم کی کیفیت بیان کرکے دوسرے ڈاکٹروں سے بھی رائے لی ہی۔ وہ بھی نشتر کی صلاح دیتے ہیں۔ زخم کا موقع ایسا خراب ہی کہ اگر اندر کو مُونہ کیا تو پھر کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکے گی۔ اس سے میں کہتی ہوں کہ ذرا سی کسر کا باقی رکھنا بھی ٹھیک نہیں اور ابھی گہرا نشتر دینے کی بھی ضرورۃ نہیں ہوگی۔ میں امید کرتی ہوں کہ دو ہفتے میں طبیعۃ بالکل صاف ہو جائے گی۔ لیکن ان لوگوں نے عارضی تن درستی پر مغرور ہوکر ڈاکٹر بلکہ ڈاکٹروں کی رائے کی کچھ پروا نہ کی اور وہ چور اندر ہی اندر چُپکے چُپکے بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ اس علالۃ میں بھی جب آزادی کی طبیعۃ ذرا بھی حاضر ہوتی وہ اپنی بیوگی پر افسوس کرتی کچھ اس وجہ سے نہیں کہ اس کی خدمۃ اور خبر گیری میں کسی طرح کی کمی ہوتی تھی سو خدمتیں اور ہزار خبر گیریاں ایک طرف اور میم ڈاکٹر کا علاج ایک طرف مگر دو چار مرتبے اس کو جو مولوی صاحب کے سامنے تپ وغیرہ معمولی علالتیں ہوئی تھیں اس کو یاد آتی تھی ان کی ہمدردی اور دل جوئی اور وہ اب کہاں دھری تھی۔ رہ رہ کر اس کو خیال آتا تھا کہ تعلق زنا شوئی بھی عجیب طرح کا تعلق ہی کہ خوشی تو خوشی رنج و مصیبۃ کو بھی بامزہ کر دیتا ہی۔ علالۃ کی وجہ سے ایک اور تبدل بھی آزادی کے خیالات میں واقع ہوا۔ اس کی علالۃ سخت تو تھی ہی ہر چند اس کے مُونہ پر تسلی اور تشفی کے سوا کوئی کچھ نہیں کہتا تھا مگر یہ لوگوں کے بشرے سے پہچانتی تھی کہ ان کو میری طرف سے یاس ہی۔ میم ڈاکٹر کا یہ معمول تھا کہ آزادی کی چارپائی کے پاس آکر بیٹھی اور زخم کو ہاتھ لگانے سے پہلے آنکھیں بند کرکے دل ہی دل میں اس نے آزادی کی تن درستی کے لئے دعا مانگی۔ پھر زخم کی شست و شو اور بندش کے بعد چند منٹ کے لئے آنکھیں میچیں اور رخصت ہوئی۔ سمجھ تو سب گئے تھے مگر آخر کسی نے مونہ پھوڑ کر پوچھا پر پوچھا تو میم نے کہا کہ ان کے حق میں دعا کیا کرتی ہوں کہ اے خداوند تو اپنے فضل و کرم سے اس بندی کو شفا دے اس کی تکلیف کو دور کر۔ اور

میری مدد فرما کہ تشخیصِ مرض اور علاج میں غلطی نہ کروں - غرض کچھ تو اوپر والوں کا ہراس اور
سب سے بڑھ کر اندر سے اپنے دل کی گواہی آزادی بھی اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اول تو میں اس
بیماری سے جاں بر ہوتی نظر نہیں آتی اور شاید بچ بھی گئی تو اپاہج ہو کر جی تو کیا خاک جی اس سے
تو کہیں خدا مجھکو اٹھالے تو میں اُس کی جناب میں شکر کا سجدہ کروں - مرنے کے خیال کے ساتھ
جو آزادی نے اپنے دل ہی دل میں سوال و جواب کئے بڑے ہی دلچسپ تھے - سوال - کیا واقع
میں اب کوئی دن کو میں مروں گی؟ جواب - سوائے خدا کے کسی کو خبر نہیں - رہی بیماری یہ تو
زخم ہی میں نے تو بے ٹانگ کے آدمی جیتے دیکھے ہیں - وہ ایک بڑھیا فقیرنی بھیک مانگنے آیا کرتی
ہی خدا جانے کیا ہوا تھا کہ ران کی جڑ سے اُس کی ٹانگ کاٹی گئی - بیساکھی پر سارے شہر کا چکر
لگا آتی ہی - اور ایسی مثالیں بھی کثرۃ سے دیکھنے میں آئیں کہ ذرا سے دُکھ میں آدمی ہلاک
ہو ہو گئے - غرض مرجانے کا بھی تعجب نہیں اور بچ جانے کا بھی تعجب نہیں - اور اس سوال
سے فائدہ ہی کیا ہی آخر تو ایک دن مرنا ہی زندگانی کی مثال گھڑی کی سی ہی کہ کسی کی ۲۴ گھنٹے کی
کوک ہی کسی کی ایک ہفتے کی کسی کی ایک مہینے کی - جس وقت جس کی کوک ہو چکی بند + س -
جتنی تکلیف مجھکو پانو کے زخم سے پہونچ چکی ہی کیا مرنے کے لئے مجھکو اُس سے زیادہ تکلیف کا
متوقع رہنا چاہئے؟ - ج - یہ بات بھی سوائے خدا کے کوئی نہیں جان سکتا - بعض کو دیکھا کہ
چار چار پانچ پانچ دن سکرات میں مبتلا رہ کر بڑی مشکل سے جان دیتے ہیں اور بعض ہیں کہ
باتیں کرتے کرتے رخصت ہو جاتے ہیں - پہلے میرا یہ خیال تھا کہ نیک بندوں کی جان آسانی
سے نکلتی ہوگی - پھر حدیث میں دیکھا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی تین دن جان کنی
کی سخت ایذا رہی کہ آپ جلد جلد کروٹیں بدلتے پانی میں ہاتھ بھگو بھگو کر بار بار مونہ پر پھیرتے تھے
اور حضرۃ عائشہ فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے پیغمبر خدا صلعم کی جان کنی دیکھی ہی میں کسی کی
جان کنی کو جان کنی ہی نہیں سمجھتی - اور بعض بزرگوں کو تکلیف سے مرتے دیکھا اور لوگوں کو یہ
کہتے سُنا کہ کیسے خوش نصیب بندے تھے کہ دنیا میں جو گناہ کئے تھے اُن کا کفارہ یہیں جان کنی
میں بھگت گئے - علاوہ اس کے معصوم بچوں کی جان اکثر بڑی سختی سے نکلتی ہی - اکثر
لوگوں کے دماغ مرتے وقت معطل ہو جاتے ہیں تو ان کو سکرات کی ایذا محسوس نہیں ہوتی جیسی

تم کو گُولما چڑھانے کی اور نشتر کی۔ بہر کیف آسانی اور سختی موقوف ہی روح کے تعلق پر۔
اور اس کا حال سوائے خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔ اور پھر میں کہتی ہوں کہ یہ سوال بھی فضول
ہی۔ سرے سے مرنا ہی انسان کے اختیار کا نہیں تو آسانی سے مرنا اُس کے بس کا کیوں ہونے لگا
ہی۔ اس سے تو نہ پیدا ہوئے ہوتے تو بہتر تھا۔ خدا نے بے مانگے تو جان دی اور پھر اس کو
لیا تو اس قدر تکلیف پونہچا کر؟۔ ج۔ توبہ توبہ یہ تو کفر کے سے خیالات ہیں۔ اگر کہیں آخر
وقت اس طرح کے خیالات میں آدمی کی جان نکل گئی تو ابدالآباد کے لئے راندہ گیا۔ یہ تو خدا
کی قدرة میں دخل دینا ٹھیرا کہ یہ کیوں کیا اور یوں کیوں کیا۔ دنیا جہان کا اتنا بڑا کارخانہ کون
جان سکتا ہی کہ کس مصلحة سے جاری ہی ایک روے زمین پر ہزاروں لاکھوں قسم کی مخلوقات
ہی ان میں سے ایک مخلوق انسان بھی ہی جس کی پیدایش اور زندگی اور موت سب کے قاعدے
بندھے پڑے ہیں۔ میں کبھی بکری یا بلی یا اور بے زبان مخلوقات کو دیکھ کر اپنے دل میں کہا کرتی
ہوں الٰہی ان جسموں میں کس طرح کی روحیں بند ہیں اور یہ روحیں کس خیال میں رہتی ہیں۔
ایک مخلوق درخت ہیں جن کی قسموں کا شمار نہیں۔ ان کے بھی بعض حالات انسان سے ملتے
ہوئے ہیں۔ پیدا ہوے۔ بڑھے۔ پھلے پھولے۔ اور آخر کو گل سڑ کر خاک ہوگئے۔ جس طرح بعض
پھل پکنے نہیں پاتے اور تلف ہو جاتے ہیں اسی طرح آدمیوں کے بچے کوئی کوئی صغر سن میں
ضائع ہو جاتے ہیں۔ غرض ایک عجیب چکر سا لگا ہی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور یوں آدمی
بیہودہ خیالات کرنے پر آئے تو بہتیرے لایعنی اشتباہات پیدا کر سکتا ہی۔ مثلاً بچے دینے کے لئے
عورة کی کیا تخصیص تھی۔ یا کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ عورة نے چھینک لی اور ناک سے
اولاد جھڑ پڑی۔ یا عورة کھانسی اور مونہہ سے بیٹے بیٹیاں اُگل دیں۔ یا جس طرح اکیلے درخت
میں پھل لگتا ہی کیوں نہیں اکیلی عورة سے اولاد ہوتی۔ اور کیا حضرة مریم کے نہیں ہوئی؟
لیکن یہ سارے فساد میں اُس ذراسی عقل کے جو انسان کو دی گئی ہی۔ جب عقل میں فتور
ہوتا ہی تو ایسی ہی ایسی شرارتیں سوجھتی ہیں۔ انسان اسی ذری عقل کے گھمنڈ میں آکر
اپنے تئیں خیال کرتا ہی کہ میں بھی کچھ ہوں۔ کچھ تو ہی مگر بھنگے سے زیادہ ذلیل۔ مچھر سے
بڑھ کر حقیر۔ چیونٹی سے سوا ضعیف۔ اور ذری سے ذری دُکھ اور چھوٹی چھوٹی سی تکلیف سے

اُس کی ذلت اور حقارت اور بے حقیقتی ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ مگر وہ ہمیا ایسا ہی جیسا کہتے ہیں ع
چکنے گھڑے پر بوند پڑی اور پھسل پڑی + دکھ دفع ہوا تکلیف ہٹی اور وہ لگا پھر اپنی شیخی
بگھارنے۔ اسی مضمون کو خدائے تعالےٰ نے قرآن پاک میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے چنانچہ ایک مقام
پر ہے۔ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ
يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۔ اور جب آدمی کو کوئی ایذا پہنچتی ہے تو کروٹ کے بل ہے تو کروٹ کے بل اور بیٹھا
ہے تو بیٹھا اور کھڑا ہے تو کھڑا ہم کو اپنی مدد کے لئے بلاتا ہے پس جب ہم اُس کی ایذا کو دور کر دیتے
ہیں تو چلتا پھرتا نظر آتا ہے کہ گویا اُس ایذا کے لئے اُس نے ہم کو بلایا ہی نہیں۔ دکھ درد نہ بھی ہو
تاہم انسان پرلے درجے کا عاجز اور کم زور مخلوق ہے۔ چند منٹ کے لئے بھی اس کو سانس لینے
کے لئے ہوا نہ ملے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ بھوک پیاس کی برداشت کا یہ حال ہے کہ رمضان
کے مہینے میں جو لوگ سچ مچ کا روزہ رکھتے ہیں باوجودے کہ سحر تک تنو تشکم کھانے اور پانی سے
ٹھونس ٹھونس کر بھرے چلے جاتے ہیں مگر شام تک اچھے ہٹے کٹے آدمی کی چولیں ڈھیلی۔
عقلِ معاش نے پردہ ڈھک رکھا ہے ورنہ آدمی کی بھی کچھ بنیاد ہے۔ ذری سی سردی پڑی کانپنے لگا
گرمی ہوئی تو لا اُٹھا۔ صانع قدرت نے دوسرے جانوروں کو کیسے کیسے سامان عطا فرمائے ہیں۔
کسی کے سینگ ہیں۔ کسی کے پنجے۔ کسی کے دانت۔ کسی کی چونچ۔ کسی کو تیزی رفتار۔
کسی کو پرواز۔ سختی موسم سے بچنے کے لئے پَر۔ یا اُون۔ اور آدمی سب سے محروم۔ کل
سے بے نصیب۔ وہ جسمانی ریاضت اور ورزش سے دودھ پی پی کر اور گھی کھا کھا کر اپنی قوت
اور توانائی کو بڑھاتا مگر نہ بھینسے جتنا بوجھ اُٹھا سکتا۔ نہ اونٹ کی برابر منزلیں طے کر سکتا۔
نہ گھوڑے کی طرح بھاگ سکتا۔ نہ بیل کی مانند لاد کھینچ سکتا۔ وہ پھکیتی کے کتنے ہی داؤ کیوں
نہ جانتا ہو مگر ایک مکھی اس کے بس کی نہیں۔ ایک پسّو اس کے قابو کا نہیں۔ اس قدر
عاجز اور مجبور اور اس پر تکبر و غرور۔ لیکن اس کی ساری شیخی کرکری کرتی ہے موت۔ کہ وہ
نہ دعا کو سنتی۔ نہ دوا کو مانتی۔ نہ گڑگڑانے پر رحم کرتی۔ نہ کسی کی بے کسی پر ترس کھاتی۔ نہ قوت
سے ڈرتی۔ نہ حکمت سے دھمکتی۔ نہ تدبیر سے رُکتی نہ ٹالے سے ٹلتی۔ بس۔ اے ہی مرے پیچھے
کیا ہو گا ہے ج۔ ہو گا کیا جو اَوروں کا حال وہ تمھارا حال۔ آج مرے کل دوسرا دن۔

یعنی جس کی آئی وہ مر گیا۔ اور پھر دنیا کا کارخانہ بدستور چلنے لگا۔ ص

دنیا کے جو مزے ہیں ہرگز وہ کم نہ ہوں گے   چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

اِدھر جان نکلی اور اُدھر لوگوں نے پہلی منزل تک پہنچانے کے لئے جلدی مچائی شروع کی۔ گاڑ داب کے گھر آئے کسی قدر روئے پیٹے مرنے والے کو نہیں بلکہ اپنے فائدوں کو اپنی اغراض کو۔ چند روز بعد سب بمعمول بسر گئے اللہ اللہ خیر صلاح۔ س۔ نہیں میں یہ پوچھتی ہوں کہ مجکو مرے پیچھے کیا پیش آئے گی؟ ج۔ بات یہ ہے کہ جس چیز کو کسی مصلحت سے خدا چھپائے بندے کی کیا مجال ہے کہ اُس میں اپنی عقل دوڑائے۔ ظاہر حال تو سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ انسان کا جسم گل سڑکر خاک ہو جاتا ہے۔ لیکن خوب سوچو اور غور کرو تو یہ بات کچھ دل کو لگتی سی نہیں کہ بس مرنے پر خاتمہ ہو گیا۔ سبب پوچھو تو کچھ بیان کرنے میں نہیں آتا مگر جس کو دیکھو اپنے دل میں اس کا ضرور یقین رکھتا ہے کہ چاہے میرا بدن مٹی ہو جائے یا جلا کر راکھ کر ڈالیں یا جانور نوچ نوچ کر کھا جائیں پھر بھی یہ تو خبر نہیں کہ میں کیا ہوں گا اور کیسا ہوں گا اور کہاں ہوں گا مگر ہوں گا ضرور ہوں گا ضرور۔ یہ ایسا خیال ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو دنیا کا تمام انتظام درہم برہم ہو جائے بے شک یہ خیال ہر وقت پیش نظر نہیں رہتا اور سب کو یکساں بھی نہیں ہوتا۔ مگر آدمی کے تمام افعال حرکات سکنات کا دار و مدار اسی خیال پر ہے۔ آج آدمی اس عقیدے کے ہو جائیں کہ مرے اور پھر کچھ نہیں تو دنیا ایک لمحے کے لئے نہیں چل سکتی۔ ایسے لوگوں میں نہ امن ہو نہ عافیت ہو نہ نیکی بدی کا امتیاز ہو نہ بُرے بھلے کا تفرقہ۔ پھر وہ دنیا ہی کیا خاک ہو یہ سچ ہے کہ بعض لوگ انکار کر بیٹھتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا ہے اور بس۔ اور مرے پیچھے کچھ ہونا ہوانا نہیں۔ سو غیب کی بات کو جس کا راز اس زندگی میں کسی طرح کھل نہیں سکتا جھٹلا دینا کیا مشکل ہے۔ لیکن یہ اُن کی ہٹ دھرمی اور کٹھ حجتی ہے۔ ان کو جیسے قیامت کے ہونے کی خبر نہیں ویسے ہی اُس کے نہ ہونے کی بھی خبر نہیں۔ جو کچھ مُونھ میں آیا بک دیا۔ اور اگر واقع میں ان کو پورے طور پر یقین ہے کہ مرے پیچھے کچھ ہونا ہوانا نہیں تو کیوں نہیں سارے جہان کی غلط فہمی کی اصلاح کرتے۔ ہم کو اگر سمجھا دیں ایسا سمجھانا کہ دل سے یہ خدشہ دور ہو جائے تو ہم ان کا بڑا ہی احسان مانیں۔ لیکن دوسرے کو کیا سمجھا سکیں گے جب ان کا اپنا یہ حال ہے کہ

کہ گفتار سے انکار۔ اور کردار سے اقرار۔ کہ اگر حقیقت میں ان کو قیامت کا خوف نہ ہوتا تو وہ بالکل دوسری
ہی طرح کے آدمی ہوتے اور اپنے سوائے روے زمین پر کسی دوسرے کو بسنے نہ دیتے۔ جو خیال خدا
نے عام لوگوں کے دلوں میں ڈالا ہے اور جس کے مطابق اُن کا عمل درآمد ہے بعینہٖ اسی کی تعلیم
اور تاکید مذہب بھی کرتا ہے۔ کہ مرے بعد انسان کو ایک طرح کی ہستی ہوگی جس کو وہ اس زندگی
میں بخوبی سمجھ نہیں سکتا۔ اور اس ہستی کی بہتری اور خرابی موقوف ہوگی اُن خیالات اور
معتقدات پر جو وہ اس زندگی میں رکھتا تھا اور نیز اُن اعمال اور افعال پر جو اُس نے اس
زندگی میں کئے۔ اور ان دونوں زندگیوں میں اس طرح کا تعلق ہونا کچھ بھی خلاف قیاس
نہیں جب کہ ہم دیکھتے ہیں اثر ماں باپ کا اولاد میں۔ بیج کا پھل میں۔ خود انسان کی ابتدائی
حالتوں کا اُس کی مابعد کی حالتوں میں۔ تس۔ میرا کیا حال ہوگا۔ اس رو سے میری اگلی زندگی
تو بدتر سے بدتر ہونی چاہیئے۔ جہاں تک خیال کرتی ہوں میں نے تو اپنی تن پروری کے سوائے کوئی
نیکی کا کام کیا کرایا نہیں۔ اگر میرا پیدا ہونا صرف تن پروری کے لئے تھا + کہ کھاؤں۔ پیوں۔
پہنوں۔ سو رہوں تو مجھ میں اور جانوروں میں کچھ بھی فرق نہیں۔ پھر مجکو اتنی ساری عقل
کیوں دی ہوگی۔ اور خیر شاید عقل اس غرض سے دی ہو کہ میں جانوروں سے بہتر حالت
میں رہ سکوں تو بھلائی برائی کا سمجھانا کیا ضرور تھا کہ یہ سمجھ میرے دل میں چٹکیاں لے
اور مجکو ایذا دے۔ ہَے ہَے یہ سامان تو میری ہمیشہ ہمیشہ کی ہلاکت اور تباہی اور بربادی
کے ہیں۔ اب میں کیا کروں۔ مجکو کیا خبر تھی کہ میں اس قدر جلد مروں گی۔ ج۔ بس یہی
نہ کہنا کہ مجکو کیا خبر تھی۔ کیوں کیا تو نے اپنے سے چھوٹی عمر والوں کو مرتے نہیں سنا اور
نہیں دیکھا۔ کیا تجکو معلوم نہ تھا کہ تن درست کو بیمار ہوتے اور بیمار کو مرتے دیر نہیں لگتی۔
کیا تو نہیں جانتی تھی کہ زندگانی کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ کیا ایسی مثالیں سیکڑوں ہزاروں تیرے
روبرو پیش نہیں آئیں۔ تس۔ خیر تو میں نے نیکی نہیں کی تو ایسی کوئی برائی بھی نہیں کی
دنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہیں جو اَوروں کا حال وہ میرا حال۔ ج۔ یہی بات ہے تو پھر ڈرنا
کاہے کی۔ اگر آدمی کو پورا پورا اطمینان ہو کہ اُس زندگی میں ایذا نہیں رنج نہیں [illegible]
موت سے ڈرے تو احمق۔ بزدل۔ ڈرپوک۔ یہی نہ کہ دو چار دن [illegible]

سبھی کو ہوتی ہی۔ اور اُس سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ اور کیسی ہی تکلیف ہو جب ہو چکی
گئی گزری ہوئی۔ پھر دنیاوی رنج و راحة بھی کچھ رنج و راحة ہیں۔ یہ عارضی وہ چندروزہ ۔
اصلی رنج و راحة تو وہاں کے رنج و راحة ہیں جن کو کبھی انقطاع نہیں جن کی کہیں انتہا نہیں
بڑی مشکل تو یہی ہی کہ جیتے جی کوئی فرد بشر اُس زندگی کی طرف سے مطمئن ہو نہیں سکتا
یہاں تک کہ پیغمبر صاحب جن کے اگلے پچھلے سب گناہ خدا نے بخش دئے تھے جیسا کہ سورۂ
اِنَّا فَتَحْنَا میں ہی لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔ وہ بھی تو فرماتے تھے۔ مَا أَدْرِي
مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ۔ مجھکو معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور کیا تم کو پیش
آئے گی۔ اور یہی سبب تھا کہ آں حضرۃ عبادۃ الٰہی میں بڑی مشقۃ اُٹھاتے اور رات دن خدا سے
معافی مانگتے رہتے تھے۔ قوم یہود میں خدا نے دین اور دنیا دونوں طرح کی سلطنتیں دی تھیں
یعنی اُن میں بعض پیغمبر تھے بعض بادشاہ۔ اُن کی نسل اپنے بزرگوں کی فضیلتیں دیکھکر
ایسی مغرور ہوئی کہ لگے کہنے نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهُ۔ ہم تو خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں اور
اسی وجہ سے اُن کا یہ مقولہ تھا کہ ہم میں سے کسی کو آتش دوزخ چھوئے گی بھی تو صرف چند روز
کے لئے ان کو قائل معقول کرنے کے لئے خدا فرماتا ہی۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔
اگر ایسا ہی تو موت کی آرزو کرو جس سے معلوم ہو کہ جو تم مونہہ سے کہتے ہو تمھارے دل میں بھی ہی
کیوں کہ جب آدمی کو آخرۃ کی طرف سے اطمینان ہی تو وہ موت سے کیوں جان چُرانے لگا۔
غرض یہ کھٹکا کہ دیکھئے کیا ہو صاف دلالة کرتا ہی کہ اس کے دل میں چور ہی۔ جو بے قصور
ہوگا وہ مطمئن بھی ضرور ہوگا۔ اور یہ جو تم نے کہا کہ میں نے نیکی نہیں کی تو ایسی کوئی بُرائی
بھی نہیں کی تم کو اپنی ذمہ داری پر لحاظ نہیں۔ ہو نہیں سکتا کہ بشریّت کے جامے میں کوئی
شخص معصوم ہو۔ انسان کی خلقۃ ہی اس طرح کی ضعیف واقع ہوئی ہی کہ بدون بھٹکے
بے بہکے اس کو دو قدم سیدھا رستہ چلنا بھی مشکل ہی۔ اُس پر ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ ہی
کہ وہ اس کو آسانی سے اُٹھا نہیں سکتا۔ چند در چند خواہشیں اُس کے پیچھے لگی ہیں جن
میں اعتدال پر قائم رہنا نہایۃ ہی دشوار ہی۔ اس پر حقوق ہیں خدا کے جس نے اُس کو
پیدا کیا وہ اس کو روزی دیتا اور اُس کی زندگی کے لئے ہزاروں طرح کے سامان کرتا۔

اُس پر حقوق ہیں خود اپنے نفس کے اُس پر حقوق ہیں اُن لوگوں کے جن میں وہ رہتا یعنی ماں باپ کے بھائی بہن کے عزیز و قریب کے دوست آشنا کے عورۃ ہے تو شوہر کے مرد ہے تو بی بی کے اولاد کے اُستاد کے اپنے سے بڑوں کے اپنے سے چھوٹوں کے حاکم وقت کے ہمسائے کے ہم وطن کے زمین کے آسمان کے سارے جہان کے۔ محال عقل ہے کہ انسان اتنے سارے حقوق بے کم و کاست ادا کر سکے پس چار و ناچار کسی نہ کسی بات میں اس سے افراط تفریط ضرور ہوتی ہے اور اسی افراط و تفریط کا نام ہے گناہ۔ اسی طرح تمھارا یہ کہنا کہ دنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہیں جو اوروں کا حال وہ میرا حال سر تا سر نادانی اور بے عقلی کی بات ہے پھر تم مانگ کے دکھ سے اس قدر بے قرار کیوں تھیں۔ آخر دنیا میں اور بھی خدا کے بندے تھے اور ہیں جو تم سے بھی کہیں زیادہ تکلیفوں میں مبتلا ہیں۔ جب تم کو دوسروں کی ایذا سے دنیا میں تسلی نہ ہوئی تو آخرۃ میں کیوں ہونے لگی۔ مگر یوں کہو کہ ابھی آخرۃ سر پر پڑی نہیں جس دن سر پہ پڑے گی ساری حقیقۃ کھل جاے گی۔ س۔ تو کیا مجکو درستی عاقبۃ کی کچھ امید نہیں رکھنی چاہئے؟ ج۔ نہیں نہیں۔ خدا کی طرف سے مایوس ہونا بھی کفر ہے۔ س

نہ ہو اُس سے مایوس امیدوار اُسے فضل کرتے نہیں لگتی بار

س۔ کیا سچ مچ خدا مجھ جیسی گناہ گار پر بھی فضل کر سکتا ہے جس نے ساری عمر بھلائی کا کوئی کام ہی نہیں کیا۔ اب جو میں خیال کرتی ہوں تو میری نیکیوں میں اگر میں اُن کو نیکی سمجھ سکتی ہوں لے دے کر یہی ایک نماز۔ سو اول تو اتنی پڑھی نہیں جتنی قضا کی۔ اور جو پڑھی بھی تو کیا خاک پڑھی ظاہر میں تو خدا کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی ہوں اور دل ہے کہ خدا جانے کہاں کہاں بھٹکا چلا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی شامۃ ہوگی کہ کسی نماز میں مجکو رکعتوں کی گنتی ہی یاد نہیں رہتی۔ تو میں سمجھتی ہوں۔ ایسی نماز پڑھی نہ پڑھی برابر۔ رہے برس کے برس رمضان کے روزے سو میں بات کہوں صاف ہیں نے تو کوئی روزہ خوش دلی سے رکھا نہیں۔ روزے رکھے مگر اُس کے ساتھ خواہی نخواہی یہ بھی خیال آتا تھا کہ نہ رکھوں گی تو روزہ خور کہلاؤں گی لوگ چھیڑیں گے۔ اور جو قضا ہوئے اُن کے ادا کرنے کا کبھی کچھ تردد کیا نہیں۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ خد۔

تھے یا ریا کے - اسلام کا تیسرا رکن زکوۃ ہی جس میں مجکو ساری عمر کلام رہا کہ باون روپے
کا نصاب بہت ہی تھوڑا ہی اب وہ زمانے نہیں رہے کہ جس کے پاس باون روپے فاضل
ہوں اس کو غنی کہا جائے اور جب غنی نہیں تو زکوۃ کیسی - باون روپے والا صاحب
زکوۃ تو نہیں مستحق زکوۃ ہو تو ہو سکتا ہی ہاں گہنا پاتا میرے پاس ضرور ہی کبھی ٹھیک حساب
کرنے کا تو اتفاق نہیں ہوا مگر ایک ہزار سے اوپر ہی اوپر کا ہوگا - ہزار ہی روپے کا رکھو
تو ہر برسویں دن زکوۃ کے پچیس نکلتے نکلتے ایک دن گہنا ہی گیا گزرا ہو جاے - پچیس روپے
ہوں تو اس کی ٹوٹ پھوٹ ہی درست نہ کراؤں - اور اس مسئلے میں تو میں امام شافعی کے
مذہب پر ہوں جن کے ہاں سرے سے گہنے پر زکوۃ ہی نہیں - غرض زکوۃ تو نہیں مگر یوں
کوئی فقیر دروازے پر آکھڑا ہوا اور گھڑکنے جھڑکنے سے بھی نہ ٹلا تو ایسے چچڑ کو کچھ نہ کچھ
دینا ہی پڑتا ہی - میں نے بھی باسی روٹی کا ٹکڑا یا پھٹا پرانا چیتھڑا کیوں نہ دیا ہوگا - ضرور
دیا ہوگا - لیکن کیا ایسا دینا داخل خیرات ہو سکتا ہی - ہرگز نہیں - بلکہ مانگنے والے کی تحقیر
اور دل آزاری کی وجہ سے نیکی برباد گنہ لازم - نماز اور روزے اور زکوۃ کا یہ حال ہو تو
حج کا کیا مذکور ہی - نہ گئے اور نہ جانے کا ارادہ - اور خیر ان ظاہری عبادتوں پر کیا موقوف
ہی یوں بھی مجکو خدا کے ساتھ ایسا کونسا تعلق ہی خدا دنیا کے دستور کے مطابق فارغ البالی
اور خوش حالی کے زمانے میں یاد آنے کی تو کوئی چیز نہیں - ہاں مصیبت کے وقت خدا یاد آتا
ہی سو مجکو بھی یاد آیا مگر کب ؟ جب کوئی تدبیر نہ چلی - اتنی اور ایسی یاد پر مجکو بندۂ غرض
کہیں تو بجا ہی نہ بندۂ خدا - یہ حقیقت تو حقوق اللہ کی ہی اب رہے حقوق العباد تو میں نے
اپنے حقوق کے سوائے کسی سے کچھ مطلب ہی نہیں رکھا اور رکھا بھی تو لوگوں کو مجھ سے
کچھ ایذا ہی پونہچی ہوگی کسی کی غیبت - کسی کا حسد - کسی کی شماتت - میرا اصول زندگی تو
یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ یہ سلوک اور احسان کیا کم ہی کہ کسی پر ہاتھ نہ اٹھاؤں کسی کو
گالی نہ دوں پرائی چیز نہ چراؤں - میں نے اس کا مطلق خیال ہی نہیں کیا کہ مجھ پر لوگوں
کا بڑا حق یہ ہی کہ جہاں تک ہو سکے ان کو فائدہ پونہچاؤں - میں نے بہتیرے وعظ سنے
کتنی کتابیں دیکھی بھالیں مگر خدا جانے میری سمجھ پر کیسے پتھر پڑ گئے تھے کہ ایک لمحے

کے لئے بھی میں نے خیال نہ کیا کہ مجکو خدا اور بندگانِ خدا کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا
چاہیئے ۔ میں نے میاں کے مرنے کا اتنا رنج کیا اتنا رنج کیا کہ بس دوسرا بھی کوئی کرے گا تو
اتنا ہی کرے گا لیکن کبھی یہ نہ سوچا کہ یہی دن مجکو بھی پیش آنے والا ہی ۔ بے شک میں نے
اپنی پاک دامنی کو دھبہ نہیں لگنے دیا لیکن اُس میں اول تو یہ دیکھنا ہی کہ خدا کے خوف سے یا
بدنامی کے ڈر سے ۔ لیکن فرض کیا کہ خدا ہی کے خوف سے میں نے اپنے تئیں بچایا تو میں نے
ایسا کونسا کارنمایاں کیا جس کے لئے انعام کی توقع رکھوں ۔ خدا کے یہاں کی تو خبر نہیں مگر
دنیا میں تو اس طرح پر انعام تقسیم نہیں ہوتے ۔ ورنہ سیکڑوں ہزاروں آدمی آکھڑے ہوں
کہ ہم تمھارے گھر میں نہیں کودے لاؤ ہمارا انعام ۔ اجی نہیں کودے تو سزا سے بچے انعام
کا ہے کا ۔ مجکو بڑا تعجب ہی کہ جو باتیں آج مجھے ایسی کھلی ہوئی اور صاف معلوم ہوتی ہیں
اُن کی طرف اس سے پہلے میرا ذہن منتقل کیوں نہیں ہوا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ اب
میرا وقت قریب آلگا ہی ۔ ورنہ کیا میں پہلے کبھی بیمار نہیں پڑی پر میری عقل میں روشنی
میرے ذہن میں صفائی اس طرح کی کبھی نہیں آئی ۔ لیکن اب سوچنے سے کیا ہوتا ہی ۔
سوچنا تو اُسی وقت فائدے کا تھا جب مجکو اُس کے مطابق عمل کرنے کی مہلت تھی ۔ اب
موت سر پر آکھڑی ہوئی یا نہیں بھی آکھڑی ہوئی تو بیماری نے مجکو توڑ کر چور کر دیا اور
اس قابل بھی نہ رکھا کہ بھلا کھڑی ہو کر اطمینان سے دو رکعتیں تو پڑھ لیتی ۔ ایسی حالت
میں مجھ سے ہو بھی کیا سکتا ہے ۔ درد ذرا دیر کو تھمے تو آدمی کسی طرف کو جی بھی لگائے ۔
ٹیس ہی کہ دم نہیں لینے دیتی نماز میں حضور قلب ہو تو کیوں کر ہو ۔ اور مانا کہ اب اچھی بھی
ہوگئی تو پچھلی فروگزاشتوں کا کیا علاج ۔ وقت جو نکلتا تھا نکل گیا آپ میں اُس کو لوٹا نہیں
سکتی ۔ جو کچھ نامۂ اعمال میں لکھا جا چکا ہی اس کو مٹا نہیں سکتی ۔ میں ہتیرا چاہوں کہ خدا
سے ناامید نہ ہوں لیکن امید عبث توقع فضول ۔ بوؤں کانٹے اور چننے چاہوں پھول ۔
ج ۔ بے شک کردار تو ایسے ہی ہیں کہ نجاۃ کا ضعیف سے ضعیف احتمال بھی نہیں ہو سکتا
مگر خدا بڑا غفور و رحیم ہی اُس نے اپنے سچے اور پاک کلام میں بڑا مستحکم وعدہ فرمایا ہی کہ یَا اَیُّہَا
الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ

اے لوگو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتیاں کی ہیں اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بے شک
خدا سارے گناہوں کو معاف کرے گا بے شک وہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ اس سے بڑھ کر
اور بھی کوئی چیز تسلی دینے والی ہو سکتی ہے۔ سارے گناہوں میں سب گناہ آگئے خدا کے ہوں یا
بندوں کے۔ س۔ کیا تو بہ و استغفار کی بھی ضرورت نہیں ہے؟ ج۔ جب بندے نے گناہ کو گناہ سمجھا
بس یہ سمجھنا ہی اُس کی توبہ ہے۔ انسان ایک کام کو گناہ سمجھے گا تو وہ کام اُس سے ہوگا
بھی نہیں۔ اور بندہ بشر ہی ہوگا کبھی تو کبھی نہ کبھی اس کو افسوس بھی ضرور ہوگا اور وہ
اُس سے آخر کار باز بھی ضرور آئے گا۔ س۔ اچھا تو اب اس حالت میں جو دن جینا ہے مجھے
کیا کرنا ہوگا۔ ج۔ جہاں تک ہو سکے تلافی مافات اور آیندہ کے لئے اصلاح خیالات و عادات۔ س۔
مگر مجھ سے تو اب کچھ ہو ہی نہیں سکتا اور نہ آیندہ امید ہے کہ میں کچھ کرنے جوگی ہوں گی۔ ج۔
تم پر ناامیدی کے خیالات ہیں غالب قرآن کے وہ پیارے جملے اس وقت تمھارے ذہن میں نہیں
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا آتٰهَا۔ اللہ جل شانہ کسی
نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر بقدر اس کی طاقت کے اور جس قدر جس کو دیا اسی کی بساط کے
موافق اُس سے مانگا جاتا ہے۔ نہ امیر کا صدقہ اور نہ غریب کا نرمی سے کہہ دینا کہ اللہ تم کو برکت دے
ہم بہت شرمندہ ہیں کہ ہم کو تمھاری خدمت کرنے کا مقدور نہیں۔ س۔ کیا بھول ہوئی ہے
جن دنوں لوگوں کی طرف سے میرے پاس شادی کے پیام پر پیام چلے آتے تھے ایک شخص
نے ہم خرما و ہم ثواب لکھا تھا کہ اگر تم دوسرا نکاح کر لو گی تو تمھاری دیکھا دیکھی جتنی بیوہ
عورتیں نکاح کریں گی روز قیامت تک اس مری ہوئی سُنّت کے زندہ کرنے کا ثواب تم کو ملے گا
اگر میں اُن دنوں نکاح پڑھا لیتی اس نیت سے کہ دوسروں کے لئے سند ہو تو بے شک اس کے
یہ معنے تھے کہ اتنی عورتوں کو گویا میں نے عذاب بیوگی سے نجات دی۔ دنیا کی رسوائی اور آخرت
کی فضیحت سے بچایا۔ لیکن وہ موقع تو گیا اور ایسا گیا کہ پھر اُس کے آنے کی توقع نہیں۔
اب تو میں ہزار چاہوں تو کوئی بھی میرا روادار نہ ہو۔ یہی ایک بھلائی میرے بس کی تھی سو
اب تک اس سے بھی نہ کی۔ اور واقع میں اب جو میں سوچتی ہوں تو یہ نماز روزہ نیکیاں
تو ہیں لیکن پھر بھی ان عبادتوں میں آدمی کی اپنی ہی غرض ہے اور بس۔ یعنی انسان

دوزخ کے خوف یا جنت کے لالچ سے یہ سب زحمتیں اُٹھاتا ہی تو دنیا میں بھی اس کی ساری
کوششیں اپنے ہی فائدے کے لئے ہیں۔ لوگ معاش کی خاطر پڑھتے۔ لکھتے۔ امتحان دیتے
پرائے تابع دار بنتے۔ پردیس مارے مارے پھرتے۔ سپاہی سر کٹواتے اور خدا جانے کیسے کیسے
جتن کرتے ہیں۔ ان کوششوں کی اور طرح پر تعریف ہو تو ہو نیکی سمجھ کر تو ان کو کوئی بھی نہیں
سراہتا۔ اسی طرح عبادۃ اگر ثواب کی طمع یا عذاب کے خوف سے ہو تو داخلِ خودغرضی ہی۔ اصلی
اور سچی اور اعلے درجے کی نیکی تو وہ ہی جس میں انسان کی اپنی غرض کا بالکل شمول نہ ہو اور
صرف بجا آوری حکم الٰہی یا دوسروں کو فائدہ پونہچانے کے لئے کی جائے۔ مجکو رہ رہ کر پچھتاوا
آتا ہی کہ میں نے اپنی تن درستی کے زمانے میں جب میں سب کچھ کر سکتی تھی کیوں نہیں سمجھا
کیوں نہیں سوچا۔ اور اب میں دوسروں کو فائدہ پونہچاؤں گی کیا خاک۔ میں آپ بڑی
دوسروں سے خدمتہ لے رہی یعنی اُلٹی ان کو ایذا دے رہی ہوں۔ اگر دوسروں کو فائدہ پونہچانا
نیکی ہی اور واقع میں نیکی اگر ہی تو یہی ہی تو میں خود جانتی ہوں کہ میں نے نیکی نہیں کی اور نہیں
کی تو میرے نامۂ اعمال میں کیوں ہونے لگی۔ لیکن میرے ان خیالات سے ہونا ہی کیا ہی زندگی
کے جو دن اکارت جانے تھے جا چکے اُن کا لوٹا لانا میرے کیا کسی کے اختیار میں بھی نہیں۔ ہاں
ندامتہ اور افسوس کرنے سے اتنا ہی کہ اگر خدا رحم کرے (اور کرے ہی گا اور نہ کرے تو دنیا جہان
کا کہاں ٹھکانا لگے) تو یہ توبہ پچھلے گناہوں کا کفارہ اور نیکیوں کا عوض ہو سکتی ہی۔ لیکن
جب تک دم میں دم ہی تمام ذمہ داریاں یعنی فرائض آدمی کے ساتھ ہیں۔ یہ ہو سکتا ہی کہ نماز
کھڑے ہو کر نہ پڑھی بیٹھ کر پڑھی۔ یا سفر کے عذر سے پوری نہ پڑھی آدھی پڑھی۔ وضو نقصان
کرتا ہی تیمم کر لیا۔ بہر کیف نماز زیادہ یا کم اور مشکل یا آسان ہو سکتی ہی مگر نہیں ہو سکتا کہ سر
سے نماز ہی ساقط ہو جائے۔ اسی طرح اگر میں اس حالۃ میں لوگوں کو اور کچھ فائدہ نہ بھی پونہچا سکوں
تاہم کسی سے دو میٹھی باتیں کر لیں ہنس کر بول لیا بال بچوں کی خیر و عافیۃ پوچھ لی اتنے
ہی میں آدمی کا جی خوش ہو جاتا ہی اور سچ پوچھو تو یہ بھی ایک طرح پر فائدہ ہی پونہچانا ہی۔ مانا
کہ اب میں نکاح کرنے کے قابل نہیں تو کیا لوگوں کو نصیحۃ کرنے اور سمجھانے کے بھی قابل نہیں۔
باوجودے کہ مذہب میں بھی اجازۃ بلکہ تاکید ہی اور عقل کی رو سے بھی کوئی قباحۃ نہیں پھر جو

مسلمانوں میں بیوہ کا نکاح نہیں ہوتا ہو نہ ہو یہ رسم بدانھوں نے ہندوؤں سے لی ہی۔
عورتیں حد سے زیادہ شرم کرکے اپنی آزادی کھو اور اپنے حق سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ مردوں
کو اس کا خیال نہیں اور خیال ہونے کی وجہ بھی نہیں۔ خود عورت ہوں تو عورتوں کی بیوگی
کی قدر جانیں ان کی مصیبت کو پہچانیں۔ بے شک بڑی عمدہ اور موثر نصیحت تو وہی تھی کہ میں
مونھ سے ایک حرف بھی نہ کہتی اور کرکے دکھا دیتی۔ مگر اب وہ ہو نہیں سکتا تو خیر اتنا ہی کردوں
کہ اپنے پرائے سب کو بلاؤں اپنی بیتی سناؤں۔ یقین تو ہی کہ لوگ سمجھیں اور عبرت پکڑیں۔ اور
پھر دیر کرنی بھی مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو اتنا کرنے سے بھی رہ جاؤں۔ ہر چند ناسور بھر آیا ہی
اور کئی کئی ہفتے سے رِسنا بھی موقوف ہی مگر گھولن اور گُلن میں ذرا کمی نہیں۔ معلوم ہوتا ہی کہ
زخم موجود ہی اور عجب نہیں کہ اُس نے اندر کو مونہ کر لیا ہو کیوں کہ جس دن سے زخم کا رِسنا
بند ہوا اُسی دن سے مجکو دست چلے آتے ہیں۔ لوگ پیچش بتاتے ہیں مگر پیچش ہوتی تو مروڑ
اس کو لازم تھا۔ اور یہاں مروڑ کا نام نہیں۔ اور آخر یہ کیا بات ہی کہ دست کے ساتھ کوکھ
کا درد کیوں کم ہو جاتا ہی۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہی کہ جیسا میم ڈاکٹر نے کہا تھا ناسور نے
اندر کو رستہ کر لیا ہی اور اگر ایسا ہی اور یقیناً ایسا ہی ہی تو اس بیماری سے میرا اچھا محال ہی۔
دنیا میں مجکو ایسی کون سی آسائش تھی کہ میں مرنے سے گھبراؤں۔ بلا سے ایک دفعہ مر کر ہر وقت
کی ان تکلیفوں سے تو چھوٹ جاؤں گی۔ رہا وہاں کا فکر تو نہ مہلت ہی نہ طاقت۔ چلتے چلتے
بیوؤں کے بارے میں دو دو باتیں لوگوں سے کہہ لوں شاید خدا قبول کر لے اُس کی ذرہ نوازی
سے کچھ بعید نہیں۔ یہ دل میں سوچ ایک دن ٹھیرا پڑوسیوں دور نزدیک کے رشتہ داروں
اور جان پہچان والوں میں مردانہ بلاوا بھیج دیا کہ میری علالت کا حال تو آپ کو معلوم ہی اب
باسباب ظاہر مجکو اپنی زندگی کی طرف سے بالکل نا امیدی ہو گئی ہی اور میں نہیں جانتی کہ
کس دن اور کس وقت میرا دم نکل جائے گا مجکو بڑی تمنا ہی کہ ایک بار اس زندگی میں
اپنے پیاروں کو آنکھ بھر دیکھ لوں اور میں آپ سب صاحبوں کے دنیا دی اور دینی فائدے
کے لئے ایک وصیت بھی کرنے والی ہوں اور اسی غرض سے میں نے سب کو ایک ساتھ بُلایا ہی
مہربانی فرما کر ضرور ضرور تکلیف کرنا ایسا نہ ہو کہ یہ ارمان دل کا دل ہی میں رہے اور میں

رخصت ہوجاؤں۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جس وقت سے بلاوا پھرنا شروع ہوا آزادی دفعۃً ایسی
تن درست ہوگئی کہ گویا کچھ بیمار ہی نہ تھی۔ جو مضمون وہ لوگوں کے مجمع میں کہنے والی تھی
اس کو اُس نے خوب فرصت سے سوچا اور کچھ یادداشت بھی لکھ لی ہو تو عجب نہیں کیوں کہ
اتنی باتوں کا مسلسل طور پر فی الوقت یاد آجانا ذرا مشکل۔ مگر ہم نے یہ مضمون کہیں سے
نقل نہیں کیا جو کچھ آزادی کے مُونہ سے نکلتا تھا کئی آدمی لکھتے جاتے تھے اُن میں سے ایک
ہم بھی تھے۔ پھر جو دوسرے لوگوں کے لکھے ہوئے سے مقابلہ کیا تو خدا کے فضل سے ہمارا ہی لکھا
پورا اور ٹھیک اُترا۔ آزادی پردے میں تو تھی مگر ہم نے اتنے پاس سے اُس کو وصیت کرتے ہوئے
سُنا کہ اُس کے سانس تک کی آواز برابر ہمارے کان میں چلی آتی تھی۔ پڑھنے والوں کو ہم اس بات
کا پورا اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم نے اپنی طرف سے اس وصیت میں ایک حرف تک گھٹایا بڑھایا نہیں
اور اُس وقت کا لکھا ہوا مسودہ ہمارے پاس محفوظ ہے اُس پر صدہا بڑے بڑے معتبر آدمیوں
کے دستخط ہیں اور وہ تصدیق کرتے ہیں کہ یہی مضمون بے کم و کاست انھوں نے آزادی
سے سنا بلکہ ایک صاحب نے تو یہ لکھ دیا کہ کاتب مضمون نے فونوگراف[۵] کا کام دیا ہے۔ آزادی کیا
شرافت کیا لیاقت کیا تعزز خاندانی کیا ملنساری سب طور سے اس رتبے کی عورت تھی کہ کسی کو بالصرف
جھوٹوں بُلا بھیجتی تو وہ سچوں دوڑا آتا اور اس کا یہ بُلاوا تو ایسے پیرائے میں تھا کہ لوگوں
نے اپنے سو کام حرج کیے اور جتنوں کو بُلایا سب کے سب وقت سے پہلے آموجود ہوئے۔
وصیت جب تک سُنی نہ تھی ہر شخص اپنی جگہ عقل دوڑاتا تھا کہ ایسی کیا بات ہے جس کے لئے
اتنا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ آدمی ہیں خوش حال میکا تو ان کا سدا کا امیر ہے جن
دنوں ان کا بیاہ ہوا سارے شہر میں جہیز کا چرچا تھا سُسرال مقدرۃ کے اعتبار سے ہیٹی
تھی تو ان کے میاں نے بھوپال میں بہت کچھ کمایا وہ مرے تو وہی تنخواہ ان کے نام سے
جاری ہوگئی اولاد کچھ ہوئی نہیں کسی کو متبنیٰ کرتی ہوں گی اور لوگوں کو اس غرض سے جمع
کیا ہے کہ کل کلاں کو کوئی جھگڑا نہ کرے۔ دوسرا۔ نہیں جی۔ متبنیٰ کی شرع میں کچھ اصل نہیں
پڑھی لکھی مولوان مسئلے مسائل سے واقف ایسا نہیں کر سکتی۔ پہلا۔ متبنیٰ کی شرع میں اصل
نہ ہو نہ سہی مگر آدمی کو یہ تو اختیار ہے کہ اپنا مال جس کے نام چاہے ہبہ کر دے اور ان کے گئے تو

۵ ایک حال کا ایجاد کیا ہوا آلہ ہے جو آواز کو ہو بہو دوہرا سکتا ہے ۱۲

اولاد نہیں ان کو تو ضرور ایسا اختیار ہونا چاہئے۔ دوسرا۔ تم ان سے اچھی طرح واقف نہیں۔ میں ان کو خوب جانتا ہوں پہلے درجے کے دین دار ہیں وہ ایسا نہیں کریں گی۔ پہلا۔ کیا اپنے مال میں تصرف کرنا خلاف دین داری ہے۔ دوسرا۔ بے شک جس کو میں دین داری سمجھتا ہوں اور جیسی دین داری خاص کر آزادی بیگم کی ہے اس کی رو سے اپنے مال میں تصرف کرنا بھی منع ہے۔ اگر سچ پوچھتے ہو تو دنیا میں کوئی چیز کسی کی ملکیت نہیں۔ جو کچھ کسی کے پاس ہے سب عاریتہً ہے اور مالک حقیقی خدا ہے اور بس۔ اور یہ جو لوگ ہبہ یا وصیتہ یا تقسیم سے آیندہ کے لئے اپنے ترکے کا انتظام کر جاتے ہیں میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مال کو یہاں تک دوست رکھتے ہیں کہ مرے بعد بھی اس میں اپنا ہی انتظام چلانا چاہتے ہیں۔ خدا نے ہمارے ترکے کا کامل انتظام کر دیا ہے ہر ایک وارث کے حقوق ٹھیرا دیئے ہیں ہم کو اس انتظام میں دخل دینے کی ضرورۃ نہیں چنانچہ خدا نے خود فرمایا ہے اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّھُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِــيْمًا حَكِـيْمًا۔ تم نہیں جانتے کہ تمھارے باپ بیٹوں میں تم کو کس سے زیادہ نفع پہنچتا ہے کہ ترکے میں اس کا زیادہ حق ہو یا کون تم سے زیادہ نفع پانے کا مستحق ہے یہ تو اللہ کا ٹھیرا ہوا ہے بے شک وہ جاننے والا حکمتہ والا ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ موت کے ساتھ میراث اور وارث کسی کا کچھ خیال نہ آئے۔ دنیا کب سے چلی آتی ہے ہم سے پہلے بھی یہ مال کسی کے قبضے میں تھا اور وہ اس کا انتظام کرتا تھا ہم قابض ہوئے ہم نے انتظام کیا ہمارے بعد جو قابض ہوگا انتظام کرے گا۔ ع ہر کہ را پنج روز نوبتہ اوست + یہ باتیں تم نے آزادی بیگم کے مونہ سے تو نہیں سنیں۔ مگر مجھکو تحقیق معلوم ہے کہ ان کے خیالات دین داری بہت بڑھے ہوئے ہیں اور وہ ایسی چھوٹی متبذل باتوں کی طرف ملتفت ہو نہیں سکتیں کہ اولاد کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو گود لیں۔ میرا گمان تو یہ ہے کہ ان کو اولاد نہ ہونے کا کبھی خیال بھی ستایا ہوگا۔ تیسرا۔ متبنی انہیں شاید وقف کرتی ہوں۔ پہلا۔ مگر یہ کیا کہلا بھیجا ہے کہ آپ سب صاحبوں کے دنیاوی اور دینی فائدے کے لئے ایک وصیتہ بھی کرنے والی ہوں۔ تیسرا۔ دیکھنا جو وقف کے سوائے کوئی اور بات نکلے۔ چوتھا۔ یا شاید اپنی تجہیز تکفین قبر وغیرہ کے بارے

میں کچھ کہنا چاہتی ہوں گی۔ دوسرا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کیا وصیۃ کریں گی لیکن متبنیٰ بوقف۔ تجہیز تکفین اس قبیل کی تو یقیناً کوئی بات نہیں۔ یہ سب لوگوں کا بلانا کسی اَور ہی مطلب سے ہی۔ اور یہ بھید نہیں کھلتا کہ عورتوں کو کیوں نہیں بلایا۔ بہرکیف جھگڑا کاہے کا ہی کل نہیں تو پرسوں اس وقت سے پہلے پہلے سب سُن لیں گے کہ کیا وصیۃ کی۔ جس دن وصیۃ سُننے کے لئے لوگ جمع ہوئے محلے کی مسجد میں نماز صبح کے وقت لوگوں کی یہ کثرۃ تھی کہ رمضان کے الوداعی جمعے میں بھی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ اچھا معتدل موسم تھا نہ بہت گرمی نہ بہت سردی دن کے آٹھ بجتے بجتے مکان مردانہ ہوگیا اور سب لوگ آبھرے۔ ایک درے کے آگے چلمن پڑی تھی اُس کے اندر آزادی تھی اور اس کے گرداگرد چند عورتیں اور باقی تمام مکان میں مرد ہی مرد پٹے پڑے تھے۔ جب لوگ ٹھکانے سے بیٹھ لئے تو اندر درے میں سے آزادی نے خوب کڑاکے کی آواز سے پکار کر کہا +

اُنیسویں فصل۔ آزادی بیگم کی آخری وصیۃ اور خاتمہ

بزرگو۔ بھائیو۔ عزیزو۔ السلام علیکم۔ ہندوستان میں اور ہندوستان میں نہیں تو اس شہر میں شاید یہ پہلا اتفاق ہی کہ ایک پردہ نشین عورۃ مردوں سے خطاب کر رہی ہی جن میں بعض اجنبی بھی ہیں۔ عورۃ کسی قوم کسی مذہب کسی ملک کسی عمر اور کسی حالۃ کی کیوں نہ ہو تھوڑا بہت حجاب اُس کی طبیعۃ میں ضرور ہوتا ہی اس سے معلوم ہوتا ہی کہ پردہ از روے پیدائش عورۃ کے مزاج کے مناسب ہی۔ روے زمین پر صرف مسلمانوں کی ایک قوم ہی جن کے مذہب میں پردے کا حکم ہی تو دوسرے مذہب والے خاص کر عیسائی اس پر بڑے بڑے مُونہہ آتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل اُن کی ہٹ دھرمی ہی۔ وہ ہماری حالۃ سے اچھی طرح واقف نہیں اور قیاسی باتوں سے ایسے رواج پر اعتراض کرتے ہیں جو اس مدت تک یقیناً نہایۃ مفید ثابت ہوا ہی۔ میں انگریزوں کے خانگی حالات سے بالکل ناواقف ہوں مگر جہاں تک کتابوں اور اخباروں سے معلوم ہوا ہی بے پردگی کے بُرے نتیجے اُن کو بھی جھیلنے پڑتے ہیں۔ لیکن آزادی اور خودسری جو ملکی رواج کی رو سے عورتوں کو حاصل ہی چھیننا تو درکنار اس کا روکنا اور گھٹانا

بھی دشوار بلکہ محال ہی۔ مسلمانوں میں بھی چھوٹتے ہی پردے کا رواج نہیں ہوا بلکہ مدتوں
سب کی بہو بیٹیاں دستور قدیم کے مطابق باہر نکلتی اور پھرتی چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ
اسلام کی تعلیم سے لوگوں کے سینے خوف خدا اور پرہیزگاری اور نیکوکاری سے معمور
ہوگئے اور خود اُن ہی کو بے پردگی سے نفرۃ پیدا ہوئی اور انھوں نے آزادی کو اپنے
حق میں زبون اور خطرناک سمجھ کر اپنے تئیں پردے کا پابند کرنا چاہا۔ جب پردے کا
حکم نازل ہوا تو بہت دنوں تک اس میں ایسی آسانی رہی کہ عورتیں مسجدوں میں شریک
جماعۃ ہوتیں۔ لڑائیوں میں جاتیں۔ اور مجاہدین کی جو خدمتہ بن پڑتی بجالاتیں۔ جوں
جوں پیغمبر صاحب صلعم کا عہد بابرکت دور پڑتا گیا دلوں کی صفائی خیالات کی پاکیزگی کم ہوتی
گئی پردے میں بضرورۃ تشدد ہونے لگا۔ یہاں تک کہ اب جو پردے کا رنگ ہی آپ سب
صاحب اُس کو دیکھتے ہیں۔ یہ پردہ قدر مشروع سے بہت زیادہ مگر ضرورۃ اور مصلحۃ وقت
سے اب بھی کم ہی۔ باوجودے کہ میں بڑی سختی کے ساتھ پردے کی طرفدار ہوں لیکن
ایک ایسا ہی قوی سبب آکر پڑا ہی کہ میں نے اپنی آواز مردوں کو سنانے پر جراۃ کی اور
میری ساری عمر میں یہ پہلا اور خدا نے چاہا آخری اتفاق ہی کہ میں نے شرعی پردے کے
نہیں بلکہ رواجی پردے کے خلاف کیا ہی۔ رسول خدا صلعم کی صاحبزادی حضرۃ فاطمہ
رضی اللہ تعا عنہا نے مہاجرین اور انصار کو مخاطب کرکے تا بدیر بڑی لمبی تقریر کی اور
وہ تقریر ایک خطبے کے پیرائے میں اس وقت تک کتابوں میں لکھی ہوئی موجود ہی۔
ام المومنین حضرۃ عائشہ سے لوگ بکثرۃ مسئلے پوچھنے آتے اور آپ پردے میں سے
جواب دیتیں غرض میں جو یہ گفتگو کر رہی ہوں اس کے جواز شرعی کی سندیں بھی رکھتی
ہوں۔ علاوہ اس کے میں خود حیران ہوں کہ مجھ میں اس وقت کہاں کا زور آگیا ہی۔
کئی برس بعد میری اتنی آواز نکلی ہی ورنہ میری حالۃ دیکھو تو ناتوانی اور لاغری حد سے
بڑھ گئی ہی۔ اس سے کسی کو انکار نہیں اور انکار کی گنجایش بھی نہیں کہ کسی وقت اور
کسی حالۃ میں زندگی کا بھروسا نہیں۔ لیکن انکار نہ کرنا اور نہ کر سکنا اور چیز ہی اور
اعمال سے ثابت کر دکھانا کہ جیسا ہم مونہہ سے کہتے ہیں واقعی دل میں بھی ایسا ہی

یقین واثق رکھتے ہیں بالکل دوسری چیز۔ اور ان دونوں میں بڑا اور بہت بڑا فرق ہی۔
آپ چند روز کی میں کہتی نہیں مگر اس سے پہلے اپنے سے بڑوں کو اپنے دائیں داروں کو۔
اپنے سے چھوٹوں کو بعض کو مدتوں بیمار رہ کر اور بعض کو مفاجاۃً مرتے دیکھا اور سنا ایک دو
کو نہیں سیکڑوں کو۔ میں خود دو یا تین بار ایسی ایسی بیمار پڑی کہ مرنے میں کسی طرح کی کچھ کسر باقی
نہیں رہی تھی۔ مگر اس سے پہلے میں کبھی ایک لمحے کے لئے اپنی زندگی کی طرف سے ناطمئن
نہیں ہوئی۔ گویا میرا خیال یہ تھا کہ میں موت کے حکم عام سے مستثنیٰ ہوں یا جیسے خدا نے مجکو
زبان دی ہو کہ میں سو سوا سو برس کی عمر سے اِدھر نہیں مروں گی۔ سوائے خدا کے کسی کو دوسرے
کے دل کا حال معلوم نہیں۔ لیکن جہاں تک لوگوں کے برتاؤ سے سمجھا جا سکتا ہی میں خیال کرتی ہوں
کہ تمام آدمی الا ماشاء اللہ ویسی ہی غفلۃ میں مبتلا ہیں جیسی غفلۃ میں میں نے اپنی ساری عمر برباد
کی ہی۔ اس وقت نہیں تو کسی دوسرے وقت فرصۃ سے اپنی جگہ جا کر سوچنا کہ اگر دنیا کے لوگ
زندگی پر وتنا ہی اعتماد کریں جتنا کہ عقل کی رو سے ہونا چاہئیے یعنی رات کو سوئیں اور دل میں یہ
خیال ہو کہ دیکھیے جاگنا بھی نصیب ہوتا ہی یا نہیں۔ صبح کو اٹھیں اور یہ تصور پیش نظر ہو کہ
خدا جانے شام بھی پکڑتے ہیں یا نہیں۔ تو آپ ضرور اس بات کو تسلیم کریں گے کہ دنیا کا یہ رنگ
نہیں رہ سکتا۔ کیوں کوئی پکّی عمارتیں بنوائے گا۔ کس لئے کوئی باغ لگائے گا۔ کاہے کو آیندہ
کے لئے کوئی کسی طرح کا انتظام کرے گا۔ توقع لغو ہوگا بے معنے۔ امید خیال ہوگا باطل ع
نسیم غفلۃ کی چل رہی ہی اُمنڈ رہی ہیں بلاکی نیندیں + کچھ ایسے سوے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہی
افسوس ہی کہ مجکو اپنی غلطی پر وقوف اور غفلۃ سے تنبہ ایسے وقت ہوا کہ جبرِ نقصان میرے اختیار
سے خارج اور تلافیِ مافات میری قدرۃ سے باہر ہی۔ امتدادِ مرض نے میرے جسم کو اور اذعان
مرگ نے میرے خیالات کو اس قدر بدل دیا ہی کہ گویا یہ میرا دوسرا جنم ہی۔ جس خیال کو میں
ذہن میں جمانا چاہتی تھی اور نہیں جمتا تھا اب وہی خیال ہی کہ کسی وقت دل سے نہیں نکلتا
جو باتیں ساری عمر مشتبہ اور مشکل رہیں اب روزِ روشن کی طرح صاف اور بدیہی نظر آتی
ہیں۔ جن کو نہ دلیل کی حاجۃ۔ نہ ثبوت کی ضرورۃ۔ قرآن کی ایک آیۃ کو میں اپنی اس حالۃ
سے بہت ہی مطابق پاتی ہوں۔ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ

مِنۡ ہٰذَا فَکَشَفۡنَا عَنۡکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الۡیَوۡمَ حَدِیۡدٌ - اگر میرے پہلے کے سے یا یوں کیوں
نہ کہوں کہ ساری عمر کے سے خیالات ہوتے تو مجکو آپ صاحبوں کے ساتھ بات کرنی بھی
دشوار ہوتی نہ کہ ایسی بات جس کے لئے ڈھیر سارا علم درکار ہے۔ لیکن اس خیال نے کہ مجکو
دنیا میں رہنا نہیں میرے دل کو قوی میری طبیعۃ کو مضبوط اور میری ہمۃ کو دلیر کر دیا ہے۔ یہی
نہ کہ لوگ مجکو شوخ اور بے باک کہیں گے لیکن ایک دن ہوگا کہ نہ طعن کرنے والے ہوں گے -
(اور یہ شاید کسی قدر دیر میں ہو) اور نہ وہ ہوگی جس پر طعن کرتے ہیں (اور یہ بہت جلد
ہونے والا ہے) تھوڑی دیر بعد میں آپ صاحبوں سے اُس قسم کی باتیں کہوں گی جن کو سن کر
آپ اس سے بھی زیادہ اچنبھا کریں گے - خیر تو جو آیۃ میں نے ابھی پڑھی تھی اس میں روز
قیامۃ کا حال ہے کہ خداوند عالم کے روبرو ہر متنفس اس شان سے حاضر کیا جائے گا کہ ایک
تو اُس کے ساتھ ہانکنے والا ہوگا جیسے دنیا میں فوجداری کے مجرم کے ساتھ سرکاری سپاہی
لگا رہتا ہے جو اُس کو کشاں کشاں حاکم کے حضور میں لئے جا رہا ہے - اور ایک گواہ ہوگا جو حجۃ
تمام کرنے کے لئے اُس کے خلاف پر گواہی دے گا - غرض ہر شخص مجرموں کی شکل و صورۃ
میں اللہ تعٰ جل شانہ کے روبرو پیش کیا جائے گا - تو خدا تعٰ فرمائے گا تو اس حال سے غافل
رہا یعنی زندگی میں کچھ خبر نہ لی کہ مجکو جوابدہی کے لئے خدا کے حضور میں جانا ہے اور وہاں
سپاہی ہوں گے جن کی پکڑ سے بھاگ نہ سکوں گا اور گواہ ہوں گے جن کو جھٹلا نہ سکوں گا
تو تیری آنکھوں پر جو پردۂ غفلۃ پڑا ہوا تھا آج وہ پردہ ہم نے اُٹھا دیا اب تیری نظر
اس قدر تیز ہے کہ تمام چیزیں جن کی نسبۃ تجکو شبہہ تھا اب تجکو صاف بچشم سر دکھائی دیتے
ہیں - قریب قریب یہی حالۃ میری ہے - میرے والدین کے مذہبی خیالات ایک دوسرے سے
اس قدر مخالف تھے کہ دونوں میں ہمیشہ کھٹ پٹ رہتی تھی - اور یہی وجہ تھی کہ مجکو ایسی
چھوٹی سی عمر سے مذہبی باتوں میں غور کرنے کی ضرورۃ واقع ہوئی جب کہ میرے ساتھ
کی لڑکیوں کو گڑیوں کے سوائے اَور کسی چیز کا خیال نہ تھا - باتوں میں تو ہمیشہ ابا جان
دبا لیتے تھے مگر اماجان اپنے عقیدے کی ایسی پکی تھیں کہ بند ہو ہو جاتیں مگر اپنی بات
پر جمی رہتیں - اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر اُن کے دل میں کچھ شبہہ آ گیا نانا ابا پاس گئیں

اور کہہ سُن کر صاف کر لیا - مجھکو شکل تھی - بچپن کی عمر - کھیل کود کے دن - مذہبی خیالات -
اور اُن میں بھی اختلاف - فیصلہ کرنے کی لیاقۃ نہیں - اناڑی تولنے والے کی ترازو - کبھی ادھر کا
پلڑا جھک جاتا اور کبھی اُدھر کا - ماں پر نظر کی تو نماز ہے اور روزہ ہے اور تلاوۃِ قرآن ہے اور
وعظوں میں جانے کا شوق ہے - باپ کی باتوں کا خیال آ گیا تو کہاں کی نماز اور کس کا روزہ
ہفتوں خدا کا نام بھی زبان پر نہیں آتا - لیکن میں اتنی بات ضرور کہوں گی کہ ماں کا اثر مجھ پر
غالب تھا - نماز گنڈے دار پڑھی ہے قضا بھی بہت کی ہے مگر کوئی پورا مہینا نماز سے خالی گزرنے نہیں
دیا - روزے کھائے بھی اور بے دلی سے رکھے بھی لیکن ایسا نہیں ہوا کہ سارا رمضان سو کھا ڈالا دیا
ہو - لیکن اب جو سمجھ آئی (اور آئی بھی تو کب یہی پندرہ بیس دن سے) تو معلوم ہوا کہ ساری عمر
کبھی کوئی عبادۃ اُس خلوص کے ساتھ کرنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا جو شرطِ قبولیۃ ہے - تو ایسی
عبادۃ کی نہ کی برابر - اور خلوص ہوتا تو کہاں سے ہوتا - یہاں تو سرے سے دین بھی ماں اور
ننہال والوں کی نقل تھی وہ بھی باپ کی اصلاح دی ہوئی - عمر کا اکثر حصہ تو اس طرح پر
گزرا کہ تہ دل سے کبھی خدا کا خیال ہی نہیں آیا - اور جب خدا سے نہیں چھپا تو بندوں سے
چھپا کر کیا ہوگا کتنے کتنے دنوں میں اس میں حیران رہی کہ خدا حقیقۃ میں کوئی چیز ہے بھی یا
نہیں - اور ہے تو وہ ہم سے کیا چاہتا ہے - اُس نے ہم کو بے درخواست پیدا کیا - طرح طرح
کی ضرورتیں ہمارے ساتھ لگا دیں - زندگی کے دن تیر کرنے کے سوائے ہم سے اور ہو بھی
کیا سکتا ہے - اس پر عبادۃ کی مشقت - مذہب کی پابندی - مرنا - اور مرنے کے بعد جواب دہی
اس کے یہ معنے کہ ہم کو پیدا کر کے بیٹھے بٹھائے ایک مصیبۃ میں لا ڈالا - یہ کہاں کا انصاف
ہے اور کیسا رحم - دنیا میں بھلے بُرے دین دار بے دین سبھی طرح کے لوگ ہیں کسی میں کسی طرح
کی کوئی خصوصیۃ نہیں پائی جاتی جس سے خدا کی رضامندی اور نارضامندی کا پتہ چل سکے -
کتنے سارے مذہب ہیں اور ہر ایک مذہب والا دوسرے کو گم راہ بتاتا ہے مگر کوئی ایک
مذہب کسی ایک بات کا نشان نہیں دے سکتا کہ دنیا میں یہ ترجیح اسی کو ہے دوسرے کو نہیں
جس کو دیکھو عاقبۃ کا حوالہ - یہ معمّا نہ آج تک حل ہوا اور نہ قیامت [illegible] کی امید -
واقع میں مجھکو بڑی ہی پریشانی ہوتی تھی جب یہ خیال آتا تھا کہ اس [illegible] میں ہم مسلمان

دوسرے مذہب والوں کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے آٹے میں نمک تو کیا اتنے سارے آدمیوں کو خدا نے اس لئے پیدا کیا ہی کہ آخر کار ان کو جہنم میں جھونک دے میں کئی ہندنیوں کو جانتی ہوں اور دو تین میموں سے بھی میری ملاقاۃ ہی اور عقل بھی گواہی دیتی ہی کہ دوسرے مذہب والوں میں بھی نیکی خداشناسی خداترسی اور خداپرستی ہی اور اگر وہ مسلمان نہیں ہیں تو ناحق کی ضد کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس سبب سے کہ ان کو مذہب اسلام کا حال معلوم نہیں یا جس مذہب میں وہ ہیں سچے دل سے اُسی کی حقانیتہ کے معتقد ہیں اور اُن کے دل اُسی مذہب سے تسلی پاتے ہیں۔ کس قدر مشکل ہی ایسے لوگوں کی نسبتہ یہ حکم لگا دینا کہ ان کی نجاۃ نہیں۔ الغرض مذہب کی نسبتہ میرے کچھ اس قسم کے واہی خیال تھے پریشان ڈانواڈول۔ کسی کسی وقت میری طبیعتہ الجھتی بھی تھی مگر دین کی کچھ ایسی دُھن تو تھی نہیں طبیعتہ پر ذرا بوجھ پڑا اور اس خیال کو الگ کیا دوسرے کام میں لگ گئی۔ اب مجکو دو طرح کا افسوس ہی ایک تو غافل اور بے دین اور جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے کا اور دوسرے ایسی لغو ولاطائل زندگی پر افسوس نہ کرنے کا۔ جب سے مجکو اس کا پورا یقین ہوا ہی کہ میں اس بیماری سے جاں بر نہیں ہوسکتی خود بخود میری سمجھ کچھ دوسری طرح کی ہوگئی ہی۔ اب مجکو ہر طرف خدا ہی خدا دکھائی دے رہا ہی۔ اور میں کہتی ہوں کہ جب زندگی کا انجام موت ہی تو آدمی کی گو وہ روے زمین کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو کچھ بھی حقیقتہ نہیں۔ سانس نکلنے کی دیر ہی اور پھر تو مٹی کا ڈھیر ہی۔ لیکن یقین یقین میں بڑا فرق ہی۔ مجکو بھی ہمیشہ مرنے کا یقین تھا اور سبھی کو ہوتا ہی لیکن وہ یقین اور طرح کا تھا اور یہ یقین اَور طرح کا ہی۔ وہ نقل یہ اصل۔ وہ مجاز یہ حقیقتہ۔ کسی بزرگ کے حال میں لکھا ہی کہ اُنھوں نے اپنے گھر میں ایک قبر کھدو رکھی تھی اور اپنے اوپر لازم کرلیا تھا کہ ہر روز تھوڑی دیر کے لئے ضرور اُس میں جا کر لیٹتے تاکہ موت کی یادگاری تازہ ہوتی رہے۔ میں نے قبر تو نہیں کھدوی لیکن یہ پورا یقین ہی کہ جس چارپائی پر پڑی ہوں اب اسی قبر ہی میں جانے کے لئے اُتاری جاؤں گی۔ غرض موت کے اس دہشے کے یقین نے میرے سارے شکوک رفع کردیئے۔ اب مجھ پر اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ میں نہایتہ عاجز اور ذلیل مخلوق ہوں۔ اپنی حقیقتہ کا پہچانا تھا

کہ خدا نظر آنے لگا ساری عمر مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ سنتے اور کتابوں میں پڑھتے
گزر گئی مگر اس کے معنے اب سمجھ میں آگئے کہ اپنے تئیں پہچاننے سے خدا کیوں پہچانا جاتا ہے
پھر میں نے خدا کی عظمۃ اور اُس کے جلال پر نظر کی تو میری ایسی سٹی بھولی کہ اپنی ہستی کو ہستی
کہتے ہوئے شرم آنے لگی - اس خیال نے مجکو بہت ہی بڑی راحۃ پونہچائی - کیوں کہ میں ایسے
افکار میں مبتلا رہتی تھی جن میں اپنی چھوٹی سی عقل کو دخل دینا پرلے درجے کی بیہودگی اور
گستاخی تھی - اُدھر خدا کو پہچانا اور ادھر اپنے تئیں تو دیکھا اُس کے مجھ پر اس قدر احسانات
ہیں جن کی کوئی حد و انتہا نہیں - تو میں نے سوچا کہ ایسے محسن کے احسانات کا معاوضہ کرنا
خلاف شیوۂ انسانیۃ ہے - لیکن اُس کی ذات تو ہے بے نیاز یہاں تک کہ اُس کو ہماری شکرگزاری
اور احسان مندی کی پروا نہیں تو ہو نہ ہو اپنے ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ہوسکے
سلوک کرنا یہی اس کا شکریہ اور یہی اُس کی مہربانیوں کا معاوضہ ہے - کیوں کہ ہم اُس کا
برتاؤ بندوں کے ساتھ دیکھتے ہیں - سب کی پرداخت - کل کی پرورش - تو اگر ہم
اُس کے بندوں کے ساتھ لطف و مراعاۃ سے پیش آئیں تو یہ ضرور اُس کی خوشنودی
اور رضامندی کا موجب ہوگا - لیکن افسوس ہزار افسوس مجھ کو یہ باتیں کب آکر سوجھیں
جب کہ مجکو دنیا میں رہنے کی مُہلۃ نہیں - اور دَن دَو دن یا شاید دو پہر یا شاید گھڑی
دو گھڑی کی مُہلۃ ہے بھی تو بیماری سے چین نہیں قرار نہیں - مگر پھر بھی جب تک دم
میں دم ہے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا - آخر ایک بات سمجھ میں آئی جس کے لئے میں نے آپ
صاحبوں کو تکلیف دی - اور وہ بیوہ عورتوں کی حالۃ پر نظر کرنا ہے - آپ اس بات کو
ضرور تسلیم کریں گے کہ جو کچھ میں بیوہ عورتوں کے بارے میں کہوں وہ بہت زیادہ
قابلِ اعتبار ہوگا بہ نسبۃ اُس کے جو آپ اپنے دل میں خیال کر رہے ہیں - کیوں کہ اول
تو میں عورۃ ہوں اور کوئی مرد گو وہ کیسا ہی عزیز کیوں نہ ہو عورۃ کے حال سے اس قدر
واقف نہیں ہوسکتا جس قدر ہم جنس ہونے کی وجہ سے میں - دوسرے میں بیوگی
کی تلخی بخوبی چکھ اور اُس کی مصیبۃ اچھی طرح جھیل چکی ہوں - تیسرے جب میں مرنے
کے لئے طیار اور گور میں پانو لٹکائے بیٹھی ہوں تو جو کچھ کہوں گی اُس میں میری کسی ذاتی غرض

کا شمول ہو نہیں سکتا۔ اب میرا وہ وقت آ لگا ہی کہ مجکو تمام دنیاوی اغراض سے بالکل قطع
نظر ہی۔ وہ جسم جس کو میں ماں کے پیٹ سے ساتھ لائی تھی اور جس نے ساری عمر میرا ساتھ دیا
اُسی سے میرا تعلق ٹوٹنے والا ہی تو دوسرے تعلقات کیا باقی رہ سکتے ہیں۔ اور اسی خیال نے
تو مجکو جراءۃ بھی دلائی کہ لوگوں کو جمع کروں اور اُن کو بیوؤں کی مصیبۃ سناؤں۔ ورنہ کتنی
خدا کی بندیاں جی ہی جی میں گھُٹ گھُٹ کر اور گھُل گھُل کر دنیا کے پردے سے اُٹھ گئیں
اور کسی نے نہ جانا کہ بیوگی نے اُن کو کیسا کیسا ستایا اور کتنا کتنا رُلایا۔ میں خوب سمجھ چکی ہوں
کہ جو میں کر رہی ہوں آج تک کسی عورۃ نے نہیں کیا۔ مدتوں اس انوکھی بات کے چرچے
رہیں گے۔ لوگ طرح طرح کی بدگمانیاں کریں گے۔ مجکو کوسیں گے۔ بُرا کہیں گے۔ لیکن میں
ایسی جگہ جا رہی ہوں کہ یہاں کی آوازیں وہاں پہنچ نہیں سکتیں۔ میرا معاملہ تو خدا سے
پڑنے والا ہی۔ اور میں بُری یا بھلی جیسی کچھ ہوں اُسی کو معلوم ہی اور وہ دُنیا کی طرح کا جج نہیں
کہ جوری اور اسیسر اور گواہوں کے بدون اپنی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ پس میں کیا پروا
کر سکتی ہوں کہ لوگ میرے مرے بعد میری نسبۃ کیا کہتے ہیں۔ آپ صاحبوں میں سے اکثروں کو
میرے حالات معلوم ہیں اور میں اُن کے بیان کرنے کی ضرورۃ نہیں دیکھتی۔ پس میں آپ صاحبوں
کو اپنی بیوگی کی داستان سُنا چلتی ہوں۔ میں یہ دعوی نہیں کرتی کہ میری بیوگی کسی خاص طرح
کی بیوگی تھی۔ بے شک میں جوانی میں بیوہ ہوئی مگر بیوگی کسی حالۃ اور کسی عمر پر موقوف نہیں۔
بوڑھیاں۔ جوانیں۔ لڑکیاں۔ اولاد والیاں۔ بے اولاد۔ امیر۔ غریب۔ شریف۔ رذیل کہیں
رانڈوں کی کمی نہیں۔ بلکہ میری حالۃ تو بہتیری رانڈوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ میرے
ساتھ اولاد کا بکھیڑا نہ تھا کہ ان کے پالنے پرورش کرنے لکھانے پڑھانے شادی بیاہ کا تردد
کرنا پڑتا۔ نواب صاحب نے خدا اُن کو جزائے خیر دے میری تنخواہ باندھ دی تھی جس میں
مَیں بفراغۃ بسر کر سکتی تھی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہی کہ اس دم تک بفراغۃ بسر کی۔ میں نے
اکثر عورتوں کو کہتے سُنا اور شروع شروع میں میرا بھی ایسا ہی خیال تھا کہ فکرِ معاش سے خدا نے
مجکو سبکدوش کر دیا ہی میں اگر دوسرے نکاح کا ارادہ کروں تو بڑی بے جا اور بدنما اور ناروا
بات ہی۔ لیکن بہت دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ میری رائے بالکل بدل گئی اور میں نے

سمجھا کہ اگر تعلق مناکحۃ کی غرض وغایۃ یہی ہی کہ مرد کمائے اور عورۃ پہنے اور کھائے تو اس
تعلق میں کچھ بھی مزہ داری نہیں اور نہ یہ تعلق کچھ بڑی قدر کی چیز ہی - اور ایسا ہوتا تو امیر
اپنی بیٹیوں کے بیاہنے کا نام ہی نہ لیتے - نہیں - بلکہ اصلی غرض اس تعلق سے مرد اور عورۃ
کا ایک دوسرے کی محبۃ سے متمتع ہونا ہی - اور باقی تمام برکتیں جو خانہ داری سے پیدا ہوتیں
اور فائدے جو ایک کو دوسرے سے پہنچتے سب فروع ہیں اسی راحۃ رساں اور مسرۃ بخش
اور تسکین دہ محبۃ کی - آدمی کی رائے کا بھی کچھ ٹھکانا نہیں - مجھے اچھی طرح سے یاد ہی کہ
آغازِ بیوگی میں بلکہ بیوگی کے کئی برس بعد تک میرا یہ حال تھا کہ مونہ پھوڑ کر کہنے کی تو کس کی
مجال پائی تھی اگر کوئی اشارۃً کنایۃً بھی دوسرے نکاح کا نام لیتا تو میں ضرور پکڑ کر اُس کا مونہ
نوچ لیتی - اور کبھی مجکو آپ سے بھی خیال آگیا ہی تو میں نے اس کو وسوسہ شیطانی سمجھ کر ادھر
آیا ادھر ٹالا - یا وہی میں ہوں کہ اب ایسی حالۃ میں بھی جانتی ہوں کہ بے فائدہ اور لاحاصل محض
ہی اور ہو بھی نہیں سکتا مگر میری دلی آرزو یہی ہی کہ کسی کی نکاحی ہو کر مروں - اور میرا حشر بھی
نکاحیوں ہی میں ہو - ایک حساب سے تو مجکو تمام زمانۂ بیوگی میں نکاح سے انکار ہی سا رہا - اور
انکار نہ ہوتا تو میں کر بھی گزرتی - اور کرنے پر آتی تو میں کسی کے روکے سے رُکتی بھی کب -
لیکن دلی انکار جس کو سچا انکار کہنا چاہئیے وہ تو واقع میں عدۃ تک تھا کہ اُس وقت تک مولوی
صاحب مرحوم کی یادگاری تھی تازہ اور میں اس کو پرلے درجے کی بے وفائی اور بے مروتی
سمجھی تھی کہ اُن کی اتنے دنوں کی رفاقۃ کو اس قدر جلد بھلا دوں - شرع میں جو عدۃ کا ایک وقت
مقرر ہی اُس میں اور جو کچھ مصلحتیں ہوں سو ہوں لیکن یہ تو میرا ذاتی تجربہ ہی کہ اتنا وقت گزرنے
کے بعد غم میں بڑا ہی فرق پڑ جاتا ہی کہ اگر بتکلف رنج کو تازہ نہ رکھا جائے تو گویا رنج کی عمر طبیعی
اسی قدر ہی - خیال تو عدۃ کے اندر بھی کیوں نہیں آیا مگر عدۃ پوری ہوئے پیچھے تو میں نے
طبیعۃ پر زیادہ زور دیا کہ اِدھر یا اُدھر اس بات کا کچھ نہ کچھ ضرور تصفیہ کرنا چاہئیے -
میں نے سوچنے اور غور کرنے کا کوئی پہلو اُٹھا نہیں رکھا - کیا مذہب - کیا عقل - کیا میری
خاص حالۃ تمام روداد نکاح کی متقاضی تھی اور اکیلا رواج مانع - سو رواج بھی ویسا شدومد
کے ساتھ نہیں جیسا ہندوؤں میں ہی بلکہ اسی قدر کہ بیوہ جو نکاح کر لیتی ہی اس کی ویسی اور

وتنی عزة باقی نہیں رہتی اور لوگ اُس کو حقیر سمجھنے لگتے ہیں - اور یوں دُنیا میں کون ہی جس کو
اُس سے بہتر حالة والا حقیر نہیں سمجھتا - لیکن نکاح کرنے سے بیوہ عورة حقیر سمجھی جاتی ہی اُس خاص
بات میں جو سب سے زیادہ دل کو دکھانے والی ہی - اور جس کی حفاظة کے لئے اُس نے نکاح کیا ہی
یعنی ناموس بامیں ہمیشہ رسم و رواج کو بڑی حقارة کے ساتھ دیکھا کرتی اور جی میں کہتی کہ بھلے
بُرے کی شناخت کی دو کسوٹیاں ہیں مذہب اور عقل - بلکہ اگر سچ پوچھو تو ایک ہی کسوٹی ہی یعنی
مذہب - کیوں کہ انسان کی عقل کا کچھ اعتبار نہیں ایک ہی بات کو ایک آدمی اچھا سمجھتا ہی اور
دوسرا بُرا اور اسی سے تو دنیا میں اختلافات پڑے ہوگئے ہیں - ہم سمجھتے ہیں کہ معصوم بچوں
کے مارڈالنے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ حرکت نہ ہوگی - لیکن جن لوگوں میں بیٹیوں
کے مارڈالنے کا دستور ہی جیسے ہمارے ملک کے راجپوت اُن کا یہ مقولہ ہی کہ کنواری لڑکی کو بٹھا رکھنا
یا سسرا کہلانا اور سالا بننا بڑی بے غیرتی کی بات ہی کوئی فعل اس سے زیادہ تحسین کے قابل
ہو نہیں سکتا کہ جائے جان رہے آن - یہ تو میں نے مثال کے طور پر ایک بات بیان کی اسی طرح
سیکڑوں ہزاروں باتیں ہیں جن میں لوگوں کی رائیں مختلف ہیں - بلکہ آدمی آدمی کا اختلاف تو
درکنار ایک ہی آدمی ایک بات کو ایک وقت بُرا سمجھتا ہی اور پھر وہی آدمی اُسی بات کو دوسرے
وقت اچھا کہنے لگتا ہی - اور یہ تو خود مجھ پر گزری ہی اور خیال کرکے دیکھو تو کوئی فرد بشر اس
تزلزل سے خالی نہیں - بچپن کی باتیں جوانی میں بُری معلوم ہوتی ہیں جوانی کی بڑھاپے میں
غرض اچھا وہی جس کو مذہب اچھا کہے اور بُرا وہی جس کو مذہب بُرا بتلائے - تو میں اپنے
دل میں کہتی کہ جب آدمی کی عقل کو نیک و بد کی تمیز کا سلیقہ نہیں یہ رسم و رواج کیا چیز ہی
اور بڑے احمق ہیں جو اس کی پیروی کرتے ہیں - لیکن جب مجکو خود رسم و رواج سے مقابلہ کرنا
پڑا تو معلوم ہوا کہ خدا کی خدائی میں اس سے زیادہ کوئی زبردست چیز نہیں - جب جب نکاح کا
خیال آیا تب تب ارادہ ہوا اور جب جب ارادہ ہوا رسم و رواج نے سب منصوبے غلط کر کر دیئے -
میں کہتی تھی ہی ہی لوگ مجکو دو خصمی کہیں گے - برابر کی بیبیاں مجکو نظر حقارة سے دیکھیں گی
ستینیں ماریں گی - مسکرائیں گی - انگلی دُھکی سب بیوی کی صحنک کھائیں گی اور میں بیٹھی مُنہ
تکوں گی - میرے سبب سے میری نسل انگشت نما ہوگی - نہیں نہیں - میں اس بے عزتی

کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اُس سُہاگ کو لگے آگ جس کی وجہ سے آبرو پر حرف آئے۔ لوگوں کے طعنے
سنوائے۔ گالیاں کھلوائے۔ پھر کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ یہ کیا عقل کی بات ہے کہ لوگوں کے کہنے
کے لئے اپنے گھر کو چلنے دیا جائے۔ جو خدا رسول سے واقف اور دین و ایمان سے خبردار ہیں وہ دل
میں جو چاہیں سو سمجھیں مگر مُونہہ سے تو کوئی کھوٹی بات سامنے یا پیٹھ پیچھے نکال نہیں سکتے۔ اور
بلکہ دل میں بھی سمجھیں تو ایمان کا ضرر ہے۔ لیکن ایسے آدمی کتنے ہیں سو میں مشکل سے ایک۔
تو وہ کس شمار میں ہے۔ اور پھر معاملہ تو عورتوں سے پڑنے والا ہے جو عموماً دین سے بے نصیب
ایمان سے بے بہرہ۔ ان بیچاریوں کو شاذ نادر میاں سے ملاپ ہے تو اپنے بناؤ سنگار سے
اور بگاڑ ہے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو رات دن کے جھگڑے اور فساد سے خانہ داری کے انتظام
بچوں کی پرورش اس کی غیبت اُس کی بدی۔ تیرے رشک میرے حسد سے کب فرصت ملتی ہے کہ دین
کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ تو اس طرح کی حضرۃ ہیں کہ حضرۃ مریمؑ بھی ان کے روبرو آجائیں تو اینٹ
اُن پر بھی چشمک کریں پر کریں۔ لیکن نکاح کروں تو ایسیوں سے ملوں ہی کیوں ؟
مگر ایک دو ہوں تو چھوڑا بھی جاسکتا ہے یہاں تو خدا کے فضل سے آوے کا آوا خراب کنبے کا
کنبا بھونڈا۔ چار و ناچار کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ان سے مٹھ بھیڑ تو ہو ہی گی اور مٹھ بھیڑ
ہوگی تو یہ کم بختیں چھیڑیں گی بھی ضرور اور چھیڑیں گی تو دل کو ایذا ہوگی بھی بلاشبہہ ایسے
وقت میں مجکو کوئی ہوتا سہارا لگانے والا ہمتہ بندھانے والا تو میرے دوسرے نکاح کو بھی اب پندرہ
پندرہ بیس بیس برس ہوئے ہوتے۔ مگر عزیزوں نے رشتہ داروں نے اپنے پیاروں نے اور
سب طرح پر تو ہمدردی اور غمخواری کی اس کا کسی نے جھوٹوں بھی نام نہ لیا۔ یہ بھی اُسی رواج
سے مجبور تھے جس سے کہ میں معذور تھی۔ اور رواج کے علاوہ ان کو اس کا بھی خیال ہوتا تھا کہ
اس کی مرضی دوسرا نکاح کرنے کی نہیں ہے اور آخر ہے تو یہ ہم ہی میں کی یقیناً نہیں ہوگی تو اس کے
آگے اس کا مذکور کرنا بھی گویا زخم پر مرچین لگانا ہے۔ میری والدہ نے یہاں تک تو کیا کہ میری
بیوگی کے خیال سے میاں کے جیتے جی دنیا داری سے تائب ہوگئیں اور گویا ایک طور سے انھوں نے
اپنے گھر کو بگاڑ لیا۔ نانا نے صبر کی فضیلتوں کے بیان میں ایسے ایسے وعظ سُنائے کہ شوہر تو شوہر
میں آپ مرگئی ہوتی تو اپنا بھی ماتم نہ کرتی۔ غرض میں ان سب کی شکر گزار ہوں کسی نے میرے

ساتھ کی نہیں کی بے شک اِن کو چاہتا تھا کہ دوسرے نکاح کی تحریک کریں ترغیب دلائیں مگر انھوں نے نہیں کیا اس لئے کہ مجکو چاہتا تھا کہ دوسرے نکاح کا ارادہ ظاہر کروں میں نے نہیں کیا۔ میں نے بہتیری تدبیریں کیں کہ کسی ایسے شغل میں لگ جاؤں کہ یہ خیال ہی دل میں نہ آئے۔ پورے ایک برس صوم داؤد رکھ کر دیکھے کیوں کہ میں نے کتاب میں پڑھا تھا کہ روزہ اور روزہ بھی حضرة داؤد علیہ السلام کا سا ایک دن بیچ کا نفس کشی کے لئے بہت ہی مفید ہے مہینوں سر نہ دھویا۔ ہفتوں بالوں میں کنگھی نہ کی۔ کپڑے نہ بدلے۔ اچھا کھانے کی قسم کھائی۔ اچھا پہننے کا عہد کیا۔ مگر معلوم ہوا کسی چیز کا قصور نہیں۔ خود میری ہستی نکاح کی متقاضی ہے۔ ایک دن عادة کے مطابق میں اس خیال میں ڈوبی ہوئی تھی پڑے پڑے خیال آیا کہ میں ہی اپنی ذات سے اس قدر بے چین رہتی ہوں یا دوسری بیوؤں کا بھی یہی حال ہے۔ تم لوگ تعجب کروگے کہ یہ بھی عجیب دھن کی عورة ہے مگر میں نے اسی غرض سے باون یعنی دو اوپر پچاس بیوؤں سے ملاقاة کی جس میں میرے کئی برس صرف ہوئے۔ عورتیں وہ بھی عورة میں بھی۔ بیوہ وہ بھی بیوہ میں بھی۔ اس پر اُن کے اصلی اور دلی خیال دریافت کرنے میں مجکو ایسی ایسی مشکلیں پیش آئیں کہ دوسری کی ہوتی تو اتنی پیروی نہ کرتی۔ مجکو جس کا حال دریافت کرنا منظور ہوا پہلے میں نے اُس سے ربط بڑھایا۔ گھل مل کر اس کو سہیلی بنایا۔ لیکن میں جس چیز کی ٹوہ میں تھی وہ بات ہی ایسے پردے کی تھی کہ ہم جولی ہم جولی سے کہتی شرمائے۔ سہیلی سہیلی سے چھپائے۔ عورتوں کی بہتیری باتیں چھپانے کی ہوتی ہیں اور جو پیٹ کی گہری تھیں انھوں نے چھپایا بھی بہت مگر میں جو پیچھے پڑی تو کسی نہ کسی ڈھب سے پوچھ ہی کر رہی۔ ہاں نکاح کا ایسا معاملہ تھا کہ اس کا نام زبان پر آیا نہیں اور سینے والا بیتے سے اکھڑا نہیں۔ آخر ہار کر میں نے تو یہ تدبیر کی کہ جو عیب نہ کرنے تھے اور نہیں کئے تھے وہ سب جھوٹ طوفان اپنے اوپر لئے تب کہیں جا کر وہ عورتیں کھلیں اور انھوں نے اپنے دل کے بھید دیئے۔ اس طرح پر لوگوں کے حالات کی تفتیش بُری بات ہے اور شریعة میں منع ہے اور قرآن میں لاتجسسوا۔ کی مناہی موجود ہے لیکن خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں میری نیتہ میں ہرگز یہ بات نہ تھی کہ لوگوں کے پردے فاش کروں یا ان کو حقیر سمجھوں۔ میں کیا کسی کے عیب ڈھونڈوں گی جب کہ آپ میرا رواں رواں

خدا اور خدا کے بندوں کا گنہگار ہی۔ اَوروں نے اگر گناہ کئے ہیں تو اُن کو ابھی توبہ کی مہلت ہی ممکن ہی کہ خدا اُن کو توبہ کی توفیق دے توبہ قبول ہو اور اُن کے سارے گناہ معاف کردیئے جائیں شامت تو مجھ کم بخت بدنصیب کی ہی کہ توبہ کا وقت بھی باقی نہیں۔ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْهِمْ وَكَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْاٰنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا۔ توبہ تو اُن کی ہی جنھوں نے نادانستہ کوئی بُرا کام کیا پھر جلدی سے توبہ کرلی تو ایسوں کی توبہ خدا بھی قبول کر لیتا ہی اور خدا تو جاننے والا حکمت والا ہی۔ اور اُن کی توبہ سند نہین جو بُرے کام کرتے چلے گئے یہاں تک کہ جب موت آموجود ہوئی تو لگے کہنے اب میں نے توبہ کی اور نہ اُن کی توبہ سند ہی جو کافر مرے ایسوں کے لئے ہم نے عذاب دردناک طیار کر رکھا ہی تو صاحب میں تو حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ میں ہوں اور مجکو اپنی توبہ کے قبول ہونے کا بھی بھروسہ نہیں۔ بلکہ لوگوں کے حالات کی تفتیش سے میری غرض اسی قدر تھی کہ دیکھوں مجھی کو ہوگی اس قدر الھرتی یا دوسروں کا بھی یہی حال ہی۔ تو بعض کا حال تو ناگفتہ بہ ہی اُن کی وہی مثل ہی اِخْتَارَ الْعَارَ عَلَى النَّارِ۔ دنیا کی شرم سے مجبور دوزخ میں جانا منظور۔ مگر خدا کا بڑا احسان ہی کہ امیروں کی تو میں کہتی نہیں متوسط الحال اور غربا کی عورتوں میں اس طرح کے فسادات بہت ہی کم ہیں بلکہ گویا کہ نہیں ہیں۔ اور یہ سب برکتیں ہیں پردے کی۔ اور افسوس ہی کہ آج کل کے انگریزی خوان اسی کے پیچھے پڑے ہیں کہ جس طرح ہوسکے اس کو توڑئے۔ لیکن اس وقت کی میری بھی ایک بات یاد رکھنا کہ جس قدر پردے میں کمی ہوگی اُسی قدر فسادات میں ضرور زیادتی ہوگی۔ مگر یہ کہ خدا نعوآدمیوں کی جگہ زمین پر فرشتوں کو لا بسائے تو کچھ کہا نہیں جاتا۔ مجکو اس قسم کی کئی عورتیں ملیں جن کو حقیقت میں نکاح سے انکار تھا مگر تحقیق کیا تو ان کا انکار اُسی طور کا تھا کہ ایک لومڑی انگور کی بیلوں کے تلے سے ہوکر نکلی انگور کے خوشے دیکھ کر اس کا جی للچایا کودی اُچھلی بہت مگر انگور تھے اونچے پونہچ نہ سکی آخر یہ کہہ کر دُم دبا چلتی ہوئی کہ انگور کھٹے ہیں۔ تو جن کو انکار تھا اُن میں بعض کی تو صورت اچھی نہ تھی۔ بعض عمر سے اُتری ہوئی بعض بچہ کش۔ کہ پہلے چار چار پانچ پانچ کے لئے ورثہ بنائے تو ان سے نکاح کرے۔ اننی عورتوں

نہیں سچا انکار تو ایک کا دیکھا کہ اُن کو کوئی چیز مانع نہ تھی مگر اس طرح کا آدمی خدا پرست مرد یا عورۃ
کوئی شخص آج تک میری نظر سے نہیں گزرا اور اگر انھوں نے مجھ سے عہد نہ لیا ہوتا تو میں
ضرور اُن کا نام و نشان سب کو بتا دیتی کیوں کہ ایسے بزرگوں کی زیارۃ کو میں داخل عبادۃ سمجھتی
ہوں۔ میں اس کو اپنی بڑی خوش قسمتی خیال کرتی ہوں کہ اتفاق سے اُن کے پاس جا نکلی
اور میں سچ کہتی ہوں کہ اگر مجکو اپنی نجاۃ کی توقع ہی تو صرف اِس سے کہ میں نے اُن سے درخواست
کی اور انھوں نے میرے لئے دعا کرنے کا وعدہ کیا وہ ضرور اپنا وعدہ پورا کریں گی بلکہ کیا ہوگا اور
وہ اپنا وعدہ پورا کریں گی تو خدا بھی اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا بلکہ کیا ہوگا کہ وہ اچھے بندوں کی
بات کو رد نہیں کرتا۔ تم بھی از برائے خدا دعا کرو کہ اپنے نیک بندوں کے طفیل میں خدا میرے
گناہوں سے درگزرے اور میں بھی تم سب کے حق میں یہی دعا کرتی ہوں خدا قبول کرے۔ کیا ٹھکانا
ہے کہ ہم جس مونہہ سے جھوٹ بولتے غیبت کرتے قسمیں کھاتے کوستے بُرا کہتے بیہودہ باتیں بکتے
اُسی گندے اور ناپاک مونہہ سے دعا مانگتے تو ایسی دعا قبول ہو کیا خاک۔ لیکن اگر ایک بندہ دوسرے
بندے کے لئے دعا کرے تو وہ دعا قبولیت سے زیادہ قریب ہی۔ کیوں کہ میرا مونہہ گناہ گار ہی تو میرے لئے
نہ دوسروں کے لئے۔ وہ بی بی جن کا میں نے ذکر کیا میں نے اُن کو جا کر دیکھا تو بس خدا یاد آگیا
میں نہیں جانتی تھی کہ اس زمانے میں اور ہمارے ہی شہر میں ایسے ایسے بزرگ چھپے پڑے ہیں
اور واقع میں اپنے اعمال کا تو حال معلوم ہی یہی لوگ ہیں جن کی برکت سے زمین و آسمان قائم
ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہی کہ اُنھوں نے اپنے تئیں اس طرح چھپایا ہی کہ کسی کو کانوں کان
اُن کے حال کی خبر نہیں۔ اچھے خوش حال گھر کی بیٹی ہیں باہر شہر کسی بڑے امیر کے گھر بیاہی گئی
تھیں میاں کے جیتے جی تو دین داری کی کوئی بات اُن میں تھی نہیں۔ میری اُن کی بیوگی طبعی جلدی
ہوئی سی ہی۔ یہ بھی جوانی میں بیاہ کے تیسرے برس بیوہ ہو گئیں۔ میاں گھوڑے پر سوار چلے جاتے
تھے خدا جانے کیا ہوا۔ گھوڑا بِدکا گرے اور گرنے کے ساتھ جان نکل گئی۔ ان کے بھی کچھ اولاد
نہیں ہوئی۔ ان پر میاں کے مرنے کا یہ اثر ہوا کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھیں۔ اگر بیوگی کا نتیجہ ہو تو میں
کہتی ہوں الٰہی کل جہان کی عورتیں رانڈ۔ شہر میں آئیں تو غُل غپاڑے کے خیال سے اپنے
میکے میں نہیں ٹھیریں۔ دُور کے رشتے کی کوئی خالہ ہیں اُن کے مکان میں الگ کوٹھے پر رہتی ہیں

کسی سے ملنے کی روادار نہیں۔ نہ یہ کہ لوگوں کو حقیر سمجھ کر اُن سے نفرۃ کرتی ہیں۔ نہیں۔ بلکہ جو کام اُنھوں نے اپنے اوپر لازم کر لئے ہیں اُن سے واقع میں فرصتہ ہی نہیں ہوتی۔ میں بھی ناحق اُن کے اوقات میں خلل انداز ہوئی۔ میں نے اس طرح کے پاکھنڈ بہت دیکھے تھے بے باکانہ جابراجی بناوٹ کے تیور ہی دوسرے ہوتے ہیں ان کو دیکھا تو بس دل بے اختیار ہو گیا۔ تین چار گھڑی دن چڑھتے چڑھتے صبح کے معمولات سے فارغ ہو کر ریشم کھولنے کھڑی ہو گئیں۔ ریشم کھولتی جاتی ہیں اور ساتھ کے ساتھ قرآن بھی حفظ پڑھتی جاتی ہیں کچھ ایسا انداز باندھ رکھا ہی کہ ادھر منزل فیل[ل] کا ورد ختم ہوا اور اُدھر ان کی پانچ پیسے کی مزدوری بھی ہوئی۔ اور یہی ان کی وجہ معاش ہی پھر سینا لیکر بیٹھتی ہیں تو سلائی کا نہیں۔ مسافر طالب العلم یا جن کو سلائی دینے کا مقدور نہیں کپڑا دے جاتے ہیں اور یہ مفت سی دیا کرتی ہیں۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی کہ غریبوں کی اس خدمتہ کو نفلوں پر مقدم رکھتی ہیں۔ دن بھر کا روزہ اور یہ زحمتہ اور پھر رات کو جب دیکھو جاے نماز پر موجود۔ میری چار پائی انھوں نے اپنی نماز کی چوکی کی برابر بچھوائی تھی نفلوں کے بیچ بیچ میں جتنی دیر وظیفہ پڑھتیں مجکو پنکھا جھلتی رہتیں۔ میں بھی مگرے پنے سے خبر نہ ہوئی کہ اچھا ہی ذری کی ذری دنیا میں جنتہ کی ہوا تو کھالوں۔ میں نے نمازیں بہت دیکھی ہیں مگر ایسے ذوق و شوق کی باقاعدہ۔ مؤدب۔ باوقار نماز میرے دیکھنے میں تو آئی نہیں۔ جب میں نے ان کا یہ حال دیکھا تو ہمتہ نہیں پڑتی تھی کہ پوچھوں مگر آخر میں نے جی مضبوط کر کے پوچھا ہی کہ آپ دوسرا نکاح کیوں نہیں کرتیں۔ تو کہا کر تو لوں مگر بیٹھے بٹھائے حقوق شوہری کا وبال کون اپنی گردن پر لے۔ حدیث شریف میں آیا ہی کہ خدا کے بعد شوہر کا درجہ ہی اور اگر بندے کا بندے کو سجدہ کرنا روا ہوتا تو بی بی کو حکم ہوتا کہ میاں کو سجدہ کیا کرے مگر ہم لوگوں کا طریقہ کچھ ایسا بگڑا ہی کہ حقوقِ شوہری کی حفاظتہ مشکل ہی۔ پھر حدیث میں یہ بھی آیا ہی کہ عورتیں کثرۃ سے دوزخ میں جائیں گی اس لئے کہ شوہروں کا احسان نہیں مانتیں۔ تو بھئی میرا تو دوسرا نکاح کرتے ہوئے جی ڈرتا ہی اور اب بہت گذر گئی تھوڑی رہ گئی ہی اس کو بھی خدا گزار دے گا + سوا ایک ان بی بی کا انکار تو سچا

[ل] شروع فاتحہ سے سورۂ یونس تک پھر سورۂ لقمان تک آخر تک تین دن میں سارا قرآن ختم کر دیا جائے تو اس کو منزل فیل کہتے ہیں ۱۲

بیجا انکار تھا اور باقی جس کو دیکھا مونہہ سے نہیں نہیں اور دل میں ہو بھی کہیں۔ اور اگر بیوہ عورتیں ایسا خیال کریں تو اُن پر الزام کی کیا بات ہی۔ اُن بیچاریوں کے شوہر فوت ہو گئے ہیں نہ وہ ضرورۃً فوت ہوئی ہی جس کی وجہ سے دنیا جہاں میں نکاح ہوتے ہیں اور جس کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے۔ اور اگر کسی کو بُرا لگتا ہی تو چاہیئے کہ خدا سے جا کر لڑے کہ کیوں اُس نے عورتوں کو ایسا بنایا۔ انسان کی نسبت خدا نے فرمایا کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفاً۔ انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہی۔ تو ضعف دو قسم کا جسمانی اور عقلی۔ انسان کا ضعفِ جسمانی تو اس سے ظاہر ہی کہ شیر اور چیتا اور بھیڑیا اور ہاتی اور سانپ اور بچھو وغیرہ وغیرہ تو رہے بجاے خود ایک چیونٹی اور ایک مچھر کرنے پر آئے تو اس کو دِق کر مارے۔ رہا ضعفِ عقلی تو جہاں اس کی عقل شکوک اور اوہام اور صحبۃ اور تربیۃ بہت سی چیزوں کی مغلوب ہی دوسروں کی راے کا وہ اِس درجہ محکوم ہی کہ اگر اس کو دوسروں کی راے کا غلام کہا جاے تو بے جا نہیں۔ ہر شخص چاہتا ہی کہ لوگ اس کو اچھا سمجھیں اور اس کے لئے وہ سخت سے سخت محنۃ کرنے اور بڑی سے بڑی مصیبۃ اُٹھانے کے لئے ہر وقت آمادہ ہی۔ ہندوؤں میں جو بیوہ عورتیں ستی ہو جایا کرتی تھیں انگریزوں نے اس کی مناہی کرتے وقت بڑی تحقیقات کی تو ثابت ہوا کہ ستی کی لوگوں کے ذہن میں اِس قدر عظمۃ ہی کہ اُس کو دیبی کے درجے میں سمجھتے ہیں۔ بعض نادان عورتیں برہمنوں کے بھرّے میں آکر مونہہ سے کہہ اُٹھتی ہیں کہ میں ستی ہوں گی۔ اُسی وقت سے اُن کی تعظیم ہونے لگتی ہی۔ پھر اُن کو اپنی بات کی ترپچ آپڑتی ہی یہاں تک کہ لکڑیوں کے انبار پر بیٹھتے وقت تک کسی طرح کا ہراس و اضطرار ظاہر نہیں ہوتا۔ میری غرض اِس مثال کے بیان کرنے سے یہ ہی کہ شیخی ایسی بُری چیز ہی کہ ہزاروں عورتوں نے اس کے پیچھے جان گنوا دی ہی تو اگر اسی شیخی میں آکر شروع میں نکاح سے انکار ظاہر کریں اور پھر اُس انکار کے نباہ کے لئے تمام عمر بیوگی کی مصیبۃ میں رہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہی۔ بحث تو اس میں ہی کہ ایسا انکار قابلِ اعتبار بھی ہو سکتا ہی یا نہیں۔ میں کہتی ہوں نہیں ہو سکتا اور نہیں ہونا چاہیئے۔ تم کو اعتبار آئے یا نہ آئے لیکن یہ قرآن میرے ہاتھ میں ہی چاہو کسی لڑکے یا عورۃ کو پردے کے اندر بھیج کر دکھلوا لو اور میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں سنے نہیں بلکہ میرے خدا نے میری ناموس کو بال بال بچا یا ہی

مگر میں اس پر نازاں نہیں اس سے خوش نہیں۔ اور کیوں کر نازاں اور کیا خوش ہو سکتی ہوں
جب کہ میں خدا کے کلام میں یہ غضب کی آیۃ پاتی ہوں۔ وَإِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ
يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ اور تم اپنے
دل کی بات کو ظاہر کرو یا چھپاؤ خدا اس کا تم سے حساب لے گا پھر جس کو چاہے معاف کرے اور
جس کو چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جسم پر میرا بس چلتا تھا اور میں نے اُس کی
حفاظت کی۔ آنکھ غیر محرم پر نہیں پڑنے پائی۔ زبان کو گناہ کی بات نہیں بولنے دی۔ پاؤں بے راہ نہیں
چلا۔ ہاتھ بے جا نہیں ہلا۔ لیکن دل پر تو میرا اختیار نہ تھا۔ وسوسوں کو کیوں کر روکتی۔ خیالات کو
کس طرح ٹالتی۔ پس میرا بدن بالکل بے گناہ ہے لیکن دل نہ میں اس کو بے گناہ سمجھتی اور نہ بے گناہ
کہتی۔ بدن تو دنیا کی چیز ہے یہیں تک میرے ساتھ ہے اور میں یہیں اس کو چھوڑ جاؤں گی۔ جس کی
خدا کے یہاں بازپرس ہونی ہے وہ دل ہے۔ اور افسوس کہ وہ خدا کے سامنے پیش کیے جانے کے
قابل نہیں۔ لوگوں کی نظر میں اپنے تئیں بے گناہ ظاہر کرنا مجکو کیا فائدہ دے سکتا ہے جب کہ میں
خوب جانتی ہوں کہ خدا کی سرکار میں کسی کو دخل نہیں نہ کوئی کسی کو جنت میں لے جا سکتا اور نہ کوئی
کسی کو دوزخ سے بچا سکتا۔ بلکہ اپنی بے گناہی کا یقین دلانا جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا ہے اور
میں نہیں چاہتی کہ چلتے چلتے ایک گناہ اور اپنے سر پر لوں۔ مجھ پر ایک وقت گزرا ہے دن نہیں
ہفتے نہیں۔ مہینے نہیں۔ بلکہ برس کہ مرد کی آواز میرے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی۔ رات کو چوکیدار
پکارتا یا دن کو سودے والے صدا لگاتے تو میں کان لگا کر سنتی بلکہ ایک دفعہ تو بے اختیار ہو کر
ڈیوڑھی میں جا کھڑی ہوئی اور پھر مہینوں اپنے تئیں ملامت کرتی رہی۔ بیماری میں لوگوں نے میری
ایسی ایسی خدمتیں کی ہیں کہ بس میرا جی ہی جانتا ہے اور میں ان کے احسانوں کی کسی طرح تلافی نہیں
کر سکتی۔ لیکن ویسی تسلی ہی نصیب نہیں ہوئی جو خدا بخشے مولوی صاحب کے سرسری طور پر
پوچھ لینے سے ہوتی تھی کہ اب تمھارا مزاج کیسا ہے؟ ایسی بھی بہتیری عورتیں نظر سے گزری ہیں جن کا
سرے سے بیاہ ہی نہیں ہوا مجکو کبھی اُن کے حال پر ترس نہیں آیا لیکن بیوہ ہو کر بیوگی کی قدر
جانی کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔ جو میرے کہے کا یقین کرے خدا اس کو جزائے خیر دے
اور جو نہ کرے اُس کے حق میں اس کے سوائے اور کیا کہوں کہ خدا کرے وہ بھی ہم ہی سری کی عورت بنے

خدا کرے اُس کا بھی بیاہ ہو - اور خدا کرے وہ بھی بیوہ ہو کر دنیا میں رہے - جب مجکو یقین ہوا کہ ہزاروں لاکھوں عورتیں بیوگی کی سخت مصیبت میں مبتلا ہیں تو میں نے سوچا کہ اگر میں اِن کی کچھ مدد کر سکوں تو اس سے بڑھ کر کوئی ثواب کا کام نہیں - بندی کو چھڑانے غلاموں کو آزاد کرانے کا اجر ہی تو بیوہ وں کو نجاۃ دینے کا کیوں نہ ہوگا یہ بھی تو بندۂ خدا ہیں ان کو بھی قیدیوں کی سی تکلیف اور غلاموں کی سی ایذا ہی بلکہ زیادہ - ان کو بھی رنج و راحۃ کا احساس ہی - پہلے میرے دل میں آیا کہ عورتوں کو جمع کر کے اُن ہی کو مرد دا بناؤں لیکن دیکھا تو عورتیں مجبور محض ہیں مردوں نے اپنی ایسی ٹانگ اڑا رکھی ہی کہ ان کو ہلنے ہی نہیں دیتے - حقیقۃ میں مردوں کے کام ہیں اور عورتیں ناحق میں بدنام - اسی تردد میں تھی کہ ایک دن قرآن پڑھتے پڑھتے یہ بات ذہن میں آئی کہ جتنے احکام عورتوں کے ساتھ خاص ہیں خدا سے تعالیٰ نے خود عورتوں کو مخاطب قرار دے کر نازل فرمائے ہیں جیسے - وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ - وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ - يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ الخ وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَهُنَّ اور قرآن میں اس طرح کی اور بہت مثالیں موجود ہیں - لیکن بیوہ عورتوں کو اس طرح پر دوسرے نکاح کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ مردوں کو مخاطب قرار دے کر فرمایا ہی - وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ ضرور اس کا کچھ نہ کچھ سبب ہی اور وہ نہیں ہی مگر وہی مردوں کا اختیار اور اقتدار جو انھوں نے خدا اور رسول کے حکم کے خلاف زبردستی اور ہیکڑی سے عورتوں پر حاصل کر رکھا ہی - اب اگر مرد یہ کہیں کہ بیوہ کو چاہیے اپنا نکاح آپ کرلے - یہ اُس کا کام ہی - ایجاب و قبول وہ کرے گی نہ ہم - بیوی بن کر وہ رہے گی نہ ہم - تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ خدا نے ان کو ناحق أَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ کا مخاطب قرار دیا - نعوذ باللہ یا تو اُس کو اصلی حال معلوم نہیں یا اس نے مردوں کے حق میں ظلم کیا کہ جو کام ان کے کرنے کا نہ تھا اُن سے کرانا چاہا - اگر خدا کوئی چیز ہی اور قرآن اُسی کا کلام ہی تو أَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ - مردوں کے لیئے بڑی سخت آزمایش کا حکم ہے - اول تو اختیار رکھ کر خدا سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور فرض کرو کہیں شاذ و نادر بے اختیاری ہو بھی تو ایسی صورۃ میں مردوں کو حکم دینے سے خدا کا یہ منشأ ہوگا کہ اپنی بیوؤں کو نکاح پر مجبور کرو - لیکن بجائے اس کے کہ میں مردوں کو سمجھاؤں کہ أَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ - کی تعمیل کس طرح پر کرنی ہوگی اُن کو خود سوچنا

اور سمجھنا چاہیئے کہ اَنکِحُوا الاَیَامیٰ حکم مہمل تو نہیں ہی اور مہمل نہیں تو اس کا کیا مطلب ہی اور جو کچھ مطلب سمجھا جائے اُس فرض سے سبک دوش ہونے کی کیا سبیل ہی۔ میرا اتنا ہی کام تھا کہ بیوؤں کی واقعی حالت کو سچائی اور نیک نیتی سے مردوں پر ظاہر اور مردوں کو اُن کے فرض سے آگاہ کردوں شاید ایسا کرنے سے بیوؤں کی مصیبتہ میں خفتہ اور مردوں کی عند اللہ جواب دہی میں کمی ہو۔ سو میں نے کیا اور خالصتہً للہ کیا۔ اے خدا جو کچھ میں نے کہا اگر تیری مقدس مرضی کے مطابق ہی تو میری بات میں اثر اور لوگوں کو اُس پر عمل کرنے کی توفیق عطا کر۔ الٰہی دُنیا جہان کی بیوؤں کو سُکھ ہو اور میری اس ناچیز کوشش کے صلے میں نہیں بلکہ محض تیرے فضل و کرم سے ان کے طفیل میں مجکو دنیا کی اس تکلیف سے جس کو میں اب سہہ نہیں سکتی خاتمہ بالخیر کے ساتھ نجاۃ۔

کہتے ہیں اور حدیث سے بھی اس کا پتہ چلتا ہی کہ دن رات میں کوئی نہ کوئی گھڑی ایسی بھی ہوتی ہی کہ آدمی جو کچھ مُونہہ سے نکالے وہ ہو کر رہے۔ جس وقت آزادی نے یہ دعا کی وہ ضرور ایسا ہی قبولیتہ کا وقت رہا ہوگا کہ اُدھر تو جتنے مرد تھے سب اپنے اپنے دل میں ٹھان چکے تھے کہ کوئی بیوہ کے بیٹھنے کا روادار نہیں ہوگا (اور ایسا ہی ہوا) اور ادھر دعا کا ختم ہونا تھا کہ آزادی نے دفعتہً ایک ہچکی لی اور ہو چکی ✤

تمام شد

اطلاع اس کتاب کی حسب ضابطہ رجسٹری ہو چکی ہے لہٰذا کوئی صاحب قصد طبع نفرمادیں